

ادبیات  
ماہنامہ



اسرائیل پر شتم نمبر  
1919-2005

# سہ ماہی ادبیات

شمارہ 85/86، اکتوبر 2009 تا مارچ 2010

مدیر اعلیٰ

فخر زمان

مدیر منتظم

ڈاکٹر راشد حمید

مدیر

محمد عامر بٹ

اکادمی ادبیات پاکستان

ایچ ۱/۸، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد

## ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزاز یہ بھی اہل قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- ☆ شامل اشاعت نگارشات کے نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آراء گواکادمی ادبیات پاکستان کی آراء نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات ان پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جاسکتی ہیں۔

### قیمت

- قیمت موجودہ شمارہ: 300 روپے
- قیمت فی شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)، -/40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
- سالانہ (۴ شماروں کے لئے): 400 روپے (اندرون ملک)، 160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
- (رسالہ اندرون ملک بذریعہ پستی اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔)

طباعت: طارق شاہد 051 9250585

سرکولیشن: مسعود اقبال 051 9250578

مطبع: ماریہ پرنٹرز، راولپنڈی

اشاعت دوم: مارچ 2010ء

ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد۔

رابطہ: مدیر اعلیٰ: 051 9250570، مدیر تنظیم: 051 9250572، مدیر: 051 9250342

E-mail: academy@apollo.net.pk

## حرف چند

امرتا پریم برصغیر کی ان معدودے چند اہل قلم میں سے ایک ہیں جنہوں نے عالمی سطح پر شہرت حاصل کی۔ پنجابی زبان و ادب میں امرتا پریم کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے اور وہ بلاشبہ پنجابی کی سب سے معروف ادیبہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کی تحریریں دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ان کے فکر و فن کے اثرات ان کے بعد کی نسلوں میں بھی اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

پنجاب کی دیہی زندگی اور خاص طور پر ایک عورت کی نظر سے اس منظر نامے کی عکاسی جیسی امرتا پریم کے ہاں موجود ہے اس کی مثال پنجابی ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔ عورتوں کی سماجی حالت، زار کا بیان ہو، سماج کے کم تر طبقات کے حقوق کی پامالی کی داستان، یا خود اپنی ہڈ بیتی، امرتا پریم کی تحریر کی بے باکی اور جرات اظہار پڑھنے والے کو اپنی شدت کا اسیر کر لیتی ہے۔ اپنی نظم "آکھاں وارث شاہ نوں" سے ہندوستان اور پاکستان بھر میں شہرت حاصل کرنے والی اس شاعرہ نے ناول اور افسانہ کے میدان میں بھی اپنی فنی عظمت کی گواہی لی اور بطور براڈ کاسٹر اور مدیرہ بھی ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

"ادبیات" کے موجودہ شمارے میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ امرتا پریم کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر جامع بات کی جائے۔ ہم امروز احمد سلیم، افضل تو صیف، ڈاکٹر ستندر سنگھ نور، ڈاکٹر رویل سنگھ اور ڈاکٹر امیہ کنور کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس خصوصی شمارے کی تکمیل میں ہماری معاونت کی۔ امید ہے یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔

فخر زمان



## آئندہ خصوصی شمارے

درج ذیل موضوعات پر سہ ماہی 'ادبیات' کے آئندہ خصوصی شمارے ترتیب دیے جا رہے ہیں:

- جوش ملیح آبادی نمبر
- پروای ادب (بیرون ملک آباد پاکستانی اہل قلم) نمبر
- ن م راشد نمبر
- سعادت حسن منٹو نمبر
- عالمی مزاحمتی ادب نمبر
- غنی خان نمبر
- سو بھوگیان چندائی نمبر
- مجید امجد نمبر

## فہرست

13	فخر زمان	امرتا پر تیم تاریخ ساز شخصیت
چانن دی بھلکاری (اردو مضامین)		
21	امرتا پر تیم، امر دز۔۔ میں اور ٹائٹل کے روئے	احمد سلیم
33	ایک بے چین روح	اظہر جاوید
38	امرتا پر تیم۔۔۔ ایک گچی عورت	اعجاز احمد آذر
44	امرتا پر تیم	افضال شاہد
47	امر دز جی۔۔۔۔۔۔۔۔	افضل تو صیف
57	امرتا کے چند نسوانی کردار	ایم خالد فیاض
65	ایک شام امرتا پر تیم کے ساتھ	پرتو روہیلہ
68	پھولوں کے درمیان امرتا پر تیم سے ملاقات	تنویر ظہور
74	عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے	حسن عباس رضا
81	ساحر اور امرتا پر تیم	حمید اختر
87	'ایک لڑکی ایک جام' کا مطالعہ	خالد فتح محمد
91	حقیقت سے حقیقت تک کا سفر	ڈاکٹر سلیم اختر
100	امرتا کا سولہواں سال ایک چور	رفعت تابید
103	زندگی پر وف کی غلطیوں سے بھری ہے	زابد حسن
107	محبت کی اسیر۔۔ امرتا	سلیم پاشا
113	امرتا۔۔۔ ایک تاریخ	شاہد دلاور شاہ

126	امرتا پر تہم کی زندگی کے دس میں ڈوبی ہوئی باتیں	شبم قلیل
132	امرتا پر تہم --- بس ایک ہاتھ کے فاصلے پر	شبہ طراز
139	امرتا پر تہم	شمع خالد
144	تحفیل کو وجود بنانے والی ساحرہ	صفر اصفہ و ڈاکٹر
164	پریت کی شہزادی	صوفیہ بیدار
167	امرتا پر تہم --- محبت کا غنائی استعارہ	طاہرہ اقبال
171	امرتا پر تہم ایک زندہ لپٹ	ظفر اقبال
175	ایک ملاقات	فرزندی
178	امروز	قاضی جاوید
189	امرتا پر تہم	گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر
190	امرتا پر تہم کی یاد میں	محمد شامیاد
196	امرتا پر تہم	نبیلہ کیانی
199	امرتا پر تہم مجھے کہاں ملی؟	نسرین انجم بھٹی

### (پنجابی مضامین)

202	درد و چھوڑے و احال	امد سلیم
208	میرا تیرا کیر رشتہ؟	افضل تو صیف
214	نیاز بوجہی شخصیت	امیا کنور، ڈاکٹر
220	امرتا پر تہم دی کا و سموید	بلوند رگور و جیر، ڈاکٹر
226	رسیدی نکت دا و نکسن جکت	پال کور
233	امرتا پر تہم وار چنا تمک راو	تمارا آکھو چائیوا
251	ناول کار امرتا پر تہم	تمارا آکھو چائیوا
283	ترکے گھرے داپانی	جسیر بھلر
289	چوچی دس وے جوگی	جسونت دین
298	درد کھا	حسین شاد
306	میں کنا جاندا ہاں	دیوندر
311	امرتا پر تہم و پنجابی ناول و جی ستھان	دیوندر سنگھ دھانیوال، ڈاکٹر

315	امرتا پر یتیم داکا و شاستر	ستند رنگھ نور، ڈاکٹر
326	جان بچیان	سجاد حیدر
336	دشو بھائی چارے اتے سد بھاد نادی شاعری	سدرشن گاسو، ڈاکٹر
345	امرتا پر یتیم کاوی دے کاہ شاستری نکتے	سرب جیت سنگھ، ڈاکٹر
354	ناری دی آواز۔۔۔ امرتا پر یتیم	سر جیت سنگھ کچاہی، ڈاکٹر
358	امرتا پر یتیم - 141 کوتاواں	سر ندر سنگھ کوئل، ڈاکٹر
368	امرتا پر یتیم نوں ست سوال	سر بندر شرما
375	د جوگ	فرخندہ لودھی
377	امرتا پر یتیم پنجابی سہیت دلمان	کرانٹی پال
381	امرتا پر یتیم نوں پرت ماناں دی سرب جک	کرن دیپ سنگھ کرن، ڈاکٹر
386	گیت اکھراں دالی ورن مالا	موہن جیت

### چانن دیاں چھٹاں (اردو نظمیں)

395	کون کجھاب وارث شاہ کو	احمد لطیف
396	امرتا پر یتیم کے نام ایک خط	افضل احسن رندھاوا
398	امرتا پر یتیم کو یاد کرنے کی بھول	دل نواز دل
400	امرتا پر یتیم	زہیر کچاہی
401	تیرا نام امر	سلطان کھاروی
402	امرتا پر یتیم کے لیے	شفیق احمد خان
403	نذر امرتا پر یتیم	عامر سہیل
405	چانن دی پھاگاری	نذیر قیصر
406	امرتا پر یتیم کے نام	نذیر قیصر

### (پنجابی نظمیں)

408	امرتا پر یتیم جی دے تال	آغا علی مڑل
-----	-------------------------	-------------



409	امرتا پر تہم واسطے	افتخار نسیم
411	امرتا پر تہم	امریک سنگھ
413	ہیر روج تے رانجھا کلبوت جانو	امیا کور، ڈاکٹر
415	امرتا پر تہم دے مان	انوپ ورک
417	پر نام	انیل سویرا، ڈاکٹر
419	امرتا دے ناں	اوتار جیت
420	امر۔ امرتا	اوم کار سودھوتا
423	شاعری دیاں لاناں	امراکلی آباشی دلش
425	امرتا پر تہم	ایم اے رانا
427	امرتا پر تہم	بلو مدر سنگھ سندھا
429	بال امرتا	پال کور
432	ممتا تے آئیس دا چہرہ۔ امرتا پر تہم	پرمندر جیت
436	چائن	ترلوچن میر
438	اک شر دھا ٹپلی۔۔ امرتا پر تہم	جگ پال
441	امرتا پر تہم لئی اک نظم	جمیل احمد پال
443	توں دسیا۔۔۔	دیوراج
445	اک صدی اک ندی	دیونت
447	اٹھ دنیا دے مانکا	رہندر سنگھ بھٹی
450	بجراں دی ماری	رہنشاہ قویہ
452	دھی وارث دی۔ امرتا پر تہم	ریش کمار
456	شاعرانہ روج	سر جیت پاتر
458	غزل	سر دول سنگھ اجالا
460	ساحر دے جان چکھوں	سریندر کور
462	تیرے ناں	سلیم پاشا
463	اج یاد بیا کوئی آدے	شائستہ نزہت
466	امرتا لئی	صوفیہ بیدار
467	تو مونیوں۔۔۔	ظفر اقبال

468	لیجئے وارث شاہ اک ہور	ظفر اقبال
469	کوئی ویل ودھاپئے	"
470	اسیں دونویں	"
471	ایس طرح نجیں جادی دا	"
472	تیری اک بلا ہنگ	"
473	کوتا	گر بخش سنی
475	یگ بیت گئے	لکھنڈر باجوہ
477	دیہویں صدی دی لوہ	منجیت کور انہالوی
481	اک دہ صدی داوگو چا امرتا پریم	سن موہن سنگھ راڈ
485	امرتا نوں	مونسدرکار سوڈگل
487	امرتا	موہن جیت
490	امرتا دے ناں	نائب سنگھ منڈیر
492	ستویں دمی	نزل سنگھ، ڈاکٹر
495	امر کہانی	نسرین انجم بھٹی
497	توں بات پائی	برجین سنگھ ریو
502	غزل	برجین سنگھ کلیر، ڈاکٹر

### فیر تپنوں یاد کیتا

505	امرتا لئی لکھیاں نظر	امروز
522	تن دن - تن کال	امروز
527	ڈھپ رنگی	امروز

### کتاب عشق

#### انتخابِ علم

535	گور بکھی سے اردو زبان میں ترجمہ و انتخاب: احمد سلیم
	میں جمع تو (ساحر اور امروز کے حوالے سے چند نظمیں)

آکھاں وارٹ شاہانوں، امرتا پر تہم،  
 ترے گھڑے دا پانی، رب خیر کرے،  
 دے پر دسیا، تول نہیں آیا، ستر، اک خط،  
 محبت، عمر دی رات، ناگ مٹی، بچواں چراغ،  
 کفر، بُرکی، انب دا ہونوا، عرض، عشق،  
 اک نونا دھپ دا، دیکھ کیرا رویا، لفظ، ہستی،  
 آتم ملن، میرا پتہ، فیلی فونو گراف، مثل لائف،  
 امر دز جتر کار، وقت، میرے اتہاس، اک پاتر،  
 بچویں ادا سی، فی مائے،  
 او میرے دوست میرے اجنبی، سورج، پل،  
 شکوہ، دوستو،

### انتخاب نثر

### کہانیاں (گورکھی سے شاہ کھی میں منتقلی)

645	پہی انتر: جمیل احمد پال	آزادوں تے جاسنواں دے راکھے
652	پہی انتر: جمیل احمد پال	کرماں والی
658	پہی انتر: جمیل احمد پال	اک نمبر وافر ق
666	پہی انتر: افضل راز	پڑھ لکھی
673	پہی انتر: افضل راز	بھابھی مورتی
679	پہی انتر: ڈاکٹر شائستہ نذہت	تیا دے پڑے
684	پہی انتر: ڈاکٹر شائستہ نذہت	اک شیر دی موت
692	پہی انتر: ڈاکٹر شائستہ نذہت	نہ جانے لون دھم دے
700	پہی انتر: قمر الزمان	اک زمان اک چھاپ تے پھانسی
712	پہی انتر: فیصل مقصود	انب دلیور

(اردو زبان میں ترجمہ)

720	ترجمہ: میر تہا یوسفی	میر
728	ترجمہ: زاہد حسن	کہانی درکہانی
732	ترجمہ: قمر الزمان	نستعلیق کا سفر
743	ترجمہ: احمد اعجاز	تہہ خانہ
749	ترجمہ: خورشید قائم خانی	جنگلی بونی
758	ترجمہ: خورشید قائم خانی	پانچ برس لمبی سڑک
767	ترجمہ: علی یاسر	مترا
770	ترجمہ: علی یاسر	سفید دھوئی زری کا کفن
772	ترجمہ: حمزہ حسن شیخ	اجنبی اندھیرا
777	ترجمہ: الیاس بابر	مرکی طرف بلائی
783	ترجمہ: الیاس بابر	ترشول

## ناول

788	(گورکھی سے اردو زبان میں ترجمہ) قمر الزمان	دنجر
-----	--	------

## مضامین

873		جہنم کی آگ
876	پہلی ائمہ: جمیل احمد پال	لجھ پور دیروٹ
879	گورکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم	بہم سب خدا ہیں
881	گورکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم	مصور اور وزکافن اور شخصیت
888	ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ: شبنم شکیل	سیا و حاشیہ
891	پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: انور منیر	گرہن کتھا
898	پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر	امروز
		خطوط

903	امرتا پریتم بنام مظہر الاسلام / احمد سلیم
-----	---

## نئی جلد میریٹے

913	امرتا کور سے امرتا پریتم تک	بلونت گارگی
-----	-----------------------------	-------------



926	احمد سلیم (مگر کبھی سے اردو زبان میں ترجمہ و انتخاب) سرخ دھانگے کا رشتہ
940	زابد حسن حدیث درد

## انک ملاقات

943	آصف فرخی کتاب عشق کا اٹکا اورق
954	سمز اچوہدی / شبنم خلیل حدیث دل

## انگریزی تحریریں

Khushwant Singh	Amrita Pritam: Queen of Punjabi Literature
Kartar Singh Duggal	Virgin (English translation of Amrita Pritam's poem)
Ajeet Cour	An Era Vanishes
Fakhar Zaman	Amrita Pritam: A Great Wordsmith ■ Punjab's Literary History
Dr. Fatima Huassain	Amrita Pritam: The Dayen of Punjabi Literature
Hamza Hassan Sheikh	Amrita Pritam: A woman or Aphrodite
Hamza Hassan Sheikh	Amrita Pritam (english translation of Amrita Pritam's poem)
Hamza Hassan Sheikh	You Did'nt Come (english translation ■ Amrita Pritam's poem)

## امرتا پر یتیم۔۔۔۔۔ تاریخ ساز شخصیت

جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور پنجابی ادب پڑھنا شروع کیا تو امرتا پر یتیم کی شاعری کی کتاب "نویں زت" مجھے بہت اچھی لگی۔ دراصل مجھے اس سے انسپریشن ہوئی کہ اپنی ماں بولی میں لکھنا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے پنجابی کے چند صوفی شعراء کو پڑھا ہوا تھا۔ امرتا پر یتیم کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا بعد میں نے ان کی بہت سی تحریروں پڑھیں۔ یونیورسٹی کے بعد میں تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو پنجابی کی طرف رجوع کیا۔ اردو اور انگریزی میں تو پہلے ہی لکھتا تھا۔ لیکن اب پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ پہلے پنجابی ریڈیو ذرا سے لکھے پھر پنجابی میں شاعری شروع کی۔ میری پہلی کتاب "کنسو ویلے دی" 1972 میں شائع ہوئی۔ میں نے یہ کتاب امرتا پر یتیم کو بھیجی۔

جب انڈیائی لی ویشن "ڈوردرشن" پاکستان میں بھی دکھائی دینا شروع ہوا اور انہوں نے بھارتی فلمیں دکھانا شروع کیں تو ہمارے ہاں بھارتی چینل دیکھنے کا اس قدر شوق تھا کہ لوگ گھروں کے اوپر بڑے بڑے اونچے اینٹینے لگا کر ان پر سلور کی تھالیاں باندھ باندھ کر انڈین چینل کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈوردرشن سے نشر ہونے والا پنجابی ادبی پروگرام "در پن" جو امرتا پر یتیم پیش کرتی تھیں، میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ ایک شام امرتا پر یتیم نے میری کتاب "کنسو ویلے دی" کی شاعری پر بات شروع کی۔ اور کہا "یہ بہت اچھی شاعری ہے۔ یہ نظمیں بالکل نئے شعور اور نئے احساس Sensibility کی ہیں۔ اور اب تک ہونے والی شاعری کو ایک نیا ٹریڈ اور ایک نئی شکل دی ہے۔ اس میں جدیدیت ہے۔ بہت گہری ایمانیات اور سمبولزم ہے۔" انہوں نے مجھے نیلی ویشن پروگرام کے ذریعے مبارکباد دی۔

میں نے انہیں خط لکھا اور شکریہ ادا کیا اور کہا "میرا حوصلہ بہت بڑھا ہے کہ اتنی بڑی شاعرہ اور ادیبہ نے میری شاعری کو اتنا پسند کیا ہے کہ نیلی ویشن میں آکر اس کا خصوصی ذکر کیا ہے۔" میرے خط کے جواب میں

امرتا جی نے لکھا ”مجھے تمہاری کتاب ملی میں نے پڑھی اور مجھے بہت پسند آئی۔ جو چیز مجھے پسند آئے تو میں اس پر کھل کر اظہار کرتی ہوں۔“

اس کے بعد میری پنجابی شاعری کی دوسری کتاب ”ونگاڑ“ شائع ہوئی پھر میرا ناول ”ست گواچے لوگ“ ہندوستان گیا تو اس کی چھ چاب میں شامل ڈاکٹر ہر بھجن سنگھ، ڈاکٹر عطر سنگھ ایسے سکے بند نقاد شامل تھے جنہوں نے لکھا کہ ”ست گواچے لوگ“ نے ہماری ناول کی راویت کو بدل دیا ہے۔ اب جو ناول لکھے جائیں گے وہ سب اس ناول کو سامنے رکھ کر لکھے جائیں گے کیوں کہ اس ناول نے ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ”ست گواچے لوگ“ امرتا پر تہم کو بھی اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے ٹی وی پر اس کا بہت ذکر کیا۔ اس کے بارے میں آرٹیکل لکھے۔ پھر میرا دوسرا ناول ”اک مرے بندے دی کہانی“ ”پھر“ ”بندی وان“ اور پھر ”بے دھنا“ انہیں بھیجا۔ اس دور میں ہندوستان میں آمد و رفت بند ہو گئی۔ صرف خط و کتابت جاری تھی۔ ڈاک پر سفر تھا۔ میری کتابوں پر ضیاء حکومت نے ”بین“ لگا رکھا تھا۔

اس لیے جب میں ملک سے باہر ہوتا تو امرتا پر تہم کو خط لکھتا اور ٹیلی فون پر ملاقات ہوتی تو وہ بڑی خوشی کا اظہار کرتیں۔ مجھے امرتا پر تہم کی تمام تحریریں پڑھنے کے بعد ان کے متعلق پوری جانکاری حاصل ہو گئی۔ خاص طور پر 1976 میں شائع ہونے والی ان کی خودنوشت سوانح عمری ”رسیدی نکت“ اور پھر 1977 میں سوانح عمری کا دوسرا حصہ ”میں جمع توں“۔

”رسیدی نکت“ نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ بہت سارے لوگوں نے اعتراض کیا کہ انہیں بعض باتیں نہیں لکھنا چاہیے تھیں۔ میں سمجھتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل ان کے ہاں منافقت نہیں۔ وہ ہر بات سیدھے پیرائے میں کر دیتی ہیں۔ اپنے دوستوں کے بارے میں اپنی زندگی کے بارے میں ادب کے حوالے سے اپنے نظریات کے حوالے سے کسی ڈپلومیسی کے تحت کچھ بھی چھپایا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں بچے فنکار کو ایسے ہی بات کرنی چاہیے۔

1947 میں ہندوستان کی تقسیم پر فرقہ وارانہ فسادات میں قتل و غارت گری ہوئی اس پر امرتا پر تہم کو ان کی نظم ”آج آکھاں وارث شاہ توں اکوں قبریں وچوں بول“ نے پنجابی شاعری میں امر کر دیا۔ پھر 1956 میں ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ”سنہیوئے“ پر سات اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا اور پھر 1969 میں انہیں پدم شری کا نائل دیا گیا۔ 1973 میں انہیں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی

گئی۔ امرتا پریتم ورلڈ پریس کانگریس 1973 کے موقع پر ماسکو گئیں۔ اس سے پہلے 1961 میں وہ ماسکو کے رائٹر یونین کی دعوت پر تاشقند، تاجکستان اور 1966 میں بلغاریہ اور 1967 میں حکومت نے انہیں ماسکو میں ثقافتی تبادلے کے سلسلے میں یوگوسلاویہ، ہنگری اور رومانیہ بھیجا تھا۔

اس سب کی تفصیل انہوں نے "رسیدی ٹکٹ" میں درج کر دی ہے لیکن 1980 میں بلغاریہ میں ملنے والا ایوارڈ بہت ہی اہم تھا۔ 1979 میں بلغاریہ نے اپنے انقلابی شاعر گولا ولتساروف کے نام پر پہلی بار ایوارڈ دینا شروع کیا اور دنیا میں روس، امریکہ، اٹلی، پولینڈ اور ہندوستان کے پانچ ادیبوں کو یہ ایوارڈ دینے کے لیے منتخب کیا۔ تو ہندوستان سے صرف "امرتا پریتم" کا نام سامنے آیا۔

16 اکتوبر 1980 کو باقاعدہ ایک تقریب میں امرتا پریتم کو یہ ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ کمیٹی کے صدر پنچودان چیف نے اپنی تقریر میں کہا۔ ہم بلغاریہ میں ادیب اور سب لوگ خوش ہیں کہ ہندوستان کی ممتاز اور مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہماری دوست ہے۔ ہم اپنے ملک بلغاریہ میں امرتا پریتم کی تحریروں کو شائع کرتے ہیں اور پیار کرتے ہیں کیوں کہ امرتا پریتم کی شاعری سماجی شعور اور انسانی بہتری کے لیے جدوجہد کو تسلیم کرتی ہے۔

امرتا پریتم کو آزادی کا نشان (پتیل کا ایک زخمی پرندہ جس کے دونوں پر آسمان کی طرف پھیلے ہوئے ہیں) اور ایوارڈ کی آدمی رقم 1300 ڈالر نقدی کی صورت میں دیا گیا۔ امرتا پریتم کو یہ اعزاز انٹرنیشنل صوفیہ میٹنگ آف رائٹرز میں شامل ہونے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس تقریب میں 22 ملکوں کے ادیبوں نے حصہ لیا۔

1983 میں امرتا پریتم کو شو بھارتی یونیورسٹی اور جہپور یونیورسٹی نے ڈی لسٹ کی اعزازی ڈگریاں

دیں۔ 1986 میں امرتا پریتم راجیہ سبھا کے لیے نامزد ہوئیں۔ یہ 1987 کی بات ہے۔ میں ملک سے باہر

بالینڈ میں تھا۔ مجھے پنجابی کی نامور فکشن رائٹر اجیت کور نے دہلی میں ہونے والی دوروزہ "پنجابی کہانی کانفرنس"

کے لیے دعوت دی۔ میں دہلی پہنچا۔ کانفرنس کے بعد امرتا جی کو فون پر بتایا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے

کہا 'فور اسیدھے میرے گھر چلے آؤ۔ میں K-25 حوض خاص ان کے گھر پہنچا اور تین دن اور تین راتیں وہاں

گزاریں۔ دد لمحے میری زندگی کے سنہری لمحات میں شامل ہیں۔ امرتا پریتم سے مختلف حوالوں سے ادب

سیاست اور تصوف پر گفتگو ہوئی۔ پنجابی زبان ادب اور ادیبوں کے بارے میں۔ ہندو پاک تعلقات کے

حوالے سے متبادل خیال ہوا۔ انہیں پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کے دور میں میری پنجابی کتابوں پر

پابندی کا علم تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے ناول "بندی دان" کی ڈرامائی تشکیل کی ویڈیو دیکھنے کے لیے کہا تو



انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کتابوں پر پابندی کے باوجود آپ نے اس ناول کو ڈرامے کے روپ میں کیسے پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب ضیاء الحق نے چادر اور چادر دیواری کا احترام کرتے ہوئے چادر دیواری کے اندر ادبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی اور ہم نے پہلی عالمی پنجابی کانفرنس لاہور 1986 کے موقع پر یہ ڈرامہ گھر کی چادر دیواری میں دکھایا تو ایک دوست نے اس ڈرامے کی ویڈیو ریکارڈنگ کر لی۔ یہ ریکارڈنگ گھر یلو ویڈیو کمرے سے کی گئی تھی، اس لیے تکنیکی اعتبار سے کمزور ہے بہر حال ایک دستاویز تو ہے۔ امرتا پریم نے کہا میں نے ناول "بندی وان" پڑھا ہے لہذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے ناول کا ایک ایک کردار دردی جیہن بن کر آنکھوں سے بہتا گیا۔ ڈرامائی تشکیل ممتاز ادیب احمد سلیم نے کی تھی۔

امرتا پریم نے "بندی وان" کی ڈرامائی تشکیل کی ویڈیو دیکھی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی ادا اس ہو گئی تھیں۔

اُردو ادیبوں نے دوسرے دن "قلم زار" تنظیم کی طرف سے مجھے استقبال دیا جہاں اُردو کے ادیب قمر رئیس کی صدارت تھی اور مہمان خصوصی کے لیے امرتا پریم سے کہا گیا تھا۔ امرتا پریم عام طور پر گھر سے نہیں نکلتی تھیں۔ اور ادبی تقریب میں تو وہ بالکل نہیں جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے مہربانی کی کہ مہمان خصوصی بننے پر رضامند ہوئیں بلکہ انہوں نے اس تقریب میں میری شاعری اور ناولوں خاص طور پر "بندی وان" کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا۔ "فخر زمان اپنے ناول "بندی وان" میں زید کا کردار پیش کرتے ہیں تو زید کہتا ہے، "کل جو انسان قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا۔ آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں" آنے والے کل میں جو قتل ہو گا وہ بھی میں ہوں گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت میرا یہ عالم ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ وہ زید فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔ مجھے اس وقت فراق گورکھپوری بہت یاد آ رہے ہیں جو اکثر ایک بات سنایا کرتے تھے۔ ادبی تاریخ میں جنت اور جہنم کا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا والوں نے یہ دیکھا کہ یہ شاعر ادیب ہیں، یہ پتہ نہیں عوام کا دکھ اپنے دلوں میں کیوں بسا لیتے ہیں کہ پھر ساری زندگی تو پتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں عوام کے غم سے کوئی سروکار نہیں ہو گا انہوں نے زندگی کو دو نام دیئے ایک جنت جو ان کی اپنی زندگی کے لیے تھی ایک دوزخ جو شاعروں اور ادیبوں کے لیے تھی۔ پھر ایک دفعہ جنت میں ایسی ٹھنڈی ہوا چلی کہ لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ انہوں نے سوچا جہنم میں بہت آگ جلتی جھکتی ہے اس لیے تھوڑی آگ جہنم سے مانگ لی جائے۔ لیکن جب

انہوں نے اہل جنم سے آگے کی فرمائش کی تو جنم سے جواب آیا کہ ادھر قانون آگے نہیں ہوتی۔ ادھر جولوگ آتے ہیں وہ اپنی آگے ساتھ لے آتے ہیں۔

تو ایسی ہی آگے شاعروں اور ادیبوں کے سینوں میں بھتی ہے۔ یہ آگ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ اس آگ کو اسلے کرتے۔ یہ شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے۔ یہ آگ کی منہی قوتوں کے اندر ہے۔ میں شعور کی آگ کے فخر زمان کی صورت میں بھتی ہے آج ہم سب بھی اپنی اپنی آگ کے سینوں میں لے کر ان کی آگ کا استقبال کرنے کے لیے آتے ہیں۔

میرے لیے یہ بڑا اعزاز کی بات تھی۔ میں تو ویسے ہی امرتا پریتم جیسی بڑی شخصیت کے ساتھ سچ پر بیٹھا فخر محسوس کر رہا تھا۔

دہلی میں امروز اور امرتا جی کے ساتھ شہر میں بھی گھوما۔ امرتا پریتم پچھلے پہر آرام کرتی تھیں۔ ہم شام کو بیٹھ جاتے تھے پھر باتیں شروع ہو جاتیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر ہوتا۔ میرے اسرار پر وہ کوئی نئی نظم سناتی ارشیوں منڈوں مسوئیوں اور درویشوں کے حوالے سے اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں ایک دو ڈاکومنٹریز دکھائیں جو بہت ہی خوبصورت بنی ہوئی تھیں۔ میرا مطلب ہے تین دن میرے لیے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ بالکل جیسے آپ اپنے Parents کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح امرتا جی وہ پہر کا کھانا پکا رہی ہیں ر دنیاں بنا رہی ہیں امروز وہیں باورچی خانے میں میز پر روٹیاں رکھ رہے سالن رکھ رہا ہے۔ کبھی امروز چائے بنا رہا ہے۔ کبھی میں ہاتھ بنا رہا ہوں۔ مطلب یہ کہ بالکل اپنے گھر کے فرد کی طرح میں وہاں رہا۔ مجھے انہوں نے سونے کے لیے جو کمرہ دیا وہ ان کی لائبریری تھی اور جس میں بہت اہم کتابیں تھیں چنانچہ ان دنوں مجھے جو بھی وقت ملتا، میں صبح جلدی اٹھ جاتا اور کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔

میں نے کہا آج کل آپ شاعری بہت کم کر رہی ہیں اور آپ نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کی ہندی میں شاعری "کاغذ اور کیٹوس" شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا

"شاعری میں نے ویسے ہی بہت زیادہ نہیں کی۔ جب محسوس کرتی ہوں کہ شاعری کرنی چاہیے تب میں شاعری کرتی ہوں۔ میں کبھی زبردستی یا Conscious Effort نہیں کرتی کہ کوئی نظم

لکھوں۔ ہندی کی بہت ریڈر شپ ہے اس لیے ہندی میں لکھنا بھی ضروری ہے۔"

1987 سے اب تک میں کوئی چندرہ باران سے مل چکا ہوں۔ 1987 میں انہیں پنجاب یونیورسٹی نے

ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری اور اسی سال فرانس کی حکومت نے بھی انہیں اعزازی ڈگری سے نوازا۔ جب 1989 میں بمبئی کی ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی اور 1990 میں پنجابی اکیڈمی دہلی نے انہیں وارث شاہ ایوارڈ دیا۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب دی جس میں تین ہزار رائٹرز تھے۔ ان میں ”میں“ بھی شامل تھا۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے رائٹرز کے بارے میں اور ان کی تحریروں کے بارے میں لکھا اور اس کے بعد ایک ہندی کی کتاب دی جس میں ایک خاص چہرہ مجھ پر لکھا تھا۔ دو چار انگریزی میں آرٹیکل بھی میرے بارے میں لکھے۔ یہ سب باتیں میرے لیے بہت ہی بڑی باتیں ہیں۔ میرے کنبے کا مطلب یہ ہے کہ امرتا پرتم ایک بہت ہی عمدہ شخصیت تھیں۔ ایک بہت بڑی انسان فراخ دل اور امن کی پرچارک، محبت کی پیغامبر اور بہت ہی روشن خیال اور ترقی پسند نظریات کی حامل خاتون تھیں جس نے روایت کی اس طرح پاسداری نہیں کی جس طرح ہمارے ہاں روایتی کھوپہ (دلدل) میں لوگ دھسے ہوئے ہیں اور ساری زندگی ایک غلط اور جھوٹے قسم کے ڈسپلن کے تحت گزارتے ہیں۔

امرتا پرتم نے ساری زندگی ڈسپلن توڑے اور روایات سے بغاوت کی۔ اسی لیے زندگی میں انہیں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ زندگی میں انہیں امروز کی صورت میں اچھا رفیق دوست اور مسفر ملا۔ امروز سے ان کی پہلی ملاقات 1955 میں ہوئی اور دوسری 1960 میں شروع ہوئی اور 1964 میں وہ ایک ہو گئے۔ دونوں نے مل کر ”ناگ منی“ ماہنامہ پنجابی رسالہ نکالا اور اشاعت گھر بنایا۔ ”ناگ منی“ رسالہ 1966 میں شروع ہوا اور اپریل 2004 میں بند ہو گیا۔ ”ناگ منی“ کے حوالے سے میں نے امرتا پرتم اور امروز کو اکٹھے کام کرتے دیکھا۔ میٹر کا انتخاب امرتا کرتیں۔ پروف اور سیکچر امروز کی ذمہ داری تھی۔ یہ چھوٹا سا رسالہ بڑا معیاری اور پائیدار رہا۔ اس رسالے نے اپنا ایک پورا ٹروپ پیدا کیا جو اعلیٰ ادب تخلیق کر رہا تھا۔

ایک بات اور جوان میں سب سے اچھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ جس طرح ایک لکھنے والا ”ماٹیا“ ہوتا ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کی حوصلہ افزائی یہ سمجھ کر نہیں کرنی چاہیے کہ کل کو یہ ہمارے لیے چیلنج نہ بنے۔ اس طرح کا ایسا کوئی رویہ سامنے نہیں آیا۔ وہ بڑی فراخ دل تھیں۔ کوئی بھی لکھنے والا چاہے وہ پاکستان میں تھا یا ہندوستان میں تھا یا کہیں دوسرے دیس اور ملک کا اور زبان چاہے کوئی بھی لکھتا تھا۔ اچھا لکھنا ہی ان کی شرط تھی اور کی تعریف اور اس کے متعلق لکھنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔

اس طرح اچھا لکھنے والوں میں ایک حوصلہ پیدا کیا۔ امرتا پرتم ہمیشہ ایسی تحریروں کی تعریف کرتی

تھیں۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ صرف اپنے نام کے لیے یا شہرت کے لیے ہر کسی کی کتاب کا پیش لفظ ابتدائیہ یا رائے لکھ دی۔

میں نے جب بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی انہوں نے کہا میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ جب بھی مجھے موقع ملا میں ضرور پاکستان میں آؤں گی۔ میری یہ ہمیشہ سرت رسی کہ وہ پاکستان آئیں۔ میں جب بھی انہیں فون کرتا اور انہیں معلوم ہوتا کہ میرا فون ہے تو وہ فون ضرور سنتیں اور ہمیشہ پیار سے گفتگو کرتیں۔ میری عادت تھی کہ میں ہفتہ میں ایک بار فون ضرور کرتا تھا۔ چاہے ملک میں ہوں یا ملک سے باہر، ان کی خیریت ضرور دریافت کرتا۔ فون پر ہی وہ مجھے بتاتیں کہ میں نے فلاں کتاب پڑھی ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں بھی ملتی ہے ات لے کر پڑھو بڑی زبردست کتاب ہے۔

مجھے یاد ہے میری مرحوم بیوی و خوب صورت شاعرہ شائستہ حبیب اور ہمارا بیٹا فرخ جب ہندوستان گئے اور امرتا پریتم سے ملے۔ شائستہ ان سے پہلی بار مل رہی تھی۔ جب کہ انہوں نے اس کی شاعری کو اپنے رسالے میں بہت شائع کیا تھا کیوں کہ انہیں شائستہ کی شاعری بہت پسند تھی۔ انہوں نے شائستہ سے مل کر بہت سی باتیں کیں۔ عورتوں کے حوالے سے Male dominated society کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا۔ شائستہ بہت خوش تھی کیوں کہ ایک بڑی شاعر اس کی شاعری کے بارے میں اچھے کلمات کہہ رہی ہیں۔ ”سورج پر دستک“ اور پھر پنجابی شاعری ”میں کپاہ تے چائنی“ امرتا جی نے بیماری کے باوجود امروز سے پوری کتاب کی نقلیں سنیں۔ کیوں کہ امرتا پریتم پنجابی کا شاہ کھسی (فارسی) رسم الخط نہیں پڑھ سکتی تھیں۔

امرتا پریتم اور دیوندرنے مل کر میرا ایک انٹرویو لیا جو ”ماگ مٹی“ میں شائع کیا۔ امرتا پریتم کی ”آواز کی دنیا“ 1998 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی آل انڈیا ریڈیو اور پھر تقسیم کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی اور پھر آکاش دہلی سے وابستگی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتی ہے۔

فروری 2000 میں غسل خانے میں امرتا پریتم کا غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ 81 سال کی عمر میں ہڈی کا نوٹنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دو گھنٹے کا آپریشن پانچ گھنٹے میں مکمل ہوا۔ امرتا پریتم جہاں آئیں انہیں امید تھی کہ وہ پھر سے چلنے پھرنے لگیں گی۔ لیکن چند دنوں کے بعد دوبارہ ان کے پاؤں میں پھر سے تکلیف شروع ہوئی اور پھر اس کے بعد امرتا پریتم ہسپتال پر ہی رہیں۔ بدن میں یا ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ دوبارہ آپریشن ہوتا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اس لیے چند پھر نا اچھا نہیں ہوگا۔



ممنون نہیں رہا۔ میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا وہ بڑی آہستہ آہستہ باتیں کرتی تھیں اور جب میں محسوس کرتا کہ اب انہیں آرام کی ضرورت ہے تو میں واپس آ جاتا۔ ان دنوں ان کی عام طور پر ملاقاتیں بند تھیں۔ لیکن میں بسبب بھی، جی جاکر فون کرتا اور انہیں بتاتا تو وہ امر دز سے کہتیں "فخر سے کہو ابھی آ جاؤ" یہ ان کی خاص مہربانی تھی۔ ایسے ہی جب بھی میں نے لاہور سے فون کیا اور انہیں معلوم پڑا تو وہ فوراً فون سننے لگیں۔

ہم نے امرتا پر یتیم کے لیے ورلڈ جیانی کا ٹکڑے کی طرف سے Life time achievement award 2003 کا اعلان کیا۔ اگرچہ انہیں کسی ایوارڈ کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے ایک Gesture دیا۔ ہم نے ان کے لیے ایک شیلڈ بنائی محمود دت نے امرتا جی کی تصویر بنائی۔ وہ ہمارے بہت بڑے پیئرس ہیں۔ یہ بہت بڑی تقریب تھی۔ اس میں ہمارے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے امرتا جی کے لیے لکھ کر بول کر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر امرتا جی پر ایک ڈاکوسٹری فلم جو کہ باسو بھٹ چارہ نے بنائی تھی اٹھائی گئی۔ اس تقریب کی بڑی سٹائش ہوئی کہ انڈیا پاک بلکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی پنجابی ادبی شخصیت نوخیزان تھیں پیش کیا گیا ہے۔ میں نے فون پر اس ایوارڈ کے متعلق امرتا جی کو بتایا تو انہوں نے کہا میں تو تمہارے کہنے پر اڑ کر آ جاتی لیکن میں چارہ پائی سے اٹھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے اس ایوارڈ کی دلی خوشی اس لیے ہے کہ مجھے یہ ایوارڈ پاکستان میں دیا جا رہا ہے۔ جہاں میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، جوان ہوئی، شادی ہوئی، بچے ہوئے (امرتا جی کے دو بچے بی بی بی بی نداس اور بیٹا نورانی لاہور میں پیدا ہوئے) پورے اٹھائیس سال وہاں گزارے۔

مجھے ایک ہی حسرت ہمیشہ رہی کہ وہ پاکستان نہیں آ سکیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان آئیں اور ان کا اقامت نامہ دار استقبال ہو کہ لوگ یاد رکھیں کہ جتنی مہمان ادیبہ شاعرہ ہیں اتنا ہی عظیم ان کا استقبال ہوا۔ لیکن میرے بار بار اسرار کے باوجود انہوں نے کبھی لاہور آنے کا وعدہ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتیں "آچھا۔۔۔ میں دیکھوں گی۔ ٹھیک ہوئی تو آؤں گی۔" لیکن وہ لاہور نہ آ سکیں۔

بس یہ تک ہمیشہ میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔



چانن دی پهلکاری

## چائے کی پھلکاری

چائے کی پھلکاری تو پانچ بجے ہے

دیر والے آگے آگے رہیں  
چائے کی پھلکاری تو پانچ بجے ہے

اپنا دھماکا بوندی کے سر پہ نہ بھری  
دروازے اور پانچ بجے ہے

دیر بدمعاشوں کے راہ میں دے چلیں  
چائے کی پھلکاری تو پانچ بجے ہے

اپنے دلوں ساری ہست ہست ہے  
چائے کی پھلکاری تو پانچ بجے ہے

چائے کی پھلکاری تو پانچ بجے ہے

## امرتا پر یتم امروز۔۔ میں اور ناکمل کے روئے

• وہ روزِ امروز ہی نے ہوا اور آج کے بڑھ کر مجھ سے بغل کیہ ہو گئے۔ سرف ایک دن پہلے میں وہی پوچھا تھا اور بولیں سے امرتاتی کو فون کیا تھا۔

”تم سید جسے ہمارے ہاں بیوی نہیں آئے؟“ راستے میں کہاں اور بیویوں انکے کئے؟“  
امرتاتی نے فون پر ہنسی کا اظہار کیا تھا۔

”مجھے سید صاحب آپ کے پاس آتا تھا انہیں پاکستان سے روانہ ہوتے وقت کسی نے بتایا کہ آپ انڈیا سے باہر نکلے ہوئی ہیں اس لیے سوچا بولیں کون سے پہلے آپ کے بارے میں معلوم کروں گا۔“  
”اپنی تو اب سامان لے کر آ جاؤ۔“

اور اب امروز ہی ایک باتھ سے میری انتہی چارے ہوئے تھے دوسرے سے انہوں نے مجھے بغل میں لے رکھا تھا۔ ہمدردیوں کے اندر داخل ہوئے۔ میں تو جیسے کسی نشے سے مدہوش تھا۔ 1969 میں امرتاتی کا پیدا ہونا تھا اور آج چودہ برس بعد انہیں دیکھنے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ اس دن کا مجھے چودہ برس سے انتظار تھا۔ آج میں اپنی میری لے سامنے تھا۔ امروز ہی طرح بغل سے ہمارے اندر سے میں نے گئے۔ مجھے دیکھ کر امرتاتی اچھٹائی ہوئیں۔ بڑی اچھٹیت سے میرا ہاتھ دیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گئی تھیں۔ وہاں یوندر بھی بیٹھے تھے۔ یوندر زمین کی کہانیاں میں لے پاکستان میں پنجابی کے اور انہی رسم الخط سے اردو میں شائع کی تھیں۔ سب کو لے قاریں پر بیٹھے تھے یہ امرتاتی کی سنڈی تھی۔ کتابوں کی چار دیواری میں اپنے سید پر بیٹھی وہ بہت خوش دھانی دے رہی تھیں۔ یوندر نے ہاتھ میں پنجابی مانگا۔ ”جہاں“ کا امرتاتی پر تھم تھا۔

”جیسی تیار ہے مضمون کا تلف آ گیا۔ ابھی ابھی یوندر نے چار دیواری پر بات کی۔ تم نے وہی اوجھار لیں

رکھا۔ اور اس شمارے میں میرے کلام کا انتخاب بہت خوبصورت ہے ایک سیاسی نظر کا تخلیقی انتخاب۔“  
 میں ابھی تک جیسے کسی سحر میں گرفتار تھا۔ اسنے میں امروز گا سوں میں چائے بنا کر لے آئے۔ میں  
 نے تھوڑا سا حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا، گھر میں کوئی کام کرنے والی دکھائی نہ دی۔ امرتاجی کہنے لگیں۔  
 ”سناؤ سارا شگفتہ کا کیا حال ہے؟“

”بہت برا حال ہے اس کا“ چوتھی شادی اور طلاق کے بعد وہ بہت بیمار بننے لگی ہے۔“  
 ”لیکن اسنے تجھے کس لئے اسے کہنا ان تجربوں کو چھوڑ کر اپنے لیے جینے کی کوشش کرتے۔۔۔۔۔۔“  
 ”لیکن یہ سب چھوڑ دے، ہوش و حواس میں رہ کر نہیں کرتی۔ الیکٹریک شاک لگ لگ کر اس کی ذہنی اور  
 روحانی حالت تباہ ہو گئی ہے۔“

یہ سن کر امرتاجی چپ ہو گئیں۔ سارا ماحول چپ ہو گیا۔ کمرہ چپ ہو گیا۔ کتابیں چپ ہو گئیں۔ ہم  
 سب چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد امرتاجی بہت گہری آوازی میں کہنے لگیں۔  
 ”کمبخت بہت بڑھیا شاعرہ ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔“

امرتاجی نے بہت پیار اور احترام کے ساتھ سارا شگفتہ کی کتاب بلند۔۔۔ اکھر (سنگتے حروف) شائع  
 کی تھی اس وقت یہ کتاب پاکستان نہیں پہنچی تھی اس لیے امرتاجی ایک نسخہ اماری میں سے نکال کر لے آئیں۔  
 کتاب بہت خوبصورت شائع ہوئی تھی اتنی ہی خوبصورت جتنی خوبصورت کتابیں امرتاجی شائع کرتی تھیں۔  
 میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ امروز کہنے لگے۔

”یہ بلھے شاہ کی محبت کا انداز ہے۔“

”بلھے شاہ“ میں نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں بلھے شاہ کا تیار کیا کرتھا۔ ہند میں معلوم ہوا  
 کہ امرتاجی کے نئی نام ہیں اور ان میں سے ایک نام بلھے شاہ بھی ہے۔ دیوندر کہنے لگے۔  
 ”اوست ہم تو تمہیں دیکھے بغیر ہی عشق کرنے لگ گئے ہیں۔ تمہیں زندگی میں پہلی بار ابھی ملا  
 ہوں لیکن پیار تجھے برسوں سے کر رہا ہوں۔“

دیوندر کا لہجہ بہت جذباتی ہو گیا ہے۔ دیوندر ہمیشہ سے ایسا ہی ہے جس سے اس کی کہانیوں کے  
 حوالے سے جانتا تھا۔ اپنی تحریروں میں وہ اتنا ہی اپنا محسوس ہوا تھا۔ گھنٹوں تک ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ  
 دیکھ کر یہ ہوتے رہے چائے پیتے رہے باتیں کرتے رہے اور پتہ بھی نہ چلا کہ گھر کی میں سے نذر کمرات

ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہم سب اکٹھے امرتاجی کے ساتھ کچن میں گئے وہ کھانا نکال کر ہمارے سامنے لگانے لگیں۔ امرتاجی بھی کچن میں ہاتھ مار رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ چپاتی پکانے سے لے کر اپنے رسالے "ناگ منی" کے ایڈریس لکھنے تک امرتا امروز اپنا ہر کام خود کرتے ہیں۔ گھر میں ایک لڑکی نظر آئی لیکن اسے کام کرنے والی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس لڑکی کا انٹرویو میں نے "ناگ منی" میں پڑھا تھا۔ وہ اس وقت رات کو آ کر روٹیاں پکا جاتی تھی۔ ایک عورت آ کر کپڑے دھوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس گھر میں نوکر یا نوکرانی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ دو نتائج تھے جو میں نے اس گھر میں پہلے دن ہی اخذ کر لیے اور پھر اس دن سے لے کر وہاں اپنے پچاس دن قیام تک مجھے اپنے کسی نتیجے پر نظر ثانی نہیں کرنا پڑی لیکن میرے لیے اس گھر میں ابھی بہت ساری ملاقاتیں اور بہت ساری حیرانیاں پڑی تھیں اور وہ سب کچھ اتنا قیمتی اتنا سرشار کر دینے والا اتنا حیران کن تھا کہ وہ میرے دل میں ہی نہیں میرے ذہن میں بھی بیٹھ گیا۔ ایک سوچ بن کر ایک نکل بن کر۔

دوسری صبح ابھی میں سویا ہوا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے سر کے بالوں کو چھو کر کہا "احمد سلیم چائے پی لو۔"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ امروز چائے کا گلاس لے کر میرے پاس کھڑے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسا کہ جیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو میں ساری زندگی Idealise کرتا رہا ہوں وہ مجھے یوں شرمندہ کریں۔

آج دوسرا دن تھا۔ مجھے یاد نہ رہا کہ امروز جی نے کتنی بار مجھے چائے بنا کر پلائی تھی۔ ان انگلیوں کے لمس سے یہ گھر ایک میوزیم بن گیا ہے۔ ایک آرٹ گیلری اور ان آنکھوں کے لمس سے میرے دل کی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ یہ کیسی اٹھیاں ہیں جو چائے بھی اسی پیار کے ساتھ بناتی ہیں جس پیار سے تصویر بناتی ہیں۔ میں اپنا کا اس الٹا کران کے پیچھے پیچھے امرتاجی کے کمرے میں آ گیا۔ دوسرا گلاس انہوں نے امرتاجی کو پلازیا اور تیسرے گلاس کے لیے پین کی طرف چل پڑا۔ ہم تینوں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

میں نے کہا "پاکستان میں کون یقین کرے گا کہ آپ نے مجھے اتنا پیارا اتنی عزت دی تھی" امروز نے بے لگائی پیار یقین دلانے کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ بس ہوتا ہے ایک شعور کی طرح "ایک نظر کی طرح۔۔۔۔۔"

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ آج تک سنا تھا پیارا نہ ہا ہوتا ہے اس کی آنکھیں نہیں

روتیں۔ اور امر و زہری ہر بات تھے۔۔۔

پھر میں نے امر و زہری کی طرف دیکھا۔ وہ پیاسے کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”نظر کا مطلب اندر کی نظر سے ہے۔ تجھے میں نے کل پہلی بار دیکھا۔ لیکن کیا کچھ پہلی بار دیکھا

ہے؟“ کیا رکھی اپنی ایک نظر بونی ہے۔۔۔۔۔

نیا دھوکہ دیا ہے۔ بدلہ میں نے اپنے میکے پہ۔ اگلے اور امر و زہری سے پوچھا ”یہاں

”اندرونی کس طرف ہے؟“

”اندرونی کی یہ بات درست ہے۔ میرے پیسے پانی میں ڈال دیے۔ اس نے اسے دے دیا تو

دوسرے پہاڑوں کے ساتھ ان دھوکے کی۔“ اندرونی یہاں بات یہ کہ وہ اس کا شوق ہے۔

”کوئی بات نہیں۔ ساری کے لئے اس نے بھی حق باتیں کہی۔“

میرے باتیں امر و زہری نے اور پھونکنا اور اندرونی دھوکے کے لیے میرے ساتھ چل پڑے۔

”اندرونی والے نے رسید بنائی تو میں حیران رہ گیا۔۔۔“ پوچھیں روپیہ۔

امرو زہری نے اس پر۔ ”تجھے جانتا تھا اندرونی یہاں امیر لوگوں کا شوق ہے۔“

امرو زہری نے اسے دیا۔ اس نے آ رہے تھے پیسوں کی پیروی باتیں۔ کوئی فائدہ نہیں تھا ان میں اس

لیے وہ اتنی پیار کی اتنی سیدھی اور سچی باتیں تھیں۔

”بندے کو اپنے کام کا منہ نہ کرے چاہیے۔ کسی دوسرے بندے سے خدمت لینا برا تو ہے۔“

لیکن اس کے علاوہ اپنی کسی بھی نہیں بولی۔ لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ پانی، اچھی بھی تمہو نہیں بنا سکتے۔

واپس پر میں نے امر و زہری سے کہا کہ ان کا پوچھنا تھا کہ انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ ہم کچھ واپس

آئے۔

امرو زہری و چند روز میں پانچ چھ بات کے لیے جوں جوں بنا تھا۔ کسی اور بات میں فرانس سے

تو نصیحت کے لئے امر و زہری پہلے گئے۔ میں امر و زہری کے پاس بیٹھ گیا۔ پاکستان کے بارے میں اور

پاکستانی دوستوں کے بارے میں باتیں ہوئے تھیں۔ آخر زمان مظلوم، قضا، یا اسرار اللہ، یا اسرار اللہ، یا اسرار

اللہ سے فرانس امر و زہری پر۔ بندہ پانی ہو جاتی تھیں۔ میں نے کہا ”آپ سے ایک بات کی تعمیری کرنی

ہے۔“

”کون سی بات؟“

”سارا حسب بندوستان آئی تھی تو آپ نے سارا کے ہارے میں ”ٹائٹ مٹی“ میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ اس میں ہمیں ”ایب کا فخر ہے اس کا نام یہ ہے۔“

”بھئی یوں ہوا کہ سارا اردو کے ایک افسانہ نگار ابرار علی مین رائے کے ٹھہری تھی۔ ایک رات حسب ”ایب“ کے یونی نے سوئے تو وہ سارا کے کمرے میں آیا۔ سارا بھی اسے ”میں خوش ہوئی“ اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

”تھوڑی دیر بعد حسب نے سارا سے پوچھا ”تم نے منگونی کہانی“ کاں شعور اپنے پاس ہے؟“

”ہی نہیں ہے“ سارا نے جواب دیا۔

”تم نے اس کی کہانی ”سند کوشت“ بھی پڑھی ہے؟“

”ہی وہ بھی پڑھی ہوئی ہے۔“

یہ سن کر وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور کہنے لگا ”آئی لو۔“

سارا یہ سن کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی اور کہنے لگی ”ہی میں نے منگونی یہ کہانی نہیں پڑھی“ اس نے ہماری شاہ جہاں سارا کے ہاتھ دے دی۔

ایسا لگتا تھا کہ میں تمام دن سارا کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہوں تو امرتاتی خوش خوش بنتی۔ میں نے باتوں کے دوران وہ اداں اور مہذبہ بنیں ”میں پڑھتی ہوں اسے یہاں ہی ہمیشہ کے لیے پارلوں و دیہاں مڑے سے رہتے اور شعر لکھتے۔“

میں نے کہا ”چوتھی شادی اور خلاق سے اس پر قیامت ٹھہری ہے“ اولی اور یونی تو یہ سب پتھر برداشت نہ کر سکتی۔

”شریخ آدمی اقم کا ہے ہی۔۔۔“ ہوائی کے مارے سے یہ سارا کے متعلق اور اس کے دل سے بارے میں ایک قصوں کیوں نہیں کہہ رہے۔“

میں دھماکے سے کہنے لگیں ”مطل یہ تھی کہ مجھے ورکھی رسم الخٹہ میں لکھیں نہیں آتا تھا اور امرتاتی وارہ پر بھی نہیں آتی تھی۔ آخر یہ سنے پایا کہ پنجابی کے سپہ میں قادی رسم الخٹہ میں لکھوں گا اور پھر امرتاتی سے سامنے ہوتا ہوں گا اور امرتاتی اسے ورکھی رسم الخٹہ میں لکھیں گی۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی



تھی کہ میں امرتاجی کو ڈکٹیف کراؤں گا۔ وہ اتنی سینئر اور عالمی شہرت رکھنے والی شاعرہ ادیبہ اور میں۔۔۔۔۔  
میری بات سن کر امرتاجی ہنس پڑیں اور کہنے لگیں۔۔۔۔۔ ”کچھ نہیں۔ ناگ منی کے کام ایسے ہی  
ہوتے ہیں۔“

اس دن کی ڈاک میں پاکستان سے دو چیزیں آئیں۔ ایک پنجابی ماہنامہ ”لہراں“ کا نیا شمارہ تھا  
جس کے ادارے میں ایڈیٹر نے امرتا پر یتیم نمبر کی اشاعت کے بارے میں معذرت خواہی کا انداز اپنایا ہوا تھا  
اور دوسری چیز ۱۱ ہور کے ایک اخبار کی کٹنگ تھی۔۔۔۔۔ یہ شہباز ملک کا مضمون تھا جس میں اس نے لہراں کے امرتا  
پر یتیم نمبر کے حوالے سے مجھے اور امرتاجی کو گالیاں دی تھیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر بلکہ سن کر امرتاجی اداس ہو گئیں۔  
اداسی کی بات یہ نہیں کہ گالیاں چھپی ہیں اداسی کی بات یہ ہے کہ شہباز ملک اگر میرے بارے میں  
ایسا سوچتا ہے تو یہاں مجھے ملنے کیوں آیا تھا؟ اس نے بڑی عزت۔۔۔۔۔ سے مجھے اپنی کتابیں ”آئوٹراف“ کے  
ساتھ پیش کی تھیں۔ میں نے بڑی عزت سے۔۔۔۔۔ ”ناگ منی“ کے لیے اس کا انٹرویو کیا اور شائع کیا لیکن وہاں  
واپس جا کر۔۔۔۔۔

مجھے اس دن معلوم ہوا کہ امرتاجی نے شہباز ملک کو میرے لیے ”ناگ منی“ کی ایک سال کی فائل  
بھی بھیجی تھی وہ مجھے آج تک نہیں ملی۔

اداسی کے یہ لمحات گہرے اور طویل ہو گئے۔ امرتاجی کا کہنا تھا ”آخر حسین اختر نے میرے  
بارے میں نمبر شائع کر کے پچھتاہٹا ہی تھا تو پھر اتنی جگہ دو کی کیا ضرورت تھی۔“

انہی دنوں امرتاجی کچھ فرقہ پرست اور کٹر سکھوں کی طرف سے دھمکا دیا ہوا ایک مقدمہ بھگت رہی  
تھیں جو ایک پنجابی اخبار کے ایڈیٹر نے ان کی نظم ”ماتا ترپتی“ کے نو سپنے“ اور چند دوسری نظموں پر کیا تھا۔ انہوں  
نے الزام لگایا تھا کہ امرتاجی نے سکھ دھرم اور گورو نانک جی کی توہین کی ہے۔

یہ سن کر مجھے وہ سارے الزام یاد آ گئے جو یہاں ہمارے اوپر لگائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا ”سکھ  
تو ہم جلد ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہیں۔ اس لیے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔“

بہت جلد ہی اسی میں امرتاجی اپنی ایک نئی سطر گنتا نے لکھیں ”میں تے نانک دل کے روئے۔“  
میں نے سوچا ایسا مضمرہ لکھنے والی شاعرہ گورو نانک کی توہین کیسے کر سکتی ہے۔

چند دن بعد کی بات ہے پنجابی کے افسانہ نگار اور انگریزی کے اعلیٰ پایہ کے صحافی راج گل کے ساتھ

ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے انہوں کا بیان پڑھنے کے لیے دیا جس میں امرتاتی کی بھرپور نمائندگی کی گئی تھی۔  
میں نے کہا ”ایک بڑے ادیب کے دستخط رو گئے ہیں۔“

”کون سے ادیب کے؟“ راج کل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”گورو نانک جی کے“ میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

یہ بات سب بعد میں امرتاتی سے کہی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تیس سال کی لڑکیوں کے فون آئے جو مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ پندرہویں سال کے فون ایسے تھے کہ خود  
جان کر ان سے ملا جائے۔ اس دن یوندر پھر آ گئے اور ہم سب گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ اس دن یہ تک فیض  
صاحب کی باتیں ہوتی رہیں اور ختم ہو میں تو گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی کام کرنے والی  
چائے بنا کر لے آتی، کبھی امرتاتی گھر کے پچھلے حصے میں امرتاتی کا بیٹا نراج اور بہو رہتے تھے۔ ایک حصے  
میں ان کی بیٹی بی بی ہاں تھی۔ امرتاتی ان سب میں اس قدر Involve ہو جاتیں کہ محسوس ہوتا ان کا لپٹنے  
پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں اب اس وہ ایک عام سی عورت ہیں۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی  
نچھپائیاں کام اور آرت کی خوبصورتی ساتھ ساتھ جیسے چل سکتے ہیں۔ وہ اپنے تمام کام خود کرتی تھیں۔ ان  
اچانک سے ساتھ لکھتی اور پڑھتی تھیں۔ میں نے کئی ادیب یا شاعر کی تحریروں اور نئی زندگی سے تباہوں کا ایک  
دور سے کہہ اتنا قریب کبھی نہیں دیکھا۔ ان دن سب ای کام کے لیے میں اور امرا بازار جانے سے بے گھر  
سے نکلے تو یہی باتیں شروع ہوئیں۔

میں نے کہا ”آرت اور زندگی میں اس قدر ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔۔۔؟“

”ہمارے آرت اور ہماری زندگی میں کوئی فاصلہ نہیں۔ یہ فاصلہ ہے جو زندگی کو اور فوکارے فون کو علیحدہ  
علیحدہ خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔“

امرا ذاتی کوشش مجھے بہت اچھا لگنے لگا تھا اس لیے ہر وقت میں ان سے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش  
رہتا۔ انہوں نے کتنی خوبصورت بات کی تھی۔۔۔ یہ فاصلہ ہے جو زندگی اور آرت کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم  
کر دیتا ہے۔ جلا اور کوئی بندوبست اس طرح بہہ سکتا تھا؟

ایک بار ہونٹ گاڑی کی تحریروں کی بات ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی سائنس مری میں ایک ایکٹس کا  
ڈاٹر پڑے پڑے کر لیا تھا۔ ایک آرٹسٹ کے گھر میں ایک تقریب میں ایک ایکٹس لڑکی نے مسرور

سے فرماش کی کہ اس سے کمر کھینی ہوئی ایک پینٹنگ اسے دکھائی جائے۔

منصور نے کہا کہ اسے وہاں پر لٹا کر جہاں چنگھی سے وہاں سے نکلی چلی کر پینٹنگ تک جائے اور پینٹنگ اتار کے اسی حالت میں اپنی جگہ واپس آجائے تو پینٹنگ اس کی ہو جائے گی۔ نہ جانے دل کے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس لڑکی نے ایسا ہی کیا اور پینٹنگ حاصل کر لی۔

اس سارے واقعہ و ہولت کا رتی سے بڑے مزے لے لے کر رہی جو مجھے آپس لڑکیں جاہ میں نے دیکھا اور اسے اس کا ذکر یہ تو دلہنہ لے۔

کاری اور امرتا کی تھریوں میں یہی توفیق ہے۔ کاری کا پس پھرتا ہے تو آپ وہں میں بھی ایک عورت کو رہنے کو دیتا ہے۔ امرتا کا پس پھرتا ہے تو وہ ایک بڑی عورت کو بھی پناہ میں دھاتا چاہتی ہے یہ تو امرتا واس کے دل کا اور اپنی طرف کھینچتا ہے۔

ایک بار عورت اور مرد کے رشتے کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ میں نے امرتا سے پوچھا کہ بات ہو کر باتیں کرتے پوچھا۔

”آپ کے اور امرتا کی کے رشتے میں یہ جو خوبنوی یہ جو جو کڑن مہا اس کی کیا ہے؟“  
 ”اگر کے رشتے میں عورت اور مرد کا رشتہ رات کے بارے کا تو اپنے ان سے ان میں پھلتی ہے تو ان کے رشتے میں وہاں کا اجاڑا ہے۔ جب تک عورت اور مرد کے رشتے میں وہاں کا رشتہ ہی نہیں ہوتا یہ رشتہ مغلوب بنیادوں پر چلا نہیں ہو سکتا۔“

امرد میری چیولی چیولی سے رتوں کا خیال ہی نہیں رہتا تھے بعد مجھے انوں سے عورت عورت بھی میری مدد کرتے تھے۔ مجھے کسی کا فون نمبر کسی کا ایڈریس اور کارڈ ہوتا اس کے جہاں جاتا ہوتا وہاں پہنچنے کا سوال ہوتا وہی طرح میری مدد کرتے تھے جیسے دوسرے وجود کا حصہ بن گئے ہوں۔

ابھی مجھے ان کے کمر آئے چوتھوں ہی ہوا تھا اور میں نے انی ہندوں سے فون پر بات کر لی تھی۔ ایک دوسرے تو طش بھی پھٹا تھا۔

امردا کی کارڈ کا سوال تھا کہ دوسرے سویرے اچھا کرنا کتنی کے وقت میں ہوا ہی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ہوا تھا پچھلے دن کی بات دہکتی تھی۔ ”کام کتنی کے مسو کے درست رہیں۔ ابھی کبھی خطوط کے جواب دہکتی تھیں۔ ان کو ان کو دیا وہ خط اس وقت لے لے لے میں آتے تھے جو ان کی غمگوں کے بارے میں ان

یہ امر یہ کیا تھا۔ تو کوئی ٹوس فی انٹیمس ڈراما بھی پروا نہیں تھی لیکن جو اخبار ان کے بارے میں روزانہ ندری  
 اچھا لگا کرتے پر کارکنی بارہ وہ اس ہو جاتیں۔ ایک بار اس اخبار کے نکلنے کو امر کا پرتھر کے ٹھکوں سے ملتا ہے  
 کے سامنے سر جیو کا دیا ہے اور معافی مانگ لی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ امر کا اتنی وقرب سے نہیں  
 جانتے تھے انھوں نے بھی اخبار کے اس پرائیمنڈ انٹرنیشنل جسک پہنا۔ ان کی کتابوں کے عام قاری و اخباری  
 اس اطلاع پر متباہ نہیں تھا۔ ایک بار ان کو آیا کہنے والے کا کہنا ہے کہ بد باقی تھیں ان میں ایک کہ انھیں بھی  
 ہوا تھا۔ ان کے من میں تھا۔

”یہی ان کے بھی آپ کی ولی تحریر پر بھی سنا وہ ان بات پر یقین نہیں رہتا کہ آپ معافی  
 بھی مانگ سکتی ہیں۔ جی ہاں۔“ انھوں نے آگے کہہ کر کہہ دیا تھا۔ ”لیکن میں جوں کا تو پا پیٹا ہوں  
 ہندوستان میں ہی نہیں پاکستان میں بھی ہو رہا تھا۔“

اس کے بعد امر کا پرتھر نہیں کے بارے میں شہباز ملک نے ایک اخبار میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں  
 تھا۔ ان میں ان کے ہندوستان کے رہنے والے ایتنی ہی جتن بھی شاعر کی تھی جس کی شاعر کی تھی  
 ”اس پر پرتھر معافی کے لیے آیا۔“

معافی مانگنے پر پرتھر نے صرف اسے صرف کر دیا ہے۔ ”خوشنات غورہ شاعر کی ویرا اور پرتھر  
 ان کے (خوشنات غورہ) استمولی کی تھی وہ خوشنات غورہ کے قریب سے تھی۔“  
 معروف میں فی خوشنات غورہ راج سب کے شاعر کی ویرا اور پرتھر میں ایک اور  
 کے لیے وہ استولی کے خوشنات غورہ کے پرتھر کی ایک شاعرہ لکھ پرتھر کے معافی مانگ  
 کے لیے اسے معافی کر دیا ہے۔“

ان کے بعد ایک اخبار شہباز ملک کے نواسے سے پاکستان میں بھی آئے ہمارے ہمارے شہباز ملک ہے  
 معافی بھی کہ وہ امر کا پرتھر خوشنات غورہ پر اس کے کہاتے ملا وہ دیکھنے کے بھجوانے کے ذریعہ تھی۔ شاعر  
 کے ہاں کے تھیں انھوں نے بھی اور شاعر کی تھی۔ وہ امر کے ہمارے شاعر کے لیے بغیر دیوی کی طرح روزی  
 کے لیے وہ لکھ پرتھر کے امر کا پرتھر نے اپنی تحریروں میں لکھی ہے۔“

میں نے یہ لکھ پرتھر آپ کو دیکھنے شاعر کا ہے یوں دیکھنے والے پرتھر کے لیے تھیں۔ ان  
 نے شاعر کے ہاتھ کے ہاتھ آپ کی لوگوں کے دامن میں تھیں۔“

میں نے انہیں بتایا "جب پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم اے پنجابی کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ڈیپارٹمنٹ کے پہلے چیئر مین ڈاکٹر وحید قریشی نے بلھے شاہ کو نصاب میں شامل نہ کیا۔ جب پنجابی کے چند سیانے اویسوں نے اس بارے میں احتجاج کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر بلھے شاہ کو نصاب میں شامل کیا تو نوجوان لڑکے لڑکیوں میں فحاشی پھیلے گی اور خدشہ ہے کہیں وہ بے دین اور ملحد نہ ہو جائیں۔۔۔

"سن لو بلھے شاہ! امروز امر تاجی کو کہتے تھے۔

ان دنوں امر تاجی کے خلاف قانونی نوٹس کے بارے میں بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ امروز کے نام ایک خط میں "ناگ منی" کے ایک قاری پورن سنگھ نے پوچھا تھا۔

"یہ جو اخباروں میں لکھا جا رہا ہے اس کے بارے میں امر تاجی کیسا سوچتی ہیں۔"

مجھے یاد ہے امروز نے ناگ منی میں جواب شائع کیا "تمہارے طویل خط کے جواب میں بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ امر تاجی بات پر حیران ہیں کہ لفظ آدر (عزت) کے معنی ان آدر (بے عزت) کب سے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔؟"

یہ سب سیاست تھی، گھنیا سیاست اسی لیے ناگ منی میں کبھی سیاستدانوں کے انٹرویو شائع نہیں ہوئے۔

ایک سوال کے جواب میں ایک بار امر تاجی نے کہا تھا "سیاستدانوں کے انٹرویو میں اس لیے نہیں شائع کرتی کہ ان کی فلم میں "کلوز اپ" نہیں ہوتا۔"

مجھے دہلی آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ امر تاجی چار پانچ دن کے لیے ایک بین الاقوامی ادبی تقریب کے لیے پیس جا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا امر تسر اور جالندھر کا چکر لگاؤں۔ بھلا امر تسر سے لاہور کا فاصلہ ہی کیا ہے؟ بالکل قریب۔۔۔ اب تک دہلی میں کتنے ہی لوگوں سے ملاقات ہو چکی تھی امر تاجی کے گھر کوئی نہ کوئی آیا رہتا تھا۔

دہلی کے نوجوان پنجابی ادیب ہندی ادیب، بمبئی سے، کلکتے سے، پنجاب سے، پیرس سے، صوفیہ سے، ماسکو لندن، لاہور اور کراچی سے، دنیا کے تمام شہروں کے تمام راستے یہاں آ کر ایک دوسرے میں مل جاتے تھے اور وہاں ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ چند لوگ جو وہاں نہیں آئے تھے۔ ان سے امروز جی ساتھ جا کر میری ملاقات کروا آئے تھے۔

بھارت نامہ نامہ وائس رائل مان سنگھ پنجابی کے ادیب اور انگریزی کے جرنلسٹ راج گل اور مورتوں کے میگزین "منوٹی" کی ایڈیٹر مدھو کشور سے امروز خود جا کر مجھے ملوا لائے تھے۔ بلونت گارگی اور اجیت کور دہلی میں نہیں تھیں۔ رشم اور نگین گل سے ملاقات ہو چکی تھی۔

امرتا جی کے پیس جانے سے پہلے ہی میں نے "ناگ منی" کے لیے پاکستان کے پنجابی ادیب کا خاص شمارہ ایڈٹ کر دیا تھا۔ مجھے گورکھی رسم الخط لکھنا نہیں آتا اس لیے امرتا جی نے رشم کو ذمہ داری سونپ دی کہ وہ مجھ سے ڈیٹیشن لے کر مسودہ گورکھی رسم الخط میں تحریر کر دے۔ جس شام امرتا جی پیس جا رہی تھیں اس سے ایک رات پہلے رشم میرے ساتھ بیٹھ کر پاکستان کے بارے میں "ناگ منی" کے خاص شمارے کے لیے نظمیں فارسی رسم الخط سے گورکھی رسم الخط میں تبدیل کر رہی تھیں۔ جب وہ ثروت سلطانہ کی نظم "یقین ایک سوالیہ نشان" کی پہلی این "میں منی کو نہ جانتی ہوں" لکھ رہی تھی تو کھٹکھٹا کر بفس پڑی۔ ہتے ہتے کہنے لگی "کیا ضرورت ہے اس پاگل پن کی۔۔۔؟"

میں نے کہا "کہا رہا ہوں جو ہوئی۔"

رشم نے جب آگے نظم پڑھی تو ایک این تھی "میں پسے ہوئی رہی ہوں۔۔۔"

یہ سطر پڑھ کر وہ اور زور سے ہتے ہوئے کہنے لگی "سالی جواہری پسے ہوئی رہی کسی کا پسنا نہ بنی۔"

نظم کی آخری سطر تک پہنچتے ہوئے بھی رشم نہ رتی۔ امرتا اور امروز دوسرے کمرے میں تھے۔ بعد میں جب انہیں رشم کی فہمی اور ساری بات کا علم ہوا تو امرتا جی کہنے لگیں۔

"میں نے جب ساحر کو بتایا کہ ایک دن جب امروز تمہاری کتاب "میں پسے ہوتا ہوں" کا مکمل شمارہ تھا تو کہتے کہا "سااا اپنے ہوتا ہے۔ کسی کا پسنا نہیں ہوتا" تب اس وقت ساحر نے بفس کر کہا "امروز تمہیک کہتا ہے۔ میں کبیر کی اولاد میں سے ہوں اس لیے ساری عمر ہوتا ہی رہا ہوں۔"

اور امرتا جی کی یہ بات سن کر میں نے کہا "پھر تو ثروت سے پوچھنا چاہیے کہ ساحر کی طرح وہ بھی

نہیں کبیر کی اولاد میں سے تو نہیں۔"

اگلی شام امرتا جی پیس روانہ ہو گئیں اور میں پنجاب کی طرف۔۔۔ جالندھر میں ہرجیت کے گھر ٹھہرا جس کے ساتھ دہلی میں امرتا جی کے گھر ملاقات ہو چکی تھی وہ جالندھر میں فی وی پروڈیوسر تھے۔ وہیں منی بیت کو انہ چند ہی روز سے ملنے آئیں۔ میں جس دن وہی پہنچا اس رات امرتا جی پیس سے واپس آ رہی تھیں

میں اور امروز انہیں ایئر پورٹ لینے گئے۔ ہم نے گیلری میں سے دیکھا امرتا جی کا ایک بازو بندھا ہوا ہے۔  
 امروز یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ کوئی حادثہ؟

ہاں، آٹھ پیش آیا تھا۔ 24 جون کو وہ پیرس پہنچی تھیں۔ 26 جون کی دوپہر وہ پیرس کی ایک سڑک  
 پار کرتے ہوئے گر پڑیں جس سے ان کی دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ ہسپتال اور ہٹوں میں پڑی دردت  
 تپتی رہیں۔ اسی حالت میں Pain Killer کھلا کر جب اخباری نمائندوں نے امرتا جی کا انٹرویو کیا تو ایک  
 اخباری نمائندے نے اسی مادہ شائع ہوئی ان کی چھ سات لکھوں کا ترجمہ لکھا تو کہا۔

"Madame! you are the first person to break the barrier  
 of two cultures "

امرتا جی دردی کو لیاں کھا کر جی درد سے تڑپ رہی تھیں۔

"I suppose to break the barriers of two cultures, one has  
 to break one's bones ..."













امرتا پرتم اول خانہ کے ساتھ



اس کا پہلا ستم اور ماہی راگ کا گیت









امریکی پتہ اور ہوائی اڈا کے سامنے



امریکی پتہ اور ہوائی اڈا کے سامنے



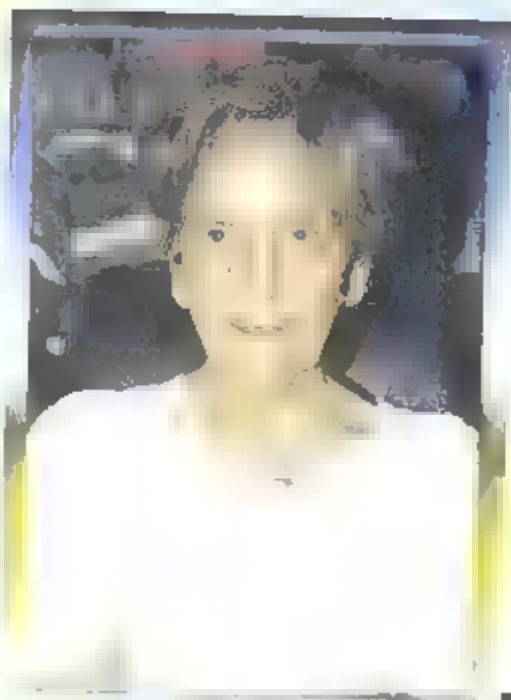




Janet & John



Janet, John & Jane



ایک بے چین رُوح۔۔۔۔۔ امرتاپریتم

اس کا پرچم خلیفہ امویہ میں اس کا پرچم ممتاز شاعر دہلی۔ اپنا پرچا یا ولی بھی ان کا نہیں لڑتا۔ انہیں بہت پہچان ملی۔ انہیں سہا کیا اور ان کت ایوارڈ بھی ملے۔ ان کی نئی کہانیوں کا دہلیوں پر جرات میں فہمیں بھی نہیں۔ ان کی ایک نظم جوان کی تعریف کا اسد فرید بن علی پاکستان میں سیف الدین سیف نے اچھی قسم "اکبر کا پرچم" میں استعمال کی۔

ایک آنکھیں دانت شوہر توں

آب و تاب

یہ نظم ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کے وقت جو کشت و خون ہوا جس میں ہندو مسلمان اور  
 مونی مونی ہوئی ہوا۔۔۔ چھو مارے گئے کئی شہید ہوا۔۔۔ امرتا پریتم نے انہی سب شہادت ذہنوں میں سب سے  
 اور سب سے رکی میں مدد دی مونی نظم ہے۔۔۔

امرا پر قہم اپنی ساری عظمت کے باوجود او تمیں چھتے یوں تھے پچھی رہیں جولان کی شخصیت کا حسن تو تھا  
نکراس سے انکیس فائدو کم اور نقصان زیادہ ہوا یہ میری ذاتی رائے ہے۔۔۔ نثار اور عتہ چین اس سے مانیں

بانی مانیں۔

اس کا پرہیزم نے اپنی زندگی اپنی شاعری کا آغاز اور سوتے یہ تھا۔۔۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ہی کو بھی شاعری کریں۔۔۔ یوں وہ ریڈیو سٹیشن پر بھی جانے لگے۔۔۔ ایک مہر زکھرا نے کی نہایت خوبصورت نثری (خاتون) دنوں میں شہرِ نیر اور پھر سارے ملک کا تذکرہ بن گئیں۔۔۔ رات کی حسین بڑھتی ہوئی غنیمتوں اور علم و ادب (فنونِ ایتھ) سے بھی تعلق ہو تو وہ دوسرے فنکاروں بن جاتی ہے اور ان کے (ایک طرف) پیارے والوں (اور ساتھ ساتھ کتنا کام کرنے والے ماحول) کا بھی ایک مجموعہ انسا ہو جاتا ہے۔ اس کا پرہیزم اس کے پاس سے خوش اسلوبی سے بچتی رہیں لیکن دل تو عورت کا دھڑکتا اور مچلتا ہے۔

ان کی شاہی معماری ہی میں ہوئی تھی اور پھر دو بچے بھی پیدا ہو گئے۔ اس عرصے میں جن محبتوں نے شدت اختیار کی اور جن کی حدت نے امرتا پر تم کو بھی بے گل کیا وہ بے گلی عمر بھران کے ساتھ چلی رہی۔۔۔ پہلے نمبر پر ساحر ندھیا نونی ہیں جنہوں نے نہ صرف امرتا بلکہ ساحر کی بھی زندگی اٹھل پھل کر دی۔ انہی دنوں کا ایک نام بڑا کاسٹریڈیو کے افسر اور پنجابی لکھاری سجاد حیدر بھی ہے۔۔۔ امرتا بیک وقت ساحر سے اور سجاد حیدر سے کیسے پیار کرتی رہیں اور کچھ کڑی دوستی کو بھی (چھوڑ دیتے) بھٹکتے رہا۔۔۔ یہ دلچسپ سوال اور انوکھی صورت حال ہے۔۔۔

یہ مفروضہ غلط ہے۔۔۔ "عورت صرف ایک دفعہ ہی پیار کرتی ہے۔۔۔" کیا عورت کے جذبات نہیں ہوتے۔۔۔ کیا اس کی پسند ناپسند نہیں ہوتی؟ کیا اس کی زندگی میں کمزور (اور دل پذیر) لمحے نہیں آ سکتے؟ یہ ساری باتیں فلسفے سے پر کھنے کی نہیں زندگی میں ڈوب کر جاننے کی ہیں۔

امرتا پر تم کو بظاہر اپنے پتی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔۔۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے پر تم شکھ سے محمدی کے باوجود انہوں نے بعد عمر کے آخری حصے میں جب وہ بیمار ہو گیا تو امرتا اور ان کے مشتہ کے بیٹے نوراج کے کہنے پر وہ امرتا ہی کے گھر پر رہا اور امرتا اس کی دیکھ بھال بھی کرتی رہیں۔۔۔

باتیرو میں بے چین ہوتی ہیں۔۔۔ وہ خود کو جاننے نہ جاننے اور چھ ماننے نہ ماننے میں ساری دنیا کی تباہی میں۔ پتی دوتا اپنی جد۔۔۔ دل کا کہنا اپنی جگہ۔۔۔ ساحران کی زندگی ہی نہیں آتما میں بھی رچ بس آیا تھا۔۔۔ لیکن ایک انظر اب تو پھر بھی تھا۔۔۔

"سیدی ٹکٹ" پڑھنے والے اس کا کھوج لگا سکتے ہیں اور میری ویل کی رو میں بہہ سکتے ہیں۔ "سیدی ٹکٹ" کے ڈرامے ایڈیشن میں امرتا نے سجاد حیدر سے بھی گہری محبت کا اظہار کیا ہے۔۔۔ جب میرے پیارے دوست مرحوم نول مشتاق نے اس کو فارسی پس (اس طرف کی پنجابی) میں اتارا اور اپنے رسالے "سورج مٹھی" میں شائع کیا تو اس میں سے سجاد حیدر والے بہت سے حصے کو چھوڑ دیا۔۔۔ ان دنوں سجاد حیدر زندہ تھے نول مشتاق نے وضع کردی بھائی۔۔۔ پھر جب "سیدی ٹکٹ" کتابی صورت میں چھپی اور ابھی تک چھپتی جا رہی ہے اس کا وہی پتہ دار وہ ہے۔۔۔

میں نے جن پتہ یوں کا ذکر کیا تھا انہیں امرتا ساری عمر تانے رہیں اور ان سے انہیں فائدہ بھی پہنچا۔۔۔ انہیں بھی ہوا۔۔۔ ان کی ایک چھتری پنجابی زبان کی مصنفی تھی۔۔۔ پنجابی زبان کی تمام تر وسعت کے

باد جو دھماکا کوہِ وسعِ صفتِ نعل - کا جو سامنے کی زبان آ رہی تھی اور وضاحت ضروری ہے۔۔۔ وہ گورکھ میں لکھتی ہیں ان کی بہت سی تخلیقات اس طرف منتقل ہوئیں مگر بیشتر کے ساتھ زایدی کلمت جیسا سلوک ہوا۔ مجھے اسی توجہ ہے۔۔۔ ان کے جس ناول "پنجر" پر بھارت میں فلم بنی اسی کو مد نظر رکھ کر یونیورسٹی اور مختلف کان کے پنجابی شعبے کے ایک طالب علم نے ایم اے کا تھیسس لکھا۔۔۔ اس نے ناول کے کئی نسخہ خط لکھے۔۔۔ میں نے وہ تھیسس دیکھا تھا۔۔۔ طالب علم سے پوچھا تو اس نے سچائی سے بتایا کہ ناول پر انگریزی زبان میں ایک تبصرہ چڑھاتا تھا ظاہر ہے۔۔۔ انگریزی کے کچھ اور طرق سے ہو جاتے ہیں اور اصل لفظ اور اس کے باطن کے معانی آتے اور رہن جاتے ہیں۔

امرتا پر قلم کی کہانیاں اور ناول اردو زبان میں بھی منتقل ہوئے ہیں مگر کسی خوش بخت اردو نگار نے ان پر کبھی حیل کر کے نہیں دئی امرتا کو پنجابی لکھاری کہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔۔۔ بہرست میں امرتا پراکتی کا مہوا وہ ناول پاکستان میں نہیں پہنچا۔۔۔ یوں امرتا پنجابی کی چھتری کے نیچے بنی بیٹھی رہ گئیں اور ان سے اپنا یا نہ اپنی سلوک ہوتا رہا جو سیف الدین سیف اور نول مشتاق نے لیا تھا۔۔۔

امرتا کی ایک اور چھتری ساحر تھا۔۔۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے مگر شاید ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے یا سمجھے بھی تو اس کا اظہار نہیں کر سکے۔۔۔ ساحر محبوبہ میں ممت بھی تلاش کرتا رہا اور امرتا ایک اور شمش میں رہی۔۔۔ یا تو اسے فلم ان مہ چاہیے تھا یا سہرا انداز محبوبہ جسے جب ان کا ہنسی چاہنے پیار کرتی تھیں جب چاہیں وہ اپنے غول میں واپس چلی جائیں چاہے محبوبہ "باب" کہتا رہتا رہتا "ولی" جواب نہیں آئے گا۔

میں نے اپنی کتاب "ہا کام محبت" ساحر لدھیانوی "میں امرتا پر قلم کو ایرانی ملی کہا ہے۔۔۔ ایرانی نسل کی ملی کا معاملہ عجیب ہے۔۔۔ وہ چوہے کھاتی نہیں فطری تقاضے کے تحت چوہے کو بو جتی ہے تھوڑا تو جتی ہے اور ادھر مہا کر کے چھوڑ دیتی ہے۔۔۔ خود بھی جلد سے مٹی نہیں۔۔۔ چوہے کو کھانگی باندھے دیکھتی رہتی ہے چوہا ذرا سا بیوش میں آکر بھاگنے لگتا ہے تو ملی اس سے پھر وہی سلوک کرتی ہے۔ امرتا پر قلم جیسی اور امرتولی ملی ایسی میری ہی جیسی محبوبا میں ہیں اس لیے یہ توجہ صادق ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب امرتا پر قلم ولی میں جا کر آباد ہو گئیں اور چھوڑے بعد ساحر لدھیانوی جی لدھیانہ اور انہوں نے ہوتے ہوئے ولی چلے گئے تو پرانی محبت تازہ دم ہو گئی۔۔۔ ساحر مبین چلے گئے۔۔۔ بقول

میداشتہ فلمی نگار کی سحر کا Passion (سب سے بڑی آرزو) تھا۔۔۔ تھوڑی جدوجہد کے بعد ساحر نہ صرف کامیاب ہو گیا بلکہ وہ مقام اور مرتبہ پایا جو آج تک پاک و ہند کے کسی نگار کو نصیب نہیں ہوا۔۔۔ ساحر بھی امرتا سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لیے جھجھکا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔۔۔ امرتا اپنی جذباتیت میں یہی چاہتی تھیں ساحر دلی ہی میں رہیں اس کے سامنے رہیں۔۔۔ ساحر کا فیصلہ درست تھا۔ یعنی۔۔۔

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے یا

امرتا پر یتیم نے اس کا اظہار خود ایک اور طریقے سے کیا ہے۔ جب منصور اندر ریت (امروز) ان کی زندگی میں آنے اور کچھ عرصے انہیں ممبئی میں فلموں کے آرٹ ڈائریکٹر کی پیش کش ہوئی تو وہ بھی بہتر مستقبل کے لیے ممبئی چلے گئے۔۔۔ تب امرتا نے کرب سے لکھا۔

”ایک پہلے مجھے چھوڑ کر ممبئی چلا گیا تھا اب دوسرا بھی اچھے کل کے لیے میرا آج ویران کر گیا ہے۔“

امروز واپس آ گئے اور دونوں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔۔۔ اب اس زندگی میں نہ ساحر تھے نہ سجاد مدیر اور نہ دیو بندر سیتا تھی۔۔۔ (یہ ایک طرف عشق کرنے والوں میں سے تھے) رسیدی کلٹ نے علاوہ امرتا نے ساحر سے عشق کی تھی ”اک سی ایتھا“ میں بھی لکھی۔ یہاں ساحر ساگر ہو گیا تھا۔

امرتا پر یتیم اب امروز کی چھتری تلے آ گئیں۔۔۔ یہ عجیب طرح کے کامبندھ اور بھوک تھے۔۔۔ نہ پیسے ہوئے نہ بیاہ کی باقاعدہ رسم۔۔۔ لیکن عمر بھر اسے رہے۔۔۔ میرنی بھارتی دوست امرتا کوک نے امرتا امروز کے عنوان سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا دلی میں اردو ترجمہ بھی چھپ گیا۔۔۔ اس حوالے سے اور کئی دوسرے ذرائع سے پتا چلا کہ سکھ برادری امرتا پر یتیم کے اس ٹول پر کافی تاثرات تھی اور ایک طرح سے ان کا سماجی بائیکاٹ (مقاطعت) کر رہا تھا۔۔۔ نوراج جسے امرتا پر یتیم نے ساحر لدھیانوی سے مشابہت ہے اور کہا ہے کوک کہتے ہیں یہ ساحر کا بیٹا ہے۔ نوراج بھی اس ’اطلا‘ سے رنجیدہ نہیں ہوتا خوشی کا اظہار کرتا ہے مگر وہ امرتا اور امروز کے رشتے (غیر سماجی اور غیر مذہبی) کو خوش دلی سے قبول نہیں کرتا۔

ممتاز ادیب میداشتہ نے میرنی کتاب نامہ محبت۔ ساحر لدھیانوی کے بیانے میں بھی لکھا ہے۔ مجھ سے اختلاف یہ ہے کہ امرتا آخر وقت تک ساحر سے بیدار کوئی رہتی تھی۔۔۔ میں سوال کرتا ہوں یہ۔۔۔ ”اور امروز کو زندگی کا اصل بنا چکی ہیں اور یہ کہتی ہیں۔“ ساحر ایک خواب تھا۔۔۔ امروز تعبیر ہے۔۔۔ ”تو کچھ یہ پیار





## امرتا پریتم۔۔ ایک سچی عورت

فلم کا شو سحر ہوا۔ سینما ہاں نے ان کثرت شائقین کا ایک جہنمیں باہر کو آکا۔ اپنا کف ایک چٹخ نما آواز  
 فضاوں میں بھٹی "اے۔۔۔ ساحر لدھیانوی" اور ان کے ہی لمحے ساحر میسوں کوں سے کیے۔۔۔ میں تھا۔ کوئی  
 ہاتھ ملا نا چاہ رہا تھا اور وہی ہت کر کے کاٹھمی تھا۔ مگر ان کثرت وہ تھے جن نے پاس جو کاغذ نمائشے منہر تھی وہ  
 آتے باز ہارے تھے۔ نوٹ بک، کتاب، کڑی نوٹ، کاغذ کا ٹکڑا۔۔۔ اور آوازیں تھیں کہ گندہ ہونی جارہی  
 تھیں "اے آنو اراف" "اے آنو اراف" "اے آنو اراف" "ساحر اپنے چاہنے والوں میں گھر ایک کے بعد دوسرے کو  
 اور جس جی کاغذ کڑی نوٹ نوٹ بک۔۔۔ کو اس کا ہاتھ لگا دو مسکراتے ہوئے آنو اراف دیتے جا رہا تھا۔ مجمع  
 تھا کہ وقت نہ رہنے کے ساتھ ساتھ یہ جہت ہی جا رہا تھا۔۔۔ یہ کوئی نئی فلم ریلیز ہونی تھی جس میں ساحر  
 لدھیانوی نے ایت لکھے تھے۔ میس اور میسٹی کے دریا اپنے ایت نکارت اپنی والہانہ محبت کا اظہار اس سے  
 آنو اراف مانک مانک کر رہے تھے کہ اپنا کف اس مجمع میں ایک نرم و نازک ہاتھ آتے بڑھا اور ایک جاہلی  
 پچپانی "سوانی آواز فضا میں بھٹی" "اے آنو اراف"۔۔۔ اس ہاتھ میں کوئی کڑی نوٹ کوئی آنو اراف بک یا  
 کوئی نوٹ بک نہیں تھی بلکہ ساحر کے سامنے ہاتھ کی پتیلی اٹھلی تھی۔ ساحر نے آواز اور پتیلی والی کی سوت دیکھا  
 ۔۔۔ یہ امرتا پریتم تھی جو عجیب بہ و اثر نظروں سے ساحر کو، کیوری تھی اور مسکرا رہی تھی۔

ساحر لدھیانوی نے اپنے چین کی ٹب کی اتنی جانب سے اپنے انگوٹھے دیا ہی لکائی پیار سے پتیلی پڑی  
 اور اس سے تین اڑیاں تیں میسوں سے اوپر اٹھوٹھا دیا۔۔۔ یہ یا طسب تھی اور یا عطا تھی۔۔۔ "امرتا  
 پریتم ساحر سے بے پناہ محبت رتی تھی۔ وہ محبت جسے کوئی محبت کرنے والا ہی سمجھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ وہ  
 ساحر لدھیانوی کی محبت میں آنکھوں تک ڈوبی ہوئی تھی۔

امرتا پریتم عجیب عورت تھی جس سے محبت کی اس سے شادی نہ ہو سکی۔ جس کے ساتھ شادی کی اس کے



موجودہ جمہوریہ کی۔ اس کے اپنے ناموں میں پوتہ پوتہ بھی برساتی رہا۔ اسے حلقہ کے اراکین  
 کو اسے مہیا کیا۔ انہوں نے اس کی وجہ اپنی چار پارٹیاں لگاتے رہتے رہے۔  
 یہ امر بھی یقین کا قیاس ہے کہ اس وقت کے پارٹیوں کے اراکین میں اس وقت کی ہے۔  
 جب کہ ان کے جوہر میں وہ بھی وہی وہی تھا۔ اس کے قریب وہی میں سے اراکین اور انہوں  
 میں سے انہوں کی نمونہ مہیا کیا۔ اس کے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے

اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے

اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے

#### Very Poor Taste

اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے

اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے  
 اس کے قریب اس کے قریب وہی میں سے ہائیڈروجن کے لیے وہی وہی تھا۔ اس کے

جاپ والی جیوں ساحر دا ہتھ چھو رہی ہواں۔۔

یہ صدف مسوسات کے جہان کی باتیں تھی افسانوی باتیں۔۔۔ افسانوی کرداروں کی باتیں۔۔۔ امرتا  
 تھی ہے مجھے پہلی بار سکریٹ پینے کی عادت انہی دنوں میں پڑی تھی یہ سکریٹ ساگاتے ہوئے یوں لگتا جیسے وہ  
 میرے پاس ہے وہ سکریٹ کے جھونکے میں "نمودار" ہوتا تھا۔۔۔۔۔

امرتا پریم کے اندر رہنے والی عشق زار عورت کی داستان تو ختم ہونے والی نہیں ہے وہ جدید سائنسی دور  
 میں بھی محبت کے معجزوں کو مشکل کرنے والی عشق زار ہی ہے۔ اس کے عشق کا ایک دوسرا روپ امن اور آزادی  
 کے ساتھ عشق ہے۔ یہ امن کی حیاتی کا بہت محنت مہموالہ ہے۔ امن امن کی کمزوری امن کا آورش اس کا نظریہ  
 حیات اور اس کا زندگی بھر کا خواب رہا ہے۔ دنیا بھر میں انسانی سماج کو امن کو بھولاری کی صورت میں دیکھنے کے  
 خواہش مند لوگ دنیا کے ہر کونے امن پسند سماج امرتا پریم کے تصور امن پر نہیں کرتے بلکہ اس سے محبت کرتے  
 ہیں۔ اب میں یہاں راستہ طور پر اس کی نظم "پنجاب دی کہانی" کو موضوع گفتگو نہیں بناؤں گا جس کا ایک ٹکڑا وہ  
 ہے جس میں اس نے تقسیم ہند اور پاکستان کی آزادی کے لحاظ میں پنجاب کو خون میں ڈبوایا وہ اصل نظم نہیں  
 ہے بلکہ ایک طویل نظم کا محض ایک بند ہے

ان آکھاں وارث شاد نوں

کتے قبراں وچوں بول

بلکہ میں اس کی نظم "تواریخ" کا حوالہ دینا چاہوں گا اور صرف وہ شعر نقل کروں گا ایک درمیان میں سے  
 اور ایک آخری شعر بدل چیتے پہا شعر بھی نقل کرتا ہوں تاکہ جب آپ ان شعروں کی پڑھیں جو میں "جب تواریخ پر  
 لکھا" میں "جب کتابوں کے اوراق نہیں تو جو منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے کھتا جائے وہ ان شعروں کے  
 آئینے میں مزید واضح اور صاف آسانی دے۔ امرتا نے کہا

ایس چوہاں ہمارے دی میہ می کرماں والی رات

جس دی بنگل وچ ہے میہ می قسمت دی پر بھات

میں تواریخ ہاں بند دی میہ سے ورقے لبوہان

ہتھن لئی ایہ ان ان والی رات جلدی میہ می جان

جیال ان جاکن چھپا انا اپنے نہیں پرین وی

اگ پرہاں ورقہ پشاں نواں بے کوئی سن دا ہو

سوویت روس میں امریکا پر یتیم کو بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر جب سوویت فوجیں چیکوسلوواکیا میں داخل ہوئیں تو امریکا بہت دکھی ہوئی۔ اس وقت پرانے شہر کے لوگوں نے حفاظتی کتہ نکاہ سے اور حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے گھروں کے نمبر منادینے تھے۔ گلیوں سڑکوں کے نام بھی کھرچ ڈالے تھے۔ یہ خاموش احتجاج کا ایک انداز بھی تھا۔ امریکا پر یتیم عالمی امن اور عالمی بھائی چارے کی داعی امریکا پر یتیم۔۔۔ پرانے شہر کے لوگوں کے ساتھ تھی اس نے لکھا:

”آج میں نے اپنے گھر کا نمبر منادیا ہے

گلی کا نام اور سڑک کا نشان بھی ختم کر ڈالا ہے

اب اگر تم مجھے، حوند ناچاؤ

تو دروازے کھٹکھٹا رہو

یہ گلی بہ شہر بہ ملک میں جاؤ

جہاں تمہیں نہیں کوئی آزاد روئے مل جائے

تمہیں

وہی یہ امر ہے“

یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے قلم کو روکنے میں وقت ہو رہی ہے مگر روکنا تو ہے۔ سوچئے امریکا پر یتیم کی ایت نکاری پر ایسا نظر ڈالتے ہیں۔ آپ کو تو علم ہے ایت تو ہوتا ہی جذبوں، دھڑکنوں، خواہوں، امنگوں، آرزوؤں کا اظہار ہے۔ امریکا کے ایت بھی زیادہ تر اس کے دل کے راز ہیں۔ کبھی اداس، کبھی غمگین، کبھی محبت سے بہاؤ اور کبھی جذبات و احساسات کی بہریں۔ اس کے یہ سارے ایت اس کی آپ بیتی ہیں۔ اسی لیے ان میں وہ جتنی بے لوث بھی اور لگاتار بھی۔ امریکا کے پٹے پیتوں میں چلنے پھولنے والوں کے آنکھوں اور قوس قزح کے رنگوں کا اثر تھا۔ وہی نہیں تھی وہ اس وقت سی انجائے پیاری کا شناس منجاس کا ذکر کر رہی تھی۔ اس نے محبت کی غمگینیاں لکھی ہیں۔ اسے چونکہ تاج کے سیکے داروں سے چڑھتی۔ اسے اپنے گھر و رشتہ کے لیے آنے والے بھی اچھے نہیں لگتے تھے اس نے کہا تھا ”ہم نیا شاعر اور بانی لکھتے منانے چلا آتا ہے اور سب سے پہلے یہی فقرہ بولتا ہے ”بی بی، رشتہ کرنے حاضر ہوا ہوں“۔ اس نے کہا ”مجھے اس انصاری سے جی ڈر آتا



## امرتا پر يتم

حاجی کے بچے ہوئے ماما کا بل بل ٹھانڈوں نے رپ کے اچار و ارون کی زور زور سے اور باقی بچے کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف خدا کے احتجاج بند کرنا ہی پرے دے دیا کہ وہ کام ہے اور ایسے مندرجہ بہت کم ہیں جنہوں نے یہ کام انجام دے کر تارکین میں اپنا نام باقی چھوڑا اور انہیں اس صورت پر مردوں کے حاجی معاش کے میں ان کوئی عورت اس بل سے گزاری ہے تو تارکین نے اس کا نام اپنے اوراق میں کھنڈا کر لیا ہے۔ قصہ کا چہرہ نہ دے والوں کی فہمست یوں تو ابھی خاصی ہے مگر اس میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب بھی جی اور جہاں میں جی ہی خاتون نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اسے مایہ ویاہر اس کی قلمی بد و جہد و تارکین کے ہر دور میں خراج آئین پیش یہ کیا۔ امرتا پر يتم کا نام جی کی میں یوں کی فہمست میں شامل ہے بلکہ اگر یہ ہمارا ہے کہ مختلف اوس میں ہے تو یہ جاننا ہوگا۔ شعر و سب کی میں میں اندوستان کے حوالے سے موعظا لیا و اسد خاتون ہے اس کے فن و عالمیہ شہرت حاصل ہوئی اور جتنے عالمی ایوارڈ امرتا کے نام میں آئے شاید ہی کسی خاتون نے داری و لکھنے پر ہوئے ہوں تاہم انہوں نے بات یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان میں اس صورت پر امرتا کے ایوارڈ کے مہینہ فنی حوالوں زیادہ واجب اور یہ ایوارڈ اس کے فنی پر ہو جائیں اور انہیں ہمارے دور کی تھلارت میں ہوں یہ بات درست ہے مگر آج سے مائیکرونگ جی میں پٹا ایک ہی اور وہ بھی مردانہ کی طرح لکھی گئی ہے۔ ہر دور میں بغاوت سے ہر چہ انصاف پر مبنی شامی رہا شاید ہی شہداء کے اور وہ یوں کی میں نے دے دیا جو ماما کا سیدھی فنی کے عشق کا پیرا لکھا اور اقارب لکھی گئی تھیں کے بعد ماما کے منسلک امرتا کے مائیکرونگ کی سچت کے اندر کی زبان اور فہم و انہی اصولوں کے ساتھ ہی جی عمارت کھجور کے لکھنے کے فوہ اچھیندی پائیں ہیں اور ماما کے ماما کے پاس ہی وہ ایوارڈ کے قریب ہوئے اور وہ جی میں یہ شامی کے امرتا کا تہہ و تہہ سب کی باتوں کا فوہ لکھا ہے اور اس کی شامی کی پہلی گاری انہی کے فوہ

اور صحافتی خدمت کا تذکرہ محض نہ کرنا چاہیے۔ سرداروں کو یقیناً آج بھی امرتا پر غصہ آتا ہوگا۔ وہ آج بھی اس بات پر سنج پاہوتے ہوں گے کہ امرتا نے ان کی ناک کاٹ دی مگر کاش وہ یہ بھی سوچتے کہ ان کی اس سہجی سنے اپنی سوچ، عمل اور تخلیق کے ذریعے سارے پنڈیہوں کا نام بھی روشن کیا ہے۔ دنیا بھر کے ترقی پسند اور مزاحمتی ادب میں اس کی تحقیقات کی ایک الگ پہچان ہے۔ بھتی منہ جس کا ماتھا چوم کر اس کے قلم کو اپنی بندوق سے تشبیہ دیتا ہے اور اوزر دے دینے والے جسے پنجاب کی آواز سمجھتے ہیں اور جس کی تحقیقات آج بھی پڑھنے والوں کو ایک انجانا سرور اور آس کے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ جو آج بھی جنوبی ایشیاء کی خواتین کی بڑی آبادی کے حقوق اور جدوجہد کی حمیہ دار ہے۔ وہ اس خطے میں بسنے والی عورتوں کی آواز اور ان کے تشخص کی پہچان ہے۔

پورا پنجابی ادب اور اردو ادب ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے کی گئی شاعری میں اس کی ایک نظم ”ان آگھاس وارث شادوں“ کا بدل نہیں آسکا۔ جو آج بھی تاریخ کے اس مہم پر اپنوں کے ہاتھوں اپنوں پہ ہونے والے مظالم کے خلاف ایک شاہکار صدائے احتجاج ہے تاہم یہ بھی امرتا کے ساتھ زیادتی ہے کہ اسے صرف ایک اسی نظم کے حوالے سے یاد رکھا جائے۔ اس نے اپنی شخصیت کی ساری بے باکی اپنی خودنوشت ”سیدی نکلت“ میں سمجھائی تھی۔ اس کی شائع ہونے والی کتب کی تعداد سو اسو کے قریب ہے جو بچانے خود ایک خاتون نگارہری کے لیے ایک ریکارڈ ہے۔ اس نے پنجابی اور ہندی میں شاعری کی کہانیاں لکھیں ہیں کا مقررہ کیے۔ اس نے فن پر لکھنے اور سننے کے لیے بہت کچھ بے گریہ و زاریوں نے اسے محروم کر دیا ہے۔ جو کسی طرح بھی اس کے فن کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

امرتا اور اس کے فن کے ساتھ ہونے والی اس نا انصافی کا ازالہ ہی اس وقت ہمارے پیش نظر تھا جب اس کے اس ارفانی سے رخصت ہونے کے بعد ورلڈ پنجابی کانگریس نے انہیں امرتا کی یاد میں ایک عالمی تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں بھارت سے آنے والے دانشوروں نے اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا کہ امرتا کی یاد میں اتنی بڑی تقریب بھارت کے کسی بھی شہر میں نہیں ہوئی اور یہ بلاشبہ کانگریس کے چیلر مین فخر زمان اور ان کے ساتھیوں کا اعزاز ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ کبھی میں بھی اس ہمال تخلیق ہمارے ملاقات ہاٹ ف جاصل کروں۔ امن کا غرسوں کے سلسلے میں بھارت جانے کا آغاز ہو چکا تھا مگر اچھی دلی دہائی نہیں آئی تھی پھر جب دلی کانفرنس کا دعوت نامہ وصول ہوا اور ورلڈ پنجابی کانگریس کا وفد تیار کر دیا گیا تو اس بار خوشی اس بات کی تھی کہ امرتا سے بھی ملاقات ہوگی۔ امرتا جی سے ملنے کے لیے وفد کے



تقریباً تمام اراکین بے چین تھے۔

کانفرنس کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے اپنے طور پر بہت سے ساتھیوں نے K-25 حوض خاص پر حاضری دی۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھا۔ خواہش تو یقیناً پوری ہوئی مگر ایک حسرت باقی رہ گئی کہ امرتا کے ساتھ بمطلام نہ ہو سکا۔ میرے سامنے ایک زندہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیتی۔ امروز اشاروں میں اسے بتاتا جو ہماری سمجھ سے بہر حال بالاتر تھے۔ وہ کئی برسوں سے اسی طرح بستر پر تھی اور امروز نے اس کے ساتھ قلم کے لیے اشاروں کی یہ خاص زبان ایجاد کر رکھی تھی۔ امروز نے بتایا کہ بس روح اور جسم کا ایک معمولی سا تعلق باقی ہے نہ جانے کب فوت جائے اور امرتا ہمیں چھوڑ کر پر لوک سدھار جائے۔ یہ منظر آج بھی ایک تازہ دکھ کی طرح میرے اندر موجود ہے۔ میں نے امرتا کا ہاتھ چھوا۔ جس میں بس ہلکی سی حرارت تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سانس کی ذرا بھی بندھی ہے۔ ہماری دلی سے واپسی کے چند ماہ بعد ہی امرتا کی رحلت کی خبر آ گئی۔ وہ بھی دنیا کے دیگر بہادر لوگوں کی طرح انتہائی سخت جان تھیں جس طرح اس نے زندہ رہنے کے لیے اپنے اصول خود وضع کیے تھے اسی طرح کئی برس تک مسلسل موت کے فرشتے کو بھی خود پر فتح پانے سے روکے رکھا۔ تاہم مجھے تو کبھی وہ رانجھے کی ہیز نہ بھی مہینوال کی سوئی اور کبھی مرزے کی ساہاں لگتی ہے۔ جس نے "توڑ بھانا" تو سیکھا تھا مگر اپنے رانجھے مہینوال اور مرزے کو پانا شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

© 2007 by All rights reserved.

## امروز جی۔۔۔۔۔

امروز کا یہ دن ماحقی امروز ایک بڑا آواز ہے۔ وہ دونوں قریب قریب ایک ہی صدی کا تھا۔ ہے۔  
ان میں سے دونوں نے اپنا اپنا کام کیا۔ امرت کے شاعر نے اور اب بھی۔ امروز نے صوفی کی اور انہوں نے  
نے ایک اکاؤنٹ کیا۔

مگر سب شاعر اپنی ہی تو امروز شاعر ہوئے۔ امروز جی نے مجھے بتایا کہ ہر شاعر کی اپنی ہی اپنی  
ایک نظر ہے۔ پھر آج کے دن جاتی ہے اور منہ کی جاتی ہے۔ سب تک وہ قلم اٹھا کر اسے لکھتے ہیں۔ یہ ہے۔  
شاعر کے لئے جس آواز کی ہے۔ سب کے لئے جس میں چلی جاتی ہے۔

مگر سب شاعر بھی ہیں۔ زندگی بہت آسان ہے۔ آج کے دن میں امروز جی نے امرت کی  
کاموں سے پھر آج۔ ایک پندرہ سو سال کا آواز ہے۔ آج کی سمر عجمی پچاس سال کی ماری ہے۔ آج کی  
ہوتی ہے۔ دونوں نے صورت پچاسی تھے اور جاتی ہے۔ بہت قریب ہے۔ امرت کی۔ آج کے دن سطر اس جہدی  
اسے ماسق اس طرح بنی ہے۔ امروز جی نے دیکھتے ہیں۔

پانچاں دریا ماں دلی جانی

دھرتی کی جھلکاری دے

سارے پانیوں تھی

وہ تیرا تیرا ہے

اسی اوکس نہیں رہی۔۔۔

اوہی جتا ہے اھر اھر وچوں

اوہی ہوئے اس رہی ہے

کتنی رہی اسے

امرتا پر یہ تم کون تھی، ایسی تھی؟ اُمرو پوچھو تو... امرت روز بہتا ہے

اوہ اشتر اشتر کوتا

تے کوتا کوتا زندگی

امرتا امرتا، امرتا امرت ایک رُوح دو قالب، نہیں قالب بھی ایک رُوح بھی ایک

شہوت

ہر رُوحی کب رہی اسے

کہ اوہ نہیں رہی

پہمیں لہند اہاں

کہ اوہ ہے

کوئی شہوت.....؟

سبے اوہ نہ ہو مندی

میں وی نہ مندا

امرتا کون تھی، ایسی تھی اور کیا تھی؟؟ ساری بات کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہاں مگر امرت کو تحیک پتہ ہے اوہ کون

تھی، ایسی تھی اور کیا تھی۔

امرتا

کدے کدے خوبصورت سوچاں

خوبصورت سریر دی

دھار لیندیا کتن

آرت یہ ہے؟

زندگی۔۔۔ رنگوں میں



اودھاناں پھریا

اودھاناں اگاں

اودھاناں اٹھ اٹھ ہوئی

وہ پہلا دن تھا پھر نظر آئے لگی۔ تیری شکل میں تیری طرح میری طرف ابھرتی رہتی ہے۔ کئی بار وہ

میرے ساتھ بات کرتی ہے۔ وہی پرانی بات۔

”میں تیروں فیہ ملاں گی“

اودھنے چاندی نہیں

ہے میرے اندر ہی تم ہو چاندی اے

مرا کے آؤں گی۔

مرا کے آؤں گی تاں اودھ آپ وی کہہ گئی اے

سر تا پریتمی آخری نظر ”میں تیروں فیہ ملاں گی“ ۲۰۰۲ء میں شاعرہ کا وقت پورا ہو گیا۔ لیکن اب

وہوں کی مراد ان کے ساتھ باقی حصہ بنتی ہے۔

”وقت دی گل“

یہ وہ آپاں دل

سے فہام شام ہوندی گی

تاں روز شاموں مندے۔

نئی نئی شام۔ یہ تھم ہوندا۔ رنگاں دی

بکشاں تھلے

پپ چوپ آک دو جے نوں ویلہ۔

نور۔ رہندے تیرے رہندے

یہ ویلہ ایل پارا رہندے

فیہ اودھ وقت آیا، جدوں

آپنی شام مر جندی ہوئی

آپے اپنی دنیا کے رنج پر رہا

سے اپنی ایک طرف ہے

اپنی طرف ہے

میرے لئے وہ راتوں رات سوچا

وہ میرے لئے راتوں رات سوچا

تو میرے لئے راتوں رات سوچا

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

پانی کے لئے

ہر شے چوں لنگھدی ہوئی  
 میرے دل نوں لگ جاندی  
 امرتا کے چلے جانے کے بعد امر و زکوٰۃ۔ ساری دنیا اس کے دل جیسی ہو گئی ہے۔ امرتا کے بارے میں  
 بی سوچ رہی ہے۔  
 امر و زکی ایک اور قلم ہے۔

### سوچنی

تصویراں وی دکھان دے بار  
 سوچنی دی تصویر دیکھی  
 میں اس سوچنی نوں دے آیا  
 اوس تصویر نوں ویندیاں ویندیاں  
 مینوں او سوچنی دسن لگ پئی  
 جس نے پنجاب دا اک ور یا  
 کھڑے مال پار کھیتا سی کئی وار  
 تے آج میں اک ہور سوچنی وار  
 سوچنی رہیاں۔

امرتا بھی سوچنی سی  
 اوستے میں آ پنے قلم نال اوتھی صدی  
 سارا پنجاب پار کھیتا  
 اٹکا تار۔

### کویتا

میں کوئی ہو جاں نہ

اور میرا کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا ہے

یہ ہے

میرا چہرہ نہیں

میرا یہ چہرہ نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں

میرا یہ کھنڈا نہیں



بہت مدد دینا چاہتی تھی آپ کو امر دینی نے

میں ایک لوگ کیت

سینا مہر دوا دینی تھی

تو اس کے

آپ کو پناہ دیا

تو پناہ دینا دیا

تو پناہ دینا دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

تو پناہ دیا

پولیس نہ مماندر نہ کھاؤ  
 اندر سب ٹھیک بابا ہوں مصلوہ  
 ڈروئی کو بیٹا  
 ایس وہ ای باب یک دستیک سپارٹس اے  
 تمیوب پتا اس  
 سپارٹس ٹول وئی دست کیس سعدا  
 اپنا  
 تے فیر تمیں وین ہو  
 کیہ کروے ہوا ایس دنیا وچ .....  
 میں ...  
 میں ہلیو پینٹ ہاں  
 ایس دنیا

امر دہاتی کی شاعری میں ایک نو-ٹھکی ترینا لوتی آتی ہے۔ آرٹسٹ رنگوں کی زبان میں اپنا دنیاں ظاہر کرتا  
 ہے لیکن حسب وئی آرٹسٹ پویشری کرے تو اس کے لفظوں کے معنوں میں سے ریٹ آجاتے ہیں۔ ایک نظر

### سوچیاں ترویاں

پتہ تیں وین دی رات  
 زندگی سوچیاں وچ تروئی تروئی  
 اپنا مال ترکہی .....  
 سامنے لٹھلاں وئی وادی آئی  
 سوچیاں ورنی خوب صورت وادی  
 تھوڑا لے چاکے وٹھیا

ہاتھوں سے اک رکھ پڑھ  
 اک بزرگ سے چنے سفید کپڑے پائیں  
 وحشیان ان اکائیں میں شاہی  
 ہو رائے جائے ویلکھیاں تاں  
 ٹیپ نظر اوس پیا  
 آتے پاتے ویر پاتے  
 نے سارے لکھنے ایں لکھنے کا غر  
 تے بہت سارے، پورے اوتھورے سلیچ ویکھے  
 زندگی نے رتا و سوچیا  
 اویکیا  
 جہوں بزرگ نے اکھاں کھولیاں  
 تاں تھوڑے اشارے مال پادیا  
 مال میں خاک چھپا  
 انتھے سس لڑاں

۱۹۸۱ء

## امرتا کے چند نسوانی کردار

میرے پیش نظر اس وقت امرتا پریم کے جو نسوانی کردار ہیں ان میں ”جندرو“ (کنویں کی بوکی)، ”چھٹو“ (چھک چھلو)، ”مس کلا داس“ (کوری ہانڈی)، ”بندو“ (تجارت کا سوال)، ”شٹی“ (شٹی)، ”ماڈل گرل“ (ماڈل گر)، ”کیرتی“ (ایک ایسے)، ”دھنو“ (دھنو)، ”نہال کوز“ اور ”ویرو“ (سرودھ) قابل ذکر ہیں۔

امرتا کے بیشتر نسوانی کردار دھیسے مزاج کے اور اپنی دنیا میں گم یا الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حالات اور واقعات کے بہاو میں بہتے چلے جاتے ہیں زمانے کی ہواؤں کا رخ موڑنے یا رسم و رواج کی دیواروں سے ٹکراتے دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں ردِ عمل اور تحرک کی وہ جہت مفقود ہے جو ہمیں بالعموم عصمت کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ امرتا کے ان کرداروں میں ایک طرف نسوانی جذباتیت کے عناصر ہیں تو دوسری طرف صبر و تحمل اور برداشت کی قوت ہے۔ امرتا اپنے نسوانی کرداروں کی مختلف جذباتی حالتوں اور صورت حال کی نزاکتوں کا پیمانہ رقم کرتی ہیں کسی خاص نتیجہ کو اخذ کرنے یا خاص تاثر کو شدت سے ابھارنے کی کوشش نہیں کرتیں اور اسی لیے ان کے ہاں کوئی خاص ڈرامائی صورت حال بھی پیدا نہیں ہوتی۔

”کنویں کی بوکی“ کی ”جندرو“ ایک باہمت عورت ہے جو پہاڑ کی اوٹ میں درختوں کے جنگل میں ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتی ہے اور کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ بچپن سے ہی وہ باپ کی لالچی بن گئی اور پھر ساری زندگی اپنے وجود کو سہارتی رہی۔ اس کی زندگی کنویں کی بوکی کی طرح گزرتی ہے جس میں ایک پیاسا راہ گیر آتا ہے اور اپنے ہاتھوں کی روک اس کے سامنے کرتا ہے تو وہ ساری کی ساری اس میں جا گرتی ہے مگر وہ پیاسا مسور جو وہاں رنگوں سے بھری ہوئی تصویریں بنانے کے لیے آیا تھا جندرو کو پتھر کی صورت بنا کر اس میں رنگ بھرے بنا چلا جاتا ہے اور کنویں کی بوکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ جاتی ہے۔ لیکن کنویں کی اس بوکی کو کسی

پرنوئی افسوس نہیں۔ وہ کہتی ہے

”نہیں نہیں کوئی غم نہیں میری اپنی تو کام آیا۔۔۔ اس کی پیاس تو بجھ گئی۔۔۔۔۔ مجھے کوئی افسوس نہیں نہ اس  
پنہ اپنے آپ پر۔۔۔۔۔“

یوں چند روز صابر و شاکر عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے اس میں احتیاج یا رد عمل نہیں ابھرتا وہ  
مغاہمت پر آمادہ ہے۔ بے شک وہ ایک باہمت اور حوصلہ مند عورت ہے مگر اس کی ساری ہمت اور حوصلہ  
فطرت سے نکلنے میں ہے نہ سماجی نا انصافی سے نکلنے میں نہیں۔ اس کی مزاحمت جس قدر بھی ہے فطرتی  
مظاہر کے ساتھ ہے سماجی عوامل کے ساتھ نہیں۔ سماجی سطح پر اس نے اپنے آپ کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ  
دیا ہے۔

غربت کے ہاتھوں جنسی استحصال کا شکار امرتا کے دو نسوانی کردار قابل ذکر ہیں۔ ایک ”چھلک چھلو“ کی  
”چھلو“ اور دوسری ”نوری باندی“ کی ”مس ملا داس“۔ چھلو کا باپ معذور اور ماں سوتیلی ہے۔ وہ نوکریاں  
بٹاتی ہے اور گھر سے باہر جا کر ادنیٰ والوں یا موثر والوں کو نوکریاں بیچنے پر مجبور ہے۔ لیکن نوکریاں بیچتے ہوئے  
اس کا منہ لوٹے جیسے تین جاتا ہے اور اس کی سوتیلی ماں کے بقول اسی لیے چھوٹی زیادہ نوکریاں نہیں ہاتھیں۔ مگر  
”رتنا“ نے جو اخبار بیچتا ہے ہاتھیں کرتے ہوئے چھلو کا منہ لوٹے جیسے نہیں رہتا بلکہ اصل امت سے زیادہ آواز  
چھوٹے اس کے باپ نے فرمائش کر رکھی ہے۔ ”چھو چھا۔۔۔ آج پوری میں نوکریاں بیچنا اور نئے وقت  
آونے کی دکان سے پورا آؤ گے یہ گوشت لیتی آتا۔۔۔“ لیکن چھلو اور اس کی مرنی بھی لیتی آتا نہیں تو تیری  
ماں ابلا ہوا گوشت سامنے رکھ دے گی۔“

اس لیے آج چھلو میں نوکریاں بیچنے کے لیے اس کوشش میں ہوتی ہے کہ اس کا منہ لوٹے جیسے نہ بنے  
یا کہ اگر چہ رتکا سے موثر والوں کے پاس جا کر نوکریاں بیچنے سے منع بھی کرتا ہے اور جاتا ہے۔ یہ سب کچھ  
ہنہ۔۔۔ میں تمہاری نوکریاں خرید لوں گا لیکن چھو کو یہ بھی گوارا نہیں۔ لہذا وہ ایک موثر والے سے پانچ نوکریاں  
نوکریاں لے لیتی ہے لیکن موثر والے کے دل میں کچھ اور ہے وہ چھلو کو ساری نوکریاں خرید لینے کا جھانسہ  
لے کر موثر میں سوار کر کے دیرانے میں لے جاتا ہے اور جب چھلو کو بوش آتا ہے تو وہ ایک درخت سے نیچے  
گئی جی پی پٹی ہوتی ہے اور اس کی جیب میں اس روپے کا نوٹ ہوتا ہے۔ سب دھاری میں سوار ہو کر گھر جاتی  
ہے تو اس کا پی پی پی ہے۔ ”اچھا ہوا اور اس چلتی ہوئی لاری سے تو پیسے اور مرچ لے اور اس نوٹ سے

نکڑے نکڑے بوجھ میں۔ "اور ایسا چہرہ نہیں ہوتا بلکہ دھبہ دھبہ دھلی کے کونے پر کوشش کی نگاہوں کے سامنے چٹکتی ہے تو اس کے قدم زل جاتے ہیں۔ "نکڑے نکڑے چہرے پر چھوٹے ہاتھوں کی خانے میں کوشش رکھا اور اس کے ماتحتی کی کوشش کیا اور اس کے اور بھی مزید بھی رکھادی۔ "اور دھبہ اس کی ماں" کرتا رہا باندھی میں کوشش ہوئی ہے تو چھوٹا باپ کرتا رہا ہے جتنا ہے "میں سو آتی تھریست ہوا اٹھائی دے رہا ہے۔" اور پھر افسانے کا اختتام اس "مٹی" پر ہو رہا ہے۔

"چھوٹے بچے ہوتے ہوتے چوٹ کی طرف مڑتے۔ چوٹ کا سارا جسم اس کی طرح ہل رہا تھا۔ چوٹ کے اچھے باندھی رکھی ہوئی تھی پہلوؤں محسوس ہوا جیسے اس باندھی میں اس کی مسکراہٹ بھونکی جا رہی ہے۔

اچھا بیٹی اب تو تیری لوگیاں بنانا شروع کر دے میں نے تیرے لیے نئے پتے بنوا رکھے ہیں۔ ماں کرتا رہا باندھی میں ٹپکی بار اس سے اتنے پیار سے ہوئی۔

عصری بندھی چھوٹے بندھے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں وہ وہ سوچ رہی تھی کہ آج حیاتوں میں وہ پتے نہیں آئیں گے جن سے وہ دیکھیں رہی جاتی ہیں اور آج سے اتنا بچتے کے لیے ایسے اخبار شائع ہوں گے جن میں ان اخبار کے ایک مضمون پر اس کی خبر چھپی ہوگی۔"

چھوٹے خواہشات کے مقابلے میں اپنی ماں اور باپ کی خواہشات اور ضروریات کے لیے "ختم" بندھی رہی۔ چھوٹے خواہشات کے مقابلے میں اپنی ماں اور باپ کی خواہشات کے لیے "ختم" بندھی رہی۔ اور وہ اس کا اس کا ایک وقت وہ جو ہے وہ ہوں گے سامنے اس کا کونے میں رہا اس کی اپنے پیشے اور مجبوری سے تعلقی کا اظہار ہے جسے "مزدور سا احتیاج" کے نام سے بھی "مردمیری" کہتے ہیں۔ باپ کی فوٹو ماش کو پورا کرنے کے لیے سوئے والے کے ساتھ ٹھکانے کی کوشش کرنا (یعنی اپنی توقعات پر پورا اترنے کی خواہش) اور اس کے لیے اتنا جھینپ چلنے والے محبوب کی بات کی پروا نہ کرنا اس کے ایک طرح کے تعلق اور دوسری کے احساس کا پتہ دیتا ہے۔ مٹی کہ افسانے کی اختتامیہ بطور اس بات کا اعلان ہے کہ اب چھوٹے ہوں گے سامنے کونے جیسا مانتا بھی نہیں بلکہ وہی اور اس ضرورت کے احتجاج کے بھی مستحق اور بوجھ کی جو ممکن تھا کہ آگے چل کر کسی بڑی اندرونی شمش یا 'Dilemma' کو ختم کر دے مٹی کی وہ "قتل" کے جس کی

خبر اخبار میں کبھی شائع نہیں ہوئی۔

میں سمجھاؤں جو مانگت کر کے پر محبوب ہے اسے اس کا پاس دیکھنی تھوڑا سا لڑائی کے لیے اپنے ساتھ لے کر لے جاتا ہے اور جب واپس لوٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ملاؤں اس اب "ورنی باندی" نہیں رہی بلکہ "کالی کالونی باندی" یعنی تجوین (نظر بنو) بن گئی ہے۔ اگرچہ یہ کالنگھ میں ملاؤں نے اپنے چہرے پر ٹھونچیں کالی ایک ظالم نے دیکھ لی تھی مگر اس کے دل میں محبت کا ایسا پانی تھا ہی نہیں کہ جس سے وہ اس ورنی باندی کی سیاہی کو صاف کر دیتا۔۔۔ اسے صوفہ التا۔۔۔ پوچھ لیتا۔۔۔ اسے سنوار لیتا۔۔۔ اور پھر اس کو کسی مقدس چوکے کی زمست بنا لیتا "لہذا میں ملاؤں اس عورتیں میں چھوڑ دیتا کہ خود کشی کر لیتی ہے۔

یہ افسانہ (ورنی باندی) اگرچہ اپنی تنقید اور تاثر کے حوالے سے بڑا بھرپور اور منظر و سبب موزوں ملاؤں کا کردار اپنی مبالغہ افراطیت کی وجہ سے متاثر نہیں کرے گا اور اس میں امرتانی مجبوری یہ تھی کہ انہیں معاشرے کی اس فحاشیت و شدت سے ابھارنا تھا جو امرتانی کے معاشی اور جنسی استحصال کو نمایاں کر سکے اور اس کے لیے میں ملاؤں کے کردار میں افراطیت کے درجات میں بڑھانا ضروری تھا۔

"بندہ" عورت کا ایک پر تو گناہ ہے۔ وہ شعائرِ محبت کے لیے وہی اور اپنا سب سے بڑا پتھر ہے۔ اس کے چہرے پر گناہ کے لیے اس کی باندی باندی بنوا دینے نہیں صرف اس کے لیے بندہ بنتی ہے۔

بندہ باندی محبت میں اپنا گھر بار سب چھوڑ چھوڑ کے آ جاتی ہے اور بغیر پیسے کے لیے اس کے بچے کی ماں بن جاتی ہے لیکن سریندر اس کی زندگی جہنم بنا دیتا ہے اور آخر کار اس کی سب رشتی کی وجہ سے ہی بندہ و گھر واپس آنا پڑتا ہے۔ سریندر کی وجہ سے وہ سب اٹھنا اٹھاتی ہے حتیٰ کہ اس کا بچہ بھی مر جاتا ہے مگر ایسے تم خوش ہوئے تو ای میں میری خوشی ہے! بندہ والی بندہ کے تجارت کا سال بھی نہیں آتا سریندر کو اس وقت چر اپنی محبت چرانی باتوں میں پناہ دیتی ہے وہ سب وہ افلاس بیماری اور گناہوں سے پرہیز کے وہ تھوڑے بھرے خوار ہیں گھر بندہ کی چوہے پر آن میں گھومتا ہے۔

پورے افسانے میں بندہ کی زندگی صرف اور صرف سریندر کے گرد گھومتی ہے اس کی دنیا اس کا جہان صرف سریندر ہے۔ یہ بڑا جی فی موش سب چھوڑ دینے اور راضی ہو کر بننے والا ہے۔ یہاں مثالیت اس قدر بڑھ چکی ہوئی ہے کہ تخلیقیت پر بندہ کی کافی کاغذیں پورے جگہ کے اٹھتا ہے۔ جذباتیت اور مثالیت پسندی کا وہ عالم اس





”انسانی رشتوں کی دوہری رشت میں بندھی ہوئی کیرتی نے شوکار کے جلتے خط کے جواب میں ایک ویسا ہی خط لکھ دیا تھا اور رسوں اور روایتوں سے ایک سرور سم سنے آقا نے پر اس نے سرخ دھماکے کا ایک رنگ نکھرا بھیج دیا تھا۔“

تہذیبی کی خواہاں اور منہ پھٹ اور مرد مار قسم کی ”دھنوا“ امرتا کے تمام نسوانی کرداروں میں واحد مقررہ اور ہی وار کردار نظر آتا ہے۔ اس کے ماضی کی حقیقت سے پوری طرح کوئی آگاہ نہیں محض روایتیں مشہور ہیں۔ منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے کاؤں پر میں کسی کو دھنوکے سامنے کچھ کہنے کی جرات نہیں۔ وہ جب تک زندہ رہتی ہے اپنے زور کے بل پر زندہ رہتی ہے۔ بظاہر اسے کوئی فکر نہیں اور وہ اکثر کہتی ہے کہ ”پلے دھیلی بندھی ہوئی ہے کوئی مشکل بنی تو جھٹا لوں گی۔“ لیکن ایک بار جب کاؤں کا ایک نوجوان ”دھنوا“ سے کہہ بیٹھتا ہے کہ ”دھیلی تو دھوا“ یہ لہجہ کی بھی ہے ”تو دھنوا“ اس نے بیان میں ہاتھ ال کر رہتی ہے ”چلو دھکاؤں۔۔۔ تمہاری ماں کی شلوار میں ہے۔۔۔“ اس کے بعد کاؤں کے کسی مرد کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ دھنوک کی طرف آکھٹا تھا کڑ بھی دیکھے۔

اصل میں دھنوا عورت کی معاشرتی حیثیت اور اس کی مجبوریوں سے بخوبی واقف ہے۔ لہذا اس سلسلے میں اس کا فلسفہ بڑا سیدھا سا ہوا اور دونوں ہے۔ کہتی ہے

”عورت تو خدا نے شرمیل بنایا ہے۔ روپیہ بل تو کوئی کرموں والی ہوتی ہے جسے اپنی مرضی کا مرد مل جائے۔ لیکن ایسی عورت تو کسی نے کبھی نہ سنی۔ کچھ کچھ دھیلیاں ہیں۔ بس وہ تین پونے دھنوا یا اور دھنوا سے نکل سیں۔۔۔۔۔“

دھنوا کی روایتوں اور بندھنوں کی باقی ہے جس کی وجہ سے اس کی باتوں میں تندی و تیزی کے ساتھ ساتھ لطف نے نشہ بھی مہجور ہیں۔ اس کی بغاوت محض جذباتی نہیں اس کی پوری زندگی کے تجربہ کا نتیجہ ہے اسی لیے جب مرتے وقت دھنوا سے کہا جاتا ہے کہ وہ تو بہتر لے گا کہ اگلے جہان کا حساب کتاب آسان ہو جائے تو وہ ہنس کر کہتی ہے

”میری فکر یوں کرتی ہو۔ بھٹوان کو حساب دینا ہے وہ لوں گی۔ یہ دھیلی جو پلے بندھی ہوئی ہے بھٹوان سے کہوں گی ”اے جھٹا لو اور حساب پکھٹا کر لو۔“

بغاوت سے چرخی ہوئی یہ دھنوا تہذیبی پسند ہے اور جب اس کی وصیت سامنے آتی ہے تو دوبارگی سے زیادہ انتہائی صورت میں نکلتی ہے۔ دھنوا اپنی تمام زمین کاؤں کے اسکول کو دے جاتی ہے اور لکھ جاتی ہے کہ

میری ایک نئی خواہش تھی کہ یہ سب کچھ مجھے چار حرف پرچہ میں اور اس کی زندگی خوار نہ ہو۔

امرتا کا افسانہ اس سلسلہ کی حقیقت نگاری کی ذیلیں میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ یہاں افسانوی کردار "نیہال کور" اور "میرو" اس طرح آمنے سامنے ہیں کہ جو نہ صرف دو مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ انہیں نمایاں بھی کرتے ہیں۔ بھلا یہ کردار ایک دوسرے کا counter part ہونے کا شائبہ پیدا کرتے ہیں مگر ایک پختہ شخصیت کے عین و نقابوں اپنی اپنی صورت حال کے مد مقابل ہیں۔

نیہال کو سرداری پڑتی رہتی ہے۔ اور وہ نہ ہونے کی وجہ سے سردار کو وارث کی فکر لاحق ہوتی ہے تو نیہال کو اس کا سردار ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ دلچسپی اور پختہ کرتی ہے اور یہ اس کے سینے سے نکلنے والی سردی کو اپنے سینے میں دبی ہوئی سردیوں کے ساتھ جانتی ہے۔ وہ میرو کو بدل اپنی بیوی اور بیوی کی طرح نیہال کرتی ہے اس کی ایک ایک بات کا اس کی طرح پورا غور کرتی ہے جیسے ایک ماں اپنی بیوی کا کرتی ہے۔ نیہال کو سردار کے عین و نقابوں کے بھی ماں کی شکل میں چہرہ ہوتا ہے جس کے نیہال کو سردار و ایک وقت اور امتیاز بخشی ہے۔

دوسری طرف میرو اس بات پر کھانا ہے کہ اس کے باپ نے دو بار روپ کے عوض اسے ایک بوزھے کو بیٹا (سردار) کے ساتھ باندھ دیا ہے اسی لیے نیہال کو یہ سب بھی دیکھنے کے لیے طرف مچتی تو اس نے دل میں ایک فکر پیدا ہو جاتی۔ میرو کی کالے بھونروں جھکی آنکھیں تھیں۔ رنگ کی ذرا سانسولی تھی مگر مانو کے رنگ میں جوانی سخت آنے کی طرح کندھی ہوئی تھی اس کی بانٹیں سینوں کی طرح گول اور سخت تھیں۔ اس نے جسم میں انگلی کا ایک پور بھی نہیں گھسایا تھا۔ سردار ان کو محسوس ہوا کہ سردار سے جو سردی اس نے لے لی تھی وہ اس نے سردی کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا۔

اسی اثنا میں میرو ایک پور سرداری ہو جاتے ہیں اور وہ زچگی کے لیے نیہال کو رکے ساتھ اپنے سینے چلی آتی ہے۔ یہاں وہ ایک جیسے فخر و ترقی سے اور ساتھ ہی نیہال کو یہ انکشاف کرتی ہے کہ یہ بچہ سردار کا نہیں بلکہ اسے بخشی کا ہے اور یہ ان کے لیے ہی شادی ہے کہ اب وہ سردار کے گھر کو لے جائیں گی۔ وہ نیہال کو اسے صرف اتنی بات کہتی ہے کہ وہ اسے بخشی کا جوڑتے ہیں اور وہ اسے بخشی کی عورت بناتی ہے۔ سب سردار (نیہال) کو کہتی ہے۔ یہی نیکو (بخشی) تو شادی شدہ ہے اور اس کے سینے میں تو میرو کی ہے اس لیے وہ اسے بخشی کا جوڑتے ہیں اور اسے بخشی کا جوڑتے ہیں۔ اسے وہی مانگتے ہیں کہ

سماتا ہے کہ میں اس کی نوکری چھڑاؤں۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ میں نے ایک دفعہ دیکھ لیا  
جوان بازوؤں کی پگڑی بھی ہوتی ہے۔۔۔“

اس طرح اگرچہ ویروکا باغیانہ رویہ ہمارے سامنے آتا ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ بغاوت منہج فطری  
تھانوں کی تسکین تک محدود رہتی ہے سابق یا معاشرتی حقوق کی پاسداری اس کا طمع نظر نہیں۔ ویروکا جانتی ہے  
کہ منشی مدان سنگھ اسے گھر بسائیں سکتا اور وہ اس پر منحصر بھی نہیں اور نہ وہ اسے اپنا حق سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کا خلوص  
دیکھیے کہ اس غشی کی نوکری کے لیے منتظر ہے۔ دوسری طرف اب وہ نہ دار کے گھر بھی نہیں جا سکتی اور وہ اس  
لئے نہیں کہ اسے نہ دار کا ہاتھ لٹا دیا جائے بلکہ نیبال کور کا وہ مشتاقانہ اور ہمدردانہ رویہ ہے جس نے اسے محبوب  
کر دیا ہے اور وہ اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یہاں بھی نیبال کور کے ساتھ ویروکا خلوص اور سچائی اختیار  
کرتی ہے۔۔۔۔۔ وہ کہتی ہے

”سردارن امیں ونیا سے جھوٹ بول سکتی ہوں مگر تم سے نہیں۔۔۔ میں نہ دار کی کسی طرح بھی  
احسان مند نہیں ہوں۔ مگر میں تمہاری احسان مند نہ رہوں۔ اگر یہ لڑکا صرف نہ دار کے آنگن  
میں ہی میٹا تو مجھے کوئی ہذر نہیں تھا مگر میں اسے تمہاری جھولی میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ تمہاری جھولی  
کے قابل نہیں ہے۔۔۔ سچ کہتی ہوں تم نے مجھے اپنے لیے کوئی چھتاوا نہیں آکر دل میں کوئی پچھتاوا  
ہے تو صرف تمہارے لیے۔۔۔۔۔“

اگرچہ امرتا پریم اردو افسانے کو کوئی بڑا نسوانی کردار تو نہیں دے سکیں مگر چند دلچسپ اور قابل ذکر کردار  
نہ ورتاؤں گئیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ منشا بیدی عسست اور کرشن چندر کے  
نسوانی کرداروں نے مقابلے میں یہ کردار زندگی کی ایسی حقیقتوں کی تجاہد کشائی نہیں کر سکے جن سے ہم پہلے  
نے واقف نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ان کرداروں کی ہمت یہ ضرور بتاتی ہے کہ یہ امرتا پریم نے خالص نسوانی  
کردار ہیں۔

## ایک شام۔۔۔۔۔ امرتا پریتم کے ساتھ

ابتدائی جاز سے تھے مجھے پشاور پوسٹ ہونے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا، لیکن سب سے اہم اور دقیق بات یہ کہ صادقین صاحب ہمارے مہمان تھے اور اپنے دیرینہ اور ایٹانائٹا آشنا وعدوں کی ایفا کی مسامی میں کھڑے۔ ڈرائنگ روم نگار خانہ چین بنا ہوا تھا اور گھر کی ساری ذی روح موجودات فرش پر چمکی اس قرطاس پر نظر سے۔ جینھی تھی بس پر دو ہمسائے الرحمن الرحیم لکھ رہے تھے کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ مہو تر صاحب شریف الہ ہیں۔ اچھا تو گویا مہو تر صاحب اسلام آباد سے میرے تعاقب میں پشاور بھی پہنچ گئے۔ راجند رام مہو تر صاحب ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ انبالہ سے آتے اور انبالہ فرسٹ کے مشاعرے کی پرزور دعوت دیا کرتے لیکن ملازمت کی الجھنوں کے سبب باوجود کوشش کے یہ تیل منڈھے نہ چڑھ سکی تھی۔ میں خود اپنے آپ سے شرمندہ تھا کہ ہر سال ان سے وعدہ کر لیتا ہوں لیکن پورا نہیں کر پاتا۔ اسلام آباد پہنچ کر انہوں نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگرچہ میرا پشاور کا نہیں ہے لیکن میں آپ کا دعوت نامہ ہر صورت ایک بار پھر آپ کو ضرور پہنچاؤں گا جس کا مجھے چنداں یقین نہ تھا۔

لیکن اس بار تو انہوں نے انبالہ کے دعوت نامے کے ساتھ ہی دلی کے مشاعرے کا دعوت نامہ بھی بھیج کر دیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ یقین دلایا تھا کہ آپ کے اسلام آباد کے سارے ساتھی بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ان ناموں میں سرفہرست فرما کا نام تھا۔ فرماز سے پوچھا تو انہوں نے کہا "ہاں میں جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو گپ رہے کی۔"

دلی اور فرماز اور پھر گزشتہ کئی سالوں کی وعدہ شکنی کی شرمندگی نے ایسا کام کیا کہ یکدم قلندر دلی کی طرح (دل ہی دل میں) میں نے غرور و غشی مارا اور زندگی کی کندالال قلعے کی فسیل پر پیچک دی۔ ممبر ہی آ کر کوئی دڑتے دڑتے فون کیا۔

”سر ایک پندرہ دن کی چھٹی چاہیے۔ عزیزوں سے ملنے ہندوستان جانا ہے۔ انتہائی ضروری ہے۔ میں نہیں گیا تو گھر کے دوسرے افراد بھی نہ جاسکیں گے۔“ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ انہوں نے ترنت فون پر بی چھٹی دیدی اور چند دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد میں ثروت، شمیم اکرام الحق، پروین فدا و اہد کے راستے انہا لے پہنچ گئے۔ فرازا کیلئے ایک دن بعد پہنچے۔

انہا لے میں دو تین بڑے یادگار اور بقول ایرانیوں کے ماندگار دن گزار کے ہم لوگ واپس پہنچے۔ میں اپنے ایک دوست فرید صدیقی کے ہاں ٹھہرا جب کہ فرازا پاکستان کے ایک سفارت کار کے ساتھ۔ یوں تو یہ واپس کا مشاعرہ بھی بوجہ بڑا ماندگار تھا لیکن اس بارے میں کچھ کہنا مجھے موضوع سے دور کر دے گا اس لیے اپنے بیان کو صرف اس شام پر محدود کرتا ہوں جب میرے میزبان نے امرتا پر تہم امر و ز اور فرازا کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔

کھانے کے مقصد وہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی خانم میزبان نے مجھے اطلاع دی کہ آج کے کھانے پر فرازا کے علاوہ امرتا پر تہم اور امر و ز بھی آ رہے ہیں۔ یہ سن کر میرا آکسانٹ منٹ اس نقطہ پر پہنچ گیا کہ اس کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا اور میں نے خانم گرامی سے ایسے ایسے چٹکانے سوال کرنا شروع کر دیے کہ انہیں تنگ آ کر کہنا پڑا *Patience Patience she will be here within an hour*

اس ایک کھنے میں امرتا پر تہم کی اس ٹھیس نے جو 53-1952 کی ایک عام سی شام میں اہم کاٹ پشاور سے ہوٹل کے نیم روشن کمرے میں یکدم میرے ذہن پر چھا گئی تھی۔ کیسے کیسے رنگ بدلے قابل بیان نہیں۔ اس ہی شام زندگی میں پہلی بار میں نے امرتا پر تہم کا نام سنا اور پہلی بار اس کی شہرہ آفاق نظم کی تاباں زندگی اور رہنے والی باتوں سے میرے کان آشنا ہوئے جب میرے ہم کلاس نے ”ساوے پتھر“ سے لہک لہک کر یہ باتیں پڑھیں۔

آکھیاں وارث شاہ نوں کتھوں قبریاں وچوں بول  
تے ان کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول  
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے دین  
آج نکھیاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

ہم نے یہ غلط اب نہ سمجھا تا اور ہر گھڑی ذہن کے بیولے صورت بدلتے رہتے تا آنکہ جب ان کے

آجہانے کی ہمیں اطلاع ملی اور ہم ان کے ذرا نیچے روم میں جہاں فرید صدیقی کے مارے ہوئے ایک شیر کی کھال بھی دیوار پر آویزاں تھی پہنچے تو میں نے دیکھا کہ لمبے باز اور ذلیل ڈول کی اوجھڑی عمر کی ایک خاتون جن کا چہرہ قسم کے منہ آپ سے عادی تھا انتہائی سادی سا لباس میں ملبوس صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ ان کے ساتھ امر و زان سے مر میں بہت کم و بڑے پتلے سانولے رنگ کے پینتیس چالیس فی مر کے نکلے آتے تھے۔ تعارف کی چھوٹی سی تقریب کی مسروریت ختم ہی ہوئی تھی کہ برادر مر از بھی آ پہنچے اور چربی و مٹھن میں جان آ گئی۔ اس کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ پھر شربت روح افزا کی بوتل بھی کھول لی گئی اور یہ مر و چونکہ جسے جوشہ نسبتاً سکون تھا پر جوش آوازوں اور بلند بانگ باتوں سے گونجنے لگا۔

کھانے کی یہ تقریب یقیناً دو تین گھنٹے تو جاری رہی ہوگی۔ اس کی کوئی خاص بات تو حافظے میں نہیں البتہ اس کے چند روشن تاثرات آج بھی قائم ہیں۔ پہلی بات امرتا پریم کی شخصیت سے متعلق ہے۔ اور یہی اس تحریر کا موضوع بھی ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے محسوس کیا کہ وہ گہرے پانیوں کی طرح خاموش و پرسکون تھیں۔ انتہائی سنجیدہ انتہائی متین ایسی شخصیت کہ نفس مطمئنہ حاصل کر چکی ہو۔ باتوں میں بھی کوئی تیزی نہیں کوئی تندی نہیں۔ کسی پر کوئی پورا انت اسکو نہیں کرنا۔ جیسی آواز چھوٹے چھوٹے جملے آہستہ آہستہ باتیں۔ کوئی عجائبات کوئی اضطرابی دور و در نہیں۔ مجھے جہاں تک یاد ہے (ممکن ہے غلط ہو) انہوں نے شربت روح افزا بھی نہیں پیا۔ چہرے پر وقت کی ہی ظہائیت کہ مسکراہٹ بھی نہ لہی جاسکے لیکن ہم نشین کو یہ اعتماد کہ ہر تن میری طرف متوجہ ہیں۔ البتہ امروز نے تو مجھے بڑے واضح کاف الفاظ میں بتایا کہ وہ شراب نہیں پیتا۔۔۔ اور اس وجہ سے کہ ابھی نہیں گئی۔۔۔

فرید صدیقی کی میزبانی کا دو گونہ سپاس گزار ہوں کہ جہاں انہوں نے مجھے اور میری ہم سفر کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور مجھے ہندوستان کی ایک عظیم شخصیت سے ملنے کا موقع فراہم کیا وہیں اس تقریب کو یادگار بنانے کے لیے ایک نوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا۔ سو یہ ان ہی کے طفیل ہے کہ میں آپ کی خدمت میں یہ تصویر ارسال کر رہا ہوں جہاں ہندوستان و پاکستان کی دو عظیم شخصیتوں کے درمیان میں بھی ایک ادنیٰ عقیدت مند ہم سفر کی کے درپے نظر آ رہا ہوں۔ جب کہ تصویر زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ میں حقیقت سے زیادہ مزید پا ہوں۔

فرید صدیقی

## پھولوں کے درمیان امرتا پریم سے ملاقات

۲۲ تا ۲۵ دسمبر ۲۰۰۰ء کو بھارت کے شہر چندی گڑھ میں عالمی پنجابی کانفرنس ہوئی۔ پاکستان سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا وفد عالمی پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان کی سربراہی میں بھارت گیا۔ ان دنوں بھارت کے ساتھ پاکستان کے حالات خوشگوار نہیں تھے اس لیے سب سے پہلے دلی جا کر پولیس رپورٹ کرائی جاتی تھی۔ دلی سے ہم چندی گڑھ گئے۔ واپسی پر بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ یہ میرا پہلا بھارتی دورہ تھا۔

دلی پہنچ کر امرتا پریم سے ملاقات نہ کی جائے یہ ناممکن تھا۔ کنول مشتاق سے میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ چوں کہ وہ قبل ازیں دلی جا چکا تھا۔ اُس کی ملاقات امرتا پریم اور امروز سے ہو چکی تھی جب کہ امروز سے اس کی خط و کتابت بھی رہی۔

کنول مشتاق اور میں رکشہ میں بیٹھ کر ”حوض خاص“ پہنچ گئے۔ کنول مشتاق، امرتا جی کی کونھی کا نمبر بھول گیا۔ کونھی پر پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہاں امرتا نام کی کوئی خاتون رہائش پذیر نہیں۔ حوض خاص کی آبادی میں ہمیں ایک پوسٹ مین نظر آیا۔ اُس سے امرتا پریم کی کونھی کا نمبر دریافت کیا۔ پوسٹ مین نے کہا ”کیا یہ کسی شخص کا نام ہے“ پوسٹ مین کا جواب سن کر میں سوچنے لگا کہ اتنی نامور شخصیت کے بارے میں پوسٹ مین کہہ رہا ہے ”کیا یہ کسی شخص کا نام ہے؟“

ہم نے کتابوں کی ایک دکان سے معلوم کیا۔ انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ کنول نے پھر دلی میں کسی کو فون کر کے امرتا پریم کی کونھی کا نمبر دریافت کیا۔ آخر ہم امرتا کی کونھی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ امروز نے دروازہ کھولا۔ اُس نے کنول مشتاق کو پہچان لیا اور ہمیں چھت پر لے گیا۔ امروز نے بتایا کہ سردی کی وجہ سے امرتا آؤپر ڈھوپ میں بیٹھی ہے۔ چھت پر امرتا جی پھولوں کے درمیان ایک چارپائی پر لیٹی تھی۔ ہمیں دیکھ

کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ بیماری کے سبب کنول مشتاق کی امروز سے خط و کتابت رہتی ہے، اس لیے میں نے دیکھا۔ امرتا پر تم نے چارپائی کے قریب میز پر ایلو پینٹ اور ہومیو پیتھی دونوں ادویات رکھی تھیں۔ میں نے دریافت کیا۔ دو مختلف علاج۔۔۔۔۔ امرتا نے جواب دیا کہ ”ڈاکٹر زوے مشورے نال ہی دونوں قسم ای میڈیسن استعمال کر دی ہاں۔“ میز پر کالا انگور بھی پڑا تھا جو ہمیں کھانے کے لیے دیا گیا۔ کنول نے سگریٹ پینے کی اجازت چاہی تو امرتا نے کہا: ”اجازت کہو؟ میں خود ہی تے سگریٹ پیندی ہاں۔“ انھوں نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈیا دکھائی۔

میں نے کہا کہ بیماری کے باوجود آپ سگریٹ جیتی ہیں۔ ڈاکٹر زوے منع کرنے کے باوجود پلی لیتی ہوں، جواب تم کر دیے ہیں۔ میں نے اپنی ڈائری امرتا جی کے سامنے رکھ دی اور آٹو گراف کی درخواست کی۔ انھوں نے نرمی میں لکھا۔

”تویر ظہور انی میریاں شہا چھیاواں۔ امرتا پر تم۔“

ان دنوں امرتا پر تم کی کتاب ”عشق اللہ حق اللہ“ زیر طہاعت تھی۔ اس کتاب کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ کتاب میں روحانی پہلو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ”چراغوں کی رات“ کے بارے میں بتایا کہ یہ کتاب ہندی میں چھپ چکی ہے۔ اب پنجابی میں شائع ہوئی جس کا نام رکھا گیا ہے ”چراغوں کی رات“ انھوں نے مجھے اپنی ایک کتاب ”آواز دی دنیا والو“ عنایت کی جو ترجمہ میں ہے۔ اس کتاب میں امرتا پتیم نے اہور اور وینی ریڈیو کے تجربات بیان کیے ہیں۔ ایک کتاب ان کی ”گاؤندا بھارت“ شائع ہوئی جس میں انھوں نے بھارت میں مقیم مختلف قوموں کے گیتوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔

امرتا جی نے بتایا کہ بیماری کے سبب اب میں کہیں نہیں جاتی۔ ۱۹۸۰ء سے قبل میں نے کافی سیاحت کی ہے۔ مختلف علاقوں میں جا کر تقریریں کرتی۔ میری تقریروں کا موضوع ”امن“ ہوتا۔ میں نے اپنی کئی تقریروں کا موضوع پاکستان کے معروف افسانہ نویس مظہر الاسلام کو Quote کیا ہے۔ میں اکثر کہا کرتی ہوں کہ ”اے خدا لکھنے والوں کو سچ لکھنے کی توفیق دے“

امرتا جی نے بتایا کہ اردو افسانہ نگاروں میں انھیں مظہر الاسلام کے علاوہ احمد داؤد کے افسانے پسند ہیں جب کہ پنجابی نگاروں میں افضل تو صیف، افضل احسن احمد ہاوا، فخر زمان اور سارا شعلہ کو پسند کرتی ہیں۔



امرتا جی نے بتایا کہ افضل تو صیف کا فون آیا۔

وہ کہہ رہی تھیں۔ آپ کے لیے کیا لادیں؟

میرا جواب تھا۔ اپنی کہانیاں اور کالم لے آؤ۔ ”دوسرے آدم کی بیٹی“ یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں ہندی میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ ۲۰۰۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ امرتا نے اپنے رسالے ”ناگ منی“ کا ایک شمارہ ”توصیف نمبر“ بھی شائع کیا۔ امرتا پر تم افضل تو صیف کے بجائے انھیں ”توصیف“ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ امرتا پر تم نے افضل تو صیف کے کالموں کے بارے میں لکھا ”اخباروں میں چھپنے والے تو صیف کے کالم مصیبت زدہ ملاقات کی ایک واحد گواہی ہیں۔ اُس کے کالم کبھی ایک اخبار میں سلسلہ دار آتے ہیں۔ پھر اس اخبار پر پابندی لگ جاتی ہے۔ تو تو صیف کوئی دوسرا اخبار تلاشتی ہے۔ لیکن اپنی آواز کو وقت کی ضرورت کے وقت غیر حاضر نہیں ہونے دیتی“

جس روز امرتا جی سے ملاقات کی۔ اُس روز ملکہ ترنم نور جہاں کے انتقال کی خبر سنی۔ میں نے ملکہ ترنم کے بارے میں امرتا سے پوچھا تو انھوں نے کہا۔۔۔ ”جب میں لاہور گئی بازار میں مقیم تھی تو نور جہاں کا مکان قریب ہی تھا۔ میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اُس وقت وہ ”بے بی نور جہاں“ تھی۔ نور جہاں اور ملتا متعلیٰ شکر کا دور منظر وہ ہے“

میں نے امرتا جی سے دریافت کی آپ نے اپنی نظم میں وارث شاہ ہی کو کیوں آواز دی؟

امرتا پر تم کا جواب تھا۔۔۔

”اُس وقت میں ڈیڑھ دنوں سے دہلی روزی کی تلاش میں آرہی تھی۔ اس سفر کے دوران میں نے سڑکوں پر، اسٹیشنوں پر اجڑے ہوئے بے گھر اور تباہ حال لوگ دیکھے۔ رات کی ویرانی میں ریل کے سفر کے دوران مجھے ڈوڑتے ہوئے درخت انسانی ڈھانچے لگے جو چیخ رہے تھے۔ ریتلے نیلے مجھے قبریں لگیں۔ میرے سامنے اس وقت وارث شاہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا جسے میں مخاطب کر کے اپنے اندر کا کرب منتقل کر سکتی۔“

جنوری ۲۰۰۱ء کو میں راولپنڈی گیا تو مجھے بتایا گیا۔ پنجابی کے مشہور ادیب افضل پرویز فالج کی وجہ سے

نعت طویل ہیں۔ میں ان کی عیادت کو چلا گیا اور ان کا انٹرویو کیا۔

یہ انٹرویو روزنامہ جنگ لاہور میں ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔ افضل پرویز نے مجھے بتایا کہ ان کی جب امرتا پریم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی مشہور نظم ”آکھیاں وارث شاہ نوں“ سنائی۔ امرتا پریم کی نظم میں یہ شعر نہیں تھا۔

اٹھ درد مندوں دیا دروہا اٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں و چھیاں تے لہووی بھری چناب

افضل پرویز کے بقول یہ شعر ان کا ہے جو امرتا کو ”دان“ کر دیا اور انھوں نے اس شعر کو اپنی نظم میں شامل کر لیا۔ میں نے اس انٹرویو کی فوٹو کاپی ولی میں امروز کو بھجوائی انھیں لکھا کہ امرتا جی سے پوچھ کر لکھیں کہ کیا افضل پرویز کا دعویٰ درست ہے؟ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور سوال امروز سے پوچھا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے مذہب کے حوالے سے رکیمیں ادا کیے بغیر امرتا پریم کے ساتھ شوہر اور بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں؟

امروز نے میرے لیٹر کا جواب دیا۔ ملاحظہ کریں

”یاد رہے کہ امروز شاہ کھی یعنی فارسی سکر پٹ لکھ اور پڑھ لیتے تھے، جب کہ امرتا پریم شاہ کھی سکر پٹ پڑھ نہیں سکتی تھیں۔

”تنویر ظہور جی۔ تہاؤں خطہ دا شکر یہ۔“

راجستھان دے کئی پنڈاں وچ عورت تے مرد پنڈ دے سر بیچ کول جاندے سن تے

کہندے بن کہ اج توں اوہ میرا مرد ہے تے اوہ میری عورت ہے تے سر بیچ کہندا

ہے ٹھیک ہے... تقریباً چالی سال پہلاں اساں وی اک دوجے نوں اپنا مرد تے اپنی

عورت آکھیاں، پر اپنی حاضری وچ بغیر کسے بول دے تے بغیر کسے سر بیچ دے۔

جو بندہ اپنے بول دا اپنے کرم دا، تے اپنی سوچ دا ذمے دار ہے، اُس نوں قانون دی کی لوڑ ہے۔

پر صدیاں ہو گئیاں نے نہ کسے قانون نال تے نہ کسے مذہب نال آدمی ذمے دار نہیں

ہو پایا۔ نا اپنے بول دا نا اپنے کرم دا تے نا اپنی سوچ دا...“

افضل پرویز جی نے جو وی لکھیا ہے اس دے اوہ آپ ہی ذمے دار تے۔ امرتا اُردو

نہیں پڑھ سکدی۔ ”جنگ“ دا کالم کیوں پڑھے گی تے نہ اوہ اہ بول، بول سکدی

اے۔ میرے دھن بھاگ.....! پرویز جی نے اپنے کولوں ہی او سب کچھ لکھ لیا اے۔  
اپنے آپ نوں خوش کرن لئی۔ امرتا بارے اکثر لوک اپنے کولوں ہی بڑا کچھ لکھ دے  
آئے ہن۔ پہلاں اپنے آپ نوں تے فیر پائھکاں توں بھلیکھے پان لئی۔ پتہ نہیں او  
بھلیکھے بازاء دے دن کدوں ختم ہون گے۔

میرے خیال وچ کوئی وی جاگ دالیکھک نہ بھلیکھے پاوندا اے تے نہ بھلیکھے پالدا  
اے۔ قانون تے مذہب آدمی نوں چگاں دی گل تاں کر دے ہن پر جگانہ دے نیں۔  
کیوں جو جاگدے آدمی تے حکومت نیں ہوسکدی۔“

امروز

کنول مشتاق جی نوں میرا سلام

تے ہر جاگ دے آدمی نوں میرا سلام

امرتا پر تیم پاستانی شاعر و سارا ثقافت کی شاعری کی مداح تھیں سارا ثقافت کا قیام کراچی میں تھا۔ کراچی  
قیام کے دوران سارا سے میری بھی چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔  
وہ جوانی ہی میں ایک حادثے میں انتقال کر گئی۔

سارا ثقافت کے بارے میں امرتا پر تیم کا کہنا تھا کہ وہ ایک بچتے ہوئے ستارے کی مانند میرے سامنے  
آئی تھی۔ کسی بھی ستارے کے ٹوٹنے کے بعد اس کی جو گرم راکھ زمین پر گرتی ہے وہی راکھ ہمیں نے اُس کی  
نظموں میں محسوس کی ہے۔ میں نے اُس کو لکھا تھا کہ تم اپنی زندگی کے حالات خود اپنے ہاتھوں لکھو، لیکن وہ نہ لکھ  
سکی۔ میرے پاس اس کی بہت سی نظمیں اور خطوط محفوظ ہیں۔ اب میں ان کو لکھوں گی۔ اس سے بہت سی غلط  
فہمیاں جو لوگوں کو اُس کی زندگی کے بارے میں ہیں ختم ہو جائیں گی۔

امرتا پر تیم کی وفات کے بعد پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر نے الہمراہال میں تعزیتی  
ریفرنس کیا۔ نظامت شائستہ نزہت اور صدارت منیر نیازی نے کی۔ سٹیج پر ان کے ساتھ سبط الحسن ضیغم، منو  
بھائی، شہزاد احمد، افضل تو صیف، فرخندہ لودھی اور بشریٰ اعجاز تشریف فرما تھیں۔۔۔ اقبال باہو نے امرتا جی کی  
مشہور نظم ”آج آکھاں وارث شاہ نوں“ ترنم سے سنائی۔ افضل تو صیف نے کہا کہ امرتا جی میری دوست ہی  
نہیں، استاد بھی تھی، میرے کئی اساتذہ ہیں مگر امرتا پر تیم کو میں Best Teacher کہتی ہوں۔ میں نے

اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی نظمیں سنیں اور اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کو پڑھا۔ وہ ٹھنٹوں کے حساب سے ٹھنٹو کرتیں اور اپنی نظمیں سناتیں۔

سبط الحسن ضیغم نے بتایا کہ امرتا کا شعری مجموعہ ”نویں رُت“ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اس طرح فروخت ہوئی جس طرح ہیر وارث شاہ اور سیف السلوک فروخت ہوتی ہیں۔

امرتا کی بائیوگرافی ”رسیدی ٹکٹ“ کے نام سے شائع ہوئی، میں نے اُس نام کی وجہ دریافت کی تو امرتا پر تم نے کہا۔ خشونت سنگھ جی سے ایک دن بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ تمہاری زندگی میں دو تین حادثوں کے علاوہ کیا ہے۔ ان کو اگر لکھیں تو ایک ٹکٹ پر لکھا جاسکتا ہے۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ٹکٹ کے سائز تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن ”رسیدی ٹکٹ“ کا سائز بھی تبدیل نہیں ہوتا۔

میری زندگی میں وقتاً فوقتاً جو حادثے ہوئے تھے میں نے انھیں نظم اور افسانے میں منتقل کر دیا تھا۔ ان ہی واقعات و حادثات کو دوبارہ قلم بند کر کے میں نے ان ”رسیدی ٹکٹ“ لگا کر پکا کر دیا ہے۔

☆☆☆☆

## عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا، اور رخصت کی اجازت لینے کے لیے اٹھا، مگر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔

”نہیں، بیٹا ابھی نہیں، کچھ دیر اور رک جاؤ، انجی میں نے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، اپنے دیس کی باتیں، اپنی جنم بھومی کی باتیں، اپنے پنجاب کی باتیں۔۔۔ ابھی تو میرا دل یادوں کے خزانوں سے بھرا پڑا ہے۔۔۔۔۔ ابھی نہیں، رہیٹھ جاؤ، تم دونوں نے مجھے ماضی میں لاکھڑا کر دیا ہے۔“

ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، میں نے کہا، دل تو نہیں چاہتا، مگر ایک کمینٹ ہے، جو جانے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ احمد داؤد نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا، اور قلوگیر لہجے میں کہنے لگا، امرتا جی، آپ نے ہمارے دامن میں اتنی محبت، شفقت اور خلوص بھر دیا ہے کہ آنے والے دنوں تک یہ ہمیں سرشار کرتا رہے گا۔ امرتا جی نے ایک بار پھر ہم دونوں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا، سر جھکا کر کہنے لگیں، ”اچھا بیٹا، رب راکھا۔“ اس سارے الوداعی منظر کے دوران امروز خاموشی سے ہم تینوں کی باتیں سنتے اور آنکھوں سے نرنے آنسوؤں کو نشتے رہے، اور پھر سر جھکائے وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔

امرتا پریم کے ساتھ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ دوسری بار میں دہلی گیا، تو وقت کی کمی کے باعث صرف فون پر بات ہو سکی، ملاقات نہ ہونے پائی۔ پہلی بار احمد داؤد مرحوم اور میں اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی اور ممبئی گئے تھے، دہلی میں قیام کے دوسرے دن سے ہی ہم نے کوششیں شروع کر دی تھیں کہ امرتا پریم سے ضرور ملنا ہے، امروز کے ذریعے ان سے ہماری خط و کتابت پہلے سے تھی، وہ ہمارے نام اور کام سے واقف تھیں۔ کیونکہ ان کے میگزین ”ماگ منی“ میں احمد داؤد کے افسانے اور میری نئیں شائع ہو چکی تھیں، یہ تخلیقات امروز نے پانستانی رسائل سے لی تھیں۔

جس دن ہماری ملاقات طے ہوئی، اس شام کو کانفرنس میں احمد داؤد نے مضمون پڑھنا تھا جب کہ مجھے انتہائی مشاعرے میں شرکت کرنا تھی۔ ناواقفیت کی وجہ سے کافی دیر ٹیکسی ڈرائیور ہمیں گھماتا رہا، بالآخر ہم حوض خاص کے ملاقاتی میں ان کی رہائش پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے، امروز نے ہمارا استقبال کیا اور لاؤنج میں لے گئے، امرتاجی صوفے پر بیٹھی تھیں، ناسازی، طبع کے باوجود انہوں نے اٹھ کر ہمیں گلے لگایا، اور صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ حال احوال کے بعد امرتاجی نے کتاب ماضی کھولی، اور پھر ورق کے ورق الٹتے گئے، چند ایک قہقہوں کے سوا، بقیہ وقت آہوں اور آنسوؤں کے جلو میں گزرا، تقریباً تین گھنٹے وہ ہم سے باتیں کرتی رہیں، بچپن، جوانی، برصغیر کی تقسیم، پنجاب کا المیہ، کچھ نظموں کے پس منظر، بیرونی ممالک میں سفر کے احوال۔ بیچ بیچ میں وہ نظموں کی کچھ لائیں بھی سناتی رہیں، میری فرمائش پر انہوں نے ”اج آکھاں وارث شاہ نوں“ سنائی۔ امروز چائے لے کر آئے تو امرتاجی خود اپنے ہاتھوں سے ہمیں چائے بنا کر دی۔ اس دوران ہم نے امروز کی پینٹنگز بھی دیکھیں۔

پاکستان واپس آنے کے بعد میں نے انہیں دو تین خط لکھے، ٹر ایک خط کا جواب آیا، جس میں انہوں نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا

۲

ان کی تمام خط و کتابت امروز کیا کرتے تھے، کیونکہ میرے خیال میں امرتاجی اردو نہیں لکھ سکتی تھیں، بعد ازاں ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا، لیکن پہلی ملاقات ہمیشہ دل کے آئین میں تازہ بہ تازہ پھول کھلاتی رہی، بقول میر،

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

امرتاجی سے میرا پہلا تعارف، ان کی مقبول و معروف سوانح ”رسیدی ٹکٹ“ سے ہوا تھا، اس کے بعد ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو، جو میرے مطالعے سے بچ گئی ہو۔ ان کی کئی نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں، جو میں اکثر تنہائی میں خود کو اور محفل میں احباب کو سناتا۔ یوں تو امرتاجی کی لاتعداد ایسی نظمیں ہیں جو جدید پنجابی نظم میں سب سے منفرد دکھائی دیتی ہیں، تاہم کچھ نظموں کی سطریں ایسی ہیں کہ وہ دل اور روح تک اتر جاتی ہیں، ان کی نظموں کے استعارے، غلامتیں، اور تشبیہات قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہیں!

نفسے دا اک تھان بنایا

- گز کوں کپڑا پاڑ لیا  
تے عمر دی جھولی سیتی۔
- ۲ عرض کرے دھرتی دی دائی  
رات کدے دی ہانجھ نہ ہووے،
- ۳ اک وار اچانک ٹو آیا  
تے دقت از لوں حیران
- ۴ میرے کمرے وچ کھلوتا رہ گیا  
ست رنگ پانی وچ ٹھلدا  
اشواں دل وچ ٹھلدا  
ست رنگاں وچ جھیس رنگاواں  
اشوئیں رنگ وچ سفنا
- ۵ نجی اکھڑ میں دی پھڑکی  
موت دے کورے کاغذ آتے  
زندگی نے اٹکھٹھالایا

۳

چند ماہ پہلے گلزار جی نے مجھے ممبئی سے ایک بہت خوبصورت اور ہمیشہ یاد رہنے والا تحفہ بھیجا، وہ قیمتی تحفہ ہر رات مجھے گلزار اور امرتاجی سے ملاقات کراتا ہے۔ یہ ایک سی ڈی ہے، امرتاجی کی نظموں کو گلزار نے اپنی منفرد آواز میں ریکارڈ کیا، اور ہر نظم سے پہلے امرتاجی کے بارے میں اور نظم کے حوالے سے بہت خوبصورت تبصرہ کیا ہے، جن احباب تک یہی سی ڈی نہیں پہنچی، ان کے لیے چند اقتباسات:

” امرتاجی نے پنجابی شاعری کے صفحوں پر تقریباً پوری بیسویں صدی چل کے اکیسویں صدی کی دہلیز پار کی تو جسم تھکنے لگا، روح مگر تازہ دم تھی، شاید چلنے کو انھیں، تو امروز نے ہاتھ تھام لیا، جو ایک صدی سے ان کا ہم قدم تھا، مزہ کے دیکھا،،،، ہاتھ ہٹا نہیں تھا، انگلیاں ابھی چھوٹی نہیں تھیں، بولیں، ”میں تینوں فیر ملاں گی“

میں تینوں فیر ملاں گی  
 کتھے، کس طراں، پتہ نہیں!  
 شاید تیرے تخیل دی چنگ بن کے  
 تیرے کیوس تے اُتراں گی  
 یا خورے تیرے کیوس دے اُتے  
 اک رہس نئی لکیر بن کے  
 خاموش تینوں بکدی رہواں گی،  
 میں تینوں فیر ملاں گی۔۔۔  
 یا خورے سورج دی لو بن کے  
 تیرے رنگاں وچ گھلاں گی  
 یا رنگاں دیاں بانہواں وچ بیٹھ کے  
 تیرے کیوس نوں ولاں گی  
 پر تینوں ضرور ملاں گی  
 یا خورے اک چشمہ بنی ہوواں گی  
 تے جیویں جھرنیاں دا پانی اڈدا،  
 میں پانی دیاں بونداں تیرے پنڈے تے ملاں گی  
 تے اک ٹھنڈک جی بن کے  
 تیری چھاتی دے نال لگاں گی

۴

میں ہو رکھ نہیں جاندی  
 پر ایناں جاندی آں کہ وقت جو دی کرے گا  
 ایہہ جنم میرے نال ترے گا  
 ایہہ جسم ملدا اے، تے سب کچھ مک جاند اے



پر چیتیاں دے دھاگے  
 کائناتی کناں دے ہوندے نہیں  
 میں انہاں کناں نوں  
 پنٹاں گی،  
 دھاگیاں نوں ولاں گی  
 تے تینوں فیر ملاں گی۔

بقول گلزار: "امرتاجی کی نجی نظموں میں بھی زمانہ نظر آتا ہے، اُن کا دور دکھائی دیتا ہے، بات کرتے  
 کرتے ایک کائنات کھول کے رکھ دیتی ہیں، لیکن جب کائنات کو سمیٹ کر نجی بات پر آتی ہیں تو کچھ دوستوں  
 کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں، اور وہاں وہ گویا گھرے گھرے دنیاوی رشتے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جہاں سان  
 کے گھاٹ پار کرنے کے لیے بہت سے پُل جلا دینے پڑتے ہیں"؛

کل اساں دونہواں نہیں  
 اک پُل جلا یا سی  
 تے اک دریا دے کنڈھیاں وانگوں  
 نصیب ونڈے،  
 نصیب ونڈے، تے بدن چھنڈے  
 تاں اک پنڈے دی ویرانی ایس کنڈھے سی  
 تے اک پنڈے دی ویرانی اوس کنڈھے  
 تے فیر رتاں نے جدوں دی کچھ بھل دتے  
 تاں توں وی اوہ پنڈے توں توڑ دتے  
 تے میں وی اوہ رتاں نوں سوز دتے  
 تے جھڑے پیتاں وانگوں  
 نئے ای ورھے اساں پانی وچ روڑھ دتے

درہے مکے میں، پر پانی نہیں سکے  
تے وگدے پانیاں وچوں پر چھانویں تاں ویکے  
پر منہ نہیں سکے

تے ایس توں پہلاں  
کچھ وچھ تے کھلوتے ایس مکہ جاپے  
چل کھنگراں جے پنڈے پانی تے وچھاپے  
ٹوں آپے پنڈے تے پیر رکھیں  
تے ادھے دریا نوں لنگھ آویں  
میں آپے پنڈے تے پیر رکھاں گی  
تینوں اکوں دی ملاں گی  
چل کھنگراں جے پنڈے پانی تے وچھاپے۔

گلزار کہتے ہیں، 'چند ملاقاتیں یاد ہیں امرتاجی، اور امر دے، انہیں سوچ میں تو اکثر دیکھا تھا،  
تھاٹ فل، نظر آتی تھیں، لیکن اداس کبھی نہیں دیکھا، ہمیشہ بھری ہوئی، دودھ سے بھرے کٹورے کی طرح چھلکتی  
ہوئی۔۔۔۔۔ لیکن شاعر اپنی اداسی چہرے پہ کہاں لکھتا ہے، وہ تو اپنی نظموں میں بھر دیتا ہے، جیسے پانی میں مٹی  
بھر ریت اندیل دے، وہیں کہیں تہہ میں بیٹھ جاتی ہے وہ اداسی، نظم کی سطح پر بھی نظر نہیں آتی، نظم کھڑ و نچی پر  
پڑی رہتی ہے، رستے گھڑے کی طرح؟'

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی  
کل تک نہیں رہنا۔۔  
ایس پانی وے گن ترھیائے  
ترہید دے ہونٹھاں دانگوں  
او میرے ٹھنڈے ٹھٹ دیا ہڑا  
کہہ دے جو کچھ کہنا،  
میں تڑکے گھڑے دا پانی، کل تک نہیں رہنا

ارج دا پانی لیکن لاہوے  
 کل دی تریدہ داقروضہ  
 نہ پانی نے کشیں بھجنا  
 نہ پلے وچ رہنا ، وے میں تو کے گھرے دا پانی ، کل تک نہیں رہنا

۶

امرتاجی کو ہم سے چھڑے کئی موسم بیت گئے ، مگر ان کی کہانیاں ، ان کی نظمیں آج بھی ادب عالیہ  
 کے صفحات پر جگمگا رہی ہیں ، میں برس پہلے ان سے ملاقات آج بھی یادوں کے بام پر جلتے چراغوں کی طرح  
 جگمگا رہی ہے ، اور تصور کے منظروں میں آج بھی یوں لگتا ہے کہ وہ ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کہیں گی ، بیٹا ،  
 کچھ دیر اور رک جاؤ نا ، ۔۔۔ وہی آواز ، وہی مستابھرا مینھا لہجہ میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے ۔ امرتاجی ،  
 میں تو رک جاؤں ، مگر آپ ۔۔۔۔۔

زیادہ سے زیادہ دل بچھا دیتے ہیں رستے میں  
 مگر جس نے چھڑنا ہو ، اسے روکا نہیں کرتے

☆☆☆☆

## ساحر اور امرتا پریم

امرتا پریم کو میں نے 1943 میں پہلی بار دیکھا۔ پریت لڑی رسالہ شائع کرنے والے اور امرتا اور لاہور کے درمیان انسان دوستی اور محبت کے نام پر ”پریت نگر“ نامی بستی بنانے والے سردار گوردیٹ سنگھ اس بستی میں ہر سال ایک ادبی کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ ساحر لدھیانوی کے بطور شاعر شہرت حاصل کرنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اسے اس سالانہ کانفرنس کی دعوت ملی۔ وہ تہا سفر کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ کسی بھی نئی جگہ جانے کے لیے اسے بیساکھی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ بہت اصرار بلکہ منت ترے کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ پریت نگر لے گیا۔ یہ ہماری دوستی کا ابتدائی زمانہ تھا۔

کانفرنس میں ہم دن بھر تقریریں سنتے رہے مگر ہماری اصل دلچسپی رات کو منعقد ہونے والے مشاعرے سے تھی۔ اس مشاعرے میں سولہ سترہ برس کی امرتا پریم نے ایک پنجابی نظم سنائی۔ اسے داد بھی بہت ملی مگر بیشتر لوگ اس کی شکل و صورت کے اسیر ہو گئے ہمارا دوست نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ وہ تو جیسے اس پر فدا ہو گیا۔ اس نے بھی اس مشاعرے میں اپنی نئی نظم ”تاج محل“ سنائی اور خوب داد پائی۔ یہ ان دونوں کی پہلی تعارفی ملاقات تھی۔ سنج پر بیٹھے ہوئے ان دونوں میں کچھ بات چیت بھی ہوئی اور غالباً دونوں نے ایک دوسرے کی نظموں کی تعریف بھی کی۔ اس کے بعد اگلے روز ہم واپس لدھیانہ آ گئے لیکن ساحر کئی روز تک اس نئی شاعرہ کی باتوں کا ذکر کرتا رہا۔ ہمارے لدھیانہ کے اس گروپ میں آرٹسٹ پری کشن، موسیقار جے دیو درما، چیمپی بادرا، چودہری غلام مرتضیٰ، فیض الحسن، چودہری احمد ریاض اور میں اور میرے بڑے بھائی صفدر علی شامل تھے۔ ساحر کی زبانی ہفتوں امرتا پریم کا اتنا ذکر ہوا کہ ہم سب یہ سن کر عاجز آ گئے۔ 1945 میں ساحر لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکالے جانے کے بعد لاہور آ گیا اس نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا مگر وہ کالج کم ہی جاتا تھا۔ مکتبہ اردو لاہور کے چودہری برکت علی اور چودہری نذیر نے اسے ادب لطیف کی ایڈیٹری کی پیش

کش کی جو اس نے فوراً قبول کر لی اب اس کی سرگرمیوں کا مرکز بھائی اور لاہوری دروازوں کے درمیان سرنگر روڈ پر واقع ادب لطیف کا دفتر تھا۔ میں ان دنوں بے کار تھا۔ میں بھی لدھیانہ سے لاہور آ گیا اور تقریباً چھ ماہ اسی شہر میں ساحر کے ساتھ قیام پذیر رہا۔ اس دوران کسی ادبی محفل میں امرتا سے اس کی دوسری ملاقات ہوئی اور اسے پتہ چلا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ انارکلی کی دکان، جس پر جگت سنگھ کو اترا کا بورڈ لگا ہوا تھا، کے مالک کے بیٹے سے بیاہی گئی ہے اور اندرون شہر مقیم ہے۔ اس نے ساحر کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔

اگلے روز ہم اس کے گھر گئے۔ دو گھنٹے کی اس ملاقات میں باتیں بہت کم ہوئیں البتہ دونوں ایک دوسرے کو محبت اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد تو ساحر اس ملاقات کی باتیں ہی دہراتا رہا اور دو تین روز بعد پھر اس کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اسے کہیں جانے کے لیے ہمیشہ بیساکھی کی ضرورت ہوتی تھی مجھ سے جب اس نے ساتھ چلنے کو کہا تو میں نے سختی سے انکار کر دیا میرا موقف یہ تھا کہ مجھے اس قسم کی افلاطونی محبت سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ میں اس بور ملاقات کا فالتو کردار بننے کو تیار نہیں ہوں۔ ادب لطیف کے دفتر میں اس وقت دیوند رستیا رتھی بیٹھا تھا۔ ساحر بہلا پھسلا کر اسے ساتھ لے گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ واپسی پر جب میں نے سیتا رتھی سے پوچھا کہ ملاقات کیسی رہی تو اس کا جواب تھا "حمید جی امرتا نے ہمیں اپنے پیڑروم میں بلا لیا وہاں دیوار کے ساتھ کھوٹی پر اس کی شلوار لٹک رہی تھی میں نے اپنا کوٹ اس کے اوپر لٹکا دیا بڑا مزہ آیا۔"

چھ مہینوں کے اس قیام لاہور کے دوران ساحر دو چار بار پھر بھی اس کے گھر گیا مگر میں نے ان دونوں کی ان ملاقاتوں میں غل ہونے سے ہمیشہ اجتناب ہی کیا۔ ساحر وہاں جاتا ضرور رہا مگر وہ اس کے تندرست اور توانا شوہر سے خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ جگت سنگھ کو اترا کی دکان ادب لطیف کے دفتر سے انارکلی میں داخل ہونے والی سڑک کے عین سامنے واقع تھی۔ ہم صبح نظام ہوٹل انارکلی میں ناشتے کے لیے جاتے تو اس دکان کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ ساحر اس راستے کے بجائے ایک دوسرا اور نسبتاً لمبا راستہ اختیار کرتا۔ اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ امرتا کا شوہر اسے پکڑ کر اپنے گھر جانے سے منع کر دے گا۔ چند ماہ بعد ہم دونوں واپس لدھیانہ چلے گئے مگر امرتا کا ذکر مہینوں ہوتا رہا۔ جنوری 1946 میں ساحر کو فلم "آزادی کی راہ پر" کے گانے لکھنے کی پیش کش ہوئی۔ یہ فلم کانگریس کی آزادی کی جدوجہد کے موضوع پر تھی اور اس کے پروڈیوسر ساحر کے ایک کلاس فیلو کلونت رائے تھے۔ کلونت کنز کانگریسی تھے ساحر کی زندگی کا تو مقصد ہی فلمی گانے لکھنا تھا اس نے کبھی بڑا

شاعر بننے کی آرزو نہیں کی، ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ وہ فلموں کے لیے ایسے نئے لکھے گا کہ دنیا اسے یاد کرے گی۔ فلموں کے لیے گانوں کے ذریعے دولت اور شہرت حاصل کرنے کی اس آرزو کا ایک اور پہلو بھی تھا اس کی وہ محبوبہ جس کی وجہ سے وہ کالج سے نکالا گیا تھا، بمبئی میں مقیم تھی۔

گورنمنٹ کالج سے ساحر ہی نہیں اشیر کور بھی نکالی گئی تھی، کالج کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، اشیر کور ہوسٹل میں قیام پذیر تھی اب دونوں عام طور سے کالج کے اوقات کے بعد ملتے تھے اور کالج کے گیٹ سے ملحقہ دیوار پر براجمان ہوتے تھے، اشیر کور کا تعلق لدھیانہ سے سات آنکھ میل دور واقع ایک قصبے بدروانی کے ایک سکھ زمیندار گھرانے سے تھا، جب وہ کالج سے نکالے جانے کے بعد اپنے گاؤں میں چلی گئی تو ساحر کا ہم سب دوستوں کے ساتھ ہر شام اس دیوار پر جا کر بیٹھنا معمول بن گیا، ہر شام اس "کند" پر جانا ایک طرح سے عبادت کی حیثیت اختیار کر گیا اور کسی دن اس فریضے کی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو ہم میں سے کوئی دوست اسے یاد کراتا۔ آج کند (دیوار) پر نہیں جاتا، جب ساحر کو بمبئی جانے اور فلم کے گیٹ لکھنے کی پیش کش ہوئی تو اس کی گفتگو کا موضوع بمبئی میں مقیم اشیر کور ہو گیا۔ وہ برابر اس عزم کا اظہار کرتا کہ وہ فلمی گانوں کے ذریعے شہرت اور دولت حاصل کر لے گا تو ایک روز اس کی یہ محبوبہ ضرور اس سے ملنے آئے گی۔ یہ ایک احمقانہ قسم کی خواہش تھی۔ ساحر کو اشیر کور نے رو نہیں کیا تھا۔ وہ تو اپنا گھر چھوڑ کر اس کے پاس بھی آ گئی تھی، جس روز وہ بدروانی سے لدھیانہ ساحر کے گھر آئی، ہم سب دوستوں نے اس کی اس خواہش کی پذیرائی کی کہ ساحر اس سے شادی کر لے لیکن ساحر خوف زدہ تھا اور شاید بجا طور پر کہ اس شادی کے بعد اشیر کور کے زمیندار والد کے ہاتھوں قتل کر دیا جائے۔ وہ اپنے باپ سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر چکا تھا بلکہ اس کے والد سے اس کی باقاعدہ مقدمہ بازی تھی وہ سکھ طلباء میں لدھیانہ میں موجود تھے جنہوں نے ان دونوں کی ملاقات کا غلط نقشہ پیش کر کے انہیں کالج سے نکلوا دیا تھا۔ ان سب کی مخالفت مولیٰ لینے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اس نے اشیر کور سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگرچہ وہ رات بھر اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہی مگر اس نے اس سے کسی قسم کا جسمانی تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اشیر کور واپس گھر تو جانی نہیں سکتی تھی، اگلی صبح وہ اپنے بمبئی میں مقیم ایک کزن کے پاس چلی گئی جو شاید اس سے قبل اسے شادی کی پیش کش کر چکا تھا۔ وہاں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

جنوری 1946 میں ہم دونوں بمبئی چلے گئے۔ ساحر نے منت سماجت سے پھر مجھے ساتھ چلنے کے لیے

نہ صرف مجبور کیا بلکہ کلونت رائے کی کمپنی ہندوستان کلامندر سے میرے لیے مکالمہ نویس کی حیثیت سے تقرر نامہ بھی حاصل کر لیا۔ ہم اگست 1947 تک بمبئی میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں دوبار چند دنوں کے لیے لدھیانہ بھی آئے۔ اس سارے زمانے میں امرتا کا ذکر اس نے شاید ہی کبھی کیا ہو قیام پاکستان کے بعد لاہور آنے اور چند ماہ کے قیام کے بعد جون 1948 میں واپس ہندوستان جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں کامیاب فلمی نغمہ نگار بن کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ امرتا بھی اس زمانے میں ایک بڑی شاعرہ اور ادیبہ کے طور پر قبول عام کی سند حاصل کر چکی تھیں۔ خاص طور پر اس کی نظم ”آج آکھاں وارث شاہ نوں“ نے تو اسے برصغیر کی معروف ترین شاعرہ بنا دیا تھا۔ وہاں پر ساحر اور اس کے درمیان ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہیں البتہ امرتا کی کتاب ”رسیدی نکٹ“ کی اشاعت کے بعد مجھے بھی یہ معلوم ہوا کہ نہ صرف ان کے درمیان دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہو گئے تھے بلکہ خود امرتا ساحر کو اس سے کہیں زیادہ چاہنے لگی تھی۔ ساحر کے پاکستان سے جانے کے بعد برسوں میرا اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ بیس برس تک حکومت پاکستان نے مجھے پاسپورٹ ہی سے محروم رکھا۔ پاسپورٹ ملنے کے بعد ہندوستان جانے کے لیے صحافیوں پر وزارت داخلہ سے اجازت لینے کے پابندی تھی۔ میں نے متعدد بار درخواست دی مگر ہمیشہ انکار کیا گیا۔ ساحر کی والدہ کے انتقال پر میں نے ایک دفعہ پھر درخواست وزارت داخلہ کو بھیجوائی اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کی والدہ نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا اس لیے میں اس کی تعزیت کے لیے بمبئی جانے کا خواہش مند ہوں۔ اس درخواست کا بھی گھڑا گھڑایا جواب آیا کہ ”چونکہ ساحر سے تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے اس لیے اجازت نہیں مل سکتی۔“

اس کے بعد میں نے اسلام آباد جا کر سیکرٹری داخلہ جناب رؤف خان سے ملاقات کی جس میں باقاعدہ ان سے سخت لڑائی ہوئی اور بلاخر وہ اجازت دینے پر رضامند ہو گئے۔ دسمبر 1978 میں میری بیوی چھ سالہ بیٹا عمر اور میں بمبئی میں ساحر کی جہازی ساز کی بلڈنگ پر چھائیاں پہنچ گئے۔ ہم نے چند روز اس کے گھر پر اس کے ساتھ قیام کیا۔ دو دوستوں کی یہ ملاقات تیس برس بعد ہوئی۔ دوست بھی ایسے جو جون 1948 سے دن رات ایک ساتھ رہے۔ مگر دولت شہرت اور بے پایاں عزت حاصل کرنے والا یہ ساحر وہ نہیں تھا جو تیس برس قبل مجھ سے جدا ہوا تھا وہ عارضہ قلب میں مبتلا تھا اور مردم پزاری کا شکار بھی۔ وہاں اشیر کور کی بات ہوئی اور نہ امرتا پر ہم کا ذکر اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ بمبئی پہنچنے سے قبل ہم نے جو چار روز دہلی



میں گزارے اس میں بہی کے دوستوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں ساحر کے ہاں قیام نہ کروں۔ وہ دوستوں کو گالیاں دیتا ہے اور ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میرا جواب تھا کہ مجھے گالی دے گا تو میں بھی یہ عمل دہراؤں گا لیکن میں تو ملنے ہی اس سے آیا ہوں اس لیے میں اس کے پاس ہی ٹھہروں گا۔ رہائش کے متبادل انتظام سے جو کئی اعلیٰ اور شبانہ کے گھر کیا گیا ہے مجھے کوئی غرض نہیں۔ اس پندرہ روزہ قیام میں اس نے میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی میرا اور میری بیوی بچے کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میرے بیٹے سے پیار کرتا رہا اور میری بیوی کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا بلکہ روزانہ جب شام کی محفل میں اس نے اس کے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر نوک تو میری بیوی سخت پریشان ہوئی اور بعد میں علیحدگی میں مجھ سے کہا ”ساحر آپ کی بات کا برامان سکتا ہے اور یہ کہ اسے کسی بات پر ٹوکنے سے اجتناب کروں۔“ بہر حال پندرہ روز بعد 13 جنوری 1979 کو ہم بہی سے واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس کے ایک ڈیڑھ برس بعد وہ یہ دنیا ہی چھوڑ گیا اس نے مجھ سے لاہور آنے اور پرانے دوستوں سے ملنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

1983 میں آرمیاء الحق کے زمانے میں مجھے دوسری بار دہلی جانے کا موقع ملا۔ اس دورے کے دوران اپنے قیام دہلی میں اس نے ایک روز امرتا کو فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی اسے اپنے گھر یا پریت گھر ہونے والی ملاقات تو یاد نہیں تھی مگر ساحر کا قریبی دوست ہونے کا اس کو شبہ تھا چنانچہ اس نے مجھے اسی شام اپنے گھر آنے اور وہیں رات کا کھانا کھانے کی دعوت دی۔ اس ملاقات میں امرتا امروز اور میں تین افراد ہی شامل تھے۔ یہ محفل کوئی چار گھنٹے پر محیط تھی۔ محفل بے نوشی بھی جاری رہا اور ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر باتیں بھی جاری رہیں لیکن ملاقات شروع ہونے کے کوئی ایک گھنٹے بعد امرتا نے اچانک مجھ سے سوال کیا ”47-1946 میں جب ساحر اور آپ بہی میں ایک ساتھ رہے تو کیا وہاں ساحر کی اشیر کور سے ملاقات ہوئی تھی؟ میرا جواب تھا کہ اشیر کور بہی میں فرار تھی ساحر اس کا ذکر بھی بہت کرتا تھا مگر نہ تو ہمیں اس کا اتنا پتہ تھا اور نہ ہی ساحر اتنا مشہور ہوا تھا کہ اشیر کور کو اس کے ہارے میں علم ہوتا۔ فلم ”آزادی کی راہ پر“ ٹک گئی تھی اور جو فلم تقسیم ہند کے خلاف تھی وہ قیام پاکستان کے بعد ریلیز ہوئی اور فلاپ ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سال میں ان دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر امرتا کی تو جیسے سوئی اس سوال پر ٹک گئی تھی۔ ہر پندرہ منٹ بعد وہ پھر یہی سوال دہراتی ”حید صاحب ڈیڑھ برس سے زائد عرصہ بہی میں رہنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ ساحر اس سے نہ ملا ہو؟ میں نے بار بار اسے یقین دلایا کہ ہم دونوں دن رات ایک ساتھ رہتے تھے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ کہتا



ہوں کہ وہاں ان دونوں کے درمیان ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر وہ بار بار یہی سوال دہراتی رہی حتیٰ کہ میں نے کہا ”اب تو ساحر اس دنیا میں نہیں ہے اور غالباً اشیر کور بھی نہیں“ اس لیے یہ ذکر چھوڑیے اور کوئی اور بات کیجئے“ مگر جیسے جیسے اس کا نشہ غالب آتا رہا وہ مجھ سے یہ سوال دہراتی رہی۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے وہ کتنی بڑی شاعرہ اور ادیبہ کیوں نہ بن جائے اپنے محبوب کے کسی اور کی زلف کا اسیر ہونا برداشت نہیں کرتی۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ساحر کی توقع کے عین مطابق جب وہ فلمی نغمہ نگار کے طور پر ہندوستان بھر میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا اور اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تو اشیر کور نے اسے ڈھونڈ لیا۔ ساحر کا اس کے گھر آنا جانا بھی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ اس روز تک جاری رہا جس روز اس کے شوہر نے ساحر سے کہا ”اشیر کور میری بیوی ہے یہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے“ تم اسے لے جانا چاہو تو لے جاؤ“ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو مہربانی کر کے ہمارے ہاں آنے جانے کا معاملہ ختم کرو۔“ اس کے بعد ساحر اشیر کور کے گھر کبھی گیا نہ اس سے ملا۔

☆☆☆☆

## ’ایک لڑکی ایک جام‘ کا مطالعہ

اس افسانے کے تین کلیدی اجزاء ہیں۔ ایک لڑکی کی دو تصویریں؟ پہلی تصویر میں دیکھنے والوں کو اس کے چہرے سے زیادہ کمر دکھائی گئی تھی اور دوسری تصویر ایسی تھی کہ جس کے بارے میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ منہ سے بول اٹھے گی۔ اس تصویر کا نام تھا ”ایک لڑکی ایک جام“ اور راوی نے اسے دیکھ کر مصور سے کہا تھا: ”ایسا جام پینے کے لیے تمہاری ساری عمر بھی کم ہے۔“ دوسرا وہ لڑکی (جس کی تصویریں تھیں) جو چائے کے باغ میں بیٹیاں چینی تھی اور اس کا خاندان (ایسے تمام خاندانوں کی طرح) غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ تیسرا جز وہ مصور ہے جس نے لڑکی کی تصویر بنائی۔

مصور شہر کا رہنے والا ایک جدید آدمی تھا جسے بوتل سے رغبت تھی اور لڑکیاں لباس کی طرح تھیں جو روزانہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس نے جب لڑکی کو دیکھا تو اس کے روپ کی چمک اسے چند ہی گنتی۔ یہ ایک نئی لڑکی تھی جسے اس کے لیے نیا تجربہ ہوتا تھا۔ لیکن ایسے ہوا نہیں۔ دراصل مصور پالم پور کے چائے کے باغات کے نزدیک کاغذ کے ایک گاؤں میں کچھ عرصہ کے لیے ٹھہرا ہوا تھا اور یہ تصویریں اس نے ہی بنائی تھیں۔ مصور نے لڑکی کو جب دیکھا تو برسات کے دن تھے۔ نالے کے پانی میں ساتھ والے گاؤں کو جانے والی سڑک بھی ڈوب گئی تھی۔ تین دن کے بعد سڑک دکھائی دی۔ مصور اور لڑکی کی اس سڑک پر بند بھڑ ہوئی۔ مصور نے لڑکی سے کہا تھا ”دیکھو نا پانی آخر سوکھ ہی گیا۔ ایک بار تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ پانی کبھی سوکھے گا ہی نہیں۔“ لڑکی کے جواب پر امرتا پریتم نے اس کہانی کو تفسیر کیا ہے۔ اگر لڑکی وہ جواب نہ دیتی تو مصور کی سوچ میں تبدیلی نہ آتی اور وہ لڑکی کو ایک جسم ہی سمجھتا۔ لڑکی نے کہا تھا ”یہ بھی کوئی آدمی کے آنسو ہیں جو کبھی نہ سوکھیں۔“

مصور نے کسی وقت یہ بات ایک بنگالی ٹول میں پڑھی تھی۔ اُن پڑھ لڑکی کا جواب اسے اس (لڑکی) کے گھر لے گیا۔ یہاں سے افسانے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا۔ مصور کے لیے پہلے وہ لڑکی ایک ماڈل تھی۔ وہ اس

کے لیے اتنی غیر اہم تھی کہ اس نے لڑکی کا نام جاننا بھی مناسب نہ سمجھا وہ اسے ٹونی کہہ کر بلانے لگا۔ مصور لڑکی کے گھر جا کر اس کی بات میں چھپے دکھ کو سمجھ گیا۔

لڑکی کے گھر میں اس کا باپ تھا 'ماں تھی' 'بھائی اور ایک بھابھی تھی۔ ان کے مشترکہ دکھ میں اسے آفاقت نظر آئی۔ وہ جانتا تھا کہ دکھ سے ہی انسانی تہذیب رقم ہے۔ وہی تحریر اس گھر میں ہر طرف لکھی ہوئی تھی۔ وہاں بے کسی، بے بسی، محرومی اور غربت ہر سو بکھری ہوئی تھی۔ "ایک جام ایک لڑکی" والی تصویر کے پس منظر میں چائے کے باغات تھے لیکن ان باغات پر ٹونی اور اس کے خاندان کی غربت اور مجبوری کے بادلوں کا گہرا سایہ پھیلا ہوا تھا۔

زیر نظر افسانے کے بیانیہ عمل اور کرداروں کی پیش کش متاثر کن اور دلچسپ ہے۔ یہاں دونوں تصویریں بھی کردار کی حیثیت لے گئی ہیں۔ کہانی کے آغاز میں مصنف نے ان تصویروں کا تعارف کرواتے وقت لکھا ہے "چائے کے ایک پودے میں آخری کوئیل ڈیزہ پتی پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک پوری پتی اور دوسری اس کے ساتھ جڑی ہوئی چھوٹی سی نازک پتی اس ڈیزہ پتی کا رنگ الگ دکھائی دیتا ہے۔ اس آخری کوئیل کے نیچے ڈھائی پتیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں، بہت ملائم اور نازک۔۔۔۔۔ ان پتیوں سے جو چائے بنتی ہے وہ بیش قیمت ہوتی ہے۔"

ایک مشہور مصور کا گٹلہ کے ایک غیر معروف گاؤں میں ایک خوبصورت لڑکی کے حسن اور تعقل کا گرویدہ ہو کر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں امرتا پریم نے کہانی کو دلچسپ بنانے کے لیے روایت کا سہارا لیا ہے۔ کیا ایک تعلیم یافتہ اور مشہور عورت کسی اُن پڑھ 'مردانہ حسن سے مالا مال اور ذہین مزدور کے ساتھ اس کے گاؤں میں زندگی گزارنے کا عہد کر لے گی؟ اگر ایسا ممکن ہے تو ہمیشہ نندہ (مصور) کا اس لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر لینا بھی منطقی ہے۔ وہ جب ٹونی کے گھر جاتا ہے تو اسے بتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں لڑکیوں کی قیمت لگتی ہے۔ غریب 'مہاجنوں کے مقروض ہوتے ہیں اور اس قرضے کے عوض ان کے پاس لڑکیاں بیچ دی جاتی ہیں۔ ٹونی کے باپ کے سر پر بھی قرضے کا بوجھ تھا۔ جب ہمیشہ نے اس گھر میں اداسی اور بے بسی کے آسب کو پہچان لیا۔

قرضہ دینے والے مہاجن نے پندرہ سو روپے کے قرضے کے عوض ٹونی کو اس کے باپ سے مانگا ہوا تھا۔ یہاں امرتا پریم کے پاس کہانی کو آگے بڑھانے کے صرف دو راستے تھے۔ وہ یا تو لڑکی کو مہاجن کے پاس

جانے دیتی۔ اگر وہ ایسے کرتی تو خطے میں جاری نا انصافی کا حصہ بن جاتی اور افسانہ بے مقصد ہو کر رہ جاتا۔ اور اگر ٹونی اس ظلم کے خلاف آواز بلند کر کے ہمیشہ نندہ کے پاس پناہ لے لیتی یا اسے اپنی قیمت ادا کرنے کے لیے کہہ دیتی تو ہمیشہ نندہ اس کے پیسوں کے عوض اس کے جسم کا تقاضا بھی کر سکتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ٹونی مہاجن سے خائف تھی۔ وہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی ”بابو! وہ آدمی نہیں شیطان کا بچہ ہے۔ مجھے تو خواب میں بھی اس سے ڈر لگتا ہے۔“

اب کہانی ایک نازک موڑ لیتی ہے۔ کسی وقت ہمیشہ نندہ نے پوچھا تھا ”ٹونی تو چائے کے پودے کی آخری کوئیل ہے بتا یہ چائے کون پیئے گا؟“ ہمیشہ نندہ کو جب خاندان کی پریشان کن صورت حال (Predicament) کا پتا چلا تو اس نے ٹونی سے کہا کہ وہ چندرہ سوروپے کا بندوبست کر دے گا اور نہ وہ اپنے باپ کو بتائے کہ وہ سگائی توڑ دے۔ ہمیشہ کو شاید امید تھی کہ ان چندرہ سوروپوں کے عوض ٹونی ممنوعیت میں اپنے آپ کو ہمیشہ کر دے گی۔ لیکن فکشن تو (Improbables) پر مبنی ہوتا ہے اور سماجی معاشی اور بعض اوقات نظریاتی اکائی اس کے لیے معنی نہیں رکھتے۔ ہمیشہ نندہ ٹونی کو عقلی سطح پر اپنے برابر سمجھ چکا تھا۔ شاید اسے ایسی کوئی لڑکی پہلے ملی ہی نہیں تھی جو اس کے عقلی معیار پر پورے اترتی؟ اس لیے لڑکیاں اسے لباس کی طرح لگا کرتی تھیں۔ ٹونی اس کے معیار پر پورا اترتی تھی لیکن اس نے ابھی تک اس کے ساتھ اپنے رشتے کی نوعیت طے نہیں کی تھی۔ عالمی تناظر اور نظریہ مصنف کے ارادے کو مست دیتے ہیں۔ دراصل ہوا وہی عالمی تناظر اور نظریے کی تشریح کرتا ہے۔ ”ایک لڑکی ایک جام“ عالمی تناظر میں جبر و استبداد کے خلاف ایک آواز ہے۔ امرتا پریم نے اس افسانے کا تانا بانا مہارت کے ساتھ بنایا ہے۔ ٹونی ایک حساس ذہن اور خوش کل لڑکی ہے۔ ہمیشہ نندہ اسے جب چندرہ سوروپے کی پیش کش کرتا ہے تو وہ کہتی ہے ”بابو! تو مجھ سے بیاہ کرے گا؟“ اور پھر ”ارے بابو میں کوئی بھکارن تھوڑی ہی ہوں۔“

ہمیشہ نندہ نے ٹونی کو اپنی زندگی اور روح کی آگ کے متعلق بتایا اور اسے یہ احساس دلایا کہ وہ اس آگ میں جل جائے گی تو اس نے فوراً کہا ”پھونک پھونک کر پی لوں گی۔“ اس جواب نے ٹونی کو ہمیشہ نندہ کی نظر میں ایک نیا مقام دے دیا۔ اسے لگا کہ وہ صرف اسی لڑکی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کر سکے گا۔ اس نے ٹونی کو اپنی زندگی میں آئی لڑکیوں کے متعلق بتایا کہ وہ تو ایک جام کی طرح نہیں ایک خالی کر کے دوسرا بھر لیا۔ ٹونی یہ سن کو ہنس پڑی ”کیوں بابو! تیری پیاس نہیں بجھی؟“ اس مکالمے کے بعد ”ایک لڑکی ایک جام“ اپنے

کلائنگس کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ کلائنگس افسانے کے اختتام کے بجائے اگلے مکالمے میں پوشیدہ ہے۔ "ایک وعدہ کرنا" جب تک میرے سن کا پیالہ ختم نہ ہو جائے تو کسی اور پیالے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔" یہاں ہمیشہ نندہ کو گزری ہوئی زندگی کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ اسے تو صرف خالی جام ہی ملے تھے جنہیں وہ بھر بھر کر خالی کرتا رہا۔

اب افسانہ ایک مانوس سے گرد و پیش کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ گرد و پیش ہمارے فکشن اور فلم میں عام ہیں۔ زیر نظر افسانے کے انجام کو ہم مصنف کی "فن کارانہ ناکامی" نہیں کہیں گے کیوں کہ یہ اس کا فن کارانہ ارادہ نہیں تھا، اس کے اس ارادے کی تکمیل میں سماجی مخالفت ایک رکاوٹ تھی۔ سماج کا مستقل جھوٹا نقش، یادداشت اور بے مقصد ہدایت فن کار کو بے بس کر دیتے ہیں۔

سماج کی خواہش ہوتی ہے کہ فن کار کے کردار غیر متحرک اور واقعات بنیادی منطق سے عاری ہوں۔ "ایک لڑکی ایک جام" کے کردار متحرک اور زندگی کو ایک قدم آگے لے کر جانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ نندہ پندرہ سو روپے کا بندوبست کرنے میں شہر چلا جاتا ہے۔ جب وہ واپس پہنچتا ہے تو بوڑھے مہاجن نے اپنا سودا نوٹنے کی خبر سن کر ٹوٹی کو دھوکے سے زہر دلوادیا تھا۔

ہمیشہ نندہ نے ٹوٹی سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اس (ٹوٹی) کے سن کا پیالہ ختم نہ ہو جائے وہ کسی دوسرے پیالے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ راوی کے بقول اس نے ایسے ہی کیا۔ سماج نے ٹوٹی کا بھرا ہوا پیالہ تو توڑ دیا لیکن ہمیشہ نندہ کا کسی اور پیالے کو نہ تھا منازعہ کی سے فرار تھا یا ٹوٹی سے وفاداری؟

واقعات کو کھولنے کے لیے مصنف نے خود کو راوی بنایا ہے اور "فلش بیک" کی تکنیک کا استعمال کر کے کہانی کو مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ سماج کی ناانسانی پر مبنی ایک روایتی کہانی ہے ایسی کہانی جس کی صداقت آفتابی ہے۔

☆☆☆☆

## حقیقت سے حقیقت تک کا سفر

(”رسیدی ٹکٹ“ کا مطالعہ)

”میں کے بغیر“ تم کے معنی نکلتے ہیں نہ دیتا کے یہ نہیں کے آگے تم کا سفر ہوتا ہے۔ اور تم کے آگے اپنی کائنات کا“

امرتا پرتم

آپ جتنی لکھنے کا کیا محرک ہے؟

سوال آسان، جواب مختلف!

معتد جوا بات میں سے ایک بنیادی بات تو یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ”میں“ کا اظہار ہے۔ میں جو کہ ذات و صفات کا آئینہ ہے، یہی آئینہ شخصیت کا عکاس اور استعارہ قرار پاتا ہے، فرد اس آئینہ میں جب اپنا جلوہ دیکھتا ہے تو خود سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر خود بینی کے اس عمل میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ فرد کے لیے جو آئینہ ظلم ہوش افزا ہوتا ہے دوسروں کے لیے DISTORTING MIRROR بھی ثابت ہو سکتا ہے

آپ جتنی کا محرک اگر نزکیت ہے تو پھر نزکیت فن کارانہ طریقہ ہے اظہار پاتی ہے (یا ایسا ہونا چاہیے) اسی لیے آپ جتنی میں ”میں“ کا راگ دھیمے سبروں میں الاپنا چاہیے ورنہ قاری کی نزکیت مصنف کی نزکیت سے متصادم ہوگی اور یوں آپ جتنی میں سے شخصیت کا رس معدوم ہو جائے گا۔

آپ جتنی قلم بند کرنے والا بالعموم دیباچہ میں آپ جتنی کے محرک کے بارے میں تحریر کرتا ہے، مگر کبھی معذرت کے انداز میں تو کبھی دفاع کے اسلوب میں، کبھی بہانوں کی مانند وہ جواز تراشتا ہے تو کبھی داد طلب ہوتا ہے۔ امرتا پرتم نے ایسا کوئی تنقیدی دیباچہ نہ لکھا کتاب کے آخر میں اس نے یوں لکھا۔

”وہ بھی ایک دن تھا۔۔۔۔۔ جب میں نے اپنے بارے میں اس قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بجائے سوچا تھا۔۔۔ کبھی جب میں، اپنی سوانح حیات لکھوں گی، صرف دس سطر لکھوں گی اور وہ سطر میں نے کاغذ پر لکھ کر رکھ لی تھیں۔ وہ سطر آج بھی میرے سامنے ہیں اور آج بھی وہ اتنی ہی سچی ہیں، جتنی اُس روز لکھتے وقت تھیں۔ میری تحریر، کیا نظم اور کیا نثر، میں جانتی ہوں کہ غیر قانونی بچے کی طرح ہے۔ میری دنیا کی حقیقت نے میرے دل کے خواب سے عشق کیا، اور ان کے وصل ممنوع سے یہ تحریر پیدا ہوئی۔

جانتی ہوں۔۔۔۔۔ ایک غیر قانونی بچے کی قسمت اُس کی قسمت ہے اور اُس کو ساری عمر اپنے ادبی سماج کی پیشانی کے بل سہنے ہیں۔

دل کا خواب کیا تھا، کون تھا اس کی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کجخت بہت حسین ہوگا، ذاتی زندگی سے لے کر کل کائنات کی بہتری تک کی باتیں کرتا ہوگا تب ہی حقیقت اپنی اوقات کو بھول کر اس سے عشق کر بیٹھی اور تحریر جو پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ ہمیشہ کچھ کاغذوں میں لاوارث بھٹکتی رہی۔۔۔۔۔

اور آج بھی میرا یقین ہے۔۔۔۔۔ یہ دس سطر میری پوری اور طویل سوانح حیات ہے۔۔۔۔۔“ (رسیدی ٹکٹ: ۱۶۲)

یہ سطر سچی اور کھری حقیقت نگاری کی مظہر ہیں۔ اس سے دو چار ہونے کے لیے ہر ادیب میں ہمت نہیں ہوگی بالخصوص ہمارے معاشرے کی عورت کے لیے! ”خالص عورت“ کی ضمنی سرفی کے تحت لکھی ہے۔

”یوں میرے وجود کے اندر کی عورت، ہمیشہ میرے اندر کے ادیب سے ثانوی درجہ پر رہی ہے، کئی بار یہاں تک کہ میں اپنے بیچ کی عورت کی اپنے آپ کو یاد دلاتی رہتی ہوں۔“ (رسیدی ٹکٹ: ۲۲)

منہ پر لکھتی ہے۔

”اس میں۔۔۔ اندر کی خالص عورت کی خالص ادیب کے ساتھ کوئی پُر خاش نہیں۔ اس



نے خود ہی اس سے پیچھے، اس کے عقب میں کھڑے رہنا قبول کر لیا ہوا ہے۔

(رسیدی ٹکٹ: ۳۳)

”خالص عورت“ کا خالص عورت ”ادیب“ کے لیے جگہ خالی کر دینا دراصل برتر وجود کو تسلیم کرنا

ہے۔ ایک اور موقع پر بھی امرتا پرتم نے آپ بیتی کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا:

”خودنوشت سوانح حیات کو اکثر چمک دکھ بھری یک طرفہ سچائی خیال کیا جاتا

ہے۔۔۔۔۔ خود ستائش کا فن کارانہ وسیلہ، لیکن بنیادی سچائی کو ادیب کی اپنی ضرورت

مان کر نہیں کہنا چاہوں گی۔۔۔۔۔ یہ حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل ہے۔“

(رسیدی ٹکٹ: ۱۲۷)

یوں دیکھیں تو امرتا پرتم کی جذباتی اور تخلیقی زندگی ”حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل قرار پاتی

ہے۔ کام مشکل اس لیے کہ اس میں خسارہ بھی ہے۔ وہی بات:

”عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا“

یہ سطریں دیکھیے:

”المیہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنے عشق کے ٹھہرتے بدن کے لئے ساری عمر گیتوں کے

ہوا بہن سستے رہیں۔ المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان پرائیڈوں کو سینے کے لیے آپ کے پاس

خیالوں کا دھماکا ختم ہو جائے اور آپ کی قلمی سوئی کی نوک ٹوٹ جائے

(رسیدی ٹکٹ ص: ۳۲)

غالباً یہ المیہ ہر تخلیق کار کا ہے کہ ہونے اور نہ ہونے کے دو پائوں بیچ لینا اس کا مقدر ہے اس عمل سے البتہ

اعصابی تناؤ بھی دراصل تخلیقی محرک ثابت ہوتا ہے یوں کہ جہلت قلم میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

امرتا پرتم نے ”رسیدی ٹکٹ“ میں غسل آتش کی ضمنی سرخی کے تحت یوں لکھا!۔

Create an idealized image of yourself and try to resemble it.

”یہ الفاظ کا زمانہ اس نے اپنی پہلی ملاقات میں اپنی محبوبہ سے کہے تھے۔ مجھے یہ کسی

نے نہیں کہے۔ لیکن میں نے یہ سنے تھے۔ اپنے لبوں میں سے سنے تھے۔۔۔۔۔ اور پھر

اپنے ہونٹوں سے ہی اپنے کانوں کو کئی بار کہتی رہی۔ ہر اس بار بھی۔ جب ان پر عمل



سے پھڑ جاتی تھی۔۔۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ان لفظوں کا طلسم میری پکڑ میں آیا ہے۔۔۔ صرف یہ۔۔۔ کہ ساری عمر یہ مددگار و معاون رہے ہیں۔ ان کا طلسم ہی شائد اسی بات میں ہے کہ اپنی شبیہ جب بھی اپنے تخلیقی وجود سے کچھ مشابہت پکڑنے لگتی ہے۔۔۔۔۔ خیالی وجود۔۔۔ اور بھی حسین بن کر دور جا کھڑا ہوتا ہے۔ صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ ساری عمر اس تک رسائی پانے کے لیے سعی و جہد کرتی رہی ہوں۔

(رسیدی ٹکٹ ص: ۸۴)

کیا یہ TO BE OR NOT TO BE کا دائمی DELLIMA ہے یا برتر وجود کی تلاش یا پھر داخلی غلا کو پر کرنے کا ایک انداز۔۔۔؟

در اصل اس کشاکش سے جو بعض اوقات فرد کو ذہنی ہفت خواں طے کراتی ہے عام شخصیت اور تخلیقی شخصیت میں اس سے امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ عام فرد سوزنہائی میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ مگر تخلیق کار رائنڈ ہیگرڈ "SHE" کی مانند "عمل آتش" سے نیا جنم حاصل کرتا ہے۔ "رسیدی ٹکٹ" میں امرتا پریم نے "ققوسی نسل" کے ضمنی عنوان تلے یہ بھی لکھا!

"دنیا کے سب سچے ادیب مجھے ققوسی معلوم ہوتے ہیں، تخلیقی عمل کی آگ میں جلنے، اور پھر اپنی راکھ میں سے تخلیق کی صورت میں پیدا ہوتے!"

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۶)

امرتا پریم کی آپ بیتی چھپی تو اچھی خاصی تنازعہ کتاب ثابت ہوئی غالباً ساحر لدھیانوی کے تذکرہ کی وجہ سے؟ احتجاج؟ اتنی بولڈ؟ اتنی جرأت؟ لیکن میں تذکرہ ساحر کو ادیبہ کی دیانت داری سمجھتا ہوں۔ اپنی ذات سے دیانتداری، اپنے فن سے دیانتداری، اپنے آئینڈیل سے دیانتداری شاید اسی لیے وہ یہ بھی لکھ سکی!

"ساحر ایک خیال۔۔۔ ہوا میں چمکتا، شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا جاؤ"

(رسیدی ٹکٹ: ۸۴)

"رسیدی ٹکٹ" میں اور بھی بہت کچھ ہے اتنا کہ ساحر کا تذکرہ حذف کر دینے کے باوجود بھی کتاب

قابل دید اور دلچسپ اور مددگار رہتی ہے ملاحظہ ہوں امرتا کے ایک گیت کے یہ بول:

"سننے کا ایک تھان بنوایا"

گزر بھر کپڑا پھاڑ لیا، اور عمر کی چولی سی لی  
 آج ہم نے عرش کے گھرے پر سے  
 بادل کی ایک چٹنی اُتاری، مگھونٹ بھر چاندنی پی  
 گیتوں کے ساتھ چکا جائیں گے۔

(رسیدی ٹکٹ: ۱۰۹)

یہ جو ہم نے موت سے گھڑی اُدھار پہ لی

اور اس گیت کے ساتھ ان منہ بولتی سطروں کا بھی اضافہ کر لیں تو بات کہیں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

”یہ کتابوں کے نہیں زندگی کے ورق ہیں، لیکن ان کی عبارت صرف اُن کی سمجھ میں  
 پڑتی ہے، جنہوں نے زندگی کے بگولے اپنے بدن پر جھیلے ہیں، اور جو ہاتھوں کی قوت  
 صرف اپنے دلوں سے لیتے ہیں“  
 (رسیدی ٹکٹ: ۱۱۵)

”۔۔۔ آج یہ جو کچھ اپنے دل کے عمیق ترین گوشوں سے نکال کر کاغذوں کے اوپر  
 رکھ رہی ہوں، یہ صرف اُن کے لیے ہے جو دنیا کی روایتوں اور اداسیوں کو دروازے  
 سے باہر بٹھا کر، دل کے سچ کو اندر بیٹھ کر جینے کا حوصلہ کر سکتے ہیں“

(رسیدی ٹکٹ: ۱۱۶)

آخری اقتباس اس بنا پر قابل غور ہے کہ امرتا کو عمر بھر معاندانہ تحریروں سے مصلوب کرنے کی کوشش  
 جاری رہی۔ امرتا پر تیم اپنی تخلیقات کے برعکس اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے متنازعہ ہیں۔ مذہب و مسلک میں  
 حلال و حرام کا تعین ان احکامات سے ہوتا ہے، جو عملی زندگی میں بعض اوقات تضادات کا باعث بھی بنتے ہیں۔  
 ہندو سے لے کر گائے بلکہ چوہے تک کو پوتر سمجھنے والا اور اپنا کا قاتل ہندو مسلمان کا خون بہاتے وقت ذرا بھی  
 متردّد، پریشان یا دشمنان نہیں ہوتا، ہم مسلمان بھی اس ضمن میں کسی سے کم نہیں، کون سا گناؤں بکیرہ یا صغیرہ ہے جو  
 ہم سے سرزد نہیں ہوتا بلکہ جو گناہ نہ کر سکیں ان کی حسرت کے داد طلب بھی ہوتے ہیں۔ عورتوں پر کتے چھوڑنے  
 والے، انھیں زندہ دفن کرنے والے اور تنگی عورتوں کے جلوس نکالنے والے سب کچھ کر گزریں گے بعض سو رکا  
 نام بھی نہ لیں گے۔ سکموں میں شراب جائز لیکن تمباکو نوشی حرام، لہذا سموکنگ کرنے والے کا نزاعات کے حضور  
 میں گھرے رہنا باعثِ تعجب نہ ہونا چاہیے۔

امرتا پر تیم کیونکہ منافق نہ تھی اس لیے اس نے ذاتی زندگی کو اخفاء میں رکھنے کے برعکس گفتنی، ناگفتنی

سب کا برملا اعتراف کیا اور یہی باعث خرابی تھا۔ منافق معاشرہ سچائی کو برداشت نہیں کر سکتا ایسے معاشرہ میں زیست کرنے کے لیے جھوٹ پر جھگڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ امرتا پریم اگر منافق ہوتی تو ساحر سے نہ تو محبت کا اعتراف کرتی اور نہ ہی اس کے سگریٹوں کے ٹوٹوں کو سنبھال کر رکھنے اور سگریٹ پیئے کا اعلان کرتی۔

(رسیدی ٹکٹ: ۱۱۸، ۸۸، ۲۵)

امرتا پریم نے زندگی کو چار حصوں (۱) شعور (۲) لاشعور (۳) دلیری اور (۴) تنہائی میں تقسیم کرتے ہوئے دلیری کے ضمن میں یہ لکھا:

”حال کو ادھڑنے والی اور مستقبل کو سینے والی دلیری، خوابوں کو تاش کے چٹوں کی طرح ملا کر اور بانٹ کر کوئی کھیل کھیلنے کی دلیری جس کی کوئی بھی ہار دائمی ہار نہیں ہوتی۔ جس کے پتے پھر سے ملائے جاسکتے ہیں اور جیت کی امید پھر سے ہانڈی جاسکتی ہے۔“

(رسیدی ٹکٹ: ۳۶)

دلیری کا یہ تصور کتابی کے برعکس ”داردائی“ ہے اس لیے اپنے اندر واضح کے ساتھ ساتھ بین السطور مفہوم کا بھی حامل ہے اس لیے جب یہ لکھتی ہے تو بات سمجھ میں آ جانی چاہیے۔

”بہت سگریٹ جیتی ہوں اور کبھی کسی کسی دن مجھے دہسکی بھی اچھی لگتی ہے۔ اس کو روز عادت کے طور پر نہیں پی سکتی، لیکن کسی دن اچانک اس کی ٹیکھی طلب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جانتی ہوں یہ دونوں چیزیں جب کسی عورت کے ساتھ وابستہ ہو کر ایک ذکر بنتی ہیں۔ یہ ذکر عورت کی شخصیت کو بنجیدگی لفظ کے ساتھ نہیں جوڑتا۔“

(رسیدی ٹکٹ: ۱۶۰)

امرتا پریم کس تہن سے یہ لکھتی ہیں:

”جگ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے“ (رسیدی ٹکٹ: ۱۱۸)۔

میرا یہ قیاس ہے کہ اگر سکھ عورت نے مسلمان مرد کی محبت کا اعتراف نہ کیا ہوتا تو شاید اتنی جبینوں پر تل نہ آئے ہوتے اس امر کے باوجود کہ ایک وقت وہ ساحر کے بارے میں یہ بھی کہہ دیتی ہے:

”سالا جولا ہا، ساری عمر خواب بننا ہی رہا، کسی کا خواب نہ بنا۔“ (رسیدی ٹکٹ: ۸۸)

امرتا پریم کی ”رسیدی ٹکٹ“ صرف ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اس لحاظ سے تو اسے مختصر بلکہ مختصر ترین

آپ جتنی قرار دیا جاسکتا ہے، عمر عزیز کی تصویر اتنے چھوٹے کیونوں پر چینٹ کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے کارگر اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی امر تا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے وہ قرہ العین حیدر کی مانند تفصیل پسند نہیں اس لیے اشاروں اور کنایوں میں مجید کھلتی ہے۔

کفایت الفاظ کی بناء پر مجھے تو ”رسیدی ٹکٹ“ منیجر جیسی دل کشی کی حامل نظر آتی ہے۔

جہاں تک اس آپ جتنی کی تکنیک کا تعلق ہے تو یہ روایتی انداز میں تحریر نہیں ہوئی۔ واقعات کی ترتیب نہ زمانی ہے نہ مکانی بعض آپ بیتیاں منظم اور مرتب انداز میں لکھی جاتی ہیں۔ پیدائش، والدین، خاندان، تعلیم، ابتدائی اثرات، کیریئر، شادی، بچے، وغیرہ وغیرہ سب کے بارے میں ضروری (اور غیر ضروری) کوائف، معلومات اور تفصیلات ملتی ہیں۔ مگر رسیدی ٹکٹ میں یہ انداز روا نہیں رکھا گیا۔

رسیدی ٹکٹ کو ایک شاعر نے قلم بند کیا مجھے تو یہ طویل نثری نظم محسوس ہوتی ہے ایسی نظم جس نے شعور کی رو کے زیر اثر جنم لیا۔ اس لیے واقعات سے مملو جذبات اور احساسات کے بیان میں بدوجز جیسا انداز کار فرما ملتا ہے۔ واقعات کے بیان میں منطقی ترتیب کے برعکس تلازم خیال جیسا انداز ملتا ہے۔ اس میں ڈائری بھی ہے، خواب بھی ہے، اس میں دنیا کے بعض بڑے ملکوں کے دؤروں کی روداد بھی ہے اور عالمی سطح کے قد آور اہل قلم سے ملاقاتوں کا احوال بھی ہے اور ان کی زندگی پر تبصرہ بھی ہے اور اپنے ناولوں، افسانوں اور نظموں کا تذکرہ بھی، ساآر بھی ہے، امروز بھی اور بچے بھی۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے، لیکن ان سب کے بیان میں صرف اتنے ہی الفاظ خرچ ہوتے ہیں جتنے الفاظ کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ الفاظ کے استعمال میں اسے کفایت شعار عورت قرار دیا جاسکتا ہے۔ عورت جب تخلیق کار بنی تو یہ دعویٰ کر سکی:

”۔۔۔۔۔ زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ میری قلم تھی۔ چاہے کوئی حادثہ میری اکیلی چھاتی پر گزرتا، چاہے ملک کی تقسیم ایسا لاکھوں لوگوں کو پیش آتا، یہ قلم میرے اعضاء کی مانند میرا حصہ، بدن بن کے رہتی تھی۔ سو صرف یہی زندگی کا فیصلہ تھا۔ باقی سارے شوق گویا کھا دین کر اس کے رگ و ریشہ میں سما گئے۔

معلوم نہیں، زندگی میں کون سی مہک کی خاطر کیا کیا کھا دیتا ہے۔۔۔۔۔ ساآر۔۔۔ کی دوستی بھی، محسوس ہوتا ہے،۔۔۔۔۔ امروز کی دوستی کے پھول میں کہیں شامل ہے

چاہے کھا دین کر اس کو زرخیز بنانے کی صورت میں:

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۵)

میں نے جب اپنی آپ جی "نشان جگر سوختہ" قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تو اس الجھن سے دوچار ہوا کہ گفتنی اور ناگفتنی کا کیا تناسب ہو؟ کتاب زیت سے کون سی عبارت حذف کی جائے، کن تصویروں کے لیے جگہ رنگ استعمال کریں کہاں کنایہ سے کام لیں اور کن امور کو نمایاں تر کیا جائے، وضع رہے کہ میں جھوٹ، طمع اور مبالغہ کی بات نہیں کر رہا۔

اس نقطہ نظر سے جب "رسیدی ٹکٹ" کا مطالعہ کیا تو اسے جھوٹ، طمع اور مبالغہ سے پاک پایا، امرتا شاعرہ تھی مگر اس نے شاعرانہ اسلوب نہ اپنایا۔ وہ جذباتی عورت ہو گئی مگر اس نے آپ جی کے چولہے پر جذبات کی ہندیا نہ پکائی اور نہ ہی اس میں اُبال پیدا کیا۔ غیر جذباتی نثر میں ذات و صفات کا بیان کیا، سادہ لدھیانوی کی محبت کے اعتراف کی صورت میں امرتا نے ناگفتنی کا بھی تذکرہ کر دیا۔

امرتا پر یتیم یورپین عورت نہ تھی جسے سب کچھ کہہ دینے کی آزادی حاصل ہے وہ اس معاشرہ کی فرد تھی جس میں یتیموں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی ہے مگر امرتا پر یتیم نے نہ صرف یہ کہ یتیموں کو توڑے بلکہ اس ضمن میں اخفا سے بھی کام نہ لیا یہ بڑی بات ہے اور یہی "رسیدی ٹکٹ" کا plus point۔

بقول امرتا پر یتیم:

"میں صرف دل میں نہیں ترنوں، الماریوں میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنبھال رکھتی ہوں"

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۶)

یہاں قلم کار امرتا پر یتیم نہیں بلکہ ایک عورت سے ملاقات ہوتی ہے، عورت جسے نامساعد حالات میں بھی اپنے عورت ہونے کا احساس ہی نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ جو عورت ہونے پر فخر بھی کر سکتی:

"۔۔۔۔۔ جب تک میری نگاہوں میں میری عزت ہے، میرے ناموں پر حرف نہیں آ سکتا"۔۔۔۔۔ میری طرح میری عزت نے بھی ساری عمر کسی پر انحصار نہیں کیا۔"

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۴)

وہ مزید لکھتی ہے:

"اپنی ہستی پر فخر ہے۔۔۔ اگر پنجاب کی سرزمین پنجاب کی ایک نظم ہے۔۔۔۔۔ تو میں

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۵)

اس نظم کے معانی ایسی ہوں

یہ تعلیٰ نہیں، عزت نفس کا احساس ہے جس کا ”رسیدی ٹکٹ“ میں قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ یوں دیکھیں تو ”رسیدی ٹکٹ“ اس عورت کے رزمیہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جس نے مخالفت، گالی، طنز استہزاء، بہتان کے کانٹوں سے بھری راہ کا انتخاب کیا مگر فخر سے سر بلند کیے کسی فاتح کی مانند تخلیقی سفر جاری رکھا اور کامران بھی رہی۔۔۔ اس لیے کہ اس کے پاس تخلیق کار کا ید بیضا اور منور قلم تھا:

”زندگی کے اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتی تھی وہ میری قلم تھی

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۵)

قلم۔۔۔ جو کبھی پتوار بنتی ہے تو کبھی باد بان ک، کبھی راہنما ستارہ بنتی ہے تو کبھی اندھیرے کو منور کرنے والا چاند، کبھی عصا تو کبھی ضرب کلیم!

☆☆☆☆

## امرتا کا سولہواں سال: ایک چور

امرتا پر یتیم عشق کے رس میں گوندھ کر بنائی گئی ایک حسین عورت، جو سراپا گداز تھی۔ سرتاپا چاہت، جس کا رواں رواں محبت کے گیت گاتا ہوا، نونتی، ٹوٹ کر بنی، بکھرتی، بکھر کے سمنتی، وہ By birth شاعر و تھی، اس نے بہت لکھا، بے تحاشہ لکھا اور آخری دم تک لکھا، اس میں ہر احساس کو لکھنے کی طاقت تھی، خود اس پر ہنسی، پڑھنے والے پر بیت جاتی ہے۔ ایک شفاف عورت جس نے اپنی زندگی کی کتاب یوں کھول کر رکھ دی، کہ جیسے

دیکھو وہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں

میں نے تو سب حساب جاں بر سر عام رکھ دیا

جیسے شعر سن کر لڑکیاں دھک سی رہ جاتی تھیں۔

شاید کہانی اس سے بھی پہلے کی ہے، جب امرتا کے باپو سے چوری چوری سولہواں سال اس سے ملنے آیا تھا، نہیں، بلکہ یہ کہانی اس سے بھی پہلے کی ہے جب دس برس کی عمر میں اس کے خوابوں نے ایک صورت بنائی جو بعد میں ساحر بن گیا (بلکہ اور بھی نہیں) کہانی اور بھی پہلے کی ہے جب چار برس کی عمر میں اس کی رنگائی پر یتیم سے ہوئی اور یہ نام اس کی جان سے ایسا جڑا کہ اس کی جان جانے کے بعد بھی جڑا ہوا ہے۔

امرتا کی سوچ میں گداز، لطافت اور پیاری پیاری ہے۔ اس نے ہر اٹھتی ہوئی لڑکی کی طرح اپنی زندگی میں آنے والے شہزادے کی تصویر بہت کم عمری میں ہی بنائی۔ سولہواں برس بقول اس کے اس کی زندگی میں چور ہوں کی طرح چپکے چپکے۔ چپے چپے آیا تھا۔ اسی آنکھ بچولی میں امرتا نے وہ تصویر اس بیٹھے برس کے حوالے کر دی، جو سب سے چوری خوابوں میں اس نے بنائی تھی، وہ سولہواں برس مدتوں اس تصویر میں طرح طرح رنگ بھر سکے اس کے دیتا رہا۔



پھر یہ ہوا کہ امرتا نے یہ سارا پیکر ساحر کی ذات میں ایڈجسٹ کر کے اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔

ساحر نے امرتا کو کیوں نہیں اپنایا؟ کوئی مجبوری تو بیچ میں تھی نہیں پھر بھی کوئی بات تو ہوگی۔ خیر ساحر نے وہ سنیہڑے پڑھے بغیر واپس کر دیئے، جن میں روتی، کر لاتی، سسکتی، پیار کرتی، پیار مانگتی امرتا تھی، وہ وہ سنیہڑے تھے جن کے لیے 1957 میں امرتا کو اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ امرتا نے سوچا، ”خدا یا یہ سنیہڑے میں نے کسی انعام کے لیے تو نہ لکھے تھے۔ جس کے لیے لکھے، اس نے نہ پڑھے اب کل عالم بھی پڑھ لے تو مجھے کیا۔“ (ایک تو نہ ملا ساری دنیا ملے بھی تو کیا)۔

عشق ترے انگوٹھا لایا، کون حساب چکا دے گا

کاپس منظر بتاتے ہو ہے امرتا پر تہم خود لکھتی ہے۔

”میں نے ہنس کر ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا، ”آٹو گراف“ ساحر نے ہاتھ میں پکڑے چین کی سیاہی انگوٹھے پر لگا کر وہ انگوٹھا میری ہتھیلی پر لگا دیا۔ جیسے میری ہتھیلی کے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ اس میرے کاغذ کی عبارت کیا تھی جس کے اوپر اس نے دستخط کئے۔ یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے۔

عبارت نہ کبھی اس نے پڑھی، نہ زندگی نے، اس لیے کہہ سکتی ہوں ساحر ایک خیال تھا، ہوا میں چمکتا ہوا۔ شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک جادو۔“

خود امرتا کے حسابوں، وہ ساحر کہیں Exist کرتا ہی نہیں تھا۔ کیا یہ واقعی شیزوفرینیا کی کوئی ہلکی سی Wave تھی۔ جس نے اس کی ساری زندگی کو بگولے کی طرح اپنی پیٹ میں لے لیا۔ کتنی درازیں امرتا کے تن اور من پر آئیں، جب وہ گھر بار ساحر کے لیے چھوڑ کر چل دی تھی۔ چلنے سے پہلے اس نے ساحر کو فون کرنا چاہا، اور بیچ میں آگیا وہ اخبار جس میں ساحر اپنی نئی دوست سدھا ملہو ترا کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ (وہ ساحر اس دنیا میں کہیں آیا ہی نہیں جس کی تم دیوانی ہو۔ اس کے سولہویں سال نے اس کے دل کے کہیں قریب دھڑک کر کہا۔) یہ ایک اور ٹریجڈی ہو گئی۔

تر کے گھڑے کا سارا پانی بہہ چکا تھا۔

دنجابی کے وہ سارے لفظ، فقرے اور لہجے جن کا بدل دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں، اس



میں سارا رچاؤ امرتانی نے بھرا، امرتانی نو فنی تو یہ سارے بول جادو نہ بنتے، جادو گرتہ بنتا۔ ساحر بس ساحری رہتا۔

امرتا کی توڑ پھوڑ، ساحری بے دغا کی، امرتانی کی پذیرائی ان سب نے مل کر امرتانی پر تیم کو تخلیق کیا۔ پنجاب کا عاشقانہ لب و لہجہ امر ہو گیا، اور پنجابی کویتا نہیں گاتی اپنے سا جن پر ثار ہوتی پنجائیں امر بونئیں۔

اب آکھادار شہانہ، کہہ کر دو جھنگ کی ہیر کی کھلی ہو گئی۔ اگر کبھی میں امرتانی ہم عمر ہوتی اور امرتانی سے ملی ہوتی تو میں ضرور اس کی بڑی گودھی کھلی ہوتی اور امرتانی افضل تو صیف کی بجائے مجھے خط میں لکھتی تیرا تن دن و اطمین ہو تر یہ لا گیا۔ تر یہ میں پیاس سے بھی زیادہ پیاس ہے۔ پنجابی کے اکثر لفظ اپنے احساس میں یوں بھٹکے ہوئے ہیں کہ ان کا کسی اور زبان میں ترجمہ تو ہو سکتا ہے بدل نہیں ہو سکتا۔ امرتانی ایسے لفظوں کو ان کے رس سمیت خواب استعمال کیا ہے یا شاید امرتانی کے استعمال نے ان میں رس پیدا ہے۔

عمر کی پختگی کے باوجود، دو سو پلوں سال بار بار رائیڈز میکر ڈکی "شی" کی طرح نا آسودگی اور تشنگی کے شعلوں میں نہا کر چمکتا ہوا اس کی عمر کے ہر سال میں اس سے لپٹا رہا۔ اس سے ملنے آتا رہا۔ اور اس نے اس میں برس کو خود سے الگ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ سولہ سال کی امرتانی ہر نئے سال میں امرتانی پر تیم کے بدن میں دراڑیں کرتی اور اس میں رس بس جاتی تھی۔

اس سولہ برس کی امرتانی کو امرتانی نے سنبھالا جو شاید خود اس سے سولہ برس چھوٹا تھا۔

وہ داستان تھی کسی اور شاہزادے کی

مرا تھا نام فقہ زبیب داستان کے لیے

لیکن امرتانی زبیب داستان نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود ایک داستان تھا، امرتانی وہ شاہزادہ تھا، جس نے سلطنت بیوٹی کی آنکھیں چوم کر اس کو سو سال کی تکلیف دہ خیند اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ خواب سے بکایا۔ اس کے تمام تراش سمیت اس کو دل میں بسایا اور پھر خود اس کے گھر میں رچ بس گیا۔ امرتانی کو ہی نہیں اس نے اس نے سہ سے نو بجی رنگوں سے رنگ دیا۔ امرتانی کا چاہت بھرا ساتھ زندگی کے آخر تک امرتانی کے ساتھ رہا، اپنے کہ جب وہ رخصت ہوئی تو تب بھی وہ سولہ برس کی تھی۔

## زندگی پروف کی غلطیوں سے بھری ہے!

امرتسر اور لاہور کے درمیان ایک بستی آباد کی گئی، پریت گمر، دنیا کی یہ سبے مثال بستی محبت کی اور امن کی علامت کے طور پر آباد کی گئی تھی۔ یہاں ادیب، شاعر اور فنکار بستے تھے۔ علم کی، ادب کی، فکر کی اور دانش کی منڈلی جما کرتی۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ 1944ء میں یہاں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں ساحر موجود تھے اور جہاں امرتا پریتم بھی مدعو تھیں۔ بعضوں کا کہنا یہ ہے کہ امرتا کے یہاں اس طرح کے مصرعوں کا آغاز بھی یہیں ہوا تھا۔

وے سائیں، تیرے چہ سنے نے

اج کت لیا کتن والی نوں

محبت کے چپ پہ پاؤں دھرے دانش کا گھڑاسر پہ لیے چنگھٹ اور جانے والی اپنے عہد کی میرا نے اپنی ساری چٹا اپنے ایک سوانحی ناول ”رہسیدی نکٹ“ میں دل کھول کر بیان کر دی ہے۔

ہمارے جدید ادب میں امرتا پریتم جیسی ادیبہ کی دوسری مثال موجود نہیں۔ اُس نے اپنے آرٹ میں عورت کے وہ جہی رنگ بکھیر دیے جو عورت نے اس کے عہد تک دریافت کیے، اُس نے انسان کی بات کی، محبت کی اور امن کی بات کی، دنیا بھر میں موجود انسانوں کی آزادی کے گیت گائے۔ 1947ء میں جب وہ اٹھائیس برس کی تھیں، تو انھوں نے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم دیکھی، اور اس تقسیم کے نتیجے میں انسانوں کی، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی بے توقیری دیکھی تو پنجابی شاعری کے شاہ کو پکارا:

”اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبریاں وچوں بول“

31 اگست 1919ء میں دو گوبر انوالہ میں پیدا ہوئیں 31 اکتوبر 2005ء میں دہلی میں وفات پا گئیں، لیکن وہ طویل مدت تک لاہور میں رہیں اور ہمیں سے ادب، فن، آرٹ اور عشق کے ابتدائی نقوش ان

کی زرج اور وجود پر مجھے شروع ہوئے۔ اُن کے والد کے ملنے والوں میں ساحر بھی شامل تھے۔ ”جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو میں ایش نرے میں اُن کی پی گئی سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹوٹے سلگا سلگا کر اپنے لبوں سے لگاتی۔ انھیں پینے کے جتن کرتی، اور اس امر کا اظہار انھوں نے کئی بار کیا ہے۔

اظہار کی اور آزادی کی کئی شکلیں ہیں۔ بے شمار صورتیں ہمیں امرتا پریم کے یہاں ترتیب و تشکیل پاتی نظر آتی ہیں۔ وہ 14 برس تک آل انڈیا ریڈیو پر ستار بجاتی رہیں۔ کہیں دور اس کی مدھم سی لے آج بھی سنائی دیتی ہے۔

امرتا، چھیالیس برس اور دو ماہ تک زندہ رہیں۔

اُن کی زندگی کے یہ طویل برس محض برس ہی نہیں خود زندگی کا حسن بن کر سامنے آتے ہیں، ان برسوں کے دوران انھوں نے سجاد حیدر، ساحر اور امر و جیسی شخصیات کی ذاتوں میں اپنا اور اپنے فن کا جواز ڈھونڈا۔ پریم سنگھ۔ اوائل عمری میں ہی جن سے اُن کی شادی ہو گئی تھی۔ اس سے امرتا کی علیحدگی جلد ہی ہو گئی تھی لیکن اس کا نام امرتا کے اپنے نام میں لفظ ”امر“ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

تقسیم کا گھٹاؤ اتنا گہرا تھا کہ منٹو، ہیدی، کرشن چندر اور بعض دوسرے اہم لکھنے والوں کی طرح امرتا کے سینے پر بھی نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ انھوں نے اسے اپنی شاعری، ناولوں، کہانیوں اور مضامین کا موضوع بنایا۔ اُن کا ناول ”پنجر“ اس سلسلے کا ایک اہم اظہار یہ ہے۔ انھوں نے اس درد کو یوں سینے سے لگائے رکھا کہ گوجرانوالہ اور لاہور کی آزاد اور خوشبودار ہواؤں میں سانس لینے والی امرتا پریم نے لکیر کی دوسری جانب جب پاؤں دھرے تو مرکز نہیں آئیں۔ لیکن اُن کے افکار، اُن کے خیالات اُن پر کون بند باندھ سکتا تھا۔ ایک اُن کا ادبی تخلیقی عمل تھا۔ اپنی گائیکی کے شوق کو انھوں نے کلاسیکی اور صوفی شاعری سننے میں تبدیل کر لیا تھا۔ 1944ء سے انھوں نے اپنا ادبی رسالہ ”ناگ منی“ شروع کر دیا تھا۔ جس کا ہر شمارہ ایک خاص شمارہ ہوتا۔ یہ ایک ہی موضوع ایک ہی جذبے کی تقسیم ہوتا۔ جس میں تخلیقات کا انتخاب امرتا پریم کرتیں صفحہ بہ صفحہ اسٹریٹنز امر و کی ہوتیں یوں پڑھنے والے بصری حظ بھی اٹھاتے۔ وہ عظیم شاعرہ تھیں، اُن کی نظم میں اپنے عہد کی ساری روح سم آتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک برا لکھنے والا ہی روح عصر ہوتا ہے۔ جس سے زمانے اپنے زندہ ہونے کی شناخت طلب کرتے ہیں امرتا پریم کی ذات آپ اپنے زمانے کی شناخت ہے۔

امرتا دس دس پھریں، کئی ملکوں کے ادب کا ترجمہ کیا۔ خود اُن کی اپنی تخلیقات کے تراجم چونتیس

زبانوں میں ہوئے۔ اُن کے معروف ناولوں میں 'جنجر، چک نمبر چھٹی، اور ڈاکٹر دیو، کے علاوہ آبلنا، اشوکا، اک سوال، بلاوا، بند دروازہ، رنگ دا پتہ، اک سی انیتا، دھرتی سا گرتے سپیاں، دلی دیاں گلیاں، ایکا تے ایریل، جلا وطن یا تری، جیب کترے، اک رابونا، پکی حویلی، اک دی لکیر، کچی سڑک، کوئی نہیں جانتا، ادھناں دی کہانی، اک خالی جگہ، تیرھواں سورج، انجاندن، کورے کاغذ، ہر دت دازندگی نامہ اور نہ راوہانہ رکنتی۔

"نویں رت" امرتا کا وہ شعری مجموعہ ہے۔ جسے جدید پنجابی شعری ادب میں ایک تخصیص حاصل ہے۔ پاکستان میں اسے پہلی بار پنجابی کے نامور کہانی کار اور ڈرامہ نگار سجاد حیدر نے چیمپلز پبلشنگ ہاؤس سے چھپوایا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں لوک شعری، کلاسیکیت اور صوفیانہ شعری روایت اس شعری مجموعے کی نظموں کے رنگ و آہنگ میں ڈھلی ہے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈیاں کرناں، امرت لہراں، جیوندا جیون، تریل دھوتے پھل، او گیتا والیا، بدلاں دے پلے وچ، جھدی لالی، مکی جیہی سوغات، لوک پیڑ، پتھر کیے، لمیاں واناں، میں تو رات بیاں بند دی، سرگھی ویلا سنہڑے، اشوکا چیتے، کستوری، ناگ منی اور کاغذ تے کیوس اُن کے شعری مجموعے ہیں، اسی طرح چھپی ورھے بعد، کنجیاں، آخری خط، گوجرویاں پریاں، چائن دا ہوکا، جنگلی بوٹی اور اجنبی ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ آپ جی "رسیدی ٹکٹ" کے علاوہ، میرا کمرہ اور بڑے لکھنے والوں کے انٹرویوز پر مشتمل اُن کی کتابیں ہیں۔ ہندی، اُردو، انگریزی، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، اڑیا، اسامی، بنگلہ، سندھی، روستی، بلغاریہ، پولش، سرب، سپینش، فرنچ، ہال، تیلگو، کوکنی، ازبک، چیک، مقدونیہ، ہنگیرین، رومانیہ، یوکرین، البانین عربی، ڈینش، چینی، جاپانی، ویت نامی، جرمن اور نارویجن وہ زبانیں ہیں جن میں امرتا کی ناولیں، شاعری اور کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ہندوستان میں سب سے اہم "پدم شری ایوارڈ" سمیت کوئی اہم ایوارڈ نہیں جو انھیں نہیں ملا، اُن کی ادبی خدمات کا بیرونی دنیا میں بھی اعتراف کیا گیا ہے اور دنیا بھر کی اہم یونیورسٹیوں سے انھیں اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں ایک سو کے قریب کتابیں تخلیق کرنے والی امرتا پریم کی شخصیت ہمارے لیے کسی معجزے سے کم حیثیت نہیں رکھتی، جو انسانوں سے ہی نہیں، دھرتی اور دھرتی دیتا سے بھی سوال کرتی ہے۔

"دھرتی.... ات سندرتاب

تین سورج دی جلد والی

پر خدا یا، بھکھ، ٹنگ، بہم تے نلامی

اسکی تیری عبارت ہے

یاں پروف دیاں غلطیاں؟

پروف کی غلطیاں تو دکھائی دے جاتی ہیں اور درست بھی کی جاسکتی ہیں لیکن زندگی؟ زندگی، امرتا کے یہاں درد قرار پاتی ہے۔ جسے وہ کہتی ہیں ضیں نے سگریٹ کی طرح پیا ہے اور کتاب عشق جسے وہ عمر بھر رقم کرتی رہیں۔ کتاب زندگی کی وہی تفسیر تھی جسے بنی آدم اپنے روزِ اول سے اپنے پلو کی پوٹلی بنائے اس میں باندھے اپنی آئندہ نسلوں میں منتقل کرتا چلا جا رہا ہے۔ بس صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی کے یہاں اس کی دھجج منفرد اور اس کا نکھار اور طرح کا ہوتا ہے امرتا پر یتیم نے بھی امن کے اور محبت کے اس گیت کو نیا آہنگ، نیا ڈھنگ اور نیا اسلوب دیا۔ وہ اسلوب جو ہمارے عہد، ہمارے عہد کے انسان کا اسلوب قرار پایا ہے۔ وہ جو کہہ رہی ہیں۔

چائن دی پھلکاری تو پا کون بھرے؟

امبر داک آلا سورج بال گیا

من دی اچی مٹی دیوا کون دھرے؟

لیکن کسی نے کسی کو تو من کی اس اونچی مٹی پر چراغ دھرتا ہی ہے۔ شاید وہ امرتا پر یتیم ہی ہوں گی۔

~~~~~

## محبت کی اسیر۔۔ امرتا

امرتا پر یتیم، ادب میں ایک معتبر اور جانا پہچانا نام، ایسی شمع جس کی روشنی سے ایک زمانہ، ایک عہد اور ایک نسل منور ہوئی۔ اس نے ہجرت کا زہر چکھا۔ ذاتی زندگی میں ازدواجی نا آسودگی کو بھی سہا۔ باقی زندگی ایک ایسے بہادر دوست کے ساتھ گزاری جس کے لئے اس نے کسی قانونی یا سماجی ضابطے یا سند کو ضروری نہیں سمجھا تو پھر اسے سماج کی باتیں بھی لامحالہ سننا پڑیں۔ ایک حساس اور خوبصورت ذہن کا جب ان وارداتوں سے گزر رہا ہوتا ہے تو لامحالہ بہت توانا اور متاثر کن ادب تخلیق ہوتا ہے۔ امرتا نے اس آگ میں جل کر جو کندن بنایا ہے اس کو سارے اہل نظر نے پڑھا اور حد سے زیادہ سراہا بھی۔

لیکن آج جو ہمارا موضوع خن ہے وہ امرتا پر یتیم کی ادبی سرگرمیاں نہیں ہیں بلکہ اس کی تخلیقی قوت کو بڑھاو دینے والے محرکات یعنی امرتا کی ذاتی زندگی میں آنے والے تین مرد ہیں۔ یہ تینوں مرد ایک دو بے سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔ تینوں کا امرتا سے رشتہ یا تعلق بھی جدا جدا طرز کا ہے۔ اپنے اپنے حصے کے کرداروں کو نبھاتے یہ مرد امرتا کو کس مقام پہ لاتے ہیں اس کیلئے ہمیں ان میں سے ہر ایک کی شخصیت پر نظر ڈالنا ہوگی۔

سب سے پہلے امرتا کی ذاتی زندگی میں جس مرد کی آمد ہوتی ہے، وہ اس کا دھرم پتی پر یتیم سنگھ ہے۔ یہ وہ نام ہے جس نے امرتا کے نام میں پر یتیم کے لفظ کا اضافہ کیا۔ اور یہی وہ صاحب جن سے امرتا پہلی بار اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر کسی اور مرد سے متعارف ہوتی ہے۔ اس کے والد نے امرتا کی شادی نو عمری میں ہی کرنے کی کوشش میں ایک ایسے گھر کو ڈھونڈا جو کہ کاروباری اور کھانا پیتا ہے لہورانا رکلی میں اس خاندان کی کیڑے کی دوکانیں ہیں گھر میں نوکر چاکر ہیں اور لکشمی دیوی اس گھر پر عاشق ہے۔ امرتا کے والد نے رشتہ طے کرتے ہوئے خواتین والی مخصوص کھوج نہیں کی جو کہ عورتوں کا خاصہ ہوتی ہے خصوصاً رشتے طے کرتے

وقت جو سن گن محلوں گلیوں کی سیاست میں لی جاتی ہے وہ امرتا کے والد سے نہ تو ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ تو ٹھہرے ایک بھگت اور اللہ لوک انسان۔

پریم سنگھ ایک تھنوں، بیکار اور آوارہ قسم کے انسان اپنے تو کیا خاندان بھر میں مشہور تھے۔ پنجابی میں ایسے بندے اسلئے ایک محاورہ بولا جاتا ہے کہ اس نے "کدی لکھ بھن کے دہرا نہ کچا" یعنی عملی زندگی میں فارغ قسم کا شخص۔ گھر والے اس کی نا انقیوں سے نالاں تھے اور جلد از جلد اس سے چھٹکارے کا سوچتے تھے۔ والدین کو بھی وہی اولاد پیاری لگتی ہے جو ان کے لئے مفید ہو یعنی کام کاج کر کے ان کا ہاتھ بنائے یا کما کر لائے۔ بڑا بیٹا چونکہ والد کے ساتھ برابر کا ساتھ دے رہا تھا اسلئے وہ گھر یاہر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پریم کیلئے گھر والوں نے ایک ایسی لڑکی کا رشتہ تلاش کیا جو غریب خاندان سے ہو اور ان کے سامنے کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ سو جلدی جلدی جھٹ مٹنی اور پٹ بیاہ کر کے پریم سنگھ کے باپ نے بیٹے کو انارکلی میں کپڑے کی ایک دوکان بنا دی اور عملاً اپنے گھر سے علیحدہ کر دتے ہوئے یہ آواز بھی لگا دی کہ جاؤ بیٹا جا کر کماؤ اور کھاؤ۔ پھر پلٹ کر اس نے جوزے کی خبر لی۔ لی کہ جیتے بھی ہیں کہ نہیں۔

امرتا ان دنوں ریڈیو پر کام کرتی تھی اور بحیثیت اچھی شاعرہ اپنے آپ کو منوا چکی تھی۔ پریم سنگھ کا اپنی بیوی سے تعلق صرف بستر تک کا تھا یعنی رات کا رشتہ۔ دن کے اجالے میں ان کی دوستی کبھی بھی گہری نہ ہو سکی۔ کہنے کو میاں بیوی تھے مگر گھر داری کا پریم سنگھ کے اندر کوئی خیال تک نہ تھا۔ روزانہ صبح امرتا اپنے خاوند کو دروازے تک اسلئے نہیں چھوڑنے آتی تھی کہ محبت بھرے انداز میں رخصت کر سکے بلکہ شوہر صاحب اپنی بیوی کو اس دن کے کھانے پکانے کا خرچہ دس روپے کا نوٹ دوکان پر جانے سے پہلے دروازے پر دیا کرتے تھے۔ ایک روز اپنی بیوی کو موصوف کہتے ہیں "آج تو اتوار ہے چھٹی کا دن" امرتا نے کہا ٹھیک ہے پھر رات کو کھانے سے بھی چھٹی کر لینا۔

پریم سنگھ نے جو بھی کاروبار کیا، اس میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی یا وہ اس طرح پھل پھول نہ سکا جس سے کمزور میں خوشحالی آتی۔ لے دے کے زندگی میں ایک فلیٹ خرید پایا جس کی قسطیں بعد میں امرتا نے اپنی مائی سے اتاری تھیں۔ امرتا اس کے قرض اتارتے اتارتے اتنا تھک گئی کہ تنگ آکر اس نے ایک دن پریم سنگھ کو بھی اپنی زندگی سے اتار دیا۔ پریم سنگھ کا سب سے بڑا نقص اس کی اپنی ذہنی اپروچ تھی جس سے امرتا جیسی بلند پایہ عورت کا نبھاہ نہ ہونا لازمی بات تھی۔ کہاں ایک بہت بڑی ادیبہ اور قلم کار جو بولے تو ایک ایک



لفظ موتی، اور کہاں ایک دوسرے تیسرے درجے کا کم عقل اور کم فہم دوکاندار جس کی سوچ کا دائرہ اس کی دوکان اور بیکار قسم کے دوستوں سے کبھی آگے تک گیا ہی نہیں۔ امرتا جسے ہندوستان کی طاقتور وزیراعظم کا قریب حاصل ہے اور وہ اس ہستی کو راجیہ سبھا کی ممبر بنانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ پریم سنگھ اس خوبصورت لہن کی مالک بیوی کے لائق ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ایک دوسرے مرد کی آمد ہوتی ہے جو امرتا کے آس پاس ہی کہیں رہتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا رہتا درویش سا انسان ہے جس کا وجود رتبہ نے پیار کی مٹی سے گوند کر بنایا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو امرتا کو دل ہی دل میں چاہتا ہے، اس کو دکھ اور مصیبت میں بڑے حالات سے لڑتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ وہ امرتا کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور خود کلامی میں اپنے حالات کو بہتر کرتے ہوئے امرتا کے مصائب کو کم کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔ یہ صاحب مشہور آرٹسٹ امروزی ہیں اور اپنے فن سے دنیا کو حسین دیکھنا چاہتے ہیں۔ شمع دہلی رسالے میں بطور آرٹسٹ کام کرتے ہیں اور مبلغ تین سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔

امرتا جلد ہی ان کے وجود کو محسوس کر لیتی ہے اور ان کیساتھ مل کر اپنے دکھ سکھ کو شیر کر کے لگ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ رفاقت امروزی کی کھولی سے نکل کر امرتا کے گھر تک آ جاتا ہے۔ امروزی ایک بھلا مانس انسان اب امرتا کے بچوں میں گھل مل جاتا ہے اور پھر امرتا کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کی ڈیوٹیاں بھی اپنا لیتا ہے۔ ان کو سکول لیجانا اور واپس لانا امروزی کے روزمرہ کا معمول، اور جس کے بچے ہیں پریم سنگھ وہ ان ذمہ داریوں سے بے نیاز۔ شوہر کی بے غرضی اور پھر اس کے قرضوں کا بھارا امرتا کو جب شل کر دیتا ہے تو وہ اس کو گھر سے نکل جانے کا بول دیتی ہے۔ پریم سنگھ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک مشرقی بیوی اپنے شوہر کو گھر سے نکلنے کا کہے گی۔ امرتا نہ تو باقی کچھ عورتوں کی طرح اللہ میاں کی گائے تھی اور نہ کوئی معمولی عقل فہم والی ہستی۔ اس نے جو کچھ کیا، بہت سوچ سمجھ کر اور مناسب موقع پر کیا۔ چونکہ موجودہ مکان امرتا کی ذاتی کمائی سے تعمیر کیا ہوا تھا سو اسے نکلنے ہی بنی۔ پھر اپنے فلیٹ میں جا کر رہنے لگا اور جب اس کا آخری وقت آیا تو امرتا کا بیٹا نوراج اپنے باپ کی ہمدردی میں ماں سے لڑنے لگا۔ امرتا چپکے سے جا کر پریم سنگھ کو اپنے گھر میں لے آئی اور پھر قانون اور دھرم سے بالاتر ہو کر ایک طلاق یافتہ بیوی نے سابق شوہر کے کی حصار داری کر کے اس کے آخری سفر کو آسان کیا۔

امروزی اور پریم سنگھ کے درمیان ایک تیسرا مرد بھی ہے جو امرتا کی سانسوں اور سوچوں کا محور بھی ہے



اور محبوب بھی۔ اس کا تعلق اس دین سے ہے جس کو ہندوستانی اپنی رسوائی میں جگہ نہیں دیتے اور جس کے اس انسانی حق کو داغدار کر دینے کیلئے امر اپنی مافی سے بھڑکتی ہے کہ ان کے برتن ہمارے برتنوں سے الگ کیوں ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جس کے پریم میں بندھی امریتا موثر سائیکل کے پیچھے بیٹھی امروز کی کمر پر انگلیوں سے اس کا نام لکھتی رہتی ہے۔ جس کے سنگ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے اور اس کے پئے ہوئے سیکرہٹ کے ٹکڑوں کو سوغات سمجھ کر سمیٹ لیتی ہے پھر اس کے جانے کے بعد ان بیٹھے ہوئے ٹکڑوں کو عشق کی آگ میں ساگھا کر اپنی پریت کو منور کرتی ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس سے اس کی سوچوں کی اڑان اور خیالوں کی بلندی ہم رقاب ہوتی ہے۔ جو تخیل کی اسی معراج پر اسے بائیس کھولے ملتا ہے جہاں وہ خود پہنچی ہوتی ہے۔ ہاں یہ شخص ساحر لدھیانوی ہے جس نے رومانوی شاعری میں اپنا لوہا منوالیا ہوا ہے۔ جو مشاعروں کی جان ہے۔ جو فلمی شاعری میں لوگوں کی زبان پر مچلتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو امرتا کے لفظوں کو عشق، ہجر اور وصل کی لذتوں سے آشنا کرتا ہے۔

امروز سدا کا خدمت گزار اور ملوک انسان، میں نے پوچھا ساحر سے آپ کو کوئی حسد وغیرہ تو نہیں، امروز بولے "حسد کیا، میں تو امرتا سے پیار کرتا ہوں اور اس سے بھی جس سے امرتا پیار کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہوتی تھی جب یہ دونوں اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تھے۔ میں ان کو چائے پانی الا کر دیتا ہوں سید اکرم اور ان کی باتیں سنتا تھا۔ اصل میں دو چیزیں ہیں پاشا جی پہلی بات عشق کے حوالے سے ہے اور وہ یہ کہ عشق کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ یہ چلتا رہے یا ادھور رہے تو اس کی تپش بندے کو عام انسان سے بھگت یا پتہ نہیں کیا بنا دیتی ہے۔ بندہ اپنی ذات کو چھوڑ کر بھی سوچنا شروع کرتا ہے۔ اس کا سفر، اس کا راستہ اور اس کی منزلیں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ شاید ان دونوں کے دل میں بھی کوئی ایسی ہی بات تھی جس کی بنا پر وہ بات کو آگے نہ بڑھا پائے۔ لیکن میرے خیال میں امرتا کا ذہن ساحر کے حوالے سے کلیئر تھا، وہ ساحر کے ساتھ زندگی کی شروعات چاہتی تھی مگر جہاں تک تعلق ہے ساحر کا تو اس میں گھبرسانے کا جذبہ تھا ہی نہیں تھا، یا اس نے کبھی اس زاویے سے اپنی زندگی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ بات اس کے دوستوں کو بھی پتہ تھی کہ ساحر صاحب امرتا کے ساتھ سندھ رہتے ہیں لیکن وہ اس معاملے کو بس گفتگو اور ملنے جلنے کی حد تک رکھنے میں راضی تھے۔ آپ اسے دل لگی بھی نہ دیتے تھے۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ ساحر کے دوستوں نے مل کر اسے اور امرتا کو ایک کمرے میں ہی بند کر دیا۔ شاید وہ بات کو کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بات وہیں کی وہی رہی اور کچھ بھی نہ

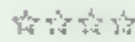
ہوا، امروڑ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے امرتا کو سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ میں نے پوچھا۔ امروڑ بولے، میں بہت چھوٹا تھا لہور میں پڑھتا تھا تب میں نے امرتا کی تصویر اپنے گھر کے ایک فریم میں لگی دیکھی تھی۔ میرے باپ کو امرتا کی شاعری بہت پسند تھی اور اس نے یہ تصویر پریت لڑی رسالے میں سے ٹاٹ کر لٹائی ہوئی تھی۔ جس میں امرتا کی کویتائیں چھپی تھیں۔ پھر دہلی میں اتفاق سے میرا فلیٹ امرتا کے گھر کے پاس ہی تھا، یوں اسے روزانہ دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع مل گیا۔

امروڑ جی! امرتا پر یتیم کی زندگی میں آنے والے تیسرے مرد آپ ہیں اور حقیقت میں آپ ہی وہ شخص ہیں جس کے ساتھ امرتا جی نے زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کیا ہے۔ کیا کبھی ایسا نہیں لگتا کہ باقی کے دوسرا یکسر اکارول ادا کر رہے تھے اور اصل میں اس فلم کے ہیرو آپ تھے؟

واہ پاشا جی کیا خوب کہی آپ نے، یہ بات سن کر تو مجھے بھی اب کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے جو یہ کہ انسان جو چاہتا ہے وہ اسے کم ہی ملتا ہے اور جس کی تمنا نہ ہو وہ اس کے آگے پیچھے ہی رہتی ہے نظروں کے آس پاس اور اکثر بیروں میں۔ امروڑ جی اب یوں تو نہ کہیں امرتا نے آپ کے ساتھ کو بہت دفعہ اپنی خودنوشت میں سراہا ہے۔ نہیں پاشا جی آپ بات کو کسی اور طرف لے گئے میں نے یہ نہیں کہا کہ امرتا نے مجھے سویکا نہیں کیا، وہ تو فخر کرتی تھی کہ رت بندے کو پورے جنم میں صرف ایک جوانی دیتا ہے اور مجھے تو امروڑ کی شکل میں دوسری جوانی بھی دی ہے، یہ پیار نہیں تو کیا ہے۔ اب آپ امرتا کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں کیا اب بھی اس سے وہی چاہت ہے؟ کیوں نہیں امروڑ بولے میں تو امرتا کی یادوں کی دھپ جائے اس کے گھر میں بیٹھا ہوں اور امرتا مجھ سے جدا نہیں ہوئی، وہ اب بھی میرے پاس ہی ہے، روزانہ مجھ سے ملتی ہے، باتیں کرتی ہے اور میرے ساتھ ساتھ دور تک پیدل چلتی ہے۔ ہم آج بھی سنسان سی سڑک پر چلتے ہوئے تھک کر فٹ پاتھ پہ بیٹھ جاتے ہیں اور کھوکھے سے چائے لے کر پیتے ہیں۔ وہ مجھ سے جدا نہیں۔ کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے کو بھی، ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ایک ساتھ ہیں۔۔۔۔۔

ابھی ہم نے امرتا پر یتیم کی زندگی میں آنے والے تینوں مردوں کے ذاتی کرداروں پر بہت تھوڑی سی نظر ڈالی، یقیناً تشنگی رہ جاتی ہے اگر ہم ان پر سیر حاصل بحث نہیں کرتے۔ مگر یہاں ہمارا مقصود امرتا جی کی ادبی زندگی کا احاطہ کرنا نہیں تھا بلکہ عنوان کے آس پاس رہتے ہوئے امرتا کی ذاتی زندگی میں آنے والے مردوں کے کرداروں کا ہلکا سا تعارف تھا، جنہوں نے اپنے عہد کی بڑی ادیبہ کی داخلی اور خارجی حیثیت کو متاثر

لیا۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو ان تینوں میں سے میرا ووٹ بھی امروز ہی کی طرف ہے جو اپنے آپ کو منفی کر کے کسی اور کیلئے جینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ جو دکھ سکھ میں برابر کا ساتھی بنتا ہے بنا کسی رشتے کے بغیر کسی تعلق کے۔



## امرتا۔۔۔۔ ایک تاریخ

جب برصغیر کی سرزمین کے ہاں بڑی سرعت سے کیونزم کی جانب متوجہ ہو رہے تھے اور استعماری ذہنیت انہیں خالصتاً مذہبیت کی طرف دھکیل دینے کے لیے کوشاں تھی۔ ان کا مقصد ملاً ازم اور شدہ ہندو ازم کا ٹھہرا برصغیر کے گرد بڑھانا تھا۔ ان ہتھکنڈوں سے آنے والے وقت میں اس خطے پر گرفت کرنا ان کا مطمحہ نظر تھا۔ اس شدید پنجابی دور میں 31 اگست 1919 کے دن نند سادھو (کرتا سنگھ) اور راج بی بی کے گھر منہی کلی امرت کور کے نام سے کھلی۔ کرتا سنگھ گوجرانوالہ کے اعلیٰ مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا شاعر بھی تھا۔ راج بی بی ایک سکول ٹیچر تھیں۔ ابھی امرتا گیارہ سال کی تھیں کہ راج بی بی ملک عدم کوچ کر گئیں۔ کرتا کی ایک اور بڑی بہن تھیں جو سادھن ہو گئیں۔ امرت کور امرت سے امرتا ہو گئی باپ نے اپنا تخلص ہتھکاری رکھ لیا۔ ہتھکاری بھی پنج کھنڈ بھسوز کے سکول میں ٹیچنگ کرتا تھا۔ وہ لکھاری تھا۔ رات کو لکھتا صبح سکول جاتا اور واپسی پر آ کر سو جاتا۔ گوجرانوالہ کے بعد لاہور میں وہ ایک کالج میں بھی پڑھاتا رہا اور سہت پرچے "رنجیت نگارا" کا ایڈیٹر بھی رہا۔ گھر میں پنجابی کا خوب راج تھا۔ وہ سنسکرت، برج بھاشا اور پنجابی میں شاعری کرتا۔ امرتا پر یم ادبی ماحول میں پلی بڑھی اور 1933 میں اس نے گیانی کار امتحان پاس کیا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلی تھی مگر زندگی کے سمندر میں اسے کچھ انتہائی کڑے گھونٹ بھی پینے پڑے۔ ابھی چار سال کی تھی کہ منگنی ہو گئی۔ یہ وہ عمر تھی کہ جب بچے کو زمانے کی اونچ نیچ کا بالکل پتہ نہیں ہوتا۔ ماں راج بی بی نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ رشتہ طے کیا وہ اپنا تجربہ نہیں دھرانا چاہتی تھی۔ امرتا پر یم کی ماں ضلع گجرات کے گاؤں مانگا کی رہائشی تھی اس کی شادی دئے سٹے کی تھی جس سے شادی ہوئی وہ فوج میں بھرتی ہو کر ایسا گیا کہ پھر وہاں واپس نہ آیا۔ راجن بی بی گوجرانوالہ میں اپنے بھائی کے گھر چلی گئی وہاں اس نے سکول ٹیچنگ بھی کی۔ ایک دن دیال سنگھ کے ڈیرے پر گئی وہاں دیالوجی کے بیٹے مندی نے راجن بی بی کو اپنا دل جانی

بنالیا۔ دیال جی نے دونوں کا ملاپ کروا دیا۔ نند جی نے اپنا نام کرتا رنگھ اور تخلص چوکھ رکھ لیا۔ دس سال کے بعد اللہ نے ایک بیٹی عطا کی جس کا نام چوکھ کا ترجمہ کر کے امرت کور اور بعد میں امرتا کر دیا۔ جب ماں مر گئی تو باپ بھی تارک الدنیا ہو گیا۔ امرتا پر یتیم بغاوتوں کے دور میں پیدا ہوئی اس کے ضمیر میں ماحول اور ارد گرد کی آب و ہوا رچی بسی ہوئی تھی۔

امرتا پر یتیم نے اپنی زندگی میں پہلی بغاوت تب کی جب ابھی گیارہ سال کی تھی تب ماں کی مرگ کے بعد گھر میں ثانی کا طوطی بولتا تھا۔ جب ابھی ماں حیات تھی تب گھر کے کچن میں تین گلاس الماری میں الگ تھلگ رکھے ہوئے تھے یہ باقی برتنوں سے الگ رکھے ہوئے گلاس تب الماری میں سے نکالے جاتے تھے جب باپو جی کے کچھ مسلمان دوست ان کو ملنے کے لیے گھر آتے تھے ان کو لسی یا شربت پلانا ہوتا تھا۔ جب دوست چلے جاتے پھر یہ برتن اگلے مسلمان لوگوں کے انتظار تک الماری میں سے بھاٹکتے رہتے۔ امرتا نے بغاوت کی کہ اگر ان گلاسوں میں ڈال کر دودھ ثانی نہیں دے گی تو وہ دودھ نہیں پیئے گی۔ اس بات کا پتہ جب باپو جی کو لگا تو انہوں نے برتنوں کی تفریق کا قلع قمع کر دیا۔ ثانی اس حقیقت سے غافل تھی کہ یہی بچی کل کو ان گلاسوں میں شربت پینے والوں کے سپوت سے عشق کرے گی۔ امرتا پر یتیم نے باپ کی شاعری پڑھتے پڑھتے خود بھی شاعری لکھنا شروع کر دی اور ساتھ ساتھ قافیہ ردیف کی درستگی کے لیے اصلاح بھی لیتی رہی۔ ذات پات کی تمیز عروج پر تھی جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تو امرتا پر یتیم ابھی بچپن کی دہلیز پر تھی۔ اس کے دیو چاچا کو سرکاری سکول سے اس لیے جھنسی کروادی گئی کہ وہ اپنے طالب علموں کو پھانسی کی واردات بتاتے ہوئے رو پڑا تھا۔

اولین ادوار میں امرتا پر یتیم کی شاعری کو شوقیہ سمجھتے ہوئے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ جب امرتا اپنی عمر کے 17 ویں سال میں داخل ہوئی تو یہ سال اس پر بہت بھاری تھا۔ یہی سال اس کی شادی کا سال تھا اور یہی وہ مبارک سال تھا جس میں اس کی کتاب ”امرت لہراں“ چھپ کر منظر عام پر آئی۔ باپ سنسکرت، برج بھاشا اور پنجابی میں شاعری کرتا تھا اسے ایک مارجن یہ بھی تھا کہ وہ ”رنجیت نگارا“ کا ایڈیٹر تھا اور رنجیت نگارا میں چھپنے والی تحریریں ہر جگہ پڑھی جاتی تھیں۔ باپ سے ہی امرتا نے گورکھی سیکھی۔ 1933 میں امرتا پر یتیم نے گیانی کا امتحان پاس کیا۔

1936 میں وہ اپنے پتی کے ساتھ لاہور کا رخ کرتی ہے۔ 1930 سے لے کر 1940 تک لاہور شہر مذہب و ملت سے آزاد شہر تھا۔ جہاں ہر رنگ نسل اور مذہب کے لوگ آزادی سے رہتے تھے۔ معاشرتی

ملن اور ہم آج بھی عروج پر تھی۔ 1935 میں اس کی کتاب ”ٹھنڈیاں کرناں“ منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اتنی سرائی گئی کہ امرتا کو اس نے شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

لاہور میں آکر امرتا پریم ایک بڑے ادبی حلقے کا حصہ بنی اور گربخش سنگھ کے پنجابی رسالے ”پریت لڑی“ سے تعلق جوڑ لیا، امرتا ہرن مولا خاتون تھیں، موسیقی اور رقص میں قدم رکھا تو باقاعدہ ٹریننگ لی اور آل انڈیا ریڈیو لاہور میں فوک گانے گا کر لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔

امرتا پریم کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ شادی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور یہ کاغذی بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔

امرتا محبت کو انسانیت کی معراج سمجھتی تھی، ساحر لدھیانوی کی محبت میں گرفتار ہوئی تو دل و جان سے اسے چاہنے لگی۔ امرتا سچے جذبوں کے ساتھ ساحر کے سحر میں گرفتار تھی۔ اس پاکیزہ محبت میں تاریخ دانوں کو وہی محبت کا دوام دکھائی دیتا ہے جو عشقیہ داستانوں اور لوک قصوں میں ہوتا ہے۔ ساحر تنہائی پسند اور امرتا روشن خیال تھی۔ اس نے عورت کی آزادی کا علم اٹھایا۔ ساحر سے محبت بھی کی تو ڈنکے کی چوٹ پر۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر 1946 میں امرتا نے ستار بھی بجایا اور ہر ماہ ریڈیو والے اسے ستار بجانے کے لیے بلا لیتے۔ اس نے 1946 تک آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن کے لیے نظمیں، گیت، فچر اور کہانیاں لکھیں۔ پاکستان بننے کے بعد انڈیا روانہ ہوئی پھر آل انڈیا ریڈیو کی لکھاری اور ناڈسربن گئی۔

امرتا پریم سیکولر ذہن رکھنے والی اور مضبوط اعصاب کی عورت تھی مگر اس کے باوجود وہ ہندوستان میں ہمیشہ بائیس باز کی تنظیموں اور مختلف گروہوں اور مختلف رائٹرز کی تنقید کا نشانہ بنتی تھی۔ اپنی موت سے تقریباً بیس بائیس سال قبل ہی اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اس نے بیشتر وحدت الوجود مذہب، تعویذ گندوں اور ہندو کہانیوں سے جڑی ہوئی تحریریں لکھیں۔ وہ خواب، اس کی حقیقت، روحانیت، ربی وجود کو بہت ماسنے والی تھی۔ امرتا کی فکر پر رابعہ بصری اور منصور حلاج کی سوچ کے اثرات تھے۔ اس کے علاوہ وہ ادشو (رجنیش) کی کتابوں اور فلسفے سے بڑا قریبی تعلق رکھتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ اگر تمہیں گوتم بدھ کو سمجھنا ہو تو پہلے ادشو (راجنیش) کو پڑھنا لازم ہے۔ بہت سے پاکستانیوں پنجابی ادیبوں کی تحریروں اور شاعروں کی تخلیقات کو ہندی اور گرومکھی میں ترجمہ کرایا۔ اس نے ”ناگ منی“ پر چوبیس بائیس سال ایڈٹ کیا۔ اور جب سے امروز کے ایڈیٹر اس میں جتنے لگے تو وہ پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی مشہور ہوا۔ انڈیا پاک کے رشتوں میں کئی بار تناؤ



آیا۔ سرحد کے دونوں جانب بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لیے محترم رویہ رکھتی تھی۔ دونوں ممالک کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی رشتوں کے تقدس پر خوشی کا اظہار کرتی۔ پاکستان سے جو جتنے بھارت (دہلی) جاتے چاہے وہ کسی زبان سے بھی تعلق رکھتے ہوں امرتا پریم سے ملاقات کرنا اپنی خوش بختی سمجھتے تھے۔ اس کے حلقہء احباب میں سے ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، دیوند رستیا، تھی، کرشن چن، عصمت چغتائی، افضل تو صیف وغیرہ تھے۔ اس کے دولت کدے میں شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، بابا فرید، رابندر ناتھ ٹیگور، ساحر فیض، احمد فیض، احمد راہی وغیرہ کی تصاویر لگی ہوئی تھیں جو کہ امروز کی کاوش تھی بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا کمرہ بلھے شاہ اور سلطان باہو کے مزارات کی چادروں سے بھی مزین تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں ان چادروں سے اٹھنے والی مہک میں صوفیا کا رنگ ہر طرف بکھرا محسوس ہوتا، اس کی کتب کی تعداد سینکڑوں تھی۔

وہ سچی اور کھری عورت تھی۔ ادب کی باریکیوں کو بنظر غائر پرکھنے کا فن جانتی تھی ایک مرتبہ کسی نے ان سے نظم اور نثر کی تفریق کا سوال پوچھا تو کہنے لگی کہ بظاہر نظم اور نثر میں تو کوئی خاص تفریق دکھائی نہیں دیتی مگر شاعری جی ہوئی برف کے ٹکڑوں کی مانند ہوتی ہے جو ایک ہی نقطے پر کھڑی رہتی ہے جبکہ ٹکھلی ہوئی برف کو ہم نثر کہیں گے جسے اپنے پھیلاؤ کے لیے بڑے کیوس کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری کو اکٹھا دیکھنا ہو تو اس کو ایک لفظ میں سمیٹ سکتے ہیں جبکہ نظم کو بہت زیادہ پھیلاؤ چاہیے۔

امرتا پریم نے بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ چھوٹی عمر میں ڈائری بھی لکھا کرتی تھی اور ڈائری لکھ کر چھپا دیا کرتی تھی۔ جب اسے کسی کے دیکھ لینے کا ڈر ہوتا تھا تب وہ اسے تالے میں بند کر کے رکھ دیا کرتی اور وہ بھی الماری کے اندرونی دروازے میں تاکہ اگر کوئی تالا کھول کر دیکھ بھی لے تب بھی اسے ڈائری دکھائی نہ دے جب حد سے زیادہ الماری پر قفل گری کی گئی تو الماری دوسروں کی نظروں میں آگئی پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔ قفل کھولا گیا۔۔۔ ڈائری پڑھی گئی۔۔۔ پھر ڈائری کے کیوس پر بکھرے ہوئے کئی حصوں کے بارے میں پوچھ پیچھے کی گئی۔۔۔ امرتا نے غصے میں آ کر ڈائری تار تار کر دی اور پھر کبھی ڈائری نہ لکھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ پاگل پن برالگا۔ خود پر غصہ کھا کر پھر سے ڈائری لکھنا شروع کر دی۔۔۔ ڈائری لکھی گئی اور پھر چوری ہو گئی پھر یوں ہوا کہ امرتا نے ڈائری کی بجائے شاعری اور گیت منظر عام پر لانا شروع کر دیئے اس کی شاعری کا جادو اس کے گیتوں اور نظموں میں اور اس کا احساس افسانوں کی زینت بنا۔ اس کی تحریروں اور شاعری میں تڑپ، کرب، کسک، نفیسگی، رنگینی، مٹھاس، پیار اور شیرینی ایک مشت موجود ہیں اور یہ

سب صفات اس کے من کی سچائی کی توسط سے ہیں۔ وہ ہمارے کئی قد کاٹھ والے مصنفین کی طرح چوری چھپے سگریٹ نوشی نہیں کرتی تھی۔ اس کی تحریر ہی اس کی اصل اولاد تھیں۔ اس نے ایک لاوارث بچے کو پالا۔ جس زمانے میں امرتا پریم کے ہم عصر اور کالج کے دوست پروفیسر سرکاری آفیسر ڈائریکٹر اور جج وغیرہ بنے بیٹھے تھے۔ انہی دنوں لوگوں نے امرتا پریم کو تپتی دھوپ میں بسوں کا انتظار کرتے ہوئے سڑک کنارے دیکھا۔ اس زندگی کے دکھ، غم اور رشک رواں یوں تو شاعری میں جگہ جگہ ملتے ہیں اسی طرح کی ایک زیرِ نظم میں اس نے بچ کا دروازہ کھولا ہے

میں تیری بیچ تے جد پیر دھریا سی  
میں اک نہیں ساں۔۔۔۔۔ دو ساں  
اک سالم ویایہی تے اک سالم کاری  
سو تیرے بھوگ دی خاطر  
میں اوس کنواری نوں ختم کرنا ی  
میں قتل کجیا سی  
ایہہ قتل جو قانونا ناجائز ہندے من  
صرف اوہتاں دی ذلت ناجائز ہندی ہے  
تے میں اوس ذات دا زہر پیتا سی  
تے فیر پر بھات ویلے  
اک لہو وچ بجھے میں اپنے ہتھ دیکھے سن  
ہتھ دھوتے سن  
بالکل اوس طرحاں  
جیوں ہی میں شیشے سا بنے ہوئی  
اوہ سا بنے کھلوٹی سی  
اویس جواپنی جاچے  
میں راتیں قتل کیستی سی



اوہ خدایا

کیسہ بچ داہنیر ابہت گاڑھاسی؟

میں کنھوں قتل کرنا سی

تے کنھوں قتل کر بیٹھی۔۔۔ (ٹھساری)

بات صرف عام دکھوں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عورت ہونے کے ناطے اس معاشرے میں عورت ذات پر ہونے والے ظلم و بربریت کے خلاف بھی آواز حق بلند کی۔ وہ نام نہاد بندشوں کے خلاف بھی مزاحمت کرتی رہی۔ کہتی ہے:-

اج میں اپنے گھر داہنیر مٹایا ہے

تے گلی دے متھے لگا گلی داناؤں ہنیا ہے

تے ہر سڑک دی دشاداں ناؤں پونجھ دیتا ہے

پر جے تسیں مینوں ضرور لکھنا ہے

تاں ہر دیش دے ہر شہر دے ہر گلی دا بو ہانکھورو

ایہ اک سراپ ہے اک ور ہے

تے جیتھے وی ستتر زوح دی جھلک پوے

بجھنا اوہ میرا گھر ہے (میرا پتا)

وہ بہادر بے باک با کردار اور باغیانہ کردار کی مالک تھی۔ اگرچہ وہ اپنی تحریروں میں ڈیموکریسی پر اگ

اور ڈکٹیٹر شپ اور اس طرح کے موضوعات کا تذکرہ کرتی رہے مگر اس سب کے باوجود اس کے پیش نظر یہ بات

رہتی ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور زندگی کو زندگی سے جوڑنے والی عورت ساری عمر خود ٹوٹی رہی۔ اس کی ساری

شاعری انسانیت کی شاعری تھی مگر ساری شاعری میں یوں لگتا ہے کہ عورت کے لیے عورت نام ہے محبت کا

گویا اس کی ساری شاعری محبت کے نام تھی

اک کوئی ڈھپ دی

میں ڈیک لاکے پی لواں

تے ان ٹوٹا ڈھپ دا

میں لکھ دے دوج پاپواں (سیال)  
 کدے کدے میں اٹھ۔۔۔ سوچاں۔۔۔  
 لکھ دی لال ندی نوں پاڑاں  
 اپنا دستخط آپ چھپاواں  
 اس قرضے توں مکر جانواں (اک ٹھٹھا)  
 وہ سماج کی اینٹوں کو ترتیب سے جوڑ کر ایک خوبصورت عمارت بنانے میں لگی رہی  
 سامراج اک ناواں شاہی یونا  
 ہر آدمی ذاتِ خلل دے دا لگ اُگی  
 حاکم دا حکم اوتا ہے  
 اوہ جتاوی کر لوے  
 تے پر جادی پیڑاوی ہے  
 اوہ جنی وی جر لوے (دیکھ کبیرا رویا)

وہ سماج کا دکھ ذاتی سمجھتی تھی۔ نجی حادثے تو ثانوی حیثیت پرکھتے تھے اس کی نظر میں جو روزِ نجانے اس کی  
 ذات پر کتنے وارد ہوتے مگر بیرونی حادثے ہی دراصل اس کے حواس پر طاری تھے سب سے بڑا سانحہ ملکی تقسیم کا  
 سانحہ تھا۔ جہاں انسانی لبو سے سرسبز و شاداب سرزمین رنگین ہو رہی تھی وہاں امرتا کا قلم بھی اسی خون کے آنسو  
 رو رہا تھا اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کی پوروں میں پکڑا قلم دکھ کے گھونٹ پی کر لفظ اور اراق پر اتارتا رہا۔ ایک  
 نظم ”اک گر جے دی موم بتی“ لکھتی ہے

اک گر جے دی موم بتی  
 روز چھاتی دی اگ نوں پیراں وچ بال کے میں  
 گر جے توں باہر جاندی ہاں  
 تے جگدیاں بجھدیاں اکھاں چوں گزر کے میں  
 اکھراں دے حسن تک پہنچ جاندی ہاں  
 پر اکھراں دے حسن۔۔ کاغذ دی اجازت

جد کے کاغذ چوں باہر آؤندا ہے دھرتی بدن چھو بندا ہے

تاں دھرتی دے لہو وچ بھنڈا ہے۔۔۔۔۔

او میرے آج دے مسیحا توں نہیں لہدا کتے

تے میں عنماندی جہی صرف گولیاں تے

بند و قاف دی آواز سندی

اوس گر جے وچ پرت آؤندی ہاں جو حالے

وی کسے دیس وچ نہیں بنیا۔۔۔۔۔

امرتا پریم آج کے دور میں پیار محبت اور دوستی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ ذات باری تعالیٰ نے جہاں اسے  
حزرت دولت شہرت اور فکری آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا۔ وہاں وہ اتنی ہی عاجز اور دوسروں کا خیال رکھنے  
والی تھی۔ اگرچہ وہ پارلیمنٹ کی ممبر تک بھی رہی وہ چاہتی تو اپنے گھر میں پارلیمنٹیرین کی طرح نوکروں کی  
قطاریں لگا سکتی تھی مگر شائستگی اور قرینے سے نوزیر سر کرنے والی امرتا نے اپنے گھر میں ایک بھی نوکر نہ رکھا اپنے  
سارے کام بلکہ امروز جو اس کا پرانا ساتھی اور عمر کے آخری دنوں تک کا دوست تھا کے ساتھ کام کرنا خود پسند  
کرتی تھی۔ وہ مشرقی پنجاب میں تھی مگر اس کا خوبصورت دل مغربی پنجاب میں دھڑکتا تھا۔ مغربی پنجاب سے  
جانے والے احباب اور جو نیند گان علم کو مل کر وارث بنے شاہ حسین سلطان باہو اور خولجہ فرید کی دھرتی اور  
ربانشیوں کا حال پوچھتی اور باتیں کرتے کرتے سرحد کراس کر کے پاکستان کی دھرتی میں آہستی۔ سب دکھ سکھ  
اپنی آنکھوں میں بھر لیتی۔ اگر ماں دھرتی سے محبت کا اگر کسی نے سیکھا ہو تو اس عظیم ہستی سے سیکھے جس کا نام امرتا  
پریم ہے۔ اس کی ہر تحریر لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہوتی وہ لفظ صفحہ قرطاس پر اندھ لٹتی تو وہ موتیوں کے ہار بننے  
جاتے وہ تصنع بناوٹ کو قریب نہ پھٹکنے دیتی۔ اس کی ڈکشن انتہائی رسیلی تھی۔ امرتا پریم پنجاب سرزمین کا وہ  
لیجنڈ ہے جسے پنجاب دیس بھی بھلا نہیں پائے گا۔

امرتا کے دور اور تحریر میں اس وقت نکھار پیدا ہوا جب پارٹیشن کے وقت اس نے اپنی آنکھوں سے ظلم کی  
بولی دیکھی۔ انصاف مانگتے ہوئے چہرے لاہور سے دہلی جاتی ہوئی ٹرین میں یہ منظر اس نے اپنی آنکھوں  
سے دیکھا۔ کانوں میں چیخ و پکار اور باہر کا سناٹا وقت کی کالی تاریخ کی مانند لگ رہا تھا۔ گاڑی کی کانوں میں  
شاں شاں کرتی ہوئی آواز شاید امرتا کے دور کو پیٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے شجر سانپ

بھیڑے محسوس ہو رہے تھے۔ اسی حزن میں اس نے ”آج آکھاں وارث شاہ نوں“ لکھی۔ وہ سوچتی رہی کہ وارث شاہ کتنا عظیم ہے جس نے ہیرو کے دکھ کو گیت سنگیت کا رنگ دیا۔ امرتا کو بھی اپنا دکھ شیئر کرنے کے لیے وارث شاہ ہی دردی اور ہمدرد انسان لگا۔ چند دنوں میں یہ نظم جنگل میں آگ کی طرح پہنچتے پہنچتے پاکستان بھی آگئی جس کو فیض احمد فیض نے اپنے ’دیباچے‘ میں بھی شامل کیا۔ جہاں امرتا پر یتیم کی اس نظم کو بہت سراہا گیا وہاں اس بے چاری کو اس کے عوض بہت دکھ بھی ملے۔ خاص طور پر کئی سکھوں نے اسے مذہبی خانے میں رکھ کر تو! اور کہا کہ امرتا کو وارث شاہ کی بجائے گردونا تک نظر کیوں نہ آیا اور اس نے وارث کو پکارنے کی بجائے گردو جی نامک سے التجا کیوں نہ کی۔ سارے سکھ بھائیوں نے مخالفت نہیں کی بس انتہا پسند سکھ گروہ کی طرف سے ہی یہ رد عمل سامنے آیا جو ویسے بھی امرتا کی شاعری کو پورنو گرافی کہتا ہے۔ انتہا پسند سکھوں کے ساتھ کمیونسٹوں کی مخالفتوں کا بھی امرتا کو سامنا کرنا پڑا۔ کمیونسٹوں کا موقف تھا کہ امرتا کو وارث کی بجائے لینن اور شالین دکھائی کیوں نہیں دیئے۔ اس نظم کے رد عمل پر بہت سے جنگ نظر شاعروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ خداداد صلاحیتوں سے مالا مال امرتا پر یتیم نے صرف آئیس (21) برس کی عمر میں پنچر ناول تحریر کر کے اپنے ساحر سے عشق اور استقلال کی دھو میں مچا دیں۔ بے اختیار ہی میں لکھے ہوئے لفظوں کے پھولوں سے میڈیا نے بھی خوشبو چرائی اور ہر جگہ اس کی مہک پھیل گئی۔ بات صرف یہیں تک نہیں تھی امرتا کی ساحر کے لیے لکھی گئی وہ نظم ”تیریاں یاداں بہت دیر ہوئی جلا وطن ہوئیاں“ بھی امر ہو گئی۔

امرتا کی ساحر کے بارے میں نظموں کی ایک کتاب "Sunehra" (سنیہڑے) ہے جو 1955 میں شائع ہوئی۔ امرتا نے پنجابی لٹریچر کو پہلی بار Jnanpith Award اپنی نظموں کے مجموعے کاغذتے کیونس کی وجہ سے دلویا۔ اس کے بعد یہ ایوارڈ نرمل ورم اور معروف ناول نگار گردیاں سنگھ کو مجموعی طور پر ملا تھا۔ امرتا کو انعام ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ کیا وہ اس ایوارڈ پر خوش ہے تو اس نے ایک مصرع پڑھ کر اپنا جواب مکمل کیا کہ

”مان سچے عشق دا اے ہنر دا دعویٰ نہیں“

امرتا جہاں عزت، شہرت، دولت اور محبتیں سمیٹی رہی وہاں ایوارڈز بھی چل چل کر اس کی جھولی میں آتے گئے اسے Cyriland Methodious Award بلغاریہ سے ملا اور اس کے علاوہ Ordre des Arts Las Letters فرانس سے دیا گیا۔ دہلی گورنمنٹ نے بھی اسے ملیم کی شاعرہ کے خطاب سے نوازا اور پھر اسی خطاب کو پنجاب اکیڈمی لاہور پاکستان نے اسے عطا کیا۔ پاکستانی پنجابی لکھاریوں کے اس خطاب پر وہ

انتہائی خوش تھی جس میں لکھا ہوا تھا کہ

"You are the true daughter of Waris Shah and the waris of our Waris"

1976 میں 'رسیدی نکٹ' پہلی بار شائع ہوئی۔ سچ اور حقیقتوں پر مبنی اس تحریر میں وہ تمام اجزاء شامل ہیں

جو اسے Dom Morees کی سوانح حیات My sons Father کے برابر لاکھڑا کرتی ہے۔ یہی وہ تحریر تھی

جسے Stephen Spender نے کلاسیک کا درجہ دیا۔ امرتا پر 'تم' نے Revenue Stamp کو مد نظر رکھتے

ہوئے اس کا نام 'رسیدی نکٹ' رکھا۔۔

امرتا نے اپنی والدہانہ محبت کے مہیب صدمے سے نہ صرف خود امر ہوئی بلکہ اپنے ساحر کو بھی امر کر

گئی۔ امرتا پر 'تم' کے لکھنے لکھانے کا عمل تقریباً ستر بہتر سال تک جاری رہا وہ 83 سال کے دھانے پر ایک دن

اپنے گھر میں گرنے سے چوٹ کھا گئی یہیں سے اس کی ادبی مصروفیات کا اختتام ہونا شروع ہو گیا۔ دیوالی کی

سہ ماہیہ پر 31 اکتوبر 2005 کو وہ مشرقی و مغربی پنجاب کے محبت کرنے والے پنجابیوں کو تنہا روتا دھوتا چھوڑ

گئی اسی خزاں رسیدہ شام میں پنجاب ادب پر خزاں مسکراتی رہی۔ اور پنجابیوں کے دل پر "چپ" کے قفل

پڑ گئے۔ جیسا کہ محبت کی دیوی اپنی نظم میں کہتی ہے

من دی ایس گھڑونجی اتے

سوچاں والی گاگر خالی

چپ میری تر یہائی بیٹھی

ہونٹھاں اتے جھہ پھیر دی

دو حرفاں دا پانی لیسے۔۔۔۔

عشق میرے نے کھوہ کٹھایا

وہ ہوں جیس طرح کسہیاں وجہن

راتاں جیکر کی گنتیاں

در ہے جیس طرح پتھر لٹے

پانی اے کتے نہ لیسے۔۔۔۔

من دی ایس گھڑونجی اتے

گا گر بیٹھی سو دھی ہو کے  
 سمجھ کچھ سکے بول نہ سکے  
 چپھ کے طرح نرہی اکڑی  
 ہونٹھ کس طرح چپ کھڑے۔۔۔  
 سمھناں دلوں موہنہ موڑ کے  
 اک بنے اکو سا بیٹھا  
 کلا کھوہ جگالی کردا  
 مٹی جتھے پتھر چبے۔۔۔۔۔

امرتا محبتوں کو صرف لازوال احساس سمجھتی ہی نہیں اپنے کردار سے جتنی بھی ہے اور اسی محبت کے رشتے  
 کو اپنی نظم ”رشتے“ میں یوں پرودیتی ہے۔۔۔۔۔

باپ ویر دوست تے خاوند  
 کسے لفظ دا کوئی نہیں رشتا  
 انج جدوں میں تینوں تکیا  
 سارے اکھر گوڑھے ہو گئے

وہ اس مذہب سے تعلق رکھنے والی ہستی تھی جس کا پہلا سبق مخلوق خدا کو خوش رکھنا ہوتا ہے بندے کا دکھ وہ  
 نہیں دیکھ سکتی بات یہیں تک نہیں رہ جاتی جس مٹی سے وہ جڑا ہوتا ہے وہ اس مٹی کو بھی مقدس مان کر پوجتی ہے  
 اس پر آنج آنے سے پہلے ہی اسے فکر لاحق ہوتی ہے وہ شعوری طور پر کوئی پیشین گوئی نہیں کرتی بلکہ پیشین گوئی  
 اس سے سرزد ہو جاتی ہے۔ اپنی نظم ”رب خیر کرے“ میں کہتی ہے

رب خیر کرے میرے ویرے دی  
 کہ جس تھاں رانجھن ڈیرا کیتا  
 ادتھے دھمک سنیدی کھیرے دی۔۔۔  
 ارج چارے کندھاں دین دھائیاں  
 کہ ارج ملکی دی بکی وچوں

دودھ دیاں بونداں کہنے چہ انیاں نیں۔۔۔

رب خیر کرے میرے ویزھے دی۔۔۔

اج نیلے دیاں مجھیں روٹیاں

کہ اج ایس میری دہنی دے دج

کس نے لہو دیاں دھاراں چونیاں

رب خیر کرے میرے ویزھے دی۔۔۔

اج ہر اک بستہ مجھن آیا

کہ اج میرے در سے دچوں

سدا اکھر کہنے چھپایا

رب خیر کرے میرے ویزھے دی۔۔۔

مار دھاڑ، قتل و غارت آبادھاپی اور حقوق کی کھینچا تانی کے دور میں پروان چڑھنے والی نرم نازک اور حساس پستیلی اگرچہ ماحول پر سزتی کڑھتی رہی مگر گھپ اندھیروں میں روشنی کی کرن دیکھنے والی مکمل طور پر تاریکیوں سے مایوس نہ ہوئی بلکہ جینے کے لیے جس زدہ معاشرے میں نئی راہیں اور نئے موسم تلاش کرنے کا عزم کرتی ہے اپنی نظم ”نویں رت“ میں کہتی ہے۔۔۔۔۔

اور بیا کوئی گاؤں

دھوئیں نال دھواکھی دھرتی

کو لے چائن واک پوچا

کون بیا کوئی گاؤں

دور بیا کوئی گاؤں

علم و ادب کے میدان میں اس نے مندرجہ ذیل کامیابیاں سمیٹ کر نہ صرف شہرت کمائی بلکہ پنجابی ادب کا دامن بھی رنگارنگ تجربوں اور امتناف سے بھر گئی۔

۱۹۵۶ء میں سہتہ اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا

۱۹۶۶ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک ناگ منی رسالہ نکالتی رہی

- ☆ 1969 میں پدم شری ایوارڈ لیا
  - ☆ 1973 میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی
  - ☆ 1979 میں واپٹ ساروا ایوارڈ حاصل کیا
  - ☆ 1983 میں بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کیا
  - ☆ 1983 میں ہی جودھ پور یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی
  - ☆ 1983 میں دشنو بھارتی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کی
  - ☆ 1986 میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی
  - ☆ 1987 میں حکومت فرانس کی طرف سے ڈگری ملی
  - ☆ 1989 میں ایس این ڈی ٹی بیہی یونیورسٹی کی طرف سے بھی اعزازی ڈگری حاصل کی
  - ☆ 1990 میں پنجابی اکادمی کی طرف سے وارث شاہ ایوارڈ حاصل کیا
- اس کے علاوہ بہت سے اعزازات اور ایوارڈ اور انعامات حاصل کیے

☆☆☆☆



## امرتا پر یتیم کی زندگی کے رَس میں ڈوبی ہوئی باتیں

پچھتر کتابوں کی مصنف وہ جینس عورت کہ جس کے ہاں تخلیقی اظہار کے وفور کی ایسی شدت ہے کہ کم کم دیکھنے میں آتی ہے جس کی نثر اور شاعری آپس میں اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے پانی میں رنگ۔ جو حرف کی عظمت کی اتنی قائل ہے کہ لفظوں کو سچے موتیوں کا درجہ دیتی ہے۔ ایسی شاندار خاتون سے ملنے کی تمنائیں صد دراز سے دل میں تھیں۔ آخر کار میری یہ تمنا پوری ہوئی اور بہت خوبصورت انداز میں ہوئی۔ وہ یوں کہ 1989 میں Tourism کے حوالے سے پاکستان سے ایک وفد سید یوسف رضا گیلانی صاحب کی قیادت میں کہ جو اس وقت نورازم کے وزیر تھے انڈیا کے ایک Festival میں شرکت کے لیے دہلی گیا۔ ٹکٹل ایڈیشنل سیکرٹری نورازم تھے۔ چنانچہ مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ دہلی میں پہلی رات وہاں کے نورازم والوں نے تاج محل ہوٹل میں بہت ہی خوبصورت ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد کھانا تھا۔ کھانے پر دہلی کے بہت سے معززین کو مدعو کیا گیا تھا۔ جس میں شاعر وادیب، موسیقار ڈانسرز لڑکیاں لڑکے وزراء امراء اور بیوروکریٹس سب شامل تھے۔ غرض یہ کہ ایک رنگ و بو کا طوفان تھا کہ جو کسی خواب کا منظر لگ رہا تھا مگر آپ سے کیا کہوں میری سوئی تو ایک ہی جگہ انگی ہوئی تھی۔

”ذہن بار بار یاد دلاتا مجھے امرتاجی کا پتا کرنا ہے“ اچانک اپنی پلیٹ پکڑے ہوئے کنور مہندر سنگھ میر سے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ نور جہاں ثروت نے میرا ان سے تعارف کرایا میں نے تھوڑی سی گفتگو کے بعد ہی اپنی بے تابی کا اظہار کر دیا۔ وہ بہت ہنسے۔ بولے ”لے اپنی جی ٹی گلی سی۔ میں تاں امرتا دا جیٹھ آں۔ میں فون کراں گا او بنوں کل 11 بجے جا کے مل لے توں۔“ پھر میرے بشارت چہرے کو دیکھ کر اور بھی ہنسے۔ مجھے تمام پتا وغیرہ سمجھایا۔ دوسرے دن گیارہ بجے جب میں امرتا پر یتیم سے ملنے کے لیے 25 حوض خاص دہلی والی چٹ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ کر ان کے گھر کی طرف رواں تھی تو ظاہر ہے میرے ذہن نے ان کا ایک پیکر پہلے سے تراش رکھا تھا۔ یہ پیکر ان کی شاعری افسانے اور سوانح عمری پڑھ کر اور ان کے مداحوں سے ان کی باتیں سن کر

خود بخود بن گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں آج ایک ایسی خوبصورت خاتون سے ملنے جا رہی ہوں جس کا ظاہر اور باطن ایک سا ہے۔ جو لوگوں کے دل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس کا دل انسان دوستی کے جذبے سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ جو جسمانی طور پر کمزور اور نازک سہی لیکن ذہنی طور پر ایک ایسے مضبوط قلعے کی مانند ہے کہ جسے طاقت کے زور پر فتح کرنا تقریباً ناممکن ہے جو ایک طرف معاشرے کی فرسودہ روایات سے باغی ہو کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ جانتی ہے اور تنہا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہے اور دوسری طرف تیلیوں کے پروں جیسا نرم و نازک دل رکھنے والی ہے کہ جو مذہب کے نام پر کشت و خون ہوتا دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتی ہے۔

اج آ کھاں وارث شاہ نوں جتے قبریں وچوں بول  
تے اج کتاب عشق دا کوئی اکھا ورقا پھول

اُٹھ درد منداں دیا دردیا اُٹھ دیکھ اپنا پنجاب  
اج نیلے لاشاں دھمپیاں تے لہو دی بھری چناب

اک روٹی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے مین  
اج لکھتاں دھیاں روئندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اج سارے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور  
اج کتھوں لیا پئے لہہ کے وارث شاہ اک ہور

جب عشق کی بات کرتی ہے تو ایک صوفی کی طرح کہتی ہے

”پئے جیکن کئی بھیاں

ہر ایک بھئی اک جھوکا امیر عشق مجوری کروا“

گاڑی دہلی کے ایک نسبتاً خاموش علاقے میں ایک کوچی کے آگے آ کر رُکی اور سبز بیلوں سے لدی ہوئی

دیواروں نے مجھے اپنی زبان میں خوش آمدید کہا۔ میں نے کال بیل کی۔ ایک چھوٹی بچی نے دروازہ کھولا اور

مجھے گھر کی اوپر کی منزل پر لے گئی۔ سادہ سا ڈرائنگ روم جس سے نفاست جھلک رہی تھی میرے سامنے تھے۔  
مجھے ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دہلی پتلی نازک سی امرتاجی سوتی شلواری میں ملبوس میرے سامنے کھڑی  
تھیں۔ انتہائی شفیق چہرہ جیسے ماں کا چہرہ ہو۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اپنا پہلا مجموعہ جو دو برس پہلے شائع ہوا  
تھا ان کی نذر کیا ساتھ ہی کہا میں انڈیا فقط آپ سے ملنے آئی ہوں۔

ووڈرامسکرامیں بولیں۔ ”پاکستان کے لوگ بھی مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور یہ بات مجھے بہت اچھی لگتی  
ہے۔ دیکھو نا ابھی کراچی سے نزہت صدیقی ملنے آئی تھی فخر زمان بھی آئے ہوئے تھے میرے ہاں ہی  
نظہرے۔ تم لوگوں کی وجہ سے وہاں کی کتابیں پڑھ لیتی ہوں۔ اچھا بتاؤ کیا تم بھی کراچی کی رہنے والی ہو۔  
”جی نہیں میں ”لاہورن“ ہوں۔“ ”تو اب تک اردو کیوں بول رہی تھیں۔“ انہوں نے پنجابی میں سوال کیا۔  
میں چپ رہی۔ ”اچھا یہ بتاؤ کیا پنجابی میں لکھتی بھی ہو؟“ ”کبھی کبھی۔ مگر بہت مشکل لگتا ہے۔ دراصل  
شروع سے گھر میں تمام رسالے اور کتابیں اردو کی ہی آتی تھیں۔ وہ پڑھتی تھی۔ بس اس طرح۔۔۔“ مجھے  
کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک دم سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ”اپنی مادری زبان سے بس بولنے کی حد تک دوستی ہے  
ہماری۔ اب یہاں دیکھو۔ انڈیا میں ہندی کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ سب سکولوں میں لازمی قرار دے دی گئی  
ہے۔ اس زبان کی نشوونما کے لیے ہر قسم کی شعوری کوشش ہو رہی ہے حکومتی سطح پر۔ مگر پنجابی جو یہاں لاکھوں کی  
زبان ہے اس کے لیے کچھ نہیں ہو رہا۔ مجھے افسوس ہوتا ہے انہی باتوں پر۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی مظہر الاسلام سے  
باتیں ہوئیں اس موضوع پر۔ کیا کہتا ہے وہ؟ پکا پنجابی ہے۔ بہت پیارا انسان ہے۔ کیسی خوبصورت کہانیاں  
لکھتا ہے۔ نشا یاد کی کہانیاں بھی میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ کتنا خلوص ہے اس کی تحریروں میں ہاں احمد داؤد  
بھی اچھا لکھنے والوں میں ہے۔ سب کو میرا پیار دینا۔ مظہر سے کہنا کبھی آکر مجھے ملے۔“ ”جی ضرور کہہ دوں گی“  
میں نے جواب دیا۔ (واپس آکر میں نے مظہر کو ان کا پیغام دیا تھا۔ اس نے کہا ”شبثم یہ ایک عجیب بات ہے  
کہ میں بھی امرتاجی کو بطور انسان اور بطور شاعرہ ادیبہ بہت پسند کرتا ہوں۔ لیکن آج تک ہم دونوں کی ملاقات  
نہیں ہوئی۔“

میں نے اسلام آباد کے ایک دو ادیبوں کا نام لیا اور پوچھا آپ نے انہیں پڑھا؟ خالدہ حسین کا نام  
خاص طور پر اس وقت ذہن میں آ رہا ہے۔ بولیں ”کتابیں نہیں ملتیں بس کوئی بھیج دے یا جب کوئی ملے آئے۔  
تو درشن ہو جاتے ہیں وہاں کی کتابوں کے۔“ پھر کہا ”تم مجھے وہاں سے کتابیں بھجوادو۔ تمہارے لیے آسان

ہوگا کیونکہ ٹورازم کے سلسلے میں سرکاری لوگ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔“ میں نے وعدہ کیا اور کسی حد تک نبھایا بھی۔ ”شبم ویسے کتابوں پر یاد آ یا کہ میری سب کتابیں پاکستان میں بغیر میری اجازت کے چھپ رہی ہیں۔ بغیر مجھے دکھائے ہوئے۔ کتنی غلط بات ہے۔ جب وہاں کی چھپی ہوئی اپنی اتنی کتابیں دیکھتی ہوں تو ایک طرف تو خوشی ہوتی ہے کہ وہاں بھی لوگ مجھے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف بہت رنج ہوتا ہے۔ ان میں سے کتنی چیزیں خواہ مخواہ کاٹ دی گئیں ہیں۔ کئی جگہ تو عبارت بالکل بے ربط ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر میری نظموں کا غلط منظر ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح تو سارا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے نظم کا۔ کچھ ہونا چاہیے نا اس سلسلے میں؟“ ان کے لہجے میں دکھ تھا۔ ”امرتاجی“ میں نے کہا۔ ”پاکستانی مصنفوں کی کتابیں بھی انڈیا میں بغیر اجازت کے چھپتی ہیں اور یہی حال ان کا بھی کیا جا رہا ہے۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم مگر کہاں رہ گیا وہ کاپی رائٹ ایکٹ۔ جو کسی کا دل چاہے چھاپ لے۔ نہ مصنف کی اجازت نہ پیسہ نہ دھیلا۔ خیر اتنا کرو۔ میری جو کتاب تمہیں وہاں نظر آئے مجھے فوراً بھیجو۔ کہیں راستے میں ہی تو نہیں رہ جائیں گی۔ کتابوں کا تبادلہ بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے“ انہوں نے دو تین مرتبہ دہرایا۔

”آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”خواب جو انوکھے ہوتے ہیں ان پر ایک کتاب ”لال دھاگے کا رشتہ“ نام رکھا ہے اس کا۔ کتاب ایک جاپانی بدھ مت فلاسفر کے نظریات پر ہے جس نے کہا تھا کہ جس طرح بچے کا ماں سے رشتہ انوث ہے اسی طرح انسان لامکاں سے جڑا ہوا ہے۔

شبم میں خود کئی مرتبہ ایسے خواب دیکھتی ہوں کہ جس میں میرے پچھلے جنم کا تجربہ نظر آتا ہے۔ خوابوں سے انسان کا کیا رشتہ ہے۔ بس یہی یہ کتاب بتائے گی۔ بہت دلچسپ چیز ہے۔ جیسے ہی لال دھاگے کا رشتہ وہاں شائع ہوئی میں نے فوراً ٹورازم والوں سے کہہ کر منگوا لی واقعی بلاشبہ یہ ایک انوکھی کتاب ہے۔“

”امرتاجی اور کیا لکھ رہی ہیں؟“

”نظم اور نثر پر تحقیقی کام بھی کر رہی ہوں اگر درمیان میں اتنی بیمار نہ ہو جاتی تو کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر لال دھاگے کا رشتہ مجھے خود اپیل کر رہی ہے اس سے میری ذہنی تسکین ہوتی ہے۔“

”امرتاجی یہ بتائیں ادیب کی اپنی تسکین زیادہ اہم ہے یا قاری کی؟“

وہ بولیں۔ ”قاری اہم ہے بہت اہم ہے۔ یہ ایک خوشگوار تجربہ ہے کہ اگر قاری کو آپ کی بات کا ابلاغ

ہو۔ مگر مصنف کی اپنی تسکین کو میں زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ دیکھو اگر ادیب محض قاری کے لیے لکھ رہا ہے تو دولت، شہرت، طاقت سب کچھ ادیب کو ملتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سب کچھ سنبھال نہ پائے تو خود اس کا بُت چکنا چور ہو جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی ظاہری یا خارجی شبیہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ میرا معاملہ دوسرا ہے میں اپنی باطنی شبیہ کی قائل ہوں۔ کئی دفعہ اس باطنی یا اندرونی شبیہ کے حوالے سے مجھ پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اعلیٰ انسانی معیار پر پوری اترتی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر پھر میرے اندر سے ہی کوئی طاقت مجھے سنبھال لیتی ہے۔ یہ بحث ذرا لمبی ہو جائے گی۔ اور کوئی بات کرتے ہیں۔ کیوں؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: ”جی نہیں۔ مجھے اس بحث سے دلچسپی ہے۔ دراصل میں تو اسی سلسلے میں آپ سے دو تین سوال کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں آپ مجھے اتنا وقت دیں گی یا نہیں۔“ میں نے غور کیا کہ میرے اس جملے پر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی وہ بولیں: ”بات وقت کی نہیں ہے۔ میری صحت کی ہے۔ ابھی طبیعت پوری طرح بحال نہیں ہوئی۔ مگر تم ذرا اپنے سوال دکھاؤ۔“ میں نے پرس میں سے کاغذ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

”ارے یہ تو تمہاری اور میری دونوں کی مشکل حل ہو گئی۔ تمہیں پتا ہے ابھی ابھی ستر اچوہدری نے مجھ پر بہت خوبصورت مضمون لکھا ہے۔ وہ تقریباً میرا تروویا ہی سمجھو۔ اس میں تمہیں اپنے تینوں سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“ وہ انھیں اور اندر جا کر بہت سے اخباروں اور رسالوں کے تراشے اٹھالائیں۔ ”ستر اکا مضمون“ یہ سارا ثقافت پر میرا مضمون ہے ہاں یہ منٹو پر ہے۔ اس کو ہری شرمانے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور بہت سے ہندی سکرپٹ میں میرے مضامین ہیں سب رکھ لو۔ سب رکھ لو۔“ میں نے جلدی سے سارا خزانہ سمیٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچانک وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور بولیں ”ہندی سکرپٹ تم کیسے پڑھو گی؟ انہیں چھوڑ جاؤ۔“

”امرتا جی تھلیل صاحب کی بڑی بہن شاہدہ حبیب پنجاب یونیورسٹی میں ہندی کی کلاسز لیتی ہیں۔ بڑی لائق فائق ہیں۔ وہ پڑھیں گی میں لکھ لوں گی۔“ وہ مطمئن ہو گئیں۔

امروز چائے لے کر آ گئے تھے۔ ”کس قدر خوش مزاج اور مہمان نواز انسان ہیں۔“ میں نے سوچا پھر ان کی خوش مزاجی کو دیکھتے ہوئے فوراً ایک فرمائش کی۔ میری ایک تصویر بنادیں امرتا جی کے ساتھ۔ ”میں اتنا ایکسپرٹ نہیں ہوں اس معاملے میں اگر کوئی سرچیر نہ آیا تو مجھے الزام نہ دینا۔“ وہ ہنسے۔ بہر حال انہوں نے تین چار تصویریں بنادیں۔

فون کی ٹھنٹی بجی۔ امرتا فون پر بات کرتے ہوئے بہت خوش لگ رہی تھیں۔ ”جانتی ہو کس کا فون تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ”نچلی منزل سے بچوں کا۔ میں اوپر کی منزل میں ہوتی ہوں۔ بچے نچلی میں۔ ویسے ہی فون کرتے رہتے ہیں۔“ وہ ہنسیں۔ ”ہاں سنو۔ میں نے تمہیں جو ہندی سکرپٹ دیئے ہیں ان کا ترجمہ بہت اچھا کر دانا۔ بہت کم اچھے تراجم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والے معیار برقرار نہیں رکھتے۔ ایسے ایسے ترجمے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ بس کیا کہوں۔ جب تک Original کتاب سامنے نہ ہو۔ ترجمے کا سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آتا۔“

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں سب آپ کو بھجواؤں گی۔“

”اچھا ایک سوال کا جواب مختصر سا ابھی دے دیں۔“ میں نے ذرا منت کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کل جو ادب ہمارے ہاں اور آپ کے ہاں تخلیق ہو رہا ہے آپ اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟“ ایسے لگا جیسے کسی نے ان کی کسی دکھتی رگ کو چھینر دیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولیں۔ ”صرف ادب ہی کی کیا بات کرتی ہو۔ تجارتی سوچ کے اس دور میں فن کے نام پر فحشی سطح کی سوچ کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ مگر خیر دونوں طرف چپ چاپ بیٹھ کر کام کرنے والے موجود ہیں۔ پھر کبھی اس پر بھی تفصیل سے بات کریں گے ابھی تو تم کو بھی ایک تقریب میں پہنچنا ہے“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔

”آپ پاکستان آئیں تو پھر ہی ممکن ہے۔“ میں نے درخواست کی۔ ”آؤں گی تمہارا کتوبر میں ذرا موسم

اچھا ہوا در میری اپنی طبیعت بھی ٹھیک ہو۔“

والپسی پر میں سوچ رہی تھی۔ امرتا نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ زندگی کبھی شیریں ہوتی ہے کبھی تلخ مگر بے ذائقہ کبھی نہیں ہوتی۔ امرتا کی باتیں بھی ایسی ہی ہیں زندگی کے رس میں ڈوبی ہوئی۔

☆☆☆☆



## امرتا پر یتیم۔۔۔ بس ایک ہاتھ کے فاصلے پر

’اس وقت میں اپنے بک شیلف کے سامنے کھڑی ہوں اور سارا سے مخاطب ہوں۔۔۔ دیکھو دوست، اس وقت میرے کتنے ہی عظیم دوست، وشٹھ رشی، اور دیدویاس سے لے کر بان بھٹ، کالی داس، سلطان باہو، وارث، سیلو، چیخوف، غالب، کا زان زاکس، آئین رینڈ، ساحر فراق اور فیض تک تیرے پاس بیٹھے ہیں۔۔۔ بس ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے، یہ طے ہو جائے گا تو میں تم سب سے بہت باتیں کروں گی۔۔۔ بک شیلف کے سامنے کھڑی ہو کر نہیں، تم سب دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھ کر۔۔۔“

امرتا پر یتیم

اور پھر۔۔۔ یہ ایک ہاتھ کا فاصلہ ختم ہو گیا۔ وہ اب اپنے دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھی ہے۔ وہ سب اپنے مشترکہ غموں پر ہنس رہے ہیں، ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے ہیں۔ اُن سب کے تخلیق کردہ کردار قطاروں میں مودب کھڑے ہیں۔ ایک میلہ سا لگا ہے۔

ہلکے ہلکے شور اور بحث کی آوازیں رفتہ رفتہ اونچی ہو رہی ہیں۔ میں کان لگا کر سن رہی ہوں۔ امرتا کے افسانوں کی عورتیں آپس میں بحث کر رہی ہیں۔ ”کچکی“ دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ امرتا کی بہترین تخلیق ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ میں نے ایک عورت، جو میری سیمیٹی تھی، کے پیار میں اپنی زندگی کی قربانی دی ہے اور عورت کو ایک عظیم درجہ عطا کیا ہے، جس نے اپنی سیمیٹی کی ادھوری زندگی کو پورا کیا۔ غلط روایات کی بھیمنٹ چڑھ جانے والی مظلوم عورت کی موت کے بعد اُس کی زندگی کو پورا کرنا بالکل نیا تجربہ تھا اور اُس میں بقول کچکی کے، وہ کامیاب رہی ہے۔

جب کہ ”ایک ہوک“ کی نہال کو راور ”اندھیرے کا کنڈل“ کی دودھیا اور مس رائے کا کہنا تھا کہ یہ قربانیاں تو انہوں نے بھی دی ہیں۔ دودھیا اور مس رائے کا جواز یوں اور بھی ٹھیک تھا کہ اُن دونوں نے تو اپنی

اپنی زندگی ہی میں ایک دوسرے کی ادھوری زندگی کو پورا کیا تھا۔۔۔ اُن کا کہنا تھا کہ ”کریاں والی“ کا کردار زیادہ مضبوط اور یاد رہ جانے والا کردار ہے۔ ”کریاں والی“ جو تقدس کا ٹکڑا لگائے منافقت کی اُس گندی، جنس زدہ زندگی سے نکل آئی تھی جہاں پاکیزگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ وہ تنہا زندگی گزارنے کو اس بات پر فوقیت دیتی تھی کہ اُس کا جیون ساتھی اُس کے ساتھ جھوٹی زندگی گزارے۔۔۔

چھبیلی نائن نے درمیان میں لقمہ دیا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ امرتا کی تخلیق کردہ عورتوں میں سے بیشتر اسی ڈکھ سے ہو کر گزری ہیں۔ چند، مرکی عرف بلاتی، چندرو، مسز پور، سب اسی ڈکھ میں مبتلا تھیں۔۔۔ دہری زندگی کے ڈکھ میں۔۔۔ لیکن سب نے اس ڈکھ کو سہا اور امر ہو گئیں۔۔۔

”گلیری“ جو ایک مرد کے دل سے نہ بھلائی جانے والی کامیاب محبت تھی، بولی کہ مجھے تو وہ عورتیں زیادہ جان دار محسوس ہوتی ہیں جنہوں نے کسی اور کو چاہتے ہوئے بھی اپنے جیون ساتھی سے بے وفائی نہیں کی۔۔۔ جو اپنے اپنے دلوں میں خاموش محبت کو دفن کر کے بظاہر ایک جیون جیتی رہیں لیکن اپنی عزت کو داغ دار نہیں کیا۔۔۔ مثلاً بھابی مورنی اور تاپی۔۔۔ اور۔۔۔ یا پھر وہ ”گلیانا“ کتنی مظلوم تھی جو دنیا کے مردانہ نظام کی بھینت چڑھ گئی۔ اُس نے تو ابھی محبت کے زینے پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ وہ تو صرف آزادی سے دنیا دیکھنے اور دنیا میں گھومنے کی تمنائے نکلی تھی۔ وہ اپنی زندگی خود بسر کرنا چاہتی تھی۔۔۔ اور مرد سے یہ برداشت نہ ہوا کہ کوئی عورت اُس کی مدد کے بغیر، اُس کو اپنے جسم کا سہمدے دیے بتایاں بے خوف بھر سکے۔۔۔ سو وہ مردانہ درندگی کا شکار ہو گئی۔ کتنا زندہ رہ جانے والا کردار تھی ”گلیانا“ اور اسی طرح ”چھمک چھلو“ کی چھلو جو بچاری دہری درندگی کا شکار ہوئی۔۔۔ ایک طرف سوتیلی ماں کا ظلم اور دوسری طرف ایک انسانی درندے کا۔۔۔ اور بچ میں پستی بے چاری چھلو۔۔۔ ایک چھلو ہی کیا کتنی لڑکیاں اس نام نہاد تہذیبی معاشرے میں ہوس کی بھینت چڑھ جاتی ہیں اور امرتا بار بار پیدا نہیں ہوتی۔۔۔ جو قلم اٹھائے۔ پھر ”کوکلی“ جیسا کردار جو سماج کے منہ پر ایک طمانچہ ہے جہاں لڑکی کو جذبات سے الگ نکال کر دیکھا جاتا ہے، جہاں صرف اُس کے کنوارے جسم کی وقعت ہے جس پر فتح کے جھنڈے گاڑنا مردانگی۔۔۔ اور کتنی کوکلیاں روز فٹج ہوتی ہیں، کتنی آرزوئیں روز مرتی ہیں، کتنے در در و زجہم لیتے ہیں۔

گلیری جوش اور جذبے سے بولے ہی جا رہی تھی کہ راج کو سردارنی کی گونج دار آواز نے ایک لمحے کے لئے خاموشی طاری کر دی۔ اُس کا رعب اور دب دہرے ہی ماحول کو شجیدہ بنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔



اُس نے ”تہہ خانے“ کی ”گایا“ اور ”سات پونیاں ستر مذہبے“ کی ”کھنکھلا“ کے حق میں آواز بلند کی۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں کردار ہر جنم میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان کو کسی جنم میں بھی نکالا یا بھلا یا نہیں جاسکتا۔ یہ محبت کی معراج پر پہنچ جانے والے آفاقی کردار ہیں۔ یہ نام بدل بدل کر دنیا میں آتے ہیں۔ کبھی محبت کو پالیتے ہیں اور کبھی نہ پانے کی خلش دل میں لئے لئے اگلے جنم میں دوبارہ آنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک درد اور کسک چگا کر۔۔۔ یہ نہ بھولنے والے کردار ہیں۔

کرداروں کی بحث زوروں پر جاری تھی۔ ہلکی آوازیں تیز ہو چلی تھیں، ویسے بھی عورتیں بحث کرتی ہوں تو لڑائی کا گمان ہوتا ہے۔ ہاتھ چلا چلا کر وہ اتنے زور سے چیختی ہیں کہ تو بے ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت بھی نرملا، ویرو، سیما، پارو، دیپو، پھول متی، سون متی، فرکی، شیاملی، دھنوا اور انگوری سب اپنی اپنی ہانک رہی تھیں، اپنے اپنے پسند کے کرداروں کے بارے میں رائے دے رہی تھیں کہ اچانک ان کرداروں کو چپ کروانے کے لئے ”سارا“ اپنی ”آنکھوں“ سے باہر نکلی اور اپنے تجزیہ لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے کہنے لگی۔۔۔ عورت ازل کی آنت سے اُٹھی ہوئی وہ کہانی ہے جسے لکھتے لکھتے آسمان شفق تک پھیل گیا اور جھوٹ اور گناہ کے اندھیرے نے رات کی کالک کی بنگل ماری۔۔۔ عورت کی کہانی کبھی ”پانچ برس لمبی سڑک“ پر چلتے چلتے بوڑھی ہو گئی کبھی ”ایک مضبوط کتاب“ میں ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر روئی تو کبھی کسی بے کار شے کی طرح ”ایک اندھیرے کونے“ میں غیر محسوس طریقے پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی۔۔۔ وہ زندگی کے ساتھ تھی، وہ موت کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے ہونے کو ثابت کر کر کے ہاری نہیں ہے صرف اُس کے نام بدلے ہیں۔۔۔ ہاں، اُس کے رہنے کے مقام بدل جاتے ہیں۔۔۔ کبھی وہ مندر سے نکالی جاتی ہے تو کبھی مسجد سے۔۔۔ کبھی وہ دل میں بسائی جاتی ہے تو کبھی صرف آنکھوں میں۔۔۔ کبھی اُس سے گھر سجایا جاتا ہے تو کبھی محفل۔۔۔ کبھی وہ بہت سستی مل جاتی ہے تو کبھی اُس کی قیمت چکانا مشکل ہو جاتا ہے۔ سارا امرتا کی کہانی ”گروڑ گنگا“ سے ایک اقتباس سنانے لگی:

”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دل کا مندر بھی بدری ناتھ کے مندر کی طرح بڑی دور ہے۔ اپنے دل کا مندر بھی اور کسی دوسرے کے دل کا مندر بھی۔ کوسوں کے کوس چلتے پڑتے ہیں، دھوپیں کانٹنی پڑتی ہیں، سردیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں، چڑھائیوں میں سانس ٹوٹتا ہے، اترائیوں میں گھٹنے ٹوٹتے ہیں۔ اور کئی دفعہ تھوڑی سی روئی کے لئے بھی ترسنا پڑتا ہے۔۔۔ لیکن اس مندر میں روحانی دیدار ہوتے ہیں۔ یہ انسانی دل کا مزاج ہے،

کہ اُس کو دیدار کی تمنا ہے۔ اس پیاس کی تکمیل کے لئے وہ راستے کی تمام تکالیف برداشت کرتا ہے۔۔۔۔۔“  
(گر وڈ گنگا)

پھر سارا نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی: ”کبھی وہ ”کالی مائی“ ہوتی ہے تو کبھی ”سانولی مائی“، کبھی ”الک نندہ“ کہلائی جانے لگتی ہے تو کبھی ”بھیل گنگا“، کبھی کرم ناشا، کبھی دھارا، نمود دھارا، ونڈ و دھارا، رام گنگا، دشتو گنگا اور آکاش گنگا۔۔۔۔۔ آخر وقت اور زندگی کی دھارا میں بہتے بہتے وہ ”گر وڈ گنگا“ بن جاتی ہے، جہاں سے اگر ایک پتھر بھی نکال کر اُس کی پوجا کی جائے تو سانپ کا ڈر نہیں رہتا۔۔۔ اور محبت کے ناگ سے ڈسے جانے کے بعد دل پہ اور کسی چیز کا زہر اثر ہی نہیں کرتا۔۔۔ سچی اور پاکیزہ محبت کا زہر زندگی کے کچے کچے راستوں میں ایسی دھند بھری غیر مرئی نیلا ہٹیں بکھیر دیتا ہے کہ پل بھر کا سفر صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔۔۔ اس نیلی روشنی میں سے کرداروں کے جگنو سینے والے قلم کا صرف بک شیلفوں میں ہی نہیں لوگوں کے دلوں میں بیٹھ رہتے ہیں۔“

سارا نے اپنا پھیلا ہوا سانس سمیٹا اور اپنی ”آنکھوں“ میں واپس اتر گئی۔۔۔ بک شیلف میں ایک سکوت طاری ہو گیا۔۔۔ ساحر امرتا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔۔۔ بولا۔۔۔ حاصل کر لینا ہی تو سب کچھ نہیں امرتا۔۔۔ حاصل نہ کر کے ”گر وڈ گنگا“ بن جانا ہی زندگی کا اصل ہے۔۔۔ دل جیتنا جسم جیتنے سے کہیں زیادہ خوش کن ہے۔۔۔۔

مجھے اپنی کبھی ہوئی بات یاد آرہی ہے: ”نہ مٹنے والی پیاس کا نشہ رمل جانے والی شراب سے زیادہ

ہے۔۔۔۔۔

اور میں سوچ رہی ہوں کہ امرتا پر یتیم کے کردار زیادہ مضبوط تھے یا اُس کی شخصیت۔۔۔ اُس کے کردار پوری کہانی اس کی شخصیت کے گرد گھومتے رہتے تھے۔ مجھے لگتا ہے امرتا ہر کہانی میں خود داخل ہوتی تھی۔ کرداروں کے ساتھ گھل مل جاتی تھی۔ وہ باہر کھڑے ہو کر اُن کا جائزہ نہیں لیتی تھی بلکہ اُن سے دوستی کر کے اُن کی کہانیوں میں شامل ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

”میں اور کچکی ابھی ایک دوسری کی واقف نہیں ہوئیں تھیں کہ میری مسکراہٹ نے اُس کی مسکراہٹ کے ساتھ دوستی کر لی۔۔۔۔۔“  
(کچکی)

”اس کا منہ دیکھ کر اگر کسی نے نوکری خریدنی بھی ہو، تب بھی نہیں خریدتا۔ ذرا ہنس کر کسی سے بات

کرے تو اگلا ایک کی جگہ دو خرید لے۔۔۔ یہ کوزے جیسا منہ بنا کر کھڑی رہتی ہے۔۔۔“ ماں کرتارو کے سارے بول چھلو کے کانوں میں ہنسیوں جیسا درد کرنے لگے۔۔۔

(چمک چھلو)

”۔۔۔۔۔ دروازے سے باہر مشعلیں جل رہی تھیں۔

ہوا میں تلی ہوئی مچھلی کی اور تازی کی بو تھی

ڈھولوں کی آواز سے کئی گیت جاگ رہے تھے۔

کوکلی کی آنکھوں میں کئی رنگ چمک رہے تھے۔“

(کوکلی)

”کوکلی مچھروں کے گھر پیدا ہوئی تھی

اور آج مچھروں کے گھر بیاہی تھی

لیکن کوکلی کو محسوس ہوا۔۔۔۔۔

وہ ایک لڑکی نہیں، ایک مچھلی ہے

یہ سہاگ کی بیج نہیں، ایک جال ہے

اور اب وہ بیاہ کی کنڈی میں پھنسی ہوئی ہے۔۔۔۔۔“

(کوکلی)

”میں اپنا نام لکھ دیتی ہوں کر ماں والیہ!۔۔۔ میں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے نوٹوں پر اپنا نام

لکھا ہوگا، لیکن آج میرا جی چاہتا ہے کہ تو میرے نوٹ پہ اپنا نام لکھ دے!۔۔۔ کہانی کا بڑا نہیں ہوتا، بڑا تو وہ

ہے، جس نے کہانی خود اپنے جسم پر جھیلی ہے۔“

(کرماں والی)

”جنرہ بھی ایک دیے کی طرح جل اٹھی۔

ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا جیسے جنرہ کی آنکھیں بجھ گئیں تھیں۔ شاید اُسے تیل کے ختم ہونے کا

اندیشہ یاد آیا ہو۔ لیکن دوسرے لمحے اپنے دیے میں اپنا ہی تیل ڈالتے ہوئے کہنے لگی ”جب اُس نے گھر بسایا تو

(رام جی کے کنویں کی بو کی)

چمچ میں گھر میں دیے کی طرح جل اٹھی تھی۔۔۔۔۔“

”وہ جس روش بنگلے میں رہتا تھا، اس کا ایک اندھیرا کونہ بھی تھا۔ جس کو کچھ معلوم نہیں تھا اس کو وہ کونہ دکھائی نہیں دیتا تھا، اور جس کو معلوم تھا وہ کبھی اس کونے کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ اس لئے چاہے پچیس برس ہو گئے تھے، لوگوں کو اس بنگلے اور اس کونے کی کہانی معلوم نہیں تھی۔“

(ایک اندھیرا کونہ)

”میرا نام یونس ہے۔ ایک دن تم نے پانی پینے سے پہلے بتایا تھا۔

میرا نام گایا ہے۔ میں نے تمہارے ہاتھ سے پانی کا خالی کنورہ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

اور مجھے محسوس ہوا تھا۔۔۔ تمہارے آنے کے وقت ”کچھ“ ہمیشہ پانی کے کنورے کی طرح بھرا ہوتا

تھا اور تمہارے جانے کے بعد وہ ہمیشہ خالی کنورے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ۔۔۔ تمہارے

(تہہ خانہ)

خشک حلق جیسا ہو جاتا تھا۔“

”جیران کن بات تو یہ تھی کہ زندگی نے گلیانہ کو پیدا کیا تھا، لیکن اُس کو پیدا کر کے بالکل بھول گئی تھی۔

لیکن میں جیران نہیں تھی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ زندگی کی یادداشت عام طور پر کھو جاتی ہے۔ میں نے گلیانہ کو بتایا

کہ ہمارے دیس میں ایک بوٹی پائی جاتی ہے، جسے برہمی بوٹی کہا جاتا ہے۔ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ

برہمی بوٹی اگر کوئی کچھ دن پی لے تو اُس کی کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آتی ہے اور میرا خیال ہے۔۔۔ کہ زندگی کو

(گلیانہ)

برہمی بوٹی رگڑ کر چینی چاہیے۔“

امرتا کرداروں کا دروازہ لیتی تھی، کردار اُس کے نظریات کی پنہ گاہ میں آ جاتے تھے۔ خود امرتا کی

زندگی ایک نظریہ تھی، ایک اصول تھی۔ اُس کی شخصیت، اُس کے کرداروں کی ہمت اور اُس کی زندگی کی فضا میں

کوئی تضاد نہیں تھا۔ سکھ خاندان میں پیدا ہونے والی اور روایتوں کے شکنجے سے آزاد ہو کر ایک خود مختار روح کی

طرح زندگی بسر کرنے والی ”امرتا“ اُس وقت کے نقاد کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھی۔ اُسے ٹوکنے، اُسے

روکنے، اُسے بجھا دینے، اُسے مٹا دینے کی ہر کوشش کو اُس کے لکھے لفظوں نے مات دی۔ وقت کی عدالت میں

اُس کے سارے کردار، ساری عورتیں اُسے اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بک

شیلف میں ہے۔۔۔ دلوں میں ہے،۔۔۔ اور میں۔۔۔ اپنے بک شیلف کے سامنے کھڑی ہوں۔۔۔ اور

امرتا سے مخاطب ہوں۔۔۔

”امرتا۔۔۔! تم نے عورت کو جسم کے سوا جانا ہے۔ تم نے صحیح معنوں میں اُس کے جذبات کو سمجھا

ہے۔ تم اُس کے دل میں اندر تک اتری ہو، اُس کے جسم کی تہا راہ دار یوں میں اُس کے ساتھ دوڑی ہو۔ تم نے ویسے تو ہر طبقے کی عورت کے لئے لکھا ہے لیکن اُن مجبور اور اُن پڑھ عورتوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر دھڑکی ہو جنہیں سماج عورت تو کیا انسان بھی تسلیم کرتے ہوئے کبجی دکھاتا ہے۔ تم نے عورت کا ہر روپ دکھایا ہے اور ہر روپ میں اُس کی محبت کو اجاگر کیا ہے تم نے اُس کی روح کی پرستش کی بھی ہے اور کروائی بھی ہے۔ تم نے محبت کو عورت میں اس طرح گوندھ دیا ہے کہ کتنی بھی واجدہ تبسم اور عصمت چغتائی آئیں۔۔۔ عورت کی تفحیک کریں۔۔۔ اُس کے جذبات کو غلط رنگ دے کر پیش کریں۔۔۔ وہ تمہاری ولایت ہوئی عزت، توقیر اور بہادری اُس سے چھین نہیں سکتیں۔ نقاد اسی لئے ابھی تک تمہارے کرداروں کی بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس سے ان کرداروں کی آنکھوں میں نہیں جھانکا جاتا۔۔۔ وہ آنکھوں کی سچائی کا سامنا نہیں کر پاتا۔۔۔ وہ تمہاری زندگی میں تمہاری آنکھوں سے ڈرتا رہا اور اب تمہارے کرداروں سے ڈرتا ہے اسی لئے وہ تمہاری "محبت کے تسلیم کردہ جرم" کو High Light کرتا رہا، حالانکہ محبت کے اس Triangle میں تم تینوں اپنی اپنی جگہ بہت عظیم ہو۔۔۔ تم۔۔۔ سآر۔۔۔ اور آمروڑ۔۔۔ اور مجھے اپنا یہ بک شیلیف بہت عزیز ہے جس میں تم ہو، سآر ہے، سآرا ہے۔۔۔ وارث ہے، باہو ہے، جینوف ہے۔۔۔ مہک ہے، توانائی ہے۔۔۔ روشنی ہے اور۔۔۔ اور زندگی ہے۔۔۔ !!

☆☆☆☆

## امرتا پریتم

گلاب لہجے جھرنوں سے پاکیزہ الفاظ کو شاعری میں پروانے والی شاعرہ امرتا پریتم سے میرا گہرا ناٹھ ہے۔ اُس نے جس مٹی سے جنم لیا۔ وہ مٹی پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کی مٹی ہے۔ وہ بھی پنجاب کی بیٹی میں نے بھی یہاں جنم لیا۔ اُس نے بچپن کے ابتدائی دن جس زمین پر کھیل کود کر گزارے میں بھی اُس کے پاؤں کے نشان ڈھونڈتی وہاں سے گزرتی رہی۔ لیکن وہ سچ اور انصاف کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتی تھی۔ میں سمجھوتوں اور خاموشی کو اوڑھنے زندگی گزارتی رہی۔ جب اُس نے سارہ شگفتہ کی موت کا نوحہ فضا میں بکھیرا تو میری جیسی ایک عظمیٰ کو ہر سلطانہ کی زندگی اور موت کا تسخیر اڑایا۔۔۔ تو میں نے امرتا کو خط لکھا۔ اور داد دی۔ تو اُس نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں جو سچ لکھ اور پڑھ نہیں سکتا۔ وہ کیسے شاعر اور ادیب ہو سکتا ہے۔“ تو میں نے دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے سوچا۔۔۔ ہم تو بھٹو کی پھانسی دینے والے کے بلا دے پر بھاگے چلے گئے تھے۔ وہ 1947 کی ہجرت میں کٹ مرنے والوں کے لیے تڑپ اٹھتی ہے۔ اور ہم لال مسجد اور ڈرون حملوں میں مرنے والوں کے لیے وہ کلمات احتجاج کے بلند نہیں کر سکتے۔ پھر ہم اپنی مٹی کا قرض کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ 31 اگست 1919 میں ’میں گوجرانوالہ میں سکھ گھرانے میں پیدا ہونے والی خاتون عورتوں کے لیے ایک لائٹ ہاؤس کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ہمارے گھروں میں ایسے باغی خیالات لیکر پیدا ہونے والی سارہ شگفتہ کوثرین کے نیچے کود کر جان دینی پڑتی ہے کہ اپنی مرضی اور من مانی کی زندگی گزارنا صرف مردوں کا حق ہے۔ عورت اگر سوچ بھی لے تو اُسے اپنے خیالات کو آج بزم زم سے دھوکہ پاک کرنا پڑتا ہے۔

رسیدی ٹکٹ میں وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔ ”جب میں 11 سال کی تھی تو میری ماں بیمار پڑ گئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ ہلکی کی طرح زرد ہو گئی۔ سہیلیاں اور رشتہ دار خواتین اُس کے گرد بیٹھی ہیں کہ ماں نے پوچھا میری بنا کدھر ہے۔ اُس کی سہیلی پریتم کور نے میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں جب دیا تو اُس پر غشی طاری



ہوگئی۔ ایک عورت نے مجھے کہا ماں کے لیے دعا کرو۔ شاید اُسے ترس آ جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کرتے ہوئے خدا سے التجا کی خدایا میری ماں کو مرنے نہ دینا۔۔۔ میں آہستہ آہستہ دعا پڑھتی رہی۔ ماں خاموشی سے چلی گئی۔ میں نے رونے کی آوازیں سنیں تو جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا سب رو رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی خدا بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔ پر یہ سب کیوں ہوش گنوار ہے ہیں اور اچانک مجھے محسوس ہوا ماں جا چکی ہے۔ خدا کسی کی نہیں سنتا بچوں کی بھی نہیں۔۔۔۔۔

میں نے اُس دن سے عبادت کرنی چھوڑ دی۔ ابو مجھے سالوں سے جس عبادت کی تربیت دے رہے تھے۔ میں نے اُسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ خدا یہاں نہیں ہے۔ یہ میرا پختہ یقین تھا۔۔۔۔۔

رسیدی ٹکٹ میں نے برسوں پہلے پڑھی تھی۔ لیکن میں آج بھی امرتا کی اُس کیفیت کو محسوس کر سکتی ہوں جو ماں کے آخری وقت اُس کے اندر چل رہی تھی۔ ایک معصوم گیارہ سالہ ذہین لڑکی جسے آنکھ کھولتے ہی خدا کی وحدانیت کا درس دیا گیا۔ سونے سے پہلے کی عبادت اس لیے کی جاتی تھی کہ چاروں طرف سے خدا ہڑے وسوے اور بڑی چیزوں سے پناہ میں رکھ سکے۔ اُس وقت بھی امرتا ایک جذبے کی کھڑکی را جن کے خواب کے لیے کھلی رکھتی تھی۔

امرتا نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ 16 سال کی عمر میں اُس کی شادی پریم سنگھ کے ساتھ ہوگئی جس کے ساتھ ملٹنی بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔ پریم سنگھ اگرچہ ایک ادیب اور ایک رسالے کا ایڈیٹر بھی تھا جسے امرتا اپنے ساتھ چلتا ایک سایہ ہی سمجھتی تھی۔ میں نے اس دور میں جو بھی لکھا وہ سب اُس سائے سے متاثر ہو کر لکھا۔ وہ جس نے میرے جسم اور خون کا خراج لیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میری سوچ توانا ہوتی چلی گئی اور میرے اندر ایک پرندے جیسی آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا گیا۔ جی ہاں 1960 میں امرتا نے اس سائے سے نجات حاصل کر لی۔ جس نے اُسے دو بچے اور اپنا نام پریم دیا تھا۔ اسے چھوڑتے ہوئے امرتا کو اپنے اور پرانے دونوں کی تنقید برداشت کرنا پڑی ہوگی۔ وہ خود کہتی ہیں کہ وہ واقعہ جتنا میں سال پہلے تکلیف دہ تھا آج بھی ہے۔

وہ لکھتی ہیں میں ابھی اپنے Teens سے باہر نہیں نکلی تھی کہ مجھے وہ چہرہ نظر آیا جس کے خواب میں دیکھتی تھی۔ جس کے بارے میں میں نے آخری خط میں جس آگ میں جھلکتی رہی تھی وہ سب میں نے اس میں لکھ دیا۔۔۔ جس پر انہیں (1957 میں اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا)۔ وہ کہتی ہیں خدایا میں نے یہ ایوارڈ کے لیے

نہیں بلکہ اُس کے لیے لکھا تھا جو بچپن سے میرے خوابوں میں بسا ہے۔ اگر یہ اُس نے نہیں پڑھا جس کے لیے لکھا ہے تو پوری دُنیا پڑھ لے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ لکھتی ہیں۔ ”ایوارڈ کی خبر کے بعد ایک Reporter فوٹو گرافر کے ساتھ میرا انٹرویو لینے کے لیے آیا تو میں نے ایک کاغذ پر ساحر ساحر لکھ کر بھر دیا۔۔۔ دوسرے دن تمام اخباروں میں اس کا تذکرہ تھا۔“

امرتا اسے لیلیٰ مجنوں کے پیار کی طرح سمجھتی تھیں۔ وہ نہت جسے وہ بچپن سے من مندر میں بٹھائے پوجا کر رہی تھیں۔ آج اُسے سب کے سامنے بیان کر چکی تھیں۔ ایک ناول میں دل دیاں گلاں لکھ کر انہوں نے ساحر سے محبت کی سند چاہی۔ لیکن ساحر کی محبت امرتا کے نصیب میں نہ تھی۔ جب وہ ملے تو ساحر کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آچکی تھی۔ ہاں امرتہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس وقت بھی جب ساحر نے دُنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اپنی محبت کے جنازے پر امرتہ کے کاندھے سے لگی روتی رہی۔

And each man kills the thing he loves.

By all let this be heard

Some do it with a bitter look

Some with a flattering word

The coward does it with a kiss

The brave man with a sword

ساحر کی محبت تو نہ ملی لیکن سجاد جیسا دوست اور امرتہ جیسا چاہنے والا امرتا کے نصیب میں تھا۔ امرتہ جس نے زندگی کے چالیس سال امرتا کے پہلو میں گزار دیے محبت بھی ایک عجب تکون ہے جسے آپ چاہو وہ نہیں ملتا۔۔۔ لیکن جو ملتا ہے اُس سے محبت نہیں ہوتی۔۔۔ ہم جیسی عام عورت ہوتی تو محبوب کی تصویر کو سینے میں چھپا کر صرف اس کے گن گاتی جو اُسے چاہ رہا تھا۔۔۔ امرتا رسیدی ٹکٹ میں لکھتی ہیں کہ ساحر مجھے ٹیلی فون پر اپنی غزلیں سنایا کرتا تھا۔ ایک رات گیا رہ بجے وہ میرے ساتھ خالی جام کرتا تھا۔ اُسی رات امرتہ بھی میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اور وہاں بیمار ہو گیا۔ ساحر نے اپنا ڈاکٹر امرتہ کی دیکھ بھال کے لیے بھجوا دیا۔۔۔ یہ محبت کی تکون ہی تو تھی جو امرتا کے لیے ڈھال بنی ہوئی تھی۔

امرتا پر تم نے لگ بھگ 100 کے قریب افسانے ناول اور شاعری کی کتابیں لکھیں۔ اُن کی کتابوں کے تراجم انگریزی، ہندی، فرانسیسی میں ہوئے۔ 16 سال کی عمر میں پہلی کتاب امرتہ لہریں لکھی جو 1939 جیسی کتابیں لکھ کر ادب میں اپنا لازوال حصہ ڈال دیا۔۔۔ امرتا کی بہت ساری کہانیوں اور ناولوں کو



فلسی قالب میں بھی ڈھالا گیا جن میں ”پنجر“ فلم ہمیشہ یاد رکھی جانے والی ہے۔

بزرگانِ دین سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ پاکستان کے ادیب جب بھی اس ادیبہ کو ہدیہ پیش کرنا چاہتے وہ کسی نہ کسی مزار کی چادر ہوا کرتی۔ وارث شاہ بلوے شاہ سے اُسے بے حد عقیدت تھی۔ وہ وارث شاہ سے کہتی ہیں۔ سچ انصاف اور آزادی کے لیے اٹھو۔ اپنی قبر کی گہرائی سے اُٹھ کر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑھو۔ تمہارے پنجاب کی جینی رو رہی ہے۔ اپنے پنجاب کی حالت دیکھو۔ امرتا کی اس چیخ نے تمام پنجاب تمام پاکستان بلکہ تمام دنیا کے اُن دلوں میں اپنے غم کی انی پرودی جو دوسروں کے ہارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ”اج اکھاں وارث شاہ نوں“ ایک ایسی پکار ایک ایسا احتجاج بن گئی ہے جو ہمیشہ فضا میں لوگوں سے ہونی والی بے انصافی پر بین کرتی رہے گی۔

اگر کوئی امرتا کے حوالے سے مختصر لکھنا چاہے تو اسے ادب کی جون آف آرک کہہ سکتا ہے یہ جس نے ہجرت کا دکھ لیا اور عورتوں کی بے بسی پر احتجاج کیا ہے۔ آغاز میں اُس کی نظموں میں عام لڑکی کے خواب اور چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش دکھائی دیتی ہے۔ یہ ساری شاعری لڑکپن کی پہچان تھی جوں جوں وہ وقت کی بھٹی میں کندن بنتی گئی تحریروں میں وہ پروگریسو Progressive ادیبہ کے طور پر پہچان بناتی ہیں۔ امرتا کو پنجاب کا پہلا رتن ایوارڈ لینے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور پہلی سائیڈ اکیڈمی ایوارڈ لینے والی پہلی خاتون بھی مانی جاتی ہے۔

بھارتیہ ہنر ایوارڈ جسے بھارت کا سب سے بڑا ایوارڈ کہا جاتا ہے وہ بھی امرتا کے حصہ میں آیا۔ 1977 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی انہیں بہت ساری یونیورسٹیوں نے پیش کی۔ اس کے علاوہ بہت سارے عالمی ایوارڈ بھی۔ بلغاریہ اور فرانس کے ایوارڈ بھی اُن کے حصے میں آئے۔

وہ 2004 تک لکھتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ موت نے اپنے ہاتھ اُن کی طرف بڑھانے شروع کیے۔ امروز کی محبت 'نیو راج بیٹے کی اور الکا بہو کی نگہداشت اور بیٹی کی توجہ بھی اس جانکنی کے عالم میں بے بسی سے انہیں تک رہی تھی۔ خاتون جس نے زندگی کی ہر مشکل کو بہادری سچائی کی لگن اور انصاف کی طاقت کے زور پر سہا تھا۔ وہ موت سے ہارتی جا رہی تھی۔ 31 ماکتوبر 2005 کو امروز کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے یہ کہتی ہوئی مر گئی کہ میں آئندہ جہنم میں صرف اور صرف تمہارا ساتھ چاہوں گی۔

امروز کی چالیس سالہ بے لوث محبت 'خلوص' عقیدت کو جواب مل گیا تھا۔ وہ ہاتھ جو برش اس لیے اٹھاتا

تھا کہ امرتا کی کتاب کو خوب سے خوب رنگ اور انگ دے سکے۔ جو سانس اس لیے لیتا تھا کہ امرتا اس فضا میں  
سانس لے رہی ہے۔ اُسے یہ عہد یہ وعدہ زندہ رہنے کی نوید دے کر چلا گیا کہ اگلے جنم میں صرف اور صرف میں  
اور امرتا ہوں گے۔ کوئی اور محبت کی تکون نہیں۔۔۔

☆☆☆☆

## تخیل کو وجود بنانے والی ساحرہ

میں 2007ء میں امریکہ کے شہر ڈیٹروئٹ گئی تو پہلے ہی دن کھانے پر ایک پنجابی رائٹر جسویر سے میری دوستی ہو گئی۔ اس نے لنچ کے بعد میرا سامان اٹھایا اور اپنے گھر لے گئی۔ اس کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ گھر کی پچھلی سمت شیشے کی دیواریں تھیں اور دیواروں کے باہر وسیع و عریض خاموش پارک۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا کسی دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ آج کل اس کے گھر کنیڈا سے اس کی خالہ اوتار آئی ہوئی تھی۔ جو امرتا پرتم کی بہترین دوست تھی۔ اوتار بہت خوبصورت اور ہنس مکھ تھی۔ روزانہ یوگا اور واک کرتیں تھیں اسی لئے بہت اکیلی تھی لیکن اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اس کی بٹاشٹ تھی۔ ہر وقت ہنسی مسکراتی اوتار بچوں کی طرح سیر و تفریح، کھانوں کے پروگرام بناتی بہت اچھی لگتی تھی۔ میں دو دن اس خوبصورت خاندان کے ساتھ رہی مگر بے شمار خوبصورت یادیں اور اپنائیت کا احساس لئے واپس آئی۔

جسویر مجھے اپنا گھر دکھانے سب سے پہلے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں اس نے کہا کہ جوتے اُتار کر اندر آنا یہ مندر ہے۔ میں کچھ حیران ہوئی کہ جسویر بہت لبرل اور سیکولر سوچ کی مالک تھی۔ بہر حال مندر کے اندر داخل ہونے پر پتہ چلا کہ یہاں کوئی بھگوان ہے نہ مذہبی پوجا پاٹھ کا اہتمام بلکہ بڑے سلیقے قرینے سے کچھ اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک پرانی چوکی پر ایک پرانی چپلوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا۔ جسویر نے بتایا یہ تمام چیزیں امرتا پرتم کی ہیں۔ اور وہ میرے لئے بہت مقدس ہستی ہیں اس لیے میں نے اس کمرے کو مندر کا نام دے رکھا ہے۔

اوتار، جسویر سے امرتا کی بے شمار باتیں ہوئیں، بلکہ بیشتر وقت ہم اوتار سے امرتا کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ امرتا اور امروز بھی زیر بحث رہے۔ میں نے جسویر کو بتایا کہ میں کبھی امرتا پرتم سے تو نہ مل سکی لیکن امروز سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ ایک لمحے کی دیر تھی جسویر نے ایک نمبر ملایا اور فون میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگی ”امروز نال گل کر“ (امروز صاحب سے بات کرو)۔ ایک دم خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول

گئے۔ انہوں نے بہت محبت سے بات کی اور دعوت دی کہ میں جب بھی انڈیا آؤں دہلی ان کے گھر ضرور آؤں۔

امرتا پریم کے لئے پہلے بھی میرے دل میں محبت کے احساسات تھے۔ اب عقیدت بھی شامل ہو گئی تھی۔ کئی بار سوچا امرتا پریم پر کچھ لکھوں لیکن عقیدت کا احساس مجھے اس کی ذات کی کوٹھڑی میں داخل ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں کافی عرصہ باہر ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کر کے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، پتہ چلا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔ ایسے در تو کسی کے لئے کبھی بھی بند نہیں ہوتے میں ناحق باہر سے خالی ہاتھ لوٹ جاتی رہی۔ بہت سی سیڑھیاں تھیں۔ ہر سیڑھی پر علم کے خزانے کا ایک صندوق رکھا تھا۔ شرط یہی تھی کہ امرتا سے ملاقات کے لئے اس خزانے کو پھلانگ کر اوپر نہیں جانا بلکہ اس کا لفظ لفظ دل میں اتار کر آگے بڑھنا ہے۔ شرط بہت اچھی تھی۔ بھلا کون خزانے کو نہ کہہ کر ٹھکرائے گا۔ میں نے بھی خزانہ لوٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا پہلے صندوق شاعری کے زرو جو ابر سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک ایک لفظ تلمینے کی طرح چمکتا اور دمکتا محسوس ہوتا تھا۔ میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور میں لفظوں کو دل میں اتار نہ سکی۔ عجیب صورتحال تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ لفظوں کی ساحرہ ہے۔ ہر شے کو منفرد نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ جذبوں، خیالوں اور سوچوں کو بھی مادی رنگ میں سامنے لا کھڑی کرتی ہے۔ کس لفظ کے کیا معنی ہیں، کیا مفہوم ہیں۔ انہیں کس رنگ میں پڑھوں کس طرح دیکھوں یہ سب جاننے کے لئے میں نے امرتا سے دوستی کرنے کی سوچی اور کئی روز امرتا پریم کو ساتھ ساتھ لئے پھری۔ کبھی اپنے بیک میں کبھی ساتھ والی سیٹ پر اُسے بٹھائے میں منتظر رہی کہ کبھی تو وہ کھلے گی مجھ سے دل کی بات کرے گی۔ میں نے اس سے دوستی کرنے کے لئے اس کی پسند ناپسند اور مزاج کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ سید اختر حسین کا امرتا پریم نمبر پڑھا۔ احمد سلیم کے طویل مضامین پڑھے۔ دیگر دوستوں کے تاثرات پڑھے مگر بات نہ بنی۔ پھر چھوٹے سے رسیدی ٹکٹ نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ رسیدی ٹکٹ جیسے اس سارے خزانے کی کنجی تھی۔ ابتدائی صفات پڑھتے ہی ساری اجنبیت کی دیواریں گرنا شروع ہو گئیں۔ کیونکہ اب امرتا نے مجھ سے بات کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ تو میری اپنی ہی نگلی بہت کھرے مراسم تھے ہمارے زمین کے مٹی کے محبت کے۔ ایک ہی مٹی سے ہمارا خمیر اٹھا تھا۔ اس کی والدہ راج بلی بلی مانگے ضلع گجرات کی تھیں یعنی امرتا کا تخیال گجرات میری سرزمین تھا۔ وہ گجرات جو علم و ادب اور محبت کی سرزمین ہے۔ اُسی سے امرتا بھی جڑی ہوئی تھی۔ علم و ادب اور عشق و محبت اسے نائک دالی میں بھی ملے تھے اور اس کی سرشت بھی انہی کی

مرکب تھی۔ یوں سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ امرتا کی والدہ کا بیاہ گوجرانوالہ میں ہوا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شوہر فوج میں کام آ گیا۔ یوں دل کا دل سے رابطہ ہوا نہ وہ شوہر کے رنگ میں رنگ سکی۔ شاید قدرت نے کسی اور شخص کے دل کو اس کے حسن کے چراغ سے روشن کرنا تھا۔ راج بی بی کا بھائی بھی فوت ہو چکا تھا۔ بیوہ بھالی اور راج بی بی دونوں سکول میں پڑھاتی تھیں۔ جب تنہائی اور دکھ کی بہتات ہو اور کوئی دنیاوی آسرا نہ ہو تو انسان اُن دیکھے خدا کا سہارا تلاش کر کے خود میں حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نند بھابی بھی سکول جانے سے قبل اکثر سنت دیال کے ڈیرے پر گھڑی بھر کے لئے ماتھا نیکنے رک جاتیں۔ ان دنوں وہاں ایک نوجوان نند راج اپنے گھریار اور مال و دولت کو تنج کے اور عیش و عشرت کے پیر بن اتار کر گھیر وے کپڑے پہن کر سادھو بن بیٹھا تھا۔ ہر وقت آنکھیں بند کئے گیان کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ ایک دن بارش کی وجہ سے راج بی بی اور ان کی بھابی کو مجبوراً وہاں رُکنا پڑ گیا۔ کی فرمائش پر شعر پڑھتے ہوئے نند سادھو نے آنکھیں کھولیں تو سامنے راج بی بی بیٹھی ہوئی تھی اس سے آنکھیں کیا چار ہوئیں گیان اور دھیان کی دنیا تہس نہس ہو گئی۔ محبت نے نند سادھو کے اپنی تحویل میں لے لیا کہ اس نے گھیر و اچولا اتار کر چاہت کا لباس زیب تن کر لیا اور راج بی بی کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ امرتا راج بی بی اور نند سادھو کی اکلوتی اولاد ہے۔ والد بھی شعر کہتے تھے امرتا کی پیدائش پر انہوں نے اپنے تخلص پیراگ کو تجسیم کر کے وجود عطا کیا اور امرت نام رکھا۔ امرتا کا وجود محبت کے احساس سے بنا تھا۔ اس لیے وہ نفرت، بغض اور بے انصافی کی فضا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ انسان اپنے وجود اپنے دل اور ذہن سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن صاف تھا دل صاف تھا۔ اسے حقیقت کا علم تھا کہ یہ دنیا ایک خالق کی تخلیق ہے اور تمام مخلوق ایک خاندان کی طرح ہے۔ اس نے محسوس کر لیا کہ خالق تو انسان کے اندر رہتا ہے اور ہر شخص اس سے منفرد تعلق جوڑتا ہے۔ امرتا کو بھی ہر جگہ وہ دکھائی دیتا تھا۔

صدق ہی کچھ انج دا

جنتھے وی سر جھکا لیا دلہیز جالی اوس دی

ناموں یا کاموں سے فرق نہیں پڑتا دل کے اس سبق کو اس نے کبھی فراموش نہ کیا۔ اور ساری عمر مذہب کے نام پر جھوٹ اور نفرت کی دیواروں کو مسمار کرتی رہی۔

شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے دیکھا کہ ارد گرد تو عجیب کھیل جاری ہے۔ مخلوق کئی خانوں میں منقسم ہے۔ 12 سال کی عمر میں اس نے جو علم بغاوت بلند کیا اسے تاحیات سر بلند رکھا۔ بغاوت کا سلسلہ اس نے گھر سے

شروع کیا۔ اس کی نانی اس کے والد کے مسلمان دوستوں کے کھانے پینے کے لئے برتن الگ رکھتی تھی کم عمر امرتا کے لئے یہ قطعی ناقابل قبول تھا۔ اس نے ہڑتال کر دی اور ان ہی گلاسوں میں پانی پی کر رہی۔ کٹ منٹ پر قائم رہنا اس نے بچپن سے ہی سیکھ لیا تھا۔ وہ ساری عمر انحراف کے راستے پر چل کر خود کو بھی منواتی رہی اور معاشرے کے بنائے ہوئے رسم و رواج کو بھی ٹھکراتی رہی جو انسان کی تذلیل کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کا بہترین حصہ لاہور میں گزرا۔ لاہور کی علمی ادبی فضا نے اس کے جوہر کو خوب سنوارا۔ اسے فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ رقص سے محبت تھی۔ لاہور میں تارا چوہدری سے اس نے باقاعدہ رقص کی تعلیم حاصل کی۔ ستار بجانے کا شوق ہوا تو باقاعدہ ماسٹر رام رکھا اور سراج احمد سے ستار سیکھا۔ لاہور لارنس گارڈن کے عقبی باغ میں ٹینس سیکھی۔ تقسیم کے وقت درو سے دل بچھنے لگا تو بابا گرو نانک یا کسی اور ہندوستانی ادیب شاعر کی بجائے وارث شاہ کا نام لے کر روئی۔

اس نے محبت کی تو ایک مسلمان شاعر سے جو بالکل حسین نہیں تھا۔ مگر امرتا کو وہ پوری دنیا میں خود دکھائی دیتا تھا۔ وہ کبھی اپنے فیصلوں سے پیچھے ہٹی نہ پچھتائی۔ اندر جیت اس کی زندگی میں آیا تو اس نے اسے امروز کا نام کا دیا۔ برسوں لوگ امروز کو مسلمان سمجھتے رہے۔ اور شاید یہی امرتا چاہتی تھی۔ سکھ مت میں سگریٹ پینا گناہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے امرتا نے نہ صرف سگریٹ پی بلکہ بہت ساری نظموں سے اعلان یہ اس کا اظہار بھی کیا ایک اپنے نام کے ساتھ اپنی مختصر داستان رقم کی وہ بھی سگریٹ کی مثال دے کر۔ ہمیشہ سچ لکھ کر اس نے مروجہ نظام سے بغاوت کی۔

چھوٹی عمر میں والدہ کے فوت ہو جانے کی وجہ سے امرتا شدید تنہائی کا شکار ہو گئی۔ مگر اس تنہائی میں اس نے ایک ساتھی کی شبیہ تراش لی۔ جو اس کی باتیں سنتا تھا۔ اور وہ اس سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ اس جیسے خیالات رکھتا تھا۔ یہیں سے اس نے تخیل کو وجود عطا کرنے کی مشق کرنا شروع کر دی تھی۔ ذات کے اندھیرے قلعہ میں قید نے اسے اگلیوں سے ٹٹولنے اور محسوس کرنے کی عادت ڈال دی اور وہ ساری عمر یہی کرتی رہی۔ امرتا نے جب لکھنا شروع کیا تھا اس وقت پنجابی ادب پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ ہر جذبے ہر خیال کو حقیقی معنوں میں دیکھا جاتا تھا۔ مجاز کا رنگ زیادہ پسندیدہ نہیں تھا۔ امرتا نے مجاز کو ہی اصل سمجھا کیونکہ مجاز کا تعلق بدن سے ہے وجود سے ہے۔ اور انسان اس بدن کے ذریعے ہی تمام احساسات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ روحانی تجربہ بھی بدن کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت دو جسموں کو ایک کرتی ہے۔ تو روحانی تجربہ ممکن ہوتا ہے۔



روحانیت کو بدن سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ مٹی کا بدن کئی تقاضے رکھتا ہے۔ خون میں اُگنے والے جذبے اپنا اظہار چاہتے ہیں انہیں خوشبو کی طرح پھیلنا، چھا لگتا ہے۔ اس نے کائنات کی ہر شے کو جسم عطا کیا جس کو چھوا جاسکے۔ جس کو محسوس کیا جاسکے وہ خود لکھتی ہے

”میرے لئے غیر جسمی کچھ نہیں ہر شے کا وجود گوشت پوست کی طرح ہے جس کو ہاتھ سے چھو سکتی ہوں۔“ (ص 114 رسیدی ٹکٹ)

چتر کے دیوتا سے امرتا کو شکوہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کئے صدیوں سے میٹھی نیند سو رہا ہے۔ حسین دوشیزائیں سولہ سنگھار کئے اس کے در پہ آتی ہیں۔ اس کے قدموں پر اپنا ماتھا رکھتی ہیں۔ اپنے سانس نہچا اور کرتی ہیں۔ مگر ان کی سانسوں کی خوشبو، ان کے لمس کی گرمی سے اس چتر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ان کا جواب نہیں دیتا۔ جبکہ محبت جواب مانگتی ہے۔ محبت دوطرفہ ہوتی ہے۔ امرتا ایسی محبت اور پوجا کے خلاف ہے جہاں دوسرا فریق احساسات سے عاری ہو۔ اسکے دل میں حرارت پیدا نہ ہو۔ اس کے احساسات میں طوفان نہ اٹھے اس کے لبو میں جذبے نہ اُگیں۔ اس کی خواہشیں رقص نہ کریں۔ وہ وجود کو اہمیت دیتی ہے لیکن انسان اور جانور میں فرق بھی اسے معلوم ہے۔ بدن جب تک محبت کے رنگ میں پوری طرح بھیگ نہ جائیں ان کے درمیان ہر رشتہ جھوٹا ہوتا ہے۔ بھلے وہ دنیاوی حوالے سے جائز ہی کیوں نہ ہو۔ ”ویو پار“ نظم میں امرتا نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ جسموں کے ویو پار کے کئی بازار ہیں ایسی شادی بھی ایک ویو پار ہے جس میں فریقین کے درمیان محبت نہ ہو۔

ویو پار

ہسساں دا ویو پار

ٹکڑی دے دو چھابیاں دائر اک مرد اک نار

روز تو لہے ماس روز دسپدے لہو

تے آخر کار دے دھ لہندے نیس

لبو مٹی دے بکے بکے سکے دو ترے چار

مہنگے مہنگے نقشاں چھپے کدے کدے کوئی قدر دان آ

لبی چوڑی، دا ج، دوی، دی بولی دیندے تار

دنیا مادہ پر یقین رکھتی ہے جو احساس سے عاری ہے، اسلیے امرتا اُسے ”ماس دا شجرہ“ کہہ کر پکارتی ہے  
جہاں پننا، پھل پھول نہیں سکتا۔

دنیا نرے ماس دا شجرہ ، پننا بے اولاد دے

ایس دنیا نوں کہیہ کجھ کہیے جیہڑی ایس موت تے مے

”گرچہ ہر شے گوشت پوست کی ہے لیکن اس میں پننا اور احساس بھی ہونا چاہیے وہ پننے کی موت برداشت نہیں  
کرتی۔“ کیونکہ پننا، احساس اور خواب سے جڑا ہوا ہے اور احساس اور خواب کے بغیر انسانی جسم صرف مادی  
شے بن جاتا ہے۔ لیکن جسم کو مادہ نہیں بننا چاہیے کیونکہ اس مادی جسم کو روح، سانس، خوشبو اور آہ نے کس کے  
باندھا ہوا ہے اور یہ ترہ کسی سے نہیں کھلتی۔

گنڈھ

ہوٹھاں دا کپڑا پاٹ گیا

پر گنڈھ نہیں کھل دی ساہواں دی

ایہہ گنڈھ ساڈیاں روہاں دی

ایہہ گنڈھ ہے دو خوشبوواں دی

ایہہ گنڈھ ہے تے ہو کیاں دی

ایہہ گنڈھ ٹھنڈیاں آہواں دی

ایہہ گنڈھ جسم دے نھیر سے دی

ایہہ گنڈھ جسم دے چائن دی

ایہہ گنڈھ ہے دو عرضوئیاں دی

ایہہ گنڈھ ہے دو درگا ہواں دی۔۔۔۔

یعنی دو وجود جب ایک ہوتے ہیں تو ان کی روہیں، خوشبوئیں، احساسات، اچھائی برائی، سب ایک ہو  
جاتے ہیں۔

امرتا کو اپنے دیرینہ دوست سے شکوہ ہے کہ وہ دل کے باغوں میں اُگنے والی ہری چائے کی پتیوں کی طرح



باتوں کو فوراً توڑ کر اور چھپا کر خشک ہونے کے لئے رکھ دیتا ہے تو دل کا گمراہ اس ہو جاتا ہے اور اس کی حرارت  
 دھیمی ہو کر بجھنے لگتی ہے۔ امرتا کو یقین ہے کہ جذبوں کی بھی کڑیوں کو پھونک مار کر جلایا جائے تو عشق کی حرارت  
 بول پڑے گئی اور میرے جسم کی دیکھی میں دل کا پانی کھول اٹھے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے یہ پوٹلی تو کھولو، خشک  
 کی ہوئی پتیوں کو نکال کر برتن میں ڈالو اور گرم گرم گھونٹ ہم دونوں پی کر دیکھیں ورنہ عمر گزارنی مشکل  
 ہے۔ عشق کی یاد میں سارا بدن و تری مٹی کی طرح ملائم ہو جاتا ہے۔ اور لفظ اس مٹی میں بیج کی طرح گرتے تو  
 پھول بن کر کھلتے ہیں تو وجود مہک مہک جاتا ہے۔ وہ تمام کائنات کو جادو کے عمل سے دل کے صحن میں لے آئی  
 ہے۔ وہ اس سے باتیں کرتی ہے۔ زمین آسمان، سورج چاند ستارے، پھول درخت پہاڑ و جود رکھتے ہیں۔ مگر  
 امرتا نے انہیں احساس اور زبان بھی عطا کر دی ہے۔ وہ سب اس سے باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ نظر نہ آنے والی  
 چیزیں بھی مجسم ہو کر سامنے آتی ہیں۔

عشق مجھیں اوس فی جندے کیکن دہ نہ گزارے؟

جند کہے ”میں سپنے تیرے مہندی نال شنگارے“

عشق مجھیں اوس فی جندے کیکن نین روندے؟

جند کہے ”میں نکھاں تارے زلف تیری وچ منڈے“

جہاں وہ تجسیم کے فن میں ماہر ہے۔ وہاں وہ تحلیل کرنا بھی جانتی ہے۔

گھول کے سورج اسان

دھرتی نوں ڈوبا دے لیا

تاریاں دے نال کوٹھا

عکس دا لنیا اسان

سپنے کو گھونسا کہنا بھی امرتا کا کمال ہے

سپنیاں دے آہنے وچ رات بھر کوئی رہ گیا

گل سی نروان دی پر جسم خاکی کہہ گیا

دھرتی اور آسمان بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں

ہوٹھ کجھ اسمان دے ہلدے پے  
 کول ہو کے سُن ذرا اج دھرے  
 رات دی بھٹھی نوں کس نے بالیا  
 کھولدی ہے دیگ سورج دی کیوں  
 بات ہے دنیا دی دنیا والیو  
 دیگ وچ پھر بٹھنا ہے عشق نے

تاثر میں شدت پیدا ہو گئی ہے

رات میری جاگدی تیرا خیال سوں گیا  
 سورج دا رُکھ کھڑا سی کرناں کسے نے توڑیاں  
 تے چن دا گونا کسے نے اتر توں اج اڈھڑیا  
 کیوں کسے دی فیند نوں سُنے بلاوا دے گئے  
 تارے کھلوتے رہ گئے اتر نے بوبا ڈھو لیا

✽

جس رات دے ہوٹھاں نے کدے سُنے دا متھا مٹیا  
 سوچاں دے چیریں چھٹکدی اک جانچھر جی اوس رات دی

✽

ہجر دی اس رات وچ کجھ روشنی آوندی پئی  
 پھیر بتی یاد دی کجھ ہور اُچی ہو گئی

✽

|       |      |      |     |        |
|-------|------|------|-----|--------|
| اج    | اساں | اتر  | دے  | گھڑیوں |
| بدل   | دی   | اک   | چلی | لاہی   |
| ٹھٹھ  |      | چانی |     | بتی    |
| ڈاڈھی | اُچی | کندھ | وقت | دی     |

|       |      |        |      |
|-------|------|--------|------|
| انہر  | عاشق | اوندھی | پائی |
| بینھا | دھند | کھٹا   | پیوے |
| پورب  | دی   | اج     | منجی |
| کوئی  | سویہ | بہن    | آئی  |

احساسات کی دنیا وسیع ہے مگر امرتا کیلئے کائنات ایک مکان میں سمٹ گئی ہے، کبھی وہ چاند سورج کا گولہ پکڑ کر کھیلتی ہے، کبھی سورج مکھن کا بیڑا بن جاتا ہے اور کبھی چو کی پر رکھے آسمان سے گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے اور اس کے نکلے جذبوں کی آنکھوں کو ابولہبان کر دیتے ہیں۔

اچن چیتی پاواٹھا

انہر دی ایس چوکی اتوں

ڈک پیا شیشے دا سورج

روح امرتا کے نزدیک ایک آگ کا نام ہے۔ جو پتھر وجود میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ انسان کی ہستی ذہن، ذول اور روح کی ہم آہنگی کا نام ہے۔

سوچاں دے سرور ہتھاں نوں دھوتا

متھے دا دیوا میں تلیاں تے دھریا

تے روح دی آگ چھوہائی

اسے سورج روشنی زندگی اور امن سے پیار ہے، مگر اس کا سورج بادلوں کے محل میں گہری نیند سو رہا ہے جہاں نہ کھڑکی ہے نہ دروازہ ہے نہ سیڑھی اندھیرا اس کے سینے میں صلیب کی طرح چھپتا ہے لیکن وہ بے شمار دکھوں کے باوجود کبھی زندگی کو نہ نہیں کرتی، ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر کے زندگی کو ہاں کہتی ہے اور اس کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ غور کیا جائے تو وہ تمام عمر بچ اور جھوٹ کے درمیان گوشہ عافیت تلاش کرتی رہی۔ منافقت کے دور میں ایسی جگہ جو سچے انسان کے لیے رہنے کے قابل ہو۔

چل! چھٹاں دے سر تے اک چھت پائے!

دیکھ! اوہ سا بننے، پرانہ، ادھر

بچ اتے جھوٹ دے وچکار کجھ جگہ خالی ہے۔

حقیقت کا بیان امرتا پر ختم ہے۔ خوف تو اس کی سرشت میں ہی نہ تھا اور کسی بھی سچے انسان کی خوف سے دوستی نہیں ہو سکتی۔ مگر عورت ہوتے ہوئے اس نے خواہ مخواہ کی دکھاوے کی چادر نہیں اوڑھی بلکہ ایک مکمل انسان کی طرح تمام دکھ سکھ خوشیاں غم انسانی فطرت کی خوبیاں خامیاں اور دل کی خواہشیں لئے کھڑی ہے۔ اس کی شاعری تو ایک بازار ہے جس میں اس کی حیاتی کا ہر روپ موجود ہے۔ جو اس کے دل پر بیٹتی ہے۔ جو اس کی روح اور دل محسوس کرتے ہیں جو اس کا بدن جھیلتا ہے سب رقم کر دیا ہے۔ اور سب کو بتا دیا ہے کہ یہ غم اس معاشرے میں ایک انسان کا نہیں ساری دنیا کا ہے، کبھی وہ دنیا کی نمائندگی کرتی ہے اور کبھی تمام دنیا اس کے غم میں شریک ہو جاتی ہے۔ ہر محاذ پر دونوں کا دکھ ایک رہتا ہے۔

دیکھ لفظاں داکھڑا ک نہ کرے!

کہ تیری عمر دے کئے ہی ورھے، میرے بدن وچ سے پنے

اوہ جاگ اٹھے تان کیکن کہاں گی

کہ کسے جان والے نوں، پچھوں وی وایج نہیں ماری دی

کسی پرانے دوست سے ملاقات کا احوال لکھتے ہوئے جو کئی بار بلانے پر نہیں آیا امرتا خوشی سے نہال ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹ گھلے بن گئے ہیں جن میں خوبصورت پھول کھلتے ہیں۔ امرتا شیشے کی صراحی میں خیالوں اور نظروں کی شراب بھر کر جام بناتی ہے اور سب پیتے ہیں۔ اسے وہ گھڑی بھی یاد ہے جب اس کے محبوب کی اچانک آمد پر کمرے میں وقت حیران کھڑا رہ گیا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اس نے گھبرا کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی تو اس کے گھٹنوں سے جو خون نکلا وہ آج تک امرتا کی یاد کی کھڑکی میں جما ہوا ہے۔

پراوس دن وقت نے جد باری چوں چھال ماری سی

تے ادس دے گوڑیاں دچوں جوہو سیمیا سی

ادہا ہو

میری باری دے تھلے اے تک جمیا ہو یا ایہہ

اسی طرح کبھی کبھی کوئی پرانی ملاقات بھی تجسیم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو بہت حیرانی ہوتی

ہے۔

نیزہ گھننے دی ملاقات

اچ ساہنے اوس چوک وچ اک سنتری وانگوں کھڑی  
 تے میریاں سوچاں والا نگھا اوس ہتھ دے کے روک دتا ہے  
 جانے خدا میں کیہ آکھیا سی تے جانے خدا تو کیہ سنیا ہے  
 مرد اور عورت کی محبت کی حیوانی سطح کارومانس جس میں بدن کا لہو بدن کی موسوگھتا، جنگلی جانور کی طرح  
 چنگھاڑتا اپنے دانتوں اور پنجوں سے کھال اڈھیرتا ہے اور پھر اک دن پالتو کتے کی طرح شریانوں میں بیٹھ کر دم  
 ہلاتا ہے۔

”تمیں“ بنا میرا جنم

مَن دی تھالی وچ اپرادھ دا اک سکن اے  
 ماس دے وچ قید ہویا ماس دا اک جھن اے  
 گوشت پوست کے وجود کا سب سے بڑا سرمایہ محبت کا جذبہ ہے وہ وصل کے لحاظ کو کس خوبصورتی سے  
 تجسیم کرتی ہے۔

اچ ماگ دی راتے میں ندیے پیر پایا  
 بڑی لکری راتے ایہہ ندی کوئی سی  
 گل انہوئی.....

پانی نوں انگ لایا تاں ندی دودھ دی ہوئی  
 کوئی ندی کراماتی، میں دودھ وچ نہاتی  
 ایس تکو غڈی ایہہ کبھی ندی؟ کہیا سُننا؟  
 تے ندی وچ چن تر داسی  
 میں تلی اُتے چن دھریا، گھٹ بھریا  
 تے ندی دا پانی میری رت وچ گھلدا اپنا  
 تے اوہی چان میری لکھ وچ ہلدا اپنا۔

دنیا میں کئی دیواریں راستہ روکے کھڑی رہتی ہیں دیوار کے ساتھ سائے اور چھت کا ساتھ بھی ہے مگر زیادہ  
 تر کاوٹ ہی مفہوم لیا جاتا ہے پتل، لوہے، چندن کی دیوار کی طرح گوشت کی دیوار ہے۔

تے اک ماس دی ایہہ کندھ سی، بن دی ہے  
تے ایہہ دے پچھوں سپیاں دا نیلا رنگ دسد اسی  
بن دی دسد اے

اوہ چھاتی دے تران نال کندھ نوں بھندی رہی  
پر ماس دی ایہہ کندھ... محبت دی کندھ  
کدے دی کھلدی نہیں

✽

دھڑ ایک درخت ہے جس پر گوشت کے پھول کھلتے ہیں  
دھرتی دیاں ٹانیاں اُتے

روز ماس دے مٹھل کھڑ دے غیس، ماس دے مٹھل جھڑ دے غیس...  
پراک مٹھل کیا کو کھڑ یا، پراک مٹھل کیا کو جھڑ یا  
دھرتی انج کدے نہ ہنسی، دھرتی انج کدے نہ روئی  
کہو جیسی ایس دی خوشبوئی، مٹھل سو یا پر مہک نہ موئی...

وجود ایک حقیقت ہے، گوشت پوست مادہ ہے مگر وہ پتھر کی طرح ساکت نہیں بلکہ ہر لمحہ اس میں آگ کی  
بھٹی جلتی رہتی ہے۔ جبکہ پتھروں میں نہ آگ ہے نہ لہس ہے۔

پتھر دے دیوتا، پتھر دے پجاری

وصل انگ نہ چھو ہندا

تے برہا بھنگ نہ ہوندا

پر پتھراں دی نگری کوئی آگ نہ پالے

چھاتیاں دے چلھے کوئی آگ نہ ہالے

متھیاں دی بھٹھی کوئی آگ نہ سیکے

امر تا جب بھی تن کی بات کرتی ہے من کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ تن اور من کے تقاضے مختلف نہیں

نی مائے

نی مائے اس کہزیاں نہتاں، میرے متھے وچ پھل کھڑیا  
میرے تن دی تے من دی سنی، گلابی جیہارنگ چڑھیا۔

ۛ

تن من پر جب بہارِ رت آتی ہے تو ماتھے پہ پھول کھلتا ہے۔ تن من کی مٹی گلابی ہو جاتی ہے۔ ہر طرف  
جھانچھر کی مدھر آواز سماعتوں میں رس گھولتی ہے اور رقصِ خون میں شامل ہو کر پورے وجود کو محبت کی اسکی لے عطا  
کرتا ہے کہ انسان جو قدم اٹھاتا ہے، جھومتا ہے۔ بغیر محبت کے جنسی رشتہ بھی کیٹکنکی زندگی کا حصہ بن کے رہ جاتا  
ہے۔ انسان بے شمار کاموں میں الجھ کر اس جذبے سے بھی لاطلق ہو جاتا ہے اور لمحاتی تعلق باقی رہ جاتا ہے۔  
جسم کو کامیوں کی فیکٹری کہتے ہوئے امرتا لکھتی ہے۔

میں اپنے مردنوں بلدی

جیویں پیلیاں چوں اک گاجر

جاں مولیٰ نوں توڑ کے

کوئی ہسکھ نوں اک ٹھلھ پاندھے

اگر چہ امرتا ہر شے کو کنکریٹ حالت میں دیکھتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ٹھوس چیزیں بھی خیال بن جاتی ہیں۔ حتیٰ  
کہ وجود بھی وہم اور سایہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

میں چھاواں دے اندر ڈولدی اک چھاں ساں

تے شاید توں دی اک خاکی جھیا سایہ

نظم "وشواس" میں امرتا نے خیال، جذبے اور احساس کی طرح افواہ کو بھی ایک مادی وجود اور زندگی کی  
حرارت بخش دی ہے۔ وہ حرکت کرتی ہے، دیواروں کو ٹکریں مارتی ہے، سوراخوں اور سرنگوں میں گزر گاہ تلاش  
کرتی ہے، تاکہ امرتا تک پہنچ سکے مگر امرتا نے کانوں میں عشق کی روئی ٹھونس کر بیرونی دنیا سے رابطہ ختم کر رکھا  
ہے۔

اک افواہ بڑی کالی

اک چام پنھ وانگوں میرے کرے ج آتی ہے

کندھاں نوں ٹکراں مار دی

تے کھڈاں موریان تے سرنگاں لہدی

پراکھاں دیاں کالیاں گلایاں

میں ہتھاں نال ڈھک لیاں ہن

تے تیرے عشق دا میں کناں بچڑواں دے لیا ہے

امرتا کا جسم "میں" جو "تو" سے مل کر وجود بنتا ہے۔ "میں" پانی کا روپ ہے اور "تو" آگ جو روشن بھی کرتی ہے حرارت بھی بخشتی ہے زندگی کی علامت ہے اور من سے خیال غیر کا سارا مواد جلا کر رکھ کر دیتی ہے۔ امرتا جب میں اور تو کی بات کرتی ہے تو صدیوں پرانے یونانی فلسفے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ شروع میں مرد اور عورت ایک وجود کا حصہ تھے اور بعد ازاں ایک دیوتا نے ان کی کسی غلطی کی وجہ سے انہیں کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کی طرف غیر شعوری اور غیر اختیاری کشش رکھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے سے ہستی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ایہہ میں دی مٹی دی ترہی سی

کہ اوس نے توں دا دریا پیتا،

ایہہ میں دی مٹی دا ہر اسپنا

کہ توں دا جنگل اوس لہہ لیتا

ایہہ میں دی مٹی وی دا شنا

ستے توں دے انبر دا عشق سی

کہ توں دا نیلا جیہا پینا

مٹی دی تیج تے سُتا!

دو الگ جسموں میں قید انسان تمام عمر ایک دوسرے کو آوازیں دیتے رہتے ہیں۔ جب دو جسم ایک وجود بن جاتے ہیں تو پتھروں کی تیج بھی پھولوں میں بدل جاتی ہے۔ آنکھیں ہونٹ، انگلیاں، پونے دو بدنوں کے اکھڑ بن جاتے ہیں۔ جو محبت کی داستان لکھتے ہیں

ایہہ میرا تے تیرا میل سی

اسیں پتھراں دی تیج تے سُتے،



تے اکھاں، ہوٹھ، انگلاں، پونے

میرے تے تیرے بدن دے اکھر بنے

”میں“ اور ”تو“ کی دوستی اور ”میں“ کو ”تو“ کی پہچان ہی اصل حقیقت ہے۔ یہی محبت ہے۔ یہی

عبادت ہے یہی ریاضت ہے۔ ”میں“ اور ”تو“ کے ملاپ سے قبل دو جسم جذبوں، احساسات سے عاری تھے۔  
روح سے بے خبر تھے۔ روحانی ترقی بھی دو کی ایک میں ضم ہونے سے ممکن ہوتی ہے۔

میں نے جد توں ٹوں پہنیاں

تاں دوویں ہی پنڈے انتر دھیان سن،

ایک بھلاں دی طرح ٹکدھے گئے

تے روح دی درگاہ تے در پے گئے.....

دیے ”تو“ میں“ کے تصور میں ”تو“ کا تصور پیدا ہوتا ہے مگر جب جسم کو اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے

اس کے احساس میں پھول کھلنے کا موسم آتا ہے، لفظ سے ذہن روشناس ہوتا ہے اور لب ادائیگی کا ہنر جانتا ہے۔  
تو اس کی نظر کے سامنے سب سے پہلے ”تو“ کا اکھر لہراتا ہے۔

میں دی چار ت موی سی

ماس دے بونے نوں یو آ پائی

پون کنیں مہک بھگی سی

توں دا اکھر لہلہایا سی.....

امرتا کی نفیم ’نیل‘ دو جسموں کے ملاپ نہیں روح اور جسم کے ایک ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ جسم

یہاں روح کے تابع ہے۔

تے ایس توں پہلاں

کہ کچھ وٹھ تے کھلو تے ایس مک جانیے

چل! کھنکر اس جیسے پنڈے پانی تے وچھائیے!

توں اپنے پنڈے تے پیر رکھیں،

تے اوھے دریانوں ٹنگ آویں!

میں اپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی

..... تینوں اکوں دی ملاں گی.....

یعنی بدن تو کھنگر پتھر کی طرح ناکارہ ہے۔ اس لئے اس بدن کو کشتی بنا کر چلیں تو محبوب سے ملن ممکن ہوتا ہے۔ یہاں بدن مقصد نہیں مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہاں امرتا بدن سے آگے کسی منزل کی بات کرتی نظر آتی ہے۔

میری بیج حاضر ہے.....

پر بنجی تے قمیض دانگن

توں اپنا بدن دی اتار دے

پرانہہ موڑھے تے رکھ دے

کوئی خاص گل نہیں.....

ایہہ اپنے اپنے دیس دارواج ہے!

انسان کا وجود روحانی اور مادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلنے سے ہی وجود مطمئن ہو سکتا ہے۔ خالص مادی یا خالص روحانی دونوں غیر انسانی ہیں۔ مادہ حقیقت ہے اور روح مادہ کے اندر ہے تو حقیقت ہے ورنہ ہمیں اس کا ادراک ہے نہ شعور، جسم اور روح الگ الگ تو نہیں، ان دونوں کے ملاپ سے ہی وجود بنتا ہے۔ اس لئے جب جسم کی بات کی جاتی ہے تو روح کو دیس نکالا نہیں مل جاتا بلکہ اس میں روح بھی شامل ہوتی ہے روح کے بغیر تو جسم صرف مٹی کا پتلا رہ جاتا ہے۔ ہاں روح اور جسم کی دوستی کی مختلف سطحیں ہیں۔ امرتا کے نزدیک بھی جسم سے مراد ایسا مکمل وجود ہے جہاں روح اور بدن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوں۔ ان میں مکمل ہم آہنگی ہو۔ لیکن روح کی بات کرنا جسم کے تقاضوں سے دستبردار نہیں ہونا ہے۔

امرتا پر تم ایک ہستی کا نام ہے۔ لیکن اس کا دل ایک ایسا محل ہے جس میں سستی سوئی، پورن، سندراں اور ہیر نے بسیرا کیا ہوا ہے۔ اس نے ان سب کے خیالات بن کر حیاتی کا جوڑا بنایا ہے۔ اور جب بھی وہ یہ لباس زیب تن کرتی ہے تو وہ سب اسکے محسوسات میں در آتی ہیں۔ چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اپنی اپنی بولنے لگتی ہیں۔ اور امرتا قلم بن کر لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

خدا نے جب انسان کی تخلیق کی تو آگ، پانی، مٹی اور ہوا کے مرکب میں اپنی روح ڈال کر زندگی بخشی۔

اب امرتا کا کمال دیکھیے روح کا یہ قصہ کس طرح تجسیم کر کے بیان کرتی ہے اور رب کے روحانی وجود کو بھی  
لفظوں کے چولے پہنا دیتی ہے۔ درخت انسانی جسم ہے اور رب روح ہے۔

رب جی! توں میرے رکھتے آ کے

اک دن منت منی

تے چولے نالوں پاڑ کے کئی

رکھ دی ما بنی ننھی

خدا نے اس جہان میں ہر انسان کو مختلف ذمہ داریاں سونپی تھیں امرتا کے ذمے سچ لفظ لکھنا تھے۔ وہ اس  
نے لکھے اگرچہ اس کے عوض اسے کبھی انہی سوچوں کی سولی پر لٹکنا پڑا، کبھی زمانے کی مخالفت سہی پڑی مگر وہ  
سرفروغ ہے اب خدا اپنی روح کو واپس بلا لے۔

آؤ رب جی رکھ نالوں

ہن ما کی کھلن آؤ

تے روح والا اک اخیر اکر

اپنی جھولی پاء

وہاں۔۔ بعد خیال اس کے ذہن میں نہیں کوکھ میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں اولاد کی طرح جنم دیتی

ہے۔

کہ آک انہری پینا

مری لکھ وچ آیا

تے بیاسی واناں تلب

میری لکھ وچ بیٹھا رہیا

لفظوں کو برتنے انہیں نے مفہوم دینے، خیال کو جسم کا لباس پہنانے کے ہنر جاننے والی امرتا کہتی ہے کہ  
میرا وجود تو چپ کا درخت ہے اور میں نے اس درخت سے ارادنا کوئی لفظ نہیں توڑا مگر جو خود بخود جھڑ کر میری  
جھولی میں آتا رہے۔ میں انہیں جمع کرتی رہی۔ اس کے کان کوئی آواز نہیں سنتے مگر جو حرف اس کے لبوں میں  
بولتے ہیں وہ صرف انہیں سنتی ہے کیونکہ وہ سچے حرف ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے روزمرہ حالات کو ذات کی

کھڈی پر بن کر کہانی بنائی ہے اور ذات کے درخت سے جھڑنے والے لفظوں کو امرتا نے انگلیوں کا لمس، دل کا درد اور لہو کی حرارت عطا کر کے زندہ کر دیا ہے اور زندہ لفظ کبھی نہیں مرتے۔

نہیں چپ دے ایس رکھتوں

میں اکھر نہیں توڑے

ایہ تار جو رکھ تالوں جھڑے کی

میں ادھی اکھر چنے بن

امرتا گوشت کے بدن کو ایش ٹرے کہتی ہے جس میں وجدان اور الہام بھی راکھ بن کر گرتے ہیں۔

تے میں آدم .... اخیر وچ بنداماس دی اک ایش ٹرے

الہام دے دھوئیں توں لے کے سگریٹ دی راکھ تک

کائنات کا سارا قصہ "میں" اور "تو" کا قصہ ہے، "میں" کے ساتھ "تو" کا تصور وابستہ بھی ہے اور لازم و

ملازم بھی۔ "میں" کے جسم میں "تو" سانس کی طرح رہتا ہے۔

میں دی جو سوچاں بیتیاں

اونہاں دی راکھ جھاڑی سی

ٹنسی وی جھاڑ سکدے او

امرتا کے لئے سوچ سگریٹ کی طرح ہے۔ وہ سوچ کو سکیٹ کی طرح چیتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کا

من، احساس اور جذبہ سگریٹ کی طرح شلگ شلگ کر راکھ بنتا ہے۔ لیکن یہ راکھ بہت قیمتی ہے اسی لیے امرتا

اسے نظم کے صندوق میں سنجال دیتی ہے۔ نظم "آگ دی بات میں" امرتا نے جسم میں جان کی صورت سلگنے والی

سگریٹ کی بات کی ہے۔ جو محبوب نے سلگائی تھی۔ سگریٹ جل گئی مگر عشق کی مہک محبوب کی سانسوں اور ہوا

میں ہمیشہ کے لیے رچ گئی۔ امرتا کو زندگی کی پرواہ نہیں عشق کی آگ کی پرواہ ہے۔ کیونکہ عشق کی آگ جلتی دہنی

چاہیے۔

آگ دی اک بات ہے تو ہیں ایہ بات پائی سی

ادھی سگریٹ چند دی جو توں کدے سلگائی سی

ایس میرے جسم اندر ساہ تیرا چلدا رہیا  
دھرتی گواہی دے گی دھواں نکلدا رہیا

دیکھ نوٹا آخری انگٹاں دے دیوں جھڈ دے  
سیک میرے عشق دا پوٹا نہ تیرا چھوہ لوے  
راکھ کب بنتی ہے پتے کب گرتے ہیں درد کے سگریٹ سے جھڑنے والی راکھ نظموں کی صورت کب  
اختیار کر جاتی ہے۔ جب وجود ریاضت اور تپسیا کی بھٹی میں جل کرنی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اک وردی

جو سگریٹ دی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے

صرف کچھ نظماں بہن

جو سگریٹ دے تالوں میں راکھ دا گن جھانپاں

اس نے اپنے پورے وجود کو قلم بنالیا تھا۔ یا اس کے دل میں اتنے جذبے اتنے احساسات تھے کہ ان کو قلم  
کرتے کرتے پورا وجود قلم میں ڈھل گیا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے فن اور ہنر پر مان نہ کیا۔ اگر مان کیا تو ج  
لکھنے پر۔ اسے فخر تھا تو صرف اس بات پر کہ وہ عشق کی ہر آزمائش میں سرخرو ہے۔

اُسے تاز تھا اپنی انفرادی سوچ اور مسلک پر کہ وہ چھاؤں بھرے رستوں پر چلنے کی بجائے کانٹوں پر چل کر  
نئی راہیں بناتی رہی۔ زندگی میں بے شمار مخالفتوں کا سامنا کرنے والی حساس امرتا مر کر امرت ہو گئی کیونکہ علم و  
ادب سے محبت کرنے والوں نے اسے دل کے تاج محل میں سجایا اور اس دنیا میں دل کے تاج محل سے اعلیٰ کوئی  
جگہ نہیں۔ اپنے محبوب کو اس نے اپنے گیتوں کا حصہ بنا کر ذات کا حصہ بنالیا۔ اس کی باتیں اس کی شاعری اس  
کی زندگی الگ نہیں۔

مان نیچے عشق دا ہے، ہنر دا دعویٰ نہیں

قلم دے ایس بھیت نوں کوئی علم والا پائے گا

عشق دی دہلیز تے سجدہ کرے گا جد کوئی

یاد پھر دہلیزوں میں امانہ آئے گا۔۔۔۔

امرتا پریم امن کی دیوی ہے اس کی شاعری امن کا عہد نامہ ہے۔ کائنات ایک ہے، سب لوگ انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں اس لئے سب کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے۔ اپنی نظم عہد نامہ میں لکھتی ہے کہ زبانی باتیں بہت ہو چکیں۔ اب قلم میں عمل کی سیاہی بھر کر اس عہد نامے پر دستخط کرنا ہوں گے۔ یہ نظم اقوام عالم سے خطاب ہے۔ جس میں علم اور قلم کی قدر کرتے ہوئے ہر طبقہ فکر کے لوگوں سے دستخط کی استدعا کی گئی ہے۔

امن دا ایہ عہد نامہ، آؤ دنیا والیو دستخط کرو!

کاغذ ہے ایہ تقدیر دا، تے قلم ہے تدبیر دی  
آج قلم دے وچ عمل دی سیاہی بھرو! دستخط کرو

وہ چاہتی ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک رشتے میں بندھ جائیں۔ انسانیت کے رشتے میں رواداری کے رشتے میں۔ بھلے ان کے دلوں میں محبت کے ٹھانٹھیں مارتے سمندر نہ ہوں۔ تمام گلے شکوے رکھتے ہوئے چھوٹی بڑی غلط فہمیاں ناراضگیاں ہوتے ہوئے وہ فیملی فونو گراف میں تو اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ کتنی معصوم خواہش ہے۔

اسیں وے سارے..... ہندو تے مسلمان، گورے تے کالے، عربی تے یہودی،

چیک تے روسی، امریکی تے ویت نامی

تے پرانہہ..... جٹھ موڑ کے بیٹھے ہوئے چینی بھرا

ایس طرح اک تصویر تے کھچا سکدے ہاں

تے جدوں فونو گراف رکے گا..... ناؤ پلیز سائل!

اسیں سارے اکو دار مسکراواں گے.....

کاش ایسا ہو سکے۔

☆☆☆☆

## پریت کی شہزادی

کبھی کبھی وقت کی سخاوت اسیر لہجوں کو جنم دیتی ہے انہی لہجوں میں سچائی کی افزائش ہوتی ہے جو ان کی دھڑکنوں کا "ست" پی لیتے ہی "امر" ہو جاتے ہیں۔۔۔ وقت کا ساحرا نگلیوں میں جادو بھردیتا ہے پوروں سے رس نکالتا ہے۔۔۔ سورج کہتا ہے میں "امروز" ہوں اور مجھے امشب میں ڈھلنا ہے مگر پورے یقین اور وقار کے ساتھ۔۔۔

امرا جب پریت کی گلی سے گزرتی ہے تو "نیر وں" سے جھانکتی آنکھیں نسوانی سرگوشیاں اور ناٹ کے پردوں سے لگی بندی کا جل کہنے گجرے میں اسیر مخلوق کو اپنا "حق" یاد آ جاتا ہے وہ اس برصغیر کی اسیر عورت کو پاؤں کی "اڑی" مار کر جگا جاتی ہے جو صرف درد کی منتقلی اپنی جہی کو کرنے پر مامور ہے۔

پنجاب کے سینے پر چلتی ٹرین بے کاری کا روگ آتے جاتے جنگلشن ویران شیشن اندھیرے راستوں کا منہ اور دھرتی کی "تریز" سے پھوٹی آواز

انج آ کھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچوں بول

تے انج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

ایسا ظلم کرنے والے مردوں نے نہیں ڈھایا جتنا وارث نے عورت کو مکمل انسان سمجھ کر اس کے "اقرار" کو جلد دے کر کیا ہے کھونٹے سے بندھی مخلوق رسی تو تڑا میٹھی مگر بے سمت راستوں پر مخالف ہواؤں سے نبرد آزما ہے دل نفرت کو پی جاتے ہیں مگر محبت برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ نفرت وجود کو جوڑ کر کھڑا رہنے کا حوصلہ دیتی ہے مگر محبت میں بدن سیال ہو جاتے ہیں وارث جب پنجاب کی عورت کو اس کی مرضی کا "بڑ" بخشا ہے تو آنکھیں پھل جاتی ہیں امرتا کی پکار اس بیچ پر مہر ثبت کرتی ہے کہ پنجاب کی عورت جب بھی حق مانگے گی تو کسی حفران پر دھان سے نہیں صرف اور صرف وارث شاہ سے وہ کہتی ہے۔

اک چپہ چن تے مُٹھ کو تارے  
ساڈ امل بیٹھے آسمان۔۔۔

یہ فلسفہ ذات کے اجارہ داروں سے دراز ہوتا ہوا ایوانوں کی حاکمیت تک طمانچہ ہے ہماری زندگیوں  
کے آسمان پر چند رشتوں کے ستارے اور مقدر کا چاند حکمرانی کرتا ہے فلیکب نے کہا تھا  
گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا

گوجرانوالہ سے دہلی تک یہی نارسائی اسے بھی لاحق تھی ایک عورت جو گھر بساتی ہے جس کی کوکھ آباد  
ہوتی ہے جس کے آنگن میں قلعاریاں گونجتی ہیں جو انگلیوں میں قلم تھام کر بھی چوہے کی آگ کو سلگائے رکھتی  
ہے جو محبت کا بھرم بھی بھاتی ہے اور کرم دھرم پر بھی پورا اترتی ہے جو سوچتی ہے جو کھوتی ہے بچے خاوند دوست  
یار عاشق بننے ٹوٹے کاغذی رشتے محبت کی پسپائی دوستی کی فتح اور ہاتھوں کی کاوش۔۔۔ کیسی بھری بھری  
عورت ہے امرتا کتنی لبریز۔۔۔ کیوس پر پنجاب کے نقشے سے امرتا کا سراپا ابھرتا ہے جو نہ ہندو ہے نہ مسلم نہ  
کچھ نہ عیسائی جو صرف عورت ہے مکمل عورت۔۔۔

اس کے قلم کی سچائی اس کی زندگی کی سچائی سے جڑی ہوئی ہے اس نے دکھ سنے قبول کیے مگر دروغ گوئی کا  
نوالہ نہیں چکھا زندگی کو جیسا سوچا ویسا ہی برتا۔ زندگی سے اپنا حق مانگا تو اس کی پوی قیمت ادا کی۔۔۔

لحد آ کر کو سامنے رکھ کر ہر لمبے کا شہد کشید کیا کہتی ہے  
وے میں تڑکے گھڑے داپانی  
کل تک نہیں رہنا۔۔۔

چناب میں ڈوبتے چاند اور کچے گھڑے کی خوشبو عشق کی معراج ہے۔۔۔ یہ دینے فنکار کے فن کو اُجالتے  
ہیں امرتا کو تیرنا آتا ہے تو ڈوبنا بھی آتا ہے اس نے اپنی ذات کے منکشف لمحوں کی کھڑکیاں کبھی بند  
نہیں کیں۔۔۔

اپنی نظم خالی جگہ میں آخری حصہ ہے  
میں کنایہ چر

پنڈے دے مینہ وچ گلدابار  
پھر عمر اس دے موہ نوں



اک زہر وانگ پی کے  
 ابدے کھدے ہتھ نے میرا ہتھ کڑیا  
 چل چھٹاں دے سرتے ایک چھٹ پائیے  
 او دیکھ پراں۔۔۔ ساہنے اوتھے۔۔۔  
 سچ اتے جھوٹھ دے وچکار۔۔۔ کچھ جگہ  
 خالی اے۔۔۔۔

انہی دو انتہاؤں کے سچ زندگی بنتی ہے اطراف میں ابنا ملٹی abnormality ہے مگر توازن سے عدم  
 توازن تک کا سفر ہے اپنی نظم "جان والے" میں کہتی ہے

میری ٹٹ رہی آواز  
 کیوں ہے تیری مہر میری منت دی محتاج  
 وفانوں کہناج واسطہ پانا پوے گا؟  
 شاید مشکل ہی ملد اے وفاد اصلہ  
 کئے ارغوانی سال  
 میں انجانیاں ہنگال سئے

صوفیانے اسی "رائی گانی" کو قلمبند کیا ہے مگر اس احساس کے ساتھ کہیں بھی احساس زیاں نہیں ہے بلکہ جب شاہ  
 حسین کہتے ہیں "ایویں گئی وہائے" او پس پردہ یہی بے لطف بے بساط بسر کی گئی ساعتیں ہیں۔۔۔ بشر وقت  
 بسر نہیں کرتا بلکہ وقت بندے کو "برت" لیتا ہے انسانوں کی طویل پروٹی ہوئی تسبیح کے دانے خاموش رتے ہیں۔  
 وقت کالس ایک ایک موتی "کیرتا" رہتا ہے اس طویل چپ میں ارتعاش تب پیدا ہوتا ہے جب کوئی کوئی موتی  
 بغاوت کر کے ڈوری کو چھوڑتا ہوا چمن سے احتجاج کرتا ہے۔۔۔ امرتا بھی انہی باغی موتیوں میں سے ایک

ہے۔

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم — محبت کا غنائی استعارہ

کالجوں، اسکولوں میں منعقد ہونے والے پنجابی ٹاکروں کے آغاز یا اختتام پر امرتا پر یتیم کی یہ نظم اک لازمہ سا ہو گئی ہے۔

”آج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبر اں وچوں بول“

یہ اشعار اتنے تواتر اور اتنی مدت سے تقریروں کی زینت بنتے چلے آ رہے ہیں کہ لگتا ہے آخرا یک روز وارث شاہ تنگ آ کر قبر اں وچوں بول ہی پڑیں گے۔ وارث شاہ کو بولنے پر مجبور کرنے والی امرتا پر یتیم کہتی ہیں کہ اُن کی زندگی کے حالات و واقعات تو بس رسیدی نکت جتنی وسعت اور تنوع رکھتے ہیں لیکن اُن کی تخلیقی زندگی کی جہتیں اُسی قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں، لیکن میری وسعت و نگاہ اُن کی ایک جہت افسانہ نگاری تک ہی محدود ہے۔

امرتا ایک شاعرہ ہیں۔ شاید اسی لیے اُن کا افسانہ بھی اکسد ابہار گیت ہے لیکن طریبیہ نہیں غنائی ہے۔ ایسا غنائیہ جو سماعتوں میں رس گھولتا اور دل و ذوق میں اسرار بھری آسودگی اُنڈھلتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے اطوار زندگی اور فطرت میں عجب ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ اس لیے اُن کی تخلیق کی آئینج جہتوں، جذبوں اور فطرتوں کو آئینہ سا نکھار دیتی ہے۔ اُس کی تخلیق سچ کی مناس ہے جس کی کڑواہٹ وہ محبت کے دو بول سے چن لینے کا فن جانتی ہے۔ یہ تمغیاں شئی کی وہ ہوک ہیں، جو سمندر کے وجود میں پارو کی یاد بن کر سد ابھتی رہتی ہے۔ ”وے میں بھل گئی موڑتے آ کے اک سیٹی مار مترا“ اُس نے افسانہ دل والی بولی میں لکھا ہے۔ یہ حکایت دل ہر افسانے کا مرکز نقطہ ہے۔ سماج ظالم ہے۔ رسوم و رواج کی جکڑ بندیاں اور معاشرتی نا انصافیاں کڑی ہیں۔ جس کی سیاہ روی کوری ہانڈی کو سیاہ بھوتنی بنا دیتے ہیں لیکن اُس کے کورے بدن کی کالک کو نرم ہاتھوں سے

کھرچ مانجھ کر صاف کرنے والا منکا بہر حال موجود رہتا ہے، جو کہتا ہے ”اب میں اسے دھو کر ہانڈی بنالوں گا۔  
ماں جواب دیتی ہے مگر اُس کو جادو کیا ہوا ہے۔ ابھی میں اس کا جادو اتار دوں گا۔ جادو کہاں ہے۔ صرف کالک  
تھوپی ہوئی ہے۔ میں ساری کالک اتار دوں گا۔“ منکے کے جواب میں امرتا کا فلسفہ حیات پوشیدہ ہے۔

امرتا کے افسانے میں محبت نارسانہیں ہے اور دل کی حاکمیت کے سامنے ہر طاقت پسپا ہے لیکن نہ  
وہ عمر بھر کے ساتھ کی پابند ہے اور نہ ہی جسمانی قربت کی خواہش مند۔ وہ تو پل بھر میں دولتِ دل سے سیر ہوتی  
اور پھر سدا اسی سحر میں مقید رہتی ہے۔ کیونکہ یہ دل والا جام ہے، جس سے من کبھی بھرتا ہی نہیں منت نئے جام  
پینے کا عادی مصور سمیش نندا ایک بار اس دل والے جام کو لبوں سے لگاتا ہے تو پھر عمر بھر وہ ختم ہونے کو ہی نہیں  
آتا۔ کیونکہ ”ایک لڑکی ایک جام“ کی ٹوٹی نے کہا تھا۔

”ایک بار جام بھر لو اور جب تک میرے دل کا یہ جام ختم نہ ہو جائے۔ تب تک کسی اور جام سے  
اپنے ہونٹ نہ لگاتا۔“

سمیش نندا کہتا ہے:

”مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اب تک جتنے جام پیئے تھے وہ اجسام کے جام تھے۔ دل کے جام  
نہیں تھے اگر کوئی ایسا ہوتا تو پھر جب تک اُس کی شراب ختم نہ ہو جاتی تب تک میں کسی دوسرے جام سے منہ نہ  
لگا سکتا۔ شاید دل کے جام کی شراب کبھی ختم نہ ہوتی۔“

یہ دل کے جام کی تاثیر ہی ہے کہ امرتا کے ہاں اک مثبت عمل اک راست رویہ منفی حالات اور  
کرداروں میں بھی جاری رہتا ہے۔ اس جذبہ محبت کو ابھارنے استوار کرنے اور پھر اُس کر دینے والی ذات  
بالعموم عورت کی ذات ہے۔ جس کے اندر سے اُنڈا چھلکتا یہ من کا بھرا پیالہ جنس مخالف کو ایسا ذاتِ عقد عطا کرتا ہے  
کہ پھر عمر بھر اس الوہی ذاتِ عقد کو نہ بھلا پاتا ہے اور نہ ہی مل من مزید کی طلب کرتا ہے۔ کیا زندگی اتنی ہی محبت  
بھری اتنی ہی شانت ہے جتنی امرتا پیش کرتی ہیں۔

تہہ سے بھی حسین ہیں غم روزگار کے

جیسے فلسفے کا کہیں گزر کیوں نہیں ہوتا۔ امرتا کا ماحول اور معاشرہ بھی تو یہی کھنور سماج ہے۔ جیسا ہمارا  
اُس کے گرد بسنے والے انسان بھی تو ایسے ہی دو غلے اور بددیانت ہیں جیسے ہمارے گرد لیکن فرق یہ ہے کہ امرتا

ان خرابیوں کو دست پناہ سے چین چین کر نہیں دکھاتیں۔ معاشرے کے ناسور دھوپ میں ڈال کر ان کی سزا اند سے نفرت پیدا نہیں کرتیں۔ ہم جن کو زخموں کو چھتے اور ان کی غلاظتیں دکھا دکھا کر داد چاہتے ہیں کہ کیسے بد بودار زخموں کی ہم نے چیز پھاڑ کی ہے۔ امرتا کا رویہ ان کے لیے بھی ماں دھرتی جیسی پوشیدگی اور شفقت کا ہے جو اپنے تھوڑ جیسے بچے کو بھی اپنی کوکھ میں رکھ لیتی ہے۔ امرتا اگر کوئی منفی کردار دکھاتی بھی ہے تو اس کے مقابل کھڑے معصوم شانت اور مثبت کردار کا رنگ اتنا چوکھا ہوتا ہے کہ برائی کی سیاہ سطح ابھرنے نہیں پاتی۔ اُس پر کئی لال گلابی پھول کھل آتے ہیں۔ امرتا اچھے برے کا موازنہ نہیں کرتی نہ اچھائی کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتی ہے۔ نہ برائی سے نفرت پیدا کرنے کو موازنے کی تکنیک اپناتی ہے۔ وہ تو بس دل والا راگ چھیڑ دیتی ہے۔ جس کی تاثیر اور آہنگ میں سب پایاب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ”یہاں انھوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈا تھا۔ انھیں لگا جیسے ہر ایک پتھر آج دیوتا بن آ گیا ہے اور انھوں نے پھولوں سے بھری مٹھیاں چاروں طرف بکھیر دیں جو کچھ انھوں نے ایک دوسرے سے حاصل کیا تھا تو نہ اُس سے مزید حاصل کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی حاصل کیا ہوا گم ہو سکتا تھا۔ اس لیے پھر راج اور الگ کبھی نہ ملے۔“ امرتا کا بنیادی فلسفہ اثبات اور استغنا کا ہے۔ زیادہ کی ہوس اور حصول کی خواہش پر اس جذبے یا فلسفے کی پاسداری مقدم ہے۔ اس لیے تو اس کی محرومیاں بھی حزن نہ جیسا سزا دیتی ہیں۔ مجھے کبھی لگتا ہے کہ امرتا کی کہانی وہ تعویذ ہے جسے محبت کرنے والے منڈھا کر گلے میں پہن سکتے ہیں یہ تعویذ چھوٹی سی پڑیا میں سما سکتا ہے اور پوری زندگی کو خود میں سمو سکتا ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ منفی رویوں کے خلاف کہیں غصہ کہیں جھنجھلاہٹ کیوں نہیں ابھرتی؟ نہ مصنفہ میں نہ متاثرہ کرداروں میں ”ہیرے کی کٹی کی جند داس کا جواب دیتی ہے۔ اپنی موت کے محرک پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔

”تم کہتی تھیں نا کہ تمہارا بیٹا ہیرے کی کٹی ہے۔ میں نے وہی ہیرے کی کٹی کھالی ہے۔“

ہیرے کی کٹی نکلتے ہوئے نہ جندو کے لبوں پر شکوہ ہے اور نہ ہی مصنفہ اعصاب شکن کرب ناک منظر چینٹ کرتی ہے۔ امرتا کے ہاں ہرزہ ہر کا تر یا ق محبت ہے۔ یہ محبت نہ مشتعل ہوتی ہے نہ انتقام پر اُترتی ہے۔ امرتا کے حوصلے اور بڑے دل پر بعض اوقات تو حیرت ہوتی ہے وہ سب کچھ خود میں سمو لیتی ہے اور بس۔ ایک ہی احساس کشید کرتی ہے۔ احساس محبت۔

کیونکہ امرتا کا بنیادی فلسفہ اثبات، محبت اور استغنا کا فلسفہ ہے۔ وہ حادثے کی شدت یا واقعات کی پیچیدگی میں نہیں الجھتی بلکہ روزمرہ کے معمولات اور بنیادی انسانی فطرتوں اور جذباتوں سے وہ افسانے کا

تاروپود بناتی ہے۔ نہ تو منہ کی طرح لرزادینے والے انجام سے حیرت زدہ کرتی ہے نہ بیدی کی طرح تلخی حیات کو گھول کر افسردہ بناتی ہے، نہ عصمت کی طرح اندر کے راز باہر نکال کر انسانی جہتوں سے ہمیں شرمسار کرتی ہے۔ نہ علامتوں کا پردہ اور نہ ایمانوں کا اسرار۔ اُس کی ہر کہانی محبت کے راست رویوں کی کہانی ہے لیکن کسی کا انجام وصل نہیں ہے جس سے جسمانی ملاپ ہے۔ اُس سے دل نہیں ملتا اور جس کے سنگ دل دھڑکتا ہے وہاں بدن کبھی ٹھل نہیں ہوتا۔ یہ فلسفہ امرتا کے افسانوں کی مضبوط اکائی ہے۔ عموماً ہیروئین اور کبھی کبھی ہیرو جہاں جسمانی طور پر رستے بستے ہیں وہاں اپنے فرائض پر قربان ہیں لیکن چپکے چپکے اک من مندر الگ بسا رکھا ہے اور اسی من مندر کی حکایت ہی کہانی کا اصل تھیم ہے۔ من مندر کی اقلیم وسیع سی لیکن تنوع نہیں رکھتی یہ کمی امرتا اپنے خوبصورت اسلوب سے پوری کرتی ہیں۔ لفظوں کو ایسے چنتی اور افسانے میں پروتی ہے جیسے موسیقی میں لڑک جو افسانے کی تکنیک پر بیجتے ہیں۔ یہ ایسی مصنفہ ہے جو لفظوں کی بندش میں کھلتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے فلسفے اور دانش کے اسرار بھر دیتی ہے۔ اس کے فن کی کلید یہی دانش افروز نپے تلے جملے ہیں۔ واضح صاف لیکن پرتاثیر اور منفرد کہ نوک دل سے لکھے گئے ہیں۔ مندر کی پچارن کے اشلوک کہ برہا کی ماری کے گیت۔ لیکن غزل کے عاشق جیسی بے صبری اور کم ہمتی ہرگز نہیں ہے۔

امرتا اک الگ طرز حیات اور منفرد طرز بیان کی افسانہ نگار ہے۔ طرز حیات میں اُس کا طرز اثر محبت، استغنا اور متاع سرمایہ دل ہے تو طرز بیان میں انہی زمینوں کے خدوخال نکھارنے کو ایسی کشیدہ کاری اور مصوری کہ لفظوں کے دل بھی دھڑکنے لگیں۔

امرتا معمولی مٹی کو خدا بنا دینے کا فن جانتی ہے۔ بس اسی فلسفے کو اُس نے رُخ اور زاویے بدل بدل کر لکھا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی مغنیہ محبت کا کوئی گیت اپنی ہے تو سماعتیں مسرور اور دل مسرور ہو جاتے ہیں۔ امرتا کا افسانہ بھی اسی بحر اور طمانیت سے بھرا ہے۔



## امرتا پر یتیم، ایک زندہ لپٹ

نقاد شاعر اور میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر سید شبیر الحسن نے ایک سوالنامہ پچھلے دنوں بھیجا تھا جس میں مضافاتی ادیبوں کی کارگزاری کے بارے میں پوچھا گیا تھا، نیز یہ بھی کہ کیا میں اس اصطلاح سے اتفاق کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں ان سے اتفاق نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ براہ راست ادیبوں کو خانوں میں بانٹنے والی بات ہے جس سے یہ بھی شبہ گزرتا ہے کہ آپ مضافات میں رہنے والے ادیبوں کو شہری ادیبوں کے مقابلے میں ”پینڈ“ ادیب سمجھتے ہیں جو کہ بعض ادیبوں کے نزدیک اشتعال انگیز بھی ہو سکتا ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی ادیبوں کو تقسیم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں مثلاً پاکستانی ادب اور بھارتی ادب کا نام دے کر۔ کار خیر سرانجام دیا گیا ہے حتیٰ کہ ہمارے دوست ڈاکٹر انیس ناگی نے تو ”پاکستانی اردو ادب کی تاریخ“ کے نام سے پوری ایک کتاب لکھ ماری جس پر ڈاکٹر گوپلی چند نارنگ نے ایک محفل میں ان کے ساتھ ہاتھ ملانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ آپ ایک متعصب ادیب ہیں۔ اس کتاب میں زبان و بیان اور صرف و نحو کی کم و بیش 150 غلطیاں تھیں جن کی میں نے مثالیں دے دے کر نشانہ ہی کی تھی اور مجھے کہنا پڑا کہ ڈاکٹر انیس ناگی کو کم از کم اردو تو سیکھ لینی چاہیے!

واضح رہے کہ ادب کا تعلق ملک یا علاقے سے نہیں بلکہ اس زبان سے ہوتا ہے جس میں وہ تخلیق کیا گیا ہو۔ چنانچہ اردو ادب خواہ بھارت پاکستان یا دنیا کے کسی بھی ایسے علاقے میں تخلیق کیا گیا ہو جہاں یہ زبان بولی پڑھی یا لکھی جاتی ہو وہ اردو ادب ہی کہلائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود اردو ایسی زبان ہے جس نے یہ تفریق اور تقسیم ختم کر دی ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی اہلیت اور پوری پوری گنجائش موجود ہے کیوں کہ اس کی ابتداء اور ہیئت کدائی ہی ایسی ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی کو چھوڑ کر دنیا بھر میں اسے

راجپٹ کی غالباً سب سے بڑی زبان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

چنانچہ اس حوالے سے شمس الرحمن فاروقی 'ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' قرۃ العین حیدر بلونت سنگھ 'کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی کو بھارتی ادیب نہیں کہا جاسکتا جبکہ فیض احمد فیض 'منیر نیازی' منو' شوکت صدیقی اور انتظار حسین کو پاکستانی ادیب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ان کی بنیاد ایک ہے اور وہ اردو زبان ہے۔ ادب کی کوئی سرحدیں نہیں ہوتیں نہ ہی اسے مختلف علاقوں اور زمینوں میں محدود کیا جاسکتا ہے۔ اور دنیا جس تیزی سے سمٹ رہی ہے اس حساب سے تو یہ امتیازات ویسے بھی باقی نہیں رہ سکتے۔

بلکہ اکادمی ادبیات نے تو اس سے بھی دو قدم آگے جا کر یہ انقلابی اقدام اٹھایا ہے کہ پنجابی کی ایک ادیب کو یہ اعزاز دیا ہے بلکہ یہ اعزاز خود بھی حاصل کیا ہے کہ امرتا پریتم نمبر نکالنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے حالانکہ "ادبیات" میں صرف اردو کی تحریریں جگہ پاتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے تراجم شائع کر دیے جاتے ہیں جنہیں فخر زمان، بجاطور پر قومی زبانیں قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک جواز یہ بھی رہا کہ پنجابی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی بھی زبان ہے اور مشرقی پنجاب کی بھی۔

جہاں تک "مضافاتی" ادیبوں کا تعلق ہے تو آخر ان ادیبوں کو کیا نام دیا جائے گا جنہوں نے اپنی ابتدا تو کسی مضافاتی علاقے سے کی اور اپنے ادب کا بیشتر حصہ بھی وہیں تخلیق کیا لیکن بعد میں بڑے یا مرکزی شہروں میں شفٹ ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ان کا وہ ادب مضافاتی شمار ہوگا جو مضافات میں تخلیق کیا گیا اور بعد ازاں یعنی شہروں میں آ کر تخلیق ہونے والا ادب مضافاتی نہیں رہے گا اور شہری قرار پائے گا اور ایسا ادیب بھی آدھا تیر اور آدھا نیر بن کر رہ جائے گا۔

شروع شروع میں میرا تعارف امرتا پریتم کے ساتھ اس حوالے سے ہوا تھا کہ اس وقت کے مشہور شاعر ساحر لدھیانوی اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتے تھے۔ ادھر ہمارے ایک مقبول پنجابی شاعر احمد راہی کا بھی یہی حال تھا جنہوں نے اپنی وہ خوبصورت نظم لکھی جس کا پہلا مصرع یہ تھا۔

اک لغراں جیہی نیار گوی جیدہا منڈیاں ورگاناں

لیکن افسوس کہ اس نے مصداق روز کے ساتھ گھر بسالیا اور یہ دونوں دیکھتے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک زمانے میں منیر نیازی قرۃ العین حیدر کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن مرحومہ نے پوری



زندگی کنوار پن میں گزار دی۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں مختلف افسانے مشہور ہیں کہ مثلاً وہ تدمرازج تھیں اور ہما دشا سے ملنے سے انکار کر دیتی تھیں جبکہ بعض ادیبوں کے نزدیک وہ انتہائی ملنسار واقع ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں پاکستان بھی آئیں اور ریڈیو کے علاوہ مختلف جگہوں پر ملازمت بھی کی اور یہاں ان کا مستقل قیام کا ارادہ بھی تھا جو انہیں بعد میں تبدیل کرنا پڑا اور وہ واپس بھارت سدھار گئیں۔ بہر حال امرتا پریم کے بعد وہ بھارت کی دوسری خاتون تھیں جنہیں بے پناہ عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔

میں گورکھی سکرپٹ نہیں پڑھ سکتا اس لیے امرتا کی بعض شاہ کھسی میں اتاری گئی تحریریں ہی میری نظر سے گزری ہیں۔ زبردست اور انقلابی شاعرہ تو وہ تھیں ہی انہوں نے فنِ افسانہ نگاری کو بھی نقطہء کمال تک پہنچا دیا۔ واضح رہے کہ وہ کوئی ایسی شدت پسند انقلابی یا محزمتی شاعرہ نہیں تھیں بلکہ ان کی شاعری میں وہ لوحِ تاثیر اور تازگی بھی دستیاب ہے جس کی مثال صرف فیض احمد فیض سے دی جاسکتی ہے جبکہ سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر ان کے فن کا دل کھول کر اعتراف کیا گیا۔ انہیں بلاشبہ ایک زندہ لچنڈ کا درجہ حاصل تھا اور رہے گا۔ حتیٰ کہ ’’اج آکھاں وارث شاہ نوں‘‘ جیسی لازوال نظم ہی انہیں تادیر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

اگرچہ بلونت سنگھ، کرتار سنگھ دگل اور راجندر سنگھ بیدی بھی پنجابی ہیں لیکن ہمارا دل ان کے لیے اس طرح نہیں دھڑکتا جس طرح امرتا پریم کے لیے دھڑکتا ہے کیوں کہ وہ پنجابی زبان کی شاعرہ ہے اور زبان کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے بزرگ تو قبل از تقسیم ضلع اوکاڑہ میں آباد تھے جہاں چک بیدیاں کے نام سے ان لوگوں کا گاؤں اب بھی موجود ہے۔ پھر اہل پنجاب کے ساتھ ہمارے اور رشتے بھی ہیں۔ مثلاً ہماری ثقافت ہمارے گیت اور بولیاں تک ایک ہیں نیز سکھ طبقہ ہماری ہی طرح سے توحید پرست بھی ہے۔

ہمارے ایک بزرگ اور ایک قومی روزنامہ کے ایڈیٹر نے اگلے روز کہا تھا کہ بہت جلد بنگلہ دیش پاکستان سے آ ملے گا۔ بنگلہ دیش کا تو میں کہہ نہیں سکتا البتہ شرقی پنجاب زیادہ دیر تک مغربی پنجاب کے بغیر شاید ہی رہ سکے کیوں کہ ثقافتی اشتراک کے علاوہ سکھوں کے مقدس مقامات جن میں نکانہ صاحب بطور خاص شامل ہے، مغربی پنجاب میں واقع ہیں۔ میں خود ذاتی طور پر کنفیڈریشن کے نظریے میں یقین رکھتا ہوں اور بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان اور ترکی وغیرہ کی یکجائی کا حامی ہوں لیکن خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔

چنانچہ امرتا پریم کے ساتھ ہماری ادبی جرئت کی بڑی وجہ ماں بولی بھی ہے جو دونوں جگہوں پر مشترک



ہے۔ یہ دونوں حصے جذباتی طور پر مزید قریب ہو سکتے تھے لیکن گورکھی رسم الخط ہمیشہ سے اس کے آڑے چلا آ رہا ہے جب کہ اہل مشرقی پنجاب کے لوگوں کے لیے شاہ مکھی رسم الخط اتنا ہی آسان ہے جتنا مشکل ہم لوگوں کے لیے گورکھی سکرپٹ ہے کیوں کہ اردو کے ساتھ معمولی شناسائی رکھنے والا شاہ مکھی کے حوالے سے کسی وقت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے لیکن کوئی ٹھوس نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔

اگر یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح سے سر ہو جائے تو مشرقی پنجاب کا پنجابی ادب کم و بیش سارے کا سارا اہل مغربی پنجاب کی دسترس میں آ سکتا ہے جس سے ہر قسم کی دوریوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور یہ دونوں خطے الگ الگ رہتے ہوئے بھی ذہنی اور رائے لکچول سطح پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ سکتے ہیں۔

امرتا پر تہم سرحد پار سے غالباً واحد ادیب ہیں جن کی وفات پر ہمارے ہاں بھی پورا سوگ منایا گیا جیسے واقعی کوئی اپنا مر گیا ہو۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے لاہور میں منعقدہ ادبی ریفرنس اس سلسلے کی سب سے زوردار تقریب تھی۔ انگریزی 'اردو اور پنجابی اخبارات و رسائل نے کھل کر انہیں نذرانہ محبت پیش کیا۔ مضمون باندھے گئے، کالم لکھے گئے اور ان کی یاد میں نظمیں لکھی گئی۔ اپنائیت کا یہ ایک بہت بڑا مظاہرہ تھا۔

امرتا ایک عجیب اور عظیم خاتون تھیں۔ پروفیسر افضل تو صیف ایک جگہ لکھتی ہیں کہ طویل علالت کے آخری دنوں میں ایک نوجوان کہیں سے انہیں ملنے کے لیے آیا۔ امرتائے اُسے اندر بلا لیا، بٹھایا، نام پتہ اور حال چال پوچھا اور بولیں:

”کیسے آتا ہوا؟“

”مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ یہ سن کر امرتا بند پر سے انہیں اس کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ ”مجھے بھی تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میرے صحبت نہیں رہی

”برکی“ جیسی نظم اور ”رسیدی ٹکٹ“ جیسا افسانہ لکھنے والی امرتا پر تہم اب بھی ہمارے درمیان موجود

ہیں۔ ایسے لازوال لوگ، ہر کربھی مرا نہیں کرتے بلکہ اپنے محبت کرنے والوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

رہنمہ دے لے ناز دل ما

## ایک ملاقات

ستمبر 1965 کی جنگ جو پنجاب کی سرحد پر اچانک پھوٹ پڑی تھی عام لوگوں کو اپنا گھر بار مال اسباب سب چھوڑ چھاڑ کر نکلنا پڑا تھا۔ جنگی علاقے سے دور کہیں پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ جنگ کے بارے میں خبریں بہت خوفناک آرہی تھیں۔ دونوں طرف کے لوگ مر رہے تھے۔ اپناج ہو رہے تھے۔ کئی ایہوں سے بچھڑ گئے تھے۔

اُن سرحدی علاقوں کے لوگوں میں سے کچھ ہمارے گاؤں میں بھی اپنے رشتے داروں کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اُن پناہ گزینوں میں ایک بابا سراج دین بھی تھا جس نے 1947 کی قتل و غارت اور توہین انسانیت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی تھی اور آج تک خوفزدہ سادکھائی دیتا تھا جب سراج دین سے میری ملاقات ہوئی تو وہ درد بھری آواز میں

”اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبر اں وچوں بول“

بول رہا تھا۔ میں نے پہلی بار یہ نظم سنی تو میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ پھر بابا سراج دین کی زبان سے نظم کی ادائیگی۔۔۔ ایک ایک لفظ کے معنی واضح ہوتے چلے گئے۔ جنگ ختم ہو گئی۔۔۔ بابا سراج دین اپنے کتبے کے ساتھ واپس چلا گیا۔ لیکن میرے لیے درد کی کک چھوڑ گیا۔۔۔ جب بھی میں بابا سراج سے سنی ہوئی نظم جو مجھے ازبر ہو چکی تھی دہراتا تو میری عجیب کیفیت ہو جاتی۔

نظم کے خالق کو میں ملنا چاہتا تھا۔ مگر نہ تو بابا سراج کو نظم کے خالق کے بارے میں معلوم تھا اور نہ مجھے۔۔۔ شاعر سے ملاقات کا شوق میرے اندر پلتا رہا۔ بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ نظم کا خالق مرد نہیں عورت ہے امرتاپریتم۔۔۔ جو اسی پنجاب کے رہنے والی تھی اور اب دہلی میں ہے۔

میرے لیے حیرانی کی بات تھی کہ ایک عورت نے اس سطح کی لطم کھی ہے۔ یہ عورت نہیں پنجاب کی رُوح ہے جو صدیوں سے زخمی ہے نفٹ رہی ہے اور چین کر رہی ہے۔۔۔ امرتا پر تہم جی کے لیے میرے دل میں اور بھی احترام پیدا ہوا اور ملنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔

بلیھے شاہ نے بھی پنجاب کے لئے اور بربادی پر بین کیے تھے

|        |       |      |           |
|--------|-------|------|-----------|
| دا     | عذاب  | حشر  | درکھلا    |
| دا     | پنجاب | ہویا | نہال      |
| ماریا  |       | دورخ | دورباوینے |
| پیاریا | یار   | آمل  | سانوں     |

پنجاب کے وارث شاہ نے ہیر (جو پنجاب کی رُوح ہے) کو علامت بنا کر پنجاب کے دکھ درد کو ایسے بیان کیا کہ اہل درد کو بخمبھوڑ کر رکھ دیا۔ امرتا پر تہم جی نے جو وارث شاہ کو پکار تے وقت "بین" ڈالے ہیں۔ اس سے اُس نے اپنے آپ کو پنجاب کی جچی بنی ثابت کر دیا۔

بلیھے شاہ اور وارث شاہ کی طرح پنجاب کے دکھ درد پر آپ بھی روئی ہے اور اہل درد کو بھی تڑپایا ہے۔

پنجاب کی اس جچی بنی کو ملنے کے لیے میں بے تاب ہوں لیکن کوئی چارہ نہیں۔ دلی جاؤں تو جاؤں کس طرح۔۔۔ آخر مارچ 1985 کو مجھے اپنے دو دوستوں کے ساتھ دلی جانے کا موقع مل ہی گیا۔۔۔

اوائل عمر کا شوق اب کچی عمر میں پورا ہونے جا رہا تھا۔۔۔ میرے دوست تو دلی دیکھنے اور سیر و تفریح کرنے جا رہے تھے مگر میں پنجاب کی جچی بنی کے درشن کرنے۔

امرتا پر تہم جی میں اور تحریریں بھی پڑھ چکا تھا جو اُدھر اردو میں چھپتی رہتی تھیں۔ دلی پہنچتے ہی میں امرتا پر تہم جی سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر دوستوں نے سمجھایا کہ پہلے ضروری قانونی تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔ تھانے جا کر اپنی آمد درج کروانا ہوگی۔ سب سے پہلے کہیں ٹھہرنے کا انتظام کرنا ہوگا۔۔۔ اگلے دن تھانے میں اپنی آمد درج کروائی اور دوستوں نے سیر و تفریح کا پروگرام بنالیا، لیکن میری حالت تو۔۔۔ پیر میر علی شاہ والی تھی

اب سبک بٹراں دی دھیری اسے

امرتا پر تہم جی کو فون کیا اور کہا میں لاہور سے آیا ہوں اور آپ کے درشن کے لیے دلی پہنچا

ہوں۔۔۔ مسکراتی آواز میں جواب ملا۔۔۔ ”آ جاؤ۔۔۔ میں گھرای آں“ اجازت ملتے ہی میں نے دیر بھی نہ لگائی اور حوض خاص پہنچ گیا۔ امرتا پر یتیم جی بہت محبت سے ملیں۔ امروز سے تعارف کروایا۔۔۔ باتیں شروع ہوئیں تو پھر ہوتی چلی گئیں۔ زبان وادب کے بارے میں ٹاہور کے بارے میں۔۔۔ باتوں باتوں میں بھی میں نے کہا۔۔۔ کہ پنجاب کی دھرتی صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کے پاؤں تلے ہے جو میں حملہ آور آیا اُس نے پنجاب کی رُوح کو کچلنے ختم کرنے کی کوشش کی ہے پنجاب کی زمین زخم زخم ہوئی مگر اس کی رُوح ابھی زندہ ہے جس کا ثبوت آپ کی نظم ہے جس میں امرتا پر یتیم ہی پنجاب کی زخمی رُوح ”مین“ ڈال رہی ہے۔

میری اس بات پر امرتا پر یتیم نے چند لمحے مجھے غور سے دیکھا اور کہا:

”ہائیں دے توں کون ایں اپنا پورا تعارف تے کروا ایہہ گل کتھوں کڈھ لیا یا ایں۔“

پھر میں نے اپنا تعارف استاد دامن کے حوالے سے کروایا۔۔۔ تو امرتا جی استاد دامن کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ اُن کے کہنے کے مطابق استاد دامن عشق درگاہ کے شاعر تھے۔۔۔ استاد دامن کے بارے میں انہوں نے بہت سوال کیے اُن کی زندگی کے بارے میں بہت پوچھا۔

پنجابی کے دوسرے ادیبوں سے زیادہ باتیں استاد دامن کے بارے میں ہی ہوتی رہیں۔ اس دوران جو امرتا پر یتیم جی کی طرف سے خلوص محبت اور مسکراہٹیں مجھے ملیں میں ان سے متاثر ہوا۔۔۔ میرے دوستوں کے تو کئی اور پردگراں تھے۔۔۔ وہ آگرہ جانا چاہتے تھے مگر میرا دل تو دل کے حوض خاص میں ہی رہنے کو کر رہا تھا۔۔۔ امرتا پر یتیم جی نے بہت اصرار اور مان سے کہا کہ

”توں اتھے ای رہیو میرے کول‘ مہینہ دو مہینے‘ دیند بڑھالیتے ہیں۔ استاد دامن کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مجھے لکھ کر دے۔ میں استاد دامن کے بارے میں بہت کچھ اپنے رسالے ”ناگ منی“ میں چھاپنا چاہتی ہوں۔

افسوس میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے فیکٹری سے صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی۔ میں ان کے پاس نہ رکنے پر بار بار معافی مانگ رہا تھا۔۔۔ اور پھر دوبارہ آکر زیادہ دن رہنے کا وعدہ کر کے آیا۔ شاید میری قسمت میں دوبارہ جانا نہیں تھا میں نہ جاسکا مگر اُن کی باتوں سے مجھے استاد دامن کے بارے میں ایک ناول لکھنے کا حوصلہ ملا جو ”بھیل“ کے رُوپ میں چھپا تو میں نے بہت معذرت کے ساتھ امرتا پر یتیم کو ناول بھیج کر لکھا۔

شرمندہ ہوں دوبارہ نہیں آ سکا۔ مگر اس ہوں صرف ایک ملاقات ہی ہو سکتی ہے پنجاب کی چچی بیٹی

آج بہت یاد آتی ہے۔

قاضی جاوید

## امروز

سارک ادیبوں اور ادب کی فاؤنڈیشن کی طرف سے تصوف اور اس کے فلسفہ اور شاعری کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس 20 مارچ 2006 کو نئی دہلی کے انٹرنیشنل سنٹر کے لان میں شام کی چائے کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ دوسرے دن پاکستان اور بنگلہ دیش کے مندوبین ریل کے ذریعے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجیر ٹی کے مزار شریف پر حاضری دینے کے لیے اجیر شریف جانے والے تھے۔ ایران، افغانستان، ترکی، ازبکستان اور اٹلی وغیرہ سے آنے والوں کو شاید اس دورے میں دلچسپی نہ تھی۔ خیر میں نے سوچا کہ اجیر میں وہی تکلیف دہ مناظر ہوں گے جو میں نے گزشتہ شام دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے اندر اور باہر دیکھے تھے۔ اس لیے وہاں نہ جانا ہی بہتر ہوگا۔

یہ درگاہ نئی دہلی کی بستی نظام الدین میں واقع ہے۔ یہ درجنوں تنگ و تاریک میڑھی میڑھی اور بے حد غلیظ گلیوں پر مشتمل مسلم اکثریت کی آبادی ہے جس کے کم و بیش سبھی مکین بھکاری ہیں۔ ایسی بستی میں حضرت امیر خسرو اور مرزا غالب سمیت کئی ممتاز ہستیاں پیوند خاک ہیں۔

آٹھ صدیوں سے پورے ہندوستان سے ان علاقوں سے بھی جواب پاکستان اور بنگلہ دیش میں شامل ہیں ہر روز سینکڑوں لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر آتے ہیں۔ ان میں مسلمان ہوتے ہیں اور ہندو بھی اور وہ ہزاروں لاکھوں کے نہ رانے پیش کرتے ہیں۔ یہ ساری رقم کہاں جاتی ہے؟

درگاہ کے سجادہ نشینوں، متولیوں اور کارندوں نے ان صدیوں میں یہاں کوئی ادارہ نہیں بنایا، کوئی شائستہ بندوبست نہیں کیا، زندگی میں کوئی خوبصورتی، کوئی ترتیب اور کوئی تہذیب پیدا نہیں کی۔ بس بھیک منگے پیدا کیے ہیں جو ہر آنے جانے والوں کو اپنی لغو فریادوں اور دعاؤں سے گھیر لیتے ہیں۔

اس ہستی کو جنوبی ایشیاء کی مثالی ہستی ہونا چاہیے تھا مگر آپ اس کو ہمارے خطے کی سب سے گندی ہستیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ وہاں کے مکین بھی نہ صرف ذہنی اعتبار سے بلکہ شکل و صورت لباس رہن سہن اور گفتگو کے لحاظ سے بھی تاریک صدیوں کے شہری محسوس ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ ہے وہ کلچر جو تصوف نے پیدا کیا ہے؟

اس قسم کے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ میں نے سگریٹ سٹلکا پا اور راج گھاٹ کے انٹرنیشنل گیٹ باؤس کے لائنچ میں رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈنر کے بعد ہم لوگ یہاں پہنچے۔ مادام افضل تو صیف پانی کی بوتل کی تلاش میں وہیں آگئیں۔

”آپ صبح اجیر جا رہی ہیں؟“ میں نے ان سے پوچھا۔ گزشتہ روز سے وہ مجاوروں سے خوش نہ تھیں۔ ہوا یہ کہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے سجادہ نشین خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب نے تصوف کانفرنس کے مندوبین کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کھانے سے پہلے ’خواجہ ہال‘ میں صوفیانہ موسیقی کا پروگرام ہوا اور پھر ہم کو درگاہ پر لے جایا گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواتین کو حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کے مزار کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ باقی خواتین تو یہ جان کر چپ رہیں اور باہر سے ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے لیکن مادام افضل تو صیف کو آپ جانتے ہیں۔ وہ بے انصافی اور اونچ نیچ کے خلاف احتجاج کیے بغیر بغیر نہیں رہتیں۔

”نہیں۔۔۔ میں اجیر شریف نہیں جاؤں گی“ مادام نے جواب دیا۔

”میرا ارادہ بھی نہیں ہے“ میں نے ان کو بتایا۔

میں تو کل صبح امرتاجی کی تعزیت کے لیے ان کے گھر جاؤں گی اور شاید ایک دن وہیں رہوں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ امرتا پریم پاکستانی ادیبوں میں سب سے زیادہ افضل تو صیف کو چاہتی تھیں۔ لہذا ممکن نہ تھا کہ وہ دہلی آئیں اور امرتا پریم کی تعزیت کے لیے نہ جائیں۔ کل دوپہر کو پٹیلہ یونیورسٹی کے رجسٹرار مادام افضل تو صیف سے ملنے آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مادام کے پاس امرتا پریم کے جو خطوط تصاویر اور دوسری چیزیں ہیں وہ ان کی یونیورسٹی میں قائم ہونے والے امرتا پریم میوزیم کے لیے دی جائیں۔ ایسا ہی میوزیم امرتسر کی گورونامک یونیورسٹی بھی بنا رہی ہے۔ اس نے بھی اس سلسلے میں مادام افضل تو صیف سے رابطہ کر رکھا ہے۔ یوں وہ ابھمن میں تھیں کہ امرتا پریم کی لمبائیتیں کس کو سونپیں۔

”امرتاجی کے گھر! تو کیا آپ اس پندرہ منٹوں کے لیے مجھے ساتھ نہ لے جائیں گی؟“

دوسرے روز ہم گیسٹ ہاؤس سے صبح دس بجے نکلے۔ یہ گیسٹ ہاؤس مہاتما گاندھی کی سادھی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع و عریض پارک میں واقع ہے۔ پارک کے اس حصے کو ”گاندھی درشن“ کہتے ہیں۔ وہاں مہاتما گاندھی کی یادگاروں کے لیے ایک میوزم بھی بنا ہوا ہے۔ جونہی ہم باہر آئے تو معلوم ہوا کہ پارک کا گیٹ بند ہے۔ بلکہ دیش کی وزیراعظم خالده ضیاء مہاتما گاندھی کی سادھی پر پھول چڑھانے آئی ہوئی تھیں اور سیورٹی کے تقاضوں کے تحت گیٹ بند تھے۔ خیر یہ مرحلہ دس پندرہ منٹوں میں طے ہوا اور ہم رکشہ لے کر نئی دہلی کے متوسط طبقے کی بستی ’حوض خاص‘ K-25 کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ درختوں اور بیلوں میں چھپا ہوا ایک ادا اس سا گھر تھا۔ گیٹ سے گزر کر جب میں نے گھنٹی بجائی تو القاء نے دروازہ کھولا اور مادام سے پٹ کر رونے لگیں۔

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”آئیے۔۔۔ اندر آ جائیے“ میزبان نے دعوت دی۔

”قاضی صاحب‘‘ مادام نے کہا ”یہ امرتاجی کی بہو ہیں۔۔۔ القاء“

”بہت پیارا نام ہے۔ روسی ہے شاید“ میں نے کہا ”اس گھر کے سب لوگ ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہم نے بالائی منزل پر جانا ہے۔ امروز ہم کو وہیں ملیں گے۔“

امروز یہ باتیں سن رہے تھے۔

”ہاں! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا“ امروز نے خوش دلی سے کہا۔ معلوم ہوا کہ مادام نے ان کو مطلع کر دیا تھا۔

ہم راہداری میں کھڑکی کے ساتھ لگی کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ امروز نے بتایا کہ امرتا پر ہمیشہ اس میز پر کھانا کھایا کرتی تھیں۔ بے تکلف دوستوں سے باتیں بھی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

”خوب! بے تکلف دوستوں کا اعزاز ہم کو بھی مل گیا۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور امروز کی طرف دیکھا۔ وہ مصور جس نے پنجابی ادب کی ہزار سالہ تاریخ کی سب سے بڑی شاعرہ کے ساتھ چالیس پینتالیس سال گزارے۔ اس کی سینکڑوں تصویریں بنائیں اور اپنا تعلق یوں نبھایا کہ جہاں امرتا کا نام آتا ہے وہاں اس کا بھی نام لیا جاتا ہے۔



بجائی گرتا) کانفرنس میں شرکت کرنے والے بنگلہ دیش کے پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ زمان مہا نے ہم کو بتایا کہ بنگال میں گرتے کو "بجائی" کہتے ہیں (چتلون اور جوگرز پہنے ہوئے امروز تھوڑی دیر کے بعد مجھے بتانے لگے تھے کہ وہ زندگی کے 80 سال گزار چکے ہیں۔ (وہ امرتا پریم سے چھ سال چھوٹے تھے) دیکھنے میں وہ 65 سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ سادہ شائستہ مہذب اور سراپا محبت اور ہاں بے حد متکسر المزاج بھی۔ انہوں نے خود ہی بات شروع کی

"بچپن میں کوئی میرا نام پوچھتا تو میں جواب میں 'لوک' گیت بتاتا۔ اصل میں لوک گیت کسی کا نہیں ہوتا، مگر سب کا ہوتا ہے۔ ابھی میں دس سال کا ہی تھا کہ والدہ فوت ہو گئیں (امرتا گیارہ سال کی عمر میں والدہ کی شفقت سے محروم ہوئی تھی) مجھے ماں کی تلاش تھی۔ مجھے امرتا مل گئی۔ ہم دونوں مل کر گھنٹوں آوارہ گردی کرتے، سارا وقت اکٹھے گزارتے۔ بہت سا سے بیت گیا۔ تب ایک روز اس نے مجھے کہا کہ ہم دن بھر اکٹھے رہتے ہیں، کیوں نہ اکٹھے ہی رہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض تھا۔ ہم اکٹھے رہنے لگے۔ ان دنوں امرتا اپنے پہلے خاوند سے الگ ہو چکی تھی۔ اصل میں وہ لاہور میں قیام کے زمانے سے ہی اس سے ٹالاں تھی اور طلاق مانگتی تھی۔ ایف سی کالج کا پروفیسر لطیف اس کا دوست تھا۔ امرتا اس کو سب باتیں بتایا کرتی تھی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس سماج میں عورت کا اکیلے رہنا آسان نہیں۔ لہذا پہلے کوئی سہارا ڈھونڈو پھر طلاق لو۔ امرتا نے ساحر (لدھیانوی) کا سہارا لینا چاہا لیکن وہ کمزور آدمی تھا۔ امرتا کو آگے بڑھنا دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔"

امروز کو معلوم تھا کہ جو کوئی ان سے ملنے آتا ہے وہ ان کی اور امرتا کی زندگی کے حالات میں دلچسپی رکھتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ انہوں نے امرتا پریم کے ساتھ لگ بھگ نصف صدی کا عرصہ کیونکر گزارا تھا۔ القاء نے مشروبات سے ہماری تواضع کی تھی۔ وہ میز سے خالی گلاس اٹھانے لگیں تو میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تیس منٹ گزر چکے تھے۔

"خدا یا! میں نے کہا "مجھے اجازت لینی چاہیے۔"  
 مادام افضل تو صیف سے میں نے پندرہ منٹ نمبر نے کی بات کی تھی۔  
 "قاضی جادیہ" امروز نے کہا "کھانے سے پہلے آپ نہیں جاسکتے۔"  
 "ہاں بھائی صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کھانے کے بغیر چلے جائیں۔ میں بیٹاری ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا" یہ القاء کی آواز تھی۔



دونوں کے لیے میں خلوص تھا اپنائیت اور محبت تھی مگر میرے پاس اس شہر میں رہنے کے لیے صرف دو تین دن تھے اور یہ شہر بہت بڑا تھا۔ بہت کچھ تھا وہاں دیکھنے کے لیے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے اٹھوں اور ٹیکسی لے کر سیدھا پرانے شہر کی کسی گلی کی نگر پر اتر جاؤں اور پھر شام تک آوارہ گردی کروں۔ وٹی کی گلیاں دیکھوں۔۔۔ ان کوچوں سے گزروں جو میر صاحب کو اوراق مصور دکھتے تھے اور دوپہر کا کھانا جامع مسجد کے سامنے والی گلی میں واقع 'کریم ہونٹ' میں کھاؤں جس کی دھوم تھی۔ دوسرے دن دوپہر کا کھانا گجرات کے ڈاکٹر اظہر محمود اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد سعید خوجہ کے ساتھ میں نے اسی ہونٹ میں کھایا۔ مگر وہ اپنی شہرت کے برعکس بس یونہی سا تھا۔ البتہ اس سے اگلی رات احسان اکبر احمد سعید بھٹانی اور میں نے جامع مسجد کے دروازے کے سامنے کباب کھائے جو واقعی مزیدار تھے۔ خیر پروگرام اب الٹ پلٹ گیا۔ میں ان نیک روجوں کی بات کیسے نالتا۔ مادام نے بھی اب ان کی تائید کی تھی۔

امروز نے دوبارہ بات شروع کی:

”میں فیصل آباد میں پیدا ہوا تھا اور لاہور کے میو سکول آف آرٹس میں تعلیم پائی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد میرا خاندان امرتسر کے ایک نواحی گاؤں میں آباد ہو گیا۔ یہ گاؤں امرتسر سے پانچ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ جب میں اور امرتا مل کر رہنے لگے تو میں نے اپنے ماں باپ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ میرے جیسے جو آبائی زمین آئی وہ میں نے اپنے بھائیوں کو دے دی تھی۔۔۔ وہ خوش تھے۔ ماں باپ کی تو بات ہی اور ہے۔“

امروز نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے محن میں لگی ہوئی بوگن ویلیا کی دو بیلوں کی شاخیں سامنے کی دیوار سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں دہلی میں گرمی کا ہلکا سا احساس ہونے لگا تھا۔ وہاں کا درجہ حرارت عموماً لاہور سے زیادہ رہتا ہے۔ (مثلاً 14 اپریل کو لاہور میں درجہ حرارت 12 اور 34 درجے سینٹی گریڈ تھا جبکہ دہلی میں 22 اور 37 تھا)

”میرے گھر والے امرتا سے نہ ملے تھے“ امروز نے بات جاری رکھی ”تین چار سال گزر گئے۔ پھر ہم دونوں ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے امرتسر گئے تو میں نے امرتا سے کہا کہ چلو ہم ان لوگوں سے مل آئیں۔ ہم گئے تو وہ سب خوش ہوئے۔ امرتا سب کے دل کو بھائی تھی اور میں تو تھا ہی ان کا لاڈلا۔۔۔ میری وادی زندہ تھی۔ ۱۱ اور ۱۰ سے زیادہ خوش ہوئی۔ کہنے لگی کہ امروز جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔“



تھی۔ پانچ ہزار اس نے ڈالے پانچ ہزار میں نے۔ پر ہم دونوں نے یہ رقم بڑی مشکل سے اکٹھی کی تھی۔“  
 زندگی کے سفر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کے نمایاں مرحلوں کو امروز دل جمعی کے ساتھ بیان کر رہے  
 تھے۔ ظاہر ہے کہ جب محبوب شریک حیات 80 سال کی عمر میں اکیلا چھوڑ جائے تو وہ ناخوشیاں میں جیے گا۔  
 مادام افضل تو صیف نے گزشتہ روز پنیال یونیورسٹی کے رجسٹرار سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا  
 کہ پنیالہ اور امرتسر دونوں شہروں کی یونیورسٹیاں ان سے امرتا پریم کے خطوط تصدیق اور دوسری اشیاء مانگ  
 رہی ہیں، وہ کس کو دیں، کس کو مانگ لیں۔ امروز کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک یونیورسٹی کو اصل چیزیں دے دیں  
 اور دوسری کو نقل فراہم کر دیں۔“

”بس یہی ایک طریقہ ہے دونوں سے نپٹنے کا۔“ انہوں نے کہا تھا۔۔۔ میں نے تائید کر دی۔  
 امروز اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے اور امرتا کی ایک فریم شدہ تصویر لے کر آئے جس پر ان کی مشہور  
 نظم ’’آج آکھاں وارث شاہ نوں‘‘ گورکھی سکر پٹ میں لکھی ہوئی تھی۔ مادام شاید یہ سکر پٹ پڑھ لیتی ہیں۔  
 میں اس معاملے میں بالکل کوراہوں۔ نظم کے چند مصرعے امروز نے پڑھ کر سنائے۔

’’واہ کیا نظم ہے‘‘ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ’’اس نے اپنے خالق کو ابدیت بخش دی ہے۔‘‘  
 ’’ہاں الیکن اس پر اعتراض بھی بہت ہوئے ہیں‘‘ امروز دوبارہ ماضی کی طرف بھاگ رہے تھے۔  
 ’’بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ امرتا نے اس میں صرف چناب کی بات کی ہے، بیاس کا نام کیوں نہیں۔ وہ بھی تو لبو  
 رنگ ہوئی تھی۔ چناب کا نام لے کر امرتا نے غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والے ظلم کی دہائی دی ہے۔  
 مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ظلم بھلا دیا ہے۔ خیر، لوگوں کی باتیں ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ کئی سکھ  
 بھی اس نظم سے خوش نہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ امرتا نے ظلم کی دہائی دینے کے لیے وارث شاہ کو کیوں پکارا  
 ہے۔ گورو نانک جی کو آواز کیوں نہیں دی؟‘‘

’’لوگ کسی بات سے مطمئن نہیں ہوتے۔ یہ نظم جیسی ہے، لا جواب ہے‘‘ مادام نے رائے دی۔  
 ’’امرتا کہتی تھی کہ اب یہ نظم اس کی نہیں رہی، پنجاب کے لوگوں کی ہو گئی ہے۔ ممبئی کے ایک ڈائریکٹر نے  
 امرتا کے ایک ناول پر فلم بنائی تھی۔ ایک دن اس نے فون پر امرتا سے یہ نظم بھی فلم میں شامل کرنے کی اجازت  
 طلب کی اور یہ بھی پوچھا کہ وہ اس کا کتنا معاوضہ لیں گی۔ امرتا نے جواب دیا کہ یہ نظم اب اس کی نہیں رہی،  
 سب کی ہو گئی ہے۔ اور جو شے سب کی ہو اس کا معاوضہ نہیں ہوا کرتا۔ اس فلم میں زہرہ نگاہ کی ایک نظم بھی شامل

ہے۔ اس کے لیے ڈائریکٹر نے زہرہ نگاہ سے رابطہ کیا اور معاوضے کی بات کی۔ زہرہ نگاہ نے جواب دیا کہ یہ فلم امرتاجی کے ناول پر بن رہی ہے۔ میں اس میں اپنی نظم کا کوئی معاوضہ نہ لوں گی۔“

سکھوں کی بات پھر سے ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ سکھ امرتاجی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ پنجاب کی دو یونیورسٹیاں ان کی یادگار بنا رہی ہیں اور ان کے کام کو محفوظ کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو کسی کو مثال کے طور پر فیض صاحب کی کوئی شے محفوظ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

”ٹھیک ہے سکھ امرتا پر فخر کرتے ہیں“ امروز نے جواب دیا۔ وہ خود بھی مومن سکھ ہیں۔

”پہلے لڑتے بھی تھے۔ چالیس سال پہلے جب بابا نانک کا پانچ سو سالہ جنم دن منایا گیا تو انہوں نے امرتا سے اس موقع کے لیے نظم لکھنے کو کہا۔ امرتا نے جواب دیا کہ وہ آرڈر پر نظم نہیں لکھ سکتی مگر پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ اصل میں ان دنوں ہمارا بیٹا (نوراج جس کو گھر میں شیلی کہتے ہیں) برودہ گیا ہوا تھا اور اس نے اپنی خیریت کی اطلاع نہ دی تھی۔ امرتا سخت پریشان تھی۔ بار بار برودہ فون کر رہی تھی۔ وہ تین دن اسی الجھن میں گزر گئے۔ پھر ایک رات نوراج کا فون آ گیا۔ ماں کا لفظ سنتے ہی وہ اچھل پڑی۔ بعد میں کہنے لگی کہ مجھے اپنے بیٹے کا اس قدر خیال ہے تو نانک کی ماں کو کتنا ہوگا۔“

”تب اس نے نوحصوں پر مشتمل نظم لکھی جس میں بابا نانک کے Concieve ہونے سے لے کر ان کی والدہ کے دردزہ تک کی کیفیات بیان ہوئی ہیں مگر سکھوں نے اس نظم کو پسند نہ کیا۔“

”شاید وہ اس نظم کو غیر ضروری طور پر شوخ یا گستاخ سمجھ رہے ہوں گے“ میں نے بات بڑھائی۔

امروز نے بات جاری رکھی۔

”پرانے خیال کے سکھ اب بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امرتا سگریٹ پیتی اور بال کٹواتی تھی۔“

مادام نے یاد دلایا کہ امرتاجی کے والد کے ساتھ بھی ایک مرتبہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔

”ہاں“ امروز کو نیا موضوع مل گیا۔ ”وہ مشہور واقعہ ہے۔ اصل میں امرتا کے پتا جی سکھ مبلغ تھے اور سلائیڈز کے ذریعے بابا نانک کی زندگی اور فکر کی تعلیمات بتایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ ننھی امرتا کو ساتھ لے کر ایک گوردوارے میں گئے اور سلائیڈیں دکھا رہے تھے کہ ایک وہاں آ نکلا۔ اس کو بڑا غصہ آیا۔ چلا کر کہنے لگا ”بند کر یہ تماشا۔۔۔ یہ سینما یہاں نہیں چلے گا“ اس پر امرتا کے باپ نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے

آگئے۔ اس کے بعد نہ کبھی وہ کسی گوردوارے گئے اور نہ ہی تبلیغ کی۔ وہ کہتے تھے کہ ”ان کم بختوں کو کوئی تعلیم نہیں دے سکتا۔“

القابلیٹیں اٹھائے آئیں اور میز پر رکھنے لگیں۔ کھانا اب سرد ہونے کو تھا۔ ایک بج چکا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد میزبان سے رخصت مانگنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن آج میرا ارادہ یہی تھا۔ اس لیے میں نے گفتگو کا رخ انجام کی طرف موڑنا چاہا۔ مادام افضل تو صیف بظاہر اطمینان سے بیٹھی تھیں لیکن مجھ کو معلوم تھا کہ ان کے دل میں اس گھرانے کے مستقبل کے بارے میں کئی وسوسے ہیں۔ وہ کئی باتیں کہنا چاہتی تھیں اور کئی باتیں سننا چاہتی تھیں مگر فی الحال خاموش تھیں۔

”اب امرتا جی نہیں رہیں تو آپ کو کیا لگتا ہے؟“ میں نے اس مصور سے پوچھ لیا جس نے زندگی اس شاعرہ کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اب امرتا کی وفات کے ساڑھے چار ماہ بعد ان کی یادوں کے جھوم سے نکلنے کی راہ نہ پاسکا تھا۔

”کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔۔ لگتا ہے کہ وہ یہیں ہے۔۔۔ پہلے کی طرح۔“

”گویا ان کی Physical Presence ضروری نہ تھی؟“

”نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اب بھی یہیں ہے۔“

القابلیٹیں میز پر چھریاں کانٹے رکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے سر کی بات کی توثیق کی۔ ”ہمیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ چلی گئی ہیں۔۔۔ وہ یہیں ہیں جی۔۔۔ ہمارے پاس۔“

”بالکل“ امروز نے لقمہ دیا ”اس نے کہا تھا کہ مجھے مرنے کے بعد نبھانا مت۔ نہ ہی کوئی مذہبی رسم ادا کرنا۔ وہ ہر وقت پاک صاف رہتی تھیں۔ بھلا اس کو نبھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے ایسے ہی کیا۔ دوست پوچھتے تھے کہ اس کی بعد از مرگ رسوم کب ادا ہوں گی۔ میں ان کو جواب دیتا کہ زندگی میں وہ کونسی رسوم ادا کرتی تھیں جواب ہم اس کی رسمیں ادا کریں گے۔ اس کی موت پر جلے ہوئے۔ میں نے وہاں کبہ دیا کہ جلنے میں کوئی افسوس نہ کرے گا۔“

اس موقع پر مادام افضل تو صیف نے امروز کو امرتا کی وصیت یاد دلائی اور پوچھا کہ آیا اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں۔ امرتا نے وصیت یہی کی تھی کہ جب اس کا کرم یا کرم ہو تو اس کا قلم بھی ساتھ رکھ دیا جائے۔ امروز کو یہ بات یاد نہ رہی تھی۔ گویا اس پر عمل نہیں ہوا تھا لیکن القاب نے مداخلت کی اور بتایا کہ اس کو یہ وصیت یاد تھی اور جب

امرتا کے مردہ جسم کو گھر سے بجانے لگے تھے تو اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے قلم ڈیڈ باڑی کے ساتھ رکھوا دیا تھا۔

القاء سوپ لے کر آئی تھیں۔ سبزیوں کا سوپ جو گلاسوں میں پیش کیا گیا۔  
 ”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“ میں نے امروتا سے پوچھا۔

”جب سے امرتا گئی ہے‘ میں نے نظمیں کہنا شروع کر دی ہیں۔ بہت سی نظمیں ہو گئی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ پریس میں ہے۔ میں نے اس کا عنوان ’جشن جاری ہے‘ رکھا ہے۔“

”خوب! آپ شاعر ہو گئے۔ کتاب کب آ رہی ہے۔۔۔ کیا دو تین مہینوں میں؟“  
 ”نہیں مہاراج۔۔۔ بس ایک دو ہفتوں میں آ جائے گی۔“

ہم تین سوپ پیئے لگے۔ پھر القاء نے کھانا چن دیا۔ دال، سبزی، رائیہ اور دہلی کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں،  
 میسلے کا دہی۔

امروتا کو اپنی نظموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے دو تین نظمیں سنائیں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ  
 ”امرتا کو خبر نہیں کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ ان کے لہجے میں ولولہ تھا اور تاسف بھی۔“  
 ”تو کیا پینٹنگ کا قصہ تمام ہوا؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں“ امروتا نے جواب دیا ”ہاں پہلے سا جوش نہیں۔ بہت سال ہوئے امرتا نے ایک  
 بار کہا تھا کہ امروتا تم عورتوں کی تصویریں بناتے ہو، لیکن صرف ان کے بدن کا حسن دکھاتے ہو۔ Woman  
 with mind تم نے کبھی پینٹ نہیں کی۔ اس کے بعد سے میری تصویروں میں نسوانی جسم کا حسن ہے تو سہی لیکن  
 Mind زیادہ اہم ہو گیا ہے۔“

مادام نے اور میں نے کھانے کی تعریف کی۔

امروتا کہنے لگے کہ امرتا پر تم ہمیشہ خود کھانا پکایا کرتی تھیں۔ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ البتہ ’شادی‘ سے  
 پہلے انہوں نے خود کبھی نہ پکایا تھا۔ بعد میں انہوں نے ہم کو ایک تصویر دکھائی جس میں امرتا نے پہلی بار کھانا پکایا  
 تھا اور دونوں مل کر کھا رہے تھے۔ ان کو ماضی کا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ دونوں بھئی کے تاج محل ہوٹل کی ایک  
 دعوت میں شریک تھے۔ کھانا جاری تھا۔ ایک کے بعد دوسرا کورس شروع ہو رہا تھا۔ ہم بور ہو گئے۔ میں نے  
 امرتا سے کہا کہ آؤ گھر چلیں اور بھنڈیاں کھائیں۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔



کھانے سے فارغ ہوئے تو امروزی ہم کو امرتا کے کمرے میں لے گئے۔ یہ کارنر میں بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دس فٹ لمبائی چوڑائی کے اس کمرے میں پرانے طرز کا ایک پانگ تھا۔ ایک صوف اور دیوار میں ایک الماری تھی جس میں چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک کھڑکی تھی۔

مادام افضل تو صیف کے لیے یہ ایک بھائی لمحہ تھا۔ وہ اس کمرے میں کئی بار سارے دن بچائیوں کے دل پر راج کرنے والی امرتا پر تہم سے مل چکی تھیں۔ وہ امرتا جو خود مادام کی زبردست مداح تھیں۔ انہوں نے مادام پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

مادام کی جذباتی کیفیت کو بھانپتے ہوئے میں نے کمرے میں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کو لے کر ملحقہ ڈرائنگ روم میں آ گیا جو گھر کے دوسرے کمروں کی طرح امرتا کی تصویروں سے آنا پڑا تھا۔

”امروزی بے حد شکر یہ اس محبت اور مہربانی کا جو آپ نے دی۔ میں اب رخصت چاہتا ہوں۔“  
 ”مہربانی آپ نے کی جو یہاں تک چلے آئے ہیں لیکن ایک منٹ رکیے۔ میں آپ کو اپنی چند نظمیں دینا چاہتا ہوں۔“

وہ دوسرے کمرے میں گئے اور پانچ منٹ بعد لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر اردو میں چار پانچ نظمیں لکھیں تھیں۔ انہوں نے یہ کاغذ میری طرف بڑھایا۔

یہ نظمیں ہیں جو میں نے 30 اکتوبر 2005 کو امرتا کی وفات کی شام لکھی تھیں۔

اس انمول یادگار کے لیے میں نے امروزی کا شکر یہ ادا کیا اور الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر امروزی مجھے وہیں سے رخصت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ”میں آپ کو نیچے تک چھوڑ کر آؤں“ انہوں نے کہا۔ میں نے القاء اور مادام کو خدا حافظ کہا۔ مادام ابھی وہیں ٹھہرنے والی تھیں۔

میں امروزی کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا مگر وہ مانے نہیں۔ ہم دوسری منزل سے نیچے آئے۔ میں نے مصافحہ کے لیے دوبارہ ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور ہم چلتے ہوئے گیٹ سے باہر آ گئے پھر ہم چلتے ہوئے تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر شاہراہ پر پہنچے جہاں سے مجھے رکشہ یا ٹیکسی مل سکتی تھی۔

”آپ کہاں جائیں گے؟“

”اب نہیں بجنے کو ہیں۔ اس لیے راج گھاٹ کے گیٹ ہاؤس جاؤں گا۔“

رکشنے میں بیٹھنے سے پہلے ہم گلے ملے۔

”یہ ملاقات“ میں نے امروز سے کہا۔۔۔۔۔ ”مجھے یاد رہے گی۔“

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

## امرتا پر یتیم

امرتا پر یتیم اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ادیبہ ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک لچنڈ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خاص طور پر تقسیم ہند پر اپنی نظم ’اج آکھاں وارث شاہ نوں تو قبریں وچوں بول‘ کی اشاعت کے بعد وہ ادب کے آسمان پر ایک ستارہ بن کر چمکیں۔ یہ نظم تقسیم کے فسادات میں ہونے والے خون خرابے میں عورتوں کی حالت زار کی عکاسی کرتی ہے۔ اصل میں امرتا نے وارث شاہ اور دوسرے عظیم پنجابی شاعروں کی روح سے خطاب کیا کہ انھوں نے روپانی داستانوں کے ہیروؤں کی تکلیف کو محسوس کیا اور اس پر غم و غصے کا اظہار کیا لیکن یہاں تو ایک پوری نسل انسانی ذبح کر دی گئی۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنی قبروں سے باہر آئیں اور پنجاب کی مظلوم بیٹیوں کی فریاد سنیں۔ یہ نظم انڈیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ترجمہ ہوئی اور راتوں رات کلاسیک کا درجہ حاصل کر گئی۔ امرتا پر یتیم کا ایک کے بعد دوسرا مجموعہ شائع ہوتا رہا اور وہ ایک ثقافتی علامت کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

امرتا ایک سادہ اور منکسر المزاج انسان تھیں، بہت شائستہ اور دلی پتلی، لیکن اندر سے شخصیت بہت مضبوط اور دلیر۔ انھوں نے ایک ساتھ بہت سے محاذوں پر جنگ لڑی اور کسی بھی جگہ اصولوں پر کھوٹ نہیں کیا۔ انھوں نے شاعری اور نثر دونوں ہی میدانوں میں بہت لکھا اور اپنے رسالے ’ناگ منی‘ سے پنجابی لکھاریوں کی ایک نسل کو متاثر کیا۔ عورتوں اور مظلوم طبقات کے لیے جنگ کرنے والی امرتا پر یتیم نے جس بہادری اور نڈری سے ساحر لدھیانوی کے ساتھ اپنے عشق کا اعتراف کیا، وہ ایشیائی عورت کی آزادی اور آزاد ارادے کے حوالے سے ان کے حوصلے اور بلند ہمتی کی دلیل ہے۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی روایت باقی رہے گی۔



## امرتا پر یتیم کی یاد میں

اکتوبر ۵۰ء کی آخری شام پنجابی کی مہبان شاعرہ امرتا پر یتیم کی زندگی کی بھی آخری شام تھی۔

امرتا پر یتیم صرف پنجابی کی شاعرہ اور ادیبہ نہیں تھیں ان کی تقریباً ساری کتابیں اردو، ہندی اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہیں اور وہ ایسی شاعرہ تھیں کہ ان کی نظمیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر بھی اپنا تاثر برقرار رکھتی ہیں۔ دنیا بھر میں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستان میں بھی ایسا کون سا پڑھا لکھا اور صاحب ذوق شخص ہوگا جو امرتا پر یتیم کے نام، مقام اور ان کے وارث شاہ کو مخاطب کر کے کہے ہوئے اشعار سے ناواقف ہو۔ سن سینتالیس کی تقسیم کے فرقہ وارانہ فسادات پر ہر شاعر، ادیب اور حساس تخلیق کار نے اپنے رنج اور دکھ کا اظہار کیا مگر امرتا پر یتیم کا انداز اور لہجہ سب سے جدا تھا۔ ان کی درد بھری آواز ہر دل میں اتر گئی اور ہمیشہ کے لئے امر ہو گئی۔ ان کی اس طویل اور مشہور نظم کا عنوان ”تواریخ“ اور ذیلی عنوان ”پنجاب دی کہانی“ تھا اور یہ ان کے مجموعہ نویں رت میں شامل تھی اور اس کا وہ ٹکڑا جہاں وہ وارث شاہ کو مخاطب کرتی ہیں تاثر کے اعتبار سے دنیا بھر کی پرتاثر شاعری کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

گلیوں میں گیت بھر کر گلیوں میں تند

ترنجوں میں غیاں سہیلیاں چڑھ کر بند

سے سچ دے بیڑیاں لڈن دتیاں رو ہڑ

سے ڈالیاں چینگ اچ پتلاں دتیاں توڑ

جستہ دج دی سی پھوک پیار دی اوہ دیکھلی گئی گواچ

را نچے دے سب ویراں بھل گئے اسدی جاچ

دھرتی تے لہو و سیا قبرال پیاں چون

پریت دیاں شہزادیاں اچ وچ بزاراں رون

اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور  
اج کتھوں لیا یے لہجے کے وارث شاہ اک ہور

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبریں وچوں بول  
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا درقا پھول  
اک ردٹی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے دین  
آج لکھاں دھیاں روندیاں، قینوں وارث شاہ نوں کہیں  
اتھ درد مند داں دے دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب

اج نیلے لاشاں وچھیاں تے لہودی بھری چناب  
امرتا پریتم پر ہندو اور سکھ شاعروں اور گروؤں کو مخاطب کرنے کی بجائے ایک مسلمان شاعر سید  
وارث شاہ کو مخاطب کرنے پر اعتراضات بھی کئے گئے۔ مگر امرتا پریتم نے ہمیشہ وہی کیا جسے سچ سمجھا۔ ان کے  
قلم میں بڑی جرأت تھی اور انہوں نے سچ کے سوا کبھی کچھ نہ لکھا۔ وہ ذاتی زندگی اور رویوں میں بھی سچائی سے  
کبھی دور نہ ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی اوائل عمری کی شادی انہیں کوئی خوشی نہیں دے رہی  
تو انہوں نے نہایت دوستانہ طریقے پر اپنے شوہر کو علیحدگی پر آمادہ کر لیا اور ایک مقررہ تاریخ پر دونوں ایک  
دوسرے سے الگ ہو گئے۔ امروزان کی زندگی میں آیا اور وہ سماج کے روایتی بندھنوں سے آزاد رہ کر زندگی بھر  
ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے۔ انہوں نے ساحر سے محبت کی مگر کبھی اس کے اعتراف میں ہچکچاہٹ محسوس  
نہ کی۔ نہ ہی امروز یا کسی اور سے کچھ چھپایا۔ ایک بار ان کے بیٹے نوراج نے جب اس کی عمر تیرہ برس کی تھی  
پوچھا:

”ماما ایک بات پوچھوں، سچ بتا دو گی؟“

”ہاں“

”کیا میں ساحر انگل کا بیٹا ہوں؟“

”نہیں“

”اگر ہوں تو بتا دیجئے۔ مجھے ساحر انگل، چچھے لگتے ہیں“

”ہاں بیٹا۔ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہوتا تو میں تم کو ضرور بتا دیتی“

امرتا کہتی ہیں کہ سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ میرے بچے کو یقین آ گیا۔

ساحر لدھیانوی سے ان کی محبت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئیں مگر سچ وہی تھا جو

امرتا نے خود بیان کیا ہے۔ رسیدی ٹکٹ میں ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

”اے لاہور میں جب کبھی ساحر ملنے کے لئے آیا کرتا تھا تو گویا میری ہی خاموشی میں نکلا، خاموشی کا ٹکڑا

اگر سی پر بیٹھتا تھا اور چلا جاتا تھا وہ چپ چاپ صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ قریب آدھا سگریٹ پی کر رکھ دانی

میں بجھا دیتا اور پھر نیا سگریٹ جلا لیتا اور اس کے جانے کے بعد صرف سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے

میں رہ جاتے تھے۔ کبھی ایک بار۔۔۔ اس کے ہاتھوں کا لس لینا چاہتی تھی لیکن میرے سامنے میرے ہی رواجی

بندھنوں کا فاصلہ تھا جو طے نہیں ہوتا تھا“

ملک کی تقسیم سے پہلے جب امرتالاہور میں ریڈیو پر ملازم تھیں تو ان کے اور معروف ڈراما نگار اور

براڈ کاسٹر سجاد حیدر کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئیں۔ لیکن ان کی دوستی ہر طرح کی آلائشوں

سے پاک صاف تھی۔ وہ سجاد حیدر کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

”دونوں ہاتھوں سے تلخیاں بانٹتی ہوئی سب ملاقاتوں میں صرف سجاد کی اس قسم کی ملاقات تھی

جو پہلی تھی اور جس کے ساتھ دوستی لفظ آنکھوں کے سامنے جھلما جاتا تھا۔ جب لاہور میں تھی تو اکثر ملاقات

ہوتی تھی۔ کسی ملاقات کے دوران ہونٹوں پر کوئی شوخ لفظ نہیں آیا تھا۔ وہ ملنے آتا تھا تو ایک ادب اس کے

ساتھ سیرھیاں چڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ لاہور کی کسی دعوت میں سجاد کے ایک دوست کی بیوی نے منھائی بانٹتے

وقت سجاد کو بار بار امرتی پیش کی۔ سجاد نے دوا ایک مرتبہ تو ہنس کر بات ٹال دی مگر پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا ”بھابی

اس کے نام پر آج تو آپ نے مجھ سے مذاق کیا ہے پھر کبھی نہ کرنا تجھے معلوم نہیں کہ میری محبت میں اس کے

لئے پرستش بھی شامل ہے“

امرتا پریم نے اپنی نظموں، افسانوں اور ناولوں میں زندگی اور معاشرت کی کچی تصویریں پیش کی

ہیں۔ ان کا اہم طوب نہایت دلکش اور شاندار تھا۔ ان کی فکر روشن تھی اور وہ زندگی کی ترقی پسندانہ اقدار پر یقین

رکھتی تھیں۔ ان کی تحریروں میں رنگ، نسل اور عقیدے سے بالاتر ہو کر انسانی معاملات اور خاص طور اپنے عصر کی

عورت کے مسائل اور دکھوں کی ترجمانی کی گئی۔ ان کی نظموں میں کیتوں کی مٹھاس اور گیتوں میں غزل کا سا

حسن اور سوز ہوتا۔ اور ان کی نثر بھی شاعرانہ اور پرتا شیر تھی۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے دنیا کی ہر زبان اور اردو میں بھی تراجم ہو چکے ہیں۔ بعض ناولوں پر فلمیں بھی بنیں۔ برصغیر کی تقسیم اور فسادات کے پس منظر میں لکھے ہوئے ان کے ناول ”ہنجر“ پر بنی فلم نے حالیہ برسوں میں بڑی کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ ان کی کتابوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ وہ دہلی سے ایک بہت معیاری پنجابی رسالہ ”ناگ منی“ نکالتی تھیں اور پاکستانی ادیبوں کی تحریروں کو اس میں خاص طور پر شائع کرتی رہتی تھیں حالانکہ یہ بہت محنت طلب اور مشکل کام تھا کیوں کہ وہ خود شاہ مکھی یعنی اردو رسم الخط لکھ پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ غالباً امروز پڑھتے جاتے تھے اور وہ ساتھ ساتھ پنجابی گورکھی میں ترجمہ کرتی جاتی تھیں۔ انہیں بہت سے قومی اور بین الاقوامی ادبی ایوارڈز ملے اور ایک صوبائی زبان پنجابی میں لکھنے کے باوجود ان کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا تھا۔

امرتا پرتم ایک کشادہ نظر اور فراخ دل لکھاری تھیں۔ اپنے جونیئر ز سے ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہا۔ پاکستان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو جن سے وہ شفقت اور محبت روا رکھتی تھیں اور جن میں حوصلہ افزائی کے لفظوں کا دان پن کرتی رہتی تھیں، ان کی رحلت، اپنا ذاتی دکھ محسوس ہوا۔ میں بھی ان کے سوگواروں میں شامل ہوں۔ میرے ساتھ بھی وہ بہت شفقت برتی تھیں۔ 1980ء میں جب میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”ماس اور مٹی“ شائع ہوا۔ تو میں نے منیر احمد شیخ کے ذریعے جوان دنوں دہلی میں پاکستان سفارت خانے میں متعین تھے انہیں اپنی کتاب بھجوائی۔ ایک تو میری کتاب اردو میں تھی دوسرے پتہ چلا تھا وہ اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتیں مجھے خط کی رسید کی بھی توقع نہ تھی مگر کچھ دنوں بعد ان کا بہت ہی خوبصورت اور حوصلہ افزائی کا خط آیا۔ پھر کچھ دنوں بعد انہوں نے میرے بہت سے افسانوں کا پنجابی میں ترجمہ کر کے ناگ منی کا ماس اور مٹی نمبر شائع کر دیا۔ ان کے ساتھ ان کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل تھا جو ہمیشہ میرے لئے حوصلہ افزائی اور تخلیقی توانائی کا منبع رہا ہے۔ انہوں نے لکھا:

”محمد منشا یاد کی کہانیاں جاتے ہوئے ہاشور ذہن کی کہانیاں ہیں اس لئے ان کہانیوں نے اچیت (سوئے ہوئے، لاشعوری) من کے طے شدہ وقت کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور اپنے لئے چڑھتے سورج کی لالی کا وقت مقرر کیا ہے۔ تاکہ انسان کے لئے جو کچھ بھی دن کی روشنی میں ممنوع ہے وہ اسکے چھپے ہوئے اسباب کی جڑیں تلاش کر سکے۔ خواہ وہ ہدایتوں اور روایتوں کی قائلہ پرستش جڑیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کہانیاں ایک سان ہیں جن کے لفظ لفظ پر چڑھ کر انسان کی نظر تیکھی ہوتی ہے میں محمد منشا یاد کی کہانیاں پڑھنے

والے قارئین کی نظر کو سان مبارک کہنا چاہتی ہوں“

اس کے بعد بھی وہ اکثر میری کہانیوں کو گورکھی پنجابی میں ترجمہ کر کے ٹاگ منی میں چھاپتی اور ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مجھے متعارف کرتی رہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات 30 دسمبر 1987ء کو حوض خاص دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں ان کے مخالفین کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دہلی گیا تھا۔ کانفرنس کے اگلے روز میں نے انہیں فون کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں۔ میں نے تمہاری آمد کے بارے میں اخبار میں پڑھا اور صبح سے انتظار کر رہی ہوں مجھے یقین تھا تم کانفرنس سے فارغ ہو کر مجھے فون کرو گے اور اس وقت مجھے ملنے آ رہے ہو گے۔ فوراً آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔ میں ان کے گھر پہنچا تو وہ اتنی محبت اور خلوص سے ملیں اور اتنے کھلے دل سے میری کہانیوں کی تعریف کی کہ میں آج تک سرشار ہوں۔ ان کے ساتھ اتاری ہوئی تصویریں، ان کے اپنے دستخطوں کے ساتھ دی ہوئی کتابیں، ان کی نظمیں اور گیتوں کے کچھ ریکارڈز اور ان کے شفقت و محبت سے کہے ہوئے الفاظ میری زندگی کی نہایت قیمتی متاع ہیں۔

میں نے امرتا پرتم کی تحریروں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں جب بھی زندگی میں پریشان ہوتا ہوں یا کسی ناکامی سے دوچار ہوتا ہوں تو رسیدی ٹکٹ کی یہ سطریں میری ہمت بڑھاتی ہیں۔ آپ بھی سن لیجئے شاید آپ کے بھی کام آئیں۔ لکھتی ہیں:

”ان دنوں دل کی عجیب، حالت تھی۔ تنہائی کا شکار تھی۔ جب پہلی مارچ 1961ء کو دیت نام سے مجھے بوجی منہ کی تار آئی۔ تو دل کی رو کچھ بدلی۔ سانہ بی ایک وہ انگریزی فلم یاد آنے لگی جس میں ملکہ الزبتھ ایک حسین نوجوان کو دل ہی دل میں پیار کرتی ہے۔ اس کو جب بحری جہاز دے کر ایک فرض سوئچی ہے، تو دور سے دور بین کے ذریعے جاتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر پریشان ہوا نہتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ اس نوجوان کی محبوبہ بھی جہاز پر اس کے ہمراہ ہے۔ وہ دونوں ڈیک پر کھڑے ہیں۔ اس وقت ملکہ کو پریشان اور آزرده دیکھ کر اس کا ایک خیر خواہ کہتا ہے۔ ”میڈم! لک اے بٹ ہائر“ اور اس نوجوان اور اس کی محبوبہ کے سروں سے اوپر، ملکہ کی حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے۔۔۔ اور میں اپنے آپ کو خود ہی کہتی۔ ”امرتا! لک اے بٹ ہائر“ اور میں زندگی کی ساری شکستوں اور پریشانیوں سے اوپر دیکھنے کی کوشش کرنے لگتی۔ جہاں میرا تحریر تھی، میری نظمیں، کہانیاں، میرے ناول۔“

میں سمجھتا ہوں امرتا مری نہیں۔ اس نے صرف اپنا پتہ تبدیل کیا ہے۔ جو اس نے اپنی ایک نظم  
”اپنا پتہ“ میں پہلے ہی بتا رکھا تھا:

”آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹایا ہے  
اور گلی کے ماتھے پر لگا گلی کا نام ہٹایا ہے  
اور ہر سڑک کی سمت کا نام پوچھ دیا ہے  
لیکن اگر آپ نے مجھے پانا ہے  
تو ہر دیس کی، ہر گلی کا در کھٹکھاؤ  
اور جہاں بھی، آزا در و ج کی جھلک پڑے  
سمجھتا وہ میرا گھر ہے“

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم

اسکروائٹلڈ نے لکھا کہ اگر دنیا کے نقشے پر Utopia نہ ہو تو دنیا کا نقشہ جغرافیے والوں کے لیے ہوگا مگر فن کاروں اور فلاسفروں کے لیے بے کار ہے۔ Utopia ہی تو ہے جس کے حصول کے لیے انسان کی جدوجہد ہے اور جب اس جزیرے پر پہنچ جاتا ہے تو نئے Utopias کی تلاش میں اپنے بادبان کھول کر پھر سے عزم سفر ہوتا ہے۔

امرتا پر یتیم نے زندگی یوں بسر کی کہ جیسے یہ پنجاب میں رہنے والی ایک خاتون کی دکھ بھری داستان نہ ہو بلکہ کسی بھی انسان کے لیے زندگی کا خواب ہو، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ ہو اور مستقبل کا Vision ہو۔

کچھ دن پہلے ایک دوست نے جو کھٹمنڈو سے ہو کر آیا تھا، بتایا کہ وہاں بدھ مت (Bhuddist) Painters کا ایک ایسا گروپ ہے جو اپنی پینٹنگ بنا کر دریا میں بہا دیتے ہیں تو تخلیق کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر معاشرتی اور روایتی آنکھ کے جبر اور خوف سے آزاد کر لیا جائے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ فارمولا بڑے آرٹ اور ادب کی تخلیق میں بہت بڑی روکاوت ہے اور پولیس کا خوف تو ادب اور آرٹ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

امرتا پر یتیم نے اپنی زندگی اور فن دونوں کو ان دونوں جبر سے آزاد کرنے کی جرأت کی اور زندگی بھی شاندار بسر کی اور بڑا ادب بھی تخلیق کیا۔

بڑے ادب کی ایک بڑی Dimansion اس کا مستقبل سے ہم آہنگ ہونا بھی ہے اور مستقبل سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ادیب کو کچھ پُر امید بھی رہنا ہے اور اُمید کے لیے کچھ ایسی قدریں اور اصول دریافت کرنے ہوتے ہیں جو قاری کو بھی مایوسی کی تاریکی سے نکالے اور اور ہم عصر احساس بھی خوف اور نامرادی کی جکڑ سے نکلے۔



امرتا پریم نے اپنی شاعری اور فکشن میں سوچ کی ہر اُس روایت کو جو معاشرتی طور پر کتنی ہی Qlorified کیوں نہ ہو پیش کیا جو انسان کی آنکھ کو دکھ اور غم کے آنسوؤں سے بھر دیتا ہے۔ انھوں نے وارث شاہ کو بھی عظیم شاعر اسی لیے کہا کہ پنجاب کی ایک بیٹی روئی تو انھوں نے ایک ضخیم کتاب اُس کی آہ و بکا پر تحریر کر دی اور ثابت کر دیا کہ یہ شاعر وادیب ہیں جو آنسوؤں کے محقق ہیں جو آنسوؤں کی تحقیق اور تفتیش میں مصروف ہیں اور یہ فن کار ہی ہے جو ایک فرد کے دکھ سے بھی لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ وقت کے گال پر آنسو کا ایک قطرہ گرا تو اس نے تاج محل جیسا شاہکار تخلیق کیا۔ تخلیق کار یہی ثابت کر رہے ہیں کہ آنسوؤں کی تخلیقی طاقت بے انت ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔

برصغیر کے معاشرے میں شاید فرد کے دکھ سے لا تعلق پائی جاتی ہو لیکن برصغیر کے فنکار میں بے حس لا تعلق نہیں ہے۔ اسی لیے امرتا پریم نے فکشن بھی لکھا چناں چہ ناول ہو یا افسانہ فرد کے بارے میں ہے افسانہ کے بارے میں نہیں۔

امرتا پریم برصغیر کی وہ نمائندہ لکھاری ہیں جہاں ہمیشہ یہ کوشش کی گئی کہ نئے سوچنے کے ڈھنگ دریافت کیے جائیں۔ جہاں جینے کو ہر دم نئی امنگوں اور نئے خوابوں نے معنی دیے۔ جہاں گوتم بدھ نے باقاعدہ سوچنے کے نئے ڈھنگ دریافت کرنے کے اسلوب بتائے۔ جہاں Ideology کا لفظ گھڑا ہی نہیں گیا۔ شاید اس لفظ کی پیدا کی ہوئی تھن سے برصغیر کے ذہن نے اپنے آپ کو آزاد رکھا۔

پنجاب محبت کرنے والوں کی دھرتی ہے اور محبت وہ جذبہ ہے جو انسان کو آزادی سے جینے کا حق دیتا ہے محبت یہ نہیں دیکھتی کہ اُس کو کسی کی تائید حاصل ہے یا نہیں۔ محبت صرف حسن کی دریافت کا نام ہے۔ حسن کی تخلیق کا نام ہے اور اپنی دریافت اور تخلیق سے پُر اعتماد رشتے کا نام ہے۔ امرتا پریم نے ایسے کردار تخلیق کیے جو حسن کی دریافت اور تخلیق کے اس عمل میں سرگرم عمل ہیں اور اسی لیے انھوں نے عظیم کرداروں کی ایک Galaxy تخلیق کی۔

دنیا میں ہر جگہ یہ کوشش رہی ہے کہ عورتیں اور بچے ظلم کی چکی میں پسنے نہ پائیں۔ اُن کے دکھ میں کمی کی جائے امرتا پریم اپنے فکشن میں اس کوشش کا حصہ نظر آتی ہیں۔ وہ ایسی دنیا کا خواب دیکھتی نظر آتی ہیں جہاں آنسوؤں کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں گھروں سے آہ و بکا کی آوازیں نہیں اُٹھ رہی ہیں بلکہ امن و شanti سے رہنے کے سلیقے سکھائے جا رہے ہیں۔ جہاں انسان کی بہتری کے لیے تخلیقی کاوشیں ہو رہی



ہیں۔

امرتا پریم کے افسانوں اور ناولوں میں ایسی خواتین کی Galaxy ہے جو علم دوست ہیں۔ امن اور آسودگی کے لیے کوشاں ہیں، جو اس دنیا کی تخلیق میں مصروف ہیں جہاں انسان اُن روکاؤں کی شناخت کر رہا ہے۔ جو امن، محبت اور تخلیق کی راہ میں حائل ہیں، جو قدرت کی شاہکار تخلیق انسان کے دماغ کو ضائع کر دیتی ہیں اور پوری زندگی کو بے ثمر کر دیتی ہیں اور اُن کے کردار دنیا سے رخصت ہوتے وقت صرف احساسِ زیاں لے کر جاتے ہیں اور زیاں کا احساس امرتا پریم کے چند کرداروں کو اس وقت زیادہ محسوس ہوتا ہے جب وہ چاہنے کے باوجود اپنے علم اور عقل کی روشنی میں اپنی ہی زندگی کو ترتیب نہیں دے سکتے اور ایسے معاشرتی ماحول میں سانس لینے پر مجبور ہیں جو انھیں مایوسی کے اندھیرے اپنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ امرتا پریم نے ایسے ماحول کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے جو انسانوں کو مجبور کر رہا ہے کہ مایوسی کو عادت سمجھ کر اپنالو۔ انھوں نے مایوسی کو انسانی ذہن کی عادت نہیں بننے دیا۔ انسان کا یہ اعتماد کہ وہ چاہے تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ اس کا تبدیلی اور ارتقاء کے صدیوں پرانے قانون پر اعتماد اس کے فہم و بصیرت کا حصہ ہے اور یہ فہم و بصیرت امرتا پریم کی اپنی شخصیت کا حصہ بھی ہے اور ان کے افسانے اور ناول کے اکثر کردار کا بھی۔

امرتا پریم نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ”ریدی ٹکٹ“ میں بھی اپنے قاری کو یہی پیغام دیا کہ اس دھرتی پر وہ سب کچھ موجود ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن فرد بھی خالی ہاتھ نہیں ہے وہ بھی اپنی ذہانت کی توجہ کا بدلہ لے سکتا ہے۔ وہ خوابوں اور انگلیوں کو تخلیق کر سکتا ہے۔ انھیں حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ وہ ایک سنگ تراش کی طرح پتھروں کو بھی طاقت اظہار دے سکتا ہے وہ ایک موسیقار کی طرح ارد گرد بہتی ہوا کا ایک گھونٹ منہ میں رکھ کر باہر نکالے تو وہ گیت ہوتی ہے۔ لفظوں اور آہنگ کا شاہکار۔ عام سے چلنے پھرنے میں وہ آہنگ اور ترتیب شامل کرے تو انگنت رقص وجود پا جاتے ہیں اور رنگا رنگ رنگوں کی ترتیب بدل دیے تو وہ شاہکار پینٹنگ ہوتی ہے اور انسان کے ذہن کی یہ قوت و صلاحیت کہ وہ اُن چاہ بدل سکتا ہے اپنے اندر کا بھی اور اپنے ارد گرد کا بھی، اسی پر امرتا پریم کا اعتماد ہے اور یہی ان کی نویدِ امید ہے۔

~~~~~

## امرتا پر یتیم مجھے کہاں ملی؟

در اصل امرتا پر یتیم کو امرتا پر یتیم کے سامنے لانا بہت مشکل کام ہے خصوصاً ہم جیسے لوگوں کے لئے جنہوں نے تاریخ کو پڑھا ہے، دیکھا نہیں، جھیلا نہیں، برتا نہیں۔ لیکن ہاں ہم بھی تین مارشل لاؤں اور بہت سی قربانیوں کے بعد جھیلنے والوں میں تو ہیں نا۔ امرتا پر یتیم سرحدوں کی تقسیم سے بھی تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ہوتی جاتی ہے؛ شخصیتوں کے درمیان ایسے اچرج فارمولے بھی ہوتے ہیں جو ہو ہی نہیں چکتے۔ امرتا پر یتیم پاکستان بننے کے بعد اس کے اندر وارث شاہ کے حوالے سے بھی زندہ ہوئی تھی اب وہ مرنے کے بعد بھی ہمارے اندر دوبارہ زندہ ہو رہی ہے، بڑے عجیب طریقے سے۔ شاید ملکوں کی تاریخوں میں جب عورت جاتی زندہ ہوتی ہے تو امرتا پر یتیم، امرتا شیرگل اور سردجی ناندو، عطیہ فیضی اور اینا مونیکا جیسی عورتیں پھر پھر زندہ ہوتی ہیں۔ امرتا پر یتیم دراصل ہندوستان ہے، پنجاب ہے، راوی ہے، گوجرانوالہ ہے۔ کچا مچن ہے مچن میں کھڑی دھریک ہے، چرخہ ہے ہاتھ میں چھبی چھلتر ہے، ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے، آل مال تھاں ہے، کیا کیا نہیں ہے؟ بڑے روپوں والی امرتا پر یتیم مجھ سے جڑتی ہے اپنی اونچائی کی وجہ سے بھی اور اپنی آواز کی اونچائی کی وجہ سے بھی۔ وہ ایک اونچی آواز ہے جو سب عورتوں کی طرف سے بولتی ہے اور للکارتی ہے تو جنرل ڈائر کو نہیں، وارث شاہ کو جو اس کے لئے متعلقہ Relevent ہے۔ دراصل بات ساری Relevance کی ہوتی ہے۔

امرتا پر یتیم سے میں نہیں ملی؛ جو لوگ ان سے ملے ہیں میں ان سے ملی ہوں، میں تو ہچی گوپرا سے بھی نہیں ملی اور اس ماں سے بھی نہیں ملی جس نے ذوالفقار علی بھٹو جیسے سورج بیٹے کو جنم دیا مگر یہ لوگ اپنی آواز اور ارادوں کے ساتھ میرے من کے اندر رہتے ہیں؛ اگر شوکار پٹالوی نصرت فتح علی میں سما سکتا ہے تو یہ سب لوگ کیوں مجھ میں نہیں سما سکتے؟

امرتا پر یتیم مجھے بہت پہلے ریڈیو لاہور کے سٹوڈیوز میں موسیقی کے ایک پروگرام میں ستارہ بجاتی ہوئی

ملی، بہت دیر بعد ریڈیو پاکستان کے ایک ماہنامہ رسالے آہنگ میں ان کی تصویر چھپی تھی ستار بجاتے ہوئے۔ نہایت من موئی صورت۔ اس کے بعد ہی انکی آپ بیتی پڑھنے کو ملی تو رسیدی ٹکٹ کا اصل مطلب سمجھ میں آ گیا کہ اسکے بغیر کام رک جاتے ہیں۔ لیکن کاش یہ بڑی شخصیت ایک رسیدی ٹکٹ میں سما سکتی اور کتنا برعکس ہوا کہ یہ شخصیت ڈاک کے لفافوں، ڈاک بابو کے تھیلوں اور ڈاک ٹرین کے ڈبوں بلکہ برسوں کے چہروں پر مہر ہو گئی، اس کے لئے پاکستان ہندوستان اور کوئی استھان اہم ہی نہ رہے۔

امرتا پریم ایک سیکولر روح تھی جو عورت سے زیادہ انسان تھی اور اپنے چاروں طرف بھی انسان دیکھنا چاہتی تھی۔ رشتوں کے آئین میں قلم اور کاغذ کا کھیل کھیلتی تھی۔ نظموں کی خوبصورت کشتیاں بناتی تھی: آنے کی چڑیاں اور چڑیاں اور چڑیوں کے گیت لکھتی تھی۔

گیت لکھتی تھی عشق اور موت کے اور ذرا برابر نہیں ڈرتی تھی، عشق کوچ مانجی اور سچ مان کر عشق کرتی تھی۔ مذہبوں، ذاتوں، براتوں سے بالاتر ہو کر اگر عشق کرنا کفر تھا تو کفر کرتی تھی۔ بقول میر،

نخت کافر تھا وہ جس نے پہلے میر

مذہب عشق اختیار۔۔۔۔۔ کیا

اس کے عشق میں انسان ذات کے عشق کے ساتھ، اپنے دیس اور دھرتی کا عشق، اپنے دریا اپنے راوی اپنے گھر سے دھوڑے کا عشق، اپنے گھر واپس نہ آ سکنے کا روگ اس عشق کی اعلیٰ منزلوں سے جوڑتا چلا گیا وہ پھر کبھی گوجرانوالہ نہ آ سکی، ہندوستان کے نوٹے ہوئے ٹکڑے پاکستان میں نہ آ سکی۔ کوئی رکاوٹ تو نہ تھی شاید صبر توڑ منزل پر تھی، وہ اپنی چھوڑی ہوئی دلیز سے ناراض ہو گئی تھی۔ امرتا پریم گیان دھیان اور شعر کے ساتھ کہانیاں لکھتی تھی، کہانی کار امرتا پریم، شاعرہ امرتا پریم، ستار نواز امرتا پریم، گوجرانوالہ کی بیٹی امرتا پریم، نرم خویہ کنست سیاستدان امرتا پریم، اسمبلی کی سیٹوں سے اندرا گاندھی کی دوستی تک امروز کی تصویروں کا موضوع امرتا پریم، ناگ منی کی ایڈیٹر، اور نوا سے نوا سیوں کے آئین میں رنگی بیڑھی پر بیٹھی پنجابن امرتا پریم ہمیشہ ایشیا سرخ ہی لکھتی رہی۔

ایک بار جب ہم نے یہ بھی سنا کہ امرتا پریم لاہور میں تھی۔ امرتا راوی تھی تو یہ بات میں اپنے ایک شیش ڈائریکٹر سجاد حیدر صاحب سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے بھی رسیدی ٹکٹ کے برابر جواب دیا۔ وہ بہت شفیق خاتون تھیں جبکہ امرتا جی نے بھی سجاد صاحب کے لئے اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ بہت شرمیلے دوست تھے۔

میں نے امرتا پر یتیم کی تصویریں بھی دیکھیں ہر عمر ہر انداز کے ساتھ نہایت خوبصورت اور Gracefull خاتون تھیں ہر عمر میں۔ ان کی کہانیاں بھی پڑھیں، انکی گفتگو اور لہجہ ان کے خدو خال سے سمجھ میں آیا۔ ناگ منی کے اوراق سے انکے مسائل بھی۔ وہ ایک بہادر خاتون تھیں آپا افضل تو صیف بتاتی چلی جاتی ہیں۔ فخر زمان لکھتے ہیں تو لکھتے چلے جاتے ہیں۔ تب ہمیں یقین ہوتا ہے کہ امرتا پر یتیم واقعی راوی تھی جو کبھی نہیں سوکتی جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، مزہ کے جنم لیتی رہتی ہے۔ تاریخ جب عورت جاتی کی دارتا لکھے گی تو اسے عورت نہیں انسان لکھے گی۔ جس کے لئے حدوں اور سرحدوں کی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔ محبتوں کو سیاستوں کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب بھی، کرشن چندر، کرنا سنگھ دگل، امرتا پر یتیم اور امروز، پاش اور شیوکار بٹالوی جیسے لوگوں کو پڑھنا یا ان کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے ملک میں مواد بہت کم ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ ان پر ہماری یونیورسٹیاں تھیمس کرنے کی اجازت نہیں دیتیں! ان کا ذکر ہم اپنے میڈیا پر نہیں کر سکتے۔ ہم ان کے قریب نہیں جا سکتے جن سے ہماری ذہنی قربتیں ہوتی ہیں تو ہم ان کے بارے میں کیا لکھیں گے؟ کیا لکھ سکیں گے، کہاں اور کیسے ان سے مل سکیں گے۔ ہماری یہ ادبی قربت داریاں ہماری ہی سوچ اور سانس کا حصہ ہیں۔ بھلا ہونے والے زمان صاحب کا وہ حکومت میں ہوں یا نہ ہوں، ثقافتی ادبی رشتوں کے تانے بانے جوڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ انہی کی کوششوں سے ہم سرحد پار کے قلم کاروں سے ملنے لگے ہیں اور ان کے سمجھ نام اور بڑے کام کو دیکھنے کی خواہش جاگنے لگی ہے جن پر امرتا جی سمیت بہت کام کیا جانا باقی ہے یہ بات اور یہ کام اگلی نسل کے کندھوں پر اور ان کی جھولی میں ابھی سے ڈال دینا چاہیے، ورنہ ادبی کم مانگی تو ہے ہی۔

☆☆☆☆

## درد و چھوڑے دا حال.....

(1)

امرتا پر یتیم..... اک تاں یاں اک نظریہ یاں اک ساگر پیار دا، گیان دا، انسانیت دا۔ تے امرتا ورگی ہو رکون سی؟ پریم دیوانی میرا؟ کشمیر دی للیٹھوری یاں لہند عارف؟ مغل شہزادی زیب النساء محلی؟ ایران دی قرۃ العین طاہرہ؟ یاں گلاب داس دے تاں نال جڑی اپنے لہوردی پیر پر یتیم؟ تے اوہ کیمڑ اپنیڈ اسی جیمڑ امرتا پر یتیم نے جھا گیا؟ گوجرانوالہ توں لہور دا؟ لہور، حیدرے گٹی بزار نوں اوہ ہمیش یاد کردی رہی؟ 1947 وچ لہوردی بھری چناب نوں جھا گیا یاں اوہنے وارث شاہ نوں پکاریا سی تے 31 اکتوبر 2005 نوں وارث شاہ اوہنوں پکار اٹھیا! وارث موئے تے وچھڑے کون میلے

پر امرتا نہ موئی اے تے نہ وچھڑی اے۔

31 اکتوبر نوں میں اوتھے ساں، دلی وچ۔ گوردگرتھ صاحب ہارے اک کانفرنس ہو رہی سی۔ بھائی ویر سنگھ سدن دے بٹا دے اُٹھے میں ”گوردگرتھ صاحب تے بابا فرید“ دے سر تاویں پٹھ اک پرچہ پڑھنا سی۔ 29 اکتوبر نوں شامیں میں لہوروں دلی اپنی اسی۔ اتر پورٹ توں ہوٹل جاندے ہوئے اک، حادثہ واپر گیا۔ بم دھماکیاں وچ کئے ہی جی مارے گئے سن۔ ہوٹل وچ دی بابا کارمچی ہوئی سی پر میں نکل کے امرتا جی دل جانا چاہوند اسان پر باہراک پاکستانی لئی حالات چنگے نہیں سن تے ہوٹل والیاں نے مینوں ہوٹل وچ ہی رہن دی صلاح دتی سی۔

1983 توں میرا ایہہ طریقہ سی۔ جدوں وی دلی اپڑا، سدھا امرتا جی تے امرتہ دل پہنچ جاندی۔ کئی سی دہائے اوہناں دل خضر دا۔ دلی جاندیاں کدی سوچنا نہیں سی چندا کہ اوتھے جا کے نکاتا کتھے ہووے گا پر پچھلے دو تین ورھیاں توں امرتا جی ڈاؤں بیمار رہے سن، میں نکاتا تے ہوٹل وچ کرن لگ چیا ساں پر جیس پل

میں دلی اپڑا، سامان ہوٹل وچ چھڈ کے 25۔ حوض خاص اپڑ جاندا۔ گھنٹیاں بدھی امرتاجی نال گلاں کردا، سیال دیاں شاماں امرتاجی لئی بہت اوکھیاں ہوندیاں سن پر دے اسیں آہ چھت تے ڈھپتے بیٹھے رہندے تے شاماں پین توں پہلاں تھلے آجاندا۔ پچھلے ڈیڑھ دوورھیاں توں امرتاجی سُر ت وچ دی نہیں سن رہے پر اوہناں نوں دیکھ کے تے امرتاجی نال گلاں کر کے جا پدا، امرتاجی نوں وی مل لیا اے، اوہناں نال گلاں دی کر لھیاں نیں۔

اوتھے ہی دو تن داری امیہ کنور نال وی میل ہو یاں۔ ایہہ بی بی امرتاجی بارے لکھیاں نظماں دی کتاب مرتب کر رہی سی تے ادھنے میری اک نظم وی ایس مجموعے وچ شامل کیتی اے۔ 30 اکتوبر نوں اوہناں نال بھائی دیر سنگھ سدن دی کانفرنس وچ میل ہو گیا۔ اوہناں خوش ہو کے دسیا کہ امرتاجی بارے نظماں دی کتاب چھپ گئی اے تے اوہ میرے لئی اک کاپی سویرے لیاں گیاں۔

میں آکھیا ”میں کل شاماں دا آیا ہویا واں۔ شہر دے حالات چنگے نہیں۔ مینوں امرتاجی کوں لے چلو۔“

امیہ جی کہن لکھیاں۔

”اج میں بچی نوں رکتوں پک کرنا اے۔ میں کل فیر اتھے کانفرنس وچ آؤنا اے، تہاں کوں کل لے چلاں گی۔“

آکھ سکدا واں کہ میں دلی وچ ساں۔ دو دتاں توں ساں پر امرتاجی نوں نہ مل سکيا۔ انج پہلاں تے کدی نہیں سی ہویا۔ کیہ کوئی انہونی ورت جاوے گی۔ میں سوچیا انج شامیں میں آپے امرتاجی ول جاواں گا۔ کانفرنس توں ہوٹل پریتا تاں ہوٹل دی انتظامیہ نے دسیا کہ علاقے دے تھانے توں فون آرہیا اے، میں جدوں دی پریتاں، اوہناں نوں فون کر لوں۔ ہوٹل والیاں نے گل کرا دی۔ پولیس افسر ”وچارو ناندرے“ لئی مینوں ملنا چاہوند اسی۔ میں اوہنوں دسیا کہ میں اوس کانفرنس وچ آیا واں جیہدا افتتاح تہاڈے وزیراعظم صاحب نے کیتا اے۔

ہن میں لابی وچ بہہ کے ہی تھانیدار صاحب نوں اڈیکن لگ پیا۔ شاماں ڈو بجھسی رات وچ بدل کھیاں پر اوہ نہ آئے۔ ہن میں سوچدا واں، خورے اوہناں نے آؤنا ہی نہیں سی۔ فون تے ہی اوہناں دی تسلی ہو گئی ہووے گی تے مینوں ہوٹل توں نہ نکلن لئی اوہناں آؤن دا کہہ دتا ہووے گا۔ نہ آؤن دا کارن جو دی

ہوے، میں امرتا جی ول نہ جاسکیا تے ساری رات فی وی تے حادثے تال مرن تے پھٹڑ ہون والیاں بارے تے آؤن توں پہلاں ہی ادا سی گئی دیوالی ہارے فی وی تہرے سندا رہیا۔

31 اکتوبر آگئی۔ کانفرنس وچ امیہ جی کتاب لے کے آئیاں سن۔ اوہناں دسیا کہ اج میرا پرچہ

پڑھے جاؤن مگروں اوہ مینوں امرتا جی ول لے جان گیاں۔

”میں امرتا جی نوں وی دس دتا اے کہ میں احمد سلیم ہوراں نوں لے کے آواں گی۔“

دو پہر مگروں تجا سیشن شروع ہویا۔ مینوں سٹیج توں بلاوا آ گیا۔ اچے میں اپنا پرچہ پڑھنا سی، جدوں

میں دیکھیا، امیہ جی چھیتی چھیتی میرے ول آرہیاں سن۔ کول اپڑ کے اوہناں میرے کناں وچ آکھیا:

”امرتا جی پورے ہو گئے“ تے ایہہ کہندے ہوئے اوہ چھیتی چھیتی باہر ول نوں ٹر پئیاں۔

مینوں جاپیا، جیویں میں کجھ نہ سنیا ہووے۔ میں ایہہ ہر اوہر نظر ماری، پر وگرام دے کرتا دھرتا تے

بھائی دیر سنگھ سدن تے ڈائریکٹر مہندر سنگھ جی کدھرے نظر نہیں سن آرہے۔ میں سٹیج توں اٹھ کے جاوی نہیں ساں

سکدا۔ چان چک پرچہ پڑھن لئی میرا تاں پکاریا گیا۔ مینوں کجھ سمجھ نہیں سی آرہی کہ میں کیہ بولنا اے تے کیوں

بولنا اے۔ پہلاں توں لکھیا ہویا پرچہ میں بوجھے وچ پالیا۔ میری داغ کسب رہی سی۔ میں آکھیا۔

”دو دن پہلاں دلی آیا ساں تے اک انہونی ورتی سی، سڑکاں تے بزار لہو تال بڑھ گئے سن۔ ہنے

ہنے کجھ چہ پہلاں اک ہور انہونی ورت گئی اے ایس لئی میں اپنا پرچہ نہیں پڑھاں گا بس کجھ گلاں کر اں گا۔

دوہاں دیساں دے۔ مانجھ دیاں گلاں، بابا فرید تے گورو صاحبان دی سانجھ دیاں گلاں، وارث شاہ۔ تے امرتا

پریم دی سانجھ دیاں گلاں

ہن مینوں یاد نہیں میں ہو کر کیہ کجھ بولیا سی۔ بس جدوں مڑھکو مڑھکی میں سٹیج توں اتھاتاں مہندر سنگھ

جی خوش ہو کے آکھیا۔ ”تسیں بہت چنگا کتھا، دل دیاں گلاں کیتیاں ساریاں نوں بہت چنگا لکھیا۔ تہاڈا پرچہ

تاں لوکی انج دی پڑھ لین گے۔“

میں کیہ آکھدا، اک کاغذ اوہناں ول ودھا دتا۔ اوہ بے اتے میں انگریزی وچ لکھیا سی!

"AMRITA PRITAM IS NO MORE"

اوہناں پرچے تے نظر ماری، پریشان ہو کے میرے ول ودھے۔

”تہانوں کیویں پتہ چلیا؟“



میں ساری رات کہانی سنا دتی۔ تھوڑے چروچ اوہ سٹیج توں اعلان کر رہے سن۔  
 ”اج امر تاجی پورے ہو گئے۔“

میں اوہناں نوں آکھیا ”میں او تھے پہنچنا اے، مینوں آگیا دیو۔“  
 میں باہر نکل کے امیہ جی نوں اوہناں دے موہاں اے تے فون کچا۔ اوہ دس رہے سن۔  
 ”اہیں امر تاجی دے اتم سنسکاراں لئی نکل رہے آں۔“

میں پہنچیا تے 25۔ حوض خاص چان بھان کر رہیا سی۔ گھر دے سارے جی، امر تاجی نوں لے  
 کے گئے ہوئے سن تے گھر دے باہر میڈیا کنٹھا ہو رہیا سی۔

شاماں ڈونکھیاں پے کھیاں، جدوں امروز جی، امر تاجی دا پتر، اوہناں دی دھی، اوہناں دی نونہ  
 تے اکوں اوہناں دے بچے امر تاجی دے بناں گھر پر تے۔ امروز جی، مینوں گلوکزی پا کے اندر گھروں نوں نر  
 پے۔ میڈیا نے اُتے تھلے پورے گھر اُتے ہڈا بول دتا سی پر امروز جی شانت سن۔

ریڈیو، ٹی وی تے اخباراں والے دگڑ دگڑ کر رہے سن۔ امر تاجی دے گھر والے اوہناں نوں بڑی  
 نمرتا تے حلیمی نال مل رہے سن۔ میں پچھلے کئی گھنٹیاں توں میڈیا والیاں دیاں گھاں سن رہیا ساں، جیہناں وچ  
 سیکنڈل ورگی بوکھنڈری ہوئی سی۔ امر تاجی اُتے مقدمے دیاں گھاں، اوہناں دے تے امروز جی دے سہبھ  
 بارے گھاں۔

اک پتر کار نے جدوں زور دے کے پچھیا کہ امر تاجی نال بناں کسے قانونی بندھن دے رہن  
 بارے، اج اوہ کیہ محسوس کردے نیں تاں امروز جی نے بڑے نرم بھاپ کر ڈے لفظاں وچ آکھیا۔  
 ”تہاڈے قانونی بندھن والے اتھے چاہلی دن کٹھے نہیں گزار سکدے، اسیں قانون دا سہارا لئے  
 بناں چاہلی ورھے کٹھے گزار لئے نیں۔“  
 اک ہوو سوال سی:

”امر تاجی دے بناں اج کیوں محسوس کردے او؟“ امروز جی اوہ سے شانت لہجے وچ آکھن گئے۔  
 ”امر تاجی اتھے ای اے ایہناں کمریاں وچ، اوہدا جسم بس وداع ہو یا اے.....“

گھروں امروز جی نے اپنے ایہناں احساساں بارے ان گنت نظماں وی لکھیاں تے اک اخبار لئی  
 مضمون وی لکھیا: امروز دے لفظ سن۔



”امرتا کچے نہیں گئی، اوہ میرے کول ای اے، اوہ ہذا جسم بے شک استھے نہیں اے۔ پہلاں وانگر میں روز ایہ سوچ کے گھر مڑاواں کہ اوہ مینوں اڈیک رہی ہووے گی۔ گھر وچ اوہی ہوند وا احساس اج وی اے..... جیس دن توں اوہ بیمار پئی۔ میں ودھ توں ودھ اوہ دے کول رہن لگ پیا ساں۔ اوہ تال رہن تے کول بہن لئی کہندی سی۔ دو جیاں دی مدد نہیں لینا چاہندی سی۔ اوہ اچلانا کرنا موت نہیں ودا عیگی اے۔ مرن توں پہلاں، اپنی بیماری دے دنوں وچ اوہنے جیہڑی اخیرى نظم لکھی، اوہ دے وچ وی اوہنے ”الوداع“ ہی آکھی سی۔ میں تینوں فیڑملاں گی، دو تن دنوں..... مگروں میں مڑ کے امروزی جی کول گیا اوہناں کوئی درجن بھر نظماں لکھیاں ہونیاں سن۔ میں سوچیا، امرتانے جتنے لکھنا چھڈیا اوہ توں امروزی نے شروع کردتا۔ فیر اوہ اخیرى نظم تے نہ ہوئی۔

اسیں گھنٹیاں بدھی امرتا جی بارے گلاں کر دے رہے۔ اوس دن وی کسے رسالے وی ایڈیٹر امروزی جی دا انٹرویو کرن آئی ہوئی سی۔ اوہ میرے تال وی سوال جواب کرن لگی پئی۔  
انھن توں پہلاں میں آکھیا۔

”اسیں پاکستان وچ“ کاغذ تے کیوس“ چھاپنا چاہوندے آں۔ امرتا جی دا اپنا مرتبہ کیتا ہویا مجموعہ، تیس ایہدے لئی کجھ لکھ دیو۔“

اوہناں اوہتھے ہی بیٹھے بیٹھے چار اکھر لکھ دتے جیہڑے امرتا جی دی کتاب دا کھڑا بن گئے نیں۔  
ہوٹل واپس آکے میں راتیں امروزی جی دیاں نظماں پڑھدا رہیا۔ اک نظم دے بول سن۔

پیار وچ

من کوئی ہو جائدا ہے

پرا یہہ کوئی

کوئا لکھدا نہیں

کوئا جیوندا ہے

تے آکھ سکداواں کہ اج امروزی جی وی نظماں لکھ نہیں رہے، نظماں جیوں رہے نیں۔ انجیاں  
نظماں وی تے امرتا جی دیاں نظماں وی۔

جتنوں تیک امرتا پریم جی دی شاعری واسلبدھ اے، اوہدے بارے میں کیہ آکھاں۔ میں کیہ تے میری نظر کیہ۔ صرف ایہنا آکھ سکداں کہ امرتا جی دی اپنی شخصیت وانگوں، اوہناں دیاں نظماں وی من وچ آہنے پالیندیاں نیں۔ ایہہ نظماں پیار دیاں نیں، پیار دی سوجھ دیاں نظماں نیں۔ اوہناں وچلی چڑ، چڑ دی سوجھ دیندی اے۔ اوہناں وچلا اکلا پا، اکلا پے دی سوجھ دیندا اے۔ اوہناں وچلی صنفی لوک، مرد و عورت و چکار جھیزے دار و پ نہیں دھار دی، سگوں ظلم دے اوس نظام دی سوجھ دیندی اے جیہڑا ایس جھیزے دار اصلی کارن اے۔ سوجھ اوہناں دی شاعری داکھ کردار اے۔

پاکستان وچ امرتا پریم دی پچھان، اج وی ”اج آکھاں وارث شاہ نوں“ توں اگاہ نہیں ودھی۔ ایہہ کتاب پڑھن والیاں دی پچھان اوس امرتا نال کروے گی جیسے 1960 دی دہائی وچ ہی نویں شعور نال سانجھ پائی سی۔ تے فیراوہ شاعری ساہنے آئی جیسے اج آکھاں وارث شاہ نوں، تے سلیڈے، دیاں نظماں نوں اک نواں رنگ روپ بخشیا۔ اک نویں نظر، اک نویں پچھان۔ ایہہ مجموعہ، امرتا جی نے آپ اپنے کل کلام دانما سندھ کلام کر کے چھاپیا سی ایس ایس ایس نوں بناں کسے گھانے وادھے دے چھاپ رہے آں۔ مینوں زندگی وچ امرتا جی نے اپنیاں لکھتاں پاکستان توں چھاپن دی کئی وار لکھ کے آگیا دتی سی۔ بن اوہ دواع ہو گئے نیں تے امرتا جی نے مینوں پاکستانی ایڈیشن دی اجازت دیندے ہوئے، ایس ایڈیشن لئی چاراکھرو دی لکھ دتے نیں تے بن ایہہ کتاب تہاڈے سہماں وچ اے۔

پہروم بتو مایہ خویش را

☆☆☆☆

## میرا تیرا کیہ رشتہ؟

ساڈا میل بھوڑے دی لہرہ تے ہو یا۔ جے کتے اُجاڑے نہ پندے، پنجاب آپ سالم رہندا تاں کیہ ہوندا؟ امرتا لہورای رہندی۔ نہیں کدے دی لہور نہ آوندی جے آوندی تاں دی کیہ۔ اوہنے تاں مہان ای ہونا سی۔ میرے ورگی جو نیرنوں ایڈی وڈی شاعرہ کیہ جانے کیہ کجھ۔ پہلی داری امرتا پریم داناں سنیا، کوئی کالج وچ لاہور دی پرہیل دے گھر گج پنجابی آئے سی، اوہناں دو نظماں سنائیاں۔

”اج اکھاں وارث شاہ نوں...“

دو جی نظم موہن سنگھ دی رب رب بارے سی ”رب اک غنجل دار بھارت“، کھانے پچھوں سویٹ ڈیش! مینوں تاں اوہ پوری یاد آگئی۔ مکی دی روٹی، تازہ مکھن، نویں شکر۔ عجیب گل اے پنجاب دی بولی وچ کئی لفظ مکی دی روٹی ورگے، کئی مکھن چھنے تے کئی تازی شکر ورگے دی سن۔ پر مینوں کیہ پتہ۔ ستر (۷۰) دی دہائی وچ میں لہور آ گئی۔ انگریزی، اردو ادب لٹریچر ایجوکیشن نیٹنگ و تھیرا گج۔ پر مکی، مکھن تے شکر ورگے مزے دی بولی۔ کتھے؟ امرتا پریم ”وارث شاہ نوں قبریں وچوں بلا کے کیہ کہنا چاہندی سی۔؟ اوہ آپ کہنی چہی سی، کتھے رہندی اے اج کیہ کہندی اے۔“

بہت وڈی شاعرہ اے، بہت وڈے شہر وچ رہندی اے، پر لہور آوندیاں ڈردی اے۔ امرتا پریم نوں لکھنا شروع کر دتا۔ جدوں اوہ اپنا پتہ لکھیا۔ تاں میرا آپنا پتہ گواچ گیا۔ اوہ زمانہ جدوں اتھے جمہوریت دی جنگ زوراں تے آئی۔ ساڈا لیڈر ماریا گیا۔ ساڈے لئی دھرتی تنگ، آسمان دُور ہو یا۔ مینوں لگا ویلے دا گواہ کوئی نہیں۔ گواہ نوں محترم بھی ہونا چاہی دا اے۔

اوس کلجک وچ میرے کول کچھ لفظ تے اک گھر دا پتہ ہے سی۔ اوس پتے اُتے اوہ لفظ پڑ گئے۔ امرتا

پریتم نے سمجھ دی لئے، تے سانجھ کے رکھ دی لئے۔ اوہ شاعرہ سارے انقلاب دی ہسٹری توں واقف سی۔  
 اوہ پاکستان تو واقف سی۔ اوہ نے مینوں پچھان لیا۔

پچھلے جنم اوہ میری ماں سی۔ ایہہ سچ اے۔ رُوحاں اک دوجی نوں جنم دیندیاں۔ ایہہ گل دی اوہ نے آکھی  
 سی، سگوں خط وچ لکھی وی۔ اوہ خط میرے کول بیگا۔ امرتا پریتم دے ہور کہنے لفظ میرے لئی..... اک پوری  
 کتاب میرے لئی، اک خطاب میرے لئی..... "بچی دھی پنجاب دی"۔

اک ہور رشتہ: بڑے مان نال اوہ مینوں لہور دی اویہ کہندی سی۔ مَن اوہ مان میرا سی کہ شہر لہور دا؟ امرتا  
 پریتم دا شہر لہور جھڈیا میرا وی ہو گیا۔ میں اوہناں نوں ملن جاندی تاں ڈونی خوشی ایس کر کے پی افضل  
 توصیف اہدے لہوروں آئی اے۔ آپنے شہر دا حال تجھن دا طریقہ دی امرتا پریتم دا آہنا سی۔  
 اک داری جا کے بیٹھی تاں میرے نال پہلی گل اسطراح کہتی "اک گیت ہوندا سی:

اچے بُرج لہور دے

بیٹھ وگے دریا

مل مل نہا دن کوریاں

لین گراں داناں

کیہ بنیا اوس گیت دا

تے گراں دا۔۔۔؟

فیر دوجی گل منجھی:

اک رفوگر ہوندا سی

پائیاں دھرتیاں نوں گنڈھدا ترپدا

----

اوہ منٹو

تے اوہ فیض جو

نیم تاریک راہواں تے مارے جان

والیاں دی گل کردا سی۔۔۔۔؟

اوس گیت دا کیہ بنیا۔۔۔؟

اوہ دریاتے گراں۔۔۔؟

اوہ گاؤن والیاں گوریاں۔۔۔؟

شاعر تے کہانی والا۔۔۔؟

تے اوہ شہراں دا شہر

لہور جس دا ناں۔۔۔؟

میں کہنا چاہندی سی: دریا شک گیا۔ گیت اُداس ہو گئے، سونیاں ڈب کھیاں۔ شاعر مر گیا، کہانی گواچ

گئی، تے گراں دا ناں لینا کفر ہو یا۔

ہیں؟ ایہہ کیویں ہو یا؟

کدے گراں دا ناں لینا وی کفر ہو یا۔۔۔؟

تے شہر آ پے کیہ کہندا۔۔۔؟

شہر تاں بس چپ رہندا

امر تاپر تہم دی نظم بولدی رہی۔ آپنے سوالاں دا جواب آپے دیندی رہی۔ میں اُونہاں دے سامنے کرسی

تے بیٹھی گرم چاہ دا گھٹ لیتدی رہی۔

شاعرہ بولے تاں ہو رکون بولے۔

فیر آیا نظم دا اخیر لا حصہ تاں شاعرہ اپنے آپ نال ہم کلام ہوئی۔

”پر جدوں تو صیف نے شہر خاموشاں دی گل کہتی

تاں جتے میرے اندر کر کے

گج دیوے یکن لگ پنے

خبرے گج قبریں تے رکھن لئی!

دیوالی دی رات امر تاپر تہم اپنے بنیرے تے بہت سارے دیوے بال کے رکھدی سی۔ اُونہاں دچوں

کئی دیوے لہور والیاں لٹی ہوندے۔ اوہ کسے شاعر، ادیب، کسے متر میرنوں ٹو یا نہیں سی من دی۔

پوری دنیا دے ادیب، شاعر فریڈم فائٹرز امن تے عوام لئی نکھن والے، امن تے عوام دشمن نال لڑن

والے، امرتا دے میر غزن۔ اوہ گمنام راہوں تے مارے جان والے فریڈم فائٹرز دے تاں دل دیواوی ہال  
کے آپنے بنیرے تے رکھدی سی۔ ۱۹۴۷ء وچ پنجاب دی پارٹیشن ویلے پنجابی عورت نال جوئج ہویا، جو اُدہ نے  
سمتیا۔ اُس عورت نے امرتا نے قلم چلایا تے ہر سال دیوا ہالیا۔ امرتا دے بنیرے بڑے دیوے بلدے سی اوہدا  
گھراک آرٹ پیس۔ اک روشن دان جہا ادب محل دا تخلیقی جہان دی کھڑکی سی۔ کتاباں، تصویراں، سوچ،  
مخل، روشنی، ہریالی..... تخلیق دے عطر دی خوشبو نال ہلکدا اک گھر..... بس اکو اک..... اوہ سے گھر دی نہیں  
زیارت کیتی، اوہ سے کمرے وچ جا کے بیٹھی جتھے تخلیق دی دیوی دے منہ توں مٹھلاں دا رنگ شعر بر دے سی۔

امرتا جی کولوں مینوں کیہ ملیا، کتا کو ملیا؟ بے حساب؟ اُن مول..... اُنہاں میری تصدیق کیتی۔ میری  
اصل نوں متیا۔ دلی وچ چھپی میری کتاب دلفلیپ امرتا جی نے لکھیا:

”جس دن جمی صاحبان  
وقت دے کلچے رُگ بھر کے

وقت دے کلچے رُگ بھر کے کسے نہیں کہیا سی:

جس دن جمی صاحبان ہو رنہ جمیا کوئی

تے صحیح اکھراں وچ صاحبان کال کدے بیتیا کال نہیں ہوندا۔

کوئی صاحبان جدوں بندھی اے۔ اوہوں وقت دے کلچے رُگ بھریا جاندا اے“

تے

ہونیاں دے ہونٹاں تے آجاندا اے:

جس دن جمی صاحبان ہو رنہ جمیا کوئی!

آج دے کال وچ صاحبان دا اک ناں تو صیف وی ہے۔

تو صیف جہدے مرزے ورگے تخیل نے وقت دے دیراں شمیراں اُگے واہراں چاڑھ دیتاں۔ اوہ

تو صیف چنے ویلے دے سارے قہر جھل لئے پر احساس مندی دا ہر اُچار کھیا۔

تے چیتا ہر وی مان متا ہو گیا.....“

ایہہ حوالہ اے اُس جدوجہد دا، اُس جنگ دا جو ہمیں تے میری جرنیشن دے ساتھیاں نے پاہودا حائل لئی

سی۔

اک وڈے سامراجی ڈکٹیٹر دا زمانہ کئی چارے پا سے نھرے دا عمل جمہوریت دا لیڈر موت کوٹھنری دے اندروں اپنا حصہ پارہیاسی۔ باہروں وڈ کر کوڑے کھاندا تھکدا نہیں سی۔

اگنی جشن دی ہویا۔ لکھے لفظ اُتے سنہر لکائی۔ پروگریسو ادب تے شاعری نوں سیم تھوڑ آکھیا گیا۔ سارا ملکہ مصلوب ہویا، تاں میں وی اپنا حصہ پایا۔ اسیں بہت سارے ساں جو بُز دلی دے جیون توں ہانگی ہو کے موت ول نس پئے۔ بن سوچے سمجھے پاہوداہ، پاہوداہ!

سامراج دی طاقت نوں ذراحت کر کے آسان قلم چک لئے۔ آساں بندوقاں وی چک لبیاں۔ آساں جنگ کبھی امن واسطے، جمہوریت واسطے۔ کتاب واسطے لکھے لفظ دی حرمت واسطے آساں جنگ چھوڑی۔ ڈکٹیٹر دا ظلم، سامراج دا قہر بڑا کمینہ! سانوں بہتا پتہ نہیں سی ظلم کمینہ دی ہووے تاں کبھی ہوندا۔

پر امرتا نوں پتہ سی۔ اوہ دنیا دے سامراجاں تے ڈکٹیٹراں نوں جاندی سی۔ ایسے کر کے اوہنوں فکر بڑی سی۔ ایسے کر کے اوہنوں ساڈی بڑی قدر وی سی۔ اوہدی اپنی قدر بہت وڈی سی۔ ہوچی مہندہ ورگے عظیم فریڈم فائٹر نے اک داری شاعرہ امرتا دا امتحانم کے آکھیا سی۔ یو آر گریت امرتا۔۔۔۔

With your pen and poetry you ■■■ doing the same job, Which I ■■■ doing with my gun.

اوس۔۔۔ لیے آزادی عوام دا لشکر اپنیاں قلماں نال تے بندوقاں نال ساری دنیا مشرق تے جنوب وچ کھلے یا ہویا سی۔ امرتا ہر تھاں گئی۔ پر مڑ کے پنجاب آگئی۔ اوہ اول و آخر پنجابن سی۔ پنجاب لئی اوہا پیار۔ پنجابی ادب و زبان لئی اوہا مان۔ دنیا دے سارے شاعر نوہدے آسپے۔ پر وارث شاہ، نوہدہ، جودی۔ خالق تے تخلیق کار۔۔۔۔۔

ایس معاملے وچ امرتا پر تہم تھوڑی سکھا شاہی وی کردی سی ایہہ جاندے ہوئے وی کہ میںوں بلوچستان نے پالیا، پڑھایا، سمجھو جھ، علم عقل دار ستہ دتا۔ امرتا جی نوں پتہ سی میرا بہتا کم اُردو وچ ہے گا۔ اوہناں میںوں ”بچی دھی“ پنجاب دی لکھیا۔۔۔۔۔ کیوں جو میں پنجاب نوں لکھیا۔ آج کیاے امرتا پر تہم دی ہری۔ کیہ فرق ہے؟۔

کوئی مر جاندا کوئی امر ہو جاندا اے، کوئی اگلا جنم لیندا اے۔  
خبر چھپی:

”امرتا پر تم نے دنیا سے رخصت لی۔

کیا کچھ چھوڑا ہے۔ کیا کچھ دنیا کو دے کر گئیں۔ میں تو اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔ امروز جی کو کچھ اندازہ ہے۔ انھوں نے ٹیگور کی مثال دے کر کہا: جب وہ (ٹیگور) بیمار تھے اور بستر مرگ پر اُداس لیٹے تھے تو کسی نے کہا: ”تسلی کی بات ہے کہ آپ نے دنیا کے لیے تھے۔ چھ سو (۶۰۰) گیت لکھ پائے۔“ ٹیگور نے کہا وہ جو لکھا ہے، سازوں کے ساتھ ٹھک ٹھک کرنے والی پرائکٹس تھیں۔ ابھی تو سازوں پہ سُر لگائے ہیں۔ گیت تو ابھی مجھے گانے ہیں“

سو امرتا جی ٹیس اپنے پنجاب نال وسدے رہو! میں تہاڈے ناں دا جود یو پالیا۔ روشنی میری اے۔ میں جو لفظ لکھے برکت میری اے۔ پر ٹیس جو گم مینوں دے کے گئے اوہ میرا اعتبار اے۔ ساری انسانیت دا بھرم، انسان دا گیت اے۔ ٹیس کہیا سی:

”ہتھوں قلم نہ رکھیں۔ دنیا نال ناراض نہ ہوئیں۔“

ٹھیک اے امرتا جی تہاڈی گل وڈی اے!

میں پنجابی پاس ہاں!

تہاڈی دتی سند!

مینوں معتبر بناؤندی اے۔

☆☆☆☆



## نیاز بو جہی شخصیت

امرتا جی دے سنگ ساتھ رہن والے اوہناں دے جیون ساھی امروز، ٹونہ، دھی، پتر، اوہناں دے بچے، امرتا جی دے نزدیکی دوست اوہناں دی شخصیت دی مہک نال مہکدے تال رہندے ہی من پر اوہناں توں دور پار رہندے، اوہناں توں پیار کرن والے لوک وی ایس الوکار (معجزاتی) نیاز بو جہی شخصیت توں سکھنے نہیں رہ سکدے۔

ایس نیاز بو شخصیت نوں نیڑیوں، جاندیاں قریب چودھاں سال ہو گئے ہن۔ حالانکہ اوہناں دیاں کتاباں راہیں تے کدے کدائیں کسے سیمینار وچ اوہناں نال میل ایس توں پہلاں وی ہوندا رہیا۔ اک دن فون آیا۔ میں امریت جی نال گل کرنی اے۔ کہیا : بول رہی ہاں۔ دوجے پاسیوں آواز آئی۔ میں امرتا پریم بول رہی ہاں۔ سنیا اے تہاڈی پنجابی اتے ہندی دوہاں بھاشاواں اتے برابر دی کمانڈ اے۔ مینوں آپنے لئی اک انواک دی کدے کدائیں لوڑ پیندی ہے۔ سریر دا روم روم ساہ لین لگ پیا۔ اک چھن لئی جویں دل دھرکنا بند ہو گیا تے فیر اوہدی رفتار اپنی تیز ہو گئی کہ لکھا بس بئے ای۔۔۔۔۔ اس شخصیت دی آواز سننا جنوں میں ستویں انھویں جماعت توں دیوانیاں وانگ پڑھدی آ رہی ساں۔ اودوں جدوں میرے گھر نیڑے پنجابی دیاں کتاباں نہیں ملدیاں سن۔ اودوں ہندی وچ سبھ توں پہلی کتاب پڑھی ”کالا گلاب“۔ اس کچی عمر وچ جدوں اینیاں گہریاں گلاں سمجھ وچ نہیں آؤندیاں، ”کالا گلاب“ دل دا دماغ اتے پتا نہیں کیہ اثر کردا گیا کہ میں دیواناوار اس وچلیاں ول توں چھوہن والیاں سطران

نوں لکیر دی گئی۔ تے فیر ”اک دا بوٹا“، ”پنجر“، ”ڈاکٹر دیو“، ”دلی دیاں گلیاں“، ”اک سی انیتا“، پڑھیاں۔ جس گیتا بک شاپ توں اک رُپے تے دو کتاباں کرائے تے لے کے آؤندی ساں، اوس نوں ہور کتاباں لیاون نوں کہندی۔ جدوں مینوں مہینے دا جیب خرچ ملدا تے گیتا کتاباں والا دی اوس کتاب نوں کرائے تے دے دے دے دے کافی پیسے کما چکا ہوندا تاں میں ادھا ٹل دے کے اوہ کتاب خرید لیندی۔ اودوں توں ای میری کئی جہی لائبریری دا آغاز ہویا۔ اوہ کتاباں اج وی میری نجی لائبریری دا ہنگار بن۔ اوس وچ بہت وڈا اضافہ ہویا امرتا جی دلوں ملیاں بچ جیسے سو کتاباں تال۔ فیر میں ”ناگ منی“ یعنی شروع کیتی۔ امرتا امروز دے وچاراں دی قائل ہوندی گئی۔ ہولی ہولی سبھ نوں امرتا جی پرستی میری کریر دا پتا چلدا گیا۔

خیر مکمل جہات توں اگے آئیے۔ فون دے دو بچے پاسیوں امرتا جی بول رہے سن۔ ”کل میرے گھر آسکدے او؟ میرا پتا ہے۔۔۔۔۔“ میں ہس پئی، ”تھاڈا گھر میں دیکھیا ہے۔ کئی وار راتیں سیر کردیاں تھاڈے گھر دے کولوں لنگھی ہاں۔ (بہت پہلے دو وار اوس گھر وچ جاوی چکی ساں اک وار پرھنسک دے طور تے اتے اک ویر جوگی دیدی (دیو دی بچی) دا کوئی مسیج لے کے) سو کہیا ’کل آواں گی‘ فون بند ہو گیا پر جویں یقین نہیں آ رہیا سی۔ اپنی نوکری تے جد اگلے دن گئی تاں بار بار دوستاں نوں کہندی، کسے نے مینوں مورکھ تاں نہیں بنایا، جو جاندا ہووے کہ میں امرتا جی دی سنک دی حد تک پرھنسک ہاں۔ پر دوستاں دا کہنا سی، جو وی اے، تینوں اک دیر ضرور جانا چاہیدا ہے۔ فیر جدوں ادھناں کول گئی تاں آؤن جان دا اچھا سلسلا قائم ہویا کہ اج تیک برقرار اے کئی دیر پر یوارک اتے ساجک کھجکناں کارن وچھ آ جاندی اے پر وقت دی سوئی نوں ایڈھر اودھر سرکا کے امرتا جی کول جان لئی سا کڈھ ای لیندی ہاں۔ جدوں وی اوہ مینوں یاد کردے بن، یاں مینوں ادھناں دی یاد آؤندی ہے، یاں اوس نیاز بو دی مہک وچ گواج کے آلے دوالے پھیلے ہوئے پردوشن توں نکت ہونا چاہندی ہاں۔

بہت سارے یادگاری چھن ہن۔ امرتا جی تے میں، کئی طرحاں دے بہت  
 سانجھے کہتے ہن۔ دوستاں دے، کولیگاں دے، لیکھکاں دے، پروار دے، عشق دے۔  
 اوہناں نال جڑیاں کئی موہ بھریاں سمرتیاں میری زندگی دا اکھڑواں حصہ ہن۔ کئی دیر  
 اچانک کوئی پرشن، کوئی وِشا، کوئی فیچر امرتا جی میرے ہتھ پھڑا دیندے۔ ایس طرحاں ملو  
 ملی چراں دا انتر من دے بھوریاں وچ پیا پتا نہیں کنا کجھ باہر آ جاندا۔ 'اک پرشن' دس  
 قدم، 'وِش باریاں' جے لیکھ ایسے دا پرمان ہن۔ بہت بیمار ہون دے باوجود میری کتاب  
 دے چھن وِش پوری دلچسپی لینا، بھومکا لئی موہن جیت دا ناں بھاوندا (جو اک کتاب دا  
 سبھ توں خوبصورت حصہ اے) کتاب دے فلیپ لئی لکھیاں امرتا جی دیاں چار سطران  
 ایس کتاب دا جیونت احساس ہن۔ ایس کاو سنگریہ "چھناں دی گاتھا" دا نام کرن دی  
 اوہناں کتھا۔ میری بیٹی دا میرے گھر آؤنا دی اوہناں دی پرینا صدقا ای ہے۔ جدوں  
 اوہناں نوں فون کر کے ایہ خوش خبری دتی، اوہناں نے اوس نوں دیکھنا چاہیا تاں کہیا  
 کسے دن لے کے آواں گی۔ کہن لگے، نہیں، اوہنوں دھپ ج نہ لیاویں۔ میں خُدا  
 دیکھن آواں گی۔ اوہنیں دینیں دی اوہناں دی طبیعت ٹھیک نہیں سی پر ایس دے باوجود  
 جدوں اوہ امروز جی دے سوڈھے دا آسرا لے کے میرے گھر دیاں چار پوڑھیاں چڑھ  
 کے آئے تاں میں اپنے آپ اتے رشک کر اُٹھی تے اوہناں پلاں چھناں نوں آپے  
 کیرے وِش قید کر لیا۔ اج دی مینوں اوہ سبھ توں اہل تحفا لگدا ہے جھوا اوہناں میری  
 بچی نوں دتا سی۔ امرتا جی ولوں ملیاں اوہناں دا دتا اک اک تحفا سانجھ رکھیا ہے۔ چاہے  
 اوہ کتاباں ہون، پھن دا لے سوٹ ہون (جو من تنگ تے چھوٹے ہو گئے ہن پر  
 اوہناں نوں کسے نوں دین دا من نہیں کردا) چھٹ پٹ ٹوماں ہون، کجھ ہور تنک  
 سک ہووے یاں فیر ملیم ایوارڈ تے دتا گولڈ میڈلس ہووے۔ فیر پچھے میرے سوٹ  
 دے رنگ نوں دیکھ اوہناں الماری چوں کڈھ کے چیکوسلوواکیا توں لیاندا اک خوبصورت  
 قیمتی برسلیٹ میری دینی تے بٹھ دتا سی۔ ایہ سبھ بیش قیمتی تحفے میریاں یاداں نوں دیا پک  
 بناؤندے ہن۔

امرتا جی، مہان لیکھکا ہون دے نال نال اجی بنداس شخصیت ہن، جس نے جویں چاہیا جیویا ہے میں اک معمولی، ادنا جی شاعر ہاں پر کجھ گھاں وچ اوہناں نال سانجھ ہے۔ ساڈے دوہاں دا ای پہلا عشق کتاباں ہن۔ چاہے اوہ کہندے ہن۔ ”مان سچے عشق دا ہے، ہنر دا دعوا نہیں۔۔۔۔۔“ چنگے انساناں، مٹھلاں، کتاباں بارے گل کردیاں، اوہناں دی چنگیائی دا مان دوہاں دے چہریاں تے ہوندا ہے۔ پورے سنسار وچ کسے نال دی ہوندی نا انصافی تے ساڈے دوہاں دا من بھر آؤندا ہے۔ جتھے اوہ ایس نا انصافی لئی امروز جی نال گل کر لیندے ہن، اوتھے میرے کول اجیا کوئی مکمل مرد نہیں۔ امرتا جی نوں اچھے ایس گل دی عمر جی طویل ستھٹی ہے کہ اجیا پورن مرد اوہناں دا حاصل اے۔ اوتھے کئی وار اوہناں نوں اک کسک دی ہوندی ہے کہ دنیا دیاں ہور عورتاں نوں ایہ پراپتی کیوں نہیں ہوندی۔ اوہ کئی وار جدوں اپنا رشتا چننا چاہندیاں ہن تاں سارے رستے بند کیوں ہو جاندے ہن۔ اوہ بہت وار ’ناگ منی‘ وچ پانٹھکاں دلوں کیچے گئے پریشاں دے امروز دلوں دتے جواہاں تے سویمان نال بھر جاندے ہن۔ اک وار کسے نے سوال کیتا ’عورت مرد دا رشتا ایسا الجھیا ہویا کیوں ہوندا ہے؟‘ امروز جی دا جواب سی، ”کیوں کہ اجے تیک مرد نے عورت نال سونا ای سکھیا اے، جاگنا نہیں سکھیا۔۔۔۔۔“ ایہ ہے اک مکمل مرد دا جواب۔ پر امروز جی دی گل وچ اضافہ کرنا چاہندی ہاں ایہ کہہ کے ”اجے بہتیاں مرداں نے صحیح معنے وچ عورت نال سونا وی نہیں سکھیا۔“

پچھے جے بوٹیاں، بھلاں دی گل چل رہی سی تاں میں کہیا دیدو! پتا اے اک بوٹے دا ناں لیلا بھنوں اے۔ حالاں کہ کتاباں وچ واڑ دی اک قسم دا ناں بھنوں آؤندا ہے۔ میرے گھر جنے وی مالی مہینے، دو مہینے بعد میری پسند دے، عام اتے گھٹ نظر آؤن والے ورلے بوٹے دے جاندے ہن اوہ سبھ ایس نوں لیلا بھنوں ای کہندے ہن۔ امرتا جی کہن لگے لیلا بھنوں ای ہونا اے۔ اک دم بچیاں ورگی جگیا سا سی اوہناں دی آواز وچ، اوس بوٹے نوں دیکھن دی۔ فیر میں اوہناں نوں لیلا بھنوں دا بوٹا دے

کے آئی۔ اوس دن جو وی ساہنے آئے، الکا، راجیش، امرتا جی اوہنوں کہن، ایہ امیا جھڑا  
 بوٹا لیائی اے، پتا اے ایہدا کیہ ناں اے۔ لیلا مجنوں“ اوس بوٹے دے چٹاں دا اتلا پاسا  
 سبز اتے پٹھلا سرخ لال ہوندا اے، اک پتے دی سدھ مٹھ دو رنگی ہون کارن ای شاید  
 ایس نوں لیلا مجنوں کہندے ہوں۔ ایس نوں کسے اُچی تھیں رکھو تاں گندا جویں دو  
 سریر ابھید ہوئے ہوں۔ خیر اوس دن توں بعد ہن جد وی ملیے ہسدے ہوئے کہن گے،  
 امیا! کسے بوٹے دا ناں ”ہیر“ دی ہے اے کہ نہیں۔ پتا کر۔ پچھے جے نیاز بو دا بوٹا  
 چاہیدا سی۔ اوہناں اگے گل کیتی، کہن لگے۔ نیاز بو دا بوٹا جس گلے وچ لکيا ہودے،  
 اوہدے نال جوڑ کے دوچا گملا رکھ دیو، اوس نال دے گلے وچ اوہدے بیج ڈگدے ہن  
 تے نواں نیاز بو دا بوٹا منگر آؤندا اے۔ میں اوہدے نال گملا رکھوا دیندی ہاں۔ کچھ  
 دنوں بعد جدوں میں فیر اوہناں دل گئی، کہن لگے، اوہ آپنا نیاز بو دا پودا لے جائیں۔  
 میں کہیا ”14 اگست نوں ایہ بوٹا وی لواں گی تے امروز جی دی بنائی پینٹنگ دی جس  
 دی اک مہینا پہلاں فرمائش کیتی سی (ایس دن میرے کسے نال دوستی دے 25 سال  
 پورے ہو جان گے تے ایس پینٹنگ وچ اوس چھن قید ہے جدوں امروز جی نے پہلی وار  
 امرتا جی دے پیلنگر والے گھر وچ اوہناں دے ہتھوں پرہیا کھانا کھادا سی۔ پتل  
 دی تھالی، اک روٹی، اک سبزی۔ ساہنے پیا پتل دا پتیلا۔ سادگی، سچ، سچ، تے خوبصورتی  
 دا دو سمیل) 14 اگست نوں میں اوہناں دل گئی، ہٹھاں ویڑھے وچ لیا کے دھرے نیاز  
 بو دے گلے نوں چک کے گڈی وچ رکھیا تے پینٹنگ لین لئی اتے دل نوں جان نوں  
 مڑی ای ساں کہ الکا کہن لگی۔ اُتے کوئی نہیں۔ امی جی ہاسپٹل ایڈمٹ ہن۔ بابا جی  
 وی اوتھے ہن۔ امی جی دا بلڈ پریشر بہت ودھ گیا سی۔ اوہناں نوں دیکھن گئی۔ اوہناں  
 دی کمزور صحت، مُندیائیں مُندیائیں اکھاں دیکھ کے رہ رہ اکھاں بھر آؤندیائیں تے بار بار  
 رب اگے ارداس کراں۔ پردردگار! امرتا جی نوں تندرست کر۔ اے کئی ورھے اوہناں  
 دی سانوں، ساڈے سماج نوں لوڑ ہے۔ اوہناں دیاں کتاباں نے اے ہزارں لوکاں دی  
 نمائندگی کرنی اے۔ راہ روشن کرنا اے۔ ایہو جہیاں ہستیاں تاں رہا توں وی صدیاں بعد

بھیجا دیں۔ ایہناں نوں کسے دی طرحاں دی تکلیف توں بچا۔ ایہناں دا نگہ ہمیشہ ملدا رہے۔ کئی وار اوہناں نوں میرے اتھرو پونجے ہن، مینوں گھوڑی وچ لیا ہے، ڈھارس نہایا ہے۔ پچھے جے دیش دیودی ہوری آئے دئے سن۔ راجیش وی اوٹھے سی تے گل چل پئی بھگت سنگھ دی۔ امرتا جی نے کوئی کتاب لکھی اوس وچوں مسعود منور دی لکھی بھگ سنگھ دی گھوڑی پڑھ کے گاؤن لگے۔ ہولی ہولی اوہناں دی اوڑ اتھروواں وچ بھجی گئی تے میں ایس احساس مند شاعر، احساس دل عورت دیاں بھادناواں اگے سیس نوؤندی گئی۔ کہن لگے پتا نہیں کیوں جد وی بھگت سنگھ دی گھوڑی نوں گاؤندی ہاں میرے اتے ایہی عالم طاری ہوندا اے۔ اوس دیاں قربانیاں نوں لوکی بھلی بیٹھے ہن۔ ایسے طرحاں میری امرتا دے بہت چاہن والے ہن پر اسے وی اوس دی دین دی صحیح قدر نہیں پئی۔

اج سویرے سویرے امرتا جی نوں ملن گئی۔ اوہناں نوں اوہناں دے پرانے رول وچ دیکھ کے من کھڑ اٹھیا تے رات بھر ہوشیاں وچوں نکلدی دعا نوں پورے ہوندے دیکھ اوس پروردگار شکریا ادا کیتا۔ ایس ویلے امروز جی ولوں دتی امرتا جی دی پستک ”اشو رنگ مجیٹھو“ میرے ہتھیاں وچ ہے۔ امرتا جی دے ایسے نویں مجیٹھرے رنگ وچ میں رنگی جا رہی ہاں۔ اپنا آپا بھلدا جا رہی ہاں۔ جتھے امرتا جی ایہوں نکسن ویلے اوٹھوئی ہو گئے، میں امرتامنی ہوندی جا رہی ہاں۔

(پہلی انتر : جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

## امرتا پریتم دی کا وسمویدنا

پنجابی کا وچٹن وچ امرتا پریتم دار چنا تمک بمب اک اجیہا سمویدن شیل لیکھکا دا ہے، جس نے اپنی کرتاری قلم راہیں عورت دی بے بسی نوں و بھن پرتاں اپر سنگاں وچ چتو یا اتے چتریا ہے۔ اس دی کا و سمویدنا دامل سر و کار عورت دی ترا سدستھتی دا پرما تک بودھ کرواؤنا ہے۔ اس دی گچی سا جک یا ترا دے آپار عورت دیاں دراسد ہونیاں دا ا لیکھ ہے۔ امرتا اوہ قلکار ہے جس نے خود عورت دی بے بسی اتے ستاپ نوں اپنے تن من اُپر ہنڈایا ہے۔ اس دی کا و سمویدنا دی پرما نکتا دار بس ہی ایہ ہے کہ اوہ تن جھاگے انو بھواں نوں بولی دین والی کوتری ہے۔ اس دی قلم دی شکتی ایہ ہے کہ اوہ بے باک اتے سمکالی ستھتیاں تے انتر وودھ پچھاندی ہے۔ اوہ اس سماج دی سازشی لیلا نوں جان دی پچھاندی ہے، جس وچ عورت نوں دیوی من دا بھرم پالیا جاندا ہے۔ اسے دیوی نوں جدوں ایہ سماج بھوگ دی گڈی بناؤندا ہے تاں اوہوں امرتا دی قلم ابھیاں منفی حکمتیاں وودھ تکھی سر وچ رچنا تمک بول اچاردی ہے۔ امرتا دے ایہناں کا و بولاں وچوں امانوی حکمتیاں دا داغی اتے کالا چتر جگ ظاہر ہندا ہے۔ امرتا دی کا و سمویدنا دی شکتی ایہ ہے اس وچ دھرتی جائی دھی دے ستاپاں نوں آواز بن کے ارتھ دتا گیا ہے۔ اوہ اوہناں پرستھتیاں دا کا و ویک اُساردی ہے جو عورت نوں ان ہویاں بنا دیندیاں ہن۔ ایہناں منفی ستھتیاں وودھ جاگروک قلم نوں پچھاندیاں ہی امرتا دی کا و سمویدنا دھرتی دی چیتنا بنی ہے۔ اسے نے ہی امرتا نوں عورت دی بلند آواز بنایا۔ ایہناں ارتھاں وچ اس نوں جیوندے بولاں والی کوتری منیا گیا ہے۔

ایہ تھہ تاں سپٹ ہے کہ پنجابی ساہت ہی نہیں، کسے دی بھاشا دے ساہت وچ تاری دی سمویدن شیلنا دی ابھویا کتی کوئی لیکھکا ہی و دھیرے خوبصورتی اتے تیکھٹنا نال کرسکدی ہے۔ پنجابی ساہت جگت وچ امرتا توں پہلاں استری دی گل مرد لیکھکاں نے ہی کیتی پر اس وچ اوہ دم نہیں سی، اوہ گھبرتا نہیں سی، اوہ



ہمدردی وی نہیں سی جو امرتا دیاں لکھتاں وچ ہے۔ اپنے ہنڈائے دکھاں کارن عورت ہی عورت دیاں تکلیفاں اتے تراسدیاں بارے و دھیرے محسوس کردی ہے۔ عورت دی عورت نال ہمدردی پچی تے سجاوک ہندی ہے جد کہ مرد لیکھکاں ولوں دکھائی گئی ہمدردی دکھاوے والی جاں اوپری جاں اپچارک ہی لگدی ہے۔ اسے لئی امرتا دیاں رچناواں و دھیرے جیوندیاں جاگدیاں جاچدیاں ہن۔ اوہ انسان دی روح اندر دور تک جھاگدی ہے تے فراوہناں انتریو جذبیاں نوں کاغذاں اتے پھلاں وانگ کھار دی ہے، بھانت بھانت دے پھل، خوشگوار پھل، پریم بھجے پھل، رنگ برنگے پھل، مسدے پھل، روندے پھل اداس پھل، سجرے پھل، مرجھائے پھل، طرح طرح دے پھل۔ اک مہمان لیکھکا اک اجی شاعرہ جس دا بچے تک کوئی ثانی نہیں کیونکہ امرتا امرتا ہے تے اس ورگا کسے ہوو دا ہونا بڑا کنھن ہے۔

انج تال ساہت دے ہر روپ نوں امرتا نے بہت کجھ دتا۔ بھادیں کہانی ہووے جاں ناول، سفرنامہ ہووے جاں ہوو دارتیک پرکوتا نوں جو نکھارتے حسن امرتا نے عکسیا اس دی مثال اوہ آپ ہی ہے۔ انوواد تے سمپادنا دا خیر وی نہیں چھڈیا۔ پر اس دی اصل پہچان اک بہت وڈی کوتری دجوں ستھاپت ہوئی۔ اس نے شروعات وی کوتا لکھن نال ہی کیتی جد اوہ کیول گیارہ ورھیاں دی ہی سی۔ امرتا نوں 'استری دی آواز' کر کے جانیا جاندا ہے۔ اس دیاں رچناواں داملول دھرا استری ہے جو کچے سنسار تے سماج دے ہتھماں ستائی جاندی ہے۔

صدیاں توں مرد پردھان سماج وچ استری گلیاں سڑیاں قدراں قیمتاں دا انوسرن کردی رہی ہے تے کچی سماجک دستھادے تحت مرد دیاں دھمکیاں نوں اپنی ہونی سمجھ کے بھگتدی رہی ہے۔ اتھاسک سویمیاں دے انومان انوسار پورو ویدک کال وچ تاں استری دا سماج وچ درجہ سنو کھجک دسیا جاندا ہے۔ ویدک کال دے شروع شروع وچ وی حالات ٹھیک ہی سن پر ہولی ہولی ناری نال انیاں تے جبر و دھن لگاتے اس دا سماج وچ درجہ نگوٹا جیہا بن کے رہ گیا۔ مرد پردھان سماج وچ ہوو دستواں دان کرن وانگ استری نوں وی دان وچ دین دی پر تھا چل پئی۔ اوہ اپنی بلیمین ہو گئی کہ گاواں بھھاں وانگ ماس دا ایہ بت خریدیا ویکھیا جان لگا۔ امرتا پریتم نے عورت دی اس تراسدی نوں جس شدت نال اپنیاں کوتاواں وچ چتریا ہے۔ اوہ اپنے آپ وچ مثال ہے۔ 'کنیا دان' کوتا وچ امرتا نے ناری دی اسے ستھتی نوں پیش کر دیاں لکھیا سی:

ماس دی بوئی



ککھ دی بوٹی  
 واہ واہ دانی  
 واہ واہ راستے  
 کڈے کرم کمان  
 جیہڑے جھولی تگن  
 اوہی ہی پروان  
 کنیا دان کنیا دان  
 ہوئے کلیان.....

### کنیا دان مہاں کلیان

امرتا پنجابی سہت جگت دی اوہ عظیم کوتری ہے جس نوں وڈے وڈے شاعراں، کویاں،  
 ساہتکاراں نے وکھ وکھ دھیشناں نال نال نوازیہ ہے۔ اردو دے پرسدھ شاعر محمد اقبال نے امرتا نوں دب  
 درشنی والی اکھ، مہر گیت گاؤن والی بلبل کہہ کے سنا نیا ہے۔ جیت سنگھ سیٹل نے اس نوں سہت گنگن واچندر ما  
 پچڑھدے پنجاب دا تیز سوی سورج کیہا ہے۔ امرتا وارو جد چم سیما تے پہنچدا ہے تاں ایہ لوک آواز بن  
 جاندا ہے۔ اس دے لوک گیتاں اتے کوتا دے بولاں وچوں اس دی آلوچنا تمک درشنی جھلکدی ہے۔ سماجک  
 تے اتہاسک پچھو کڑی دھر تل تے اس دیاں کوتا داں دے بول بھلے مے کن۔

امرتا عورت دی آواز دی چا ہوان ہے پر اس دے وچار انوسار آدمی دی سوچ نوں پہلاں بدلنا  
 پڑے گا۔ اس دا اپنا ایہ کہنا ہے، ”مے تک آدمی کیول عورت دے سریر دے سواد نوں ہی جان دا آیا ہے۔ اس نے  
 عورت دے مے کن دی دنیا ج جان اتے اس دی سندرتا نوں پہچان دی کدے وی کوشش نہیں کیتی، اس لئی مانو  
 تاری دی آزادی دی تھاں آدمی دے مے کن نوں سنسکار دین اتے ویک شیل بناؤن بارے کجھ دھیرے ہی  
 سوچنا چاہیدا ہے اتے اس کھیر وچ ٹھوس قدم کرنا چاہیدا ہے“

امرتا دا کا دستر اصل وچ ’ٹھنڈیاں کرناں‘ (1935) توں شروع ہویا تے کاؤنگر یہاں دا ایہ قافلہ  
 ’امرتا لہراں‘ (1936)، جیوند جیون 1939، تریل دھوتے پھل 1947، اوہ گیتاں والیاں 1942، بدلاں  
 دے پے وچ 1943، شجھ دی لال 1943، مگی جی سوغات 1944، لوک بچ 1944، پتھر گپے 1946،

لیاں داٹاں 1947ء، میں تواریخ ہاں ہندی دی 1950ء، سرگئی دیلا 1951ء، سنیہڑے 1955ء، اشوکا چیتی 1957ء، سکٹوری 1959ء، ناگ منی 1964ء، کاغذ تے کیونس 1970ء، میں جمع توں 1977ء آ وناں تر دا گیا۔

شروع شروع وچ اس دیاں کوتاواں اہمھاوک تے روایتی قسم دیاں سن پر ہولی ہولی ادھ-تھارتھ وادی ہو گئی تے جیون نوں بہت نیڑیوں ہو کے دیکھن لگ پئی۔ 'پتھر گیلے' نال اس نوں بہت پر سدھی حاصل ہوئی۔ اس سنگریہ وچ نرا شاہے بھٹکن ہے۔ دراصل ایہ دنیا ہی مرد دی دنیاں ہے جس وچ آرتھک وسیلیاں اتے اسے دا قبضہ رہیا ہے۔ سمجندھاں دا آدھار آرتھکنا ہون صدقہ عورت سدھی مرد اتے نر بھر رہی۔ اسے لئی صدیاں توں مرد اس نوں اپنی جائداد، جاں ورتوں دی اک دستو دا انگ سمجھدا آیا تے عورت اس دے رحم کرم تے جیون دی رہی، اوہی عورت دا ان داتا سی۔ اس ان داتے اتے دیا انگ کر دی کوتری نے لکھی سی:

ان داتا میری جیجھ تے تیرا لون ہے

تیرا ناں میرے باپ دیاں ہوٹھاں تے

تے میرے اس بت وچ میرے باپ دا خون ہے

میں کوں بولاں، میرے بولن توں پہلاں

بول پیندا ہے ان تیرا.....

امرنا پریم نوں 'چم دی گڈی' تے ان دی برکی دا ذکر کر کے ناری دے سنتاپ نوں گہرائی بخش دی

ہے۔ عورت دی ترس جوگ حالت درساؤن لئی اس نے 'گیوشالا' کوتا وچ اس دی تلنا گیوناں کہتی۔

ویاہ درگے پوتر بندھن انوسار دی ناری توں کنا کو سمنان پراپت ہے، اس دی کوتا 'ویو پار' اس

بارے دیا انگ کر دی ہے:

جسساں دا ویو پار

نکڑی دے دو چھاپیاں

نکڑی دے دو چھاپیاں دا کر

اک مرد اک نار

اک بازار تاں گا دجا کے

اشٹ دیو دی منھ تار کے  
 سودے تے اک سوہر لو کے  
 دن دیہاڑے دھگن دے دی  
 ہو جان دے حقدار

پیار محبت ورگا خوبصورت جذبہ رکھن دا عورت نوں ایہ سانج اوھیکار نہیں سی دیندا۔ امرتا 'راکھے' اوہناں دو غلے لوکاں اتے تیر چلاؤندی ہے جو پیار دے تاں دشمن بن تے پیار کرن والیاں اتے کوڑی اکھ رکھ دے بن۔ اوہ تاری دے اندر چیتنا پیدا کرن لئی جتن شیل رہی ہے تے طرح طرح نال اس نوں بلوندی رہی ہے۔ اوہ چاہندی سی کہ عورت نوں وی صحبت ورگا خوبصورت احساس پرگٹاؤن واجب ہووے تے عورت دی آزاد ہو کے آسمان وچ خوبصورت پنچھی وانگ تاریاں لاسکے۔

امرتا دی کوتاؤچ وکھ وکھ سا جگ سروکاراں دی پیشکاری ہے۔ مثال بھاویں عورت دی برابری دا ہووے جاں انسان انسان دی برابری دا، پر اس درشتی کون نوں اوہ بہت کبیر تال لیندی ہے۔ 'پتھر کیٹے'، 'لمیاں وانان'، 'نفرت' تے 'جھلیاں' ورگیاں رچناواں اس دی مایوسی نوں سنجیدگی نال پیش کردیاں بن۔ ساجک بے انصافی دے خلاف امرتا نے 'سستہڑے' وچ بلند آواز اٹھائی۔ اس دا نجی غم مانوتا دا درد بن کے ابھر دا ہے۔

اپنے ویش دی دردناک وٹھ دے ڈراوے درش تے ہو کے اس دی سرو شیرشٹ کوتاؤچ اج وی اسیں اسے شدت نال سن سکدے ہاں۔ جس وچ اوہ وارث شاہ نوں مخاطب ہندی ہے.....

اک روٹی سی دھی پنجاب دی  
 توں لکھ لکھ مارے دین  
 اج لکھاں دھیاں روندیاں  
 تینوں وارث شاہ نوں کہن

'پتھر کیٹے' وچ ساجک اتیاچار دے عام پر بھاو دا بلنجی انو بھو وچوں گر بن کیتا ہویا ہے پر 'لمیاں وانان' وچ ایہ دکھ آس پاس پھیلے دکھ توں جاگرت ہویا ہے۔ 'لمیاں وانان' پنجاب دی وٹھ کار د پیدا ہوئے سنتا پ نوں لبو تال بجی قلم نے درد دے غمیاں اتے ہندا ہے عورت۔

ستھاپت قدراں قیمتاں پر تہی کوتری بھاویں خراش دی ہے، دکھی دی ہے، ودرودہ وی کردی ہے پر  
 نال ہی اس نوں بھروسہ ہے مانوی سچاء دی چنگیائی وچ اوہ آسوند ہے کہ منکھ دے حالات بدلن گے۔ اس دا  
 پیار وچ بھروسہ ہے۔ منہیڈے دیاں سند رکوتاواں وچ رتاں نوں مناؤن تے ایہناں وی سندرتا دا چتارن  
 ہے جس وچ آشتا تے تراشاد وہاں دا انو بھو ہندا ہے۔ اس وچ سا جک سنیہا ہے، اس وچ آس ہے۔ اشوکا جیتی  
 دا پھل ہے پیار دے پر تیک دا۔ امرتا دی شاعری وچ ٹیکور وانگ صحبت دے جذبے نوں پروان کھٹا گیا ہے۔  
 کیونکہ ایہی جذبہ انسان نوں انسان بناؤندی ہے۔ امرتا عورت نوں تیار کردی ہے کہ اس پیار دی بھکھیا نہ منگے  
 سگوں اپنے حق پر اپت کرن لئی سنگھرش کرے اتے حاصل کر کے رہے۔ اس دیاں کوتاواں کیول رمانچک ہی  
 نہیں ہن اوہناں وچ اک روحانی گمن وی ہے تے۔ تھمار تھہ دی روح دی۔ اوہ پیار بارے کہندی ہے، پیار  
 میرے لئی سدا کامل بن کے آیا، اک شکتی جس نے مینوں پریریا ہے، مینوں جگایا ہے۔ جو یں دو یگانہ جی  
 کہندے ہن: سرب گیان تہاڈے اندر ہے۔ پر تہانوں اک ہو رگیان دی لوڑ ہے جس دی روشنی وچ تنہیں  
 اپنی روشنی دی پرکھ کر سکو۔“

کوتا وانگ امرتا دیاں کہانیاں تے ناواں وی عورت نال ہندے انیاں، ظلم تے اس دیاں تکلیفاں  
 دی گاتھا بڑی بلند آواز وچ سناؤندے ہن۔ سا جک کوریتیاں تے دھار مک فساداں دے دکھانت نوں بڑیاں  
 تیکھننا نال پیش کروے ہن۔

امرتا پنجابی سادھت جگت لئی اک بہت وڈا اور دان ثابت ہوئی اتے منکھ لئی اک چائن منارا سی۔  
 پیار دے گیتاں دی مہان کوتری نے پیار نوں سرور شریٹ منیا، پوجیا تے بھجایا۔ اس انوسار پیار زندگی دی صحیح  
 ارتھناں وچ تلاش ہے تے پیار ہی منکھی جیون دا سمجھ توں وڈا قانون وی۔ تے اسے قانون وچ رہ کے اس نے  
 اپنا سارا جیون بھجایا۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ”رسیدی ٹکٹ“ دا ولکھن جگت

لیکھک دی شخصیت دے بہت سارے کچھ تاں پرکھ تے اپر تکھ روپ وچ اوہدیاں لکھتاں وچ ہی پنے ہندے ہن۔ پرفروی لیکھک دا بہت سارا نچ ان کیہارہ جاندا ہے۔ لیکھک دی زندگی دے اوہناں کچھاں تے پریرناواں وچ پانھکاں دی اتمکناوی بڑی ہندی ہے۔ جیہڑے اوہدیاں لکھتاں دے پیچھے کم کردے ہن۔ بھاویں بہت سارے لوک سوے جیونیاں نوں ایہ کہہ کے نکار دیندے ہن کہ ایہ تاں لیکھکاں دے نچی برتانت ہن۔ پر چرچت دے سٹھاپت لیکھکاں تے ویاکتیاں دا نچ وی نچ نہیں رہ جاندا۔ ایہ گل بڑی مہتو پورن ہندی ہے کہ سماج دے کیہڑے حالات، اوہناں نوں بھیڑ وچوں کڈھ کے باہر لیائے، کتھے کتھے سماج دے حالات اوہناں دے پیراں دیاں بیڑیاں بنے تے اوہناں اس درونوں اپنیاں لکھتاں وچ اتاریا اتے کہناں حالات تال اوہناں نکلر لئی تے سماج نوں اوہدا در پن دکھاؤندے ہوئے، اوہناں اگلیاں پیڑھیاں لئی نویں راہ تلاش کیہتے۔ اس لئی سوے جیونی ساہت جگت وچ ایہ گل سٹھاپت کردی ہے کہ لیکھک تے لکھت، دوویں مہتو پورن ہن۔ ویلیاں نوں، سماج نوں چاہیدا ہے کہ ایہناں نوں کجھن اتے سنبھال کے رکھن۔ جدوں کسے لیکھک دی سوے جیونی اوہدیاں لکھتاں وانگ ہی چرچت ہندی ہے تاں اس سنبھال دی لوڑ ہو روی ودھ جاتی ہے۔

امرتا دی سوے جیونی ’رسیدی ٹکٹ‘ ایہناں ساریاں گلاں کر کے مہتو پورن ہے۔ ’رسیدی ٹکٹ‘ پہلی واری 1976 وچ چھپی سی، فراس دے تن ایڈیشن ہو چھپے اتے پنجویں وار 1997 وچ امرتا نے اس نوں نویں ترتیب وچ 1997 تک دی زندگی تک لے جا کے پرکاشت کیا۔ 1997 دی اس نویں ترتیب والی ’رسیدی ٹکٹ‘ ہی میری چرچا دا آدھار ہے۔ پہلی ’رسیدی ٹکٹ‘ وچوں اوس نے کجھ حادثے درتے کڈھ دتے اتے اگلی زندگی دی یا ترانوں وچ شامل کردتا۔ ایہ اوس نے بہت سچیت روپ وچ پہلے صفحے اُپر ہی لکھیا ہے۔

کئی حادثے جدوں دا پر رہے ہندے ہن  
 ہنے ہنے لگے زخماں ور گئے  
 تاں اوہناں دی کوئی چھس اکھراں وچ اتر جاندا ہے  
 پرویلا پا کے احساس ہندا ہے کہ  
 ایہناں گھلاں نے لمبے لمبے لئی ساہت نوں کجھ نہیں دینا  
 ایہ وقتی دا، ورو لے ہندیاں ہن.....

اس 'رسیدی نکٹ' وچ شخص امرتاوی ہے، لیکھک امرتاوی، اوہ امرتاوی ہے، جو اپنیاں نظماں،  
 جاولاں، کہانیاں، وارنک تے 'ناگ منی' وچ موجود ہے اتے اوہ امرتاوی، جو ایہناں لکھتاں توں باہر رہ گئی۔  
 اس وچ سچیت امرتاوی ہے، اتے امرتا دا اچیت دی، جو اوہدیاں لکھتاں تے جیون دا آدھار بنیا۔ پنجابی وچ  
 بہت سارے پرسدھ لیکھکاں نے اپنیاں سوے جیونیاں لکھیاں ہن، پر اک عورت لیکھک دی سوے جیونی  
 ہون کر کے، وکھریاں جیون پرستھتیاں، سماج دے ستھاپت پر پر بندھ نال ٹکراؤندیاں اک وکھری جیون شیلی  
 اپناؤن دی جرات کرن کر کے اتے اک نویٹگی کاوک شیلی کر کے 'رسیدی نکٹ' دی دنیا بڑی دکھن ہے۔

سوے جیونی وچ لیکھک دا ہندا تاں نج ہی ہے، پر کوئی لیکھک جتنا چر اپنے آپ توں وٹھ تے کھڑا  
 نہیں ہندا، اوہ کوئی دی نکھت تے سوے جیونی وچ نہیں لکھ سکدا۔ سوے جیونی وچ لیکھک اک ویلے اپنے جیون  
 دے دریا وچ اتریا وی ہندا ہے اتے کنڈھے تے دی کھلوتا ہندا ہے۔ امرتا سوے جیونی دے اس سدھانت  
 پرتی بہت سچیت سی۔ اوہ لکھدی ہے:

"سوے جیونی نوں اکثر چلکدی چلکدی اکو سی سچائی سمجھیا جاندا ہے، سوے شوا گھا دا منری  
 مادیم۔ پر بنیادی سچائی نوں لیکھک دی اپنی لوڑ من کے میں اپنی چاہوا لگی ایہ سوارتھ توں۔ تھار تھ تک پنشن دا  
 اصل ہے۔"

اک کجھ اوہ ہندا ہے جو ساہویں، بناں کسے تردد دے نظریں پے جاندی ہے، تے اک صرف کجھ  
 اییاں دسدے، تے اک سوچاں نوں چھان چھان لکھدا ہے، "تھار تھ اوہ وی ہندا ہے، اوہ وہ تے اوہ وی۔"

ہرکلا، اُساری وچوں مڑ اُساری داناں ہے۔ ایہ تھار تھ دی مڑ اُساری دی۔ تھار تھ ہے۔ سچائی  
 دی ککھ وچ پے کے فیروں ککھ وچوں نری ہوئی سچائی۔ تھار تھ دی مڑ اُساری، تھار تھ توں۔ تھار تھ تک

بچپن دا اصل ہے۔“ (پنا 100)

اپنی گل نون اگے تور دیاں امرتا سوے جیونی دج لیکھک تے پاٹھک دے رشتے پرتی ایمانداری پرگٹاؤندی ہے:

”ناول کہانی دا پاٹھک، پاتراں دے مونہاں نوں قیاس دا ہے، اوہناں دے دلاں دی پلچل توں اوہناں دے نقش چتو دا ہے، پرکے سوے جیونی دا پاٹھک اپنا سارا دھیان اکو تے جانے ہوئے منہ استے کیندرت کر دا ہے۔ ایہدے دج لیکھک تے پاٹھک سمکھ ہندے ہن۔ ایہ لیکھک دا اپنے گھر دج پاٹھک نوں نچی بلاوا ہندا ہے، سنگ سٹکوچ دی ولیز توں اندر وار۔ تے ایہ صرف او دوں سمکھ ہندا ہے جدوں لیکھک دا جیرا اوہدے کسے سچ نالوں اوتانہ ہووے۔ ایہدے دج کوئی جھوٹھ، مہمان دی نہیں، میزبان دی اپنی ہٹک ہندی ہے۔“ (پنا 100)

امرتا ’ریدی ٹکٹ‘ دا ارنجھ لیکھک تے لکھت دے اک ہون توں کردی ہے، ”جو کجھ واپریا، من دیان تہاں دج واپریا، تے اوہ سارا کجھ نظماں تے ناولاں دے حوالے ہو گیا، فیرباتی کی رہیا؟ فیرو دی کجھ سٹراں لکھ رہی ہاں، کجھ انج، جو یں زندگی دے لیکھے جو کجھ دے کاغذاں اتے لکھی جی ریدی ٹکٹ لا رہی ہوواں۔ نظماں تے ناولاں دے لیکھے جو کجھ دی کجھی رسید نوں پکی رسید کرن لئی۔“ (پنا 9)

سوے جیونی دا ایہ سوتر سچیت ہے جاں اچیت، پر پوری ریدی ٹکٹ دج مھیلیا پیا ہویا ہے۔ اس دج امرتا دی جیون یا ترا، شخصیت دے وکاس اتے لکھت یا ترا دے دو بمب ابھر دے ہن، جیہڑے اوہدی زندگی، شخصیت اتے لکھتاں دے پیراڈائیم بن دے ہن:

”لوک آکھدے نیں، اوں عورت نے جیہڑے محبت دے گیت لکھے، اوہ لال رنگ دے گلاب بن گئے نیں، تے جیہڑے درد داں دے گیت لکھے، اوہ گلاب کالے رنگ دے ہو گئے نیں، تے جیہڑے اوہنے منکھی پیار دے گیت لکھے، اوہ چٹے گلاب دے پھل بن گئے نیں۔“ (پنا 41)

ایسے طرح اوہ اپنی مانسک اوستھا دے چار پڑاواں دی گل کردی ہے:

”پہلا پڑاوا اچیتکنا۔ ایہ اک بال بدھ دا لکھی، جس نوں ہر چیز اچنجا لگدی ہے۔ جس نوں چھوٹی توں چھوٹی چیز دج وڈی توں وڈی دلچسپی جاگ چیدی ہے تے جیہڑی جھٹ وک اردی ہے تے جھٹ ورج جاندا ہے۔



دوسرا پڑا ہی چیتا۔ اک اک موکلے انگاں والی تے ہندو جیل جرائی وانگ سی، جس دا ہور بڑا انگڑا  
ہندا ہے، بڑا رتا۔ جیہڑی، زندگی دیاں غلط قیماں نال جدوں رس بہندی ہے، من وچ نہیں آؤندی۔ تے  
جیہڑی اک متھ دا نگوں نفرت نوں منی سمجھدے اپنے متھے وچ سانجی رکھدی ہے۔

تیسرا پڑا ہی دلیری۔ درتھان نوں اوہیڑن والی تے بھوکھ نوں سون والی دلیری۔ سپیاں نوں تاش  
دے پتیاں وانگوں رلا کے تے ونڈے کے کوئی کھد کھدین والی دلیری، جس دی کوئی وی ہارسد یوی ہار نہیں ہندی  
جس دے سپتے مڑ رلائے جاسکدے ہن، تے جت دی آس مڑ کے بھی جاسکدی ہے.....  
تے ہن چوتھا پڑا ہے اکھتا..... (پنا 44)۔

ایہناں بہاناں دے آدھار تے 'رسیدی ٹکٹ وچوں لیکھکا دا جو پہلا روپ ابھر دا ہے، اوہ اک  
درد مند کڑی دا ہے۔ پچھن وچ ہی ماں نوں گواہی ملی ایہ کڑی، پتا دے دھرم آدرش اتے اپنے کچے کچے سپیاں  
وچا لے گھر جاندی ہے۔ پتا اوس نوں دھار مک، سماجک سنسکاراں وچ پالنا چاہندے سن، پر جوان کڑی دے  
سپنے اس آدرش جذبے نہیں ہوسکدے۔ پتا دھرم اتے پانچھ داسر کھیا دا کلا اوہ دے دوالے اُسا دے اتے کڑی  
جان بچھ کر اوس وچوں ہیریاں کر کے اپنے سپیاں دے ٹائیک نوں اندر داخل کر لیندی۔ پتا چاہندے سن کہ  
دھی دھار مک کو تا لکھے، پر دھی اپنے سپیاں دے ٹائیک نوں سمودھت سی۔ چار سال دی عمر وچ نیزلی رشتے  
داری وچ منگی اس کڑی دا سولاں سالاں دی عمر وچ دیاہ کر دتا گیا۔ پر دیاہ دا ایہ پر بندھ اوہ دے سن اتے  
سپیاں دے پیچ نہ آیا۔ اس لئی سولھواں ورہ اوہ دے اندران ہنڈایا رہ گیا۔ تے اس نوں اوہ اپنیاں لکھتاں وچ  
اتارن لگی۔

'رسیدی ٹکٹ وچوں لیکھکا دا دو چار روپ اوس درد مند عورت لیکھکا دا ابھر دا ہے، جس نے بھر جوانی  
دے ورھے تیرے درد دے سنگ ہنڈائے۔ سپیاں دا ٹائیک سامنے آکھلوتا، پر اپنیچ ہو گیا، ان چاہیا دیاہ  
اوہدی مجبوری بن گیا اتے ان چاہے چاہن والے اوہدی نفرت بن گئے۔ پر امرتا نے مجبوری تے نفرت نوں  
اپنی زندگی وچ ٹھہرن نہیں دتا اتے اپنے احساس تے لکھتاں محبت نوں سرپت کردتیاں:

رل گئی سی اوس وچ اک بوند تیرے عشق دی  
ایس لئی میں عمر دی ساری کڑتن پی لئی۔

ساحر دی محبت دے درد نوں اوس نے امرودی محبت وچ بھلا دتا۔ اوہ امرودی دے درویشی امراں



وچ اذان بھرن لگی۔

’رہیدی نکلت وچوں لیکھکا دا تیجاروپ اک جرت والی عورت لیکھکا دا ابھردا ہے، جس نے ادھوری محبت دے درد نوں وی پار کیتا، فرجموڑی وی پنجابی لاہ کے امروز ورگے من دے ساتھی نوں جیون ساتھی بناؤن دی جرات کیتی اتے اوہدی دیوار اٹلی۔ تے نکعتاں ایر لگا تار لگدے الزاماں نوں پار کردیاں اپنے سچ اتے نکعت دے سچ نال ایمانداری نال وچھد بہ ہندی، صرف پنجابی ہی نہیں، انیکاں مکاں اتے بھاشاواں دے سبابت جلت اپر ستر ورھیاں تک پھائی رہی۔

’رہیدی نکلت وچوں لیکھکا اک روپ نجاست لیکھکا تے زخم دا ابھردا ہے، جو اپنے درد نوں اوکاں دے درد وچ وی گھول ہندی ہے اتے اپنے درد نوں پار کردیاں، اپنے جے سمودین شیل لوکاں دے درد نال جزوی، منھنی مسئلہاں نوں سماجک، راج تھیک اتے دھار مک سندر بھان وچ سمجھدی، راشٹری انتر راشٹری پدھر اوپ، منھنی سمودینا نال سانجھ پاؤندی ہے۔ قریب 20-15 دیشاں وچ گھمدی امرتا اوتھوں دے لوکاں دی سمودینا نال سانجھ پاؤندی۔ اوتھوں دے سبابت، لیکھکاں، چٹکاں اتے آگوداں نال شاعری تے چٹمن دیاں نکلاں کردی۔ ہر ملک دی شاعری دا پنجابی وچ ترجمہ کردی۔ ویٹام دے لیکھکاں نال گل کردی امرتا دعا کردی ہے،

”کاش ساری دنیا دیاں خوبصورت نظماں دل جان تے اوہ ویٹام دی راکھی کر سکں.....“ (پنا

(65)

”اج آکھاں وارث شاہ نوں“ ورگی نظم اتے ”رب خیر کرے میرے دیرے دی۔“ گاؤن والی امرتا نے کتے دی بولدیاں لکھدیاں اپنی کاوشلی نہیں چھڈی۔ 1986 وچ اوس نوں کٹھ منتریاں دی اک کانفرنس وچ غیر سرکاری بارے وچوں شامل ہون دا موقع ملیا تاں اوس آکھیا:

”اک ویاسی جدوں کیرل وچ جاتی دادوی بھیا نکتا نوں دیکھ کے سوامی دوکاند نے کیہا سی کہ کیرل، بھارت دا پاگل خانہ ہے۔ اج میں بھریاں اکھاں نال کہنا چاہندی ہاں کہ ایس ہر پرانت نوں بھارت دا پاگل خانہ بنا رہے ہاں۔“ (پنا 117)

اس توں بعد اوس نوں راج سجاد دی ممبر نامزد کیتا گیا۔ سند وچ وی اوس نے بھارت پاک سمبندھاں تے انتر کت شاعرانہ ادبیاں دیاں مشکلاں، وپار کیرن، آسام دے ویشٹوٹھ وچ عورتاں دے

داخلے تے پابندی، قانون و دستھا نال سمبندھت اتے لیکھکا دیاں کئی سمبندھت نال سمبندھت مذہب  
اٹھائے، جہاں دا ذکر اوس نے 'رسیدی ٹکٹ' وچ کیتا ہے۔

'رسیدی ٹکٹ' وچ لیکھکا دی شخصیت دا اوہ روپ وی اجاگر ہندا ہے، جو سارے حادثیاں، گلے  
شکوے، درد، سویدنا تے سوالاں توں پار جاندا ہے۔ امرتا اس نویں 'رسیدی ٹکٹ' وچ پہلی 'رسیدی ٹکٹ' والے  
گلے شکوے تے درد دا ذکر خفی کر دیندی ہے۔ کیونکہ نہ تے تھیں صرف کہانیاں تے اتہاس بن دے ہن،  
حادثے تے دکھ دین والے داناں کوئی وی ہوسکدا ہے، تھیں کوئی وی ہوسکدا ہے، پر اوہ ادھناں تاواں تھیاواں  
نوں چھڈ کے سیاہ طاقاں دے سار تک نوں پہچانن دا حقن کردی ہے۔ زندگی دے کج سویکا رنوں پہچاندی  
پریشان توں پار جان دی اچھا اپنی گل سمیٹدی ہے۔ درد دی سویدنا توں کج تے کج دل یا ترا کردی امرتا  
ادھیاتمک کج وچ جا اتری ہے۔ اک ادھیاتمک ورثے وچ پیدا ہوئی امرت کور، جو پہلاں اوس ورثے  
دے بندھناں ورو دھ بغاوت کردی ہے، پر ہوئی ہوئی کج سویکا رنوں بعد اوسے طرح دی ادھیاتمک چیتنا وچ  
اتر جاندی ہے۔ جویں امرتا دی لکھت ویشاں تے بھاشاواں دیاں حدیں توں پار جاندی ہے، اوسے طرح  
امرتا دی چیتنا وی دھارمک دلگناں توں پار جاندی ہے۔ بچپن دیاں نکلیاں نکلیاں گلاں اوہ سچیت وچ اتر  
گئیاں تے فراوہدی راہبری کر دیاں رہیاں۔ 'رسیدی ٹکٹ' وچ سپیاں دا شکار تے دیا کھیا وی اوہ اپنے اوچتین  
وچ اترن واسطے کردی ہے۔ اس سوسے جیونی وچ اوس نے اپنی ساری یا ترا دے گاؤہ روپ وچ اپنیاں نظماں  
دے نال نال، اپنیاں کہانیاں تے نادلاں دے پاتراں نوں پیش کیتا ہے۔ امرتا نے اپنے بارے جو کیتا، اوس  
نوں پرتی بہت کرن لئی اوہ حادثے، اپنے پاتر، اپنے تے خیال.... سمجھنوں درپن وچوں پیش کردی ہے۔ ایہ  
سارے درپن سانوں امرتا نوں ہور سپشٹ ویکھن ویکھن لئی وی اتے اوہدی لکھتاں وچ وی ہور چنگی طرح  
اترن لئی مدد کردے ہن۔

'رسیدی ٹکٹ' امرتا دا اپنے مسکالیاں تے پنجابی لیکھکاں پرتی اک الانبھا وی ہے۔ بھاویں  
ادھناں وچ اوس دے چاہن والے سن، بھاویں کہانیاں گھڑن والے تے بھاویں اوس دیاں لکھتاں لئی  
ایکھاں وچوں ورو دھتا کرن والے۔ اصل وچ جدوں ساڈا کتے کوئی پر شمسک پیدا ہندا ہے، اوسے ویلے کتے  
ساڈا کوئی ورو دھتی دیکھن ویکھن پیدائندہ ہے۔ "اج آکھاں وارث شاہ نوں" کوتا لئی جتھے اوس نوں بھارت تے  
پاکستان وچ بہت پرسدھی تے پیار حاصل ہو یا اوتھے بہت ساری ورو دھتا دی ہوئی۔ ہور دی کئی لکھتاں اُپر

مقدمے تک دائرہ کرتے گئے۔ اپنے سمکالیاں لئی اوہ گلے نال بھری اوہناں نوں دیر شیر کہندی ہے تے:

میرا پنجاب - میرا کھیا کھانا باہل

میرے دیر شیراں نال رل گیا۔ (پنا 105)

پر سمکالیاں پر پی اس الا نیجے نوں اوہ نویاں پیڑھیاں توں اک امید نال دور کروندی ہے:

”میرے کول جو کجھ سی، جواج برف وچ دیا گیا ہے، تاں ایہ برفاں جدوں پگھرن گیاں،

ایہدے ندیاں نالے اوہ ہون گے، جو ایمان نال ہتھیں وچ نویاں قلماں پھرن گے تے اوہناں قلماں دی

شدت وچ، میرا اوہ کجھ وی رلیا ہووے گا، جواج چپ دی برف وچ دیا گیا ہے۔“ (پنا 100)

’رسیدی ٹکٹ‘ وچ امرتا نے کال کرم دی شیلی نہیں اپنائی۔ اوہ انج وی اتہاس جن وچ یقین نہیں

رکھدی سی۔ اوس نے سوئے جیونی نوں گھٹنا کرم اتے باہری تے انتریا تراوی ترتیب وچ پیش کیتا ہے۔ بھادریں

1997 وچ چھپی ’رسیدی ٹکٹ‘ وچ امرتا، امروز دے اپنے جیون وچ آؤن دے پر یوارک اتے سماجک

پرتیکرم نوں اتے۔ جتھار تھک کجھ نوں پیش کردی سی۔ ناگ منی راہیں، جو اوس نے پنجابی لکھنکاں دیاں تن

پیڑھیاں پر یرت کیتا، اوس دے ساکار تھک کجھ پیش کرسکدی سی۔ پر ہوسکدا ہے، اس سمبندھی ناگ منی وچ

بہت کجھ لکھ لین کر کے، اوس نے دہراؤن ٹھیک نہ سمجھیا ہووے۔ پر کسے سوئے جیونی وچ، لیکھک جو کہندا ہے

اتے جو جیوندا ہے، اوس وچ وٹھ نہیں ہونی چاہیدی اتے ایہ وٹھ ’رسیدی ٹکٹ‘ وچ نہیں ہے۔

’رسیدی ٹکٹ‘ امرتا اتے اوہ دیاں لکھتاں دی پتر سر جتا ہے۔ سنت اکستین دی کتاب

Confession نوں پہلی سوئے جیونی نیا جاندا ہے۔ اوہ لکھدا ہے:

”میرا من کتھے کوئی پناہ لہ سکدا اسی؟ جتھے وی میں جاندا ساں، میرا آپا فروی پچھے چھٹ جاندا اسی۔

ہے کوئی ایسی تھاں، جتھے میں اپنے آپے دا شکار نہ ہوواں۔“

’رسیدی ٹکٹ‘ وچلی یاترا وی اپنے اندروں باہر، باہروں اندر، اپنے آپ تک دی اتے فرا اپنے آپ

توں دی پار جان دی یاترا ہے۔

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم دار چنا تمک راہ

امرتا پر یتیم نے تیجے دھاگے دے اتر وچ ساہت دی دنیا وچ پرویش کیتا۔ اس سمبھ وچ لکھکا  
امرتا پر یتیم دی اُساری دے سے دے واستوک حالات اتے اک نگاہ ماری ضروری ہے۔ اس لئی اس سے  
دے ساجک اتے اتہاسک حالات اتے تیجے دھاگے بھارتی ساجک ورتارے اتے ویشیش طور تے پنجابی  
ساجک عملاں اتے امرتا پر یتیم دی پیڑھی دے لکھیاریاں دے ساجنے کڑھے سوالاں نوں سمجھادی اوشک  
ہے۔

کچھ اہمیاں باہریاں گھنٹاواں ہن، جہاں نوں بھارتی اتہاس دے دکاس تے پورا پر بھاو پایا۔  
ایہناں وچوں پر سکھ سن 1928 داسا مارج واد وچ پیا سبھ توں گہرا سنگت، بہتی واد پر بندھ داکھیر نوکھیر نو ہونا اتے  
ساجوادی ویشاں دا ودھد اجاؤ۔ 1933 وچ جرمنی وچ فاشٹ سرکار بنی اتے سارے وشو وچ نازی واد دے  
خلاف بیان ودھ گئے۔ 1939 وچ چھڑے دو بے وشیدہ نے بھارت نوں وی جنگ وچ کھچ لیا۔ بھارتی  
جٹادی اچھاوے ورودھ انگلینڈ نے بھارت نوں وی جنگ وچ شریک دھر قرار دے دنا اتے فاشٹ جرمنی نال  
یدھ وچ بھارت دے منکھی اتے مالی سادھنا دی ودھ توں ودھ درتوں دی کوشش کیتی۔ بھارتی ساج دے ہر  
حلقے وچ اس دے خلاف ورودھ پر گٹ کیتا گیا۔

تیجے دھاگے دے بھارت وچ آزادی لئی سنگھرش کردی جٹا اتے سامراج وادی طاقتاں وچ ٹاکرا  
ہور نکھا ہو گیا۔ 1929-1933 دے سنسار آرٹھک شکست دا بھارت دے کرتی جن سمو اتے بڑا ماڑا اثر پیا  
اتے اس دے نتیجے وچوں باستی وادیاں اتے سونتر تادے لٹھکاں دے وچکار ورودھ ہور وی تیز ہو گیا۔  
1928 وچ بھارت وچ سونتر تانگرا م دی اک نویں لہر اُچی۔ کساناں دی مہم نے تیزی پھڑی اتے بھارتی  
پردھاری نے اپنے اندولن نوں سرگرم کردنا ودھیرے پیا ناں وچ ہندوواں، سکھاں اتے مسلماناں اتے دو بے

دھرم دی ایکتا دی جھلک پیندی سی۔ پنجاب وچ سامراج ورو دھمی لہر کرانقی کاری سنگھرش داروپ دھارن کر رہی سی۔ سماج دے سارے ورگاں نے بورژوازی، بدھمی جیویاں نکلے تے وڈے زمینداراں اتے کساناں نے آزادی دی منگ دے نعرے دا مول انا گیا کاری لہر دے آرتھک نکلتیاں دا اتے سرکاری اتیاچاراں نوں روکن دی کانگریس دی سنگ داز ورو دار سر تھن کیتا۔ ویسویں صدی دے پورے نتیجے دھاکے وچ پنجاب دی اکالی لہر دے نکلے نعرے بھارت دی ہستی وادی غلامی توں مکتی اتے اس نوں اک ستمبر دیش بناؤ تاسن۔

انگریز ہستی واداں دی نیتی دھارمک اتے ذات پات دے بھید ور گیاں مدھکا لین پر پوراواں نوں بھکڑاؤن دی سی۔ اس دے نتیجے وچوں ایہ بھید ہوڑ و نکھرے ہو گئے۔ انگریزاں دی پوری کوشش سی کہ ہر دھرم دے پڑھے لکھے لوک صرف اپنی ساہتک بھاشا تک ہی سمیت رہن: مسلمان اردو ورتن، ہندو ہندی اتے سکھ کیول پنجابی۔ اس کر کے پنجاب دی سنسکرتک ایکتا نوں بھاری سٹ وجی۔ اک پر لکھ ساہتک اتے راج بھتک طاقت ہندیاں ہو یاں وی سکھ راج نیتی وچ سرگرمی نال حصہ لین توں وانجھے رہے۔

پنجابی ساہت وچ ایہ ابال دا اتے پچھڑ کے آئے بودھ داساں سی۔ جیکر بنگالی ساہت وچ بودھ دا رنجہ انہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ اتے اردو ساہت وچ تیجے چوتھائی حصے وچ ہو یا، تاں پنجابی ساہت وچ بودھ و ہروی بعد وچ آیا۔ ایہ بھارتی اتہاس دا اوہ دور سی جدوں کہ یگور دے شہاں وچ ”قومی چیتنا پچھی ساہت دی جادوئی چھوہ دے امر ہون بیہوشی توں جاگ رہی سی۔“

اس طرح پنجاب دے ساہتک راج بھتک اتے سنسکرتک جیون اتے بودھ دے آدرشاں دی ستھاپنا اتے انت کٹھن حالتاں وچ ہوئی۔ ایہ دیش دے دو بچے ہیاں دیاں حال اتاں نالوں بالکل دکھ سن۔ ”اس بھ کر کے پنجاب دے بورژوا راشر واد نے کئی گچھلہ اردوپ دھارن کیتے جیہڑے اپنی ہوند دے باوجود کل بھارت دی سامراج ورو دھمی لیر نال سدا اک منہ ہو کے نہیں رہے۔“ کچھ حد تک اس بھ دا امر پنجابی ساہت اتے وی بیا۔ نتیجے دھاکے دے انت وچ سماج وادی وچار دھار نے پنجابی ساہت دیاں مول خلیاں دے دکاس اتے اپنا امر پایا۔

پنجابی لیکھکاں دیاں رچناواں وچ سکھ، ہندو اتے مسلم ایکتا دے وچار نے اک وڈا رول دھارن کرنا شروع کیتا۔ سلماں دے بدھمی مان ورگ وچوں لیکھکاں اتے پترکاراں دا اک سموہ انہیا پدیا ہو یا جس نے پنجابی راشر وادی ساہت دے دکاس وچ اک وڈا حصہ پایا۔ ایہ سن: بھائی ویر سنگھ اتے کانھہ سمرھ جیہ

پنجابی لیکھاں اتے کوپاں نے ساجک جیون وچ اپنے دودھ دے آگورول دی جیتھنا دا پرگٹا، تیجے دھا کے دیاں پرکھ ساجک پترکاواں (پریتھم، پھلواری، موجی آو) وچ کیتا۔ ایہ پرچے پنجابی ساہت دے جنوادی دھڑے دی پرتیندھتا کردے سن۔ 1939 وچ شروع ہوئے لوک راجی طاقتاں دے جرمن اطالوی فاشزم دے رودھ یدھ اتے خاص طور تے سوویت لوکاں دے فاشٹ حملے دے خلاف ویرناپورن سنگھرش نے بھارتی اتے پنجابی ساہت وچ اک نویں دشا وستونوں لے آندا۔

تیجے دھا کے دے لیکھکاں دے کلا تمک سادھنا داسواں کلاسیکی اتے سمرکالی انگریزی ساہت، امریکی اتے روسی کلاسیکی ساہت سن۔ سوویت لیکھکاں دیاں رچناواں نے پرگتیوادی وچاردھارا دی ستھاپنا وچ وڈا حصہ پایا۔ ساج وادی وچاراتے مارکس وادی وچاردھارے بہت سارے قلم دے ماہراں نوں آکرشت کیتا۔ پرگتیوادی لیکھکاں نے دنیاں دے ساجی آرتھک سمبندھاں نوں سمجھن دی کوشش وچ مارکس وادی وچاراں نوں اپنایا۔ مدھ ایشیا اتے فرانس کاکیشیا وچ ساج وادی جت دی اس وچ سہائی ہوئی۔

آلوچنا تمک - تھارتھ وادی ستھاپنا لئی گھول تیجے دھا کے دے ساہت وچ جنوادی لبردا سو بجاتمک آدھار بنیا۔ "تیجے دھا کے دے بھارت وچ مکھ سو بجاتمک وچاراں دی ہنر پرگتیوادی لیکھکاں اتے کلاکاراں دے اس سے دی رچنا تمک پرتھادے سدھانتاں نوں سمجھن دے جتن نال ہوئی۔ ایہناں وچ سبھ توں پرکھ بھارتی پرگتیوادی لیکھک سنستھانال سمبندھت لیکھکاں دیاں رچناواں سن۔ اس توں علاوہ کلاکاراں دے جتن سن نویں حالات وچ بھارتی لیکھکاں دیاں بھرپور سنسکرتیک پرپراواں داوکاس کرنا، دھارمک پنڈتاؤں اتے ساجوادی دیس «وچ جنمے پرکھ اتے چنگے سو بجاتمک وچاراں نوں بھارتی آدھار دینا۔» اس سنستھانوں جتھے بند کرن وچ اتے اس دے کم وچ پنجابی لیکھکاں ملک راج اند، اقبال سنگھ، کرتار سنگھ ڈگل، موہن سنگھ آو نے سرگرمی نال حصہ لیا۔

اس طرح نال چوتھے دھا کے دے لیکھکاں دی وچاردھارا ستھاپنا وچ سنترتا لبردا پھیلاؤ، ہستی وادی داکھیر نوکھیر نو ہونا اتے ساریاں جنوادی طاقتاں دا فاشزم اتے چھپانہ کھوٹاقتاں دے خلاف اک مٹھ ہونا سہائی ہووے۔ اس چیز جی دے ساہنے کئی جمل سمیاواں سن، جویں کہ اک ساجک بھاشا داوکاس، ورتمان پنجابی ساہت دی ستھاپنا وکھ وکھ ساجک شیلیاں داوکاس اتے سدھار، ساہت نوں پنجاب دے لوکاں دے ہتاں



دے نیزے لیاؤ نا آد۔

چوتھے دھا کے دے لیکھکاں نوں ایہناں سبھ مسلیاں نوں سمجھن اتے اپنی پوزیشن نوں صاف نہجت کرن دی لوڑی۔ ایہ محسوس کر دیاں کہ اوہ کچھڑ گئے ہن، پنجاب دے لیکھکاں دی کوشش بھارت دے پرکھ لیکھکاں دے برابر آؤن دی سی۔ مگر بخش سنگھ دے لفظاں وچ، ”اوہناں کول اپنے دس حدے ودھاؤن دے ویلے تاں سین، پر گہرائی وچ جان لئی بہتاساں نہیں سی۔“ ایہ سبھ کارن چوتھے دھا کے دے لیکھکاں دی جیتھوا آدھار بنے۔ ایہناں لیکھکاں وچوں اک ہے امرتا پریتم۔

امرتا پریتم دا جنم 31 اگست 1919 وچ گوجرانوالہ وچ ہویا۔ پنجاب دے اتہاس اتے سنسکرتی وچ بہت کچھ اجیہا ہے، جس دا سبندھ اس علاقے نال ہے جس وچ امرتا پریتم نے جنم لیا۔ اس دا ناں امرتا اس دے پتاسر وار کرتار سنگھ ہسکاری نے، جو کہ مشہور اتہاس کار، کوی اتے سکھ دھرم ساہت دے چنگے جانوسن، نے رکھیا۔ گوجرانوالہ توں بعد لاہور وچ اوہ کالج وچ پڑھاؤندے سن اتے ساہتک پرپے رنجیت نگارا دے ایڈیٹر سن۔ گھر دا واناورن ساہت اتے پنجابی بھاشا نال بھرپوری۔ امرتا دے کوی پتا سنسکرت برج بھاشا اتے پنجابی وچ دھارمک کوتاواں لکھدے سن۔ اوہناں نے بی بیئی دے من وچ کوتا لئی پیار پیدا کیتا اتے امرتا نے پہلے ساہتک قدم اوہناں دی دیکھ رکھ وچ ہی آتھائے۔ ”بچی دی کلپنا شکتی نوں چھوٹی عمر توں ہی پنجاب دی بھرپور لوک دھارا، پراتن ویرگاتھاواں اتے مہاں کاواں، لوک جیون سمبندھی گیتاں اتے ناچاں خیاں اتے غماں اتے پنجاب دی نت وی زندگی دی خوراک ملدی رہی۔

امرتا پریتم نے آپ سدا اپنے سنسار ورثی کون دی تھاپنا وچ اتے کلا تک رچناواں اتے اپنے پتا دے دڑے اثر دا ذکر کیتا ہے۔ امرتا پریتم دی سکھیا سکھ دھارمک اتے دارشنتک سنسکاراں دے آدھار تے ہوئی۔

سکھاں دی دھارمک پستک آدگرنتھ ہے جو کہ پنجاب اتے اتری بھارت دے تیرھویں توں سولہویں صدی تک دے لوکراجی کویاں دیاں رچناواں دا سنگریہ ہے۔ امرتا نے آدگرنتھ، دسویں گردوگو بند سنگھ، جو کہ چٹک اتے کوی سن، دی بہادری بھرپور پستک ’دسم گرنتھ‘، ستارھویں اتے اٹھارویں صدی دی کاور چنا اتے دیا گنگ ساہت، اتے انہویں صدی دیاں دلش بھگتی پورن ویرگاتھاواں نوں جانیا اتے سمجھیا۔

اس ساری بھرپور ساہتک وراثت وچوں کالی داس، وارث شاہ اتے شرت چندر چٹو پادھیائے امرتا

لنی بھتوں زیادہ عمر پاؤں والے ثابت ہوئے۔ خود امرتا پریم نے کیا ہے کہ ایہناں لیکھکاں دا عمر اس دی رچنا تے سدھانہ ہو کے اپر گٹ ہے۔ اپنے رچنا تک مارگ دے ارنجھ وچ امرتا پریم اتے روند رتا تھ نیگور دے دیا کتواتے رچناواں دوہاں دا ہی بڑا گہرا اثر پیا۔

اوس دی ماما جلدی ہی اس توں وچھڑ گئی اتے اس دا پالن پوسن اپنے پتا دی دیکھ رکھ وچ ہو یا۔ اس دی ساجنگ پرتھما چھوٹی عمر وچ ہی ابھری۔ اپنی پہلی کوتا اس نے 11 ورھے دی عمر وچ لکھی۔ 1935 وچ اس دا پہلا کاؤنگر 'شمنڈیاں کرتاں' بھجیا۔ 1936 وچ امرتا پریم دا اگلا کاؤنگر 'امرت لہراں' دے ناں بیٹھ پرکاشت ہو یا اتے اس توں اپرنت کاؤنگر 'جیوندا جیون' بھجیا۔ عمر دے پہلے کاؤنگر یہاں وچ دھارنگ پریم دا انش ہی جو کہ اس دی ساجنگ پرتھما دی ستھاپنا دے وانا ورن نوں دیکھدیاں سجاوک ہی ہے۔ کرتا رنگہ ڈگل نے صحیح لکھیا ہے کہ اک منہ دھارنگ فرتے دی ہوند جو کہ صرف اک گرنٹھ دے انوسار ہی چلدا سی، دا نتیجہ ایہ ہو یا کہ بہت سے تک پنجابی ساجت زیادہ تر دھارنگ ہی رہیا، جد کہ غیر مذہبی ساجت داوکاس پنجاب دیاں دو جیاں بھاشاواں بھاو ہندی اتے اردو وچ بندار پیا۔

سکھ دھرم دے موڈھی گردنا تک نوں امرتا پریم نے سپورن منکھتا دے بھتوں بدھی مان جیاں وچوں اک نیا ہے۔ اس دے نال نال امرتا پریم دے شروع دے کاؤنگر یہاں اتے بھائی دیرنگھ دی کوتا دی چھاپ ہے۔ بھائی دیرنگھ پنجابی دی نوین کوتا دے آگواں وچوں اک سن۔ سن 1941 وچ امرتا پریم دی نوین پستک 'تریل دھوتے پھل' چھپی۔ اس سنگریہ وچ اس دی کوتا داکھ وشنا ناری پریم، پریم دے غم اتے خسیاں ابھر کے سامنے آئے۔ اس نے پریم وچ دلاپ کردیاں، اداں ہندیاں، مسدیاں اتے خسیاں نال ڈلھ ڈلھ پیندیاں عورتاں بارے لکھیا ہے۔ ایہ اوہ عورتاں بن جہاں دے نیناں وچ آگ ہے اتے جہاں کول ماں ورگی ممتاز دین والا دل ہے۔ اس دی کوتا وچ پرکھ ستھان اس ناری دا ہے جس دے نصیب وچ بھارتی سماج وچ موجود سارے اتر و رودھ دسدے بن۔ پنجاب دی بیٹی امرتا پریم نے اوہناں بیڑاں، گریہاں اتے بھکھاں نوں محسوس کیتا ہے جو کہ انگریزاں کارن پنجاب دے لوکاں نے سہیاں۔ اتے بھتوں زیادہ دکھ ناری نوں ہی سہنے پئے۔

رومانس دا دی کوئی چیز ت ناری دے ہر دے نوں بہت اچا کر کے چتر دے سن۔ لیکن امرتا عورت وچ سوئے مان دی اتے میٹھا وودھ روس پرگٹ کرن دی بھاداناں جاگرت کرن دی کوشش کردی ہے۔ اس



دور وچ شاعرہ نے لاہور وچ ریڈیو سٹیشن لکھنا ستارو جاؤ تا شامل سن۔ اس سبھ نال اس دی رچنا تک درشتی وچ دستھار اتے وادھا ہویا۔

سن 1942 وچ اگلا کاؤنگریہ اوگیتاں والیا اتے اس توں اپرنت 1943 وچ بدلاں دے پلے وچ ناں ہین کاؤنگریہ پرکاشت ہوئے۔ اس دور نوں (1943 تک دے سے نوں) کوتری امرتا پریم دی ستا چننا دا دور کیہا جاسکدا ہے۔ خود امرتا نے لکھیا ہے کہ "اس شروع دے عرصہ وچ میں ہر چیز نوں حیرانی نال دیکھدی ساں۔" امرتا پریم دی کاؤر چنا وچ حالاں ماری نوں اک ٹھوس اتے وکھری شخصیت دے روپ وچ نہیں سی چتریا گیا۔ ماری سب دی وکھری ہوند نہیں سی سکوں اس نوں عورت دیاں پیرمی ول بھادناواں راہیں اسدھے طور تے درسایا گیا سی۔

دسویں صدی دا چوتھا دھا کا بھارتی لوکاں واسطے بہت کشن دور سی۔ دو جاوشویدھ جاری سی۔ وکھرتے پاکستان دی منگ اپنی دودھ دی لہر کر کے پنجاب دے لوک بہت ہی چشت ہوئے کیونکہ پنجاب اک مسلمان علاقے دے طور تے جانیا جاندا سی اتے پنجاب دی قسمت اس گل تے ہی زبھری۔ پنجاب دی ونڈ جاں بھارت توں وکھ کیٹے جان دے خطرے نے کجھ سے اپنی دھار تک (اکالی) اتے راج پیٹک سنسٹھاواں جو یں کہ چیف خالصادیوان نوں اک منھ کر دتا۔ سوتنتر تاسنگرامیاں اپنی کرڑی آزمائش داسماں سی۔ امرتا اپنی وی ایہ اپنے درشتی کون نوں نچت کرن والا تے رچنا تیم سارگ نوں متھن داسماں سی۔ کرڑی واستوکتا نے اس نوں اپنے نچی کشاں دے پرم پر اگت گیت گاؤن تک سیمت نہیں رہن دتا۔

اس دور وچ اس دی رچنا زیادہ واستو وادی ہو کے آلے دوالے دی دنیاں نوں چھوہن لگ پئی اتے ایہ کوئی بمی گھٹنا نہیں سی سکوں تیجے تے چوتھے دھا کے وچ پرگٹ ہوئی ساہتک زچی پرگتی دا دوا اک انٹریو انگ سی۔ اس رچی دا دوا اچھ ساہت اتے ساہک۔ تھار تھہ دا اک دو جے نال زایدہ ڈونگھاسل سی۔ پرگتی وادی کوتا دی ستھاپنا مارکس وادی ندھاندا دے اثر پٹھ ہوئی اتے ایہ بھارتی اتے پنجابی ساہت وچ اک مہتور پورن دھارا سی۔ ویشیش گل ایہ ہے کہ اس پرگتی وادی دھارا دا اگلیر وکاس امرتا پریم دیاں رچناواں وچ ہویا۔

اس دیاں رچناواں وچ سامراج ورودھی دت دکھائی دین لگدے ہن (کاؤنگریہ سمجھ دی لالی، ہن 1943) اس دور دی اس دی کاؤر چنا دی خاص گل ماری دے پرشن نوں زندگی دے مطلب دی اپنی کھوج نال جوڑنا سی (لوک، چتر، ہن 1944)۔ ہولی ہولی امرتا پریم ساہت دیاں اصلی سمیاواں اتے پچیاں اتے

لیکھک دی سہت وچ صحیح تھاں دی پوری سوجھ بکھجی ہے۔

اس توں اگلے چھ سالوں نوں لیکھکا دانواں رچنا تک دور کیہا جاسکدا ہے۔ اس سے دیاں تئاؤ بھریاں گھنناواں، جوں کہ دو جاوشویدھ، آزادی دی لڑائی داتکھیرے ہونا (خاص دور تے پنجاب وچ، جتھے سکھاں دے سارے راج بیک اتے دھارمک گٹ بھارت دی ونڈ دے خلاف سن)، بنگال داکال آگھنناواں اس دی کاور چنا وچ پرتی بندھت ہو یاں اتے اوہناں نے پاٹھک نوں جھوڑیا۔

لیکھکا صاف طور تے ایہ بکھدی ہے کہ نویں کال وچ کلا تک رچنا دے نویں جائزے دی اتے نال ہی نال نویں ساہتک روپ دی لوڑ ہے۔ لوک پیر اتے سے دی منگ دے انوسار اوہ زیادہ آدھونیک روپ..... نوں جن دی ہے۔ 'لوک پیر تے پتھر گینے' وچ۔

دو جاوشویدھ سہایت ہو یا۔ اس نے امرتا پریم نوں اپنے ورثی کون نوں بدلن دے مجبور کیتا اتے ملک دی ونڈ نے اس نوں بری طرح نال جھوڑ دتا۔ پنجابیاں اتے ونڈ دے دردناک نتجیاں داسجھتوں زیادہ اثر ہو یا کیونکہ پنجاب داک حصہ بھارت وچ رہ گیا اتے دو جا پاکستان کول چلا گیا۔ انگریزاں دے اکساوے نے ونڈ دے سے مسلماناں، ہندواں اتے سکھاں وچ کارخت کوئی ٹکرا ہوئے۔

بھارت داک دی کوئی اس گھننا توں بودل نہیں سی رہ سکدا اتے خاص طور تے پنجاب دی شاعرہ۔ پنجاب دی ونڈ تے اس نے آکھاں وارث شاہ نوں لکھی۔ اس کو تا وچ اس نے پنجاب دیاں عورتاں دے سارے دکھاں داسپشت ورنن کیتا ہے۔ ایہ کو تا ساریاں دی زبان تے سی اتے لوکاں نے اس دی ہتھ نال اک دو جے لوکوں نکل کیتی۔ اس کو تا نال امرتا پریم دی کاور چنا داسا جک دور ارنہ ہندا ہے۔ سن 1947 توں بعد امرتا پریم دلی آ گئی۔ سن 1947 امرتا دے رچنا تکم دکاس وچ اک سیمابن گیا۔ اوہ پنجاب دی پچی آواز بن جاندی ہے جو کہ عام لوکاں دیاں بھادناواں دا پرگٹا کردی ہے۔ اس کو تا وچ اس دا پنجاب دی ساہتک پر میرا اتے لوک دھارا نال ڈونگھا اتے پکا سمبندھ سہایت ہندا ہے۔ ڈونگھے سوجھاوی وچاراں کارن اس نوں لفظی دکھاوے توں نفرت ہو جاندی ہے۔ اس دیاں کو تاواں نوں سرل اتے بناوٹ رہت طریقے نال پیش کردی ہے۔ اس دیاں کو تاواں لوکاں دے ہر دے وچ سبھ توں کوئل تھاں نوں چھوہ جاندیاں بن۔

بھارت دی ونڈ دا اثر پنجاب دے آر تھک دکاس تے ہو یا۔ سچائی دے بہت سارے پر بندھ اتے کپاہ دی کھیتی والے مدل علاقے پاکستان وچ رہ گئے۔ دو جے پا سے پنجاب توں آئے پناہ گیراں دا سوال سی۔

سن 47-1946 وچ پنجاب وچ 80 لکھ دے قریب لوک آئے۔

بہت ساریاں مشکلاں کھڑیاں ہوئیاں جو کہ آرتھک اے سمیٹا چارک پرکار دیاں سن۔ لوڑی قومی سوال نوں، بھاشا دے سوال نوں سلجھاؤن دی، عام جتنا دی سمیٹا چارک پدھرنوں ودھاؤن دی۔ بھاشا دا سوال پنجاب وچ کافی مشکل سی کیونکہ قومی بھاشا دے طور تے پنجابی نوں پورا مقام حاصل نہیں سی۔ سکولاں اتے دفتریں وچ وی ہندی اتے اردو نوں پہل دتی جاندی سی۔

پنجابی سبھت وچ ایہ سبھ کچھ نویاں سمیٹاواں دے روپ وچ سامنے آؤندے۔ ایہ بن قومی ایکتا، سماجک نیاں اتے امن دیاں سمیٹاواں۔

موہن سنگھ، کرتار سنگھ ڈگل اتے دوجے لکھکاں دے نال نال امرتا پریم نے پنجاب دی وٹھ دے بعد دیاں اتے نویں جیون دیاں سمیٹاواں نوں اپنیاں رچناواں سرپت کیتیاں۔ ایہ رچناواں بن لسیاں داٹاں (کوٹاواں، سن 1949)، پنجر (ناول، 1950)، سرگمی ویلا (کوٹاواں، 1951)، پنجاب دی آواز (لوک گیت سنگریہ، سن 1952)، سنہیر دے (کاؤنگریہ، 1955)۔ اس ویلے اوہ بڑے غصے نال اوہناں لوکاں بارے لکھدی ہے۔ جہاں نے اپنے حالات نال سمجھوتا کر لیا ہے (کوٹا جگیاں) تاری دا سوال دی نویں طور تے ابھر دا ہے۔ سماجک انیاں دے خلاف آواز کاؤنگریہاں مسلیڈ نے، 'کستوری' اتے 'لمیاں' داٹاں وچ سنائی دیندی ہے۔ کوٹاواں جی اتے 'دھوت' آ وچ اک ایسی عورت دی آواز سنائی دیندی ہے جو کہ سمجھدی ہے کہ جیتے دی رہند کھوند دے خلاف لڑائی راہیں ہی خسیاں دی رکھیا کیتی جاسکدی ہے۔ سماجک انتر و ودھاں نوں بے نقاب کر دیاں امرتا پریم بھارتی سماج وچ نویں اخلاقی نیم تھاپت کرن دے حق وچ ہے۔ اپنیاں کوٹاواں وچ اوہ امرت دی شخصیت دے اوہناں پکھاں اتے زور دیندی ہے جو کہ اس دے اپنے سنسار ورثی کون نوں درسائندے بن۔ انسان وچ سبھ توں وڈی چیز اک سرگرم شخصیت ہے۔ ایہ نظریہ قلم دی کلاکار نوں گھٹناواں دے وچ سرگرم حصہ لین لئی مجبور کر دا ہے۔ چوتھے داٹکے دا انت امرتا دی کلا دی پر پھلتا داٹاں ہے۔ ہرسل نویں کاؤنگریہ، ناول اتے گیت سنگریہ جمپ دے بن۔ پنجاب دی سماجک زندگی دے کیمڑے پکھ سن، جہاں کر کے ایوں ہو یا؟

سبھ توں پہلی گل ایہ ہے کہ پنجاب وچ کئی سماجک سنسٹھاواں نے سرگرمی نال کم کرنا شروع کیتا۔ ایہناں وچوں سبھ توں مہتو پورن سنسٹھاواں پنجاب سرکار دا بھاشا اتے سبھت و بھاگ، پنجابی بھاشا اتے

سابت اکادمی اتے پنجابی لیکھک یونین سن۔ ایہناں سسٹھاواں دے تحت کئی کانفرنساں، میٹنگاں، سجاواں اتحاد ہوياں شروع ہوياں، جہاں دے سٹے وچوں نہ صرف پنجابی بلکہ ہندی اتے اردو وچ لکھن والے لیکھکاں دچکاروی میل جول کافی ودھ گیا۔ صاف دل امرتا نوں کافی اوکڑاں آیاں۔ لکھاریاں اتے اخبار نویساں دی اریکھا داسا ہنسنا کرتا پیا۔ پرجدوی اس نوں سماں زیادہ مشکل لگدا، اوہ کوتا لکھدی۔ پہلا انسان جس نے امرتا پرتم داسر تھان کیتا اوہ لیکھک اتے آلوچک تیا سنگھ سی۔ ”تیا سنگھ جی نے میریاں ساریاں پستکاں دا ذکر کیتا، میرے اندر لے شاعرنوں پہچانیا۔“

سن 1947 توں بعد داسماں (چوتھے دھا کے دانت اتے سارا پنجواں دھا کا) امرتا پرتم لئی رچنا تمک کچھوں اک سار تھک دوری۔ اسے دور وچ ہی اس دے ساجک، راج بھیک اتے سو بھاتا تمک ورثی کون دی ستھاپنا ہوئی۔ اس سبھ دی جھلک اس دے بعد دی دارتک یاں نادلاں تے آلوچنا تمک لیکھکاں آد وچ ملدی ہے۔

’کالا گلاب‘ وچ اس نے ’میں‘ دی ورتوں کر کے ہزاراں بھارتی عورتاں دیاں بھاوناواں نوں پرگٹ کیتا ہے اتے پایہ بارے اپنے ڈھنگ نال کھلے طور تے لکھیا ہے۔ اس سنگریہ وچ اس دی اک نویں شیلی ہے۔ شاید ایہ کہنا اتیک تھنی نہیں ہووے گی کہ پنجابی کوتا دے اتھاس وچ پیار سپورن طور تے بناں کسے رہسمنی آدرشواد دے موہن سنگھ دی کاوڑ چنا وچ ستریا گیا ہے۔ امرتا نے پریم دیاں ایہناں منکھی بھاوناواں نوں اک نویاں پاسا پر دان کیتا۔ ایہ اس دی اندر دی چڑ ہے، اس دا بے پردہ دل ہے، اس دا ناری داوشا ہے۔ لیکن غمی احساس راہیں اوہ سپورن منکھی بھاوناواں پرگٹ کر دی ہے۔

امرتا نے بڑی داری و دلش یا تراکیتی اوہ سوویت یونین دی گئی۔ ایہناں یا تراواں دے اثر وچوں اس دی کاوڑ چنا وچ دکھ دکھ طرح دے وٹے شامل ہوئے۔ سن 1961 وچ امرتا پرتم نے سوویت لیکھ یونین دے صددے تے سوویت یونین دا دورہ کیتا۔ اوہ ماسکو، تاشقند، سمرکند اتے باکو آد شاعراں وچ گئی اتے اس نے رابندر ناتھ ٹیگور دے سو سالہ جنم دن دے سلسلے وچ ہوئے ساگم وچ وی حصہ لیا۔ سن 1966 وچ اوہ فیئر سوویت یونین گئی۔ سن 1967 وچ اوہ جارجین کوی شو تارستاویلی دی 800 سالہ ورھے گنڈھ دے ساگم وچ حصہ لین گئی۔

سوویت یونین وچ اس نوں ہر چیز بہت بھائی اتے اس نے اس دا کھلا پرگٹا کیتا۔ امریکی پرچے

محفل دے پتر کار نال اک انٹرویو وچ اس نے کہا، 'سوویت یونین اتے دو بے ساجوا دی مکاں وچ ہویاں تہدیلیاں مینوں بہت چنگیاں لکھیاں۔۔۔۔۔ کل ملا کے ایہ ساجوا دی ڈھانچا سارے مکاں لئی بہت چنگا ہے۔ او تھے رواں کول چٹکی روئی، تم اتے کپڑے بن۔

سوویت یونین توں اس نے اپنے بچیاں نوں بڑیاں صاف اتے چیاں چٹھیاں لکھیاں جو کہ اک پینٹ دے روپ وچ پرکاشت بن۔ پینٹ، جس دانان ہاریاں جھروکے ہے۔ اس دی بھومکا وچ اوہ لکھدی ہے کہ ایہ باریاں دے گوانڈھی گھراں دیاں، دو دوست مکاں بھارت اتے سوویت یونین دیاں بن جو کہ چنگے گوانڈھیاں واسطے سدا کھلیاں بن۔ ساہتک پرچے 'آر سی' دے مطابق 1961 وچ 'کرچی لکیراں' پنجابی لکھن مکاں واسجھ توں اتم سنگریہ سی۔

آرمینیا، ازبکستان اتے سوویت یونین دے ہر کونے وچ سوویت لوکاں نے اس نوں اپنی خوش مزاجی اتے اپنے لوکاں دی اتنی لئی جیا توڑ محنت کرن دی چاہ نے موہ لیا۔ اپنی پینٹ اتیت کی پرچھایاں وچ امرتا نے فرغانہ دی وادی نوں 'خوابیدہ حسینہ' کہا ہے، جس نوں کہ سوویت لوکاں دی محنت نے کپاہ نال بھر پور علاقے وچ تبدیل کر دتا۔

ایہ سنگریہ ازبکستان دی مشہور شاعرہ اتے لوک ہستی زلفیا نوں سرپت ہے اتے ایہ کوئی سبھی گل نہیں۔ زلفیا اتے امرتا وچکار گہری دوستی ہے۔ اوہ کدی حیرانی اتے کدے انتشاء نال ازبک عورتاں دی کامیابی بارے لکھدی ہے۔ 'کپڑاں دیاں ڈھائی ریکٹر عورتاں سن۔۔۔۔۔ اتے فرغانہ شہر دی کارج سادھک کمپنی دی پرتھان دی عورت سی۔ اس توں بعد میں کلکوفو فارم' اوکا کھون' دی پردھان نوں ملن جس پنھ ڈیڈہ بڑا لوک تم کر دے بن۔

امرتا پریم زلفیا بارے، بھاو پورب دی اس عورت بارے لکھدی ہے جیہڑی کہ آپ کجھ چہ پہلاں چار دیواری وچ بندی، جس کول اپنے چہرے توں برق لاہن واقع نہیں سی جیہڑی کہ اپنے ہی گھر چوں پیسیاں بدلے وپٹی جاندی سی، اس عورت بارے جیہڑی کہ بن آپ اک نویں ازاد زندگی دی گائیکا بن گئی ہے۔

سنی 1968 وچ امرتا پریم دیاں چٹھیاں اتے سفر نامیاں 'انگلریہ' کی پتیاں 'اکتاب چھپیا۔ اس وچ لکھنکا اوہناں ٹھٹھاواں ملاقاتاں اتے چیزاں بارے لکھدی ہے جہاں نے اس نوں ساجوا دی مکاں دے دورے سے خاص طور تے پر بھلاوت کیتا۔ ایہناں وچ سوویت یونین دی تہی یا ترا، بلغاریہ، رومانیہ اتے پوربی

جرمنی دے دوردا لیکھ ہے۔ سوویت یونین وچ جو دھیان دے لیکھکاں دی یاد دل اتے جو سنبھال اوہناں نال سمبندھت استھاناں دی کیتی جاندی ہے بھادیں اوہ لیونالستانی نال سمبندھت یا سٹایا پولیا ناہوے، جاں ماسکو، یر یوان جاں تاشقند شہر ہووے، اس نے امرتا دے ہر دے نوں ٹب لیا۔

امرتا پریم میکسم گورکی، انتون چیخوف، لیونالستانی، پشکن اتے مایا کووکی دیاں رچناواں نال جنگی طرح پرچت ہے۔ دنیا دے ساہت دیاں پراپتیاں دا ادھین رکھ دیاں امرتا نے کافی دھیان سوویت یونین دیاں بھاشاواں دے وچ پرچت ساہت دے انو بھواتے پراپتیاں دل دتا ہے۔

لیکھ اتے چھپیاں امرتا دیاں رچناواں دا اک اہم حصہ بن گئے۔ امرتا پریم دا اپنییاں رچناواں وچ سوویت یونین دے دشمنوں اہپیاں کو تاواں جوں کہ یوری گاگارن وچ چھوہنا سوویت یونین وچ استریاں دی آزادی بارے لکھنا، کرسٹ ول و تیرے نوں درساؤنا اتے ہور بہت سارے سوالاں نے اس دیاں رچناواں وچ اک نواں رنگ لے آؤنا، اتے اس دے مولک اتے کو مانتری درشتی کون نوں ابھاریا۔

امرتا پریم دیاں رچناواں وچ سمیاواں دے دستکار داسدھا سمبندھ اس دی اک اپنی مولک کلا تمک شیلی دی بھال نال ہے۔ سوویت ناری دے چتر اس نال امرتا پریم دی کوتا اتے وار تک شیلی دا دستکار بندا ہے اتے کیتھی سمبندھاراہیں زندگی دے انش اتے نیکھن چٹگیری طرح ابھر دے ہن۔ لیکھکاں اتے چھپیاں دی انت کاوشی شیلی اوہناں نوں اک وکھری رنگت پروان کردی ہے اتے سوجھ دی بھاؤ کتا اس لئی ودھ جاندی ہے کہ امرتا پریم نہ کیول اک شاعرہ اتے وارا کار سگوں اک عورت دے طور تے دی تنکھی سوجھ نال اتے اپنے منجھے ڈھنگ نال وی لکھدی ہے۔

سمیا چارک وٹاندرے دے پروگرام دے تحت بھارتی سرکار نے امرتا نوں 1967 وچ یوگوسلاویا، مگسری اتے رومانیہ بھیجا۔ ایہناں سارے دیشاں وچ تن تن ہفتے بتاؤن توں بعد اوہ بلخاریا، بھجھی جرمنی اتے تہران گئی۔ سن 1969 وچ اس نے نیپال یا تراکیتی، اتے سن 1972 وچ مڑ یوگوسلاویہ دا دورا کیا۔ اس توں اپرنت اس دیاں یا تراواں دی سوچی وچ چیکوسلواکیہ، فرانس، انگلینڈ، اٹلی، اتے اسپین وی شامل ہوئے۔

امرتا پریم لئی ہر دیش اک ادبھت کوتا دی طرح ہے جو کہ دو جیاں نالوں دکھ ہواتے ادھ وار تک روپ وچ بھاؤ دنیا دے اتنے سارے ملکاں دے سفر نامے دے روپ وچ کوتاواں لکھدی ہے۔ ایہناں وچ ہر



قوم دیاں ادھیاتمک پراپیتاں اتے قدراں قیمتاں دے ورتن دے نال نال اوہ اوہناں سمیہا چارک قیمتاں اتے پچھانہ کچھو طاقناں دا کلا تمک چتر الیکدی ہے، جیہڑیاں کہہ دیا کئی نوں غلام بناؤندیاں ہن۔

وجودیت، انسانیت آدول قوم اتنی رویاں اوہناں خاکیاں وچ وی دیکھن نوں ملدا ہے۔ جو کہ اس نے کجھ لیکھکاں، کوپیاں، راجسی اتے قومی ہستیاں دے کچھ ہن: ایہناں وچ ازبک شاعرہ زلفیا بکودا شاعر رسول رضا، بلخارین اتے ویتنامی لیکھک، ایتھو پیا اتے جاپاندے کوی، ویتنام دا پردھان ہوچی من شامل ہن۔ پردھان ہوچی من دی شخصیت نے لیکھکاں تے اتنا اثر پایا کہ اوہ کوتا لکھے بناندرہ سکی (ہوچی من)۔ ہوچی من نے اس نوں کیہا، اسیں دوویں سپاہی ہاں جو دنیا دیاں غلط قیمتاں دے خلاف لڑ رہے ہاں۔ میں تلوار نال، توں قلم نال۔ اس وچاردی پیشی شاعرہ دیاں ساریاں رچناواں وچ ملدی ہے، اس دیاں رچناواں وچ ناری دی بھتوں پراتن منگ۔ امن دی منگ سنائی دیندی ہے۔

امرتا پریم دی سرجنا تمک زندگی وچ چھیاواں دھا کا جس وچ اوہ نال نال کوتا اتے وارنک تے کم کر رہی سی، خاص طور تے پھلدا نیک سی۔ اس عرصے وچ اوہ اپنیاں ودیش یا تراواں اتے لیکھکاں آریاں ملاقاتاں دے اثر پیٹھ سی۔ زندگی دے بنیادی سوالاں دے جواب دی بھال اتے دیش دے سمیہا چارک وکاس وچ ہندیاں تبدیلیاں نوں سمجھن دی کوشش وچ امرتا پریم نے وارنک دی دورتوں کرنی شروع کیتی جس دا کیئوں زیادہ وڈا سی اتے جو حقیقت دی بہو کچھ سمجھلدا راتے زیادہ تر انتر ورو دھی تصویر دا ورن کر سکد اسی۔

”رچنا تمک عملاً اکو ہے، حالانکہ بیان دے سادھیام دکھ رہے ہن۔“ امرتا پریم بیان دے نویں ڈھنگ اتے راہ ڈھونڈی ہے اتے اوہناں نوں لہ لہندی ہے۔ ”اس دیاں گلپ کار رچناواں وچ دی ادب دی احساس مندی اتے مہارت ہے جنہاں نے اس نوں اک اسچے درجے دی شاعرہ بنایا ہے۔“

چھویں دھا کے دے بھارت وچ پورب دے دو جے دیشاں دی طرح آرتھک، سماجک اتے راج عینک وکاس نال سمبندھت انتر ورو دھاتے وچاردھارک نکراء ہو ریکھے ہو چاندے ہن۔ بھتوں وڈی گل ایہ ہے کہ آزادی دی لڑائی دے سے ستر تا پراپتی نال جوڑیاں گئیاں امیدیں پوریاں نہیں ہوئیاں۔ اسے وچہ کر کے دیش وچ نراشا وادی منواو تھا دوا دھا ہویا۔ بھارتی عملیت نوں اتے سماج دے جن دے اصلی کارناں نوں سمجھن دا جتن کر دیاں امرتا پریم ایہ کہندی ہے کہ بورژوا راج عینک دی گل بات نوں وکھ کے اوہ چپ رہنا چاہندی ہے۔ اس دیاں کوتاواں ’چپ‘ ’اک مٹی دی ڈھیلی‘ ’راج نیٹی‘ آدی وچ نراشا وادیت

تھلکدے ہن۔ شاعرہ اپنیاں رچناواں وچ تھلکدے نریش وادی دی آپ آلو چنا کردی ہے، تے کہندی ہے کہ اس دیاں رچناواں وچ آشا وادی سطران زیادہ ہن اتے اوہ زیادہ شکتی وان دی ہن۔

سن 1968 وچ امرتا پریم نوں پنج سالانہ لئی سہت اکادمی صلاح کار کمیٹی دامنر چنیا گیا۔ صاف دل اتے سداھانندی پکی امرتا سبھ توں پر جھاشالی لیکھکا اتے مولک رچناواں دا ہی کچھ لیندی سی۔

امرتا نے اداسی نے اداسی نال بھی کوتا 'الوداع' اس سے رچی جدوں اوہ کچھ اخباراں دی کمیٹی سکھت آلو چنا کارن بیمار ہو گئی سی۔ شاید ایسناں حالات اتے جیویں دھا کے دی اس دی عام نریش وادی سنو اوتھا دا ہی نتیجہ سی کہ اس دور وچ امرتا زیادہ تر اداس اتے اگلی سی۔ نہ تے پچھانہ پھوٹتاں اتے نہ ہی پرکھیاں اور دھمی تیاں دے کتھن امرتا پریم نوں سچ اتے نیاں دے مارگ توں ہٹا سکے جاں اس دیاں رچناواں دے عملی ارتھ نوں وکرت کر سکے۔

جیکر اک اجیہی رچنا دی بھال کیتی جاوے جو اک شاعرہ دے سبھ توں اندرونی وچاراں اتے احساساں نوں درساؤندی ہووے اتے بھارت دی اتنی دی راہ وچ روڑا ہن والیاں سمیاواں بارے اس دے وچاردس دی ہووے، تاں دلاں دے بھیت نوں اجیہی رچنا کہا جاسکد اے۔ پنجابی ساہتکار ہر بکن سنگھ نے صحیح کیہا ہے کہ ایہ کوتا امرتا پریم دی نرتر دھدی مہارت دی پرتیک ہے۔

اس نظم وچ امرتا نے ماں (جو کہ پنجاب دے اتہاس دی پرتیک ہے) اتے دھی (جوانی) دے ایسے صحیح اتے ٹھوس اتے نال ہی نال بڑے ویالک چترتاں راہیں بڑے رانگے ڈھنگ نال پنجاب دے پنج ہزار سال دے اتہاس دا ورثہ کیتا ہے۔

اپنے آلے دوالے دی حقیقت دے بیان دی کوشش نے امرتا دی کاوشیلی اتے شہاں دی چون وچ وی فرق لے آندا اتے اس نے کئی طرح دے کاورواں دی درتوں شروع کیتی، جہاں وچ آزادی نظم، لوک گیتاں دے اتے ناچاں دے تال (بھنگڑا، بکدھا) وی شامل سن۔ ایسناں نویں روپاں دی چون اس نے لوک دھارا وچوں ہی کیتی۔

دو جے عالمی جنگ توں بعد بھارت، جس نے کہ بستی وادوے اتے جنگ دے کشت سہے سن، وچ پرکھوادی سہت داوکاس ہويا۔ سجاد ظہیر، یسپال، ملک راج انند، گر بخش سنگھ، گر کھ سنگھ مسافر دے نال امرتا پریم وی امن لئی جدوجہد کرن والیاں وچوں اک سی۔



امن داوشا پہلاں اس دی کا ور چنا وچ اتے اس توں بعد وار تک وچ کئی سالاں دی سوچ وچار بھال، سند یہاں اتے کئی سالاں دے تجربے توں بعد آیا۔

سوکھم نظراتے احساس مند ہوں دے نال نال امرتا پرتم امن، لوک راج اتے منکھتا وادی حامی دی ہے۔ اس دیاں نظماں میں گیت لکھدی ہاں، برف لگا تار پیندی پئی وچ پریمکا، ماں اتے بھین دی امن لہی منگ سنائی دیندی ہے۔

سن 1973 وچ اوس نے ماسکو وچ وشوا امن کانگریس وچ حصہ لیا۔ اوتھے سنیاں تقریراں دے سدھے اثر بیٹھ اوس نے برف لگا تار پیندی پئی ناں پٹھ لکھی۔

ستویں دہاکے وچ اوس دی رچنا تمک تلاش دا خاص کچھ ایہ ہے کہ اوہ سادہت وچ اوہناں سماجک اتے آرٹھک تبدیلیاں نوں درساؤنا ضروری سمجھدی ہے جو بھارت وچ ہو رہیاں سن۔ اس دی وجہ ایہ ہے کہ اکتوبر کرائی نال جڑے وچاراں نوں اک نویں ساجنگ و شاملی شروع ہندی ہے۔ تقریباً سارے پنجابی لکھک امن لہی ہو رہی جدوجہد دے حق وچ سن اتے سماج وادی وچاراں دی حمایت کر دے سن اتے اوسدے جدو دنیا دے سارے آگاہ و دھولک لینن دی سوسالہ ورھے گنڈھ منار ہے سن، امرتا پرتم نے مہان آگودے اتہاسک رول بارے کوٹا لکھی۔

اوسدیاں ستویں دہاکے دیاں رچناواں (کاوشگریہ کاغذتے کیئوس اتے ناول جیب کترے) وچ بھارتی سماج اتے سادہت وچ پرانیاں ہندیاں ساریاں چیزاں دے خلاف ودھداروس دکھائی دیندا ہے۔ امرتا پرتم نے 1966 وچ ساجنگ پرچہ 'ناگ منی' کنڈھنا شروع کیتا اتے اوس وچ سوویت کویاں، دو جے سماج وادی مکاں دے کویاں اتے پیچھی مکاں دے پرکھوادی کویاں دیاں رچناواں دا ترجمہ چھاپنا شروع کیتا۔ اس نال پنجابی پائٹھک دے من وچ اجکل دی دنیا دے نال سانجھ دے احساس وچ کافی دادھا ہویا۔ اس پرچے وچ ایسے مشہور پنجابی لکھکاں جویں کہ اجیت کور، ہر بھجن سنگھ، بلد یو سنگھ اتے نال ہی جوان لکھکاں، جسیر بھٹلر، جوگا سنگھ، سی کمار، جگتارا تے سکھیر آدیاں رچناواں چھپیاں۔ پچھلے پنج سالاں وچ پرچے وچ چھپن والیاں چیزاں دا گھیراؤ دھ گیا ہے۔ ساجنگ سالاں دے نال نال اج سماجک اتے رچنا تمک سالاں وادی جہ چاہوں لگ پئی۔ اس پرچے وچ مشہور سائنسدان کلاکاراں نال انٹرویو چھپدے ہن اتے راج نیتی اتے سماجک ڈھانچے وچ موجودہ کیاں دا ذکر کیتا جاندا ہے۔ پچھلے کچھ سالاں وچ دو جے مکاں دے

ساہت نوں سرپت پکشل پرچے دی نکھن لگ پئے ہن۔ پرایہ اک اجیہا پرچہ ہے جس وچ لیکھکاں لئی بڑے اہم مسئلیاں بارے لکھیا جاندیاں ہن۔ نو جوان لیکھکاں دیاں رچناواں وی چھپدیاں ہن اتے پائٹھکاں نوں دوسرے دیشاں دی سکال کادور چنانال جانکاری وی ملدی ہے۔

ناگ مئی دے پرکاشک نوں پچھیاں چٹھیاں وچ پائٹھک لکھدے ہن کہ اس پرچے نوں اکو واری نہیں پڑھیا جاسکدا، اس نوں کئی واری پڑھنا پیندا ہے جد کہ دوسرے پرچیاں نوں اک واری وچ ہی پڑھیا جاسکدا ہے۔ اس گل توں پرچے وچ چھپن والے لیکھکاں اتے رچناواں دی ڈونکھیاں دا پتا لگدا ہے۔

15 مئی 1973 نوں دلی یونیورسٹی نے امرتا پرتم نوں ساہت دے ڈاکٹر دی پدوی نال سمانیا سن 1975 وچ لیکھکاں دی سائیک کانفرنس وچ ناگیور شہر وچ امرتا پرتم نوں پنجابی ساہت وچ یوگدان وجوں سمانیا گیا۔

اس شاعرہ نے بہت ساریاں انتر راشٹری سائیک کانفرنساں، گورٹھیاں آدو وچ حصہ لیا۔ اوسدے ساٹھیاں اتے مٹراں وچ فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کرتار سنگھ دگل اتے دوسرے قلم داہر ہن۔ لیکھکاں اتے کویاں بارے لکھے لیکھاں وچ ایہ صاف دسدیا ہے کہ امرتا داسر جتا تک وچار دھارا والے لوکاں اتے اپنے دوالے دی حقیقت نوں اپنے کماں اتے لفظاں نال بدل دین دی کوشش کرن والے لوکاں ول کناں جھکاؤ ہے۔

امرتا پرتم پنجابی ساہت دے سب سے دیر وچ ہی بند نہیں اوس نوں بنگالی اتے ہندی دیاں سائیک پراپتیاں دی پیاریاں ہن، کیرل داساہت دی پسند ہے۔ بھادایہ ہے کہ لیکھکاں دی دلچسپی دا دائرہ کل بھارتی ساہت ہے اتے بھارتی ساہت دے آپسی میل جول اتے پر بھاد ہارے دی لیکھکاں دی اصولی رائے ہے، ”تیسرا پڑا ہندا ہے، دلیری، درتمان نوں اکھیرن والی تے بھوکھ نوں سیون والی دلیری۔ سیدیاں نوں تاش دے پتیاں وانگ دلا کے دند کے کوئی کھید کھینڈن والی دلیری جس دی کوئی ہار سد یوی ہار نہیں ہندی.....“

امرتا پرتم دے ورثی کون اتے اخلاقی نظریے نوں سمجھن لئی اتے کل بھارتی سائیک ورتارے وچ اوسدی تھان نوں سمجھن لئی اوسدے اپنے بارے اپنی کادور چنانالے اوس دے نیچیاں بارے نظریے نال واقفیت ہونی ضروری ہے۔

اپنیاں کوتاواں، نادلاں اتے لیکھاں دستے وچ امرتا پرتم کلا کار دی ذمے داری، اوس دی کلا دی ساجک لوڑ اتے وقت دی آواز ورگے فوری اہمیت والے سوال اٹھاؤندی ہے۔ اوہ کہندی ہے کہ کوی نوں اپنے پیر زمین تے نکا کے رکھنے چاہیدے، بن اتے ڈونگھے تے لوک کلا والے سوئے لکھنے چاہیدے، بن۔ آپ اوہ لوک دھارا وچوں بہت کجھ لیندی ہے (دلاں دے، بھیت، کنکاں دا گیت)۔ کئی بھارتی آلوچکاں نے امرتا پرتم دیاں رچناواں دے لوک کلا نال ڈونگھے سمبندھ دل دھیان دوا یا ہے۔

اوس نوں پورا یقین ہے کہ کسے دی کوتا وچ بھادیں اوہ کسے دی زبان وچ لکھی گئی ہووے، اوس وچ اک عالمی سانجھ، اچا چشن تے چنگے کل وچ یقین ہونا چاہیدا ہے۔ کوی نوں لوکاں دیاں ضرورتاں بارے لکھنا چاہیدا ہے اتے بھوکھ دا دوت بنن دا پورا جتن کرنا چاہیدا ہے۔ پنجابی آلوچک بی۔ سی۔ گوئیل دے کھنن مطابق "امرتا پرتم نے صرف کرت وچ یقین رکھدی ہے، اوہ صامت دے ساجک درودھ پرگٹ کرن دا مادھیام ہون وچ دی یقین رکھدی ہے۔" لیکن ایہ جانن دی کوشش کردی ہے کہ سو بھاتمک اتے سنو دیا تک کجھ توں اک کلا کار دی شخصیت دا اس دی رچنا نال کس طرح دا سمبندھ ہے۔ اس طرح نال امرتا پرتم سوئے انیویا کتی (Self expression) دے سوال، جو کہ سماکی واچک آلوچکا وچ سبھ توں تیکھے سوالاں وچوں اک ہے، دا جواب دین دی کوشش کردی ہے۔ جیکر پہلاں اس سوال دے جواب وچ ایہی کہنا کافی سمجھدی سی کہ لیکھک اک اچھا کلا کار ہے جس دی لوکاں اتے ساج پرتی بڑی دڈی ذمے داری ہے تاں ستویں دھا کے وچ اس دا نظریہ ایہ ہے کہ زندگی دی جی تصویر کھچن لئی لیکھک دے ساجک درشنی کون نوں، جو کہ ساجک ورتارے دے کلامک چترن لئی ضروری ہے، اس دیاں لکھتاں توں وکھرائیں کیتا جاسکدا۔ نال ہی نال ایہ وی کہندی ہے کہ ایہ اپنی میں دی زیادہ ڈونگھی پہچان ہے۔ جد لیکھک دی 'میں' دا ساجک رساں نال نہ حل ہون والا ٹکرا ہندا ہے تاں اس نوں دکھ پہنچدا ہے۔ ایہ احساس اس دیاں نظماں وچ پیڑ دے روپ وچ ظاہر بندے بن جویں کوتا میں تے میں وچ اس نا کرے دے مطلب نوں کھلن دی کوشش وچ اپنے احساس دیاں نقلی دنیاوی رساں نال نکر دی گل کردی ہے۔ کدی کدی اس دیاں رچناواں آلوچکاں نوں انترکھی اتے بہت نجی لگدیاں ہن، جویں کہ اک رات 'عشق، انتظار' پر اوہناں وچ ہمیشہ کدے پر تکھ اتے کدی گجھا ساجک انش ہندا ہے۔ اس دے کلامک جیون دے وکھرے دور وچ اس انش وچ گتیا تک تبدیلی آؤندی ہے، پر ایہ انش کدی وی ختم نہیں ہندا۔ ایہ وی کہا جاسکدا ہے کہ 1947 دیاں گھنٹاواں توں بعد جد اک

جذباتی شاعرہ دی تھیں اک سماجک اتے حقیقی سمجھ بوجھ والی شاعرہ نے لئی، تاں ایہ انش لگاتار دودھ دای گیا۔  
 کلا وچ نجی اتے سماجک انش دا ذکر کردیاں لیکھکا کلا کار دے کرتودی اتے اس اتے اس کرتو دے  
 بھاردی وی گل کردی ہے۔ اس کرتو دا بھار اس لئی ایہاں بندا ہے کہ سہت لکھاں لوکاں دے دلاں اتے  
 دماغاں اتے وچار دھارک اثر پاؤن دا اک ذریعہ ہے۔ اس دی تقریباً ہر رچنا وچ، بھادیں اوہ وار تک تے  
 بھادیں کاور چنا ہودے، نجی کچھ سدھے جاں اسدھے روپ وچ منکھی سمبنداں وچاراں اتے احساس نال رل  
 کے لیکھک دے خشی اتے خوبصورتی بارے وچاراں نوں پرگٹاؤندا ہے۔ اوہ بھادیں عشق دے وچھوڑے اتے  
 امیدیں دی گل کردی ہودے (نظم اک خط) اتے بھادیں عورت دی خشی دی (دعوت، عشق) ہمیشہ کوئی دی  
 ذمے داری دا احساس بندا ہے۔ عورت دے احساس دی دنیا وچ پرولش کر کہ امرتا اس دے ہتر تر دے قوی  
 لچھناں نوں ابھاردی ہے۔ اس دیاں رچناواں وچ نجی کچھ آپنے آپ لئی نہیں، سگوں سماجک زندگی دے وکاس  
 نال دکھ دکھاتے بہت داری انتر ورو دھی سمبنداں دے روپ وچ پیش کیجا جاندے ہے۔ اوہ زندگی نوں حرکت  
 وچ اتے عملی انتر ورو دھی دے پرسنگ وچ سمجھدی ہے۔

دکھ دکھ دوراں وچ سہت دے کارج بارے امرتا پریم دے وچاراں وچ کجھ تبدیلی آؤندی رہی  
 ہے، حالانکہ کل ملا کے اوہناں وچ بہت زیادہ فرق نہیں پایا۔ اپنیاں رچناواں راہیں اوہ سہت اتے کلا دے  
 زندگی نال سمبندھ تے زور پاؤندی ہے، لیکھک نوں نویں بھارت دی اساری وچ وودھ چڑھ کے حصہ لین لئی  
 ونگاردی ہے اتے پریم چند اتے ٹیگور دیاں نصیحاں اجو کے حالات وچ، حقیقت وچ تبدیل کردی ہے۔

امرتا کیول لیکھکا اتے شاعرہ ہی نہیں، سگوں انووادک وی ہے۔ اس نے پنجابی پائٹھکاں دی جان  
 پچھان سوویت یونین اتے دو بے سماج وادی ملکاں دی شاعری نال کروائی ہے۔ اس نے ہور ناں دے علاوہ  
 یوگینی یوتوشینکو، زلفیا، مرزا ترسن زادے، رومانیہ، بلغاریہ دا پنجابی وچ انوواد کیجا ہے۔ اپنی لکھنی اتے انوواداں  
 لئی امرتا پریم نوں سن 1980 وچ بلغاریہ راسٹری واپسا کو پرسکا دل چکا ہے۔

شاعرہ دے رچن تک مارگ دائر کھن رچن توں بعد ایہ دھیان رکھدیاں ہویاں کہ اس دی کوتا اتے  
 وار تک وچ ڈونگھا اتے اندرونی میل ہے اتے ایہ وی کہ وار تک لکھنی اس نے چوتھے دھا کے دے اخیر وچ ہی  
 شروع کیجی اس دیاں رچناواں نوں پٹھ لکھے چارھیاں وچ ونڈیا جاسکدا ہے۔ ایہ ونڈ دا آدھار اس دے  
 نظریے دی ہتر، بھارتی ناری دے شے دا اس دی رچنا وچ وکاس اتے رچنا تک شیلی دی دودھ دی پختا ہن۔

پہلا دور --- ستھاپنا دور ہے (تیجے دھا کے دے انت توں چوتھے دھا کے دے انت تک):  
نظمیں، گیت، کوتاواں دا۔

دو جادور --- وکاس اتے پر پکتا دور ہے (چوتھے دھا کے دے اخیر توں پنجویں دھا کے دے اخیر تک): نظمیں، لسیاں کوتاواں، ناول، کہانیاں اتے لیکھاں دا۔

تین جادور --- سمجھ توں بھرپور اتے گنجلد اردور ہے (چھوواں دھا کا): کوتاواں، کاؤنگریہ، ناولاں، کہانیاں، لیکھاں دا۔

چوتھا دور --- در قزمان دور (ستویں دھا کے توں ہن تک): کوتاواں، ناولاں، کہانیاں، آلوچنا تک لیکھاں دا۔

امرتا پریم دیاں رچناواں دی پڑچول کر کے اوہناں وچ ناری سب دے وکاس نوں سمجھیا جاسکدا ہے۔ ایہ شروع دیاں رچناواں وچ روایتی اتے رومانچک سی اتے بعد دیاں رچناواں وچ اصل وادی ہے، جس وچ رومانچک انش ہن۔ شاعرہ دی شخصیت اتے رچنا تک شیلی دے وکاس اتے پر پھلتا دا اثوٹ سمبندھ عورت دے آتمک بل وچ اس دے بھرپور وشواس نال ہے۔ امرتا پریم دی رچنا تک شیلی دی خاصیت اس دی منکھ دے نچی اتے ماتسک پکھاں وچ زندگی دے پرواہ نوں دیکھ سکھن دی سمر تھا ہے۔

(پبی امتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ناول کار امرتا پریم

امرتا پر تم دے پہلے ناول

پنجابی ناول دا بانی بھائی ویر سنگھ نوں بنیا چاندا ہے۔ اوہ اک کوی دے طور تے جانا جاندا سی۔ پراس نے بہت ساری وار تک وی لکھی جس وچ چار ناول شامل ہن۔ ایہ ہن۔۔۔ سندری، و بے سنگھ، ستونٹ کور اتے بابا نو دھ سنگھ۔ بھائی ویر سنگھ دے ناولاں توں پہلاں پنجابی سائت وچ کئی ورنن یوگ گلمپ رچناں سی۔ ایہی کارن ہے کہ بھائی ویر سنگھ دے ناولاں نوں پنجابی سائت دے نویں دور دا پہلا قدم بنیا چاندا ہے۔ "بھائی ویر سنگھ دے سارے ناول سکھ قومی لہر وچ سبائی ہون لئی، رچے گلے سن اتے اوہناں دی شبلی کھلے طور تے سکھیا تمک سی۔ اپنے پاتراں نوں چترن وچ لکھک نے صرف روایتی رچنا تک ڈھنگاں دی ورتوں کیتی۔۔۔ چترن اک پکھی اتے آدرشا تمک سی اتے اس وچ پاتراں دے آتمک سنسار دی ٹھیک جھلک نہیں سی ملدی۔ ایہ چیز نہ کیول مذہلے پنجابی ناولاں وچ سگوں بھارت دیاں دو جیاں بھاشاواں دے واہت دے شروع دے ناولاں وچ وی دیکھن نوں ملدی ہے۔

پنجابی ناول دے دکاس نال سبھ توں دڈی تبدیلی وشادستودج آئی جو کہ سے دی لوڑ دے مطابق زیادہ دھرم نریکھ بندی گئی۔ لیکھنی دے لچے دی بدلہ ے گئے۔ جیکر بھائی دیر سنگھ دا بیچا دھار مک اپدیش دینا سی تاں ناک سنگھ دا بیچا سماج سدھار اتے جسونت سنگھ کنول دا بیچا سماج دی تبدیلی ہے۔ پر زیادہ تر بھارتی آلوچکاں دے مطابق ویسویں صدی دے پہلے ادھ وچ پنجابی ناول دے دکاس وچ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ اس پر میرا دے مطابق جس توں گربخش سنگھ نے رومانچک آدرشواڈا ناں دتا ہے پنجابی ناول دے خاص لچھن ایسے۔ اک وکست پلاٹ بھاوکنا (نیمہڑی عورت دے چترن وچ خاص طور تے سدھی سی) اتے سارے

کرداراں دا صاف طور تے چنگیاں اتے ماڑیاں وچ ونڈے جانا۔

گر بخش سنگھ (1892-1975) نوں پہلی ہیڑھی دے وار تا کاراں وچوں اک جانیانا جاند اے۔  
 گر بخش سنگھ نے بہت وار تک لکھی اتے اس نوں آدھو تک پنجابی وار تک دے موڈھی دے طور تے جانیانا جاند ا  
 ہے۔ گر بخش سنگھ دی سائیک سرگرمی، پریت لڑی دے سپا دن اتے پنجاب دے سائیک پر جیاں پریتم اتے  
 'پھلاوڑی' وچ دی لکھن دے نئے وچوں پنجاب دی سمیا چارک زندگی وچ اک نویں لہر --- 'پریت لہر' دا  
 دکاس ہويا۔

گر بخش سنگھ دیاں رچناواں --- ناولاں، کہانیاں اتے سائیک پریت لڑی 'دا جس وچ اوہ  
 آپ نئی لکھ لکھدا سی، آدھو تک پنجابی وار تک دی شبلی دے دکاس اتے بڑا اثر ہويا اتے اس نال سائیک اتے  
 لوکاں دی زندگی وچ کار سمبندھ ہوڑ و نکھیرا ہويا۔ لکھک نوں عام کامیاں دی قسمت بارے چتا ہے اتے  
 سماجک دکاس دے راہاں دی بھال وچ اس نے مارکس واد دا وی ادھین کیتا۔

تیجے دھاکے دے شروع وچ نائیک سنگھ (1897-1971) جو کہ 'پریت لہر' دا ہی اک پریت مندھ  
 سی، ناول رچنا شروع کیتی۔ بھائی دیر سنگھ توں الٹ نائیک سنگھ نے اس سے دے پنجاب دیاں سماجک مشکلاں  
 نوں اپنے ناولاں وچ پیش کیتا۔ ناول دی کلا وچ اس دے استاد پریم چند اتے لیوناسٹائی سن۔ اپنے ناولاں  
 وچ نائیک سنگھ عورت وی برابری ذات پات دے سسٹم اتے پنڈاں وچ جمائی ٹکرا، دے سوال اٹھاؤندا ہے۔  
 چٹا لو (1932)، غریب دی دنیا (1939)، دور کنارا (1946) آد۔ نائیک سنگ دے تقریباً سارے  
 ناول انجاس تک ورودھ دی وچار دھارا نال بھرے ہوئے ہن اتے اس دی وجہ آپ نائیک سنگھ دی ایہ خوبی سی کہ  
 'اوہ سرتوں پیر تک بھاؤک سی۔ پر سدھ سوویت آلوچک ای۔ د۔ سیریریا کوف دے مطابق نائیک سنگھ دیاں  
 رچناواں نے پنجابی ناول وی پر پھلتا وا آدھار قائم کردتا اتے اس نوں نویں پنجابی ناول دا موڈھی گنیا جاسکدا  
 ہے۔

پنجابی سائیک دی دھارا، جس نوں گر بخش نے 'سماجک-تھارتھ' داناں ہے، سنت سنگھ سیکھوں توں  
 شروع ہوئی (ناول خون تے زمین) اتے اس نوں سریندر سنگھ ڈوانے اگے دھایا۔ (ناول 'لوک دشمن'، دین  
 تے 'دنیا، دلی دریا')۔ بھاؤک پر تھا اتے 'سماجک-تھارتھ' دی دھارا دا سائیک دکاس بھارت دیاں دو جیاں  
 بھاشاواں دے سائیک وچ وی پنجابی سائیک توں کچھ پہلاں سی دیکھن نوں ملدا ہے۔



آلوچکاں نے انت سنگھ سکھوں اتے سریندر سنگھ زولادی بڑی ہر شفا کیتی اتے اوہناں دیاں  
رچناواں وچ۔ تمھار تھاواو اتے سماجی حقیقت دی صحیح اتے ڈنکھی سمجھ داوی ذکر کیتا۔ ایہ وی کہیا گیا کہ ناول لکھن  
دے ڈھنگ وچ اوہناں نوں بڑی پختا پراپت ہے۔

پر پنجابی پانٹھک حالاں اجیے ناول پڑھن لئی تیار نہیں سن۔ عام پانٹھکاں دا جھکاؤ زیادہ بھاوک اتے  
رومانچک رچناواں ول ی۔ اک پاسے تاں اس طرح دے آدرش واوی ناولاں وچ کچھ چنگیاں وی سن۔  
پر دوجے پاسے جویں گربخش سنگھ نے صحیح کہیا ہے 'ایہ زچہ پنجابی ناول دے دکاس نوں روک رہی سی'۔

جو تھے دہاکے دے انت وچ کرتار سنگھ ڈگل، جس دیاں کہانیاں پہلاں توں ہی مشہور سن، نے وی  
ناول لکھنے شروع کیے۔ کرتار سنگھ ڈگل دے ناول دشا دے نظریے توں دلچسپ بن، پرکھاسک کچھوں سارے  
اک سار نہیں۔ اوس دا کھ مچا شہری مدھ ورگ دیاں اخلاقی قدراں نوں ظاہر کرتا ہے۔ عشق ہارے اوس دے  
ناول وچ فرائد (Freud) دے ستھانت دا اثر دسا ہے اتے اس کارن اوہ پچھم دے نویں ناول دے  
نیزے بن۔ اس دور دا دوجا ناول کارا اتے کہانی کار جسونت سنگھ کنول ہے۔ اوس دیاں رچناواں دنیاوی حقیقت  
دے اک دڈے دائرے نوں چھو ہندیاں بن اتے اوہناں دامول مقصد زندگی دے مطلب نوں پرکھ کرنا  
ہے۔ آلوچکاں نے او دے ناول 'پورن ماشی' رات باقی ہے، مہر پیارے نوں' آد پند کیے بن۔

چھویں دہاکے دے شروع وچ پنجابی ساہت وچ نویں لکھکاں گمردیاں سنگھ اتے موہن کالوں  
نے پرویش کیتا جنہاں نے روانت نوں تبدیل کرن دی کوشش کیتی۔ اوہناں دیاں رچناواں دے خاص چمن  
حقیقت دی صحیح سمجھ اتے بیان بن۔ نال ہی آلوچکاں نے ایہ وی کہیا ہے کہ اوہناں دیاں رچناواں وچ  
درسائے گئے درتارے دی چھان بین وچ بہتی ڈنکھیاں نہیں۔ اچھے ہی ناول کار سر جیت سنگھ سنکھی داوی  
ناں لینا ضروری ہے۔ اوہ پنجاب دے اوہناں بہت تھوڑے ناول کاراں وچوں اک ہے جس نے ہور ہے  
تجربیاں ول دھیان دتا۔

امرتا پریتم دا پہلا ناول ڈاکٹر دیو 1949 وچ ارتھات گمردیاں سنگھ اتے موہن کالوں دیاں کیرتاں  
نالوں کتے پہلاں چھپیا۔ امرتا پریتم دے ناولاں وچ ساہت پرمر اواں نال نیزنا اتے بیان نے نویں ڈھنگاں  
دی بھال دکھرے پڑاواں تے دکھ دکھ حد تک دیکھن وچ آؤندے بن۔ اس دا سمبندھ پنجاب دے سماجک  
حالات اتے ساہت درتارے دیاں دھیان وادان نال ہے۔



پنجابی ساہت اتے بھارت دیاں دو جیاں بھاشاواں دے ساہت وچ وی ناری دا پرشن اک اتیانٹ مہتو پورن وشا ہے۔ پنجابی ساہت دے اتہاس وچ اک سیاں دیاں نائیکاواں جوئیں کہ ہیر، صاحبان، سسی، سوئی دے ناں مشہور ہن، جنہاں نوں 16-18 صدی عیسوی وچ گایا گیا۔ ایہ نائیکاواں ناری دا پاتر ا لیکن لئی اک امک سوما ہن۔ ایہ کردار ناری چ تر دے ناں صرف ڈونگھائی اتے وفاداری ہی رساؤندے ہن، سگن ناری وی سونہر تادی اچھا، طاقت، پرانے سماجک ریتی رواجاں تے دھارمک بندھناں دے خلاف روس داوی ساکار روپ ہن۔

اتھے ایہ دسنا ضروری ہے کہ پنجاب دے سکھ دھرم وچ ستھاپنا دے سہ توں ہی ساریاں نوں رب اگے اک سامان گنیا جاندا سی اتے ناری اتے نر داوی اکو درجہ سی۔ وی۔ ای۔ کو چنوکھدا ہے۔ ”بھارت دے دوجے حصیاں دے مقابلے وچ پنجابی عورتاں کول زیادہ ستر تاتے زیادہ اوہیکارن اتے اچے وی ہن۔۔۔۔۔ عام طور تے پنجاب دیاں استریاں پر دے تے گھروں چار دیواری اندر جیون نہیں بیتاؤندیاں۔“

پر مہراواں دی پکیائی اتے ستر تاداؤا کارن ایہ ہے کہ عورت جھڑی کہ جتنی ماں اتے آؤن والی بچہ می نوں پالن والی ہندی ہے، پر وار دے ریتی رواجاں دی راکھی وی کردی ہے۔ دھارمک پرتھواں دی پالنا کرنا وی اوس دی ہی ذمہ داری ہندی ہے۔ ایس لئی ناری دا پرشن اتے اوس نال سمبندھت پر یورتن پورے بھارت سماج لئی بڑے معنے رکھدے ہن۔ ناری دی جاگرتی بھارت دے راج نیٹک اتے سماجک دکاس دا اک مہتو پورن انگ ہے۔ بہت ساریاں لیکھکاواں نے پرانے اتے بے مطلب سماجک اصولاں دے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ ایس بارے عصمت چغتائی (اردو) خدیجہ مستور (اردو)، ہرلاد دیوی، منوں بھنڈاری (ہندی) آدے نے وی لکھیا ہے۔ اوہناں نے اپنے درودھ نوں امرتا پریم دے مقابلے وچ زیادہ تکھے اتے زوردار شہداں وچ پرگٹ کیتا ہے۔ اس دے وپریت امرتا پریم نرم اتے احسان مند نظر آؤندی ہے۔ اوہ نعرے نہیں لاؤندی، ٹھٹھی نہیں کسدی، دراصل اوہ استری اتے اوسدی اپنی حالت نال چاندیاں بچھدیاں ہو یاں اہمیت دے ہی خلاف ہے۔ لیکھکا اپنیاں نائیکاواں بارے اتنے دل اتے پریرنا نال لکھدی ہے، جوئیں کہ اوس نے اپنے آپ اوہ سبھ کچھ جھلیا ہو دے جو اوس دیاں نائیکاواں نال گزردا ہے۔

اوس دے سبھ توں مہتو پورن منڈھلے ناول ہن۔۔ ڈاکٹر دیو، پنجر، اک سوال، رنگ دا پتا۔ ناول ڈاکٹر دیو، اک سوال مدھ ورگ دی ناری دی حالت نوں سرپت ہن تے ناول ’پنجر‘ اتے ’رنگ دا پتا‘ پنڈو



تے پایا ہے۔“ پراس دے نال نال لیکھ کا ایہ وی درساؤندی ہے کہ ناری دے اپنے من وچ بھرم حالاں بہت ڈونگھے ہن اتے اوہی اس نوں سوے دی پہچان اتے زندگی لئی لڑن توں روکدے ہن۔ ساڈے خون وچ پرانے سنسکاراں دے جہڑے کیہڑے ملے ہندے ہن، اوہی ہولی ہولی پلدے رہندے ہن۔ جیہڑے لوک مر چکے ہن، اوہناں دے سدھانت ہی انسان دی سپورن وچار دھارا اتے چھائے ہوئے ہن۔ جیون دے سارے راہ اوہناں نے ہی گھریرے ہوئے ہن۔

منکھی ہر دے نوں سوکھتا نال سمجھن والی امرتا پریتم نے ناول وچ نائیکہ دے منو دگیا تک کچھ نوں ایکن دے کلامی ڈھنگ دی ورتوں کیتی ہے۔ نائیکہ دی ہر گتھی دھی، سوچ سمجھ اتے آتمک پریرنا دا نتیجہ ہندی ہے۔ پاتراں دا چہرہ ترسناور ہیں اتے اوہناں دی سوچنی راہیں وی درسا یا جاندا ہے۔ پاتراں دی سوچنی راہیں اوہناں دا چہرہ ترالیکنا امرتا پریتم دی کلامی دھی دا اک ٹھ ڈھنگ ہے۔ ”ممتا سوچن لگی شاید ہر جیون اک بند کمرے دی طرح ہندا ہے جس دی اک باری قدرت دے وکاس والے پاسوں کھلی ہندی ہے۔ قدرت دے وکاس وچوں وی کدے کسے جن داد دھلا جیہڑا چہرہ، کدے کسے ہنیرے دی کاکھ، کدے اکھاں نوں چندھیاؤن والی روشنی تے کدے گھپ ہنیرا، کدے خشک ہواواں تے کدے پانی نال بھجا ہویا جنگل، کدی چنگا اتے کدی ماڑا گلن والا ہر طرح دا درشاس جیون روپنی کمرے وچ آؤندا رہندا ہے۔“

اس سارے وستار دا آدھار کیول اک الوکار ہے، جھروکے راہیں پنیدی روشنی۔ لیکن اس کو علم کار دے ارتھ اتے شبلی بہو نکھی ہن۔

اپنے توں پہلی پیرھی دے لیکھکاں نائیکہ اتے گربخش دیاں پرپراواں نوں جاری رکھدیاں امرتا پریتم نے نرم، سول پر نال ہی نال انکھیلی مان والی اتے اندرونی طاقت والی پنجا بن دا ہنسب الیکیا ہے۔ کسے حد تک ایہ چہرہ نیگور دی نائیکہ (آخری کاو، دی نائیکہ لا بونے، 1929) دی یاد دواؤندا ہے اتے ایہ کوئی حیرانی والی گل نہیں، کیونکہ لیکھکا اتے نیگور دا وی اثر ہے۔ امرتا پریتم دے ناول اتے نیگور دے آخری کاؤ دواں دے ہی پاتر کچھ زیادہ دلیری دکھاؤندے ہن۔ کیونکہ متھ ورگ دی کوئی وی کڑی ویہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ اجنبی نائیکھی نہیں سی کردی کہ اپنے رشتے توں ویاہ داروپ نہ دیوے۔ پر متادی ہوند دا ارتھ اس دا دیوانی پیاری۔ کسے حد تک متا دا چہرہ بھارتی استری دے پرپراگت چہرے توں الٹا ہے۔ پاتراں چترن دی دوہی وچ موکتا کچھ گھٹ نہیں۔ منکھ وچ سبھ توں وڈی وستو کراٹیل آدھار ہے۔ اس وچ امرتا پریتم

پنجابی کوتا دیاں پراتن پر پیراواں دا انوکرن کردی ہے۔ استری کراٹیل، رچنا تک مل دی جیوندی جاگدی مورت ہے۔ امرتا پر تیم دی نائیکہ دی دھیشنا ایہ ہے کہ اوہ اوہناں کارناں نوں کجھن دی کوشش کردی ہے جہاں نے اس نوں موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔ لیکن کھ نائیکہ وچ صرف چنگیاں ہی ہن اتے اس دا اک آدرش پاتر ہونا ناول دے وچاردھارک مل نوں کجھ گھٹاؤندا ہے۔ پاتر نوں لیکن وچ اک پکھٹا اتے اچے پیار دا رومانیک کرن اس گل واسطی ہن کہ اپنے پہلے ناول نال امرتا پر تیم پنجابی ناول شیلی وچ بھائی ویرنگھ دی تھاپت کیتی اتے نائیکہ دی اگے ودھائی اے بھاوک رومانیک پر پیراواں شردھا کجھلی ار پت کردی ہے۔

مستادے پاتر وچ پر پیراگت وچارا تے ناری چتر نوں لیکن دامل سدھانت دویں اکٹھے ہو جاندا ہے ہن جو اپنے دیا کتو دی صدا چارک پوترتا نوں نہیں پچاسکیا اوہ پیار نوں خش نہیں دے سکدا، کیونکہ اوہ پریمی نوں کیول نگلی سوغاتاں دیندا ہے۔ ”فیراک مورتی دی۔۔۔ مستانے پچھانیا اوہ جگدیش سی۔۔۔ مستادے ہر دے وچوں نکلیا، مینوں معاف کر دیو، مینوں کھما دے دیو۔ میں تہا نوں کی دے سکدی ہاں۔۔۔ میں سبھ پوچی لٹا چکی ہاں۔ تیس موتیاں دے وپاری سی، پر میں کنگال ہو کے تہاؤں کوں آئی۔ تہاؤں جیہاں وچ ملے پھٹے مکے، سستیاں سپیاں، نکلیاں نکلیاں سپیاں ار پت کردیاں مینوں شرم آگئی۔“

بیان کرن والے پکھاں دی چون وچ امرتا پر تیم دی لکھنا نظر آؤندی ہے: نائیکہ دے چترن وچ اس دے صدا چارک منو گیا تک پکھاں دا ڈنگھا ادھیان شامل ہے، جس نال کھاپن پیدا ہندا ہے، اتے سماجک سمیاواں ابھر کے سامنے آؤندیاں ہن۔

حالانکہ ناول دا انت دکھائیک ہے (مستادی موت ہو جاندی ہے)، اس نوں پڑھ کے پانٹھک اداس نہیں ہندا، کیونکہ پورا ناول آشاؤ نال بھر پور ہے۔ لکھنا درساؤندی ہے کہ کوئی صدیاں پرانے سماجک تے دھارک بھرماں وچ جکڑی بھارتی ناری جاگرت ہو کے اپنے ادیکاراں لئی لڑنا شروع کردی ہے۔ پہلیاں کوششاں وچ بے وی تھلکدی ہے اوہ پر یوار دے تنگ دائرے تک سمیت ہن۔ لیکن بھارتی حالات لئی اس داوی کافی سماجک مہتو ہے کیونکہ کئی صدیاں تک بھارتی ناری بے زبان غلام بن کے رہی ہے۔ تیجے تے چوتھے دھاکے داساں جس دا بیان ناول وچ کیتا گیا ہے اچھا سماں سی، جدوں بھارتی ناری دیاں رچیاں دا دائرہ گھر بار تک ہی سمیت سی۔

جس طرح پنجاب دے پرسدھ ناولکار نائیکہ دے ناول ’چٹا لہو‘ (سن 1932) وچ ناول دی

نائیکہ سارے سماج نال لڑسکن دی حالت وچ نہیں سی، اسے طرح امرتا پریتم دی نائیکہ نوں دی پچھے ہٹنا پیندا ہے، اس نوں کسے دی ہمدردی جاں سہارا نہیں ملدا۔ اتے ایہ کوئی شوگی میل نہیں، سگوں پنجاب دی اس سے دی ساجک حالت دا پرتیک ہے، جس وچ پرانیاں رہو ریتاں پھلدیاں آرہیاں سن۔

اجو کے بھارتی سماج دیدی آلو چنار دے نال نال لیکھکا ممتاز دے وچار راہیں نائیکہ دی اگلی آواز دی نفسانیا اتے ترارتھانوں درساؤندی ہے۔ پر آپ لیکھکا نوں وی گھول دے طور طریقے پتا نہیں حالانکہ ناول اک اچھے سے لکھیا گیا جد پنجابی پاٹھک شاید موجودہ ساجک اتے دھارمک بندھناں اتے حالات دے غلط پکھاں نوں سمجھن لئی تیار ہو چکا سی۔

لیکھکا دے پہلے ناول بارے آلو چکاں نے زیادہ رائے پرگٹ نہیں کیتی پر دوجے ناول 'پنجر' دے حق وچ بہت کجھ کہیا گیا۔ ہندی دے لیکھکاں وچوں جیند رکمار نے سمجھتوں پہلاں ناول دی پرسنہ کیتی۔ نیوزی لینڈ دے لیکھک چارلز براش نے امرتا پریتم نوں لکھیا۔ "میں پنجر ناول پڑھیا ہے، میں تینوں جاننا چاہندا کہ میں انٹرٹیک کتناں مل گیا ہاں۔ توں کہانی نوں بڑے خوش نور احساس نال لکھیا ہے۔ لفظاں دے سجم نال ایہ کیرت مان کرن والی ہے۔"

ناول 'پنجر' اک ہندو شاہوکار دے اُجڑے پروار دی بیٹی دی قسمت بارے ہے۔ ناول وچ پنجاب دی وند دے بعد ہویاں اخلاقی تبدیلیاں نوں درسایا گیا ہے۔

'ڈاکٹر دینو دی طراں ہی اس ناول وچ وی ہندوواں اتے مسلماناں وچکار دودھ دے ویر دے پورے دکھانت نوں درسایا گیا ہے۔ ملک نوں آزاد کرواؤن لئی پنجاب دی قربانی دتی گئی سی۔ امرتا پریتم نے، جس نے اپنے اکھیں اس خونی قتل عام نوں دیکھیا سی، اچھے حقیقی اتے درد بھرے ڈھنگ نال ہندو گویاں دے اودھالے، گھراں دے ساڑے جان اتے پناہ گیراں دے سارے دکھاں نوں چتریا ہے، کہ تقریباً سارے لیکھکاں دے اس وشے اوپر لکھن دے باوجود وی ایہ ناول کافی مشہور ہو یا۔ لیکھکا دو ملکاں دے واسیاں، پنجابیاں دی مانسک پریشانی اتے اوہناں دے احساس دی پیچیدگی نوں بیان کرن وچ کامیاب ہوئی۔ آپ لیکھکا نے لکھیا ہے، 'ایہ پورہ میں ہاں، ایہ میرا احساس ہے کہ جہڑی وی گزری اج نکالنے پیچیدی پئی ہے، سمجھو میری آتما نکالنے پہنچ رہی ہے۔'

نکال دیش وچ ہندو لڑائی دے دوران اک جوان اک دن لئی جنگ توں گھرا آیا۔ اس نے امرتا پریتم

نوں لہجہ کے اوس نوں بھگدیش دے شرتار تھیاں دی ذرور شایان کہتی۔

نال ہی اوس نے ایہ وی دسیا کہ اوس دیاں پستکال پڑھن والیاں اتے کیہ اثر ہندا ہے۔ اوس نے دسیا کہ اجے لوک عورتاں دی بے حرمتی کرن دی کستافی نہیں کردے۔ ایہ گل امرتا پرتم دی مہارت دی پرتیک ہے۔ ایہ قلم دے سماج اتے اثر دی نشانی ہے اتے اس توں پتا لگدا ہے کہ ناول کارنوں اک عورت دی بے حرمتی راہیں ملک دی ونڈ دیاں شکار ہزاراں لکھاں عورتاں دی قسمت بیان کرن وچ سفلیا ملی اتے اس پر سنگ وچ امریکی آلوچک وی چلی نہیں جا پدی کہ اکو کردار نال واپردیاں بہت ساریاں گھنٹاواں اک دوھیلی جا پدیاں ہن۔ ایہناں کتیاں دکیاں گھنٹاواں دے پچھے اک تاں سماجک اہمیت رکھن والے انش ہن اتے دو بے پاتہ تائیک دے کردار خاص طور تے پورو دے کردار وچ اخلاقی زور ہے۔ جدوں اپنے رشتے داراں کول جان دا موقع آؤندا ہے اتے ایہ امید وی ہندی ہے کہ اوس نوں واپس لے لیا جائے گا تاں اوہ کیوں واپس نہیں جاندی۔ کہ اس دی وجہ ایہ ڈر سی کہ سماج اوس نوں اتے سارے پردارنوں تیاگ دیوے گا۔ جے کراہی ہے کہ اوس دی نفرت پیار وچ بدل پئی ہندی ہے، اوہ اپنا اوہ حال کرن والے نوں پیار کرن لگ پیندی ہے، منہ سب دکھ راہندیاں دی اتے اپنے سنے سمبندھیاں توں دور ہندیاں دی ایہ گل پورونوں اوس دے نال رہن دا فیصلہ وچ مدد دیندی ہے۔ اتھے ناول کار نے احساس دی دھرم آگے پر مکھتا اتے زور دتا ہے۔ ناول کار دے مچے مطابق جیون دیاں دوراں ممکن ہن۔ حالات نال سمجھوتہ کیتا جاوے کہ تاں؟ پورو حالات نال سمجھوتا کر لیندی ہے پر ایہ اچیت سمجھوتہ نہیں، سکوں جیتن طور اتے چاکیا گیا قدم ہے۔ اس طرح نال جے کر پہلے ناول وچ متا دیو نال پیار کردی ہے لیکن کسے ہو نال دیاہ کرن لئی مجبور ہے تاں ہنجر دی پورو حالات نال سمجھوتہ صرف اس لئی کردی ہے کہ اوس دی محبت واقفنا ہے۔ اس طراں پہلے ناولاں وچ ہی اس سوال نوں دوکھ ڈھنگاں نال نیز یا کیا ہے۔ جستوں تک پورو دے چترن دا سوال ہے، تاں آلوچکاں نے بالکل صحیح کہیا سی کہ اوس دا چتر اک دم آدرش داوی ہے۔ اس نال چتر دا کلا تک وزن اتے اہمیت ضرور کجھ گھٹ جاندے ہن، پر ایہ آلوچنا پروان نہیں کہیتی جاسکدی کہ "اوس نوں پورے معافی وچ عورت ہونا چاہیدا ہے۔" کیونکہ پورو دا اپنے خاوند ول رویہ اتے اوس دا آخری فیصلہ اس گل دے خلاف ہن۔ اوہ اپنے احساس کارن رشتے داراں کول جان توں نانہ کر دیندی ہے۔

ڈاکٹر دیودی وشادستونوں جاری رکھن والا امرتا دا اگلا ناول اک سوال ہے۔ اس دا مکھ تائیک کلاکار



جگد یپ ہے۔ کتھا تک دے دو مکھ رکھ بن جہڑے دو تانیکاواں شانی اتے ریکھا دے چتر اں نال سمبندھت  
 بن۔ اوہناں دوہاں دی قسمت دا جگد یپ دے جیون نال نیڑے دا سمبندھ ہے۔ ناول وچ بیان کیتیاں  
 گھنناواں بھارت دی ونڈ توں بعد دے سے دیاں بن۔

ناول کارنائیک دے بچپن درساؤندی ہے جد اوس دی ماں دی موت ہو جاندی ہے اتے نائیک  
 دے من وچ سروشکتی ماں رب دی ہونڈ بارے شک پیدا ہو جاندی ہے کیونکہ ایہ رب اوس دی پرائتھنا دے باوجود  
 دی اوس دی ماں نوں نہیں بچا سکیا۔ جگد یپ دا امیر باپ شانی نال دو جاویاہ کرلیندا ہے۔ شانی اک غریب گھر  
 دی بیٹی ہے جس داویاہ اوس دے گھر والے اوس دی مرضی دے خلاف کر دیندے بن۔ کالج دی پڑھائی توں  
 بعد جگد یپ کلاکار بن جاندی ہے بہت سفر کردی ہے اتے تصویراں بناؤندا ہے۔ اپنے پتا دی موت دے بعد اوہ  
 شانی دی بدبختی نوں سمجھدیاں ہویاں اوس دے دوہے ویاہ اتے زور دیندا ہے۔ ناول دے اخیر وچ شانی  
 اپنے من چاہے بندے نال ویاہ کرلیندی ہے اتے اک خوش چتی اتے ماں بندی ہے۔ جگد یپ دی ملاقات  
 اک دیہاتی عورت ریکھا نال بندی ہے اتے اوس نوں ریکھا نال محبت ہو جاندی ہے۔

لیکھکا نے شانی اتے ریکھا دے چتر اں نوں اپنے ڈھنگ نال چتریا ہے۔ ایوں جاپدا ہے کہ  
 ناول وچ وکھری قسمت ہندیاں وی اوداک دوہے دے چتر نوں پورا کر دے ہوں۔

شانی دے کردار نوں لیکھکا نے بڑی ہمدردی نال اکیلیا ہے۔ زبردستی کیتے گئے ویاہ توں بعد اوہ کھوہ  
 وچ چھال مارن دی کوشش کردی ہے پر اوس دا پریمی اوس نوں بچالیندا ہے۔ اپنے پتی دی موت توں بعد اوہ  
 پر پیرا مطابق اپنے پتا دے گھر نہ مڑ کے ہور ناں نکھاں بھارتی ودھواواں وانگ اپنے پتی دے گھر ہی رہندی  
 ہے۔ اوس دا جائیداد تے کوئی حق نہیں، دوہے ویاہ بارے اوہ سوچ دی نہیں سکدی، اک طرح نال اوہ گھر دی  
 چار دیواری وچ زندہ دفن ہو جاندی ہے۔

اتھتھے امرتا پریتم نے ویاہ دے سوال نوں دوہے کچھ توں چھوہیا ہے۔ اتھتھے اوس نے ودھوا دی  
 حیثیت اتے اوس دے دوہے ویاہ دے سوال دا ذکر وی کیتا ہے۔

لیکھکا نے درسا یا ہے کہ آپرڈن نرم و طیرے والی شانی دا سوہا کتنا بریک اتے پیچیدہ ہے۔ متا  
 دے چتر دی طرح اتھتھے وی شانی اپنی اخلاقی سوچھتا دا سوال ضروری ہے، میں جی نہیں سکدی میرا تن ہی رہ  
 گیا ہے میرے کول اوس نوں ہور سنبھالن دی طاقت نہیں، میری آتما ناں اوس دن ہی کھوہ وچ ڈب گئی سی۔

امر تا پر تم نہ صرف ایہ دکھاؤندی ہے کہ اوس دی نائیکہ دا درتارا کس طرح دا ہے سکوں اوس دے مانسک اتے ساجک پچھو کڑنوں وی دکھاؤن دی کوشش کردی ہے۔۔۔۔۔ چلو، باپو ہی تھوڑا خوش ہو جائے گا تے اوہناں دے سرتوں قریضے دا بھارتھوڑا ہلکا ہو جائے گا۔۔۔۔۔، اوہ ہی راضی خوشی جی لین۔۔۔

ناری پرشن دے سلسلے وچ ناول دا آلوچنا تک زکھ صاف نظر آؤندا ہے۔۔۔۔۔ ”مرضی کیہ چیز ہے۔۔۔۔۔ کس نوں کسے دی مرضی دی پرواہ ہے۔ میرے باپ نے مینوں ویج دتا سی۔ میں تاں کھوہ وچ چھال مارنا چاہندی ساں۔۔۔۔۔“ ناول دیاں ایہناں سطران وچ روحانی درد اتے غصہ جھلکدے ہن۔

شہانی دی قسمت دی مثال نوں لے کے امر تا پر تم ودھواواں دے خوس رہن دے حق دا ذکر کردی ہے، اوہناں دے دو بے ویاہ دی گل کردی۔ اوہ ایہ درساؤندی ہے کہ حق ملن نال شخصیت نوں ابھرن اتے سنتر ہون دا موقع ملدا ہے، اوس دی نائیکہ جگر سے نال بولن لگ پیندی ہے، اوس دی آواز وی پکی ہو جاندی ہے۔۔۔۔۔ پر اوس دی خوش ہون دی خواہش بہت نرم اتے بے چین ہے، بھادایہ کہ اکار شک ہندیاں ہو یاں دی شہانی داچتر کسے حد تک نچل ہے۔ گل ملا کے لیکھکا اک ایسے چتر نوں لیکھدی ہے جو کہ ہورتاں ہزاراں لکھاں ہندوستانی عورتاں دی طراں دقیا نوی خیال دی شکار ہے اتے اوہناں دے خلاف سرگرم لڑائی نہیں کردی۔

جیکر شہانی نوں پر یوار دے دائرے اندر ودایا گیا ہے تاں اس دے الٹ دوجی نائیکہ ریکھا نرم اتے سوچوان ہے، اس نوں اک پر سمجھا شالی اتے مشہور شاعرہ دے طور تے درسایا گیا ہے۔ ایہ لیکھکا دی سماجی عورت داچتر ہے۔۔۔۔۔ ریکھا کلا تک ملاں دی ستھاپنا وچ قلم دے ماہراں، دی یعنی اپنی تھاں نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ اس نال لیکھکا ایہ درساؤن دی کوشش کردی ہے کہ عورت بڑی کامیابی نال ساجک زندگی وچ حصہ پاسکدے اتے کلا دی سیوا کر سکدی ہے۔ ایہ نویں پنجاب دی ناری ہے اتے اس دی سوچ دا دائرہ اگے نالوں بہت وڈا ہے۔ جد تک ریکھا دی ملاقات جگد پپ نال نہیں ہندی اوہ اپنے وپاری پتی نال خش اتے شانت ہے۔

ناول ”ڈاکٹر دیو“ جس وچ لیکھکا نے ناری دی پرچلت ویاہ پر تھا دل ساہن خیلنا دکھائی ہے، توں الٹ ناول ”اک سوال“ وچ سوال کھڑا کردی ہے: ”کی کیتا جاوے؟“ اک پرواہ کرن والے پتی نوں سوچے اتے پریرنا بھرے پریم لہی وی جھڈ جانا کھوڑا تے انیا نہیں ہندا۔ امر تانے بڑے دکھن ڈھنگ نال اس کردار



نوں الکیا ہے: اس دی نائیکہ دے باہری احساساں وچ نہیں، سکوں گجھے اتے اندرونی احساساں وچ بڑی گہرائی ہے۔ ایناں وچ ہی اس دی کجج ہے۔

پرنائیکہ دے چہرہ وچ ہی ایہ نہیں کہ اوہ اک نال جیوے اتے پیار دوجے نال کرے۔ سبھ توں قیمتی چیز اوہ بھاؤک نرملتا ہے جو کھا پس ایہ انسانی تعلقات وچ پئی بھاؤنا دا نتیجہ ہے۔ نائیکہ دے سامنے دوراہہ بن۔۔۔ سچ بہ دینا (جو کہ) ”ڈاکٹر دیو“ دی متا نال بویا، جاں اپنے پیارنوں قربان کردینا۔ اس ناول وچ امرتا پریم اپنے آپ نوں دہراؤندی نہیں: اس لئی اپنے پیار دی قربانی اتے اپنے پتی اتے آتمک وارا اپنی موت دے برابر بن۔ اس لئی ایہ دلیل کہ ”لیکھکا اپنے آپ نوں دہراؤندی ہے۔“ کجھ بے بنیاد جا پدی ہے۔ مول بھاؤک و شائعج ہے: ناول دے اخلاقی سوال داخل ریکھا دے چہرہ راہیں کھنکھایا ہے اتے کمزوری اتھھے دوجی ہے: نائیکہ اچھیا بھاؤک بھار سہ نہیں سکدی اتے اس دی موت ہو جاندی ہے۔ اتھھے شاید امرتا پریم تھوڑا جیہا رومانس دا دھول جھکی ہے: کاو آتمک موت شاید نائیکہ نوں پانھک دیاں نکاتیاں وچ ہو راجا کر دیندی ہے۔ اس طرح دے انت وچ تیجے اتے چوتھے دھاکے دی رومانس وادی شاعری دی جھلک دسدی ہے۔ لیکھکاں اصلی جیون دی لڑائی۔ تھار تھوادی ڈھنگ نال نہ کر کے نائیکہ نوں رومانس وادی موت پران کر دی ہے، اس نوں رستمی انت دیندی ہے۔ ریکھا عورت دی مکتی، خوبصورتی اتے شخصیت وی روح دا اک رومانچک روپ ہے۔ ایہ لیکھکا دی رچنا وچ نویں ماری چہرہ دا پراروپ ہے۔ نائیکہ دے پریم دے اپنے رومانچک درجے ہون دا اک پرنیک ایہ وی ہے کہ نائیکہ دا اس دل رویہ روحانی ہے۔ ریکھا خود قدرت دا اک حصہ ہے، ”پانی وچ پرچھاواں“ ہے۔ جویں اک ”دکھا تھک کاو“ ہے۔ اس ناول وچ لیکھکا دی کاو آتمک بھہ بہت صفائی نال اجھ دی ہے۔ قدرتی خوبصورتی دا نکھانو مجھو منکھی روح دے سبھ توں کوئل وچاراں دی ڈونگھی کجھ۔

اپنے پہلے ناولاں دے الٹ ”اک سوال“ وچ لیکھکا اپنی نائیکہ دے چہرہ دا بیان پروارک زندگی دے دکھ دکھ پکھاں توں مکت ہو کے کر دی ہے: اس دے پہلے ناول وچ متا سکول وچ کم کرنا شروع کر دیندی ہے تاں ”اک سوال“ وچ ریکھا ساجک زندگی دا اک اہم حصہ ہے۔ اوہ ایہ سمجھدی کوشش کردی ہے کہ اس دے کماں دا سماج اتے لوکاں نوں کتنا حاصل ہے۔

دو جیاں رچناواں وی طرح اس ناول دا کاو آتمک مل جذباتی نائیکہ دے انشاں، کجھ نائیکہ دے چہرہ دے روایتی اتے اسادھارن ہون نال کجھ حد تک گھٹ جاندے ہے۔

پچھلے ناول 'وچ اٹھائے' کے سوال دا جواب ناول "بند دروازہ" وچ ملدا ہے۔ اس دی نائیکہ کی بچپن توں ہی حقیقت نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے، جداوہ دیکھدی ہے کہ اس دا پتا بیدردی نال اس دی ماں نوں ماروا ہے۔ ماں کیوں ایہ وطرہ سہندی ہے؟ شروع وچ کی نوں نہ اس وطرے نوں بہن دی وچا تے نہ ہی مطلب سمجھ آؤندے بہن۔ پروڈے ہون توں بعد مرد دا ظلم اتے عورت دی بے بسی، جہاں نوں اپنی اکھیں دیکھدی ہے، اس نوں جھوڑے رکھ دیندے بہن۔ اوہ سمجھ جاندی ہے کہ اس سانج وچ گھر نوں بناؤن توں بعد دی ناری گھر دی مالکن نہیں۔

ناول "بند دروازہ" وچ ایسں دیکھدے ہاں کہ ناری دی آرتھک ستمبر اس نوں دو جیاں دے نظریے نوں نظر انداز کرن اتے اپنے فیصلے آپ لین دی طاقت بخش دی ہے۔ اس طرح چیتنا نوں ناری دی قسمت بدلن دا اک طریقہ درسائیاں، امرتا پریم اس ناول وچ پروار وچ ناری دی موجودہ آرتھک ستمبر نوں بدلن دا وی سوال کھڑا کردی ہے۔ اس ناول وچ نائیکہ دیکھا دے مقابلے وچ زیادہ آتم و شواں اتے سوئے مان رکھدی ہے، اوہ زیادہ طاقتور اتے بے سمجھوتا ہے۔ ناول دی نائیکہ کی ہی دیاہ توں انکار کر کے دروازہ بند کردی ہے۔ پر اوہ اپنے استریونوں گواندی نہیں، مرداں نال نفرت نہیں شروع کردی، اپنے کوڑے تجربے دے باوجود وی سمجھ نہیں جاندی۔ امرتا پریم دی ناری وچ مذہلہ فرق ایہ ہے کہ اوہ ہر حالت وچ پیار کرن دی اچھا اتے امید جاگدی رکھدی ہے، اوہ رومانچک امیدیں اتے امنگاں نال بھرپور ہے۔ اس وچ اک اچھا انتر ورودھ ہے، جو کہ اندرونی طاقت اتے نال ہی نال بھوکتا وچ پرگٹ ہندا ہے۔ ایہ انتر ورودھ ہی امرتا پریم دے ناری جے تردی تازگی دا سوما ہے۔

عشق دی چاہ، پر ناری سویمان اتیا تم سہمان دی قیمت تے نہیں --- عورت دے اس گن امرتا پریم دے اگلے ناول "رنگ دا پتا" وچ نظر آؤندے بہن۔ اس ناول نال لیکھکا دی ناری سوال دی سمجھ وچ دی تبدیلی آؤندی ہے۔ ناول وچ ساجک ٹکراء درسا یا گیا ہے جو نائیکہ کیلی دی بورڈ وار ہوریتاں دے خلاف اتے اپنے پیارنی اٹھائی گئی آواز راہیں درسا یا گیا ہے۔

ناول دا لکھ پلٹ اک سادہ اپنیڈ وکڑی کیلی دی قسمت دوا لے گھندا ہے۔ اس دے ماما پتا قرضے پیٹھاں دب جاندے بہن، اوہناں اتے چنڈ دے شاہوکار لکھے شاہ دا اینا قرضہ ہو جاندے کہ اوہ اپنی بیٹی دا اس نال دیاہ کرن تے مجبور ہو جاندے بہن اتے کیلی جیہڑی کہ رومانچک پریم دی آس وچ جیوندی ہندی ہے اس

شاہ دے گھر آ جاندی ہے، جتنے اس دے بچے (پہلے دیاہ توں) بہیاں روٹیاں کھاندے من اتے نہائے بنائی رہندے بہن کیونکہ اوہناں دا باپ صابن نہیں دیندا۔ گھروچ فرنیچر اتا پرانا ہے کہ ویکھدیاں ویکھدیاں ٹھنڈا جاندی ہے۔

ناول دی نائیکہ کیلی اپنے امیر اتے بے اصولے پتی دے گھر روٹی دی فکرتوں بنا زندگی گزار سکدی سی۔ اوہ کد ام وچ تلی اک دی چھان بین کرن لئی آئے انیسٹر نال عورت دی طرح معاملہ بناسکدی سی۔ ایہ اک اس دے پتی نے ہی بنے دے پورے پیسے وصول کرن لئی جان بچھ کے لگوائی سی۔ اس توں علاوہ مال دا عملی حصہ اس نے پہلاں ہی چھپا لیا سی۔ راتیں دیر نال شاہوکار نے کیلی نوں جان بچھ کے انیسٹر جو اوہناں دے گھر ہی ٹھہر یاسی دے کمرے وچ بستر اوچھاؤن لئی گھلیا۔ کون جان دا ہے اوہ اس توں بعد زیادہ آرام طلب زندگی جیوں سکدی سی۔ پر امرتا پریم دی نائیکہ اجہی نہیں۔ اوہ اپنے بے اصولے گھر والے نوں چھڈ کے اپنے من چاہے مرد کوں چلی جاندی ہے۔ پر چپ چوچتی نہیں سگوں اچی آواز وچ اس دی اخلاقی کمزوری دے خلاف بول کے اتے سماج نوں دنگار کے۔ کیلی دے چتر وچ امرتا پریم اک اجہی ماری نوں درساؤندی ہے، جو نہ نہ اپنی انکھ نوں پچھاندی ہے، سگوں اس دے حق وچ ٹھوس قدم دی چکدی ہے۔ "میں جاں رہی ہاں جیکر توں پلس نوں باویں گاتاں میں تیری ساری سازش کھول دیواں گی۔"

ایہناں ناولاں وچ گھٹناواں نوں سدھی اتے سرل شیلی وچ الیکیا گیا ہے۔ لیکھکا بڑے سدھے سادے فقرے استعمال کرنا پسند کردی ہے جیہڑے کہ مطلب دے پکھوں اتنے وزن دار ہندے بہن کہ اوہناں نوں پورے سچیاں وچ بیان کیجا جاسکدا ہے۔

"سماج نے میرا ہتھ پھڑ کے مینوں اس راہ تے پایا ہے۔"

"گھٹناؤنیاں اتے غلیظ شکلاں والے لوک گالاں کڈھدے دوویں پاگل کتیاں دی طرح اک دو جے نوں دھندے بہن۔"

اس دے مذہلے ناولاں وچ ہی ناولاں آؤنوں جہاں دی طرح ورتیا گیا ہے، جس دے نتیجے وچوں اک ویش چیز عام عام چیز دی پرتیک بہن جاندی ہے۔ اس لئی اک باہرلی گھٹنا اندرلی کھجوتان نوں درساؤندی نہیں بلکہ اس ول اشارہ کردی ہے۔ اس وچ ہی امرتا پریم دی گھپ شیلی دا انوکھا جھوٹا ہے۔

"بندرواڑہ" اک خود قید ہوئی عورت ول سکیت کردا ہے جد کہ اگلی پیرھی دی عورت آپے اس سے

دروازہ بند کر دیندی ہے جدوں اوہ کے چیز نوں اپنے اخلاقی اصولاں دے مطابق نہیں سمجھدی۔ یعنی کہ ناول دے ناں واس تھاں تے اک مطلب نہیں۔ ”اک سوال“ دا مطلب ہے ”کیہ کجیا جاوے؟“

امرتا پریم اک سوال اٹھاؤندی ہے اتے حقیقت نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ پر ناول وچ اس کہتے گئے سوال دا کوئی جواب نہیں ملد اس نال پاتراں دیاں رہورتیاں وچ جکڑی زندگی وچ کوئی فرق نہیں پیندا، جد کہ لیکھکالنی انسان دی پورنتا، احساس دی پورنتا اتے اکھنڈ تاتے اخلاقی آسرے دی بھال رچناواں وچ ساکار بندے ہن۔

لیکھکا دے وار تک دی دوجی دھیشٹا ہے۔۔۔ سنکھپنا اتے وار تک وچ چلنا دے کھلے استعمال راہیں حاصل کجیا جاندا ہے۔ اس ساہتک سا دھن دا صحیح استعمال اس دی شبلی دی وڈی خاصیت ہے جیہڑی اس نوں صحیح، نپے تلے اتے سپشٹ ڈھنگ نال بیان کرن وچ مدد دیندی ہے۔

امرتا پریم دی شبلی وچ بیان دے روایتی اتے نویں ڈھنگاں دا ہتجا میل ہے۔ اس نوں خاص طور تے اس دے قدرت دے بیان وچ دیکھیا جاسکتا ہے۔ اوں دیاں رچناواں وچ اک پاسے بھارتی ساہت وچ پہلاں توں پرچلت منو گیا تک قدرتی نظارے ہن، جیہڑے پاتراں وی مانسک اوتھنا بیان کردے ہن۔ اس توں وی زیادہ سوکھم اتے شگفتی شالی ہن قدرتی نظارے دے بیان دے نویں طریقے۔ اتھے قدرتی نظارا نویں ساہت وچ پرچلت اک جھہ جاں ڈھنگ ہے۔ اس دی مثال ناول ”ڈاکٹر دیو“ وچ ممتا دا پسنا ہے۔

امرتا پریم دے ناول ”ڈاکٹر دیو“ اتے ”اک سوال“ وچ بدھی جیو ورگ دے پرتیندھاں دے رہن کہن دے بیان لئی ورتے ڈھنگاں وچ بریک چون نظر آؤندی ہے جد کہ ناولاں ”پنجر“ اتے ”رنگ دا پتا“ وچ پنیز و پنجابیاں دے رہن کہن دے تجربے، سمجھتا، مانسک بھڑاؤ دے بیان لئی صحیح طریقے دیاں دی چون دی مثال ملدی ہے۔ مثال دے طور تے ممتا دی بول چال سنکھپ اتے پر بھاوک ہے۔ دیو دے لفظ ہوو طرح دے ہن، اس دے سادے لفظاں وچ وی کوتا جھلکدی ہے۔ دل نوں چھو ہن والیاں کوتاواں امرتا دے پہلے ناولاں نوں اک خاص نگھ اتے سنگیت پردان کردیاں ہن۔

ایہ سبھ کچھ مل کے ہی امرتا پریم دی شبلی نوں انوشا بنائو ندا ہے۔ اس دا نتیجہ اہم اہم کہ امرتا پریم دے پہلے ناولاں وچ ہی کئی تھاواں نوں کئی وار پڑھن دی لوڑ پیندی ہے اسے سطران وچکار بھرے بواں دل دھیان دینا پیندا ہے۔ لیکھکا اپنی شبلی نوں بہو پکھتا پردان کردی ہے، جھو ادنوں حقیقت نال جوڑ دیندی ہے۔

لیکھکا لئی ایہ طریقہ اک ایسا ہتھیار ہے جس راہیں اوہ پانٹھکاں نوں اپنے پاتراں دیاں حرکتاں دا سدھامل نہ پا کے اوہناں دے دولاں نوں منو و گیا تک بھل بھلیو یاں دج آؤن دا سدھادیندی ہے اتے زندگی ول اپنا رویہ کجھن لئی پریردی ہے۔

اس طرح نال اپنے مذحلے نادلاں (1949-1963) وچ امرات پریم ناری پرشن بارے لکھدیاں اپنے وسہدینوں دودھاؤنچی جاندی ہے: اخلاقی مثالاں اتے عورت نوں دہی بناؤن والیاں رہو ریتاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں شروع ہو کے اوہ ساجک مسلیاں اتے بورڈ واساج دے ریتی روایتی دی آلوچنا تک پہنچ جاندی ہے۔ ایہ کوئی نچوگ نہیں کہ لیکھکا ناری دے سوال نوں پنجاب دی ونڈ دے سوال نال جوڑ دی ہے۔ اس ونڈ نال ملک وچ موجود اوہ اترو دودھ جنہاں نال ناری دی اوستھا خراب سی، ہور نکھیرے ہو جان دے بن۔

اک سائنسدان دی طرح اوہ سوکھمتا نال ہر درجے دی پنجابی عورت دے نظر لیے دی ہنرتے دکاس دا ادھین کردی ہے: بھارتی سماج دے ریت رواں دیاں خامیاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں عورت دے سماج لئی لاہے وند کم دے سپرک وچ آؤن تک اتے پر یوار اتے سماج وچ اپنے حق لئی لڑائی دی لوڑ تک، ساریاں پڑواں دایمان امرتا پریم کردی ہے۔ ناری پاتراں نوں درساؤن وچ روایتی جذباتی رومانچک ڈھنگ (پہلے نادلاں وچ) توں لے کے رومانچک-تھار تھوادی ورتوں کیتی گئی ہے۔

امرتا پریم دلوں درسائے گئے پل پل جیوندے جاگدے پاتر بن، جو بارت دیاں اس دور دیاں ساریاں عورتاں دے حقیقی احساس اتے خیالاں نوں دکھاؤندے بن۔

ناری پاتراں نوں الیکن وچ اخلاقی نرم لٹا دا اصول لیکھکا لئی سبھ توں ضروری اصول ہے۔ پر ایہ اچا اخلاق، جس دا ذکر امرات پریم کردی ہے، بھارتی سنسکرتی وچ پرچلت عورت دے اخلاق نال پورا میل نہیں کھاندے۔ بھارتی روایت انوسار عورت دے گن بن: نرم ہنٹا، آتم بلیدان، سبن شیلٹا اتے دین دی بھادنا۔ ناری پریم دے الیکن وچ انوٹھا پن نہ میل کھان والے گناں دے گھہ جو رنال حاصل کیا گندا ہے۔ ایہ گن بن: کرمی، رومانچک مجاز اتے نال ہی نال اک عجیب روحانی طاقت۔

ناری پاتراں نوں درساؤن لئی ورتیا کیا سبھ توں وڈا ڈھنگ منو و گیا تک پڑچول کیا جاسکدا ہے۔ لیکھکا اپنے پاتراں اے کماں دا سدھاملن نہ کر کے اوہناں دے نال نال سوچ وچار کردی چا پدی ہے اتے

پانٹھکانوں اپنے ہم وطنوں دے دکھ دردوں وچ شامل ہوں داسدا دیندی ہے۔

امرتا پریم دی نائیکہ چپ چپیتے دکھ سہن والی نہیں سکوں اپنے ڈھنگ نال بے انصافی دے خلاف  
آواز اٹھاؤندی ہے۔

نائیکہ اپنے آلے دوالے نال نہ صرف روحانی سکوں اصلی طور تے ناتا توڑ لیندی ہے اتے لیکھکا  
اوس دے اس قدم نوں اکواک صحیح قدم قرار دیندی ہے۔ اپنیاں نائیکاواں وچ سویمان دے احساس دی  
جاگرتی اک چنگیرے جیون دی چاہ، جیون وچ اپنی تھاں نوں سمجھن دی کوشش ایہناں ساریاں چیزان دا  
درساؤ تاہم گیتی شیل ہون دا چھہ ہے اتے اس طرح نال، ایہناں مڈھلے ناولاں وچ دی امرتا پریم دے غلب  
ساہت وچ سماجک آلوچنا دا مادہ نظر آؤندا ہے، جو خاص طور تے سرمائے دار بھارتی بورژواہلے وچ پرچلت  
سنگاراں اتے اوہناں دے ناری دی اوتھالے اثر تے چاٹنا پاؤندا ہے۔

## چھیویں دھا کے دے ناول

لیکھکا دے چھیویں دھا کے دے ناول اک طرح نال ناری پرگتی دے بیان نوں ہی جاری  
رکھدے ہن، جس وچ تبدیلی ناول "رنگ دا پتا" توں شروع ہوئی۔ ایہناں وچ اک طرح نال لیکھکا دے  
روحانی وکاس دے پرمان ملدے ہن۔

اپنے ناولاں 'ناگ منی جاں چک نو: چھتی (1964) اتے 'دھرتی، ساگر تے سپیاں' (1965)  
وچ امرتا پریم نے شان، سویمان اتے آتم زبھرنا دے کچھوں سبھ توں پرکھ ناری چترالیکے ہن۔  
امرتا پریم دے اس طرح دے بے سمجھوتا جاندار اتے غیر پرہیزگت پاتر بناؤن دے پچھے کئی  
کارن لکھے جاسکدے ہن۔

سبھ توں پہلاں ایہ کہ پہلے ناول دے چھپن دے سہ توں اس سہ تک تقریباً ویس سال گزر چکے ہن  
اتے اس دوران امرتا پریم نے نجی جیون اتے اک لکھک دے طور تے بہت تجربہ حاصل کر لیا سی۔ دوچار ایہ کہ  
بھارتی ساہت دے چھیویں دھا کے دے وکاس دیاں کچھ ویشیٹاواں نے امرتا پریم دی رچنا تک شیلی اتے  
اپنے اثر دی چھاپ چھڈی۔

ویسویں صدی دا چھیواں دھا کا اک ایجیا سماں سی جدوں سدھائٹک گھول کچھ تلخیرا ہو گیا سی، جس دا



اثر پوربی دیشاں دے سہایت اتے خاص طور تے بھارت دے سہایت اتے ہو یا۔ آزادی حاصل کیتیاں دس ورھے تر چکے سن، لیکن چھوٹے چھوٹے قدم دے راہ وچ وی اندرونی اتے باہریاں پچھانہ کچھو طاقاں والوں اوڑاس دا ساہنا کرنا پیندا سی۔ دو بے پکھوں چنگیاں پریتیاں دی غیر موجودگی نے سماج نوں نراس کردتا سی۔ دکھ دکھ طاقاں وچ حد بندی شروع ہو گئی، راشتری اکیٹا وچ تریڑ پے گئی۔ اس طرح پیدا ہوئی حالت وچوں نظاں لئی لیکھکاں نے پچھی دیشاں دے سہایت وچوں کوئی حل لھسن دی کوشش کیتی۔

دو بے قلم دے ماہراں دی طرح امرتا نے وی کامیو، سارتر، لارنس، شین بیک ول نظراں موزیاں۔ شاعرہ نوں فرانسیسی لکھاری اتے ڈاکٹر شین بیک بہت پسند سن۔ شین بیک دو بے پنجابی لیکھکاں وچ وی مشہور سی اتے اسد کھتا جاندا ہے۔ امرتا پریم نے خود فراسٹ اتے ایڈگن ایلن پودیاں کئی کوتاواں دا ترجمہ پنجابی وچ کیتا۔

شخصیت بارے امرتا پریم دے وچاراں وچ اپنے مضبوط اتے کمزور کچھ ہن، ایہناں وچ کچھ وچار جان پال سارتر دے نظریے نال میل کھاندے ہن اتے کئی اس توں عین الٹ ہن۔

کرشنا سوہتی دے ناولاں اتے سعادت حسن منٹو دیاں کہانیاں دا حوالہ دیندیاں امرتا پریم ایہناں لیکھکاں دی مہارت دا ذکر کردی ہے، جنہاں نے صرف دو پریمیاں دی نیز تا بارے نہیں لکھیاں گوں اوہناں دے دل دی حالت بیان کرن وچ کامیابی حاصل کیتی، اتے ایہ دی وکھاسکے کہ اک سچے پیار دا قدرتی پرگنا، کس طرح وی دلی نرماتا اتے وشواس دی قیمت تے ہندا ہے۔ امرتا دے ناول "ناگ منی" دے پاتراں دے آپسی فکر، ادا و حسار ایہی نظریہ ہے۔

ناول دے پاتر ہن کمار اکمار اتے امیر زادی الکا، جو کسار کول کلا دی سکھلائی لئی آؤندی ہے۔ کمار اپنے کم وچ لیٹن ہے اتے الکا نوں پسند کردیاں ہویاں دی شادی دا ارادہ نہیں رکھدا۔ اوہ پیار دے کارن اپنے بچوں نوں نہیں گواؤنا چاہندا اتے پیسے دے سمبندھ (20 روپے والے) نوں زیادہ بہتر سمجھدا ہے کیونکہ اس نال اوہ نے اتے کوئی بوجھ نہیں چنیدا، نہ احساس دا نہ آرتھک اتے نہ ہی سماجک۔ الکا اس نال پیار کردی ہے اتے اپنی مرضی اتے سویمان نال ایہ شرط قبول کردی ہے۔ اوہ الکا نوں بالکل نہیں سمجھ سکدا۔ نہ تاں اس نوں اس دل الکا دے شانت رویے دی سمجھ پیندی ہے اتے نہ ہی الکا دی اپنی قسمت اتے سماج وچ بدنامی ول بے پرواہی دی۔ کمار نے کسے سے اپنے دوست دی ہوٹل بناؤن وچ بڑی مدد کیتی سی۔ اس دے بدلے اس نے

کمار دی مدد زمین دانو تاخیر کے سٹوڈیو بناؤن وچ کیتی۔ ہن اوس نے کمارنوں ہونے دے نویں پراجیکٹ دی سجاوٹ لئی دلی بلایا۔ اس سے لئی اکا اپنے پتا دے گھر جاسکدی سی لیکن اوہ سٹوڈیو دی اساری پوری کران لئی پنڈ وچ ہی رہ جاندی ہے۔ دلی وچ کمارنوں ایہ گل سمجھ آؤنی شروع ہو جاندی ہے کہ اوہ اکا نال پیار کردانیں اتے دوسری عورت نال سبندھ نہیں رکھ سکدا۔ اکا دا پتا اوس دے گھر مڑ آؤن اتے دیاہ کراؤن اتے زور دیندا ہے۔ اکا اپنے سنگیترون ساری گل دس دیندی ہے۔ خبر آؤندی ہے کہ کمار موت تے بستر تے تے ہے اتے اکا اوس کول جا کے ہمیشہ لئی اوس دے گھر و دھوا دے طور تے رہن دا فیصلہ کردی ہے۔

اکا دا عشق اوس نوں سپٹ دیکھن وچ مدد دیندا ہے، اوس دی سانجھ اتے احساس نوں نکھیرا کر دیندا ہے۔ عشق اوس دی دنیا دی سمجھ اتے اوس دے اپنے وجود نوں ڈونگھیرا کر دیندا ہے۔ جیکر کمار دے احساس استھیا راتے رومانچک ہن تاں اکا دا جذبہ ڈونگھا اتے استھیا رہے۔ ایہناں دونظریاں دے ٹکراء وچ اکا سدھی سادی اتے اڈول ہے، کمار دے سن وچ کئی طرح دے اک دو جے توں الٹ و چار آؤندے جاندے ہن۔

لیکھکا درساؤندی ہے کہ کس طرح بارت ورگے پر پیراگت سماج وچ دی دیاہ بارے وچاراں وچ وڈی تبدیلی آ گئی ہے۔ روایتی دیاہ دی تھاں بورژوا دیاہ نے لے لئی اتے امرتا پریم اوس دیاں صفتاں دے گیت گاؤن دا کوئی کارن نہیں سمجھدی۔ اوس نے بڑے حقیقی اتے ہریک ڈھنگ نال پاتراں دے رہن سہن اتے سوچ و چار وچ ہویاں تبدیلیاں نوں درسا یا ہے۔

ناول 'دھرتی، ساگر تے سپیاں' اک لڑکی چیتنا دی کہانی ہے جس نوں اقبال نال پیار ہے۔ اقبال دی اوس نوں پیار کردا ہے لیکن اوس نال دیاہ نہیں کر سکدا۔ اس دی وجہ اوس دی ماں سی جس دا پیچھو کڑ بڑا دکھدائی سی؛ 16 سال دی عمر وچ اوس نوں جبراً گھروں چک لیا گیا سی پر بعد وچ اوس نوں سڑک تے سٹ دتا گیا۔ اوس نے بچے اقبال نوں جنم دتا۔ ساری زندگی اوس نے اقبال نوں سرپت کر دتی۔ اوس دی قربانی نوں جاندیاں اقبال نے اپنا پیار اوس نوں دین دا فیصلہ کیتا اتے طے کیتا کہ ہور کوئی عورت اوہناں درمیان نہیں آوے گی۔ چیتنا اوس نال سمست سی پر اوس نے اک گزارش کیتی: اوس دا دیاہ اقبال نال ہووے جاں نہ، پر اوہ پہلا مرد ہونا چاہیدا ہے جس نوں اوہ اپنا تن من دیوے۔ اوہ بچے نوں جنم دیندی ہے پر اقبال توں ایہ گل ایہ کہہ کے چھاپ لیندی ہے کہ اوس نے بچے نوں اتنا تھ آشرم جوں لے کے اپنایا ہے۔ چیتنا کم کردی ہے اتے بچے



نوں پالیدی ہے۔ اقبال دی ماں زور دیندی ہے کہ اوہ چیتنا نال دیاہ کر لوے، کیونکہ اوہ چیتنا دے اس بچے نوں دیکھ کے سمجھ جاندی ہے کہ اوس دا پوتر اے، پر اقبال نوں اس بارے کجھ نہیں وسدی۔ چیتنا اس شرط تے راضی ہو جاندی ہے کہ اوس دا اپنا بچہ اوس دے نال ہی رہے گا۔ اقبال نوں دیاہ توں بعد پتا لگدا ہے کہ ایہ اوس دا بچہ ہے۔ اس دی وجہ ایہی کہ چیتنا ایہ نہیں سی چاہندی کہ اقبال سمجھے کہ اوہ بچے دی گل کر کے اوس اتے دیاہ لئی زور پیا رہی ہے۔

چیتنا دے اخلاقی سدھانت سچٹ اتے کپے ہن: صاف دلی اتے احساس دی سوچھتا اتے چیتنا دا ویہار کوئی غیر اخلاقی نہیں سکوں سوے چیتنا دا پرتیک ہے۔ اس نوں پر میرا گت سدا چارک ملاں دے خلاف اک آواز وی کہا جاسکدا ہے، اوہ مل جیہڑے کہ انسان دے آدرشاں نوں کچل دے ہن اتے انسانی رشتیاں نوں وکرت کر دے ہن۔ چھوویں دھا کے وچ اس ہندوستانی ”کنز یو مرسوسائی“ دے چند صاف ابھردے ہن۔ لیکن اس طرح دا ورودھ کجھ حد تک غیر قدرتی ہے، زیادہ طور تے ایہ لیکھکا دا اوس ساہت دے خلاف دس لگدا ہے جس نے زندگی نوں آدرش روپ دے دتا ہے اتے انسانی احساس نوں صرف اصول دے سمیت داترے دے اندر ہی درساؤندا ہے۔ امرتا پریتم جویں بیارنوں اوس دی پہلی انسانی، احساس نال بھرپور خوبی پر دان کرنا چاہندی ہووے جیہڑی کہ اک سے رومانچک کویاں دیاں رچناواں وچ دیکھن نوں ملدی سی۔

اسیں آلوچکاں دی اس رائے نال پوری طرح سمیت ہاں کہ امرتا پریتم کیول اوہناں گھراں نوں اجاڑ دی ہے جیہڑے کہ کچی اتے ”ان اچھا“ تے اسری عید تے کھڑے ہون جاں اوہناں نوں، جنہاں وچ تریڑ پے گئی ہووے۔ اس طرح نال اوہ اخلاق دی سمجھ توں اچی پدھردی راکھی کردی ہے۔ امرتا پریتم پکھنڈ توں دور ہے اتے نزدیکی سمبندھاں بارے اوہ کھلے اتے متھے طریقے نال گلاں کردی ہے جو کہ چھوویں تے ستویں دھا کے دی پیڑھی لئی سجاو ک سی۔

پر جیکر راہنڈر ناتھ میگور اپنیاں رچناواں وچ ”اعلیٰ لیا“ دا انش نہیں سی آؤن دیندا اتے نہ ہی دوجیاں لکھاریاں دیاں لکھتاں وچ اوس نوں پسند کر داسی، تاں اس توں الٹ امرتا نوں لیکھکاں دی بھارتی پاتراں نوں ساہت وچ زیادہ کھلے بناؤن دی کوشش پسند ہے۔ اوس نوں پاتراں نوں کام و چارواں دا کھنا پر کھنا اتے اس توں وی ودھ کے عشق دا زیادہ حوصلے والا اتے نجھک بیان زیادہ پسند ہے۔ اوہ لکھدی ہے کہ نیزے دے سمبندھاں دے کھلے بیان وچ نہیں سکوں لیکھک دے اوہناں نوں درساؤن چکھلے مقصد وچ ہے۔

سچائی اتے روحانی خوبصورتی دے آدرش ایہ امرتا پریتم دے رچنا تمک ویا کتو دی خاصیت ہے جو ناری چہ تر وچ پورستادی لگا تار بھال وچ دیکھن نوں ملدی ہے۔

امرتا پریتم دے دو بے دور نے ناولاں وچ دی انسانی ہوند اتے سچ اتے پریم دے سوسیل بارے ڈونکھی سوچ دے میل دا احساس ہندا ہے۔ ایہ وی کہیا جاسکدا ہے کہ اتجھے کسے حد تک ٹیگور دی سندرتا بارے دھارنا دیکھن نوں ملدی ہے۔

ایہناں ناولاں وچ امرتا پریتم دی ناری پاترنوں اے لیکن وچ مہارت سبھ توں زیادہ دیکھن نوں ملدی ہے۔ اوس نوں اپنے پاتراں دے آپسی رشتیاں وچ سبھ توں سوسکھم اتے ڈونکھے احساس دا بیان کرن وچ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ایہ پاتراں دے سرکالی بن: انسان اپنے آپ نوں صرف دو جیاں راہیں سمجھ سکدا ہے اتے اس کچھ توں "ناگ منی"، "دھرتی ساگر تے سپیاں" وچ نویں بھارتی ساہت دے سبھ توں "اُجاگر اتے سیانے ناری پاتراں" وچوں کچھ دیکھن نوں ملدے ہن۔ اوہناں دے خاص چندہ نرمی اتے سدھاپن بن۔ شاعرہ امرتا پریتم ات جذباتی اتے بودھک ہے، لیکن ناول کار امرتا پریتم شانت اتے مختصر ہے۔

پراون دانا ناول "ایریل" (1968) رچنا تمک کچھوں اک ونگی ٹیڈھی لکیر ہے، اتے گل ملا کے دودھ دی ترقی دے بیان دی حد توں باہر ہے۔ اس دا ذکر بھارتی اتے سودیت آلوچکاں دوہاں نے ہی کیتا ہے۔ اس ناول دا دائرہ آتم مکھیا، شخصیت دے فلسفے نال جوے سوال، اک وگسے ویا کتو دی اندرونی "میں" راہیں پزچول ہے۔ ناول دانگھ وچار عورت دا اکلا پن ہے جس نوں ناکامیاب محبت راہیں درسایا گیا ہے۔

اس ناول وچ ڈھانچے دی اسپشٹا اتے سمبندھتا پلاٹ دا کمزور وکاس، بودھک اتے انوبھوی کچھاں دی ملاوٹ آدیکھن نوں ملدے ہن۔ اس دی وجہ ایہ ہے کہ ناول وچ لیکھکا دے وچاراں دی بہتات ہے جس نال گھٹناواں اتے پاتراں دے درنن ول گھٹ دھیان دتا گیا ہے۔

چھیویں دھا کے بھارت وچ آرتھک اتے سماجک ڈھانچے وچ انتر وودھاں دے دیکھن نال راج تیک جیون اتے اصولی جدوجہد وچ نگھاپن آیا، جس دے نتیجے وچوں بھارتی بدھی جیویاں وچ ڈھانچا اپر سننا خاصہ اتے اخلاقی سنگٹ پیدا ہوئے۔

اس کارن ہی بھارت دے کئی لیکھکاں نوں جویں کہ ہندی دے اگیوارا جید ریادو، تیگودے رچھو

کوئٹہ اوسونت شاستری، مراٹھی دے ہلو اڑ کر، پنجابی دی امرتا پریم نے پرانے ڈھنگ توں زیادہ ہو کے پرگٹایا دے نوں ڈھنگاں نوں اپناؤن دی کوشش کیتی۔ تمھارے تھوڑے دے منج تے کھڑیا ایہ لیکھک پچھم دی آسمک سمیتا وچ کجھ اجیہا طور طریقہ لکھدے ہن جہڑا کہ بھارتی سہت وچ اس کٹھن منواو تھا دا بیان کر سکدا ہو دے۔

امرتا پریم دی پراپتی اس وچ ہے کہ اوس نے نوں بھارتی سماج وچ بیگانگی (alienation) دے لچھناں نوں پچھانیا، لیکن اوس نوں اک بورژوا سماج وچ شخصیت دی بیگانگی دے مول کارن نہیں دے۔

امرتا پریم دی سبھ توں وڈی خاصیت ایہ ہے کہ اوہ سدائیں طریقیاں دی بھال وچ رہندی ہے، جس نال اوس دے رچنا تک ہتھیاراں وچ ہمیشہ نوں انش ویکھن نوں ملدے ہن۔ جیکر ”ڈاکٹر دیو“ اتے ”اک سوال“ وچ دکھائیک حل ہے تاں ”ناگ منی“، ”دھرتی ساگر تے سپیاں“ وچ اوس نوں ناول دے ڈھانچے نوں بدلنا پیا۔ دو بے دور دے ناولاں دے خاص چھپن ایہ ہن کہ منو گیا تک ناول دی طرح اوہ گہرائی دل نوں جاندی ہے اتے کارناں دی بھال وچ رہندی ہے۔ اس نال پلاٹ دی اہمیت گھٹ جاندی ہے اتے اندرونی تارکک سمبندھ زیادہ ضروری بن جاندے ہن۔ باہر لے طور تے کدے کدے ناول دے حصیاں وچ کوئی آپسی سمبندھ نہیں نظر آؤندا۔ ایہناں ناولاں وچ امرتا پریم نے دین والے کارن نہیں، سگواں، گھجے بھارت نوں درسایا ہے، جو باہروں آسانی نال نظر نہیں آؤندا۔ اک چھوٹے جے ویروے راہیں امرتا پریم پورے چتر نوں درسا سکدی ہے۔ اک اجیہا طریقہ لکھا دی مٹی ہے۔ ”خوشی چیزاں وچ نہیں خوشی دل دی حالت وچ ہے۔“ لیکھکا تارکک پڑچول اتے آپ چیتنا (subconscious) دے پرواہ دے بیان وچ مہارت رکھدی ہے جو کہ انیتا یا دگاراں اتے اجوکڑ دی ڈلوں اتھل مٹھل وچ اپنے آپ نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ اس توں اسیں لیکھکا دیاں۔ تمھارے تھوڑے دے ویش گن منو گیا تکتا ہارے کہہ سکدے ہاں۔ ایہ کہیا جاسکدا ہے کہ منڈھلے ناولاں وچ ورتی گئی منو گیا تک پڑچول نوں بعد وچ ہو کر گہرائی ال استعمال کیتا۔

لیکھکا دے چھوویں دہاکے دے ناول اوس دیاں پہلیاں گلیپ رچناواں نال تاں اندرونی طور تے جڑے ہوئے ہن ہی، اس دے نال ہی اوہناں وچ باری چتر دی پرہرگت دیا کھیا توں لگا تار و دھدی دوری دی نظر آؤندی ہے۔ دو بے تمھارے تھوڑے دے لیکھکاں جو کہ موہن سنگھ، کرتار سنگھ، ڈگل اتے جسونت سنگھ کنول آدے اپنیاں رچناواں وچ باری دی سماج اتے گھر وچ اپنی تھاں بناؤن لئی گھول دے سوال نوں اٹھایا ہے

لیکن اوہناں نے اس مسئلے نوں کیول سماجک پرکار دے طور تے لیا ہے۔ اس توں ہٹ کے امرتا پریم نوں عورت دے احساس وچ روحانی مولکتا دا پرمان ہون دے طور تے دلچسپی ہے۔ پر لیکھکا اس گل نوں صرف حقیقت دے طور تے بیان نہیں کردی، ناری دے کردار دا دکاس اوس دیاں رچناواں وچ زندگی دی چال توں اڈ نہیں، نایکاواں دے حقیقت نال نا کرے وچ اوہناں دیاں خوبیاں زیادہ صاف طور تے ابھر دیاں ہن۔ لیکھکا اپنی ہر نایکا دی شخصیت دے انوشے دکھرے پن تے زور دیندی ہے پر اس دے نال ہی اوس دے دکھرے پن وچ ہزاراں ہندوستانی عورتاں دے احساس اتے خیالاں دا پرگٹاوا ملدا ہے۔

## ستویں دھا کے دے ناول

لیکھکا دے چھویں دھا کے دے انت اتے ستویں دھا کے دے شروع دے ناولاں وچ زیادہ دے وستودی بھناتا تے زیادہ سماجک رخ جوں کہ متر نال پیار، ماتر بھوی نال پریم، جیون دا مطلب اتے جوان پیڑھی دا بھوکھ آد موجود ہن۔ شاید اس دی وجہ دیش دی وچار دھارک، سماجک اتے سماجک زندگی وچ ہویاں تبدیلیاں وچ آشاوا دی جذبات دا تراشاوا اُتے غلبہ سی۔ اس دا سمبندھ اوس نویں اتہاسک پڑاوا نال ہے جس وچوں بھارت گزر رہی سی۔ ایہ پڑاوی دگیا تک اتے تکنیکی ترقی دا بھارت دی سماجک اتے آرٹھک اتے نال ہی سمجھا چارک زندگی تے اثر۔

اگانہ ودھو لیکھک اک اچھے نویں پاتر دی تلاش کردے ہن جو کہ اس دور دے اُنت وچاراں نوں درسا سکے، اتے اوہناں دی بناتے حقیقت نوں تبدیل کر سکے۔

اج دے بھارت دی سماجک اتے راجنیتک زندگی وچ نویں پیڑھی دا مسئلہ، بھارت جے بھوکھ دا سوال، ودھدی ودیا رتھی چیتنا دی سمجھ اک وڈا مسئلہ ہے۔ کالجیاں اتے یونیورسٹیاں دے ودیا رتھی موجودہ سکھیا پرانی وچ تھوڑاں اتے سماجک انیاں دے خلاف آواز اٹھاؤندے ہن۔ نویں نویں وچاراں اتے لہراں ودیا رتھیاں وچکار پرچلت ہو رہے ہن۔ سرکاری سیکٹر وچ تیز منہمتی دکاس دا پروگرام، لوکاں دے جیون پدھر وچ اسمانتا نوں بناؤن دی کوشش، اک سماجوا دی قسم دے سماج دی اساری۔۔۔ ایہناں ساریاں چیزاں دی حمایت نوجوان کردے ہن اتے ایہ قدرتی گل ہے کہ لیکھک نویں سماج دی اساری وچ نوجوان طبقے دے رول ول اپنا دھیان دیون۔

ہندی دے لیکھک کاشی ناتھ نے اپنا ناول ”اپنا فرنٹ“ 1952ء، چھپوئیں دھا کے دے اخیر دی و دیار تھی لہر بارے لکھیا۔ تیلگو دے لیکھک کنٹھار او دے ناول ”پنج کڑیاں“ اتے ”جیون“ دی پنجوئیں تے چھپوئیں دھا کے دی نو جوان چیز مٹی دے بارے سن۔

کے وی سچے لیکھک دی طرح امرتا پر تيم دی سے دیاں ہواواں وچ ساہلیندی اتے اوہناں دے اثر پیشہ رچناواں لکھدی ہے۔

کی اوس دے پاتر گھول دے راہ تے چلے بن؟ امرتا پر تيم اجہی ہی کچھ کوشش کردی ہے جدوں اوہ درساؤندی ہے کہ سرکار دے خلاف سچیاں دین کر کے اوس دے پاتر نوں جیل بھیج دتا جاندا ہے اتے اوہ تھے اوہ کوتا لکھدا ہے۔ اتے ایہ کوئی اتفاق نہیں کہ اس دا جیل نمبر (جیت کترے) گوہر کی دے پاتر دے نمبر نال میل کھاندا ہے جاں ناول ”جلا وطن“ دے پاتر نوں ہی الو۔ اوہ اپنے آپ نوں اپنے ہانیاں مطابق ڈھال نہیں سکدا کیونکہ بودھک اتے آسمک وکاس وچ اوہ اپنے ساتھیاں نالوں کتے اگے ہے۔ اسے وچ امرتا پر تيم نوں یوگ دے خاص چھہ دکھائی دیندے بن۔ لیکن بن تجربے کار امرتا پر تيم اپنے پہلے ناولاں ”ایریل“ آدی طرح ناولاں دا اثر اشا وادی جاں دکھانک انت نہیں دیندی۔ نویاں رچناواں وچ کوئی صاف انت نہیں جس نال ساڈے نظریے وچ اوہ ادھورا پن اتے اسپشٹا رہ جاندا بن، جہاں دا اپنا مطلب ہے۔

انسانی نے کہا ہے کہ جی کلا ہمیشاں پانٹھک نوں رچنا بارے سوچن اتے انت تک پہنچاؤن لئی مجبور کردی ہے۔

امرتا پر تيم دے ناول ”ایریل“ (1968ء) اتے ”جیب کترے“ (1971ء) ساٹھی سمیا راہیں اک دو جے نال جوڑے ہوئے بن۔ ناولاں دیاں گھٹناواں اکو سے ہندوستان دے چھوئیں اتے ستوئیں دھا کے وچ دا پر دیاں بن۔ پاتراں وچ وی سانجھ ہے۔۔۔ ایہ نو جوان اتے و دیار تھی بن۔ پر جیکر پہلے ناول دا نکھ پاتر اپنی امرتوں زیادہ سیانا بودھک اتے بھادک نو جوان ہے تاں ”جیب کترے“ دا نائیک اپنی چیز مٹی دا مثالی پر تیندھ ہے۔ رخصیت اتے سماج دے ٹا کرے راہیں لیکھک بھارتی جیون دی پرانی اتے نویں دھارا دے مت بھید نوں درساؤندی ہے۔

”جلا وطن“ دا نو جوان نائیک ملک اک پڑھیا لکھیا اتے بنجیدہ لڑکا ہے۔ اوہ پڑھائی ختم کرن توں بعد ایہ نہیں جاندا کہ کیہ کرے گا۔ کتاباں دے علاوہ اوس نوں کسے ہور چیز وچ دلچسپی نہیں اوس لئی کتاباں ہی سبھ

کچھ سن۔ ملک اتے اوس دے دوستان دا جیون دکش اتے شور شرابے والے موج میلے نال بھر پور ہے جو کہ  
دو دیا رتھیاں دی زندگی دا خاص پنکھن ہے۔

ملک جیاں اتے جھوٹیاں قیمتاں بارے بہت سوچ وچار نال اس نتیجے تے اپڑا ہے کہ اوس دا  
دوست جھوٹیاں قیمتاں دے پچھے پے کے جال وچ پھنسیا سی اتے اوس نے خود کشی اسے لئی کیتی سی۔ نو جوان دی  
اندرونی کھون اتے تراستاوا کارن سماج نال ہون والی کھوٹاں ہے۔ پاتر سماج اتے اوس دیاں کپڑیاں دی  
طرح لاہ کے بدل لین والیاں قیمتاں نوں آسانی نال منظور نہیں کر سکدے، اسے لئی اوہ دکھی ہن۔ ناول وچ  
اندرونی جدوجہد دا کارن اندر لی دو جتی اتے ملک دی زندگی دے مطلب دی اتھل پتھل اتے دکھائی بھال۔  
تریجا نال رشتہ ملک دے چہرے نوں ہو رڈ ونگھٹاؤندا ہے، اتے ایہ سدھا ہے کہ اوس دے محبت بارے وچار نوں  
پیڑھی دے نو جواناں دے وچاراں نالوں کئے وکھرے ہن۔ پر اوس دا تریجا ول رویہ کیوں اتنا سخم والا اتے  
شانت ہے؟ اوہ تریجا نوں ملن دی کوشش دی نہیں کردا، سگس تریجائی اوس نوں ملن دا بہانہ ڈھونڈ دی ہے۔

پچھلے ناولاں وچ امرتا پرتم لئی سبھ توں کوڑا اتے دکھائی وچ پرواردی جھوٹی شانتی اتے گھر دے  
سکھ نالوں زیادہ قیمتی سی۔ کیہ اس دا مطلب ہے کہ ہن امرتا پرتم دی کلا تمک بھال وچ کچھ فرق پے گیا ہے؟  
ناول وچ پیار دے سمجھے کارناں دی گھوکھ توں ایہ پتا لگدا ہے کہ ملک تریجا دی ماں ول کچھ عجیب جذبہ محسوس کردا  
ہے، جیہڑا اوس نوں خود اپنے آپ نوں وی سمجھ نہیں آؤندا۔ ملک اتے تریجا دی ماما دے وچکار کوئی عجیب  
دکھائی مانسک دیوار ہے۔ اوہ تریجا نوں وی ایہ جذبہ کھول کے سمجھ نہیں سکیا۔ اسے لئی اوس دے جذبے وچ  
رکاؤٹ، لگاؤ پنا آدین۔ دو جا کارن ایہ ہے کہ اوس لئی عشق زندگی دے مطلب توں وکھر نہیں سی ہوسکدا،  
اوس لئی عشق و انسادی پکار جاں لیول "حلقہ سمبندھ نہیں سی ہوسکدا جوین ایہ اوس لئی سی جس نے تریجا دی سبھلی  
نوں دھوکھا دتا۔ اوس لئی عشق وچ کس طرح دا سمجھوتا، دھوکھا جاں ہولا پن نہیں سی ہوسکدا۔ اس لئی امرتا پرتم  
جذبات نال سمبندھت اپنے سبھ توں اہم اصول تے قائم ہے اتے ایہ کیس وچ ایہ سارے کارن جذبے دے  
پوری طرح کھل کے سامنے نہ آؤن دی وجہ بندے ہن۔

ناول داناں "جلا وطن" اسے لئی ہے کہ لیکھکا نے نائیک نوں عشق اتے خوبصورتی ول اپنے نظریے  
دے سلسلے وچ اپنے ساتھیاں نالوں کتے اچا در سایا ہے۔ اوہ جویں کہ اپنے دلش وچ بندا ہو یا دی جلا وطن  
ہے۔ اس کردار وچ امرتا پرتم نے سبھ توں سوہنے تے اچے چھ اکٹھے کیے ہن۔ ایہ کردار نوں بھارت دا،



اوس دے بھوکھ دا چنھ ہے۔ امرتا بھارت دی نو جوان پیڑھی سوچ اجے لکھن ہی ویکھنا چاہندی ہے۔ اوہ چاہندی ہے کہ نو جوان سیانے اتے وچار شیل ہوں۔ ناول وچ ملک دا کردار منو گیا تک اتے دویاک پکھاں توں دلچسپ ہے۔ اوس دا ڈسے واری دا احساس اتے وکاس بارے وچار بہت نوین ہن۔ مکھ ناک دی سوچ سمجھ راہیں امرتا پرتم اس ناول وچ نو جوان طبقے دی منو گیا تک اوستھانوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ ”وقت میرے نال کی کر رہیا ہے؟ کیہ کرے گا؟ اتے وقت نے میرے نال کی کیتا، کیوں.....؟“

دوہویں صدی دے ستویں دھا کے وچ نواں سماں نو جواناں دے جیون وچ پلاڑی جہاز اتے اینم اتے جت دی آواز ہے روپ وچ پرولش کردا ہے۔ ایہ سماں نویں رواج، نویں وچار، نویں بودھک پدھر، نواں رویہ، سمجھ کجھ پیدا کردا ہے، جس دے نتیجے وچوں نویاں سکائناں اتے انٹر ویرودھ پیدا ہندے ہن۔

نائیکہ دی سوچ وچار، اوس دی اپنے اندر دی اوکھ، جو کہ پیدا ہندی بیگانگی (alienation) اتے اثر پاؤندے ہن، شاید بھارت وچ واپردی حقیقت نوں صحیح درساؤندے ہوں، پر ادنی سوچ وچار پانھک نوں بہت اہم مسئلایاں توں ہٹا کے اندر لے ”میں“ دس موڑ کے لے جاندا ہے ہن۔ زیادہ کر کے ناول ”جلا وطن“ پرانے اتے نویں اخلاقی اصولاں دی تموز نوں درساؤندا ہے۔ اجے سماں وچ سفلتا کی چیز ہے؟ دوپے دی جیب وچوں چیمہ کڈھنا۔ جو زیادہ پیسے کھچ سکے اوہی زیادہ کامیاب منیا جاندا ہے“ ناول وچ امرتا پرتم بڑی سوکھتا نال نویں پیڑھی دی سوچنی وچ ونگ ویلویاں اتے گجھلاں وچ جھات پاؤندی ہے۔ ساڈے وچار نال وڈیہوں نال سمبندھت گجھلاں اتے ”بیماریاں“ جو کہ سجاوک ہی ہن زیادہ چنگی طرح ناول ”جیب کترے“ وچ درسائیاں گئیاں ہن۔

بھارتی آلوچکاں نے نویں ناول وچ بڑی دلچسپی دکھائی اتے زیادہ تر آلوچکاں دا کہنا سی، امرتا پرتم نے ناول وچ نو جوان پیڑھی، جس نوں کہ بہت وڈیاں اوکڑاں دا سامنا کرنا پیندا ہے، نال ہمدردی نہیں دکھائی، سگوں اوس نوں اپنا پیارا تے لاؤندا ہے۔

ناول ”جیب کترے“ دی وٹے دستو دا ذکر کردیاں بھارتی آلوچکاں نے لیہناں دی تعریف کیتی۔ ڈی۔ این۔ کلاہن نے اس ناول نوں ملکی ہوں دے نال نال کٹھور کہانی دسدیاں کیہا کہ ناول ”جیب کترے“ دوہویں صدی دے اتم ناولاں وچوں اک ہے۔

ناول دا مکھ ڈھانچہ امرتا پرتم دے اپنے بیٹے دے ویاہتی جیون اتے آدھارت ہے۔ ویاہتھیاں

اگے آؤندیاں ساریاں سسیاواں نوں کھل کے دن توں بعد لیکھکا پائھک نوں نوجواناں دی قسمت بارے سوچن تے مجبور کردی ہے۔

ناول داکھ پاڑ، انجینئری داودیا تھی کھل اتے اوس دے متر اپنا تقریباً ساراں اک پرانے سن مسان عمارت "شانتی گھر" وچ گزار دے ہن، جتھے کوئی گندگی، کٹڑ پٹا اتے بیش پرستی نہیں۔ اس تھاں تے اوہناں نوں گل بات اتے بحث کر کے شانتی ملدی ہے۔ اوہ اپنے اگے کھڑے مسکیاں نوں سلجھاؤندے ہن، "سنسکرتی دے جنسی (salitric) دکاس" تے افسوس کر دے ہن، ودھدی بے روزگاری تے زوس پرگٹ کر دے ہن۔ اتے اچھے کتھن کہ "ہیں بھوکھ نال، سے نال تے ڈر نال کھیڈ رہے ہاں" صرف ایہ درساؤندے ہن کہ اوہ "سگریٹ دے کدے کدے دھوئیں دی طرح" اپنے نجی درد نوں بھلا سکدے ہن۔ نوجوان بے مبری نال کسے روشن دن نوں دیکھن دی لالسا رکھدے ہن۔ کیہ ایہ ممکن ہے؟ جے ہے تاں کس حد تک؟ لیکھک ایہ سوال کھڑے کردا ہے۔ لیکھکا نہ کھل نوں تے نہ ہی ونود جاں تنویر نوں آدرشاؤندی ہے۔ ایہناں ساریاں دے دکھانت راہیں امر تا پرہم کل ملا کے پیڑھی دے سوال نوں کھڑا کردی ہے۔

نوجوان کلاکار ونود دا ہنر پوری طرح مکمل مکمل نہیں سکدا۔ سماج سپورن کلا نہ چاہ کے اک طرح دیاں تصویراں ہی پسند کردا ہے کیونکہ اصلی کلا تاں اک اچھا شیشہ بن سکدی ہے جس وچ سماج اپنے آپ نوں دیکھ سکے۔ ایہ سماج ہی پہلے نمبر دا "جیب کترا" ہے جس نے نوجواناں دی کلا دے ودھن بھلن دے حق نوں اپنی جیب وچ چھپا لیا ہے اتے اس سماج دا انش جوزف ورگے آدم پک ہن، جنہاں نے "جیب کتیاں" دی طرح انسانیت دے اصول نوں اپنی جیب وچ چھپا لیا ہے۔ اپنے ہونہار کوئی ودیا تھی دے ہنردی پرواہ نہ کر کے اپنی عزت اتے سفلیا دے لئی اوہ آسانی نال تنویر نال جٹھ لہندا ہے اتے اوس دی اہمیت لئی ساری یونیورسٹی موجود ہے۔ یونیورسٹی دی پر بندھک سنسٹھا بارے لیکھکا نے لکھیا ہے، "انسانیت اتے سوجھ بوجھ یونیورسٹی پر بندھکاں دی سمجھ توں پرے سن۔"

واپر دیاں گھنٹاواں نوں سمجھن دی کوشش کھل کئی طریقیاں نال کردا ہے: ونود راہیں، تنویر، اشوک، شیریں اتے ریکی راہیں اتے ہار کے اس نتیجے تے پہنچدا ہے کہ -- ساڈے وچوں کوئی وی ایسا نہیں جس دے اندروں کچھ گئے دی طرح بھونکدا نہ ہووے۔ "کئی داری اوس دے وچاراں وچ کوئی سلسلہ نہیں ہندا، لیکن اس نال صرف ایہی پتا لگدا ہے کہ اوس دا اندرونی درد، خیالاں دی اتھل پتھل اتے حقیقت نوں سمجھن دی کوشش



وچ کئی گہرائی سی، اوہ صرف زندگی دے دہن نال ترن والا نہیں سی، سگوں واپردیاں گھٹناواں نوں سمجھن دی  
کوشش کرداسی، سماجک انیاں دے کارناں دی پڑچول کرن والا، جھوکڑ نال مقابلہ کر کے ویکھن والا اتے  
بھوک وچ جھات پاؤن والا نوجوان سی۔

کیل دی دوستی برکی ناں دی کڑی نال سی لیکن برکی دے ماں باپ نے اوس نوں اپنے ساتھیاں نال  
ملن توں، جاں اوہناں نوں عمارت وچ آؤن توں روک دتای، کیونکہ اوہناں نے برکی لئی کالھ لیا سی۔ اوس  
نوں تالے اندر بند کردتا جانداسی، اتے اک وار اوس نوں دیر نال گھر پرتن وچوں ماروی پئی۔ اخیر اوس نے  
اعلان کردتا کہ جے کر اوس کول پیسے ہندے تاں اوہ دی تنویر دی طرح پردیس چلی جاندی۔ سال گزر گئے۔  
شیریں دی طرح اوس نوں بھودی ویاہتا جیون وچ سمجھاتے وفاداری، جہاں دی اوس نوں بھوتوں زیادہ تلاش  
سی، نہیں ملے۔ باہروں ویکھن نال اوہناں دی ویاہتا زندگی حالاں وی ٹھیک ٹھاک سی، لیکن اپنی جوانی دی  
کشش، کیل نال صرف اک ملاقات تے اوہ اپنا سب کچھ لٹاؤن لئی تیار سی۔

برکی دی طرح سویتا دی آخری سال دی دویار تھن سی۔ کسے گھٹنا کارن اوس نوں اپنے نال پڑھدے  
منڈے روی نال لگاؤ ہو گیا۔ اک دن شامیں منڈے کڑیاں سونے دے کندے تے گئے۔ واپس آؤندیاں  
تن سواراں والا موٹر سائیکل، جس اتے روی وی بیٹھاسی، ہنیرے وچ اُلٹ گیا۔ اوس دے سرتے ڈونگھی سٹ  
وجی اتے سویتا اوس دے نال ہی رہ گئی، تاں جے لوڑ چین تے اوس دی مدد کر سکے۔ اوہ اک دوسرے دے  
دوست سن۔ اگلے دن واپس آکے ہوشل وچ اوس نے اپنی غیر حاضری دا کارن دیا۔ ہوشل دی وارڈن نے  
اپنی رپورٹ وچ لکھیا کہ روی اوس دے رشتے دار نہیں، کوئی انجان ویاکتی ہے۔ اس لئی جدوں اوہناں کولوں صفائی  
منگی، تاں اوہناں نے کہیا کہ اوہ اک دوسرے نال ویاہ کرن دا ارادہ رکھدے ہن۔ اوہناں دے گھر خبر کردتی  
گئی۔ سویتا روی سی کہ اوس دے ماتا پتا اوس نوں گھر لے جان گے۔ اوہ چٹکی و دیا رتھن سی، اتے اگے ریسرچ  
کرن دا ارادہ رکھدی سی۔ اس لئی اوس واسطے جلدی جلدی روی نال ویاہ کرن توں علاوہ کوئی چارہ نہیں سی۔

نوجوانی دے جیون ورثن وچ امرتا پریم دی، اوہناں نوں اتے اوہناں دیاں مصیبتاں نوں سمجھن  
دی کوشش وسدی ہے۔ پر ایہ کوئی نویں زندگی دے انت والا دکھانت، جو کہ ایہ کوئی آلوچکاں نوں لگدا ہے۔  
انہی دلیل سند یہ۔ رہت نہیں چا پدی، کیونکہ امرتا پریم حالات نوں سرل کیتے بغیر، سماج نوں جنگ لگن دے  
کارناں دی بھال کردی ہے، نہ کہ اوس دی 'تباہی' دے۔

لیکھکا دو پیڑھیاں وچکار پئے پاڑے دے کارناں دا وستھار کردی ہے، اتے اوہناں دے آپسی سمبندھاں وچکار آؤندیاں مشکلاں نوں بیان کردی ہے۔ سویتا دی کہانی اک ادھارن دی طرح دتی گئی ہے، ایہ سماج دی کھل بیماری دی اک علامت ہے۔ اک پرپراگت پرپوار وچ جنسی اتے پلی سویتا اپنیاں نجی خوشیاں دی قیمت تے وی پرانیاں پرپراواں نالوں توڑن دی کوشش کردی ہے۔ ودیانے نہ صرف اوس دی سماج نال لڑائی نوں مکاؤن وچ مدد نہیں کیتی، سگوں اس لڑائی نوں ہور ودھاتا۔

امرتا پریتم بھارتی بورژوا سماج، جس وچ نفعے اتے نقدی دے سدھانت انسانی قدراں اتے ضمیر توں زیادہ ضروری ہن، نوں جھبندی ہے۔ لیکھکا ایہ درساؤن دی کوشش کردی ہے کہ پونجی وادی سماج دے پرانے کشور سدھانتاں اتے نویں زندگی وچ ڈونگھا پاڑ ہے۔

سماج کپل ورگے ایماندار، نویں زندگی دے چاہوان نو جواناں اتے اوس ورگیاں لڑکیاں نوں بکھدا اتے سویکار دا نہیں۔ کپل دایمب اک نویں بھارتی نو جوان دانموند ہے، اوس وچ بھارت دی نویں چیزھی دے سارے چنگے گن۔ ایماندار، شرافت، سیانپ اتے اندورنی خوبصورتی آو۔ ہن اتے اس پکھوں اوس دا بھبب ناول "جلاوطن" دے ملک نال بہت ملد اچلدا ہے۔

امرتا پریتم نو جوان چیزھی دیاں تاگھاں، جتن اتے حقیقت وچکار فرق نوں درساؤندی ہے اتے ایہ دی دکھاؤندی ہے کہ جیون دے ہر کچھ وچ حصہ لیندیاں ہویاں دی، اوہ کسے چیز نوں بدل سکے توں اسر تھہ ہن، اتے اوہناں نوں، سماج نوں بدل دین دے طریقیاں دا نہیں پتا۔ لیکھکا نو جوان چیزھی دل اگانہ ودھو بھارتی پونجی وادی سماج دے درشتی کون توں دیکھدی ہے اتے ایہ نہیں دسدی کہ کہو جے نو جوان سماج نوں بدل سکے دی سرتھار کھدے ہن۔

امرتا پریتم دا نظریہ ہے کہ سماج وادی تبدیلیاں وچ اک گھاٹ ہے اتے اوہ ہے نجی آزادی دی لوڑ۔ نویں سماجک رشتیاں دے حق وچ دلیل دیندیاں امرتا پریتم نال ہی نال پونجی وادی سماج دے گل گھوٹو وار تاورن دی گل کردی ہے، جس وچ انسان اپنی شخصیت نوں گوا دیندا ہے۔ اتھے امرتا پریتم دے سماجک آدرشاں وچ اک آپسی ورودھ دیکھن نوں ملدا ہے۔ جویں کہ نامور سنگھ نے وی کہیا ہے کہ اس دی وجہ بھارت دے پیچیدہ، آرتھک اتے راجتیک حالات ہن، جنہاں دی دیا کھیا کرنا بہت مشکل ہے۔

ناول دا چھپنا بھارت دی سماجک زندگی وچ اک وڈی گھٹنا سی اتے اس نال لیکھکا دے ظاہر تک

ہنر دا پتا لگدا سی۔ ناول وچ بڑی سوکھتا اتے نال ہی نرمی نال آپ ہدرے اتے روکے نہ جاسکے والے  
نوجواناں دے جیون نوں درسایا گیا سی۔ ایسے قلمبائی ڈھنگ نال چھیویں دھاکے دی نوجوان پیڑھی دی اخلاقی  
حالت نوں درسایا گیا ہے۔

ساجک حالتاں نوں سپشٹ طور تے دکھاؤن لئی امرتا پریتم نے ٹلناواں دا سہارا لیا ہے، جہڑیاں  
پہلے نالوں سپشٹ اتے گھٹ جذباتی بن: انسان اک پنڈولم ہے، حقیقت "کالا دروازہ ہے" آؤ۔

شروع دی گھپ ٹیلی وچ دین والی شہداں اتے واکاں دی گہرائی ستویں دھاکے دیاں رچناواں  
وچ وی صاف سدھا ہے۔ جان کے انگریزی زبان دا زیادہ استعمال کر کے امرتا پریتم اصلی ورتارے نوں  
درساؤندی ہے "ویدا دے کھیترو وچ راج نیتی، نوجواناں دا زبان ول رویہ، اوہناں دی ساجک پدھر، اتے اس  
توں ودھ کے باہر لیاں طاقاں دے اثر نوں۔

ناول "جلا وطن" اتے "جیب کترے" دی منو گپیا تک۔ امرتا پریتم دی مہارت دی مثال بن۔ سبھ  
توں پہلی گل ایہ ہے کہ امرتا اپنے ولوں ٹپیاں دین توں سکوچ کردی ہے، پائٹھکاں نوں گھٹناواں ول اوہناں  
نظراں نال دیکھن لئی مجبور کردی ہے، جہاں نال ملکہ پاتر دیکھ رہا ہے۔

ناول دے پلاٹ دا ڈھانچا کوئی بہت سپشٹ نہیں، گھٹناواں وچ ہمیشہ ترتیب نہیں دسدی۔ خاص  
طور تے ناول "جیب کترے" وچ گھٹناواں وچکار باہری سمبندھ بہت گھٹ ہے، اوہناں دی ترتیب مانسک  
پریرنا نال کیتی گئی ہے۔ ایہناں ناولاں وچ گھٹناواں ترنگاں دے روپ وچ واپر دیاں بن، جہڑیاں ملکہ  
پاتراں دے منو گپیا تک سوچ وچار وچ پرتکھ ہندیاں بن۔

ناول "جیب کترے" وچ کپل دے ہر دوست بارے سوچ وچار نوں اک وکھرا اکاؤنڈ سرہت ہے۔  
اُپروں اوہناں وچ کوئی آپسی سمبندھ نہیں جا پدا، لیکن اندر لا سمبندھ ظاہر ہے، کیونکہ ہر پاتر دی نجی زندگی اتے  
سماج وچ ڈونگھا سمبندھ ہے۔ ایہ سوچ وچار کئی تھاواں تے کہانی دے دیگ اتے چھا جاندا ہے بن، اتے  
اوہناں نوں پڑھن لئی پورے مانسک دھیان دی لوڑ پیندی ہے۔ اتے جے ایہناں ناولاں نوں اندر لے روپ  
دے پکھوں دیکھیا جائے، تاں ایہناں نوں ساجک منو گپیاں دیاں رچناواں دا درجہ دتا جاسکدا ہے۔

ایہناں ناولاں دی اک ہور خاصیت ول دھیان دواؤنا ضروری ہے۔ ایہ ہے سے وچ کھوتی۔  
ناول "جیب کترے" دے انھویں کانڈ وچ کالج دے اخیر لے دناں دی گل ہور ہی بندی ہے اتے نوویں وچ

اک دم اوس توں تن چار ورھے بعد دیاں گھٹاواں وڈا کر ہندا ہے۔ ”جیب کترے“ وچ پہلے کانڈ نے کجھ واکاں وچ ہی پچھلے پورے سال دیاں گھٹاواں دا ذکر کر دتا جاندا ہے، جس نال ناول وچ اٹھائے گئے مسئلے دیاں ول پورا دھیاں دین وچ مدد ملدی ہے۔

ناول دے سے وچ، بھوکھ اتے پچھو کڑ دا ہیر پھیر — ایہ بھ اچیاں چیزیں ہن، جہاں دی ورتوں لیکھک نے جان بوجھ کے ناول دی گہرائی نوں ودھاؤن لئی اتے اوس وچ لئے گئے اصلی سوالاں نوں ابھارن لئی کہیتی ہے، اتے ایہ ودھیاں نویں قسم دے ناولاں دا پرتیک دی ہن۔ امرتا پرتم دی پراپتی ایس وچ ہے کہ اوہ نویں ڈھنگاں دی ورتوں توں سکھوچ نہیں کردی اتے اپنیاں رچناواں وچ نویں قسم دے ناول دیاں ودھیاں نوں ابھاردی ہے۔ وشے و سٹو دے پچھوں نویں ناولاں ”جیب کترے“ اتے ”جلاوطن“ وچ کافی سانجھ ہے۔ دوہاں ناولاں دا منکھتا وادی رخ اس وچ ہے، کہ امرتا پرتم اخلاقی قیماں دی تبدیلی دے سوال نوں نویں پیڑھی دے نال جوڑدی ہے اتے اس دا فیصلہ سا جک ڈھانچے وچ ہویاں تبدیلیاں دے نال جوڑ کے کردی ہے۔

پنجابی اتے پورے بھارتی ساہت وچ دی پلاٹ دی ملکیت دا کوئی وڈا مول نہیں سی گنیا جاندا، سبھ توں ضروری دستو الکارک بہو کھسکا گنتی جاندی سی۔ اپنے ٹڈھلے ناولاں دی طرح چھبویں اتے ستویں دھا کے دیاں گلپ رچناواں وچ وی امرتا پرتم تکھے پلاناں دی جال نہیں کردی، سگوں الکارک کجھ دا وکاس کردن دی کوشش کردی ہے۔ اتے اس کجھ وچ اوس نوں گھٹ شہداں دی ورتوں کر کے بہت ڈونگے مطلب کڈھن وچ سفلتا ملدی ہے۔ امرتا پرتم دے الکارک سادھارنیکرن وچ نویں حقیقت دی پوری بہو پکھی جھلک، اصلی جنودا اتے جذبات اتے ڈونگھا اثر دیکھن نوں ملدے ہن۔ ایسناں ساریاں صفتاں دے میل کارن اوس دیاں رچناواں انوکھیاں اتے بے جوڑ بن جاندیاں ہن۔

امرتا پرتم دے چھبویں اتے ستویں دھا کے دے ناولاں وچ پنجابی وارنک وچ اک نویں دشا دیکھن نوں ملدی ہے۔ ایہناں وچ وکھی سانجھ (perspective) دا انش ہے۔ جس ولوں کجھ دکھ وکھ گھٹاواں عام تھتی دا پرتیک بن جاندیاں ہن۔ اس دا مطلب ایہ ہے کہ دیوی، کامی، چیتنا، ایکا، سویتا اتے کپل دے سبب صرف کجھ پاتراں دے مثالی لچھتاں نوں نہیں درساؤندے، سگوں کلاکار ولوں درسائی گئی زندگی دی مکمل اوتھار واپس ہن۔

امر تا پر تیم دیاں رچناواں دے کھانک ڈھانچے وچ دیل وی ایسے سا دھار تیلرن دے سدھاننت  
 نال سمجھت من۔ پلاٹ، جاں اوس دانتر وکاس ہی صرف رچناوے مکھ و شے نوں ابھارن دا طریقہ نہیں  
 رہ جاندا ہے۔ گھنٹاواں دا ہر انکراہ اوس دیاں رچناواں وچ اندر لے لکراہ نوں صاف ابھارن دی بجائے اوس  
 دل اشارہ کردا ہے۔ ایسے کارن لیکھ کا دیاں رچناواں وچ اک خاص سنگت ملتا، منو گیا نکتا اتے دارشاکھ گہرائی  
 پیدا ہندے من۔

(پی انتر: قمر الزمان)



## تڑکے گھرے داپانی

امرتا پر تہم نوں اپنی موت دی اڈیک بڑے چرتوں سی، اودوں توں ہی جدوں اوس لکھیا سی:

”میں تڑکے گھرے داپانی

کل تک نہیں رہتا۔“

..... تے مینوں امرتا نال ہوئی ہر ملاقات آخری لگن لگ پئی سی۔ اوہ، چھنے بھر پور زندگی جیوی سی، عمر بھر محبت لئی ساہ لئے سن، میرا اوہ بے نال بہت گلاں کرن نوں جیا کیتا سی۔

..... تے میں گنگو کتاب لئی ملاقات و ہونت لئی۔ اودوں امرتا دماغی طور اتے پوری سچیت سی پر سریر ڈنگو ڈنگو کردا مکان سی۔ اوہ بے لئی اٹھنا، بیٹھنا وی محال سی۔ امرتا نے آکھیا، ”جسیر .... گلدا ہے، ایہ سمجھو نہیں۔ میں بہت تھک جاندی ہاں۔ توں اس طرح کیوں نہیں کردا، کچھ سال کاغذ اتے لکھ دے۔ میں جدوں وی راضی ہوئی جواب لکھ دیاں گی۔“

دلی توں واپس آکے میں سوال بھیجے سن، اک وار نہیں، .... دو وار نہیں، .... پورے تن وار۔ امرتا دے خست حالت سریر نے راضی نہیں سی ہوتا۔ ایہ میں وی جاندا ساں تے اوہ وی، پراوہنے بیماری دج ہی اوکھیاں سوکھیاں جواب لکھے سن۔

چوتھی واردی سوالاں دی فہرست توں پہلاں امرتا دافون آیا سی۔ اوہ بابا سا مٹھنکیا سی، ”جسیر، کیہ گل پورا دیوان لکھن دا ارادہ ہے۔“

میں امرتا دے اوس ہا سے وچوں درد دی پیڑ نپ لئی سی۔

..... تے میں سوالاں دی چوتھی فہرست امرتا نوں نہیں ساں بھیج سکيا۔

وقت ریت درگاسی، مٹھاں وچ پھڑپھڑا نہیں سی جاسکيا۔ انگلاں دیاں درلاں وچوں کر رہیا سی، بس،

کر رہی سی۔

جدوں امرتا پر یتیم نوں پدم و بھوشن نال سسنانیا گیا تاں میں فون کیتا سی۔ امرتا پر یتیم نے ہیڈ سٹ  
اکثر اپنے کول ہی رکھیا ہندا سی۔ مینوں لگا، سہنے میں امرتا دی آواز سناں گا، "ہیلو جیسر!"

پرفون دا جواب امروز نے دتا سی، "توں اپنی دیدی نال گل نہیں کر سکیں گا۔ اوہ جیوندی ہے، پر اس  
دنیا نالوں اوہ نے ناتا توڑ لیا ہے۔ اوہ اپنے اندر ہی کسے ہو ردنیا وچ بیٹھی ہوئی ہے۔"

میں او اس ہو گیا ساں۔

اگلیرے دن دلیپ کورٹوانا نے دسیا، "سمنان والے دن میں اک ڈیڈ گھنٹہ امرتا امروز دے گھر  
رہی ہاں۔ امروز مینوں امرتا دے کمرے وچ لے گیا سی تے عام نالوں کچھ اچی سروج اوہوں مخاتب ہو یا سی  
"دیکھ ملکہ! دلیپ تینوں ملن آئی اے۔"

امرتا دیاں اکھاں وچ کوئی پچھان نہیں سی جاگی۔ اوہ خلاء ول دیکھدی رہی سی۔  
کچھ دن پہلاں ہی میں سکھ ساند گھن لئی فون کیتا سی۔ پتہ لگا امرتا کچھ نہیں سی متکدی، کچھ نہیں سی  
آکھدی۔ اوہدی لوڑ دا انداز امروز نوں خود ہی لاؤنا پندیا سی۔

میرے کول پے سوالاں والے کاغذاں نے ہوکا بھریا سی۔

میں امرتا نوں جد کدی وی ملیا ساں، اوہ بیماری۔ جدوں امرتا پر یتیم داسریہ بیماریاں دی ٹھار بن گیا  
تاں اسیں کچھ دوستاں نے رل کے سوچیا، امرتا ہوراں کول کچھ دن رہ کے آئے۔ کی پتہ، فیر آخری میلا ہووے  
نہ ہووے۔

اسین آپے اپنے گھراں وچ رجھے ہوئے ساں۔

ایہ گل ویسہ کو سال پرانی ہے۔

امرتا پر یتیم دیاں بیماریاں دی گنتی ہولی ہولی ودھدی رہی سی۔ گھن سربونوں کھاندا رہیا سی۔ اوس گھن  
نوں برداشت کرن دی پیڑ امرتا دے چہرے اتے وی صاف دس لگ پئی سی۔

میں امرتا پر یتیم نوں اپنیاں نتاں آپ گھو دیاں وی دیکھیا سی تے گوڈیاں اتے دوائی دالیپ

کر دیاں دی۔

اودھے پنڈے دے راہ وچ بھکھر اسی تے اوہ ننگے پیریں سی۔

نکیاں، وڈیاں گھٹناواں اوہنوں اگلواندھی ہو کے ملدیاں رہیاں سن۔ زندگی دے ایہو جے  
ورتارے داسبندھ اودھی صحت نال دی سی۔

ہندی دی ناول کارہ کرشنا سوہتی نے اک شبد زندگی نامہ دی ملکیت دامتقدمہ امرتا پرتم اتے کینا  
ہو یا سی۔ اوہ آکھدی سی زندگی نامہ اوس دا گھڑیا ہو یا شبدی۔ زندگی نامہ اوس دے ناول داناں وی سی۔ امرتا  
پرتم نے اپنے اک ناول داناں ہر دت دا زندگی نامہ رکھ لیا تاں شبد دے حق حقوق دامتقدمہ چھڑ پیا۔  
شبد تان لوکاں دے ہندے نے، بھادیں کوئی دی ورت لے۔  
مینوں اس مقدمے دی کدی سمجھ نہیں سی لگی۔

-----

12 اگست 1991 دی تاریخ والی امرتا دی اک چٹھی مینوں ملی سی.... "میری طبیعت بہت چنگی  
نہیں، انجھلی ہوئی ہے، جے شیرن نہ پوے تاں۔ بن تیراں ستمبر نوں تاریخ ہے، میرے اتہاسک مقدمے  
دی۔ اپریل دامتہینہ وی پہلی توں لے کے چندراں تک اوے دے لیکھے سی۔ پر جولائی وچ تاریخ لگی سی۔  
"اکھراں دے اوہ ڈنگ پتہ نہیں کدوں تک بھگتاؤ نے بن۔"  
مقدمہ، جو سالان توں چل رہیا سی، امرتا موٹی تاں اوہ وی لگ گیا۔

-----

امرتا ہمیشہ توں سوئی سی۔

اودھ اول وی ایہو کردا سی کہ سوئی سوئی ہی دے۔

اوہ گلاں کردی سی تاں ایہہ کرشمہ واپر جاندا سی۔ اوہ ہان پروان ہو جاندا سی۔ اودھی عمر کدھرے  
پراندرہ جاندا سی۔

بس، صرف اک دار اس طرح نہیں سی ہو سکيا۔

میں اوہوں مدت بعد دلی گیا ساں۔ امرتا نوں ملے بناں پرت آؤ تاں واجب نہیں سی۔

امروز نے آکھیا: "جسیر! توں امرتا نوں نہ مل۔"

میں بعد ساں، فیر پست نہیں میں دیدی نوں کدوں ملاں۔ اچ توں بچھوں کدی مل دی سکنا سی کہ



نہیں، مینوں کچھ پتہ نہیں سی۔

امروز اندر چلیا گیا۔ امرتا نے اوہدے ہتھ سنبھا بھجیا، "جسیر نوں کہو بس دومت لئی آ جاوے۔"  
میں اندر گیا تاں میرا تریہ نکل گیا۔

میری نظر سانہویں ہڈیاں دی منہ کو بھرا امرتا اپنے سر ہانے اتے بیٹھی ہوئی سی، جھکی تھکی، ٹٹی ٹٹی۔  
بے اونوں دو جنے چک کہ ہاتھ روم لے کہ گئے سن۔ غسل خانے وچوں باہر آؤن تک اوہ بہت ہنٹ گئی سی۔  
مرہکو مڑھکی ہوئی سی۔ بس فیروی چادر دی بکل مار لئی سی۔  
مینوں دیکھ کے اوہدے کولوں مسکرایا نہیں سی گیا۔

مینوں کسے نے اندروں دسیا، میں امرتا نوں آخری وار مل رہیا ساں۔ میرا من بھرا آیا۔  
میں اوہ تھے بیٹھ نہیں ساں سکیا۔ میرے کولوں کوئی گل وی سانجھی نہیں سی ہوئی۔ سوچداں ہاں، آخری  
وارتاں دیدی نال کچھ گلاں کر لیندا۔

میں بھریاں اکھاں لکا کے باہر آ گیا ساں۔

دلی توں واپس موہالی پنجے کے وی میں کئی دن اداس رہیا ساں۔

اک دن میں امرتا پر تم دی سانجھ کے رکھی ہوئی عک پرانی تصویر باہر کڈھ لئی۔ اوہ تصویر مینوں اک  
وار امروز نے دتی سی۔

تصویر فریم کروا کے میں اپنے لکھن پڑھن والے کمرے وچ لٹکائی۔

میں چاوہندا ساں، ادس تصویر ورگی امرتا میرے چیتے وچ رہے۔

-----

امرتا پر تم دی صحت دا حال میرے کول پہنچدا رہیا سی، کدی ڈاکٹر دیسپ کورٹوانہ راہیں، کدے  
امروز راہیں تے کدی پٹیا لے والی محبتی سریندر شرما دکھ درد دا حال پھر دل کے بیٹھ جاندا۔

پہلوں اوہ بستر سے نال بستر ہوئی، فیراوس دی ہوش گواچی۔ کچھ سماں اوہ ڈہنڈو بنو کر وی اکھاں  
انکھیر وی لیندی۔

..... تے فراک ویلا اوہ وی آیا، اوہ سار لیندی رہی پر ذہنی طور تے کتے ہو تر گئی۔

امروز نوں لگدا، امرتا دا پاسا تھک گیا ہووے گا۔ اوہ اوہا پاسا پر ت دندا۔

امروز نوں لگدا، ملکہ نوں بھکھ لگی ہووے گی، اوہ چچے نال اوہدے منہ وچ سوپ پادیندا۔

امروز نوں لگدا، برکتے دا بستر امیلا ہو گیا ہے، کپڑے بدن والے نے، اوہ.....

امرتا پریم دی تیارواری کردیاں امروز نت دن وڈا ہندارہیا۔

اوس ویلے ساہ امرتا دے جیون دی نشانی سن تے فراہ ساہ وی مک گئے۔

اوہ جو بہت سوئی سی، اپنا سہین اکھراں دے پلے پنھ سکے تر گئی۔

اوس دن مہینے دی 31 تاریخ سی، ایہو تاریخ امرتا دے جنم دن وی وی سی۔

-----

امرتا پریم دی موت توں پچھوں میں حالے تک ولی نہیں گیا۔

K-25 حوض خاص حالے وی اتھے ہی ہے، فیرووی لگدا ہے اتھے نہیں۔

اپنے یقین لئی میں اک دن اتھے جاواں گا ضرور۔ مینوں پتہ ہے، بن وی سارا کچھ او سے طرح ہی

ہے۔ او پرلی منزل تے کنڈالاں رہندی ہے تے زمینی منزل تے نوراج۔ وچکارلی منزل امرتا تے امروز دی

سی۔ بن وی ہے۔ امرتا چلی گئی، پر غیر حاضر نہیں ہوئی۔ بن وی میں بو ہے دیاں سو ہے رنگ دیاں گھراں

اتے لکھی امرتا وی نظم پڑھاں گا:

پر چھا دیاں نوں پکڑن والیو

چھاتی ج بلدی آگ دا پر چھاواں نہیں ہندا۔

میرے پیر اتھے ہی ختم جان گئے۔ میری نظروں دوسرا بوہا بول لو یگاتے اوس بو ہے دی نظم نوں وی

میریاں اکھاں مجھہ کرن گیاں:

اک درو ہے

جو سگرٹ دی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے

کچھ نظماں بن / جو سگرٹ دے نالوں

میں راکھ وانگ بھاڑیاں۔

میں امرتا دے کمرے وچ پیر دھراں گا۔ اتھے میں امرتا نوں محسوس کراں گا۔ اوس بستر نوں چھو

کے دیکھاں گا، جتھے اوہ لیٹیاں اتھاہ ساہتہ چیا سی۔

اوہ بستر اتے میں اک پھل تھر کے پرست آواں گا۔  
 میں جاندا ساں، کچھ ہو رو رہے نیتن پچھوں اوہ گھر کج زندگی جیو رہیا ہووے گا۔ پر او دوں او تھے  
 امر دزنے نہیں ہوتا۔

جے او دوں میں ہو یا وی تاں کج بھامہ 25-K حوض خاص دیاں پوڑھیاں نہیں چڑھ سکاں گا۔  
 (پبی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## بچو چچی دس دے جوگی

(امرتا ہوراں بارے فلم، یاداں تے کوتا بارے گل بات)

میں جلندھر دور درشن ولوں لیکھکاں دے جیون تے رچناواں تے آدھارت دستاویز فلماں بناؤن داوچار بنایا تاں بھتوں پہلی شخصیت جیہڑی میرے من وچ آئی اوہ امرتا پرتم سن۔ امرتا ہوراں دی طبیعت ناساز ہون کارن مینوں اوہناں تے فلم بناؤن لئی کجھ دیر رکنا پیا۔ اک دن میں دلی آیا تاں اوہناں نوں ملیا۔ اوہ اسے دی بیمار چل رہے سن۔ امروز نے بوہا کھولیا تے میں امروز دے پچھے پچھے امرتا ہوراں کول جا کھلوتا۔ ”ماشا! دید آیا“ امروز نے کھسمے وچ آکھیا۔ شام ہی تے مشا مشا ہنیرا۔ امرتا ہوراں منہ سر رضائی وچ دتا ہویا سی۔ اندروں ہی ہوں دی آواز دتی۔ ”دید آیا بنی جلندھروں“ امروز نے فیر آکھیا۔ ہولی جے امرتا ہوراں رضائی منہ توں چکی تے الجھے ہوئے سلیٹی سفید والاں وچ ہتھ پھیریا۔ ستیاں اکھاں تھائیں مینوں جھاکیا تے میں نمسکار کیتا۔ اوہناں کے دردناں ہوں کیتا تے میرے دل دیکھ مسکرائے۔ ”کیسی طبیعت ہے؟“ میں ہو لے جے پچھیا۔ کول ہی بیٹھ گیا۔ پینا جے ہندی ہے۔ بس ہن کاہدا حال اے، دید! میں سوچتی آں اک عمر توں بعد بندے نوں چلے جانا چاہیدا اے۔ رب نوں آواز مار لینی چاہیدی اے۔ امرتا ہوراں جسمانی چیز نوں کجھ دیر ٹھمنادے کے آکھیا۔

”تسیں انج نہ آکھو۔ رب تہانوں تندرستی بخشے۔ اے تہاں بہت کم کرنا ہے۔ سانوں تہاڈی لوڑ ہے۔“ میں آکھیا۔

ہن میں جو لکھنا سی لکھ لیا۔ بہت کم کر لیا۔ بس ہن تاں آؤ رب جی! رکھ نالوں ہن ناکی کھولن آؤ! اوہناں مسکرا کے آپ دی اس نویں نظم دی پہلی سطر بولی۔ ہن میں ہو رکی کرنا ہے۔ میں تاں رب نوں دعا کرنی آں کہ ہن بس!

امروز کول کھڑا مسکرایا۔ ”لے آجاں چاہ پنے آں۔ توں بیٹھ دید۔“

کچھ دیر چپ توں بعد میں امرتا ہوراں نوں اسدیاں آکھیا "میں رب نال گل کر لئی اے۔ اوہ کہندا تیری مرضی۔"

"کیہ گل؟" امرتا ہوراں لیٹے ہوئے میرے دل جھاکیا۔

"رب نال گل کر لئی اے پئی امرتا ہوراں تے جیہڑی میں فلم بناؤنی ایں اوہ پوری ہون وچ میری مدد کرے۔ تے اوہ من گیاے" میں آکھیا۔ امرتا جی ہس پئے۔

"- دید میرے وچ بہن ہمت نہیں۔ فلم داکم تاں تہا ڈالما ہودے گا۔"

"- تسیں جے مرضی کرو میں آپنی زندگی دا ایہ سپنا ضرور پورا کراں۔" میں آکھیا تاں شاید امرتا ہوراں دی اکھ چہ میرے اس سپنے دی لوجہی۔ اوہناں اٹھ کے ٹٹھن دی ہمت کیتی۔ میں ہولی جے اوہناں نوں آسرا دتا۔ جویں دھپ وچ کوئی چہرہ مسکرا پیا۔ امروز چاہ لے آئے۔ "ارے؟" اوہ امرتا ہوراں نوں ٹٹھیاں دیکھ کے بولیا۔

- ایما! دید نے رب نال گل کر لئی اے۔ امرتا ہوراں مسکرا کے کہیا۔

- دید نے گل کیتی اے کہ میرے تے فلم بناؤن داکم سرے چڑھاوے۔

- صرف ابی نہیں۔ میں ایہ دی آکھیا پئی امرتا ہوراں نوں اوہ ہور لمیاں عمر بخشنے۔ سو سال تک۔

میں آکھیا تے امرتا امروز دوویں مسکرائے۔ تے اسیں چاہ دے گھٹ بھرن لگ پئے۔ فیر اساں پوری شوٹنگ دی پلان بنائی۔ تریکاں نچت کیتیاں۔ فلم داتندن دا شیڈول رکھیا۔ امرتا ہوراں سارے سوال، مینوں لکھ کے دین لئی کہیا۔ امروز ہوراں نوں میں فلم لئی گرافکس بناؤن لئی گزارش کیتی۔ سبھ کچھ طے کرن توں بعد میں امروز دے نویں چتر تے ہور کم دیکھیا۔ امرتا ہوریں فیر لیٹ گئے۔ تے میں اجازت لے واپس آ گیا۔

کوئی مہینے بعد میں اپنے یونٹ سمیت جلدھر ولی آ گیا۔ ذہن وچ فلم دے ٹکڑے سمجھ رہے سن۔

اونٹیں دئیں امرتا ہوریں ایم۔ پی سن۔ اوہناں دا سرکاری فلیٹ خالی پیاسی۔ اسیں اٹھ دن اوٹھے ٹھہرے۔ امروز ہوراں ساڈی مدد کیتی۔ سانوں اچھے کوئی مشکل نہ آؤن دتی۔ شوٹنگ توں اک دن پہلاں میں امرتا ہوراں کول آیا۔ اوہ اچھے دی ٹھیک نہیں سن۔ آکھن لگے "ایہ کم لمبا ہے۔ میرے کولوں ہونا نہیں۔" میں جیسی مجھیں رب نوں ارداس کیتی کہ میرا ایہ کم پورا ہووے۔ شاید رب ضرور ہونا ہے کدھرے جو امرتا ہوران نے ساری رات، بیٹھ کے سوالاں دے اتر لکھے۔ سویرے شوٹنگ شروع ہوئی۔ پہلا شات اسیں K-25 حوض خاص

اوہناں دے گھر دالیا۔ امرتا ہوراں دے لکھدیاں دے شات لئے۔ اوہناں نوں ترن لئی آکھیا۔ ایہ رب دی کرامت ہی سی کہ بیمار اپنے امرتا جی نے رب نوں برنو ہو گئے سن۔ اوہناں اپنے وال کرینے نال سنوارے۔ سلیٹی سوٹ پایا۔ کالی شال جس نوں جال کناری لگی ہوئی سی اپر لئی۔ تنکھی لپٹک دی لیک ہوٹھاں چوں چنگی تے چہرے تے نور ڈھلکن لگ پیا۔ میں اوہناں نوں دیکھ کے چندھیا گیا۔ میں شاید امرتا ہوراں نوں ایسے سمجھن وچ پہلاں کدی نہیں سی تنکیا۔ میںوں اوہناں دیاں جوانی ویلے دیاں تصویراں یاد آئیاں۔ ساحر یاد آیا۔ میں کدھرے گواچ گیا کدچا تک کمرہ میں بولیا۔ ”وی آر ریڈی سر“ امروز ہوراں نے ڈرائنگ روم نوں ترتیب دتی سی۔ امرتا ہوراں دی شوٹنگ توں پہلاں میں اوہناں نوں آکھیا، ”رب تہا نوں کسے دی نظر نہ لائے۔“ اوہ مسکرا پئے۔ تے فیر لگا تار تن دن اسیں شوٹنگ کردے رہے۔ کدے امرتا جی سوالاں دے جواب دے رہے سن۔ کدی پوڑھیاں اترن دا شات۔ کدی برآمدے چہ کھسن دا۔ کدی کوٹے تے بچیاں دا۔ تے کدے باہر کسے باغ دی سیر دا۔ امرتا امروز ددویں ایس فلم وچ گھل مل گئے۔ اسیں اک پر یوار وانگ کم کرن لگے۔ اوہناں دے بچے وی ساڈے نال گھل مل گئے۔ اک عجیب نشطاری سی۔ شاید میںوں ایسا آئندے تے تسلی کدی وی نہیں ملی کم کر کے جنا ایہ فلم بناؤندیاں۔ جس دن اسیں پیک اپ کیتا تاں ساڈا سارا یونٹ امروز امرتا ہوران توں وداع لین ویلے اداسی بھری مسکراہٹ وچ سی۔ اسیں واپسی ویلے امرتا ہوراں دی ایہ سطر سارے سفر دوران اچار دے آئے، ”پر جھادیاں نوں پکڑن والیو، چھاتی چہ بلدی اک دا کوئی پر جھادیاں نہیں ہندا۔“

فلم بناؤندے سے ایہ گل بات امرتا ہوراں دیاں کوتاواں بارے دکھرے طور تے ریکارڈ کیتی گائی سی:

دید: امرتا جی! تہاڈی کوتا تہاڈیاں رچناواں دا پرکھ حصہ ہے۔ اج دی تہاڈیاں کجھ کاو سطران لوک گیتاں وانگ لوکاں نوں یاد نہیں۔ تے ایس توں ہورا گے تہاڈا جتن تے فلسفہ وی تہاڈی کاویا ترا وچ شامل ہندا ہے۔ ایہ دوسری تہاں پہلی نظم کدوں لکھی؟

امرتا: میری پہلی نظم دے پہلے اکھر چنن وچوں ڈگے سن۔۔۔۔ بہت چھوٹی ساں، اچے بابراں ورھیاں دی ساں، جدوں ماں نہیں سی رہی۔ میں راتیں، گھر دی چھت تے جا کے چنن دل دیکھدی رہندی ساں، اوتھے چنن دی چھاتی وچ پئے ہوئے کالے داغ، میرے دیکھدیاں دیکھدیاں دوکا لے اکھر بن جانے سن، ایہی ”ز“ ورگاتے ”ج“ ورگا۔ تے میںوں جا پدا کہ اتھے میری ماں دا ناں لکھیا ہویا اے۔۔۔۔۔ راج۔۔۔۔۔

فیر جہدوں میرے پنڈ سے ویج جوانی سر کن لگ پئی تاں چنن اتے لکھے ہوئے دوا کھراں ویج اک  
اکھر اضافہ ہو گیا۔ جا پے۔ کہ او تھے میرے محبوب داناں لکھیا ہو یا اے۔ راشن

ایہو۔ میری لکھینا داجا دوسی، جو فیر نظماں بن کے کاغذاں اتے اترن لگ پیا۔ ....

کافیہ کی بند اے، روئیف کیہ بندی اے، تے ماترا کوں گنی جاندی ہے، ایہ سکھلائی مینوں میرے  
بتاجی، جو آپ پہلوں برج بھاشا دے شاعر ہندے سن، تے فیر پنجابی ویج لکھن لگ پئے سن۔

اجیہیاں نظماں۔ اخباراں ویج وی چھپ جانیاں سن، تے فیر کتابی صورت وی چھپ گئیاں  
سن، پر اوہ بھٹماں، جہناں دے اکھر چنن وچوں ڈگدے سن، اوہ میں اپنے پتا کولوں وی چوری لکھدی ساں۔ فیر  
اوہ کاغذ، دو چار دن سکول دیاں کتاباں ویج لکا کے رکھدی ساں، تے فیر پاڑ دیندی ساں۔ ....

کاغذاں دے ادہ پالے ہوئے ٹکڑے۔ جو یں چنن نوں میرا دتا ہو یا سراپ ہندے سن۔ ....

روایتی نظماں نوں چھڈ کے، اج میں سوچدی ہاں کہ میری پہلی نظم اوہ سی، جہدا کاغذ میں پاڑیا نہیں  
سی، اوہ آسان نوں اک الانبھاسی۔ "چپے چنن تے منھ کو تارے ساڈا مل بیٹھے آسان"

تے ایہ نظم چنن نوں وی الانبھاسی، جیہڑا میرے کولوں سراپ لے کے، کجھ بولد نہیں سی۔ ....

نہن سٹھاں ورھیاں ہچھوں اچانک میرے کاغذ اتے اک نظم اتری اے، تاں میں حیران جہی  
اوہ دے منہ ول دیکھن لگ پئی ہاں۔

نہیں۔ چپ دے اس رکھ تالوں

میں اکھر نہیں توڑے

ایہ تاں جو رکھ تالوں جھڑے سن

میں اوہی اکھر چنے بن۔ ....

چنن دے چرکھے تے بہہ کے۔

بدلاں دی کیاہ کئی

ایہ تاں کجھ اوہی دھاگے میں

میں کھنڈی تے آنے نہن۔ ....

تے حیران جہی سوچ رہی ہاں کہ اوہ جو پاڑیاں ہوئیاں نظماں دے ٹکڑے میں اوہناں ارب

دیندی ہندی ساں، اوہناں چپ چاپ میرا رگہ قبول لیا سی۔ ایسے لئی تاں اوہ ہمیشہ اپنے رکھ نالوں اکھر جھاڑ دار ہیا، تے میں ساری عمر اوہ اکھر چندی رہی.....

دید: تاں نظم وی لکھی تے نثر وی۔ ایہناں دوہاں وچ تمسیں وکھرتا کوں ہناؤندے ہو؟  
 امرتا: جی ہاں۔ نظم وی لکھدی ہاں، نثر وی۔ مینوں جا پدا اے کہ جدوں احساس وی شدت اکو نقطے تے کھلو جاندی اے۔ جم جاندی اے، تاں اس شدت نوں جرن واسطے، کجھ سکیت جے اک اشعار سنگدے نیں، تے فیر اوہ سکیت نظم ہو جاندے نیں۔ نظم وچ اک آواز وی ہندی اے، تے کنبہ بلبھاں ورگی اک خاموشی وی.....

فیر جدوں ایہی نقطے اتے جی ہوئی بارف ٹھدی اے، تاں پانی دا پرواہ نثر بن جاندی اے۔ اوس ویلے کنبہ بلبھاں وی خاموشی اکھر اکھر ہو جاندی اے.....

ایہ پل پل جنم دی تے پکھل دی برف دا تاں نظم تے نثر ہندا اے.....  
 کدے کدے گلدے کہ نظم کنتی دی اوہ چیخ ہندی اے، جو کرنے دے جنم ویلے کنتی دے مونہوں نکلی سی، تے اوہناں گھبرا کے بوٹھاں وچ میٹ لئی سی۔ اوہ کواری کنتی دی حیرانی وی سی، خوشی وی، تے خوف وی۔

کرن سورج پتر سی، تے سورج دنیاں والیاں دی سوچ توں باہری لگ ہندی اے۔  
 تے نثر۔ کنتی دی اوہ چیخ ہندی اے۔ جو پاؤں حواں دے جنم ویلے کنتی دے مونہوں نکلی سی۔  
 اوس ویلے کنتی تاں اکو ہندی اے۔ نظم ویلے وی تے نثر ویلے وی، پراہیدے وچ اوہی فرق ہندا اے جو کنتی واسطے کرن دے جنم ویلے دا تے پاؤں واں دے نظم ویلے دا فرق سی.....

دید: نظمیں لکھن دے پہلاں پلاں دی پراپتی اپراپتی بارے جاں اوہدا چھواں بارے کوئی اجیہی یاد جو تہاڈے کول سا بھی پئی ہووے؟

امرتا: 1936 وچ جدوں میری کتاب چھپی سی - امرت لہراں۔ مہاراجا کپور تھلا نیں دوسو روپے بھیجے سن، تے مہارانی تاجبانے اک ساڑھی بھیجی سی۔ دوویں چیزاں ڈاک راہیں آئیاں سن، تے فیر اک دن جدوں ڈاکے نیں گھر داہو باکھڑ کایا تاں میرے انجانے جیسے من نے کسے ہور سوغات دی تمنا کر لئی، اوس ویلے میرے پیتا دے ہتھے اتے اک تیوڑی پے گئی، تے اک سوچ میریاں بنیاں وچ اتر گئی کہ ایہو جیہی تمنا



کسے لیکھک نوں بہت چھوٹیاں کر دیندی اے۔۔۔ تے فیر اوہ تیوڑی میری نگہبان ہو گئی، میری نظر ثانی کردی رہی۔ جیسے قسمت کہ مینوں ایہو جیسے چتا دا مستھا نصیب ہو یا سی۔ جس متھے وچ اوہ تیوڑی پے سکدی سی۔ اوہ تیوڑی مینوں ورٹے وچ ملی اے، تے ایہ میرے متھے اتے الف دا انگ لکھی گئی ہے۔ ایہو تیوڑی کدے گرے دی موسم بقی بن جاندی اے۔۔۔ کدے ورن گنڈھ وچوں اٹھدے دھوئیں دی لکیر ہو جاندی اے کدے مرزے دی جتھ وچوں انھی ہوئی مانی کدے بو دھئی برکھ دی اچی پتی تے کدے روح دے دماغ وچ بلدی روں دی بقی..... ایہ میری زندگی ایسے۔۔۔ تیوڑی دا اتہاس اے۔۔۔ کجھ لکھیا تے کجھ ان لکھیا۔

دید: کوئی بھانا جو کوتاواں نال واپر یا ہووے؟ اوہ پل اوہ چھن جو چھاتی چوں نکل ہوٹھاں تے کاغذاں تے آ جاندا ہے۔۔۔ کجھ ذکر کرو گے؟

امر تا: نظماں دی پہلی تے دوجی کتاب تے 1936ء وچ چھپی سی۔ ایہناں وچ اوہ نظماں سن۔۔۔ جو پیتا دے پائے ہوئے پوریاں تے لکھیاں سن۔ بڑی محنت نال ایہناں دے قافیے جوڑے سن، پر جدوں ایہ کتاباں چھپیاں۔۔۔ میرے اتے پیلا الزام ایہ لکھیا سی کہ ایہ نظماں میں نہیں لکھیاں، میرے پیتا نے لکھ کے میرے ناں تے چھپوا دتیاں سن.....

دکھ ہو یا سی، پر ایہ الزام کوئی اچھا مسئلہ نہیں سی کہ میرے دل وچوں ایہو سم آؤندا۔ پر ایہودا قطرہ اودوں ضرور سم آ یا سی، جدوں میں اپنیاں نظماں پاڑنیاں چھڈ دتیاں سن، تے فیر جدوں اوہناں نظماں دی کتاب چھپی تاں اوہ سنے وچوں اک نظم ان دا نا پنجاب یونیورسٹی ولوں ضبط شدہ کردتی گئی..... انج ایہ وی اک چھوٹا جیہا حادثہ سی، تے اودوں قیاس نہیں سی، ہو یا کد دنیا دالیاں نے۔۔۔ آؤندے ورھیاں وچ کیہو جیسے بھاوورتا نے سنے.....

سو کنیاں بھانیاں: سی پالی ہوئی ہاں..... ایسے لئی جیہڑے بھانے دے دور وچوں نگھ رہی ہندی آں، او سے طور دی نظم ستیاں جاگدیاں

ہوٹھاں اتے آؤندی رہندی اے.....

ہندوستان دی تقسیم دا ویلا سی تاں دن رات ایہو بولدی رہندی ساں۔۔۔

اک روٹی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے دین

اج لکھاں دھیاں روندیاں۔۔۔ قینوں وارث شاہنوں کہن

اٹھ درد منداں دیا در دیا۔۔۔ اٹھ تک اپنا پنجاب.....

تے اکثر نظم وی ایس تھاں آکے آواز رک جاندی سی، گلا بھراؤندا سی.....

محبت دے ریت تھلاں وچ گزردیاں اکثر ہوش کبدے رہندے سن۔۔۔

زتاں بھوندیاں تے درھے پئے گڑ دے

وے کوئی انت نہیں سی ایناں گھڑیاں دے

کھجورے موہاں توں رونقاں اوہناں ویڑھیاں دے.....

چرپا کے ایتھوں تڑپ اپنے ہی ہوٹھاں وچوں نکلدی رہی تے اپنے ہی کناں وچ چندی رہی۔۔۔

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی۔۔۔ کل تک نہیں رہنا

ایس پانی دے کن ترے ہائے۔۔۔ ترے ہاں دے ہوٹھاں دنگو

اد میرے موڈھے گھٹ دیا مترا۔۔۔ کہہ دے جو۔۔۔ کہنا.....

دیر جدوں میری نوہ سپیاں والی نظم نوں میرے گناہ دا فتویٰ مل گیا، تاں میں تڑپ کے ایہو نظم لکھی

سی۔۔۔۔

بدلاں دے مینہ لئی میرا سورج نسا جتھے بوہاندہ باری نہ پوڑھی

تے صدیاں دے ہتھاں دی ڈنڈی سولیکی، اوہ سوچاں دے پیراں نوں سوڑی.....

تے ایسے دی پہلی سطر میرے نال سونڈی سی، میرے نال جاگدی سی.....

دید: تساں اپنی عمر دے مایے درھے اتہاس دے کئی کچھ دیکھے نہیں۔ اپنی اکھیں ساہجھا پنجاب دی

ڈگدا، ٹھڈا پنجاب دی تے تقسیم ہو یا پنجاب دی تے بن پنجاب سمیا والا پنجاب دی۔ ایہناں حادثیاں بارے

تسیں کوں سوچدے ہو؟ اج کل من اوپر کی واہر رہیا ہے؟

امر تا: میری عمر دے کئی درھے ہلاک ہندے رہے نے، تے من جدوں کہہ سکدی ہاں "کر بسم

اللہ کھولیاں میں ستر گنڈھاں " اوووں ہی میرے سکون نوں ہلاک کرن واسطے کنیاں ہی سیاہ تاریخاں اٹھ  
کھڑوتیاں نہیں۔۔۔

اپنی پاستے ابد دے کھیتروچ تے اک پاستے سیاست دے کھیتروچ۔  
وہنجاب دی حالت ساہنے آؤندی اے۔۔۔ تاں کئی کئی دن آکھدی رہندی ہاں۔۔۔  
رب خیرے کرے میرے دیڑھے دی  
کہ جس تھاں رانجھن ڈیرا کیجا، او تھے دھمک سندی کھیرے دی۔۔۔۔۔  
تے جدوں اپنی حالت ساہنے آؤندی اے تاں آکھدی رہندی ہاں۔۔۔  
فقیرا! آپے اللہ ہو!

"برہے سیالماں دے معاملے" صرف ایک کال دی حقیقت نہیں سی، ہر کال دی ہندی اے۔  
صاحبان دانگن میرے وی بہت سارے دیر شمیرنے۔ صاحبان دیاں بھیناں نہیں سن۔۔۔ مینوں دیراں شمیراں  
ورگیاں بھیناں وی ملیاں نے۔ سو حقیقت ایہ ہے کہ میں حادثیاں دی پٹی ہوئی ہاں۔  
پرایہ وی حقیقت اے کہ میریاں اکھاں نے جو میرے کولوں  
میرا تصور منگیا سی۔ او سے وچ کسر نہیں آئی۔۔۔  
ایہو احساس میرے ہونٹھاں تے کئی دن کھڑوتا رہیا، تے فیر نظم بن گیا۔۔۔  
رب جی! توں میرے رکھتے اکے اک دن منت منی۔۔۔  
تے چولے نالوں پار کے کئی۔۔۔ رکھ دی جی نہیں۔۔۔۔۔  
میں اپنے لہو دا اک ٹیپا، اک اک کھر گھڑیا  
تے اوہی اوہ میرا اک اک کھر۔۔۔ جگ دی سولی چڑھیا  
میں ایسے جہنم دی لاج بچائی۔۔۔ اکھ کدے نہ رنی  
رب جی!۔۔۔۔۔

آؤ رب جی! زکھ نالوں بہن ناکی کھولن آؤ تے روح دا اک اخیری اکھر اپنی جھولی پادو۔۔۔ ایس  
زکھ تہاں جو منت منی۔۔۔ اوہو منت منی  
رب جی!۔۔۔

ایسے نظم و چوں ایہ جیہریاں سطران نے۔۔۔  
 آدو رب جی زکھ نالوں نا کی کھولن آدو  
 تے روح داک آخری اکھراپنی جھولی پاوؤ۔۔۔۔۔  
 ایہ اک التجا بن کے کئی دن میرے ہونٹھاں تے پٹھیاں رہیاں۔۔۔۔۔  
 ارج کل نویں نظم دیاں دوسطراں میرے اندر اک دھونی وانگ اٹھیاں نے۔۔۔  
 میں لیک رب دے شہر دی  
 میں مٹی اپنے حجرے دی۔۔۔۔۔

(پہلی استر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## درد کتنا

درد وچھوڑے دیاں گلاں۔ بھر دے نل۔ دکھاں دے موسم۔ پیار دیاں رفرال۔ عاشقاں دے نغے۔  
عشق دے تھکدے دھوئیں۔ ضوفیاں دی حق ہو۔ ونجھلی دیاں کوکاں۔ راگاں دے سر۔ تھلاں داستان۔ عشق  
مجازی تے عشق حقیقی ازل توں ای پنجابی شاعری دے موضوع رہے نیں۔ جتاں وچ درد دی اک لہر بلورے  
لیندی سندی وی اسے تے نظری وی اوندی اے۔

1947 وچ ملن والی آزادی دی انتہاں دی خوشی اپنی تھاں پر تقسیم ہند دی لہورنگ ہوئی۔ شیطان دے  
بھنگڑے۔ انساناں دے حیوانی ناچ۔ لہو دیا نہراں۔ ذراؤ نے مکھ۔ مٹھوایاں دے لشکارے۔ بے وی تے  
مجبوری نال بھریاں تھل۔

اکھاں۔ ڈرے چہرے بھریاں جوانیاں چہ تار تار جھٹے اپنے اندراک وکھری داستان رکھدے نیں۔  
ایہہ اک نہیں ان گنت داستاناں سن۔ لہو بھریاں داستاناں۔ انہاں داستانیاں نوں مکھ دکھ کے جہاں دو  
شاعراں شاعری کیتی اوہناں وچ امرتا پریم تے احمد راہی دے ناں بڑے چمکدے دمکدے نیں۔ جہاں  
مذہباں توں دکھ ہو کے صرف انساناں دی گل کیتی دکھیاں دے دکھ وٹدے۔ چادراں دی لیراں جمع کیتیاں  
تے اوہناں تے درد ایک دتے۔

اُج تے پاکستان نین مگروں نویں سوچ لیکے اون والے۔ انسانی مجبوراں دیاں گلاں کرن والے۔  
دسیب دے حسن تے دکھ سے نال دلا کے ادب کھلاؤں دودھا وادین والیاں وچ۔

افضل احسن رند حاوا۔ اکبر لاہوری تے نواز بڑے مڈھلے لکھاری منھے جاندے نیں۔ پر جے گوہ نال  
افضل احسن رند حاوا۔ احمد راہی تے امرتا پریم نوں پڑھیا گیا شاید اوس دور وچ ایہو جی توجہ کسے ہور نوں نہ لہ  
سکی ہووے۔

امرتا گئی تاں ایتھوں ای سی پر جانندیاں جانندیاں اوہتے رہی چیک ماری جیڑی بڑی دور تاں  
دردمنداں دے دلاں تاں ایڑی تے سارے دردمنداں امرتا نوں سلائی دتی۔ کیوں بے اوہدی چیک اُتلے

سُراں وچ سی تے روہتے پنجاب دے وڈے درد نوں سد ماری سی اوہنے آکھیا سی  
اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول  
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول  
اک روٹی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے دین  
اج لکھا دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن  
اُٹھ دردمنداں دیا دردیا اُٹھ تک اپنا پنجاب  
اج نیلے لاشاں وچھیاں تے ہو دی بھری پنجاب

ایس نظم نے بڑیاں دُہائیاں پائیاں۔ انہاں دُہائیاں دی گونج حالے وی سُنی جاندی اے۔ پنجاب دی  
دھرتی اُتلے۔ بے دسیاں۔ بے گناہویاں دا اپنا لبو ڈھلیاں جینے دھرتی اُتلے کھلاے سبزے نوں ساڑھ سواہ  
کردتا۔ ایس سڑھی بلی دھرتی دا درد بھنایاں راہی تے امرتا وی شاعری دا ہوا حصہ اے۔ احمد راہی دی ”ترنجن“  
تے امرتا دی ”نویں زت“ اوس ظلمی موسم دی کھتاں۔ پر امرتا نے اپنے دل دے درد نوں شاعری دے نال  
نال اپنیاں کہانیاں وچ اپنے مضموناں وچ دی اکوچھے جذبے نال بیان کیتا اے۔

بھارتی پنجاب وچوں پاکستان وچ جنوں سب توں بوہتا پڑھیا گیا تے پڑھیا جاندا اودہ صرف امرتا پرتم  
اے۔ ہنیریاں راتاں وچ چانن وند دے اوہدے اکھی۔ لبو دے موسماں وچ جاگن والے خیال۔ درد وون  
سواپاں کرن والے شعر۔ ٹھنڈ پان والیاں مٹھی مٹھی پیڑ بھریاں کہانیاں تے سانجھ پان والے سوال اج دی  
پنجابی ادب دا وڈا حصہ سمجھے جاندا اے نہیں۔ ایس لکھاری بی بی نوں ادبی دنیا وچ جیہڑا مقام ملیا اودہ ہور کسے  
لکھاری دے حصے نہیں آیا۔ اوہدے دل دا درد ایسا گوہڑا اے کہ اوہدی لکھت وچ ڈھلکاں ماردا اے۔

اوہدا درد بیان اک نظم وچ انج بیان ہندا اے

آنی میرے جندے

اج وی اوہو پینے تیرے

اکھیاں وچ لکھدے

پوتاں وچ سگھنداں ان دی  
 جھمبیاں چوں اُتھر دہن دی  
 شاہ راتاں دی مینڈھی وچ  
 کوئی لکھاں تار سے گندے  
 پر نہر تھی دار تک کھسکیلا  
 تر کالاں دا بول کیسلا  
 محسناں دامنہ پے گیا میللا  
 اکھیاں توں پیا مندے  
 نہ ہندی نہ چھوٹی  
 نہ تیری نہ میری ہوئی  
 پر عشقاں دی کوری کنی  
 پیندی جاندی اندے  
 تیل بناں جگدے نہ دیوے  
 جندوں باجھہ کوں کوئی جیوے  
 سورج کولوں منگ کے چانن  
 چن چکدے مندے

امرتا دی فکروی عجیب اسے کدے تے او اپنا درد بیان لی کوئی لمبی نظم اُلکیدی اے۔ کدے دو فقریاں وچ  
 دکھ دے جنگل آباد کر دیندی اے۔ ایسے طرح دا اک لمبا کھلا راوہدے انہاں فقراں وچ دیکھدے آں۔  
 اوہدی حیاتی چوسدے سارے دکھ دی کتھا دکھائی دے گی۔ اوہ کہندی اے  
 اک دردی

جو سگریٹ دی طرحاں میں چپ چاپ پیتا  
 صرف کچھ نظمماہین۔۔۔

جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وائمن جھاریاں

ذرا گویہ کرو کیویں سڑدی بلدی انسانی حیاتی دی راکھ وچوں زندگی دے پھل بھال لیا ئی۔ ایہہ وکھری  
 گل اے جے انہاں سرخ گلاباں دے موسماں وچ پھلاں دے رنگ کالے نظر اوندے نیں۔ امرتا نوں وی  
 تے پڑھن والیاں نوں وی کیوں جے گل دل وچ ایڑن دی نیں۔

سگوں دل وچ پکی تھاں بنا کے عباچہ ڈیزہ لان دی اے  
 اوتا دلاں دی ڈیرے دار اے اوہدی اک ہور

نظم جیڑی ذرا لمبی اے دیاں لائیناں دیکھدے آں۔ عنوان اے "دیوتا"

توں پتھر دا دیوتا ٹھنڈے ککر بھاؤ تیرے ندا جے تیک گرمان

جگاں جگاں دی غیندر ستے اے تیک وی جذبے تیرے جاگن وچ ندا ون

بال بال کے حسن اپنے لیکھ سندریاں آن

تیرے سولے سولے جڑھاں تے جیتن انگ نوان

پیڑے پتھرے چرناں اُتے لوئیں لوئیں پونے چھوہ کے

ماس دی گندھ وچ متے متے پیراں تک جھکان

تنگھے ساہ دیاں گرم ہواڑاں پوجادی سام گری دچوں

اٹھدے لے لے دھوئیں تیرے بھاؤ ندا جے بھٹکان

دلاں ورگے قد اوںہاں دے نیوں نیوں لہدے جان

چنوں چھیاں لکھ گوریاں کالے بھورے نیں اوںہاں دے

تیرے سولے سولے بُت تے روم روم لپٹان

جیویں مٹی دی خوشبو تے ناگ لیڈے جان

جگاں جگاں دی پوجانی کے ہونڈ تیرے ترہائے

کنے کو ہونٹاں دے رس تیرے چرناں اُتے نیکی

بارے جن اسمیں بارے

پتھر دے جھوٹے پیراں نوں میرے پوجن بھاؤ کنوارے

اک تقدیر زنائی دی رب نے بنائی اک تقدیر مرد نے



آپ گھڑ لئی جیڑی زنانی نوں پوجا پاٹ کے لا کے جلوے

وی دیکھدی اے تے جلوے وی کھاندی اے۔ امرتا زنانی

ایس کشت توں ملک کمران دا جتن کردی اے۔ اوہدیاں تحریراں لکتی دوان وی ایسی کوشش نوں روپ  
دیندیاں ہن۔ ایسے کر کے اوہدے سوال وی اوکھے نہیں میرے شہر دی ایک بی بی افضل تو صیف دی بڑی  
درداں ماری اے۔ اوہدے درد وی پڑھن جوگ نہیں کیوں جے لگدا اے اوہ پاکستان وچ امریتا دی نمائندہ  
اے۔ اوہدیاں لکھتاں وچوں وی دُکھڑے دُھل دُھل پیندے نیں۔ امرتا اوہنوں سوال کردی اے۔  
اوکھا دی تے درد بھناں وی۔

”تو صیف! چھاتی وچ ہیر دی رُوح پا کے جیویں جیویں اوہدی کوئی گل دیس۔؟“ افضل تو صیف دی  
حیاتی نوں ویلے دی باغی میاں نال جوڑ کے مکھن دا مطلب ایہہ ہے کہ درد دی ایسی کہانی سُن جاسکے۔ حالاں  
ایس سوال کسے ہوو آسان جے طریقے نال وی پچھیا جاسکدا ای پر آسان سوال تے اوہ کر دے نیں جہاں  
دُکھاں دے موسم نہ سکے ہون۔ پر ایس سوال دا جیڑا جواب افضل تو صیف نے ونا پہلے اوہ دیکھ لیے خیر گل اگے  
نور دے آں۔ ”بڑی اوکھی گل چمچہ بیٹھے او امرتا جی پر تہاڈے حساب تاں بڑی سوکھی گل اے۔ تئیں آپ تاں  
دُنیا فتح کری بیٹھے او۔ پنجاب دی بھتوں وڈی شاعرہ تے دلی دا تاج وی سرتے پالیا۔ ہن اوہ جووی پچھے یا  
دے فرق نیوں پیندا۔ میں اک گل دساں امرتا جی ایس پاسے تے پنجاب وچ جتھوں وی مٹی تہاڈے بدن  
نوں وی لگی ہوئی ہیرا جے وی کھیریاں دے دس پئی ہوئی اے۔ پیلے پنڈ ایس ہیر لئی لکھاں ہزاراں کید و دشمن  
جان دے ویری وارث شاہ دا مقبرہ بھی دیں اتھے ہیگا پر اوہدی رُوح نے مُڑ کدے پھیرا نہیں کیتا۔ راجنھاں چارا  
اپنے آپ جوگا وی نہیں بھاویں۔ دامن درگے نے لکھ دلا سے دتے

راجنھاں تخت ہزار یوں رُے تے سہی

قدماں بیٹھ سیالاں دا جھنگ اوند

میںوں پکے یقین اے ایس جواب نے امرتا جی نوں ضرور خوش کیتا ہوئے گا کہ اوہناہ ورگی درد بیان والی  
ہوروے اے۔

امرتا جیویں آپ درد بلیاں گلاں کردی اے رنج ای دو جے نوں رنج دیاں گلاں کرن دی پر پناہ دیندی  
اے۔ فیض احمد فیض نال اک گل بات کردیاں اوہنے رنج دے امی سوال کیتے جہاں وچ بظاہر تاں ہلکا پھلکا

انداز سی پر اند رکھاتے اک درد دی لہر و دھدی سکود دی صاف دکھائی دیندی اے اوہدے ہنکھن دا انداز دیکھو  
 ”تھاڑی اک نظم شاید اوہی“ اک ذرا سوچنے دے ”اوہ تساں آندر سے وزنی۔۔۔ دے ناں کہتی ہوئی اے  
 اوہ کس خیال توں اوہدے ناں کہتی سی۔“ فیض دسدے نیں۔

”اوہ میرا بڑا دوست اے۔ نظم کجھ اوہدے رنگ و بچ لکھی سی ایس لئی اوہدے ناں کردتی۔“ ایس طرح ”کجھ  
 ہو رنظمناں دی ہو دوستاں دے ناں کیتیاں نیں؟“

”ایہہ پتا اے کہدے کہدے ناں لکھیاں نیں پر کسے اتے کسے داناں نیں۔“  
 ہن امرتا اپنے مطلب دل آندیاں پچھیا۔ ”پھر بغیر ناں دے اوہدی گل سناؤ جہدے ناں دُنیا دے غم نوں رقم  
 کر دے رہے۔“

فیض کھل کے ہنس پینے کہن لگے ”اوہ اک ہندی سی قلو پھرا اوہدے توں لے کر تیرے تک لوک ہندے نیں  
 جہاں دے ناں غم رقم کری دے نیں۔“

فیض کہن لگے ”لے مَن میں تینوں دساں میں پہلا عشق اٹھاراں وریاں دی عروج کیتا سی“ نقش فریادی  
 دیاں ساریاں نظمناں میں اوہے عشق وچوں لکھیاں سن۔“

”امرتا کسے وی درد دی گل نوں کن نیں دیندی اگے سمجھدی اے“ پراوہنوں زندگی وچ پایا کیوں نیں۔“  
 ”ہمت کتھے ہندی سی اوہدی زبان کھولن دی۔ اوہداویاہ کیسے وڈے جاگیر دار نال ہو گیا سی۔“

ایہہ درد دکھتا اگے وی ٹردی اے پر میں سمجھدا اسیں آپ وی اگے پڑھیاں بنا ساری گل سمجھ لئی ہوئے گی۔  
 کوئی ہو رگل چھونے آں۔ ”رسیدی ٹکٹ“ وچ امرتا کہندی اے۔

”کدے کدے خوشی تے اداسی اکٹھیاں اکو وارگی آجاندیاں ہن۔“ آکھیا وارث شاہ دی دل نوں  
 دل دا پانی دتا سی دل داوی اتھرواں داوی۔۔۔ پر یاد ای اوہ ویلا جدوں تیرے پہلے میل نال چوٹرنی ایہہ خبر  
 پھیلی سی۔ جلدھر وچ کسے ساگم دی پردھاگئی لئی میرا ناں پیش ہو یا تاں کیونسٹ پارٹی دے اک نیتانے  
 آکھیا سی۔ ”نہیں اسیں اوہنوں نہیں بلانا“ اوہدی بدنامی نال ساڈی سجا بدنام ہو جائے گی۔“

گل ناں ایہہ دی دکھ بھری ہے۔ امرتا دی شاعری ہووے یا کہانی ہووے اکو جیسی درد دکھایاں ہندی  
 ہے۔ کہنی واسطہ اک کہانی ہے۔ جہدے وچ کہنی دی ماں پولینڈ توں کہنی نوں لکھدی ہے۔۔۔۔۔ تے  
 فیروقت آیا جدوں ہندوستان میرے لئی میرا نہ رہیا میں سوچیا سی ہندوستان نہ سکی پر پولینڈ ضرور میرے لئی میرا



ہر دس دے شہر دی ہر سڑک تے بیٹھے  
 پر کوئی اکھ تکدی نہیں نہ چو تکدی  
 صرف اک کتے دی طرحاں اک سنگی دے نال بچھی  
 کسے ویلے کسے دی کوئی نظم بھو تکدی۔۔۔۔۔  
 اک نظم دا عنوان ہے "مارلن میگز" اوہو ای مارلن میگز دجیے ہالی ووڈ دی مقبول ہیر دکن ہونن دے پاو جو  
 خود کشی کر لئی سی۔ ایہ نظم پڑھ لو تے باقی گلاں امرتا ہارے آپ سوچ لیٹا۔ بس ایہو ای درد کھاتا ہے۔  
 "زندگی اک میلے رو مال دی طرحاں۔۔۔۔۔  
 میں بوجھے دے وچ پائی پھر دی ساں  
 خورے ہزار واری میں ایس دے نال متھے دامن کھاپو بھیا  
 تے اج ایس نوں میں موت دے جشمے تے دھون چلی آں"  
 ☆☆☆☆

## میں کنا جاندا ہاں

امرتا پریم نوں ناں دے نیرے تیرے یاں ناں نالوں تھوڑا یاں ودھ جاندا ہاں۔ ایہ سطر لکھدیاں ایسے چھن میرے اندر کوئی بولدا ہے۔ 'توں امرتا نوں ایٹا جاندا ہیں، جس نوں کوں وی دیا نہیں جاسکدا' ہن میں ایہناں دوہاں اُلٹ سریاں دی تھوہ پاسکن دے آہر وچ ہاں۔

میں امرتا نوں 2 ستمبر 1996 دی سویر دس پندراں منٹ ای ملیا ہاں۔ تے بس۔ میں تے گرپریت اپنی آپنی پہلی کاو پینک (شاعری دا مجموعہ) بھیٹ کرن گئے ساں، جو اوے شام ریلیز ہونی سی۔ امرتا نوں ملن خاطر بندے نوں اوس دے گھر دے اندر پنج پوڑھیاں چڑھنا پیندا ہے پہلاں۔ فیر ملن والا اوس سحل فرش تے پہنچ جاندا ہے جتھے امرتا کچ اوتھا چ نر پھر رہی ہوندی ہے۔ جدوں اسیں ایہ پنج پوڑھیاں چڑھ فرش تے پہنچے امرت ساڈے نال سن۔ اوہ پوڑھیاں نہیں چڑھے سن، امرت لئی ایہ پوڑھیاں نہیں سن۔ بے پاسیوں پڑھن کمرے وچ امرتا ہولی ہولی ساڈے ول سرک رہی۔ لال بوٹیاں والا ڈھلا سوٹ جس دی بھونکیں مینوں بھگوائیں بھاسی۔ گل کوڈیاں دی مالا، مدھرا، گورا جسم۔ مینوں لکيا جویں لاہور قصور والا پنجاب سرک رہیا ہووے ایدھر ساڈے ول دھیرے دھیرے۔

میں امرتا دے چہرے دیاں جھرڑ گھاڑیاں پٹھاراں چوں پڑھ رہیا کتے ای نیلے، کنیاں ای جھناواں۔ جنگلاں وچ بنیاں سراواں جتھے جانداے راہی رات کھدے ہن۔ جدوں سویرے اوہ اگلے سفر تے نر دے ہن اوہناں دے اگلے پینڈے دی سیرت بدل

چکی ہوندی ہے۔ اتے صورت وی بدلی ہوئی بھاسدی ہے۔ پہلاں نالوں نوں تازی۔  
 ہریاوی۔ سراں پاندھی دے ذہن وچ پوری طرحاں شامل ہو چکی ہوندی ہے۔ میں اہرتا  
 دے چہرے تے اُداسی سادھاں دا دھونا بلدا وکھ رہیا ساں۔ جتھے مینوں "میں کیہ ہاں"  
 دے سوال دی اکن تپش دسدی رہی۔ اوئی پلہیں میں آپ نوں، جھنگ، سیال، رانجھا،  
 گورکھ دا بٹا، ہیراں دے در، ٹھوٹھا، بگلی، پیراں دیاں مزاراں، نڈا بادرا ہو ہو نچدا پھردا،  
 عشق دی نویں نوں بہار دے بھاو منڈل ج پھردا وکھ رہیا ساں۔

اوس سکتل فرش تے ساڈے نال صوفیاں تے بیٹھن خاطر امرتا تن پوڑھیاں  
 (آپنے اندروں دی) بیٹھاں اُتری۔ ایس صوفیاں تے بیٹھ گئے۔ امرتا امروز دیکھے  
 موٹھے دا سہارا لئی بیٹھی سی۔ یاں امروز نے ای آپنے موٹھے نوں سہارے دی منڈرا  
 وچ کھڑا کر رکھیا سی۔ جاپدا سی، امروز دے جسم دا ایہ انگ امرتا دے جسم دا ہے۔  
 امرتا بولی۔ نیاز بو پڑھے ہن سارے۔ کھڑا نیاز بو سبھ توں چنگ لکھا۔ تسیں آپنا نیاز بو  
 بھیجنا۔ ساڈیاں کتاباں پھولدیاں بولی۔ سوی اچیاں کتاباں چھاپ رہیا۔ امروز چاہ لے  
 آئے۔ چھوٹے ڈبے ج بکٹ۔ چھوٹیاں چھوٹیاں گلاں ہوئیاں ساہنگ شرارتیاں دیاں  
 دی۔ امرتا نے نیگے پنے بسکافاں نوں ڈھکدیاں آکھیا۔ ایہ نیگے پنے سلھ پھڑ لیندے ہن۔  
 میں سوچ رہیا ساں جویں امرتا کہ رہی ہووے۔ بسکافاں نوں ڈھکے تے بندے نوں نیگے  
 رہنا چاہیدا جو اوہ فضا چوں سلھ پھڑدا رہے۔ جو وی اوس نوں چھوے اوس دا کجھ جھا  
 چھوہن والے دے ہتھاں نال لکھا رہ جاوے۔ ڈھکیا بندتاں ڈھکے بسکافاں ورگا ہوندا  
 ہے۔ کرزا۔ سُکا سُکا جو وی چھوے اچھوتا رہ جاوے۔ پکڑ ودھاوے تاں بکٹ ٹٹ  
 جاوے۔

بھلا اپنے کو سے ج امرتا نوں کنا کھو جانا جاسکدا ہے۔

امروز ساڈے نال گیٹ تک آئے تے گیٹ تے کھڑے دس بارھاں منٹ  
 گلاں کردے رہے۔ مینوں لگا میں ایہناں دساں منٹاں ج امروز نوں پورا جان گیا  
 ہاں۔ امروز محنت، عشق بارے بول رہیا سی۔ جے تسیں ایہ جانتا ہووے کہ میں امرتا

نوں کتنا پیار کردا ہاں تاں تہانوں ساڈے گھر ست اٹھ دن رہنا پوے گا۔ پر ایہناں دناں چ کدے دی تسمیں مینوں امرتا نوں پیار کردے نہیں دیکھ سکو گے۔ میں اوہناں وستاں نوں محبت کردا ہاں جہناں نوں امرتا پیار کردی ہے۔ میں امرتا دی ہر دست، ہر پسند نوں محنت کردا ہاں۔ اک وار امرتا رات پے ٹیکسی لے گھر آئی۔ آپنی گڈی جو خراب ہو گئی سی۔ درکشاپ تے چھڈ آئی۔ کہن لگی۔ آپے کل نوں مستری چھڈ جائے گا۔ سویرے امرتا نے اٹھ کے دیکھیا۔ کار گھر وچ ای کھڑی سی۔ میں امرتا توں چوری کار ٹھیک کردا راتو رات گھر لے آیا ساں۔

امروز کدے امرتا نال آپنی محبت دیاں گھاں کر رہیا سی۔ مینوں جاپیا جویں اوہ کوئی مدھ لگی پنجاب دا انہڑھ جٹ ہووے۔ سدھا سدا، بھولا، موہ ونا، پیار رتا۔ جس دے پینڈے دی ڈھوڑ نال بھرے گھٹیاں تے اُچا چادرا لٹک رہیا ہووے۔ مینوں لگا اوہ دن وی کدے آسکدا ہے، جدوں امرتا نہ رہی تاں ایہ جٹ کسے کھونجیوں آپنا کھیس چک کے موڈھے تے رکھے گا تے جدھر موہ نہ ہويا اوس راہ ٹر پوے گا۔

میں محسوس کردا ہاں کہ میں امرتا نوں ایسا جاندا آں کہ دس سکنا ناممکن ہے۔ مینوں جاپدا اے جویں تھاٹ وائبریشنز یاں کوئی جینیٹک کریکٹرز راہیں میرا امرتا نال کوئی اڈکھ سہندھ ہے جس کر کے میری زندگی وچ کئی لہیاں گھٹناواں گھٹیاں ہن جہناں توں ایس سہندھ دی سمجھ پین لگدی ہے۔ کجھ دس سکن دی کوشش کر رہیا ہاں۔

میں آپنی عمر دے جمبویں ورھے تک اسہک بندا رہیا ہاں۔ اتفاق میرے گوزھے متر نے میرا ایم اے پنجابی دا فارم لیا کے بھر کے مینوں سائن کرن لئی کہیا۔ میں پانٹھ کرم چ "کاغذ تے کیونس" پڑھی۔ مانن لئی دی، نمبر لین لئی دی۔ ایس توں چار کو سال بعد میری زندگی چ اک اہم موڑ آ گیا۔ مینوں جیوں سکنا اڈکھا، دادھو تے بھارا بھارا لگن لگا۔ سارے ساجک رشتے مینوں جھٹی، پھو کے، غرض دست، بھوکھلے لگن لگے۔ جہناں وچ محبت ناں دی کوئی شے نہیں سی۔ پورا دن، رات، موسم، بارش، ہواواں، سبھ بے کار دادھو دادھو۔ ایہقوں تک کہ میرے اکلوتے بیٹے نال دی پیار کسے زبرد



ڈگری تے پہنچ گیا نلگن لگا۔ مینوں لگدا سی ایس طرحاں وادھو جیونا ہور کنا چے جاری رکھ  
سکاں گا۔ بس کدوں وی کدے وی ایس زندگی توں نجات پالین والا آخری راہ ای  
مینوں آپنا راہ لگ رہیا سی۔

اتفاقن میں آپنے سرخانے اپری کانس توں امرتا دی وارنک دی کتاب چکی۔  
پڑھن لگا (ہن تاں اوس کتاب، ناں تے سطران وی سر مکیاں ہن) شاید سارا حلقفت  
بارے سی۔ اوس وچ کجھ سطران امرتا دے منکھی رشتیاں دی حقیقت بارے کہیاں سن۔  
اک دم میرے اندروں جویں ہزاراں من بوجھ لہ گیا ہودے۔ ایہ گل مینوں بہت دیر  
بعد ٹھیک ہو جان توں بعد سمجھ آئی کہ جہناں رشتیاں نوں میں ناکارا سمجھ رہیا ساں  
کھوکھلے، محبت جین سمجھدا ساں، اصل وچ میں ادہناں نال اندروں جڑنا چاہوندا ساں،  
ادہناں نوں ٹھیک کرنا چاہوندا ساں۔ ادہناں نوں ادویں سویکار (قبول) کرنا نہیں سی  
چاہوندا۔ جس دے سٹے وجوں میں سویر ڈپریشن دا شکار ہو گیا۔ میں اوس سے پورے  
ساج نال کٹیا ہویا ساں۔ اک بہت پرانے متر نوں بلایا۔ اوہ مینوں کسے منو چکھتک  
(ماہر نفسیات) دی بھال وچ چندی گڑھ لے گیا۔ میں لدھیانے اک سائیکھٹرسٹ ایس  
ایس گل کول زیر علاج رہیا تے ٹھیک ہو گیا۔ امرتا نال اوس کجھ سطران والے رشتے  
نوں صرف محسوسیا ای جاسکدا ہے۔ دن لگا تاں جاپدا ہے کوئی ہلکی گل لکھ بیٹھا ہاں۔

اُنچ میں امرتا نوں دو تن خط لکھے ہن ایہناں پچھلے پندرہاں درھیاں وچ۔ بے  
جوابے خط۔ اک خط میں پنجابی یونیورسٹی توں رجسٹری کردا اوس دی رسید پتا نہیں کیوں  
کئے ای سال آپنے پرس وچ پائی پھردا رہیا۔ اوس پہلی اکو اک ملنی سے وی میں ایس  
گھٹنا نوں آپنی کتاب دی بھیٹ عبارت وجوں لکھیا سی۔ جدوں میں کوتا لکھدا نہیں  
ساں، بس تھوڑا تھوڑا پڑھدا ساں، میں تے گرپریت اک شام چندی گڑھ گھم رہے  
ساں۔ میں محول وجوں گرپریت نوں کہیا فلاں کوی کیہ کوتا لکھدا اے، میں ہنے ثریا  
جاندا لکھ سکدا ہاں۔ اجہی کوتا 'توں ماں ہیں توں چھاں ہیں، توں گاں ہیں۔۔۔۔۔'  
اتھوں ٹردے ٹردے اسیں اک ہوٹل وچ جا بیٹھے۔ گرپریت نے کہیا۔ ایہ کوتا کاغذ تے



لکھ لے۔ محول نہیں۔ کوتا ہے ایہ۔ اوہ کوتا لکھ میں 'ناگ منی' نوں بھیج دتی۔ شاید 1982 دی گل ہے۔ اوہ کوتا "ناگ منی" دے ٹائٹل سپنے تے چھپی۔ اوہ دن توں میرا "ناگ منی" نال ایہ رشتا قائم ہو گیا۔ میں دو چار مہینیاں بعد "ناگ منی" لئی کوتا بھجدا رہندا ہاں۔

میںوں امرتا گربست آشرم چ رہ رہی اداسی سادھوی لگدی ہے۔ جو کھان پین دے آہر توں بنا ہاتی سارا سا پڑھن لکھن دے سکھے لاؤندی آ رہی ہے۔ پرانے سمیاں چ اداسی سادھو اپنے ڈیریاں وچ سویرے چار بجے اٹھ نہاؤن دھون تے بندگی کرن توں بعد پورا دن گرنٹھ لکھن پڑھن وچ لا دیندے سن۔ صرف کھان پین دا سما ای گرنٹھوں باہر رہندا۔

میں سمجھدا ہاں کہ امرتا نے بھارتی عورت نوں اپنے اندروں اپنے آپ توں لبریٹ کروایا ہے۔ جو سبھ توں اوکھا کارج ہے۔

(لپی انتر : جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

## امرتا پریتم دا پنجابی ناول وچ ستھان

امرتا پریتم بھارتی سہت دے اتیانن مہوپورن پرتندھ ساہکاراں وچوں ہے۔ ساہتک پنھ بھوی صدقہ پتا دے پر بھادادھین بھادویں چوٹی عروج امرتا نے سہت سر جٹا شروع کردتی سی پر و دھوت روپ وچ اوس نے 1936ء وچ 'امرتا لہراں' نال پنجابی کاو سہت جگت وچ پرویش کجھ اتے جدوں تک اوہدی چیتنا قائم رہی اوس نے اپنی سر جٹا و بھین ساہتک ودھاواں وچ جاری رکھدیاں ہویاں لگ بھگ 60 توں ودھ پستکاں پنجابی سہت دی جھولی پائیاں۔ ایہناں وچ لگ بھگ 22 کاو سنگریہ، دے قریب ناول، 200 توں ودھ کہانیاں اتے سہت نال سمبھت کیرتاں، لوک سہت اتے لکھے شامل ہن۔ اپنی وڈہ ماترا وچ سہت سر جٹا اوس نوں کنا تمک پکھوں ہی نہیں سکوں کنا تمک پکھوں وی اتم درجے دی ساہکارا وچوں ستھاپت کردی ہے۔

بھادویں امرتا پریتم پنجابی ساہتک حلقیاں وچ اک کاوتری وچوں سبھ توں ودھ پہچان قائم کردی ہے پر اوس نے سہت دی ہر ودھا اوپر قلم آزمائی کر کے اک بہو پکھی ساہکارا وچوں وی پہچان بناؤن دا جتن کجھ ہے۔ پنجابی ناول سہت وچ اوس نے وڈی گنتی وچ ناول سر جٹا کر کے بھر پور یوگدان پایا ہے۔ میرے ہتھلے پرچے داوشادی امرتا پریتم دا پنجابی ناول سہت وچ ستھان نچت کرنا ہے، ایس لئی اسیں اوس دی ناول سر جٹا اوپر دھیان کیندرت کر دے ہوئے ایس کھیت وچ اوس دے یوگدان ہارے چھ چاکراں گے۔

پنجابی ناول دائمڈھ بھائی ویر سنگھ دے ناول 'سندری' نال بھجدا ہے۔ بیشک اوس دی پہچان وی اک کوی وچوں ودھیرے ہے پر 'سندری' توں علاوہ اوس نے 'بی جے سنگھ'، 'ستونت کور' اتے 'بابا نودھ سنگھ' چار ناولاں دی سر جٹا کیتی۔ ایہ سارے ناول، سنگھ سبھا لہر دے پر بھادادھ سنگھ قومی لہرنوں کامیاب بناؤن وچ سہائی ہون لئی رچے گئے سن۔ ایہناں دی رچنا شیلی وی سندیشا تمک اتے سکھیا تمک ہی سی۔ بھائی ویر سنگھ دے

سرکالی موہن سنگھ دیواتے چرن سنگھ 'شہید' آدمی نے وی ایسے پرورتی اوصین ہی ناولاں دی سر جنا کیتی ہے۔  
ایہناں توں بعد نائک سنگھ ایس سا جتک کھیتر وچ پردیش کردا ہے۔

نائک سنگھ دے پنجابی ناول وچ پردیش کرن نال ایس دے وکاس وچ وشے پکھوں جو تبدیلی آئی  
اوہ سی ایس دے دھرم بزیکھ ہون دی۔ جتھے بھائی ویر سنگھ دا مکھ سر اُپدیشا تمک سی اوہتے نائک سنگھ  
سر دھاروا دی ورثی کون اوصین سماج سُدھارنوں اپنا مکھ لچا متھدا ہے۔

جسونت سنگھ کنول ایس دے وکاس دا اگلا پڑا ہند اہویا اپنا لچا سماج دی تبدیلی وچون نچت کردا  
ہے۔ ایس دور دے ناولاں نوں ٹر بخش سنگھ رومانچک آدرشا نال سمبھت کردا ہے۔ ایس ناول دے خاص  
پکھن ایہ ہن۔ اک وکسیت پلاٹ، بھاؤ کتا اتے سارے پاتراں دا صاف طور تے چٹکیاں اتے ماٹیاں وچ وٹ  
جانا۔ پنجابی ناول ساہت جت وچ امرتا پریم داوی وڈا ملایو گداں ہے۔ اوس دے ناولاں ہارے رچ چا کرن  
لکیاں ساڈا دھیان سمبھتوں پہلاں اوس دے ناول 'ڈاکٹر دیو' اوپر کیندرت ہندا ہے۔ ایس ناول دا اوصین  
کردے ہوئے دیکھدے ہاں کہ اس ناول وچ کافی لمبے عرصے دیاں گھٹناواں نوں پلاٹ وچ شامل کیتا گیا  
ہے۔ لیکھکانے ایس وچ پیار، ویاہ، پروار اتے دھرم نال سمبھت و شیاں نوں چھوہدیاں اک اجنبی ناری دا  
چتر ابھاریا ہے جو سا جت قدران قیمتاں اتے انیاواں دی شکار ہے۔ اپنے توں پہلی پیڑھی دے لیکھکاں  
نائک سنگھ، کنول اتے ٹر بخش سنگھ دیاں پرمرادواں نوں جاری رکھدیاں امرتا پریم نے نرم، سہل پر نال ہی نال  
انکھلی سان والی اتے اندرونی طاقت والی پنجابن ناری دا ملب اُکلیا ہے جو کجھ زیادہ دلیری دکھاؤندی ہے۔  
زیادہ دلیری دکھاؤن توں بھاؤ ہے کہ مدھ ورگی دی کوئی وی گوی ویہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ  
اجنبی نا کجی نہیں سی کہ اپنے پیار دے رشتے نوں ویاہ داروپ نہ دیوے۔ پر ناول دی نائیکہ متادی ہوند دا رتھ  
اوس دا دیوٹی پیاری۔ سوکے حد تک متاد، چتر بھارتی استری دے پریم پراگت چتر توں اُلٹ ہے۔ امرتا پریم  
دی ایس نائیکہ دی ویشیتا ایہ ہے کہ اوہ اوہناں کارناں نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے جہاں نے اوس نوں  
موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔ لیکن مکھ نائیکہ وچ صرف چٹکیاں ہی روپمان ہندیاں ہن۔ اوس دا اک آدرش  
پاتر ہونا ناول دے وچاردھارک مثل نوں کجھ گھٹاؤندا ہے۔ پاترنوں اُلیکن وچ اک پکھتا اتے اُسے پیار دا  
رومانچی کرن ایس گل دا سکتیت ہن کہ اپنے پہلے ناول نال امرتا پریم پنجابی ناول شیلی وچ بھائی ویر سنگھ دی  
ستھاپت کیتی اتے نائک سنگھ دی اگے ودھائی اہ بھاؤک رومانچک پرمرادواں شر دھاغلی ار پت کردی ہے۔

اپنے دوسرے ناول 'منجروچ' امرتا نے ہندوؤں اتے مسلمانوں وچکار دودھ دے دیر دے پورے دکھانت نوں رو پھان کیتا ہے۔ ایس دے نال نال ملک نوں آزاد کرواؤن لئی پنجاب نوں کیہ کیہ مصیبتاں تھلندیاں پیاں اتے کیہ کیہ قربانیاں دینیاں پیاں ایس گل نوں وی ابھاریا گیا ہے۔

منجرتے 'اک سوال' تھوڑے بہتے فکر نال ڈاکٹر دیو دے وشے نوں ہی اگانہ تردے پریتیت ہندے ہن۔ اپنے ناول 'بندو روارہ' وچ اوہ ناری دی آر تھک سترتا، اوس نوں دو جیاں دے نظریے نوں نظر انداز کرن اتے اپنے فیصلے آپ لین دی طاقت بخش دی نظر آؤندی ہے۔ اوہ ناری چیتنا نوں اوس دی قسمت بدلن دا اک طریقہ درساؤندی اے ایس ناول وچ پر پوار وچ ناری دی موجودہ آر تھک سترتی نوں بدلن دا وی سوال کھڑا کردی ہے۔ اصل وچ امرتا پریم جس ناری دی پیش کاری کردی ہے اوس وچ منڈھلا فرق ایہ ہے کہ اوہ ہر حالت وچ پیار کرن دی کھچھاتے امید جگائی رکھدی ہے۔ اوہ رومانچک استگیاں نال بھر پور ہے۔ اوس وچ اک اجیہا انتر درودھ ہے جو کہ بھاوک پدھرتے اندرونی طاقت پیدا کردا ہے۔ بھاوک اتے اندرونی طاقت دا ایہ انتر درودھ ہی امرتا پریم دے ناری جبر تری تازگی نوں دی برقرار رکھدا ہے۔

ایس پرکار وشے کچھوں اپنے منڈھلے ناولاں وچوں امرتا پریم ناری بارے لکھدیاں اوس دے اخلاقی مسئلیاں اتے عورت نوں داسی بناؤن والیاں قسمتاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں شروع ہو کے سماجک مسئلیاں اتے بورژوا سماج دے ریتی رواجاں دی آلوچنا تک پہنچ جاندی ہے۔

اپنے اگلے ناولاں 'چک نمبردار' آدے وچ لیکھ کھانے شان، سویمان اتے آتم بڑ بھرتا دے کچھوں سبھتوں پر تھ ناری جبر تری لیکھے ہن۔ اوس نوں اپنے پاتراں دے آپسی رشتیاں وچ سبھتوں سوکھم اتے ڈونگھے احساس دا بیان کرن وچ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ایہ ناول انسانی ہوند، سچ اتے پریم دے سوشل بارے ڈونگھی سوچ دے احساس وی کرداؤندے ہن۔

امرتا پریم دی سبھتوں وڈی خوبی ایہ ہے کہ اوہ صد انوکھی فیلٹی دی بھال وچ رہندی ہے، جس نال اوس دے رچنا تمک ڈھنگ ہمیشہ نویں انش ویکھن نوں ملدے ہن۔ جیکر ڈاکٹر دیو اتے 'اک سوال' وچ دکھانک پہلو اگر بھوی اوپر ہن تاں 'ناگ منی' دھرتی ساگر تے سدھیاں وچ اوس نے ناول سز چنا وچ تبدیلی لیاہندی ہے۔ ایس دے ناولاں دی ویشیٹا ایہ ہے کہ لیکھ کھانے پڑچول نوں بعد وچ ہو کر گہرائی نال استعمال کر کے امرتا پریم اپنی ناولی کلا وچ لگا تار دکاس کردی ہے۔

’ایریل‘، جب کترے آدے ناولاں راہیں لیکھکا دی ناولی رچنا اندر آ رہی پر پکٹا صاف نظر آؤندی ہے۔ لیہناں ناولاں وچ نو جواناں دے جیون درشن وچ امرتا پریم دی، اوہناں نوں اتے اوہناں دیاں مصیبتاں نوں سمجھن دی کوشش دسدی ہے۔ لیکھکا دو پڑھیاں وچکار پئے پاڑے دے کارناں داوتھار کردی ہے اتے اوہناں دے آپسی سمبھاں وچکار آؤندیاں مشکلاں نوں بیان کردی ہے۔ سونا دی کہانی ایس دا پھل اُدھارن کہی جاسکدی ہے۔

امرتا پریم بھارتی بُرجیا سماج، جس وچ نفعے اتے نقدی دے سدھانت، انسانی قدراں اتے ضمیر توں زیادہ ضروری بن نوں تہدی ہے۔ لیکھکا ایہ درس آؤن دی کوشش کردی ہے کہ پوئجی وادی سماج دے پرانے کشور سدھانت اتے نویں زندگی وچ اک وڈا اتے ڈونگھا پاڑا ہے۔ سماج ’جب کترے‘ ناول دے مکھ پاتر کپل ورگے ایماندار، نویں زندگی دے چاہوان نو جواناں اتے سونا درگیاں گویاں نوں سوے کار دا نہیں ہے۔

ایس پرکار غورت لئی اک سنتر اتے سوے زبھر سوچ نوں اُلیکن والے نگار ویشیاں دی وکھن پیش کاری وچ امرتا پریم دی نوٹھکی توں وکاس شیلی ناولی کلا داوی بھرپور یوگدان ہے۔ اوس دے ناولاں وچ اوس دی ناولی کلا وچ بوریاں گاتار وکاس دی نظر آؤندا ہے۔ اوس دی پراپتی ایس گل وچ ہے کہ اوہ نویاں گھٹی جگتاں دی ورتوں سکوچ نہیں کردی ہے سگوں اپنیاں رچناواں وچ نویں قسم دے تجربے کردی ہوئی نویاں ناولی ودھیاں نوں وی ابھاردی ہے، جہناں دا پنجابی ناول ساہت دے وکاس وچ وی محتو پورن یوگدان رہیا ہے۔ ’جب کترے‘ اتے جلاوطن وچ اوہ ناولی سے وچ، بھوکھ اتے پیچھو کن داہیر پھیر کر دے ناول دی گہرائی نوں ودھاؤن اتے اوس وچ پیش کیجے گئے اصلی سوالاں نوں ابھارن وچ پھل ہندی نظر آؤندی ہے۔

ایس طراں ایس دیکھدے ہاں کہ امرتا پریم جدوں اپنا ناولی سفر شروع کردی ہے اوہوں توں لے کے اپنے پتلے ناول تک وٹے اتے کلا پکھوں وکاس کردی نظر آؤندی ہے۔ اوس دیاں ناولی سرچناواں کچے پنجابی ناول ساہت جگت دے وکاس وچ ویشیش یوگدان پاؤندیاں بن۔ پنجابی ناول ساہت نوں نویں دیسہدے ملن لئی پریت کرن اتے وکاس دی نویں لیہے توں وچ امرتا پریم دا ویشیش یوگدان ہے، جو پنجابی ناول ساہت جگت وچ ہی نہیں سگوں کچے بھارتی ساہت جگت وچ اوس دا سماجک ستھان بناؤندا ہے۔ امرتا پریم دا ساہت یوگدان ہمیشہ ساہت جگت نوں نظر آؤندا رہے گا۔ (پہلی انتر: قمر الزمان)

## امرتا پر یتیم دا کاوشاستر

امرتا پر یتیم دیاں کاوشاستر اتے کاوشلیپ دیاں کفیاں گلاں تاں اوس دے کاووکاس نوں  
دیکھدیاں ہی سپشٹ ہو گئیاں بن پر فروی اوہدے کاوشاستر نوں کچھ دکھراو چار لیتا چاہیدا ہے۔ ایہ کردیاں  
ضروری نہیں کاوشاستر دے پر تمانان ول دھیان دتا جاوے۔ سگوں سرچنا تک چیتنا نال اوس دے اپنے کاو  
اتے کاو سمبندھی کتھناں چوں اوس دے کاوشاستر ول سکیت کرنا بن دا ہے۔ کوئی وی کوی اوس سدھائیک لہجہ  
وچ پر پیرک کاوشاستر جاں اوس دے سدھائتاں نال سمبندھت نہیں وی ہندا۔ کوی دا اپنی کوتا وچ کاوشاستری  
انداز ایوں ہندا ہے:

اک دردی

جو سگریٹ دی طرح

میں چپ چاپ بیٹھا ہے

صرف کچھ نظماں بن

جو سگریٹ دے تالوں

میں راکھ وانگن جھاڑیاں

ایہ درد تے نظماں دارا کھوانگ جھاڑنا اوہ جن بن۔ جہناں نال ایہناں کوتاواں دی وومی دی گل  
جاں تھمک کیندر جوڑیا ہو یا ہے۔ ایسے نوں امرتا اک لمبی گر بن گاتھا دے مٹھک پرتیک راہیں پیش کردی  
ہے:

درد دے کئے رنگ بندے بن تے ایہناں نوں

دھارن کرن والا رب جانے کئے رنگ جھلدا ہے

تے کہنے دیو تے جملہ اہے.....

کہہ سکدی ہاں کہ میں آج تک جو دی لکھیا ہے،  
اوہ اک لمبی گرہن گاتھا ہے۔

(کاغذ تے کینوس)

اس دردنوں امرتا اپنا کاو و شواں بناؤندی ہے۔ اس دی کوتا وچ ایس دے دو کچھ ہن۔ اک کچھ  
عشق نال سمبندھت ہے، جس دی آواز اس دا کاو ہے تے اس کاوتوں اس کا وچ تڑپ وی اوے عشق کارن  
ہے۔ اس دیاں ایہ سطران اچھے کچھنوں ہی پرگٹ کردیاں ہن:

۱۔ عمر بھر دا عشق

بے آواز ہے

ہر میر انغمہ

میری آواز ہے

حرف میرے ترف اٹھدے

ہن ایویں

سلگدے ہن رات بھر

تارے جویں۔

۲۔ گیت میرے! کر دے میرے

عشق و اقرضہ ادا۔

تیری ہر اک سطر چوں

آوے زمانے دی صدا۔

میری صحبت دے چراغ!

ایہ سیاہیاں بدل دے۔

گیت میرے خون دے!

ایزار شاہیاں بدلہ ہے۔

(سنہیڑے)

اوہ کاوتوں اک خط دے روپا کار نال، اوس دے سندیش نال سمبندھت کردی ہے۔ اوس نے  
اپنیاں کئی کوتا داں خط دے وانگ ہی لکھیاں، کتے کسے خط دے لکھے لکھے شیداں دا اُتروی دتا۔ اوس نے کاو  
شاستری چیتنا نال آکھیا:

ہر میر انغمہ جویں میں  
خط کوئی لکھدی رہی۔  
حیران ہاں اک سٹروی  
تیرے تک سجدی نہیں۔

(سنہیڑے)

کوتا دے اتہاس نوں اوہ عشق دی اس پیڑا دے اتہاس نال سمبندھت کردی ہے۔ اس پیڑا دے  
اتہاس دی اوس نے اپنی کوتا وچ بار بار گل کہتی ہے تے ہن وی اوس نوں آدرش عشق دی پیڑا اوویں لگدی ہے۔  
کوتا اس پیڑا نوں پیش کردی ہے:

ڈاچی سے دی اے جے نکھیر دیندی  
کسی اے وی پنوں دا کھرا بھالے۔  
دوویں اثیاں حسن دال پیندا  
ہتھ تیساتے اے وی پیر چھالے۔  
کٹھا عشق جو چھری اٹھری تون  
رت اوس دی سدی پئی حالے۔  
کافی سے دی سدا ہی رہی لکھدی  
خونی پترے پیاردی پیڑا والے۔

(سنہیڑے)

اتھے ہی درد والے کاو وٹھو اس دادو چا کچھ اکھڑنا شروع ہندا ہے۔ جتھے اوہ عشق نوں لوکاٹی تے



اتہاس دی تراسدی نال سمبندھت کر لیندی ہے۔ اس واسدھا پر گنا امرتا نے 'میں تواریخ ہاں ہندوی' اتے ہو رکھی کوتاواں وچ کھتا۔ دلاں دا بھیت وچ پر حیرکا تمک روپ وچ ماں۔ دھی سواد ہے۔ ماں دی پنجاب دی تواریخ ہے تے دھی سے دی جوانی۔ ماں دے بولاں وچ اوس تراسدی دا اُلکھ ہے۔ اوس حرف دی پہچان دی ہے:

بکھر، عشق لوکا ئی دا،

اوکھا حرف پچھانا،

اوکھاناؤں لکھانا۔

(اشوکا چیتی)

اس لمی کوتا وچ فرید، نایک، شاہ حسین، بیٹھے شاہ، وارث، ہاشم، شاہ محمد تے ہوو شاعراں نے اپنے کا وچ پنجاب دی بیڑ کوں پچھاتی اس دانر یکھن ہے۔ کوتا دی جھو جی ذمے داری جاں چیتنا بن دی ہے۔ امرتا اس دا اُلکھ کردی ہے۔ کوتا چراغ کوں بالدی ہے، اوس بارے آکھدی ہے:

وارث دیوا ہالیا

چانن اٹھے جاگ۔

جوت جگایا جوت نوں

راہیں بے چراغ۔

اوہیو صدی اٹھارویں

ہاشم آیاوت۔

عشق سو غاتان دتیاں

پچھی آتش کھست.....

(اشوکا چیتی)

جدوں اوہ اُج آکھاں وارث شاہ نوں وچ وارث نوں پنجاب دے سمہیا چارک نایک دے طور تے آواز ماردی ہے تاں ایہ اوس دے کا ووشواساں دا ہی اظہار تے اوس دی ورثی ہے۔ ایوں امرتا نے اپنے کا ووشاسترنوں اپنے کا دیتناں تے کا واتہاس دے اس نہیکھن راہیں پر گنا یا۔

اس نال سمبندھت ہو رگلاں پر گناؤن توں پہلاں اوس دی وار تک وچوں اوہناں کجھ کتھناں داو شلیشن کیتا جا سکدا ہے، جہناں داسدھا سمبندھ، اوس ے کاوشاستر، کاو پر یوجن، کاو پر ورتی جاں کاو وودھی نال بن دا ہے۔  
 'سورج نوشی- چندر نوشی وچ اوس نے لکھیا:

"میں صحیح ارتھاں وچ لیکھک اوس نوں سن دی ہاں۔ جہدی قلم سیاہ دور دی چچ ہووے۔"  
 'میں تواریخ ہاں ہندی ایہو جی سیاہ دور دی اک چچ ہی سی۔

امرتا نے اپنیاں تقریراں وچ کاو تے ساہت دے مسلیاں، ودھیاں آد بارے اکثر گلاں کیتیاں۔ اک دار آکھیا:

"رچنا زندگی دی آلو چنا ہندی ہے۔ زندگی دی کلپنا ولوں کیتی گئی، زندگی دے تھار تھ دی آلو چنا، زندگی دی سرتھا دی آلو چنا۔ پر اس آلو چنا داسن اوووں دیکھیا جاسکدا ہے، جدوں ایہ احساس دی شدت، سوچ دی ڈونگھائی تے بیان دے انداز والے پورے تخلیقی عمل وچ گزر کے سامنے آؤندی ہے۔"

ایہ گلاں کاو دے پریماناں بارے من تے پوری آلو چنا محکم تے کاو- شاستری چیتنا نال آکھیاں مکھیاں بن۔

اوہ اپنی اک ہو ر تقریر وچ- تھار تھ پنٹن، پرگتی شلیٹا نوں پر بھاشت کردی ہے:  
 "جویں پھل دا دھرم خشبو ہے۔ لیکھک دا دھرم پنٹن ہے۔ اوہ کسے دی کال وچ ہووے، تھار تھ جو ہے تے۔ تھار تھ جو ہونا چاہیدا ہے، جو اوہ فرق جان دا ہے تاں میری نظر وچ اوہ پرگتی شیل لیکھک ہے۔"

ایوں امرتا اوس کاو وچ وشواس رکھدی ہے، جس وچ ایہ کچھ سنیوکت ہو جان دے من۔ ایہو ہی اوہ درودا جمن پر بھاشت ہندا ہے، جس دی گل اسیں ارنہ وچ کیتی سی۔ اوہ قلم، اکھرتے ادب دی تاریخ بارے اس سنیوکت چیتنا دے انداز وچ اک ہو ر تقریر وچ آکھیا:

"جہناں نے وی تھ وچ قلم لئی تے قلم دی اکھ وچ بھرا آئے اتھرو نوں دیکھیا تے فیر ہر اتھرو نوں اکھر بنادتا، اوہناں تھناں داوردتے اوہناں دا حاصل ادب دی تاریخ بن دا ہے۔"

اوس دی ایہ چیتنا ہی ڈوٹھی طرح اوس دی کوتا دی جگت جاں چہن پر بندھ نال جڑی بندی ہے۔  
 اوس دی کوتا تے تن تن چہناں رات، نہناتے سورج نوں ویشیش طور تے دھیان وچ رکھیا جاسکدا ہے کیونکہ ایہ  
 چہن وچاردھارک طور تے انتر سمبندھت ہو جاندا ہے بن۔ اوس دی کوتا دی چہن کاری نوں اک ہو چہن  
 ”چیترا“ توں بنا ہی نہیں سمجھیا جاسکدا۔ ”چیترا“ اوس لئی ویشیش مہتو ہے تے اوس دی لکھت وچ بھتوں ودھ ”چیترا“  
 دا ذکر کیتا گیا ہے۔ اوس نوں چیترا بارے اپنے کاونوں اک وکھری پستک وچ ”چیترا نامہ“ نام دی دتا۔ ایہ چہن  
 اوس دی کوتا دے چیرا اڈائیم دی پہچان کردا دیندا ہے بن۔ ”کافد تے کینوس“ دے ارنہ وچ اس دا مذہلا  
 منو دیا تک بندو وی ملدا ہے۔ اوس نے چہن دی اک نہن ستمتی بارے لکھیا ہے:

”رات انج لکدی سی کہ منیرے دا دریا وگدا پیا ہے، میں اس کنڈھے اتے ہاں تے  
 سورج کتے دریا دے اوس پار چلا گیا ہے، پتا نہیں کتھے تے میں اسجھے ہی کھلوتی رہ  
 جاواں گی اکدے اوس گھر نہیں جاسکاں گی۔“

ایہ گل امرتا دی کوتا وچ اک تلاش بن جاندی ہے۔ ایہ چہن اوس دی کوتا دے کیندری چہن بن  
 دے بن۔ ایہناں دا انتر سمبندھ کوں ستمپت ہندا ہے، ایہ دیکھن لئی اوس دی کوتا وچون کجھ کوادھرناں لئیاں  
 جاسکدیاں بن:

رات

۱۔ دل دے ویہڑے رات پئے گئی

ایس داغ نوں سنج سکھاواں

۲۔ اج دی رات تاریاں بھنی،

جناں چانن ورشی اوئی۔

۳۔ ایہ کس طرح دی رات سی

ایہ کس طرح دی بات ہے۔

۴۔ رات دا انا بھا کہون جان لگاسی

۵۔ رات کڑی دی جھولی پاؤ

چنا چن گری دا کھوپا۔

سُہنا

- ۱۔ فیر چنبا سپیاں دا  
رات بھر کھڑا رہیا۔
- ۲۔ سِنے دا اک تھان اُنا یا،  
گزر کو کپڑا پاڑ لیا۔
- ۳۔ نیندر نے جیوں اتھاں دے وچ  
سِنے دا اک کولا پھڑیا۔
- ۴۔ اک دیہاڑے سِنّا تیرا  
ڈٹھا من وے پا سے جاندا
- ۵۔ ایس گمروی سِنے آؤندے  
کنیاں وی سوچاں نوں بھیرے۔

سورج

- ۱۔ سورج نے کجھ آٹھر کے  
اج چان وی اک باری کھولی
- ۲۔ میں روز سورج جِسم دی  
تے روز سورج قیم ہندا ہے۔
- ۳۔ جدی پشتی اک پنکھوڑا  
سورج پیا رات دی لکھے۔
- ۴۔ سورج دے نال جھکے وچ  
ایہ سورج کسے اُنا ہے۔
- ۵۔ سورج دا اک کولا لے کے  
لیکاں پاوے فیر بجھاوے۔

ایہناں چہناں بارے امرت نے اپنی وار تک وچ وی کئی وار ذکر کیتا۔ اپنے اک بھندھ سورج تے

سیال دے حوالے نال اوس نے لکھیا:

”سورج دے ڈبن نال میرا کجھ روز ڈبدا ہے تے ایہدے مڑا سمانے چڑھن نال، میرا کجھ روزا سمانے چڑھدا ہے۔ رات میرے لئی ہمیشہ ہنیرے دی اک جھناں دا لنگ رہی ہے جھوں روزا اس لئی ترنا ہندا ہے کہ اوس دے پر لے پار سورج ہے۔“

”سورج دا ذکر مڑ مڑ کے میریاں نظراں وچ آؤندار ہیا۔“

(رسیدی ٹکٹ)

سپیاں ہارے امرتانے بے شمار لکھیا ہے۔ ’لال دھاگے دار شتہ وچ اوس نے 1988 تک دے اپنے سپنے ہی بیان کیے ہن۔ ’میں تینوں فیڑ ملاں کی دیاں کوتاواں سپن جکت وچ پھیلیاں ہندیاں ہن۔ کئی وار راتاں پنناتے ہوڑ جھن گھلے ملے اوس دے اوچھتن دی اوتھانوں کاو بھاشاوا لنگ بمبت کردے ہن:

”اک وار رات نوں مہاں بھارت پڑھدی پڑھدی سو نہ گئی سپنے وچ دیکھیا اک کبوتر اڈا آیتے اوہنے میری جھولی وچ پناہ لے لئی۔ دیکھیا، اوہدے پچھے اڈا ہازوی سی۔ تے اوہ میرے کولوں اوس کبوتر نوں منگ رہیا سی۔ کبوتر اپنی جان دی حفاظت منگدا گھٹ کے میرے نال لگا ہویا سی کہ باز نے مینوں آکھیا، ”جے کبوتر نہیں دینا تاں ایہدی تھاویں اپنے پنڈے داماس تول کے دے دے۔ میں اپنے پنڈے نالوں ماس لاہ کے اوہدے وزن دا تولنا چاہیا، پر کبوتر ہوڑ بھارا ہندا گیا، ہوڑ بھارا، اینا کہ میں ساری دی ساری اوہدی تھاویں مرن لئی تیار ہو گئی.... اک ہاسا کناں وچ گونجیا، تے نال ہی میرے پنڈے وچ ایہ احساس ہو یا کہ ایہ کبوتر میری قلم دا پرتیک ہے تے اک مخالفت نہ ہوں جانوں مار دین لئی ایہدے پچھے پچی ہوئی ہے....“

(رسیدی ٹکٹ)

ایوں ایہ چمن امرتا دی کوتا تے دار تک وچ کیول گھلے ملے ہی نہیں، سگوں دو تاں نوں وی اتھر سمبندھت کردیندے ہن۔

ایوں ہی چتر دا چمن اوس دیاں لکھتاں وچ رچیا مچا ہے۔ چتر دا مہتا اوس دی کوتا وچ کوئیں تے کیوں ہے، اس بارے امر تانے لکھیا:

”ساحر نوں ملن توں پہلاں میری زندگی وچ صرف خلا ہی۔ خلا نوں کسے تھہ وار جاں رت نال نہیں جوڑیا جاسکدا پر ساحر جدوں ملیا، اوہ چتر دا مہینہ سی۔ پہلی داروی تے اکوں اک کر شے وانگ، کئی وار۔

اوہ دے پہلے میل۔ ایلے میری عمر مساں دیہاں اکیاں ورھیاں دی سی۔ دیوانگی دا عالم اوہوں وی دیکھیا سی پر جدوں میری محبت نوں دیوانگی دی سکھر چھوئی، اوہ 1953 دے چتر وچ ہويا۔ اوہ ا میل سی۔ اس میل وچوں میں ’سلیہڑے‘ کتاب دیاں ساریاں نظماں لکھیاں (سوائے اک نظم توں) اس لئی ’سلیہڑے‘ بھادیں 1955 وچ چھپی سی پر اوہ دے مڈھلے صفحے اتے 1953 دے ناں لکھیا ہويا سی۔

کئی چتر اوہ وی آئے جدوں اوہ ا میل نہیں ہويا پر انج جوئیں چتر دے مہینے چتر نہ آیا ہووے۔ نظماں ہر چتر وچ لکھیاں تے فیر ہر لکھن کال۔ میرے لئی چتر ہو گیا۔ اسے لئی اج اوہناں ساریاں نظماں نوں جو میری محبت دی دیوانگی ہن، چتر نامہ وی کہہ سکدی ہاں۔“

(میں جمع توں)

ایوں امر تادی کوتا وچ چتر اک چمن لہچنک وانگ پھیل دا ہے تے اوس دی کوتا وی کجی چمنکاری وچ اس داوشیش مہتا بن جاندا ہے۔ کجھ ادا ہر ناں:

۱۔ چتر نے پاسا موڑیا

رنگاں دے میلے واسطے پھلاں نے ریشم جوڑیا،

توں نہیں آیا.....

۲۔ چتر دا ونجارا آیا

پنگی موڑھے چاکی وے۔

اسیں دہا جھی پیار کتھوری  
وہندی رہی لوکائی دے۔

۳۔ پنجاں اتے ہے ویہ سو پنج سمیت  
چڑھیا چتر مینے تے ہوئی ناویں؟  
ہتھیں اپنی لکھے سنہڑے میں،  
ہتھیں اپنی آپ وصول پاویں۔

۴۔ چتر نے بوہا کھڑکایا  
اج دا گیت اس طرح بنایا۔

۵۔ دھیاں لے کے چتر آیا  
کھی اکھڑ میں دی پھڑکی۔

۶۔ اک چتر دی پنیاں سی  
کہ چنا دودھ میرے عشق دا گھوڑا  
دیاں تے بدیاں نوں گا بن تو ریا۔

(چتر نامہ)

امرتا نے محبت نال جڑیاں اپنیاں کجیاں کوتاواں نوں چتر نامہ آکھیا، اس لئی چتر دا پھنگ اوہناں  
ساریاں کوتاواں دے انگ سنگ ہے۔

ایہ چمن لہجنگ پھیل دے تے ارتھیاں دیاں بہو دشاواں ول سنگیت کر دے ہن۔ امرتا دا کاو  
شاستر اس چمنکی سر تھا دے دشاواں نال جڑیا ہویا ہے۔ ایہ چمن پر بندھ اوس دا سندیش بن دا ہے۔ اوہ  
آکھدی ہے:

نویں رت دا کوئی سندیش دیوا  
ایس کافی دی لاج نوں پالناوے۔

(سنہڑے)

تاں اس سندیش دج چمنکی طور تے رات توں لے کے پر بھات دے سورج تک سپیاں چوں

لٹھدیاں اک یا ترا ہے۔ اسے لٹی کئی وار اوہ اس چمن پر بندھ دے اوس سندیش نال جڑ دیاں اکٹھی گل کردی ہے:

رات ہے کالی بڑی

عمر اس کے نے ہالیاں؛

جن سورج کہے دیوے

اے دی جگہ ے نہیں۔

اس دے نال ہی امرتا لئی سرتھ کو تا دی ٹھکتی سنتر تا دا احساس دین وچ ہے۔ اس نے 'رسیدی ٹکٹ'

لکھیا:

”اگ دی بات ہے، توں ہی ایہ بات پائی سی۔“ لکھ کے چاپا کہ بن چوداں ورھیاں دا

بن واس بھگت کے سنتر ہاں۔“

ایوں امرتا دا کاوشا ستر اوس درد توں لے کے اس سنتر تا دے احساس تک مہمیلیا ہویا ہے تے اوس

دی کو تا دا چمن پر بندھ اس کا وپیرا ڈانم دا ہی پر گٹا ہے۔

☆☆☆☆



## جان پچھان

خیال دے راہ! لیکن لکیاں ساڈے پیچے دیاں کنیاں کئی بے پاک ہتھ کھچدے نیں، اندروں بے دس ہو کے باہر آجان والے کئے ای منہ زور جذبے ساڈی سوچ نوں کجھلاں پاوندے نیں تے کدھروں کوئی ازلی ایل آکے ساڈی زبان دی پھر کی بھوان لگ چندی اے۔ ساڈی قلم دی قلم سانجھ کھلوندا اے۔ انج ساڈیاں نظراں ساہنے آؤن والی ہر شے غلافی جاندی اے۔ بہر وپ بھر لیندی اے۔ ساڈے دل دا رنگ ساڈیاں اکھاں وچ آجاندا اے تے سانوں نظر حوالے سادیاں تصویراں وچ من بھاؤندے رنگ اکھڑدے جا پدے نیں۔ انج جے اپنا آپ دکھ رکھ کے دیکھنے تے خورے سانوں خدا دی اپنی محنت کیتی اکارت جا پے۔ او بنے تاں اپنی خدائی دی عینہ ای جذبیاں اتے اساری اے۔

ایس ویلے جد میں اپنے اک ساتھی بارے لکھ رہیاں میرے دماغ وچ آن سنے جذبیاں دیاں تیز نو ہندراں ڈونکھیاں اتر رہیاں نیں۔ میں سچ واسوچ قائم رکھن واسطے ایس توں بناں ہو رکھ نہیں کر سکدا جے اونوں جیویں میں آپ دیکھیا اے۔ انجے ای تہانوں وی دکھا..... میں ایس گلوں ڈرناں کدھرے تہانوں میری جھولی وچ پھل ای پھل نہ دن۔ میں مٹاں میری گلجیں نظر ایس سدا بہار باغ دے پھلاں تیکر ای جا کے رہ گئی اے پر خورے تسی کندے وی دیکھ لوؤ۔ میں پھل چن کے تہاڈے اگے ڈھیر کر دیاں گا..... تہانوں پھل چنگے لگدے نیں تے بھجے بھجے چدے گوہڑے پھل چک لیا جے، تے جیکر کنڈے چن دے اتے تکھیاں نوکاں والے کنڈے دیکھ بھال لیا جے۔ پر ایہناں پھلاں نالے جے کنڈے چن تے اونے ای جے پھلاں نال سو ہندے نیں۔

امرتا پریم انسانی احساس دا موقلم اپنے اتمروؤاں نال بھیوں کے لوک پیڑ دے نازک نقش ابھاردی اے۔ آدم وی اولاد دے دکھاں دیاں ایہناں تصویراں وچ اوہ اپنے درد مند دل دے خون نال رنگ بھردی

اے اتے درد رنجانی انسانیت دیاں ایہناں بے زبان مورتیاں نوں صدا اندازی دے جادو تالی مونہوں بولن دا اذن دیندی اے۔ ایہہ جادو گری سمدھی سانویں دلوں اٹھ دی اے تے سنن والیاں دے دلاں وچ اتر جاندی اے۔ احساس دل نزول سچائی ای امرتا پریتم دی بلاری وچ اثر دا شہد گھولدی اے۔ جگ بیتیاں نوں اوہ انج ہڈ ورتیاں دی رنگن وچ رنگدی اے جے ہر کسے دے اپنے الہڑے گھاؤ چھو پے جاندے نیں تے اوہ خلقت دیاں دکھاں دے قصے سن کے اپنے ہاڑے کرن لگ پیندا اے..... وچھوڑے دی آگ، پیار دی سک، ادھائیوں ٹٹ کے ڈگن واسلبہ، دنیا دے دکھ، اپنیاں دا بیگانہ پن، بھکھ، غریبی، غلامی تے انسان دا انسان تے ظلم مذہد قدیم توں ہر زبان دی شاعری دے مضمون نیں۔ پرزریاں لفظاں دے الٹ پھری نال کلام وچ اثر پیدا نہیں ہندا تے ایسے کر کے گرامر دے ٹٹ تے شاعری کرن والیاں دے بول سنن والیاں دے کناں دیاں پردیاں نال گمراہ کے پرت اوہدے رہے نیں۔

دل تیکر اپڑن داراہ اوہناں نوں نہیں لبھا۔ جس جذبے نوں کہن والے نے آپ تہہ تیکر محسوس نہیں کیتا اوہدا اندر لا حال اوہ دو جیاں نوں کیویں دس سکدا اے۔ امرتا پریتم نوں جدوں کوئی اظہار دا سوالی جذبہ اپنے دل وچ چنگر دا جا پدا اے تے دو جیاں ساہنے لیاؤن توں پہلاں اوہنوں رنج رنج کے محسوس دی اے۔ اک نظم ”بابا“ بارے میں آپ جانتاں جے اوہ امرتا نے کنیاں پہراں دی انگباری دے بعد لکھی سی تے لکھن ویلے اوہنوں ایس کر کے گھڑی گھڑی رکنا چنیدا سی جے اتھر وچھمن وچ نہیں سن اوہدے۔ احساس دی ایس شدت نال دلاں تے ٹوٹنے کرنا بہتا اوکھا نہیں ہندا۔

امرتا پریتم دے احساس دی صداقت نے ای اج اوہنوں ہندوستان تے پاکستان وچ پنجابی شاعراں دی صف وچ سبھ توں اگے لیا کھلوا یا اے۔ ایہناں دوہاں ملکاں نے اپنے آپ دے سیاسی جھگڑے چھوڑے بھل کے ایہہ سانجھانیاں دے دتا اے جے امرتا پریتم ایس ویلے دی عظیم پنجابی شاعرہ اے۔ اج پاکستان وچ پنجابی بولن والے اوہدے کلام نوں اوہے شوق تے عقیدت نال پڑھدے تے سندے نیں جیویں ہندوستان دے پنجابی اپنی بولی دی سبھ توں ودھ دل فسون والی شاعری دامن کردے نیں۔ امرتا دی اک نظم ”اج آکھاں وارث شاہ نوں“ پاکستان وچ اپنی تھانویں چھپی تے ترجمہ ہوئی اے جے ایس ویس دی ادبی تاریخ وچ کسے دو جے ملک دے لکھاری دی اپنی مقبولیت دی کوئی ہو مثال نہیں مل سکدی۔ پاکستانی پنجاب دے ادبی رسالیاں وچ کسے ملکی پنجابی شاعر توں ودھ ایس شاعر دا کلام چھپدا اے تے بڑے چا نال پڑھیا جاندا

جیہناں دیساں وچ پنجابی بولی نہیں سمجھی جاندی اوتھے لفظاں دا جادو اثر نہیں کردا، ایس کر کے چونویاں اکھراں دے جوڑ نال اساری ہوئی شاعری اوپری زبان وچ ڈھل کے اپنا اثر گم کر دیندی اے۔ امرتا دی شاعری ایس کٹھالیوں وی کندن ہو کے نکلی اے۔ امرتا دیاں نظماں اینکاں ویری انگریزی وچ چھپ چکیاں نیں تے اوہدی شاعری بارے کئی مضمون انگریزی اخباراں رسالیاں وچ نکل چکے نیں۔ ایہناں ترجیاں وچ اوہدے شعراں دا سوچ نکھریا اے تے اوہناں دے اثر وچ رتا روالی فرق نہیں پیا۔ پنجابی ادب دے منے پر منے نقاد پرنس سنگھ نے امرتا پر یتیم دی شاعری بارے برے سلجھے انداز وچ انگریزی اخباراں ”ٹائمز آف انڈیا“ تے ”سٹیشینر“ وچ مضمون لکھے نیں۔ ایسے لکھاری نے امرتا پر یتیم دی اک نظم ”مجبور“ ترجمہ کر کے ”الشرفیڈ ویلکی آف انڈیا“ وچ چھپوائی اے۔ اک ہور نظم ”حق“ دی انگریزی تے مرہٹی وچ ترجمہ ہو کے چھپی اے تے ایہناں ترجیاں نے اوہدا ردپ سوایا کر دتا اے۔

اچ توں اٹھاراں ورہے پہلوں امرتا نے اپنا پہلا نظماں دا مجموعہ چھاپیا ”امرت لہراں“ نوں پڑھ کے پنجابی دے نقاداں نے ایس زبان دی شاعری دے اسماں تے اک نویں تارے دے ابھرن دی پیش گوئی کیتی۔ ایہہ کتاب اوس ویلے لکھی گئی سی جدوں روائتاں دے پرچھاویاں اوہدی سوچ دے آلے دوالے اپنیاں چھانواں کیتیاں ہونیاں سن۔ اوہنے اپنیاں رنگھاں، اپنیاں اڈاریاں اپنے توں دڈیاں تے اپنے توں سیانیاں دے سپرد کر چھڈیاں سن۔ اوہ ایہناں دڈیریاں دی اکھیں دھندلی تے اوہناں دے دے ہوئے راہواں تے ٹروی۔ ایسے کر کے ایہہ شاعری اوہدی اپنی محسوس کیتی ہوئی سوچ توں زیادہ اوہدے نالوں دڈیاں، اوہدے نالوں سیانیاں اتے واپری ہوئی کہانی اے۔

اوہدی دوجی نظماں دی کتاب ”جیوندا جیون“ پہلے مجموعے توں تن سال بعد چھپی۔ ایہدے وچ اوہنے دسی پنکھی توں دکھ ہو کے اپنی ورتی لکھن دا جتن کیتا۔ ایس مجموعے وچ پہلے دو دریاں بتاں نوں توڑن دا راہ دسد اے تے لیہہ توں ہٹ کے اپنے راہ چلن دی خواہش جاگ دی معلوم ہوندی اے۔ پراسے اوہدے ساہنے کوئی نواں راہ نہیں سی کھلیاں، جیہڑا اوہنوں سوچ دی نویں منزل دل لے جاندا۔ ایس کر کے اوہ اعتماد تے بے خونی ایہناں حرفاں وچ نہیں جیہڑی اپنا راہ آپ بتان والیاں دے ہوٹھاں اتے آئے ہوئے بولاں وچ ہندی اے۔ امرتا اوس تھاں نوں آن اپڑی سی جدوں اگاں دھن دی تانگھ وی ہندی اے تے راہ دی اوکھیاں

داہول دی۔

”تریل دھوتے پھل“ لکھ کے امرتا نے روپ بارے اک نواں تجربہ کیتا۔ ایہہ ساری کھلی کوتیاسی تے ایہدے وچ پیار دی سک دے نال نال سیاسی تے مجلسی جکڑاؤ توں اکی ہوئی روح وی پئی کر لاندی سی۔ ایس کتاب وچ کھیاں تھانواں نے اپنی کلانوں اپن دی آس پئی دسدی سی تے خیال پہلاں توں نویں سن۔ ”او گیتاں والیا“ تے ”بدلیاں دے پلے وچ“ امرتا دی کلانکیری ہو گئی تے اوہدے خیال ڈونکھیرے ہو گئے۔ اوہدے جذبیان نوں جھبھاں لگ کھیاں تے اچیاں اڈاریاں دی ہوا اوہدے کھنہاں وچ بھر گئی۔ پھیر اوہنے ”بجھ دی لالی“ لکھی جیہدے بارے پنجابی دے منے پر دے لکھاری نوتج نے لکھیا ”پنجابی وچ کھلی کوتیایاں سوہنی کتے نیس ملدی۔ ایہدے وچ اے۔ امرتا پریم دی جادو بولی داحسوس ہون والا تھی“ ایہوں جیہناں پڑھیا اے اوہناں نوں نوتج دی تنقیدی ویانت اتے پورا یقین آ گیا اے۔

”لوک چیر“ لکھن نال امرتا دی شاعری اک نویں سنگھم تے آن پئی۔ اوہدے شعر دارک رک رک وگد اپنی چھلاں بن کے کنڈھیاں اتوں اچھالے لین لگ پیا۔ اوہدے بیان وچ دور درازیاں خیالی وارداتاں دا ذکر گھٹ گیا تے جیوندے جاگدے انساناں دی حیاتی دے دن تے محسوس ہون والے دکھاں اوہدی قلم دارخ اپنے دل پھیر دتا۔ اوہ زندگی دے بہت نیڑے آ گئی تے بدلاں دے اوہلیوں تپ دی تراس تراس کردی دھرتی اتے آن اتری۔ اوہدے کلام وچ سچائی داسارا سوچ سا گیا تے اوہنے رومان دی رنگین دنیا پچھے چھڈ کے لوک چیر دی ساٹھی وراثت نال اپنے شعراں داحسن ودھایا۔

وقت دے تقاضے نوں سمجھ کے اوہنے پیار تے سوچ دے دل لٹن والے مضمون پراں رکھ کے غریبی تے بھکھ دے کلیجہ منہ نوں لے آؤن والے تذکرے چھوہ دتے۔ اوہدے گیت اینکاں دکھیاں دی درد بھری پکار بن گئے تے اوہدی شاعری نے غریب نیکیں عوام دلوں موجودہ مجلسی نظام دے خلاف جنگ واعرہ بلند کیتا۔ پراچے اوہدے شاعر مزاج دل دی بیج توں رومان دی بیج پھولاں رانی تھلے نہیں سی لکھی۔ اوہنے ”پتھر مکیٹے“ لکھ کے لکھیاں بہاراں دیاں کھڑیاں کھلایاں پھلاں ول پرت کے جہات پائی تے اک واری پھیر دھرتی توں اچیاں فضاواں دیاں رنگینیاں اوہدا دل موہ لیا۔ اوہ پھیر لوکاں توں دور چلی گئی۔ اوہنے پھیر شاعری دے ازلی مضمون..... پیار دیاں کہانیاں چھوہ دتیاں تے شعر وچوں لوک چیر دی کرات کڈھ کے اوہنوں نغمے دا سوہنا روپ دتا۔

پیار دی کتھا امرتا دی شاعری وچ اپنی رچی ہوئی سی کہ جدوں تیکر کوئی دلاں وچ تر تھلی پان والا طوفان نہ اوندا اوہ ایہناں مٹھیاں سفلیاں نوں چھڈ نہیں سی سکدی۔ اوہ دے شعر نوں اک نویں حیاتی اک نویں لٹکار دین واسطے انسانی تاریخ واسطے توں کیمبر طوفان آیا۔ ملک دے بٹوارے دیاں پیراں تے پیر دھر دے نویں دکھ آئے تے نویاں سرحدیں دے آر پار چنداں لوہیاں گئیاں، دلاں نوں اوڑ دے روگ لگے تے سریر اپنے بھارتال دھرت تے آن ڈکے۔ اپنیاں بروہاں سی مٹی جم کے متھے نال لان واسطے انسان، جیہناں دیاں جڑاں دھرتی وچ رکھاں نالوں وی ڈھیر ڈنگھیاں سن، سارے بندھن توڑ کے اوپریاں دانیاں نوں ٹر گئے۔ (ایس انقلاب جیسے عام انساناں دے دل ہلا دتے۔

امرتا پریم دے وردی دل اتے ڈوہنگا سلھ لایا تے اوہنے ڈاڈھیاں دکھی ہو کے جو کجھ لکھیا اوہ پنجابی ادب وچ مدتاں تیکر منزل دے نشان دا حکم رکھے گا۔ اوہدی اک لمیں نظم ”انگلز“ آج آکھاں وارث شاہ نوں ”تاشیر وچ دنیا دی عظیم شاعری دے کلڑیاں نال رکھیا جاسکد اے۔ ساڈی بولی وچ شعری زبان توں ایہوں اپنی چیز آپ وارث شاہ دے کلام وچ وی کھوجیاں ای لہے گی۔ ایہہ دل توں نکلے ہوئے حرف دی دماغ وچ پالے ہوئے بیان اتے اک بڑی دڈی فتح اے۔ ایس دل دی غنی شاعرہ نے سانجھیاں دکھاں نوں ایس انداز وچ نظم داروپ دتا اے جے کوئی اکھ نہیں جیہڑی پڑھ کے دکھاں دیاں پانیاں وچ ڈب ڈب نہ جائے۔ سیں دی واگ نوں پچھان موڑ دیاں ہوئیاں آکھیاں اے۔

گلیوں نئے گیت، پھر  
ترکیوں نئی تند

ترنجنوں ٹٹیاں سہیلیاں،  
چمکڑے گھوکر بند

نئے بیج دے بیڑیاں،  
لڈن دتیاں روڑھ

سُنے ڈالیاں چٹکھ اُج  
پہلاں دِئی توڑ

دھرتی تے لہو دِیا  
قبراں پچھاں چوں

پریت دیاں شہزادیاں اُج  
وچ مزاراں رون

اُج سکھ قیدو بن گئے،  
حسن عشق دے چور

اُج کتھوں لیا ئے لہہ کے  
وارث شاہ اک ہور

اُج آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچوں بول  
تے اُج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

امرتا پریتم نے ایس خون روندی لوک پیڑ دی کہانی پنجاب دے گھراں وچ صدیاں توں سنایاں  
جان والیاں تھیاں دے انداز وچ کہیا اے۔ اوہنے ایس ادس کتھا وچ ایہدے اپنے اندر دے دکھ توں دودھ  
دین نہیں بھرے تے مڈھلے انسانی جذبیاں نوں لفظاں اگے سوا لی نہیں کیتا۔ ایہہ لکھاں ہدورتیاں دی اک جگ  
جیتی اپنی نرول سچائی، اپنے ٹھوس دکھاں تے سر پٹیاں وارداتاں سمیت امرتا دے قلم وچوں نکلی اے۔ اوہدی قلم  
نے کجھ چنیاں چھانیاں نہیں۔ بس ایس درداں بھری لمبی کہانی دا اثر پوری دیانت تال اپنے دل اتے محسوس کیتا

اے تے اپنے سچ مٹھے انداز وچ لوکاں نوں اوہناں دی اپنی آپ جی سائی اے۔ اگ تے خون دی ایس گل وچ کدھرے کوئی غصہ نہیں، کوئی گلہ نہیں، کسے نوں کوئی دوش نہیں دتا۔ ایس کرو دھتوں پاک دل دی آکھی دا اثر سکھناں نے قبول کیتا تے جتھے اوہ روئی او تھے ساریاں دے اتھر وگ پے۔ جتھے اوہنے ہاڑے پائے او تھے ساریاں دیاں ہوکیاں اوہدا ساتھ دتا۔ اوہنے اپنے درد مند دل دا دکھ لوکاں نوں وٹھیا تے اوہناں، پیار دے اک بول دے بھکھیاں اپنے دلوں اٹھے ہوئے غم اوہدے اگے بھینٹ کر دتے۔ ایہناں دکھیاں دے دلاں اتے نگاہ ہون کر کے امرتا دی شاعری وچ آگوں اون والے ویلے بارے کوئی دوسرہ نہیں، کوئی ہراس نہیں، اوہنوں انسان دی عظمت وچ پورا یقین اے تے اون والے روشن زمانے دی امید بھری اڈیک۔ اوہ آپ آکھدی ”جیوے پھیر منکھتا جیوے پھیر منکھ“ تے لوکاں دا دھرتی نال انج مل ورتن ہندا اے بھئی ”ایہہ دھرتی انج لوکاں جوگی۔ ایہہ لوکیں انج دھرتی جوگے“ پھیر کھیتیاں دی بھر پور جوانی دا گیت انج چھوہیا جاند اے۔

ہاڑی نیجی، سوئی نیجی

دوئی نیجی، چوئی نیجی

سز دا بلدا ہار گیا

تے ٹھنڈا ککر پوہ

کھیتاں دی بھر پور جوانی

میری بھکھ دی کرے کہانی

میری بھکھ دے گیت سناوے

پوے کلےجے کھوہ

پر انسان دی تقدیر سنوہر جان دا یقین اوہدی نکھائی وچوں جمبات پیا پاند اے۔ اک ہوہ نظم وچ

انسانیت اپنے عروج نوں اپڑ دی جا پدی اے۔



جاگے اج لوکائی دے حق جاگے  
اوہناں کھوہیاں دی سوہنہ کھا کے تے

”ساخجے حق تے دھرتیاں سانجھیاں نیں“  
تھلے کون ایس وار نوں آ کے تے

”کھیت لوگاں دے“ کھیتاں نے قسم کھا دی  
سٹے اُن دے ہتھاں وچ چا کے تے

رنداں آن وقادے قول دتے  
ساخجی یون دا جام اٹھا کے تے

امرتا پریم نے اظہار دیاں نویاں راہواں لبھن توں بچے اپنی شاعری دے ہڈ چلے سوتے سکھ نہیں  
دتے۔ پیار دی گل اج وی کسے مست الست وانگر جھمر پاندی اوہدے ہونٹھاں تے اوندی اے۔ کسے دی  
اڈیک، ملن دی سک، ہک داسیک تے پیار دے مضمون دی معاملہ بندی اوہ بڑے سوہنے طریقے نال بھاندی  
اے۔ ہن بھانویں امرتا دی شاعری داسارا جادو اوہدیاں ردمانی نظماں تے گیتاں وچ بھریا ہو یا نہیں پر پھیر  
وی ایس مقام تے آ کے اوہدی شاعری وچ اک مٹھاس، اک رنگینی، اک نغمہ بھر اوہدا اے تے سواں سوہنے  
لفظ اپنی بھاؤنی بحر وچ من موئی تاثیر لے کے اسٹیل اڈول لھے اوہدے نیں۔ امرتا دیاں تازیاں گیتاں وچ  
محبت دی واردات لوک پیڑے تے جاکدی اے۔ کیوں جے روایتی محبوب دے نال اوہنے کھیتاں دی رانی  
کنک نوں وی سولاں سنگار کر کے حسن دے مقابلے وچ لیا کھلویا اے تے شاعری دے معجزے نے اوہنوں  
ہور ناں سوہنیاں توں ودھ جاذب نظر بنا دتا اے۔ عشقیہ شاعری دیاں کجھ دنگیاں توں قسی ایس صنف وچ امرتا  
پریم دی مہارت دا اندازہ کر سکو گے۔ دل وچ پیارا ٹھن دا ذکر اے۔

قدماں نوں دو قدم ملے سن  
زمین نے سن لئی سوہ



پانی دے دے وچ تھل گئی ٹھنڈک  
خونناں وچ خشبو

دن دا چائن بھیت نہ سانبھے  
رات نہ دیندی راہ  
اج وگدی پڑے دی واہ!  
یاداں دل وچ تھر تھلی پاندیاں میں تے مونہوں ہو کے بل بل کے نکلدے میں  
پیار میرا ہو گیا یاداں دے حوالے  
کنڈھیاں نالوں ٹٹ گئے ناتے

چھوڑوں نالوں رشتے مک گئے  
دل دریا وچ کانٹاں آیاں

اتھرو کھان اچھالے  
یاداں دے حوالے  
ایہو جھیاں دل ٹھمن والیاں جذبیاں دی کہانی کنیاں لطیف اشاریاں وچ بیان ہندی اے۔ کدی

انج کہ

اے جے دی او ہونے تیرے  
اکھیاں وچ لشکدے

کدے ایس اچاٹ سوچ دے سہارے بھئی۔ "کیہے نو نیاں ہارے راہ" تے کدے ایس مٹھی اگ  
دے سیک اتے کہ

سانوں پتکھ و کنڈڑے لے دے

یاں رہ پوساڑے کول

پیار دی وار دات دے سارے رنگ امر تا پر تم نے ”نویں رت“ وچ سموئے نہیں تاں جا کے دل  
دے خون تال رنگیا ہو یا ایہہ گلدستہ ساڑے تیکرا پڑیا اے۔

☆☆☆☆

## وشو بھائی چارے اتے سد بھاونا دی شاعری: امرتا پریتم

آدھونک پنجابی ساہت دے اتہاس وچ امرتا پریتم داناں اک مان جوگ اپلی بدھی وانگ انکرت ہو یا نظر آؤندا ہے۔ اوس نوے اپنے ساہت وچ اس مانوی قدراں قیمتاں اتے سمویدناواں نوں کاوک انداز اتے شبلی وچ بہت ہی خوبصورت بھرپور جیون جیون لئی پریت کردی ہے۔ اوس دی کوتا وچ منکھ دلوں سرجیاں وندیاں ساہت ہندیاں نظر آؤندیاں ہن۔ اوس دی کوتا منکھتا نوں ایکتا دے سوتر وچ بھیا دیکھنا لوچدی ہے۔ بھارتی ناری دی ستتر، مان جوگ مانوی ہوند دی ستھاپتی لئی اوس دی کوتا ویشیش روپ وچ پرچتن شیل نظر آؤندی ہے۔

امرتا پریتم دی کوتا دی وڈی خوبی، خوبصورتی اتے مہتا اس گل وچ ہے کہ اوس دی کوتا پڑھ کے زندگی ہو حسین اتے مان جوگ لگن لگدی ہے۔ زندگی نوں دیکھن دا اوس دا نظریہ اسار و اتے اتھا جھکے۔ ادھ ماڑیاں اتے الٹ پرستھتیاں وچ وی حوصلہ نہیں ہاردی۔ اوس دی کوتا پڑھ کے پاتھک زندگی جیون دے سپنے لین لگدا ہے۔ اوس دی کوتا نے بھارتی نوجوان پیڑھی نوں چنگے کے اتے پیاریکت جیون جیون دے سپنے نچون والی پیڑھی دے طور تے تیار کیتا۔ اوس دی کوتا پڑھ کے پاتھک سمویدن شیل اتے سمویدنا یکت ہن جاندا ہے اتے اپنے پیار دے چاواں دی اڈاری ادھ اس قدر لاؤندی ہے کہ اوس نوں اسان چن، ستارے، سورج دھرتی اوس نوں اپنے چاونا وچ سموندے دکھائی دیندے ہن۔ اس کر کے اوس دے چاء، سدھراں، بھاد اتے جذبے نوں نکور، مہتو پورن اتے شانامتے جاپن لگدے ہن:

دداکھیاں دے پانی اندر گل آں، کچھ سپنے گھولو  
ایہ دھرتی اج ساڈے دیزے جی رنگ آئی دے  
برباد اک کھل بلوری جندڑی دا اسان سپنا پیٹھا

روز رات نوں امبر آ کے منگد اک سلائی دے

حسناں دے عسقاں والیو! جاؤ لیاؤ موڑ کے

دشو اس دا اک جات رو جیتے وی کدھرے تر گیا

امرتا نے اپنی کوتا وچ منکھی پریم، سد بھادنا، امن، اصول، لوک بھلائی، وشو بھاپچارے دی بہتری اتے بہبودی دی وعادے گیت گائے ہن۔ امرتا دی ہر دھار صاف، سچا تے سچاسی، اسے کر کے اس دے ہر دے دچوں نکلے گیت لوکاں دی دے درد دے گیت، بن کے ابھرے ہن۔ اوہ وشو بھائی چارے دی سد بھادنا دی شاعرہ ہے۔ اس دی کوتا قدرت دی سند پریشاک پا کے نویں نویلی دہن دا نگ منگد ی اتے پھلدی وکھائی دیندی ہے:

حق سے دا شاہ اسوار ہووے

واگ سے دی انج سنہالناوے!

پیر جگ دے پیر جگ دے منزلاں ڈھونڈ سکے

دوہاں دیویاں نوں کیکن پالناوے!

نویں رت دا کوئی سندیش دینا

ایس کافی لاج نوں پالناوے!

بور پودے جوں جمیں دے رکھاتے

بھائی امن دی، عمر دا آکھناوے!

درد دے گیت گاسکن بڑا مشکل ہندا ہے لیکن جدوں درد دے گیت نوں کوئی شاعر گاندا ہے، اس سے اوہ اوہدی شاہکار رچنا ہو نیر دی ہے۔ شوکار بٹالوی نے اپنے درد دے گیتاں نوں جدوں گایا، لوکاں نے اس نوں دھیان، ہمدردی تے پریم نال سنیا۔ درد دا جنم ہی پریموچوں ہندا ہے۔ ڈونگھے، نزل تے نرچل پریم وچوں درد جاگدا ہے۔ فیر شاعری وچ آ کے ایہ درونجی نہیں رہندا، لوکاں دی داد و دین جاندا ہے۔ ایہی سادہت دا سنساری کرن دا سدھانت ہے۔ اتجھے آ کے ہی درد و لاں داد و دین دا ہے 'اج آکھاں وارڈ شاہ نوں' نظم جیہڑی پنجابی سادہت جگت وچ امرتا دی بھتوں دھ پر سدھ رچنا ہے، امرتا دی اک لمی نظم 'توارخ' دا وچکار لا حصہ ہے۔ اس نظم وچ امرتا نے 1947 دی دنڈ دا دکھانت بھونگی بھارتی لوکاں دا بہت ہی مارک چتر الکیا

ہے۔ اس جسے وچ آکے امرتا جی دی نظم اپنے پورے جلو اتے سمویہ نادی سکھرنوں چھو بندی ہے۔ اس نظم وچ امرتا جی دا نجی دکھ درد، سناپ اتے بھارت دے لوکاں دا دکھ، درد اتے سناپ اک مک ہوئے جا پدے ہن، ایہی اس نظم دی پراپتی ہے۔ ایہی اس نظم دی پرسدھی دا کارن / آدھار ہے۔ اس نظم وچ شہداں نے وی امرتا دا ساتھ دتا ہے۔ دکھائک ہون دے باوجود دکھا دی ورثی توں اوں نے اپنے بھاواں نوں اک روانی، لہجے اتے لے وچ ابھویا کئی کیتا ہے بھاو درد اگیت ہے ایہ نظم اتے ایہ درد اگیت ہی لوکاں دے دکھاں دا دارو بنیا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول۔

تے اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے وین،

اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں واٹ شاہ نوں کہن۔

اٹھ درد مند ایں دیا دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب،

اج نیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب۔

کسے نے پنجاں پانیاں وچ وتی زہر لا،

تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا۔

ایس زرفیز زمین دے نوںو مھنیا زہر،

کٹھ کٹھ چڑھیاں لالیاں پھٹ پھٹ چڑھیا قبر۔

ساتھ دانیلا دے خلاف امرتا دی آواز ہورناں پنجابی شاعراں نالوں سبھ توں ودھیرے تیز، تکھی

تے پر بھاوشالی دکھائی دیندی ہے:

جد مذہبی عشق جنون بن سرنوں چڑھدے جان

مڈلو با چڑھد اسان

بندیاں دے منہ تر کھے، پریتاں دے منہ کھنڈھے

سوہیاں رت ویاں نازاں

کالے ناگی ڈنگیاں، نیلیاں چنیدیاں جان

کسے برو دی اولہسوں، زہر ولسیاں ناگاں

ہر ہر جانندے راہیاں دے جیوں راہ دلکدیاں جان

منکھی جذبیاں وچلی آشا ہی اوس نوں نویں بھیتا دی اُساری لئی پریت کردی ہے۔ اسے لئی

1947 دی ونڈ دے دکھانت نوں تھلدی ہوئی منکھتا فر نویں اتہاس نوں سرجن لئی اٹھ کھڑی ہندی ہے۔ امرتا

انوسار، آشا، امید اتے اتشا ہی اصل زندگی ہندے ہن۔ زندگی بناں کسے اُسار و جذبے اتے سوچ دے

جیوں ای نہیں جاسکدی۔ پتر اُساری دی اس اتہاسک ضرورت اتے بھارتی لوکاں دے ایجنڈے نوں اوس

نے بہت ہی خوبصورتی نال بیان کیتا ہے:

میں تو ارنج ہاں ہند دی، میرے پچھلے درتے کج

جیوے جگاں نیک وائے۔۔۔ جو درقا لکھیا اج

اج سرگھی ویلا ویکھد انویں جگاں داکھ

پنجابی مناں دی اچی مٹی اتے روشنی دا، چمن دا، سوچ دا دیوا جو ساڈے پرکھے ہال کے گئے ہن،

او سے روشنی وچ پنجابی سمیٹا چار آلوکت ہو یا کچے دشمنوں اپنی لوء نال نہ کیول رشناں رہیا ہے بلکہ دنیا نوں اپنے

ول آکرشت دی کر رہیا ہے۔ پنجابی اپنے من دے اچے امبراں اتے ہمیشہ ہی اک اچے تے سچے سوچ تے

سورج نوں منکھائی رکھنا چاہندے ہن۔ اسے لئی اوہناں دی زندگی وی نیکی، اچتا، پختا، پختا، سار تھکتا دا مجسمہ نظر

آؤندی ہے۔ امرتا پریتیم دی قلم خوبصورت ڈھنگ نال لکھدی ہے:

چائن دی پھلکاری تو پا کون بھرے

اسر دا اک اعلیٰ سورج پال دیاں

من دی اچی مٹی دیوا، کون دھرے

بھارتی سنسکرتی تے سوچ دا سندیش اوس نے اپنی شاعری وچ بہت پر بھاوشالی ڈھنگ نال دتا بھاو

اوہ درتے اتے دراشت دی اچتا تے پختا نوں اپنے نال لے کے چلدی رہی ہے:

’سن نی دھیے میرے! ایہ میرا پنجاب

بیٹھ حضورِ ایس دی ایہ اک پاک کتاب

حرف سنہری ایس دے امن، امن، امن، تیاگ

سمیاں دلی رات وچ جاگ تے جو یں چراغ‘

اس دی کوتا داوڑا ہنر اس گل وچ ڈیا ہویا ہے کہ اوہ اپنے اڈیش اتے سندیش نوں پرکرتک بمباں  
نال بہت ہی خوبصورتی نال پیش کردی ہے۔ قدرت داحسن اس دی کوتا وچ ہو روی کھڑکھڑ پیندا ہے۔ پر کرتی  
امرتا دی کوتا وچ انگنت بمباں، پرتکیاں اتے تشیہاں دے روپ وچ دمان ہے۔ امرتا کاووی دھیتا ایہ ہے  
کہ اس وچ پر کرتی دے انیکاں روپ شاید پنجابی دے باقی کویاں نالوں بھتوں دھیرے اتے دھمن روپاں  
وچ پر یوگ ہوئے ہن۔ امرتا، چین، سور، تاریاں، دھرتی اتے بدلاں نوں کدے کدے روپ چتو دی ہے اتے  
کدے کس روپ وچ۔ اجیہا کردے سے اس دی کوتا وچ دہراؤ دا احساس نہیں ہندا سگوں بازی ہمیشہ برقرار  
رہندی ہے۔ قدرت اس نوں اپنی سکھی سہیلی لکدی ہے، اک حسین غیار وانگ امرتا کدے اس نوں کس روپ  
وچ سجاؤندی ہے، کدے کس روپ وچ، کدے اس کول اپنا کوئی دکھ سکھ پھولدی ہے اتے کدے کوئی۔ کدے  
کوئی بدل میگھ دت بن کے کسے پریمی واسنہا اپنی پریمکا نوں دین جاندی ہے، کدے سورج رات دی  
لکھ وچ اتر جاندی ہے۔ انج امرتا قدرت نال اپنی پروارک سانجھ سٹھاپت کر لیندی ہے۔ اسے طرح دی  
سانجھ نوں کسے سے ساڈے رشمیاں غیاں اتے گردواں نے وی سٹھاپت کتیا سی۔ سری گردانک دیو جی نے  
قدرت نال اپنے پیار نوں بہت کج اتے آنند بھر پور درشتی توں پرست کتیا سی جدا دہناں نے لکھیا سی میری  
رہنمائی لایا بھیجے ساون آیا۔ گردو جی دلوں قدرت نوں بھیج دے سمجھن دوارا سٹھاپت کتیا سمیرک ویشیش  
سا توک اتے اپنت بھرے ارتھان واسو چک ہے:

دھرتی انگن موہکا لوک وڈا پروار  
بھارت پیڑھا رنگلا انگن دے وچکار  
دھرتی دیس پنجاب دی، حوراں وچون حور  
واواں جھلن پکھیاں ستھاپتے نور  
امبر لہنگا بھیجیا دھرت لوہی پون  
بیریں تارے ننھ کے راتاں جھمر پون  
رت پھرے لٹ بادری سوندی امبر تان  
بدل زلفاں کالیاں اسوں گندے آن  
کتک۔ پھل کپاہ دے ریشم پے جائے مات

مکھر چہرہ را نگلا کتے پوہ دی رات  
کھیت جویں پھلکاریاں چیترا لایا منگ

امرتا کا دوی دڈی دھیشٹ ایہ ہے کہ اس نے تاری دے حق وچ آواز بلدن کردیاں ہو یاں کتے  
وی مردوی ہوندنوں نندیا جاں ردیا نہیں سگوں اس نے مردنوں جیون وچ اک سہ یا تری دے روپ وچ  
سویکا رکیتا۔ اجو کے سے وچ تار یوادی لہر دے ادھین مردنوں بھنڈا اک فیشن بندا جا رہیا ہے۔ ایہ اس لہر دا  
اک ناہند روپکھ ہے۔ مرداتے استری اس سماج اتے سھیا تا دے مہوپورن آدھارا تے پہلو ہے، ایہناں  
دوہاں دی سنیکت ہوند نال ہی مچئی جیون دھمی اتے ویونت دی کلپنا کھیتی جاسکدی ہے۔ امرتا نے اپنی کوتا  
وچ فیشن پرستی ادھین اجیہا کجھ نہیں لکھیا جیہڑا مردوی سمان جوگ سماجک ستھتی نوں اپہاس وادی درشتی توں  
اُجاگر کردا ہووے۔ ادہ استری دی اپمان جوگ ستھتی لئی مردوی تھاوین سماج دوستھانوں دوشی سمجھدی ہے  
جیہڑی استری نوں اک ورتن دی شے سمجھدی ہے۔ جس سماج دوستھا وچ پیار لئی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس دی نظم  
'دیو پارا استری دے سراپ اتے سنتاپ بھر پور جیون جیٹاں رہی زندگی داردن پیش کردی ہے:

جسماں دا دیو پار

نکڑی دے دو چھایاں دا کراک مرد اک مار

روز بولدے ماس روز وچدے لہو

تے آخر کار وٹ لیندے نیں

لہو مٹی دے نکلے نکلے سکے..... دو..... ترے..... چار۔

نردوش پریمیاں لئی پریم دارستہ کدے وی سہل نہیں رہیا، سماج دوستھانال پریمیاں دا نکر اوٹھ  
قدیم توں رہیا ہے۔ امرتا ساڈے پریمیاں دے درواتے دکھانت نوں سمجھ کے اس نوں اس ڈھنگ نال بیان  
کردی ہے کہ درد جاگدا لگدا ہے، کجھ کہند لگدا ہے اتے سماج نوں اک سوال پاؤندا ہے؟ کتھوں دی ہٹکنا  
ہے؟ ادہ اک اچھے سماج دا سپنا ساڈے سامنے رکھدی ہے جس وچ آپسی پریم پیار وی داوہ رکھدی ہوئی  
داتا ورن وچ مہکاں بکھیر دی رہے:

ڈاچی سے دی اچے بکھیر دیندی

سسی اچے وی پنوں دا کھرا بھالے



دوویں انیاں حسن داخل پنہا  
 ہتھو تہساتے اے جی پیر پھالے  
 کٹھا عشق جو چھری اٹھڑی توں  
 رت اوس دی سدی پئی حالے  
 کئی سے دی سدا ہی رہی لکھدی  
 کوئی پترے پیار دی بیڑ والے

امرتا دی کوتا پیار دے سویدنا تک پہلو توں بیان کرن سے جی کوئل ابھیو یا کئی دا پر تہجے دیندی  
 ہے۔ لوک مثالاں بارے اوہ اوئے ہی آکورش دا پر گٹاوا کردی ہے۔ انج اوہ سچ روپ وچ ہی اپنی کوتا وچ  
 پرتھو اونی اتے سا جوا دی چیتنا دی گل کر جاندی ہے:  
 نگر اوے کنڈیا لیا، اتوں چڑھیاں چیت  
 جاگ پٹیاں انج پیلیاں، جاگ پنے انج کھیت  
 نگر اوے کنڈیا لیا، چڑھیاں و ساکھ  
 ساہراج دے منہ تے اڈاؤ پیندی راکھ  
 نگر اوے کنڈیا لیا، اتوں چڑھیا جینھ  
 اصل وئے بھن دی، دھرتی تیرے پیٹھ

.....  
 حاکم دا ظلم اوتا ہے  
 اوہ جتاوی کر لوے  
 تے پر جادی بیڑا وئی ہے  
 اوہ جی وی جروے .....

قدرت اپنے آپ وچ اک وشال اکائی ہے۔ ویشاں دیاں ونڈیاں، دھرم، ذاتاں دیاں  
 ونڈیاں تاں انسان دے پائیاں من۔ قدرت سرو ویا پک، وشال، سرو ہنکاری، مانور کھیاک، برہمنڈ نوں  
 نیارا، نوینکا، اچیرا، آکر شک، من موکھ روپ پر دان کرن والی ہوند ہے۔ جیہڑا ساہکار پر کرتی قدرت

دے اس دربارے اہوند نوں سوینکار کردا ہے اس دی رچنا وچ دیرے مانوی سرکاراں لوں دیات ۴۰  
 سجادک پرگیا جاسکدا ہے۔ امرتا اس پکھوں پرے پاران کوتری ہے۔ اس نے پر کرتی دے مانوی۔ یہ  
 نوں اپنی کوتا وچ بھر پور روپ وچ ابھوکتی پران کیتی ہے۔ اس ابھوکتی کر کے اس دی کوتا وچرہ مہرہ ہور  
 سندرہ آکر شک۔ آندی ارکی اتے فلیا نکاری بن گیا ہے۔

پیار نوں امرتا نے ساری عمر آردھنا، پرارتھنا، جھکتی وانگ اپنایا۔ اس دانیون پیار دانی دوسرا روپ  
 بن گیا۔ اسے لئی اوہ اپنی عمر دے آخری ورھیاں وچ پھر جنم ملن کے اسے طرح دے پیار والا جیون جیون دی  
 اوچا من وچ رھدی رہی۔ دوبارہ جیون ملن دی تسستی وچ اوہ اپنے پیارے پرتم نوں فر پیار وگندے پاس وچ  
 ملنا لوجہ دی ہے اتے اپنی تانگہ دا پرٹاواں انج کردی ہے

میں تینوں فیڑ ملاں کی

کسے اس طرح؟ پتہ نہیں

شاید تیرے تخیل دی چنگ بن کے

تیری کیوں تے اتراں کی

جاں خور تیری کیوں دے اتے

اک دہس تھی لکیر بن کے

خاموش تینوں عکدی رہواں کی

انجیاں پکھلیاں کوتاواں خام کر کے انجیاں پستکاں میں تینوں فیڑ ملاں کی اتے خاموشی توں  
 پہلاں وچ امرتا دی کوتا دے سرکار سانج نالوں دھیرے آتم اتے اتام، کوش اتے کیتی دے رشتے نال  
 سبند ستھاپت کر دے بن اتے اس رشتے دے دواں اسے انیکاں پریشان نوں لیکن لئی فکر مند اتے  
 پریتھن شیل نظر آوندے بن۔ اس دور دی اس دی شاعری کائناتی لیلاداں دل بھر پور اشارا کردی ہے، روحان  
 دی گل کردی ہے، پرکھیاں نال سبندھاں دیاں گلاں کردی ہے۔ ایجے سے اوہ اس سنسار نوں اک ہمسفر  
 سمجھدی ہے۔ اس طرح اس دیاں نظماں وچ متھیا ہانک حوالے، دھارنک روڑھیاں اتے آستھاواں داوی  
 ذکر آوندے۔ لوک یا تک دستور دے دیکھن نوں ملدے بن۔ اس دور دی اس دی کوتا اپر اتھیا تک  
 رمواد دے سنو بن دا پر بھاؤ دیکھیا جاسکدا ہے:

اک تھو لے جے وانگ ویکھیا  
 کہ نک تھاں شواک دھونی سیک  
 رہے ہن میں کھے پاسے اوہناں دے  
 کول بیٹھی ہاں تے بچے پاسے  
 پارہتی نرت کر رہی ہے

.....  
 کہ ہن میں موت دے چشمے وچ نہاؤنا ہے  
 جتھے سارے دکھ روگ کئے جان گے  
 فیر کرشن مینوں روٹی دین گے، کسے راہ  
 واسنکیت وی کرن گے.....

فیر کوتری اپنے آپ نوں ہی سوال کردی ہے کہ کیہ اوس نے کائنات دے سارے بھید جان لئے  
 ہن جاں.....

خدایا! تیریاں توں جانے  
 میں نہیں جان گی.....

جس طرح کائنات وڈی اتے وشال ہے، ایسے طرح امرتا دی شاعری داکینوس وی وڈا اتے و  
 شال ہے۔ جس طرح ندی دی دھارا نوں وٹریا نہیں جاسکدا، اوسے طرح امرتا دی کوتا نوں کھنڈاں وچ وٹد  
 کے پڑھیا تے سمجھیا نہیں جاسکدا۔ اوس دی کوتا اکھنڈ تے زنتر ویہ رہی ندی دازل مل دھارا وانگ سد یوی  
 اتے پوتر ہے۔

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم کا وی دے کاوشا ستری نکتے

آدھونک پنجابی کوتا دے اتہاس وچ امرتا پر یتیم دایو گمدان بہتی جان پچھان داحتاج نہیں ہے۔ اوس دی کوتا نوں اکو سے دکھو دکھریاں وچاردھارک ورشٹیاں رکھن والے آلوچکاں / سمیکھیا کاراں نے مانتا ہی نہیں دتی سکوں دڈیاں دی ہے۔ ایسے دڈیاں وچوں پرگتی وادی کاودورنوں امرتا موہن سنگھ یک جاں دور عام کیسا جاندا ہے۔ اوس نوں ایوں ہی پنجاب دی آواز جے لقب نال نواز یا گیا ہے۔ پر نسا تک ورشٹی توں ایہو جے لقب ساڈی دھارک آدرش وادی سوچ وچاردی آج بن۔ ایہناں لقب نال دی وڈی سیمائیہ بن جاندی ہے کہ کاو پانھک اک شر دھامنی ماحول وچوں بول اچاردیاں اوس کچے دارودارنوں نظر انداز کردیندا ہے۔ جس وچ رچنا سجدی وی ہے اتے سہادوی رچاؤندی ہے۔ دوسرا اوس نوں ہوراں دی گت مت توں نکھیرنا اسمھو ہو جاندا ہے۔ مثال دے طور دے امرتا پر یتیم اتے موہن سنگھ پرگتی وادی دور دے دو مہتو پورن شاعر بن، دوواں دیاں کچھ سانجھاں وی درکار بن، پرتو دوویں شاعر اک نہیں بن، دوواں دی کاو سویدنا، کاو ورشٹی، کاو انوبھو وچ ہی دکھریاں نہیں کاو پنجرنا اتے کاو جگتاں وچ وی ذمیرا نتر ہے۔ دوویں دیہویں صدی دے وچکار لے یک دے منگھ نوں دتھن ورشٹی کوتاں توں انوبھو کر دے ہوئے دتھن روپن ترن دیاں ودھیاں دا پر یوگ کر دے بن۔ ایوں کہن توں بھاو ہے کہ اک یک نوں دو شاعر دتھن نظر یے توں دکھ دے بن، اک دو جے دابل نہیں بندے اتے نہی اک دو جے دا پورک بندے بن۔

دوسرا نکتہ ایہ وی ہے کہ دیہویں صدی وچ چلی محتو پورن لہر پر گتیاں ادوے انووان پٹھاسیں سٹی پدھر اتے امرتا پر یتیم نوں پر گیوادی شاعر وجوں وی سہا پت کر دے رہے ہاں۔ پر گتیاں ادی لہر دا اوس سیمیں ایناں زبردست پر بھاوی کہ ہر لیکھک پر گتیاں ادی کہن اکھاؤن وچ فخر محسوس کرداسی۔ امرتا پر یتیم اوپر پر گتیاں ادی لہر دا پر بھاو آدرش سی پرتو اوہ بنیادی طور تے پر گتیاں ادی کاو ورشٹی والی اتے پر گتیاں ادی وچاردھارک ورشٹی والی شاعری

نہیں سی۔ اوس سہیں اوپرے پرکتیو ادوی محاذاتے اندولن داہی پر بھاوسی جس نے مدھ درگی شریک کردار وچ  
 سوتنتر تا دے سپنے نوں جگایا سی۔ اوس سہیں ہر مدھ ورگے منکھ نوں انقلاب اپنے اوہناں دکھاں درداں دادور و  
 لگدا سی جسہر دا دکھ درد ساسراجی بست واداتے دئی پونجی وادی سا جک پنجر تا وچوں اگیں سن۔ مدھ درگی منکھ  
 ۔ ہدی جیوی۔ رچنا کار نے اپنے کردار وچ اوہ بنیادی تبدیلیاں نہیں کیتیاں سن جہاں دی منگ پرکتیو ادوی  
 درشن کردا ہے۔ دوسرا مدھ درگی کردار اپنے ہت دے کارن ہی 'سنترا' تا دے سپنے دا انویائی سی۔ مثال دے طور  
 تے پروفیسر موہن سنگھ جدوں ایسے سنترا تا نوں ایہ کہند اہے کہ 'ہو آزاد مل پودیں گی توں' تاں کسے دی طراں دا  
 بھرم نہیں رہندا۔ انج ایس پھو کے پرکتیو ادوے آتم موہ چوں پروفیسر موہن سنگھ نوں جڈا مرضی وڈا پرکتیو ادوی  
 کوئی کہی جائے پرنتو حقیقت ایہ ہے کہ اوہ رومانک اتے یونیویائی ودھی اتے سو بھاوا دھارنی ہے۔ ایوں ہی  
 امرتا پرتم دا بارہ ماہ ہے۔ ایس وچ بھاو کتا سمو دھنی ودھی دوو آرانیا را بن جاندی ہے جدوں کہ شاعر جس چیتنا  
 نوں جگاؤ تا چاہندا ہے اوہ سطحی پرکتیو ادوی لکھائی بن جاندی ہے۔ پرنتو ایس لہر نے کاوہیا والی نوں کرم ت دے  
 نیزے تیزے لیا کے اُچے نگہبازی و سدھی سنترا تا دا دستھاپن کردتا۔ ایس دستھاپن وچ امرتا پرتم دی کوتا دا کاو  
 شاستری نیم نہت ہے۔ اک نظم ویکھو:

نیلے امبر دی اک گٹھے.....

رات مل دا گھٹک و بے

چندر مادی چینی وچوں

چنا گاڑا دھواں اٹھے.....

سپنے جیکن کئی بھٹھیاں

ہر اک بھٹھی اک جھونکدا

میرا عشق ضروری کردا.....

میل تیرا کجھ ایکن ملدا

جیکن کوئی تلیاں اتے

اک ڈنگ دی روزی دھرتا.....

رہندی اک تے ہتھ سیکدا

گھڑی ماہے نسل ہندا

شکر شکر اللہ دا کردا

رات مل گئی گھکوو جے

چندر مادی چھنی چوں

دھواں نکلے ایسے آس تے۔

جوئی کمائی سوئی کھانا

نہ کوئی کنکا کل دا بچیا

نہ کوئی بھورا بھلک واسطے

ایس کویتا دے پنڈے وچ اوس بمبا والی وازور ہے جو کرت نال بجوی ہوئی ہے۔ پرتو ایس ہندیہ  
اتے اوس دی کویتا نوں پرگتھو اوی سدھ کرنا زبردستی ہے۔ امرتا پرتم اچھی اچھی کاو بھاشادی سر جتا دل رچت  
ہے جیہڑی شر جن۔ کرت شکتی نال لبریز ہے۔ پرگتھو اوی کا دلبر نے اچھی کاو بھاشا اگر بھو میں اتے لیا کے کاو  
نوں کرت و اچھا کر بن شیل بناوتا۔ امرتا پرتم اپنیاں آرمھلیاں کاو پستکاں صدا چارک اتے آدر شک جذبیاں  
انوں رومنترت کردی ہے۔ اوہ سوے سوہ توں سمبندھنی دھرتک دا ہی صرف نہیں کردی سکوں کاو اندر جیسے ودھی  
ودھیان اتے دیہار دی سر جتا کردی ہے جو۔ تھار تھکتاں نال جڑوا ہے۔ منکھی جیون اے آتم وردھاں وچوں  
اوہ مانوی ہوند و تلاش نال جڑ کے اچھے سماجک آدرشاں دے سچا رول و دھدی ہے جہناں دی صدا چار اتوں  
اگانہ سماجک ساد تھکتا اجاگر بندی ہے۔ سماجک ساد تھکتا دی ورثی اوس نوں پرگتھو اوی اندولن توں پراپت بندی  
ہے۔ ایہ ورثی پورن سماجک ورتارے پرتی اک سوچھی پردان کردی ہے۔ ایسے کارن اوہ عورت دی ہوند پرتی  
نظمیں اندر اک ایہا بھاو بودھا پیدا کردی ہے جیہڑا صدا چارک تھکتا دا سونہ چڑاؤندا ہے۔ امرتا پرتم دے کاو  
دے اندر ویہ نیم کم کردا پر تک دکھائی دیندا ہے پرتو ایہ نیم دوچار وھارک روپ وچ اگانہ نہیں تر دا سکوں ہوند  
دی پچھان اتے تلفظ دے ارد گرد ہی کارج شیل رہندی ہے۔ عورت ان کٹھ نظمیں وچ ایہ ورثی ہوند اوس دے  
کاو دا کاوشا سرتی نکتہ بن جاند اے۔

میں تیری سوچ تے جد پیر دھریا ی

میں اک نہیں ساں۔۔۔ دوساں

اک سالم ویای، تے اک سالم کنواری

سو تیرے بھوگ دی خاطر

میں اوس کنواری نوں قتل کرنا سی.....

میں قتل کیجی سی

ایہ قتل، جو قانونا جائز ہندے سن

صرف اوہناں دی ذلت تا جائز ہندی ہے

تے میں اوس ذلت واز ہر پیتا سی.....

تے فیر پر بھات ویلے

ایہ لہو وچ بجھے میں اپنے ہتھ دیکھے سن

ہتھ دھوتے سن۔۔

بالکل اوس طراں، جیوں ہور مٹکی انگ دھونے سی

پر جیوں ہی میں ششے دے ساہنے ہوئی

اوہ ساہنے کھلوتی سی

اوبی، جو اپنی جاچے، میں راتیں قتل کیتی سی.....

او خدا یا!

کیہ بیج واہنیر ابھت گاڑھاسی؟

میں کیہنوں قتل کرنا سی، تے کیہنوں کریشمی.....

امرتا پریتم دے کاو کیندر وچ عورت 'میں' روپ وچ ستھت ہے۔ امرتا پریتم اوس دی پہچان مرد

پردھان سماج دے پر سنگ وچ کردی ہے۔ اوس داسکیا اوسا رسا منتی قدراں قیماں وچ عورت دی کھین ہو چکی

ہوند دی ویدنا ہے۔ ایس کاوشاستری نقطے ول ڈاکٹر اتر سنگھ نے دھیان دواؤندیاں سترک دی کیجا ہے کہ،

''امرتا دی کوتا وچ استری لئی جو بھادنا جاں سویدنا پرکا نشان ہوئی ہے، اوس نوں کیول استری وادی نہیں کیجا جا

سکدا، جو اک فیشن وچوں باہروں ادھار لیا گیا بودے۔ ایہ امرتا پریتم دی مانو وادی درشنی اتے سماجک دشمن دا

اک آنکھرواں انگ ہے۔ اس درشنی تے چیتنا داسو ماوہ سچا مانو کوندری دشمن سی جیہڑا منکھ دی ہوند نوں سربوتم بیج

سو بیکار کر دیا ہے۔ منکھی چیتنا نوں اتہاس نال سمبندھت کر کے ساہیکھک بناؤندا ہے اتے ساریاں منکھی  
سمسیاواں نوں شدھ مانو وادی انتر سوچھی اتے اتہاسک دشو درشن نال جوڑ دا ہے۔“ (ساہت سمویدنا، پتا -  
(155)

مانو وادی ہونا مانوی سہرودا داپرتیک ہے۔ فر منکھی ہوند داپرتیک ہے۔ فر منکھی ہوند دی سمتر تالنی  
جہنہ جہد کرنا چارو دھارک طور تے اک وار شک درشی نال جوڑ نا ہے۔ امرتا پرتم اپنے آرنبھ دے دور وچ  
سودھا چار دے کوہد نال جوڑ دی ہے، فر پرتی وادی ساہیک لہر دے پر باو نال اتہاسک چیتنا ول ودھدی ہے تے  
تیسری بااچو کھلک پڑا داپراوہ منکھی ہوند دے ادھیاتم اتے رساتمک درشن ول پرتدی ہے۔ ایہ تے پڑا  
اوس دے کاو وکاس دے ہی پہلو نہیں سگوں کاوشاستری سمجھ دے وی پڑا ہن۔ صحبت دا کیندری سوتر ایہناں  
تناں پڑاواں دے پنڈے دے آر پار پھیلایا ہویا ہے۔ اوس دی لمبی کوتا سنہیزے وچوں ایجہا سو جھ دے کئی  
سوتر مل جاندے ہن جتھے اوہ محبت دے راہی گل کیہندی ہے۔

ڈاچی سے وی اے نکھیر دیندی

کسی اے وی پنوں دا کھرا بھالے

دوویں اثیاں حسن دامل پیندا

ہتھ تیساتے اے وی پیر چھالے

کٹھ عشق جو چھری اٹھڑی توں

کت اوسدی سدی پئی حالے

کافی سے دی سدا ہی رہی لکھدی

خونی پتر سے پیار دی بیڑ والے

اسے کر کے اوہ اپنی سچو پورن کوتا چیترا نامہ روج اسے بھاونا، سمویدنا، چیتنا اتے استوی درشی توں

بولدی ہے:

اک دردی۔

جو سگرٹ وی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے

صرف کچھ نظماں ہن -



جو سگرٹ دے نالوں میں راکھ وانگن جھانریاں.....

امر تا پر تم حبت دے احساس نوں عورت دی ہوند دے پر تے بدل و جوں اوسار کے اپنی کوتا دے  
ارتھاں نوں معنوی کرت بنائی رکھدی ہے پرتو جدوں اوہ 'آدر چننا' تے پہنچدی ہے تاں اوہ ادھیاس تک اتے  
دار شک و دھیرے ہو جاندی ہے اوس دی کوتا اتے سنگٹھن جھل ہو جاندی ہے۔ اوہ پور و لے پڑاواں دے سرلی  
سچا راتے اکبر۔ سنگٹھن دی تھاویں کوتا دی کجھتا پرتی و دھیرے سچیت ہو کے جھل سر چنارک دا پرمان دیندی  
ہے۔ اوس دی اس سر چننا کاری چیتنا نوں 'آدر چننا' والیاں ست نظماں دا پانٹھ ضروری ہے۔ اوہ منکھی ہوند  
نوں دار شک نوپ چا دھیاسی پہنچ در شئی توں واجدی ہے۔ 'آدر چننا' نظم چوں لکھیا اس کا دشا ستری وکاس دا  
آئبھاس ہو جاتا ہے:

میں۔ اک نرا کار میں ساں

ایہ میں داسکھپ سی، جو اگ وانگ پھریا

تے اگ دا جلوہ پانیاں تے تریا.....

پر اوہ پر اتہاسک سمیاں دی گل ہے.....

ایہ میں دی مٹی دی تریسی

اک اوس نے توں دادریا پیتا،

ایہ میں دی مٹی دا ہار اپنا

اک توں دا جنگل اوس لھتا،

ایہ میں دی مٹی دی واشنا

تے توں دے امبر دا عشق سی

کہ توں دا نیلا جہیا پنا

مٹی دی بیج تے ستا۔

ایہ تیرے تے میرے ماس دی سمکدھی۔

تے ایہو حقیقت دی آدر چننا سی.....

سنسار دی رچنا تاں بہت کچھوں دی گل ہے.....

اس نظم توں امرتا پریتم دی بدل دی چیتنا دا ہی پتہ نہیں لگدا اسگوں اوس دے کاو دے بدل دے  
 اوہناں شاستری نیاں دا گیان ہندا ہے کہ کاو درشتی اتے کاو انو بھوہن کیہڑیاں ستھتیاں چوں بولد اے۔ ایہیے  
 درشتی بندو دا نظریہ رہنا ضروری ہے نہیں تاں امرتا پریتم ورگی ڈہین شاعرہ دی شاعری پرتی چنتن جھٹ پریم  
 پرانگت لیہاں تے ڈھل جاوے گا۔ اوس دی کوتا دے بدل دے دھرا اتلاں دی نشان دہی کرنی کاو شاستری سمجھ  
 لئی اتے مہتھو پورن پہلو ہے۔ امرتا پریتم دے دھرا اتلاں دی سو جھ لئی اتہاسک پرستھتیاں اتے اوس سماجک  
 انو بھو سار دی سو جھی دی وی ضرورت ہے جتھوں ایہ اپنے آپ نوں بدلن لگدے ہن کیونکہ کوئی وی کاو دھرا اتل  
 امور تے دائرہ یکھ نہیں ہو سکدا اوس لئی اک پورن اتہاسک پرسنگ ہندا ہے۔ اس پرتی امرتا آپ بے حد چیت  
 ہے۔ اوہ اس چیت ستھتی وچ سباد کردی ہوئی بول او چار دی ہے جس دا اوس دی کوتا نوں سمجھن وچ ہو رہا ئی  
 ہو سکدا ہے:

دے میں تڑکے گھڑے دا پانی  
 کل تک نہیں رہنا.....  
 ایس پانی دے کن ترہیہائے  
 تریہ دے ہوٹھاں دا انگو  
 او میرے سوڈھے گھٹ دیا مترا  
 کہہ دے جو کجھ کہنا۔  
 اج دا پانی کیلن لاہوے  
 کل دی تریہ دا قرضہ  
 نہ پانی نے کنیں بھجنا  
 نہ پلے وچ رہنا.....  
 ویکھ کے تیری تریہ ورگی  
 اس پانی دی مجھوری  
 نہ اس تیری تریہ سنگ ترنا  
 نہ اس اتھے بہنا.....

اچ دے چنڈے پانی لٹکے  
 تریہ دے موتی ورگا  
 اچ دے چنڈے نالوں کل نے  
 چروانگوں لہنا  
 دے میں تڑکے گھڑے دا پانی  
 کل تک نہیں رہنا۔

اس لقمہ وچ امرتا پریم جس 'تڑکے گھڑے دے پانی' داروپک ورتدی ہے، اوس صرف اتے  
 اموریت روپ وچ ارتھوت نہیں سگوں امرتا پریم دی اوس چیتنا ورثی دا لکھائیگ ہے جو وچار دھارا، جماتی  
 ہوند، ورثی کون، کاؤنظریہ دا سوچک ہے جو سے سے وکاس گرہن کردار ہیا ہے۔ اس وچ اوس دا چھپیا کاؤ  
 سدھانت وی ہے، جیہڑا کاؤ شاستر دا پرکھ پہلووی ہے۔ دوسرا اوہ دھرووی ہے جو اوس نوں اپناؤندی ہے، پر امرتا  
 اوس نال سبادر چارہی ہے۔ تیسرا جس وچار دھارا دا اوہ پرچلن کر رہی ہے اوس وی سار تھکتا دی سیماں وی  
 اکھوں پر وکھے نہیں ہندی۔ چوتھا جتھے اوہ کھڑا چاؤ ہندی ہے، اوہ وی کجی نہیں رہندی سگوں 'پانی دی مجبوری'  
 راہیں پرمت ہندی ہے۔ امرتا پریم دی کاؤ زخمیات دا ایہ اجیہا پہلو ہے جو ٹھنڈیاں کرتاں دے نال ہوند وچ  
 آکے 'سنیہڑے' کاؤ غڈتے کیوں، 'میں جہاں توں' توں پار ہندا ہویا ہن تک دیاں 'ناگ منی' بھلماں تک  
 پہنچدا ہے۔

اوس دے کاؤ وچ 'چھاتی وی آگ' دا چمن اجیہا ہے جس نوں چھتی کیتیاں پر چھاویاں نوں پھرن  
 واسے وی پکڑ وچ آؤن دی سمجھانا توں اوہ چیت کردی ہے۔ اتھے اوس کوہا نوں۔ تھار تھو وی فوٹو گرائی نہیں  
 بنن دیندی۔ ایہ کسے کوی دا الہام نہیں ہندا سگوں اوس دی حقیقتا ہندی ہے۔ کوئی وی رچنا کار اپنی دھرتاں کھڑ  
 کے اوہ دھردے۔ تھار تھو نوں جس کلاحتکا نال پیش کر سکدا ہووے اوہ وڈا نہیں، مہان ہندا ہے۔ کدے  
 اجیہا 'بالشاک' نے اپنے ناواں وچ کیتا سی جس نوں پنجابی وچ امرتا پریم نے کوہا راہیں کیتا ہے۔ اس لہی  
 اوس دی وچار دھارک پر چنڈاواں اس کوہا وچوں لکھو جیہڑی کاؤ شاستری نکتہ نہیں اٹھاؤندی سگوں 'بالشاک'  
 یاد کروادیندی ہے۔

اچ میں اپنے گھر دا نمبر مٹایا ہے

گلی دے متھے تے گلا  
 گلی داناؤں ہنایا ہے  
 تے ہر سڑک دی دشا داناؤں پونجھ دتا ہے  
 پر جوتاں مینوں ضرور لکھنا ہے  
 تاں ہر دیش دے ہر شہر دی  
 ہر گلی دا بو ہانکھورو۔

ایہ اک سراپ ہے اک ور ہے،  
 تے جتھے وی سنتر روپ دی جھلک پوے  
 سمجھنا اوہ میرا گھر ہے.....

ضروری نہیں سنتر تا تھاڑے، ساڑے، کسے ہور دے سپیاں جہی ہودے پر ایہ ہور دے سپیاں دا  
 انووادوی ہو سکدی ہے۔ ایہ بہت اہم ہے کہ سپیاں دی Dimension تھاڑے ساہنے آدے۔ اسے کر  
 کے شاعر، وگیا فی جاں سماج پرور تک نالوں دکھرا ہندا ہے کہ اوہ سپنا لیندا ہے باقی سنے نہیں لیجے سکوں  
 سپیاں دا پر یوگ کر دے ہن۔ سپنا لین تے سپنا پر یوگ دا انتر کاوشاستری چمن چکارنوں بدل دا ہے جس نوں  
 امرتا پریتم نے حقیقت چکر دکھایا ہے۔ اوہ عورت ہو کے محض عورت دی دکالت کرن دالی شاعرہ نہیں۔ اس لئی  
 امرتا پریتم نوں منکھ عورت جاں عورت منکھ داے روپ وچ چتو نا ضروری ہے تاں ہی اوس دے کاوشاستری  
 نیاں تک پہنچ سکدے ہاں۔

امرتا پریتم نوں پرستھیادی کاودھارا دے اک انگ وجوں سمجھن دی بجائے اوس نوں آدھونیک  
 شاعر وجوں سمجھنا اتے آدھونیک ہونٹھ لیاؤ نا ضروری ہے تاں ہی اوس دی کوتا دے دھراندر کارج شیل نیاں تک  
 پہنچیا جاسکدا ہے۔

(پبی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ناری دی آواز۔۔ امرتا پریتم

سنسار دی وسوں دی ادھی آواز ناری دی آواز ہے۔ اس آواز وچ عمر گھٹتے تے تراہ باہلا ہے۔ درلیاں ناری قلماءں نے اس تراہے تے سبھے آدگاراں نوں قلمبند کیتا ہے۔ چچم دی ناری نے بیشک اپنی سدھ بدھ نوں قابو چھ رکھ آدی نال ہر مہم وچ برابری دا ادھیکاری پراپت کیتا ہے۔ اس دے وپریت بھارت دی ناری اپنے پروارک جیون وچ دکھ دکھ پڑاواں تے دکھ دکھ کر دیا کتیاں نال جڑی صدا قر بان ہندی رہی ہے۔ مانو اتھاس دے لے سفر وچ ہر تراسدی دی شکار عورت ہی ہندی آئی ہے۔ جیون جیون لئی لوڑیندے صدق اتے سرز دی وڈی ملی دولت دی تراسدی دے بھر پور سروتاں وچ صدیاں توں جمع ہندی رہی ہے۔ عورت کئی آسانی نال ہر کڑتن بناں منہ وڈے ڈیک لیندی ہے، اس دا احساس ہر دروت ہر دے نوں ہندار ہندا ہے۔

نر ناری دا منہ ہلا فرق کیول اک منہ دے تے دکھ ہو یا وسدا ہے۔ نر ناری دی سانجھ دا بیج بندا، اگدا، نسر دا، پھلدا تے پھلدا ناری دی دھرتی تے ہے۔ ایہ ناری دا کایا دا ثبوت حصہ بن کے نو مینے تک، جتھے سوادلی جٹوں بن ناری دیاں اندراں نوں پی رکھدا ہے، او تھے موہ ممتا دے سندار دا اکھڑواں انگ وی بنیا رہندا ہے۔ انج جیون لئی ہر شے نر تے ناری لئی اکو جی ہے۔ ناری نوں جس کو ملتا کر کے نرنالوں زیادہ نا جکتا پروان ہے، اوہ اوس دی شان وی ہے تے کمزوری وی۔ نر اوس تے دکتی طور تے فدا ہندا ہو یا وی اوس دے سریر نوں تر وڑا ہے۔ ناری ہر پیڑ نوں پر شاد دا انگ پراپت کردی ہے اتے اپنی وفائی نوں آخر دم تک بھاندی ہے۔ نر دی فطرت وچ بھادیں اس اہمیت دی وی خشبو کدھرے کدھرے ضرور ملدی ہے پراکثر اس دا احساس ورلا ورلا ہندا جاندا ہے۔ مانو جاتی دیاں بہتیاں جسی تے آتھک قربانیاں عورت نوں دینیاں پچیاں ہن۔

ساہتکار دا وسرت سندار، مانو آدگاراں دا وسیع چرگئی کرن کردا آیا ہے۔ سنسار ویاں چندہ قلماءں نے ناری دے انتر یو بھاداں نوں اپنے خوبصورت انداز وچ لکھیا ہے۔ کلا دے ہو رکھی سروپ وی چھپے نہیں

رہے۔ ایہناں سارے جتناں دے ہاں جو ناری دے نال بیت دی تر اسدی دا صحیح مل اکھن جو کسے قلم نے ریتا ہے تاں اوہ امرتا پریم دی قلم ہے۔ امرتا پریم دی قلم دا جادو اوج دی سنسار دے ساہتک اداریاں وچ اوس دی مشہور کوتا، جو ہندستان دی وند سے اتیا چار دا بھیا نک چتر چتر دی ہے) نال بھجیا اتھر وکیر دا ہے،

”اوج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول۔

مے اوج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دمی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے وین،

اوج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں واٹ شاہ نوں کہن۔

امرتا پریم نے پنجابی ساہتک نوں اپنے لہو پسینے نال برہا جیویا اتے ہنڈایا ہویا دتا ہے۔ اوس دا ہر اک ساہ ساہت سر جدار ہیا ہے۔ کیہ کوتا ہے کیہ کہانی ہے تے کیہ ناول.....، ایہ ساریاں ونگیاں امرتا دی چھاپ چھڈ گئیاں ہن۔ کوتا وچ بھاو، بھاوناں پٹھیاں چھپے زخم، زخماں چوں اٹھدیاں تراٹاں، تراٹاں تے چھپاں دی انتہا جدوں گیت بن مشہور آوازاں دی ہوک بن فضاواں نوں ہلا دیوے تاں سمجھو کدھرے امرتا پریم دی قلم ترف رہی اے۔ کہانی لکھدی ہے تاں پڑھدیں روٹ گئے کھلو جائے ہن۔ ناول سر جدی ہے تاں سموہ سماج دی ویدنا اجاگر ہو جاندی ہے۔ امرتا پریم پنجابی ساہت لئی ویشیش کرکدی نہ کن والا سمندر ہے۔ اس سمندر چہ اٹھدیاں لہراں سنسار دے سموہ سمندر اں نوں ٹھار دیاں ہر ملک دے کناریاں تے وچھ گئیاں ہن۔ ہر دھرتی دی ناری دی سمویدنا اتھوں دی فضا وچ گونج گئی۔ امرتا دی ہر رچنا نوں لوکاں نے پلکاں تے چک لیا۔ کوتا، کہانی، ناول، لیکھ تے آلوچنا (رچنا تمک) امرتا دے اکھ ساہتک بھڈاراں وچ سسجت الماریاں وچ امر ساہت پیا ہویا ہے۔ سنسار دیاں اوہ زباناں جو یورپ تے باقی حصیاں وچ بولیاں جاندیاں ہن، امرتا دے دل دی دھڑکن بن گئیاں نہیں جہاں وچ امرتا دا ساہت تر جمایا جا چکا ہے۔ بھارت دیاں ہور زباناں وچ وی ایہ سرور موجود ہے تے امرتا ہر دل عزیز نام ہے۔

امرتا پریم دا جیون پارورشی شیشہ ہے۔ اپنے ہر دے دی پارورشتا اوس دے جیون کال وچ اوس نال کوں نہڑی، اس گل دا احساس ہی کافی ہے کہ ناری ہر دے دی قلم تاں سنسار دے کرخت رویاں نوں کوں نہ جھٹھ سکدی ہے۔ امرتا نے ناری ظلمتاں نوں ہنڈایا اتے اوس دے خلاف بغاوت دا پرچار بھلایا۔ اوس دی رسیدی ٹکٹ نے ساہت کا رتا دے جگت وچ بچال لے آندا سی۔ ناری نوں کیوں کمزور تے بے وی دے

برقعے پٹھ لکا دینا مانتا نہیں۔ اس نوں اختیار کر لیتا وی گناہ ہے۔ ہر جیوندی جان-نمان ہے۔ انمان بن کے جیونا کننا مشکل ہے، امرتانے ایہ جنگ جو تھیا ہے تے تے اوہ جیتوں رہی ہے۔ چنگیائی کیول قربان ہو جان دا نام نہیں ہے۔ قربان کرنا ہے تے اوہناں غیر معنوی خلکتیاں نوں قربان کرو جہاں کر کے سماج وچ اکسار تا نہیں رہندی۔ عورت تے درد دوا کو جے جیوہن۔ کیول سریرک بتر ہی کافی نہیں۔ دماغی تے اخلاقی پدھر تادی اک شہری پہنچ دوہاں نوں برابری دا درجہ پروان کر دی ہے۔ دوہاں دی سانجھ، دوہاں دا اک دوہے نال پیار، وچار تے وچاراں دی سانجھ سوچ، سانجھے سنے بنے، سانجھے سنسار سر جینے اتے اپنی سانجھی ہوند نال سموہ سانو جگت وچ سلپیڈے دینے۔

”سبھے سانجھی والو سدراٹو، کوئے سد سے ہا ہراجیو“

امرتانے اس برابری اتے سیدے دی آواز اپنیاں رچتاواں وچ دتی ہے۔ ”پیار“ پر ماتمادی سمجھتوں قیمتی دستو ہے۔ پیار نوں سماج کوں تے کیوں سراپ سمجھدا ہے۔ امرتا دے گیتاں وچ اس گھاٹ لئی ترفن ہر ہر دے نوں ہلا دیندی ہے۔

”پیار میرا ہو گیا یاداں دے حوالے

کنڈھیاں نالوں رشتے سک گئے، چھوواں نالوں تا طے ٹٹ گئے

دل دریا وچ کانگاں اٹھیاں، اتھر دکھان اچھالے

ایہ وی دنیاں تیرے لیکھے، اوہ وی دنیاں تیرے لیکھے

دوویں دنیاں دار چھڈ دے، پیار کرن والے

ایہ برہا سانوں بچناں نے دتا، ایہ برہا اسیں سنگ کے لیا

ایہ برہا دے گھپ ہنیرے، کیوں کوئی دیوا بالے“

ہر روشن چراغ جدوں بجھدا ہے تاں ہنیرا پسر دا ہے۔ اج امرتا پرتم دی اپنا جیون سفر پورا کر کے سنسار توں دواغ ہو گئی اے۔ اس خلا دا ذکر ہر جانو ہر داپیا کر دا ہے۔ امرتا دے جانو بڑے ہن۔ امرتانے ہر آؤندے جاندے نوں اپنے چرے دی سد یوی مسکان نال نوازا یا ہے تے ہر اک نوں سہت پیار دتا ہے۔ اپنی ناک منی نوں کافی مشکلاں ہون دے باوجود بڑی دیر تک چھاپیا تے لوکاں تک پہنچایا۔ پنجابی جگت وچ ایہ سد یوی چپ اسہیہ دکھ ہے۔ پنجابی سماجکاراں نوں جس پیار تے سیدے دی دات ہمیشہ ملدی رہی ہے، اج اس

توں بغیر جیون دی آور پانی پوے گی۔ امرتا پر یتیم نے کدی اپنے آپ نوں وڈیا یا نہیں۔ ہر چھوٹے وڈے  
 ساہکاراں نوں سنیہ وٹھیا۔ جدوں کسے نے کوئی صلاح منگی، اوس نوں واجب اتر دے کے نوازیایا۔ امرتا پر یتیم  
 ورگی شخصیت صدیاں چہ کدی اک وار دھرتی تے آؤندی ہے۔ اپنی کرنی تے رچناواں وچ امرتا سدا جیوندی  
 رہیکی۔ امرتا دے ساہت وچ انتر یو بھاواں دی قدر کر کے اسیں امرتا دے مشن نوں جیوندار کھ سکدے  
 ہاں۔ اسیں دی اس مہمان کوتری دے سنوید نشیل ساہت دیاں تہاں چوں نگھ تے پیار مان دے ہوئے سر تا تمک  
 ساہت رچئے اتے پیار دی دولت دا آئند مانئے۔ ایہی امرتا نوں چھی شردھا منجی ہووے گی۔

(پہلی انتر: قہر الزمان)





## امرتا پریتم-141 کوتاواں

(ویدنا اتے سمویدنا دی شاعری)

امرتا پریتم-141 کوتاواں، اک اجیہا وکھن کوی۔ مگر یہ ہے جو لیکھکا دلوں 1847ء توں لے کے 1984ء تک لکھیا کوتاواں وچوں چوٹیاں کوتاواں نوں اپنے کلاوے وچ لیندا ہے۔ ایداں ایہ کوی۔ مگر یہ امرتا دی اک لمی کوی یا ترادادیر دا ہونیڑا ہے۔ ایہ اوس دے کوی وکاس دے بھین بھین درشاں نوں روچان کردا ہے اتے اوس دے کوی وچلی امتاں دی سوکھمتا، باوا تمکنا اتے سنویدنا شیلتا نوں رکھاتک کردا ہے۔ ایس مگر یہ دیاں کوتاواں دا ادھیان کرن او پرنت کوئی کجے ہی جان سکدا ہے کہ کیوں امرتا پریتم نوں اپنے ہمیں وچ یوگ کوتری ہون دا سمان پراپت ہے۔ ایہ سمان اوس نوں کیوں ایس لمی ہی پراپت نہیں کہ اوس نوں 'بچانی دی آواز' کہیا گیا سگوں ایس لمی کہ امرتا اپنی ساہت گھالنا صدقہ بھاشائی پاساراں اتے دلش کال دیاں حدیں ایس ستر تک نہپ گئی کہ اوہ 'منکھدا دی آواز' بن گئی، 'منکھ دی سمویدنا' دی آواز بن گئی۔

جوہں کہ او پر سنکیت کیتا گیا ہے، 'منکھلے کوی'۔ مگر یہ دی مکھ وکھٹا ایس دیاں کوتاواں وچلی ویدنا اتے سمویدنا نال ہے۔ جتھے ایس ویدنا اتے سمویدنا اک مکھ۔ گھٹک لیکھکا آپ ہے او تھے ہی ایس دستندھ پانٹھک ورگ نال دی ہے۔ رچنا کار اکثر لکھن ہمیں اپنے پانٹھکاں نوں درشتی وچ رکھدا ہویا اپنی سمویدنا نوں شاہدک روپ دیندا ہے۔ کئی واری رچنا وچ وی اقت ہوندی سمویدنا پانٹھک دے انوگول ہے جاندی ہے اتے کئی واری پانٹھک رچنا دے انوگول ہو جاندی ہے۔ ایداں رچنا خود ہی پانٹھک نوں اپنے ستر تک لے جاندی ہے۔ امرتا پریتم ہی اک اجیہی کوتری ہے جو اپنی زندگی دیاں پراسدک، دکھ اتے سکھد اوتھاواں نوں ہنڈاؤندی ایناں نوں بڑے ہی کج بھاوناں پرست کر جاندی ہے۔ اوس دی ایہ بھتا ہی اوس دی سوچئی کوتاواں نوں اک وکھن پچان پردان کردی ہے۔ 'منکھلے مگر یہ دیاں' چانن دی پھلکاری، 'صحبت'، 'خوشبو'، 'قلم دا بھیت'،

روشنی، کفر اُتے عینکاں ہو ر کوتا داں سپٹ روپ وچوں او پر وکت دھارنا دیاں پرمان ہن۔ ایناں کوتاواں  
وچوں کجھ انش دیکھو:

نظر دے آسان توں  
ہے تر گیا سورج کتے  
چن وچ پر اوس دی  
خوشبو اے آؤندی پئی

رل نئی سی ایس وچ  
اک بوند تیرے عشق دی  
ایس لئی میں عمر دی  
ساری کڑتن پی لئی

(روشنی: پنا 67)

پنے دا اک تھاں اونایا  
گزلو کپڑا پاڑیا  
تے عمر دی چولی سیتی

گیتاں نال چکا جاواں گے  
ایہ جو اساں موت دے کولوں  
گھڑی ہڈاری لیتی

(کفر: پنا 79)

زسند یہ ایہ کلا دی اک سکھر ہی ہوندی ہے جدوں رچیتا دی ویدنا، اوس دا دکھ ایوں رچنا وچ اکثر ہو  
جاندا ہے کہ اوس نوں ادا تیکرن ویلے کدی وی باہری پرہچاں، جھوٹے روپکاں دا آسرا نہیں لینا چیدا۔ بول رچنا  
داروپ دھار کے ستے سدھ نازل ہندے رہندے ہن۔ ستند رستگہ نور ایس آؤستھانوں ہڈاں تے ہنڈایا انو بھو

کہندا ہے۔ امرتا پر تہم ویاں کوتا داں دی کچھ اجیہی ہی پیڑ، اجیہے ہی انو پھودی تر جانی کردیاں نظر آؤندیاں ہن  
جدوں اوہ کبندی ہے۔

جویں سوچ دی کنگھی وچوں

مٹ گیا اک دندا

جویں سمجھ دے جھگے اتے

لگ گئی اک کھٹکی

جویں صدق دی اکھ دے اندر

چبھ گیا اک تپلا

فیندر نے جیوانگلاں دے ورج

سنے والا کولا پھڑیا

نواں سال اج ایکن چڑھیا

(سال مبارک: پتا 83)

موت میری اک گل چھوکی.....

کئی وار میں انھاں..... سوچاں.....

چلاں... پھل پرواہ آواں میں

لاش واقف خد لاوا آواں میں

ہر گھٹنا سمجھا سندی ہاں

اک گھٹنا سمجھا نہیں سندی

لاش نوں ہندی بھکھ لاش دی

پاتجھ نہ ہووے لکھ لاش دی

بارے لکھ، لاش دی بارے

سوئی لکھ نوں متا مارے

لاش واقرضہ لاه سکدی ہاں

لکھ واقرضہ کون اتارے

(اک گھنٹا: پنا 93)

امرتا پریم کی کوتا وچ اوہ پرکھک انش دی ہے اوہ سرودی رہسوادی کویاں والا خاصاوی ہے جو  
کدے مدھ کالی کوتا دی ملکیت سی۔ نال ہی نال اوس اندر گیت سرجن دی پر بل رچی دے وی درشن ہندے  
ہن۔ دراصل جے کرایہ کر کیا جاوے پنجابی گیت سہت وچ اوہ بڑی اہم تھاں رکھدی ہے تاں ایس وچ کوئی  
شکے والی گل نہیں۔ اوس دے گیتاں وچ لہ لہ کر داراگ، ڈلھ ڈلھ پنڈا جذبہ تے مرگدھ کر دین والی روانی  
ہے۔ پروفیسر موہن سنگھ دی اوس دے گیتاں واسکھ من واہو یا لکھدا ہے: "امرتا پریم دے گیت اوس دی آتما  
وچوں آپ مہارے نکلے نوں ہی نہیں سکوں اوس نے ایہناں نوں اک گارگیر وانگ گزٹز کے شکل دتی ہے۔  
اوہ گیت دی گوند دی استاد ہے۔" بلونت گارگی انوسار "امرتا پریم دی کوتا دی بولی سپیاں دی بولی ہے۔ اوس  
دے گیت کتک دی چانی رات دے پھلاں وانگ نرم ہن، تے سادے ہن۔ اوہ اپنے زیادہ سادے ہن کہ  
اک گھمبیر آدمی ہی جان سکدا ہے کہ اوہ کسے کوڈ ونگھے ہن۔" گیت سرحدے سے امرتا پریم پنجابی سکھیا چار،  
پرائی پنجابی کوی پریم پرانوں اپنے اک خاص اتے دھیشٹ انداز وچ ویکھدی ہے۔ ایس انداز وچ اوہ پریم پرا  
پالن دی کرلیندی ہے اتے نونٹا دل دی اکثر ہو جاندی ہے۔

اوس دے گیتاں دا اک پرکھ ہنگار ہے اوہناں وچ بمباں، پرتیکاں، اپھاواں، رساں اتے دیس  
چتراں دی اصلوں ہی نوٹیکلی اتے سوچی ورتوں ایہناں گیتاں لئی پرتیک، روپک جاں سب لبھن لئی اوس نوں  
کوئی ویشیش ادھم نہیں کرنا پنڈا سکوں جیہڑی زندگی نوں اوس نے جیو یا ہے، چتریا ہے اوس وچوں ہی اوہ ایہ سارا  
کچھ لہ لہندی ہے۔ ایہو کارن ہے کہ اوہ دے پرتیک تے اپھاواں ساڈے عیتا پرتی دے جیوان وچ رچیاں  
پچیاں سانوں دسدیاں ہن۔ جی گل تاں ایہ ہے کہ اوس دی سچی کوتا ہی ڈھلکدے بمباں دی اک البم ہے۔  
مثال دے طور تے اوس دے گیتاں دے کچھ انش پرست ہن:

چانن دی پھلکاری توپا کون بھرے

امبر دا اک اعلیٰ سورج پال دیاں

من دی اچی مٹی دیوا، کون دھرے

(چائن دی پھلکاری: پنا 37)

کرناں جیوں مولی دیاں لڑیاں

میڈھی دے وچ گندھن لگی

رات ہوئی ٹیاروے۔

دل دامن سروور بھریا

اکھیوں سکے موتی چکدی

ایہ ہنساں دی ڈاروے

(مان سرور: پنا 41)

بھکن پیز حارا لگا، جیتر کسی دون

رت کسے دے راہ تے لگی پھل وچھون

(بھکن جیتر: پنا 50)

ورھیاں دے چندوئے پٹھاں

دل دی بیڑی کھول کے پیسے

یاد بجن دی آدے

بھاویں کدھروں واک لوو

(خشبو: پنا 51)

جیتر نے بوہا کھڑکایا

اج دا گیت اس طرح بنیا

جویں عشق دے پنڈے اتوں

اکھراں دا کجھ مڑھکا آیا

(دستک: پنا 99)

امر تا پریم دا۔ تھارتھ پرتی درشنی کون صدا ہی تھکے بھاوک پرکرم دار بیہا ہے۔ جاں کہہ اوڈ اوس

نیں اپنی تہ پر گیتا تک سویدنا دوا راہی۔ تھار تھنوں گر بن کرن داراہ اپنایا ہے۔ شائد ایسے لئی برہاتے درو  
 اوس دے گیتاں دا اک بنیاوتت ریہا ہے جس دی ارادھنا اوہ جیون دے دیا پک تاؤ دے روپ وچ کردی  
 رہی ہے۔ مگر اتھے اک گل سپٹ کردینی اتے ضروری ہے۔ او پری نظرے دیکھاں ایہ برہا پٹک اتر پتی جاں  
 اپرا پتی دی بیڑ دا سوچک لگدی ہے مگر اپنے اودات روپ وچ ایہ پورتی دا اک رچنا تک پر تیک ہونیز دی ہے۔  
 منودی گیا تک طور تے ایہ آتم پچان اک شکتی شالی پریتا بندی ہے تے ایسے پریتا دے روپ وچ ہی ایہ  
 وچھوڑے دی تھاں پراپتی دا انوبھو کراؤندی ہے۔ پراپتی دا ایہوانوبھو ہی برہادی رچنا تک سنبھادنا ہے تے  
 ایسے سنبھادنا ادھیان ہی امرتا دی رچنا برہادی اردھانا کردی نظر آؤندی ہے :

ساڈی اک مہارک سانوں

سورج ساڈے بو ہے آیا

اوس نیں اج اک کو امتک کے

اپنی اک سٹائی وے

(چیمڑ: پنا 46)

اپنے ولوں ساری بات مکا چنھی

ہلے وی اک ہوکا تیری گل کرے

(چانن دی پھلکاری: پنا 37)

امرتا پر تہم کاوی دا اک کھ دھرا ناری سویدنا ہے۔ مگر اوس دی کوتا دی کیئوس ناری نوں ہی اپنے  
 چتر اں دا حصہ بناؤندی ہے (جویں کہ بپتے آلوچکاں دی مانتا ہے) ایہ نظر کش امرتا دی بہو آئی کی کوتا نال  
 انصاف نہیں۔ دراصل ناری ہر سمیں دی کوتا دا وشا بندی رہی ہے۔ چاہے اوہ کوتا کسے کوئی ولوں لکھی گئی ہووے  
 بھاویں کسے کوتری ولوں۔ ایہ دکھری گل ہے کہ کسے اک رچنا کار دا ناری پرتی درشتی کون ہووے ریہا ہے تے  
 دو بے دا ہووے۔ اتے اجیہی اوستھا وچ بچے اک عورت رچنا کار عورت ذات پرتی، اوس دیاں سمیا داں پرتی کجھ  
 زیادہ سوچیت ہو کے لکھدی ہے تاں ایہ سو بھاوک ہی ہے۔ نچت طور تے اک استری ہون دے تے امرتا  
 استری من دیاں گہرائیاں وچ اتر کے اوس دی رون ویدنا، اوس دے کرما پر تیکر مادا احساس ادھک سوچھنا نال کر  
 سکی ہے۔ اوس دیاں انیکاں کوتا داں جویں 'مجبور'، 'پنجاب'، 'کنیا دان'، 'ویو پار'، 'ان داتا'، اتے اوس دے انیکاں

گیت استری ذات دیاں مجبوریاں، اوہورے سپیاں، دردناک پیڑا اتے اوس دی ترس یوگ ستھرتی دی پرتی  
 ندھتا کرویاں بن۔ اپنی کوتا مجبور وچ اوہ لکھدی ہے:  
 میری ماں دی لکھ مجبوری

میں اوس حادثے واجن ہاں  
 جو میری ماں دے متھے تے لگنا ضروری  
 میری ماں دی لکھ مجبوری.....

(مجبور: پناہ 12)

ایسے طراں کوتا ان داتا وچ اوہ ناری دی ستھتی راورن ایویں کردی ہے:  
 ان داتا! میں چم دی گڈی، کھڈ لے، کھڈا لے  
 لہو داپال، پی لے پیا لے

میں ہاں اک درتن دی شے  
 جو میں چاہے ورت لے  
 اُگی ہاں، پیسی ہاں، کجھی ہاں، ویلی ہاں۔  
 تے اج تے توے اوپر جو میں چاہے پرت لے

میں برتی توں دودھ کچھ نہیں جو میں چاہے نکل لے  
 تے توں لاوے توں دودھ کچھ نہیں جناں چاہے پکھل لے

(ان داتا: پناہ 35)

ایداں ہی اوسدیاں اینکاں انیک ہور کوتاواں بن جو ناری دی منو۔ ستھتی، بھوتک، سماجک اتے  
 آرتھک ستھتی نوں اپنا کیندر بندو بناؤ ندیاں بن۔

تے جتے امرتا درتمان سماجک سندر بھوج ناری دی اوستھا پرتی ایس حد تک سوچیت ہے، او تھے ہی

اوہ سماج سے رو جے پہلوؤں اس توں وی اٹھج نہیں۔ اوہ ایس تھہ پرتی پوری طراں چنت ہے کہ کسے وی سہایت کار دا اپنی سہا جگہ تھستی پرتی جاگ رک ہونا بڑا ضرورہ اتے محنت پورن ہے۔ مگر اوہ ایس گلوں وی سوچیت ہے کہ کوتاہ دے کھاتک مل دا نرنا کرن اپنی کیول یوگ چیتنا نوں ہی اوحاد نہیں بنایا جاسکدا کیونکہ سہا جگہ کرت کیول چیتنا دا ہی اک روپ نہیں، ایہ منکھ دے رچنا تھک کم دا وی اک روپ ہے۔ ایسے لئی اوسدی مانتا ہے کہ سہا جگہ کرت دا صحیح مل پاؤن لئی جتھے ایہ دیکھنا ضروری ہے کہ سہا جگہ کار اپنی سوہر دتا تے سوہر دے نال نال ایسے سماج پر بندھ ویج آپے مانوی آپے نوں کنا کو مستتر رکھ سکیا ہے، اوتھے ایہ دیکھنا وی ضروری ہے کہ اوہ اپنے سہا جگہ کرم بارے کنا کو سوچیت ہے، اوس وی کرت وی سچا رشتی کئی کو دیا پک ہے تے اوس ویج مانوی پریرنا جن دی کئی کو یوگتا ہے۔ ایسے بھادنا ادھیان ہی امرتا پریم دا تھہ صدای سمیں دی نبض تے ریہا ہے تے اوہ ہمیشہ ہی اپنے سہا جگہ قدم دے سہا جگہ پرکار ج پرتی سوچیت رہی ہے۔ مذہبی جنون بارے اوہ لکھدی ہے:

جدوں مذہبی عشق جنون بن سرنوں چڑھدے جان.....

مذلوہا چڑھداسان

بدایاں دے مونہ تر کھے، پریتاں دے مونہ کھنڈے

تے چمن جو کے میٹھ کسے دے جھک جھک ہو جان

جاں جیوں گر جاں دیاں چنجاں

جیوندے موئے ہڈ کسے دے چونڈ چونڈ کے کھان

بہو بیوی دی بھل جائے پہچان

(جنون: 11)

تے ایذاں ہی جنگ دی حقیقت بارے اوس دی قلم پرکارا ٹھادی ہے:

بہادر لوک میرے دیس دے

بہادر لوک تیرے دیس دے



ایہ سارے مرن مارن چاندے  
 سراں نوں وارن چاندے  
 صرف ایہ گل وکھری ہے  
 کہ سرکدے اپنا نہیں ہوندا

(تحفہ: پتا 117)

تے تال ہی اوسدی کو تا جنگ دے رستے نوں تیاگ کے ایہ امن سفیہاوی دیندی ہے:  
 امن دا ایہ عہد نامہ  
 آؤ دنیا والیو دخط کرو

نفرت دی کالی رات ہے، نفرت دی کالی رات ہے  
 ٹھوکرناں گلے علم نوں، ٹھوکرناں گلے قلم نوں  
 دل دا چراغ ہال کے ساہویں دھرو

(عہد نامہ: پتا 136)

تے سامراج اتے لوک راج اوپر امر تانچ ویا لگ کر دی ہے:  
 سامراج: اک ناواں شاہی بوٹا  
 ہر آدم دی ذات کھیل دے وا لگ اگے  
 حاکم دا حکم اوٹاں ہے، اوہ جتاں وی کر لوے  
 تے پر جادی چیز اوٹی ہے، اوہ جتی وی جر لوے

تے لوک راج: کالی گلوچ دی کھیتی  
 کہ بنداجدوں مونہ مارے تاں جتی چاہے جر لوے  
 کھری وی بھر لوے، تے فیر جدوں چاہے  
 تاں اوے کالی گلوچ دی بہ کے جگالی کر لوے....

(دیکھ کسیرا رویا: پتا 131)

ایداں امرتا پر یتیم نچت ہی سماج اتے مانوتا پرتی اک سماج کاروے کرتب نوں پھلنا نال بھاء وندی ہے۔ جتھے اوہ اپنیاں کوتاواں راہیں سمکالی جیون دا پرتی بمب پیش کردی ہے او تھے اوہ جیون نوں اک صحیح سدھ دین وچ دی پھل ہے۔ اوس پاس۔ تھار تھک سچ (Reletive Truth) دی ہے، اتے ابو بھوتکنا سچ (Realised Truth) دی ہے تے نال ایناں سچاں دی پڑچول کرن واسطے تہجی اکھ دی۔ نرسندیہ اوسدی چوکی کوتا اہس تہجی اکھ نال دیکھیا تے پراپت کینا گیا جیون انوبھو ہی ہے۔

اتے وچ امرتا پر یتیم دی کوتا تڑکے گھڑے دا پانی دچوں کچھ سٹراں تہاڈے ساہنے پرست ہن:

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی

کل تک نہیں رہنا .....

اج دا پانی لیکن لاہوے

کل دی تریہ دا قرضہ

ناں پانی نہیں کئی بھنا

ناں پلے وچ رہنا

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی

کل تک نہیں رہنا

تے اتھے میں ایہو ہی کہنا چاہاں گی کہ امرتا نہیں بھانویں کچھ دی کہا ہووے، کچھ دی سوچیا

ہووے، بھوخ ایس ستھ دی گواہی دیوے گا کہ امرتا دی کوتا اوہ نزل پانی سی جس دی جدوں کدے ساپت ناں

ہوئی تے جو جاناں تک لوکاں دی ساہک تریہ نوں بھاندی رہی۔

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پریم نوں ست سوال

منکھ اُتے جدوں لگاتار ظلم ہوندا ہے تاں اوں دے سبھا وچ اک عجیب جہی کڑتن آدنی سبھاوک ہے، جہڑی کہ وینگ کلا لئی بہت اُچھاؤ زمین بندی ہے۔ جویں کہ اتہاس توں وی سپشٹ ہے کہ پنجایاں دا سچ جیون ہر حملاور دی آمد سے انیکاں وار جڑھوں اکھڑا ہے، تے نتیجے وجوں ساڈے لوکاں دی بولی وی ودھیا وینگ (طنز) دے پچھن بین، پر کیہ کارن ہے کہ ساڈے پنجابی ساہت وچ ابے تک ایہ ودھا سٹھاپت نہیں ہوئی؟

امرتا : جاپدا ہے، کڑتن دا بہتا انش، پنجایاں دی محنت مشقت دے مڑھکے نال دُک کے، اوہناں نوں کڑتن دے زہر توں سرخرو کر دیندا رہیا۔ ساڈے ساہت کاراں لئی وی، اوہناں دی قلم نہیں، ہمیشہ کوئی ہور محنت روئی دی ساڈھن بنی رہی۔ تے کڑتن دا باقی انش، پنجاب دی ستاں صوفیاں تے ملنگاں دی لمی روایت والی اپرامتا وچ رل کے اک اپرامتا بن گیا۔

میں ذاتی طور اتے بھاویں کھیتاں دی محنت نال کدے نہیں جڑی پر، تھیں کم کرن دے سبھا نال ہمیشہ جڑی رہی ہاں۔ تے نال ای درویشی سبھا نال۔ ایس لئی ذاتی تجربے توں کہہ سکدی ہاں کہ ضرور ایہی کارن ہون گے۔ جہناں نے ادب وچ طنز نوں اوس طرحاں سان اتے نہیں چڑھایا، جس طرحاں وقت دیاں سماجک، مذہبی، تے سیاسی حالتاں اوہدے لئی زمین تیار کردیاں رہیاں۔

قلم دی جرات تے بے باکی ساڈے ساہت دا ہمیشہ سبھا رہی ہے، اوہ ہن وی

ساڈے ساہت دا سچ انگ ہے۔

؟ اجوکی پنجابی کوتا عام لوکاں وچ دن بدن گھٹ مقبول ہو رہی ہے۔ کیہ ایہ  
ایس دے چھند مکت ہون کر کے ہے یاں ہور وی کجھ کارن ہن؟

امریتا : انج تاں ایہ ساری دنیا وچ کوتا دی نامقبولیت دا دور ہے۔ ایس دے  
باوجود وی کہ دنیا دے کئیاں حصیاں وچ انٹرنیشنل مظاہرے ہو رہے ہن۔۔۔۔۔ کوتا  
ہندستان دیاں رگاں وچ اتری ہوئی سی، کیوں کہ باہر دیشاں وچ کوتا دی روایت دا  
سیندھ ادبی طور اتے انسان دے ذاتی احساس نال ہمیشہ رہیا سی، یاں کدے کدے لوڑ  
پہن تے قومانتري احساس نال جڑ جاندا سی، پر سماجک روہ ریتاں نال، تے دھارمک  
روایتاں نال ایس طرحاں کدے نہیں سی جڑیا ہویا، جس طرحاں ساڈے دیش وچ جڑیا  
ہویا سی۔ تے ایہ ویاہ دی دیوی دے، یاں سادھنا دے منتراں دی صورت وچ اچے تک  
جڑیا ہویا ہے۔ ایس لئی سانوں ادبی کھیتز وچ کوتا دی نامقبولیت بہت اکھردی  
ہے۔۔۔۔۔

ایس نامقبولیت دا اک بہت وڈا کارن ایہ جاچدا ہے کہ کناں نال کوتا دے  
سیندھ دی جو روایت چلی آوندی سی، اوہ اتہاس دے اک موڑ تے آ کے کناں نالوں  
بہت متھے نال جڑن لگ پئی ہے، تے ایس لئی اک سروتے نوں اک پانٹھک پن وچ  
مشکل پیش آ رہی ہے۔۔۔۔۔

اوس نال جزوا کارن ایہ وی ہے کہ کوتا نوں کناں نالوں توڑ کے متھے نال  
جوڑن دے عمل وچ، کوتا والیاں نے کوتا وچلے سنگیت نوں لوڑ توں بہتا ناکار دتا  
ہے۔۔۔۔۔

ایہ ٹھیک ہے کہ اک وقت آیا سی، جدوں قافیہ دریف جہی بندش دی سلامتی  
واسطے، چٹنن نوں واریا جان لگا، تے اوہ تک بندی نوں نکارن لئی، کوتا سوچ پردھان  
ہوئی۔ پر سوچ پردھان کوتا نے بندش دے تانکے توڑ کے جو راہ موکلا کیتا، اوس راہ  
نوں اک بہت سوکھا راہ سمجھ کے، بہت سارے واہو دانی اوس راہ اتے پے گئے ہن۔



دا یقین ہوندا ہے۔

پر ادھی کرم جے بے یقینی وچوں اک اچھبے وانگ ساہنے آ جائے، تاں اوہ پاٹھک دے لوواں وچ اُتر جاندا اے۔ ادھی لوواں وچ اتریا ہویا اچھبا اوہرا چٹن بن جاندا اے۔ تے ادھی چٹن، کہانی دے کردار وانگ، اک جرات بن کے اوہنوں کسے سنبھالنا دے راہ لے جاندا ہے۔۔۔۔۔

؟ میں کدھرے پڑھیا سی کہ سیانا آلوچک ہمیشہ لیکھک دی آگوائی کردا اے۔ پر ساہج گوہٹیاں وچ کتاب دے ریویو سے عام طور تے ایہو جی آلوچنا سنن یاں پڑھن نوں ملدی اے، جس توں من اُداس ہوندا اے۔ تہاڈے دچار وچ 'آلوچک' نوں کیہ دین ہونی چاہیدی اے؟

امرتا: سریندر جی! آگوائی لفظ جے ضرور درتا ہووے، تاں ایس پہلو توں درتیا جا سکدا اے کہ کنیاں بنیادی سچائیاں نوں جدوں لیکھک اچیت طور تے لکھ جاندا اے، تاں اک آلوچک اوہناں نوں سے دی چیتنا نال جوڑ کے اُجاگر کر سکدا اے، تے ایس طرحاں چیتنا دی ہور زمین لیکھک دے چٹن دی حد وچ آ جاندی اے۔

میری نظر وچ آلوچک، اوہ پاٹھک اے، لیکھک دے سپہیاں وچ سلیا ہویا اوہ چٹن شیل پاٹھک، جنہوں اوہ ہزاراں پاٹھکاں دے مہاندریاں وچوں لکھدا رہندا اے۔ پر ایہ میں اوس آلوچک دی تشریح کیتی اے، جو آپنی ہوند دے ارتقاں نال جڑیا ہویا اے۔ اوہناں دی گل نہیں کیتی، جہناں دی ہوند نال اوہناں دے ارتھ ٹٹ گئے ہن، تے جہناں نوں پڑھ یاں سن کے تہاڈا من دی اداس ہو جاندا اے، میرا وی۔

رچنا توں آلوچنا دی گل کردیاں میں بھاشا دبھاگ والے ساگم وچ آکھیا سی، رچنا، زندگی دی آلوچنا ہوندی اے۔

زندگی دی کلپنا ولوں کیتی گئی، زندگی دے -تھارتھ دی الوچنا توں زندگی دی سرتھا ولوں کیتی گئی، زندگی دی سرتھا دی آلوچنا۔

پر ایس آلوچنا دا حسن اودوں دیکھیا جاسکدا اے، جدوں ایہ احساس دی شدت،

سوچ دی ڈیگھائی تے بیان دے انداز والے پورے تخلیقی عمل وچوں گزر کے ساہنے  
آدندی اے، صورت نظم دی ہووے یاں نثر دی، پر کسے رتن وانگ اودوں لہدی اے،  
جدوں احساس سمندر ورگا ہوندا اے، تے چٹن سمندر منھن ورگا۔

تے ٹھیک ایہی کرم اوس آلوچنا دا ہوندا ہے، جو ایس آلوچنا دی مڑ آلوچنا  
ہوندی ہے۔

تے ایس طرحاں نظم یاں نثر دی صورت اختیار کرن والے احساس نوں آلوچنا  
دا حق ایس لئی حاصل اے کہ اوس نوں زندگی نال بے پناہ محبت ہوندی اے۔ اوسے  
طرحاں اک آلوچک دی نظر نوں رچنا دی آلوچنا دا حق صرف اودوں حاصل ہوندا اے،  
جدوں اونہوں نظم یاں نثر نال اوڑکاں دا عشق ہووے۔

جس طرحاں زندگی نوں نکارن دا بل، بہتر زندگی تے اوس کلپنا کول ہوندا  
اے، جہدے کول سمجھ تے دلیل ہوندی اے، اوسے طرحاں رچنا نوں پھولن تے پڑچولن  
دا بل، آلوچک دی سمجھ تے دلیل وچ ہے۔۔۔۔۔

سو ایس تشریح نوں ساہنے رکھ کے تہاڑے سوال دا جواب ایہ دینا چاہواں گی  
کہ ایہ دو شکلیاں دے وچ روبرو ہون والی حالت ہے، جہناں وچوں اک نوں کرم شکتی  
آکھیا جاسکدا اے، دوجی نوں چٹن شکتی۔

اوس کرم شکتی وچ چٹن وی شامل ہوندا ہے، تے چٹن شکتی وچ کرم وی۔ پر  
کرم شکتی (لیکھک دی) وچ جو چٹن شامل ہوندا اے، اوہ اپنے ستر روپ وچ ہوندا  
اے۔ تے چٹن شکتی (آلوچک دی) وچ جو کرم شامل ہوندا اے، اوہ پردھان روپ وچ  
ہوندا اے۔ ایس لئی ایہ وی ٹھیک اے کہ ایہ دو شکلیاں برابر دیاں شکلیاں نہیں۔ تاں  
دی میں ایہناں نوں دو شکلیاں آکھ سکدی ہاں، کیوں کہ ایہاں وچ، جے اک شکتی  
(لیکھک دی) اوس دوجی شکتی (آلوچک دی) نوں، چٹن دی زمین دے سکن دے سرتھ  
ہے، تاں اوہ دوجی (چک دی) دی، اوس پہلی (لیکھک دی) شکتی والی زمین نوں پہچان  
دے بل تے، ہور زرخیز کرن دے سرتھ ہو جاندی اے۔

ایس زرخیزی نوں جے تسیں اگوئی لفظ دے ارتھ نال جوڑنا چاہو، تاں جوڑ سکدے او۔

؟ ”گرو نانک“ تے نکھی تہاڑی نظم تے ”رسیدی کلکت“ دے کجھ حصیاں بارے پنجاب وچ کافی دیر توں کجھ لوکاں ولوں اعتراض اٹھائے جا رہے ہن۔ منکھی جیون وچ ”دھرم دی مہتا دے“ دے پرسنگ وچ ”لیکھک دی آزادی“ بارے تسیں کیہ کہنا چاہو گئے؟

امرتا : دوست ! ایہ سوال آپ نے آپ وچ سے دا دکھانت اے۔ کیوں کہ دھرم دی ویاکھیا لیکھک نے کیہی سی، ایسے لئی ویداں دے رکھیاں نوں یعنی وقت دے لیکھکاں نوں ’ساکھیا کثرت دھرم‘ آکھیا گیا۔ جہدا ارتھ ہے۔ اوہناں نے (لیکھکاں نے) سرشی دے مولک تان دا ساکھیا نکار کیتا، تے اوہناں تان نوں منتراں وچ گر تھت کیتا۔

اک اک اکھر نوں اک اک تہ دا پرتیک بنیا گیا، ایسے لئی اک اگنی دے دکاس کرم نوں جدوں پنجابہ ناں دتے گئے، آتما وی آکھیا گیا، چیتنا وی، شہد وی، واک وی، تاں واک رچنا کرن والے کوی نوں وی اگنی آکھیا گیا۔

جدوں دیو نوں، یعنی لیکھک دے قلمی چمٹن نوں ’ہے دیو ! توں آپ دید روپ این‘ آکھیا گیا تاں اوہوں ’دھرم دی مہتا دے پرسنگ وچ لیکھک دی آزادی‘ ورگے سوال دی گنجائش کیتے سی؟

پر ایہ سوال پیدا ہویا، ایس لئی میں ایس سوال نوں سے دا دکھانت آکھیا ہے۔ جدوں ایس سوال دی زمین تیار ہو رہی سی، اج توں صدیاں پہلاں، تاں دھرم دے مول ارتھاں دی ویاکھیا لئی کئی اپنشد پران تے کئی ویدک درشن جے گرنتھ لکھے گئے، سپیشٹا دتی گئی کہ سبھ دیوی دیوتے مول تان دے لوکک روپ ہن۔ یوگ اوہناں تان دی ویاکھیا ہے۔ تے کرم کاٹھ اوہناں تان دا ابھینائے ہے۔

کرم کاٹھ نوں ’بحث تان دی دکاس پرندرا دا ادت چمٹن‘ آکھیا گیا۔ رگ وید وچ ایہہوں تک سپیشٹا دتی گئی کہ جو کرم کاٹھ دیاں ودھیاں وچ الجھ کے مول ارتھ



نوں بھل جاندے ہن، اوہناں لئی ویداں دی راگ روپی کام دھیو باجھ ہو جاندی ہے۔  
سو دوست ! چٹن دی کامھیو اوہناں لئی بانجھ ہو گئی ہے، جو کرم کاڈ وچ،  
یعنی باہری چھان وچ الجھ کے دھرم دے نول ارتھ نوں بھل گئے ہن۔

؟ ہن تک تسیں جدوں وی کسے نوں ست سوال پچھدے سی، تاں ستویں  
سوال ویلے ایہ چھوٹ ہوندى سی کہ اک سوال اوہ آپ ای آپنے کولوں پچھے۔ پر اج  
جی کر دا اے کہ یہ ستواں سوال وی میں ای پچھاں۔ پچھنا چاہندا ہاں کہ تہاڈے ناول  
"پنجر" تے نظم "اج آکھاں وارث شاہ نوں" پھڈ کے، تہاڈی بہتی رچنا دی مکھ دھارا  
سر وچ "ودھیا محنت" دی دنیا تاں ہے، پر اوس وچ آرتھک (معاشی) تے راجتیک  
(سیاسی) کیدواں دا بہت گھٹ ذکر اے۔ پر پچھلے کجھ سالوں دوران تہاڈے چٹن وچ  
'متھبھاس' 'دھرم' 'یوگ' 'تنتر' تے 'جیوتش' وغرا جو دشنے شامل ہوئے نیں، ایہ ساجک چیتنا  
ول 'محبت' والے بندی دا پیار نیں کہ اوس دا بدل؟

امرتا : تہانوں آپنی فائل دا اک ورقا دکھاندی جیں، جو میری نویں ارنجی ہوئی  
کتاب دا اک حصہ ہے۔ ایہ کتاب اتھاس (تواریخ) نال اک لمی گل بات ہووے گی۔  
جدوں میں اتھاس نوں آکھیا آججن اج گلاں کریے، تے جدوں اوہنے آکھیا 'میںوں اوہ  
وی دن یاد ہے، جدوں اج توں کئی مٹھی ورھے پہلاں توں ایہو گل تڑپ کے آپنے  
محبوب نوں آکھی سی تاں میں جواب دتا 'اج دی اوہو تڑپ اے، تے کہن والی میں،  
آپنی اوستے میں دی وشالتا ہاں، تے جھوں مخاطب ہو رہی ہاں، توں اتھاس ! میرے  
اوستے محبوب دا انت روپ ایں۔'

دوست ! ایہو ورقا تہاڈے سوال دا جواب اے۔ میں اصل وچ چرک جاتی دی  
ہاں، پراچین کال وچ چرک اوہنوں کہندے سن، جھوں ساری عمر گیان دی تریہہ لگی  
رہے۔ ایہ متھبھاس، دھرم، یوگ، جیوتش تے تنتر، میرے لئی 'محبت' والے بندو دا پیار ہن،  
علم دی پیاس۔

(پی اتتر: جمیل احمد پال)

## دجوگ

میں امرتاجی نوں کدے ملی نہیں۔ درشن ہوئے، اوہ دی ٹیلی وژن راہیں۔ اوہناں نوں بولدیاں دی ٹیلی وژن لھاپئی اوہناں دا بڑا سبھاؤ ہے۔ مٹھاتے زنبھیا ہو یا بولدے نہیں۔ اوہناں دے ادبی قد توں تے ہوش سنبھال دیاں ای جانکاری ہو گئی سی۔ جدوہتاں دی نویں ٹیکنی نظم۔ وارشاہ نوں خطاب کر کے لکھی ساہنے آئی۔ پنجاب دی دھیاں لئی امرتاجی دی کوکر دوہاں پنجابیاں توں پارتا کیں اپڑ گئی۔ اوہدوں پاکستاں نوں دجو دچہ ایاسی۔ دھرتی دی دغڈ دے پھٹ اے دونوں پاسے بحرے سن۔ امرتاجی دی لہو بھگی دی نظم دے چھٹے ہندوستان دیاں کندھاں ٹپ کے عام کوہاٹی سے بانے بھوں گئی۔ انج امرتاجی ہوش سنبھال دیاں میں بھیاں کڑیاں دے دلاں دچ وک گئی۔ نہیں بھگی پر نہیں بھگی۔ کسے نوں وی نہیں بھگی۔ امرتا تال میری سیان کج انج اے۔ لگدا اے جیویں اوہ میرے لہر دی دنیا دا حصہ نہیں۔ میرے زوق تے شوق دا اک اڈا نہیں میری ادبی بستر وچ اگا ہی دا اک نمونہ نہیں۔ امرتاجی دیاں لکھتاں کدے کدے شاہ مکھی وچ ایدھر دا کوئی کوئی رسالا باں اخبار چھاپ دیندا اسی اوہ دی اوہ اخبار جہڑا۔ انسانیت پسند تے آل دوال دی خیر خبر رکھن دا پتہ رکھتا ہے۔ سن۔ جد کوئی نظم کہانی چھینی بڑے چاؤ نال پڑھنی۔ ایسراں پنجابی زبان تے ادبی دوجے پاسے نور دا جج لیکھا پتا لگ جاندا اسی۔ اپنے پاسے دی پنجابی دی اک سگ دی اوہدوں ای شروع ہوئی تے جانی پنجابی وچ ادب تے زبان دیاں ڈونکھیاں رمزاں نہیں۔ اوہناں رمزاں دل دھیان مارنا چاہیدا اے۔ اے ساڈے لئی سوکھت تے مان وی اے۔ جیویں ایڈی وڈی رائٹر امرتا اپنے اپنے توں اپنے خیال نوں اپنی بولی وچ سوکھے سبھا پیش کر دیندیاں نہیں۔ ایسے طراں ہو رکھن والے وی ہوں گے پنجابی وچ۔ کج ایس طراں مینوں پنجابی دا کلاسیک ادب پڑھن دی پریرنا امرتاجی دلوں ملی۔ پڑھیا۔ تے جس پے گئی۔ جس وہ ملایا۔ کہن اکرن دی جاج وی آگئی پر مر امرتاجی نال میل کدے وی نہ ہو سکيا۔ بہت جتن لیتے اپنیاں اوہناں تائیں اپڑان وچ کئی جھانے وہ

کھاہے۔ اک داری میرے قابلِ وزت لکھاری جناب افضل احسن رندھاوا جی نال ملاقات ہوئی۔ گھاں  
باتاں چداوہناں آکھیا۔ تیس اپنیاں کہانیاں بھارت نہیں بھجے؟ میں اتر دتا۔ او تھے کہوں بھجھا میرا او تھے  
کوئی نہیں رندا۔ میں کسے نوں جاندی نہیں۔ رندھاوا جی کین لگے۔

”امرتا پر تم نوں وی نہیں۔“

”ہائے میں مراں۔ اوہ تے نہت وڈی رائٹر اے، اوہ نوں کیوں بھجھاں؟“ اوہ آکھن لگے ناگ  
منی پر تم دا پر چداے۔ لیا مینوں اپنی چھپی کیا ب دیاں گھٹنوں گھٹ چھ کاپیاں دے۔ میں ناگ منی نوں کھل  
دیاں گا۔

دو بجے دن میں چاؤ چائی ”پنے اوہلے“ دیاں پنج کاپیاں رندھاوا صاحب دے حوالے کیتیاں تے  
اڈیک لگ گئی۔

”ناگ منی ارج آیا کہ کل آیا۔ ہائے لوہٹرا۔ اتھوں تے کوئی رسید وی نہ آئی۔“ ناگ منی نے کیہہ آنا ہی۔  
ایہناں ای دتاں وچ امرتا جی دی ہڈورتی ”رسیدی ٹکٹ اردو لپی وچ چھپ کے پاکستان دی مارکیٹ وچ  
آگئی۔ پڑھی تے امرتا جی نال گھاں چہ گل نکل آئی۔ تو صیف کہن لگی ”توں اپنی کتاب امرتا نوں کھل۔ ناگ منی دا  
پتالیا۔ کتاب کھلی نال اپنے ہتھ نال چاہ کھی چہ لکھی چھٹی دی کھل دتی۔ فیراؤ یکن بہہ گھسی، پر کٹھوں؟ جیہڑی گل  
نصیب چہ نہ ہوئے کیوں نیجے۔ ل ل لگی رہی جیہڑی بہن تاں رتی۔ بقول غلام فرید

آپ دنجائیاں قاصد بھجھاں میرا تھی گیا حال بیماراں

امرتا پر تم لئی اک ہرکھ

آپاں اشوقی کنایتوں دیکھنے دا افسوس کہ کدے نہ مل سکی

اک سک سی چھالے چھلنے دی سانہویں بہہ کے کدے نہ چھل سکی

گل پانی جو صدری جبر والی پانی رہی دلیلیں نہ مل سکی

ویلے آس دی کلی سوس بھڈی کدی کلی سوسی کھل سکی؟

مینوں رب نے جس جاسنیاں او تھے رہی نہ اچھ وی مل سکی

جی نواں سدا ای ہرکھ تے دکھ رہے گا جیندے جی نہ تینوں میں مل سکی

بڑا چاؤ سی تینوں ملنے دا دادھو دکھ جے کدے نہ مل سکی

## امرتا پر یتیم پنجابی ساہت دامن

امرتا پر یتیم پنجابی ادب نال جڑی مہان کلاکاری۔ اوس دی کلاکاری ساہت دے ہر کھیت ج اُبھردی ہے۔ ایہ کھیت بھادویں ساہت دی دنیا نال جڑیا ہو دے تے بھادویں ساہت کاراں دی دنیا نال۔ جدوں وڈے ساہت کاراں دی گل چل دی ہے تاں اوس سے امرتا داناں گونجا ہے، ایہ تاں ضروری نہیں پنجابی کھیت وچ ہی گونجا ہو دے کیونکہ امرتا تاں کئی سال پہلاں ہی پنجابی کھیت دی سیماں پر کر چکی سی، اوس دیاں رچناواں بھارتی ساہت دا حصہ بن جس وچ پنجابیت دی جھلک چندی ہے۔

امرتا دی زندگی پنجابی لیکھک دی پریمھا شائیت کردی ہے، امرتا دا ہچھوڑا تے اوس نال جڑے سرکار اوس نوں لیکھک نالوں وڈا انسان شیت کردے بن۔ امرتا نے کدے دی اپنے آپ نوں فضول دے کماں ج نہیں ڈھالیا۔ اوس دا سو بھا پنجابی لیکھکاں نالوں بہت بھن سی۔ پنجابی لیکھک تاں اپنے سرکالیاں نال لڑکے ارکھائی جیون جیوندے رہندے بن۔ اوہناں نوں لگدا ہے سارا شہر تے ساہت ساڈی جیب ج ہے۔ ساڈیاں رچناواں کر کے کتے کجھ وی ہوسکدا ہے؟ پر ج بہت دور ہے۔

امرتا دا سو بھا اوس دیاں رچناواں چوں جھلکدا ہے۔ اوس وانگ اوس دیاں رچناواں دی نگہ دندیاں بن۔ اوہناں نوں کسے آسے جاں جو گاڑ دی ضرورت نوں پئی۔ کوئی دس نہیں سکدا کہ امرتا دا گھیرا کنا وشال سی۔ اوس ہمیشہ چہچتا توں بچدی رہی۔ لوک پرپا ہوتا اوس لئی وڈی مل سی، شائد ایس کر کے اوس دے تور جان توں بعد بھارت دا میڈیا اوس نوں وڈے پڑھرتے یاد کر رہا ہے۔

امرتا رچنا کار دے طور تے وڈی رچنا کار تاں سی ہی، پر ایس دے نال اوس نے پنجابی ساہت نوں کھرتے پہنچائی ہے۔ اوس دی 'ناگ منی' لئی ہر ساہت کار واسطے درکھلا سی۔ اوس نے ایہ کدے نہیں سوچیا کہ فلاں لیکھک کس گروپ دا ہے۔ امرتا نے کوئی فوج تیار نہیں کیتی سکوں اوس دی فوج اپنے آپ تیار

ہندی گئی۔ کئی ایسے فوج و چوں جرنیل بن گئے۔ بھارتی بھاشاواں دج اوس دی رچناہاں کوئی کشت اٹھائے مل جاندی ہے۔ اوس نے پنجابی ساہت نوں ہور بھاشاواں نال کھڑا کیتا۔ جوتھاں بھارتی ساہت وچ امرتا دا وہ ہور کسے دا نہیں کیونکہ ایماندار آدمی زندگی دے ہر موڑ تے پھل بندا ہے۔ جے کراوہ اکھل ہو جاوے تاں زندگی اپنے اترتھ گواہی دے دی ہے۔ شاید ایسے کر کے امرتا ورگا ہونا بہت مشکل ہے۔ اوس دی تسیں نکل تاں کر سکہے ہو پر مُکلتا کتھوں لے کے آؤ؟ مُکلتا کوئی اجیہی چیز نہیں جیہڑی ہزاروں ملدی ہووے۔ ایہ تاں خدا دلوں دتی ہوئی چیز ہے جیہڑی ساہتے خون دج رچ جاندی ہے۔ ایس دی وڈی اداکارن امروز امرتا دی محبت ہے جیہڑی پنجابی ویرھے دی سماں پار کردی ہوئی نویں اترتھ سر جدی ہے۔

امرتا نے بہت لمبا سفر طے کیتا۔ اوہ اپنے آخری پلاں جگم رہی۔ نہ کچھ پڑھنا نہ لکھنا۔ ناگ منی وی بند ہو گیا اتے اچانک اک دن امرتا دی تر گئی۔ اوس دے تر جان نال بھادویں اج دے لالچی جگم کسے نوں کوئی فرق نہ پیا ہووے پر اوہ جگم جیہڑا ہمیشہ کل جگم دے نال نال چلدا رہندا ہے، ایس شخصیت نوں سجدہ کردار ہے گا۔ اتے اتباس دے پناں تے ایہ گل ابھردی رہے گی کہ پنجابی ادب نے امرتا پر یتیم ور گیاں شخصیاں دی دتیاں ہن۔

اج وی ستھتی بہت ہی تر سمانی ہے۔ ایہ ستھتی وی ایسے طراں سی۔ ایس بہت کچھ نوں سرجن دی کوشش کر دے ہاں پر اپنے لالچ نوں، شہرت نوں تیاگ نہیں سکدے۔ سانوں لگدا ہے ساڈی گڈی چیزھی ہوئی ہے، ایس جگم سانوں سواد آؤندا ہے۔ پر ایہ سواد اکھاں نال دیکھی چیز دی سندرتا تے زبھر کردا ہے۔ اصلی گل تاں جیہڑی دس سکدی ہے۔ اوہ دسدی ہے سواد کتناں منھا ہے، کتناں کوڑا؟ اوس سے اصلیت جان کے تک، کن، اکھ تے جیہڑا اپنا توں فیصلہ سناؤندے ہن صرف دکھانت پیدا ہندا ہے کہ گل تاں کچھ ہو رہی نکل۔

اصلی جیون تے سنگھرش تاں اوہی ہے جس دی تعریف تہاڈے تر جان توں بعد ہووے۔ جیوندے جی تاں عام بندہ اپنے آپ جگم مان نہیں ہندا۔ فیر ساہت کار تاں اُنجھ ہی کُتی چیز ہندا ہے۔ اج دے دور وچ کوئی بھراہیت بھائی (جو وڈا لیکھک ہے) نوں بھنڈر رہیا ہے کہ اوہ سمجھ توں خطرناک لالچی بندہ ہے، کوئی عورت اپنے وڈے لیکھک پتی نوں بھنڈر رہی ہے کہ اوہ غلط آدمی ہے، پاکھنڈی کردا ہے۔ کوئی پُت اپنے وڈے لیکھک بیٹو تے ہسدا ہے کہ مورکھ نے پانھک جیہڑے ایس نوں اسمانی چڑھا رہے ہن۔ اجیہا کیوں؟ اجیہا ایس لئی کہ ایہ لوک زندگی نوں کھنڈ سمجھ کے اپنے کردار نال انسانیت دیاں بھادناواں نوں جوہں چاہن اوس

رنگ ج رنگدے بن۔ بھانڈا اوس سے بھنڈا ہے جدوں گل زہر ہو چاندی ہے۔

امرتا پرہتم نے زندگی جج جو لکھیا ادھ اوس دے اپنے قد دے برابری۔ اوس نے کسے دی پرواہ نہیں  
 کیتی۔ وڈے دیا رنگ کار لیکھک پر سائی دے انوسار رچنا کار رچنا لکھدا ہے اتے کدے بھوند کے بن۔ امرتا  
 دے نام دی بھونکن والے بہت بن پرواہ اک دن تھک گئے، امرتا امرتا بن گئی۔ جدوں تک پنجاب دا ادھاسریہ  
 اوھر رہے گا اوڈوں تک امرتا دی اکور چنا "اج آکھاں وارث شاہ نوں" کو بخدی رہے گی۔ اجیہی پرسدھی کے  
 کسے رچنا کار دے تھ آؤندی ہے۔ خوش نصیب ہے امرتا جس دی قلم چوں ایہ درونکلیا۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبریں وچوں بول۔

تے اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے دین،

اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن۔

اٹھ درو منداں دیا در دیا، اٹھ تک اپنا پنجاب،

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہودی بھری چناب۔

کسے نے پنجاب پانیاں وچ دتی زہر لا،

تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا۔

ایس زرخیز زمین دے لٹو بھلیا زہر،

گٹھ، گٹھ چڑھیاں لالیاں مٹھ مٹھ چڑھیا قہر۔

ویہ لسی وافیرون ون وگی جا،

اوہنے ہراک وائس دی ونجلی دتی ناگ بنا۔

ناگاں کیلے لوک سوہ بس فیرونگ ہی ڈنگ،

پلو پٹی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ

گلیوں لے گیت فیرونگیوں ٹٹی تند،

ترنجبنوں ٹٹیاں سہیلیاں چڑھوے گھور بند۔

سنے بیج دے بیڑیاں لڈن دتیاں روڑ،

سنے سچ دے بیڑیاں پنکھ اچ پٹیاں دتی دتی توڑ۔

تتھے وجدی ہی پھوک پیاردی، اوہ دھمکی گئی گواچ۔

راجھے دے بھدیراج، بھل گئے اوہدی جاج۔

دھرتی تے لہو دگیا، قبر اس پٹیاں جون۔

اج سکھے کید وین گئے حسن عشق دے چور

اج کتھوں لیاے لہ کے وارث شاواک ہو؟

اپنی زخم رچنا امرتا جیہا سمودین شیل دل ہی کر سکدا ہے۔ اتھے اک گل ایہ وی ابھردی ہے کہ امرتا

دی شاعری اردو تے پنجابی بھا شادے محبت دی پر تیک ہے۔ اوس وی کھ چو نکلے شہد روحاں نوں جگاؤندے

ہن۔ ایس دے الم پنجابی ناریاں سویرے سویرے اپنے پتی (شرابی لیکھکاں) نوں جگاؤندیاں ہن کہ ہن

تاں سوچ چڑھ آیا اٹھو میرے لیکھک شہنشاہ جی۔

1947ء دی ونڈ ویلے جیہڑیاں رچناواں ملدیاں ہن اوہ پانٹھکاں دے گھیرے چوں باہر ہن،

پانٹھک اوہناں نوں پڑھنا چاہندا ہے پر اوہ بہت مہنگیاں ہن۔ بھشم سہنی دا 'تمس' تے لیش پال دا 'جھوٹا ج'

گٹھو گٹھ دوڑھانی سودا ملدا ہے۔ پر امرتا دی ایہ کوتا پانٹھک نوں آسانی نال 1947ء دے درد نال ملاؤندی

ہے۔ ایسے کر کے آکھدے نے گلپ نالوں کوتا دھ پر بھاوت کردی ہے کیونکہ اوس نال دماغ دے بند پئے

دروازے کھولدے ہن، پر جے کوتا صرف کوئی نوں سمجھ آوے جس نے اوہ لکھی ہے تاں فیہر خدا ہی بچاوے:

سوت میری اک گل چروکی.....

کئی وار میں اٹھاس..... سوچاں.....

چلاں..... بھل پر واہ آواں میں

لاش دا قرضہ اہ آواں میں

اک دارا امرتا نے کیا ہی اصل لیکھک اپنے پانٹھکاں دیاں رگاں جیہو نہا ہے اوہناں دے سپنیاں

جی اوہناں وی زندگی دے ہیرے چوکیاں چہ تے ایتھوں تک پہنچا سکنا ہی لیکھک دی بھتوں وڈی پراپتی

ہندی ہے، بھتوں وڈا یوارڈ۔

امرتا واقعی ایہ یوارڈ پراپت کر چکی ہے۔ اوس دی الوداع قیامت دی آؤیک چہ ہے۔



## امرتا پر یتیم: نوئیں پرست ماناں دی سرجک

امرتا پر یتیم پنجابی ساہت دی اک اجنبی وکھن رچنا کار ہے جس نئیں رچنا تک ساہت وچ ہی نوئیں پرست ماناں نوں نہیں سر جیا سکوں سماج وچ دی اپنی جیون فلی راجیں نوئیں ماڈل ستھاپت کیجے۔ اپنی اپنے بلوان جیون فلی اتے ملوان کرتا رہیں اوس نئیں مرد پر دھان سماج دیاں ودھکیاں نوں نہیں ونگار یا سکوں سماج وچوں کڈھن دا اپرا لاوی کیتا اتے اوس نوں اوسدیاں ساہتک سمجھا دناواں پرتی وی جاگروک کیتا۔ اصل وچ امرتا نئیں جس سکالی پنجابی بھارتی سماج وچ وکھن دا بیڑا اٹھایا اوس وچ عورت صدیاں توں کرڑے سماجک بندھناں کارن کمزور اتے تراسد آدھتا دا لمبا پندھ بھوگ رہی سی۔ ایناں کرڑے بندھناں دے باوجود وی جیہڑی عورت رچنا تک کارج ول رچت ہون دا جتن کردی سی اوس دی قلم نوں دھرم جاں پروار کلیان دے وشیاں تک وکھن لئی ہی سمیت کردتا جاندا سی۔ سماج دے ایناں مول ودھاناں دی تکھن نئیں امرتا وچ استری دا ایہ لمبا سنگھرش ہی اوسدے رچنا تک کارج وچ اوسدی ساہتک سمجھتا دا وڈا سروت بنیا اتے استری جاتی لئی دھارک روپ وچ اک بہت وڈی پریرنا دی۔ اوسدی ایس پریرنا نئیں عورت نوں پہلی وار ستتر زبان بخشی اتے اوس نوں اوسدی ستتر روح دی جھلک دی دکھائی۔ ایسے لئی ایس امرتا نوں جیون اتے ساہت دواں کھیتراں وچ نوئیں پرست ماناں دی سرجن کیہا ہے۔

امرتا پر یتیم نوں اوسدی دوستی ساہتک پراپتی لئی بھارت سرب۔ سیرشٹ ساہتک پرسکار گمان پیٹھ نال سامنا گیا اتے بھارت سرکار نوں پدم بھوشن دی پدوی وی دتی گئی۔ ایناں پرسکاراں نئیں جتھے پنجابی زبان دیاں ساہتک سمجھا دناواں نوں راشٹری اتے انتر راشٹری پدھڑتے بلند کیتا، اتھے سماج وچ عورت جات دے گورونوں وی ودھایا۔ اوسدے ایس مہان یوگدان کرکے ہی اوس نوں استری جات دی آواز اتے استری دے جذبیاں، اکٹھیا اتے سویمان نوں جس قدر رندیا گیا، اوس دی ہونو نوں تنائی سمجھ کے جویں کوئیں اوس



اُتے ظلم ڈھائے گئے، آرتھک طور اُتے مرد اُتے اوس دی پردھانائیں کوئیں اوس نوں بے زبان کھتا۔ اجیہی مُوک ویدنا نوں امرتا نہیں اپنے جذباتاں دی سچائی اُتے بولاں دی ندرھڑکتاں اپنے کاوی وچ چتریا۔ اوسدی کوتا 'ان داتا' دیاں ایہ مارک پٹلیاں ایس تھ دا بہت وڈا پرمان، من جس وچ مرد پردھان سماج دی حقیقت نوں دیا نگ دے تیکھے نشتر دی چو بھ نال اوس نہیں ابھاریا گیا ہے!

ان داتا

میں چم دی کڈی، کھیڈ لے، کھڈا لے  
 لہو دایا لہ پنا لے، پیا لے  
 تیرے ساہو میں کھڑی ہاں ایہ، ورتن دی شے  
 جو میں چاہے ورت لے  
 میں بُر کی توں ودھ کچھ نہیں جو میں چاہے نگل لے  
 ان داتا؟

میری زبان تے انکار؟  
 ایہ کوئیں ہوسکدے؟  
 ہاں پیارا ایہ تیرے مطلب دی شے نہیں

امرتا دی کوتا وچ عورت ہون دے سنتاپ سبندھی اوسدی انتر درشتی وچ اوس سے ہوو دھرے گہرائی اُتے پرچنڈا آئی جدوں دلش دی ونڈ کھیں مذہبی جنون پنڈھ استری دے مانوی سنگت نوں اک ہوو دکھائیک پارساں پر اپت ہو یا۔ اُدھلے، بلائکاراں، عورتاں دے نیگے جلوس اُتے اوس اُتے ہر پرکار دے جنسی اتیاچار، اودھیا لیاں ہو یاں عورتاں دے ساجک کلنگ دے دکھائی سنیاں نوں، پُرکھ دے ورھت دی شکار استری دی سپورن نیا ستر ا دے رچ نوں امرتا لے ڈونگھے پانیاں وچ آئی آ۔ تواریخ، خرید، واپار، آدے کوتا داں آدھونک پنجابی کاوچ دے اتھاس وچ احساس دی تہرتا اُتے پرگنا ڈی تہرتا کارن کلاسیکل بن گھیاں۔ 'اج آکھاں وارث شاہ نوں' کوتا ایدھر لے تے اودھر لے ہر تھاں واسطے پنجابیاں لئی اک سائمی مُوک بن اودے ہوئی، کوتا دے کرونا مائی بولاں نے سوچے پنجابیاں نوں روا کے رکھ دتا۔ اوس دی کوتا 'خرید' وی اوس سمیں دی دکھائیک مانوی پر بھاوکاری درھانت ہے جس وچ اوس نے اک اجیہے بچے دی نیچک ڈبیدھانوں

چتریا ہے جیہڑا اک اڈھلی ہوئی استری دے پنوں باناتکاری دے پھل و جوں پیدا ہويا۔ پر مان و جوں کوتا دیاں  
چلتیاں

میں خرید ہاں اک زخم دا

میں دھبہ ہاں ماں دے جسم دا

میں ظلم دا اوہ بوجھ ہاں

جو ماں میری ڈھونڈی رہی

ماں میری دسے پیٹ چوں

سر آند جیسی آؤندی رہی

امرتا دیاں ایہ کوتاواں ساج وچ استری ورگ دے دکھ نوں مانو وادی درشتی توں پچھانن والیاں  
ہن۔ ایس تھہ وچ کوئی راواں کہ دلش دی ونڈ کمیس عورت دے درد نوں اُلکین والیاں کوتاواں دے اتہاس  
وچوں امرتا پریم دیاں نظماں نوں سبھ توں ودھ لوک پدینا حاصل ہوئی۔ ایہناں کوتاواں وچلی ڈھونڈھیں لوک  
کارن امرتا نے ساہت وچ اک نویں سکھر چھوئی۔ کسے پڑاؤ نوں ہی اوس دی رچنا تک پر تمھارا سکھرا پڑاؤ  
کیا جاسکدا ہے۔ پر اوس دی ایس پر اپتی نوں وڈیاؤن دی تھاویں پنجابی ساہت دے کجھ ودواناں نے ایہ کہہ  
کے کہ 'امرتا دیاں استری ہارے رچیاں کرتاں کیول' مہیلا دا دے باہروں داخل ہوئی ساجک فیشن دی ہی  
پرستش ہن اوس دے ساجک وکار نوں اک وار فیر چنوتی دتی اتے جیون وچ اوس دے حوصلے نوں کمزور  
کرنا چاہیا۔ پر امرتا دے سچے بولاں دی بدھڑکتا ساہویں اوہناں دی ایہ دھارنا روپل ثابت ہوئی۔ امرتا  
دیاں استری دے جذبات تے دکھاں نوں ابھو دیا تک کرن والیاں رچناواں وچ ایہ ڈھونڈھیں ویدنا ہے جو  
اوس دے خود عورت ہون کر کے نجی انوبھود چوں آئی ہے۔ دوجا امرتا کیول ایہناں دکھاں نوں پرگٹاؤندی ہی  
نہیں، سگوں ایہناں دی چیتنا راجیں عورت نوں ایہناں توں ملکت ہون لئی جاگڑک دی کردی ہے۔ اوس دی  
مانوتا وادی درشتی ساج وچ عورت اتے مرد و ہاں نوں بہترین مانو و جوں دیکھن دی چاہوان ہے۔ ایسے لئی  
اوس نے ساج دے مٹانے تے کمزور ورگ دی دلوں حمایت کیتی ہے اتے اچھا کارج اوس دانرا 'مہیلا دا' نہیں  
سگوں عورت ہون کر کے نجی بھوگیا منتاپ ہے جو ساہت وچ اوس دی پریرنا بنیا۔

امرتا دے ساجک سفر نوں پرستھ اوی لہر دے پرستہ ماناں نے ہور سدھائیک ڈونگھالی دتی تے

ایس لہردی پریرا راہیں اوس نے سماج دے اوہناں ویہلو زمینداراں دے ظلم نوں اپنی قلم راہیں نکلیاں کھجا جو  
 کرتی قسماں دی انتھک محنت دانا جائز فائدہ اٹھا کے آپ عیش پرستی دا جیون جیوندے رہے۔ امرتا نوں ہر مزدور  
 اتے کاہے نوں اپنے حقان لئی چیتن ہو کے سنگھرش کرن لئی پریرا اتے اپنی بلند آواز وچ اوہناں نوں آشا  
 پران کہیتی:

ایہ دھرتی اج لوکاں جوگی  
 ایہ لوکیں اج دھرتی جو گے  
 بھر کے چاڑھے ہانڈیاں گویے  
 بھر کے گن پرات

اتے اوہناں نوں ہو رو دھیرے جاگ رک کرن دی وجہن بدھتا نبھائی:  
 نگر اوے کنڈیا لیا  
 بھلکن دے ایس جگ وچ  
 لوک چڑھن پروان

پر دیش دی آزادی توں بعد وی جدوں کرتی، کساناں تے کامیاں دی آرتھک منہ حالی وچ کوئی  
 فرق نا پیا تاں اوس دا کوئل ہر دا اوہناں دی دیدنا نال ولوندھریا گیا تے اوس دی کا دسمویدنا جیج دے روپ وچ  
 کر لا اٹھی:

کہندے: نگھ گئی اے رات

کہندے: آئی اے پر بھات

میرے عرشاں تے شاہیاں ابے اوڈیاں ہی اوڈیاں

اساں کنڈیاں گویاں

اکٹھیاں ہی پچیا

اوئے کوں آکے سٹا سٹاوانہ ونڈیا

امرتا پر تیم دی کوتا جتھے ساجک سروکاراں نوں بڑی ساجتک سویدن شیلانا نال پرگٹاؤندی ہے او تھے  
 پیار دے سروکاراں دی پیروی وی بڑی شدت نال کردی ہے۔ پیار دا جذبہ بھاویں منکھی قدران قسماں نال

سمیہ دھت ہے پر فردی سماج وچ ایہدی کامیابی دے راہ وچ جات پات، نسل بھید، آرتھک اوچ نیچ، دھار مک  
بھن بھید ور گیاں اینکاں اوکڑاں ہمیشہ رہیاں ہن۔ کوتری نوں نجی پریم پیڑا داوی ڈوگھا انو بھوسی ایسے لئے عشق  
دے درد بیان اوس دیاں رچناواں وچ بڑ ڈب کے ہویا ہے جو یں:

عمر بھر دا عشق بے اواز ہے      ہر میر انغمہ میری اواز ہے  
حرف میرے تڑپ اٹھدے ہن ایویں      لگدے ہن رات بھر تارے جو یں  
عشق دے جذبے نوں اوہ سے دے اتھاس دی ترا سدی قل جوڑ دی ہوئی رہندی ہے:  
کانی سے دی سدا ہی رہی ویکھدی      خونی پترے پیار دی پیڑا والے۔

ڈاکٹر سریندر سنگھ نور امرتا کا دے کا دشا ستری کھ دی چہ چا کر دے ہوئے 'درد نوں اوس دی کوتا  
دے تمہیک کیندر نال جوڑ دے ہن۔ اوہناں انو سارا امرتا دی کوتا وچ پیدا ہوئے درد دے دو کچھ ہن۔ اک کچھ  
عشق نال سمبندھت ہے اتے دو جالو کائی تے عجب اس دی پیڑا نال سمبندھت ہے۔ امرتا انو سارا کوتا دا کردار  
اتے ذمے واری پیڑا نوں پہچان دی بن دی ہے اتے پیڑا دا نر تکھن کر کے چراغ بلن دی وی۔ امرتا آپ اس  
گل دا دیکھ کر دی ہے: "میں صحیح ارتھاں وچ لیکھک اوہناں نوں من دی ہاں جہدی قلم سیاہ دور دی چیچ  
ہو دے۔"

اتے امرتا دیاں بہت ساریاں کوتاوان سیاہ دور دیاں چیچاں ہی سن جہاں راہیں اوس نے اپنے  
در شئی کون توں سماج وچ واپر رہیاں تکلیفاں دا اووچن وی کیتا اتے اوہناں دا سادھان کرن دی وی ذمے واری  
بھاؤن دا جتن وی کیتا۔ جس وی کھمتر وچ اوس دے دکھ تے تراز نوں ودھیرے محسوس کیتا، اوس دی کیتی لئی  
دلوں منوں ہو کے قلمائی ڈنگ نال لکھیا۔ اوس دی کلامتکا ساہت دے کئی ہور روپاں وچ ابھو یکھت ہوئے  
جو یں گلپ، لوک دھارا، سوئے جیونی، انودا، ساہتک پترکاری۔ سارے روپ ہی اوس دی بہزرنگی پر سمجھا دا  
پرمان رہے ہن پر اس گل وچ کوئی سند یہ نہیں کہ اوس دی ساہتک سدھی جتنی کوتا دارا سمجھن ہو کے ہوند وچ آئی  
اونی ہور کسے روپ وچ نہیں۔ کوتا اوس دے احساس پر گناوے دی شدت وی رہی ہے اتے سکھروں۔ جی جی ہی  
امرتا اک یگ کوتری سی۔ نرسمہ یہ نوں راہاں دی سرجن وی اتے نوں ساہتک پرست ماناں دی چتری وی۔  
(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## گیت اکھراں والی ورن مالا

اج ایس اکویں صدی دی دہلیز تے کھڑے ہاں اتے جدوں وہویں صدی دے کچھ چونیوں وچار ماڈلاں جاں شخصیاں والیکھا جو کھاتاں جس کلا ماڈل نوں مٹوڑے اکھراں وچ لکھیا جائے گا اتے جس بہو پرتی، بہو دشاکی اتے بہو ونی شخصیت داتاں ابھر کے ساہویں آئے گا اوہ شخصیت ہوئے گی امرتا پرتم۔ امرتا پرتم سمکالی اتہاس دی دستاویز۔ امرتا پرتم ساڈے سمیاں دی دند کھتا۔

31 اگست 1919ء وچ جنمی امرتا چندراں درھیاں دی عمر ۷ لاکھ وچ گوردیو راؤ ندر ناتھ نٹا کرنوں ملی اتے سنگدیاں سنگدیاں نظم سنائی جہدیاں پہلیاں سنگتیاں انجھ سن۔

سوئی ملے گا کوئی انمول تینوں

توڑ توڑ کے سپیاں دیکھد اجا

گوردیو نہیں نظم دا انگریزی انوواد سنایا تے ایس دتی۔ ایہ خبر اگلے دن ٹریبون چھپی۔ اس گھٹنا بارے امرتا دسویں بے نظماں اووں دی لکھدی ساں پر سنگدیاں جہیاں۔ اوہناں دے جدوں نظم سان لئی کیہا تاں سنگ کے سنائی سی پر اوہناں جو پیار تے دھیان دتاسی اوہ نظم دے مطابق نہیں سی، اوہناں دی اپنی شخصیت دے مطابق سی۔

امرتا دیاں پہلیاں کوتاواں آدرش وادی رنگن والیاں سن جو او سدے پتا دے وچاراں دے دے پر بھادوہین لکھیاں گئیاں۔

دیئے امرتا نئیں پہلی کوتا اوووں لکھی جدوں اٹھ درھیاں دی سی۔ اس کرتا وچ کسے سپیاں دے شاہزادے راجن داؤ کرسی۔ نظم والا کاغذ اچانک باپ دے ہتھ آ گیا اتے بالکڑی امرتا نوں ڈانڈھے غصے دا شکار رہا۔ امرتا دسویں ہے کہ اس خیالی چہرے دا پسنا اوہنوں ویہہ درھے تک آؤ ندرایا۔ سوہنا سوکھا چہرہ،

موڈھے تے چنی شال لئی ہوئی، ہندی کندے تر رہا چہرہ۔

امرتا پریم نہیں کوٹا داکھنیک کچھ اپنے پتا توں سکھیا پر اوہناں دلوں ورسائی سدھار وادی و شے آدرش وادی اتے سدھار وادی ہی بن۔

امرتا دے ذہن دے کنیاں پکھاں تے اوہناں دے پتا ڈونگھا پر بھاو ہے۔ اوہ بچپن وچ ہی ویراگے گئے تے بابا دیال دے ڈیرے جا بیٹھے۔ (بابا دیال دی علاقے قج مانٹاسی۔) اس ویلے اوہناں داناں نند سادھوی۔ گا کے کوٹا پڑھدے سن۔ اس ڈیرے وچ ہی امرتا، برج بھاشا اتے حکمت سکھی۔ اس ڈیرے وچ کوئی راج بی بی وی آؤندی سی۔ اوہ اپنی فوج وچ سی تے اک وار ایسا گیا کہ کدے وی نہ پرتیا۔ راج بی بی ویراگی گئی۔ اتھے وی اک دن بابا دیال نیں نند سادھو نوں راج بی بی دل ڈونگھی نظر دیندیاں تکیا تے اوہ دے من دی گل بجھ لئی۔ اوہ نند، بی بی دی جیون دکھیا وی جان دے سن۔ سو کہن لگے: نند بیٹے! ویراگی تہاڈے لئی نہیں۔ تیس گریستھ جیون دھارن کرو تے راج بی بی دا تھہ اوہناں نوں پھڑا دتا۔ ایہ راج بی بی امرتا سی ماں بنی تے نند سادھو گرہستھ دھارن کر کے کرتا رنگھ بنے۔ کیونکہ کوٹا لکھدے سن اس لئی تخلص 'پوش' (امرتا) رکھیا۔ دھی جنمی تاں اپنے تخلص توں اوہدا نام امرتا رکھیا تے آپ کرتا رنگھ ہنکاری بن گئے۔ امرتا کہندی ہے: میں اپنے باپ دے تخلص راٹو وادھاں۔ 1931ء وچ ماں سوورگ واس ہو گئی۔ سو پالنا پوسنا باپ میں ہی کیا۔ باپ نال سمبھت کئی یاداں گھننا، اس بن جو امرتا دے اچت وچ ڈونگھیاں اوکریاں گھیاں۔ اک وار پیتا نیں گردوارا بولی صاحب وچ باڑی امرتا توں ارداس کروائی سی بھری سنگت وچ۔ کئی دن ارداس یاد کرواؤندے رہے۔ کیا: بولن ویلے دھیان صفر شہداں دل رکھنا ہے۔ لوکاں دل نہیں دیکھنا۔ اس طراں کوئی شہد بھلے گا نہیں۔ اس گھننا بارے امرتا کہندی ہے: جا پیدا ہے ایہ چھوٹی جیہی گل میریاں رگاں وچ اتر گئی۔ زندگی بھر دھیان اپنے ای لفظاں نال جڑیا ریہا۔ جس ویلے لکھدی ہاں پوری اوہ دے وچ سموئی دئی ہاں۔ نندا اوستھ کیہ کہندی ہے اوہوں نہیں ساں جانندی۔ (ارداس والی گھننا ویلے امرتا بھجاں ورھیاں دی سی) پر میرے پیتا جی جان دے سن۔ پتا نہیں ایہ اوہناں دی دوراندیشی سی جاں قدرست داکوئی کرم، ہنیرے میرے وجود وچ اوہ کئی پادتی کہ فیر کنیاں استت دیاں دویاں وارداتاں وچوں گزن ویلے وی من تھاویں ریہا۔ سبے کدے گھڑی ڈولیاں وی تاں اگلے جی ساویں آگیا۔ کدے خیال نہیں آیا کہ لوکیں میری نکھت پڑھ کے کہن گے۔ سماں گواہ ہے کہ اوہ دے ویہار تے نکھت ہارے کئی وار چکڑ موڈا پراہہ اپنے راہ اڈول تردی رہی، بھادویں نکھت سکھ عقیدے

نال سب دھت سی جاں چیکو سلوا کیا تے روی حملے دی نکھیدھی نال جاں رجنیش اتے جیوش بارے لکھنا و چارنا سی۔ رجنیش (اوشو) دیاں کتاباں دیاں تاں امرتا نہیں بھویکاواں دی لکھیاں ہن۔ تے 'اوشو ٹائمر' دے ویشیش نمبر اس واسطیادن کیتا ہے۔

پتا نہیں سبند دھت اک ہور گھٹناوا ہے۔ او دوں امرتا ستاں ورھیاں دی سی۔ لاہور پچو نامنڈی والے مکان وچ ہیکاری ہو ریں پر تھا جن کھرڑیاں نوں، کتاباں توں خوشخط کر کے لکھاؤندے ہندے سن۔ اک دن بالڑی امرتا اوس کمرے وچ ننگے سر چلی گئی تاں پتا نہیں چھیز ماری۔ اوہناں دا کہنا سی کہ اوس کمرے وچ ننگے سر نہیں آؤنا۔ بال من نوں صدمہ پہنچیا اتے تیز بخار چڑھ گیا۔ ماں سرتے پانی دیاں پٹیاں رکھ رہی سی۔ اوس ویلے بال من میں تڑپ کے آکھیا سی۔

'اج جیہڑیاں کتاباں کر کے چھیز ماری ہے ایہو کتاباں میں آپ لکھ سکدی آں۔ ایہ قیامتی حرف میری زبان تے کس طراں آئے سن میں اج تک نہیں جاندی، امرتا کہندی ہے۔

امرتا نہیں زندگی وچ کئی شوق پالے پر نہیا آفر قلم دا شوق۔ پہلا شوق فوٹو گرافی داسی۔ پروفیسر کرتار سنگھ ہیکاری ودھیا فوٹو گرافی سی۔ گھر وچ ڈارک روم بنیا ہو یا سی۔ خالی کاغذاں تے ابھر دے لکھدے منہ اک دنیا رچن وانگ لکھدے۔ فیر لاہور تارا چوہدری توں جھمے اٹھ مہینے ناچ سکھیا۔ سکول دے فنکشن تے نچیاوی۔ تارا چوہدری نہیں سٹیج تے آؤن لئی کہیا تاں گھر دیاں اجازت نہ دتی۔ امرتا دے شہداں وچ شوق مر جھا گیا۔ ایہ سکے چٹیاں وانگ زمین تے ڈگتاں نویں بیہ دی شکل وچ پنگر یا ستار و جاؤن دا شوق۔ ماسٹر رام رکھا، سراج احمد تے فینا استریاں امرتا دے استاد سن۔ اس ویلے امرتا دی عمر 16، 17 ورھیاں دی سی۔ کچھ دیر لاہور ریڈیو توں ستار و جایا۔ گھر دے ٹانگے تے بٹھا کے ریڈیو سٹیشن جاندی۔ سمکالی کلکاراں چوں نور جہاں، شمشاد بیگم، منور سلطانہ اتے مرا جیہ بیگم سن۔ ملکہ بکھر اراج صرف گاؤندی سی۔ پر ایہ شوق وی بہتی دیر نہ نہیا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن دلوں چھپن والے رسالے "آواز" نے ستار و جاؤندی امرتا دی تصویر ٹائل تے چاپ دتی۔ تے فیر ایہ تصویر پاتاں والیاں دیاں دوکاناں تے لگ گئی۔ سوہریاں نوں پند لگا تاں کہیا وڈے گھر اس دیاں دھیاں پاتاں والیاں دیاں دوکاناں تے لگیاں شو بھانہیں دیندیاں۔ ایہ دی کہیا جنے پیسے ستار و جاؤن دے ملدے نیں ساتھوں لے لیا کر۔ اتے ایہاں ستار دا شوق وی بیٹے دی گل ہو گیا۔ اداسی ہور سنگھنی ہو گئی۔ پہلیاں کتاباں چہ جیہڑا لوک یا تک رنگ سی اوہ پوری شدت نال ساج دیاں



عورت ورو دمی تیسھاں دی خلافت وچ بدل گیا۔ پر پھرک سماج وچ رہن والے پر پھرک مردنوں عورت دے ماس دی ضرورت سی۔ اوہدی روح نال اوہدا کوئی واسطہ نہیں سی۔ اکھوتی دھرم نے وی پر پھرک مردنوں ہی ہنگارا دتا۔ امرتا نے عورت نوں دستو سمجھے جان ورو دھ شدت نال لکھیا۔ امرتا دے پر گتے دوا اتھوں ہی مدھ بھدا ہے۔

امرتا نوں چھپیا ویاہ بارے کوں سوچدے ساؤ؟ کہن لگے: اوہناں ویلیاں چہ لڑکی ویاہ بارے Aware (باخبر) نہیں سی ہندی۔ جتھے گھر دیاں کردتا، ہو گیا۔ مگنی تاں چونہ ورھیاں دی عمر چہ ہو گئی سی۔ دوسرے ماں جیوندی نہیں سی تے باپ نال کڑی کی گل کردی۔ اودوں سوچن والی گل نہیں سی۔ نالے اوہ (سوہرے گھر والے) چنگے لوک سن۔ پہلاں توں ہی جانوسن سوہو گیا۔ ویاہ ویلے امرتا دی عمر 17 کورھے دی سی۔ جتی داناں پر یتیم سنگھ کو اڑا سی۔

تے امرتا پر یتیم ناں دا کی اتھاس ہے؟

ایہ تاں ریڈیو تے جان ویلے رکھیا۔ امرت کورتوں سکھ ہندو دی پہچان ہندی سی۔ نرا امرتا چھوٹا ناں سی۔ امرتا پر یتیم نام ڈھکواں لگدا سی۔

پلیٹھی دا کاوٹنگریہ ”شہنڈیاں کرناں“ تے ”امرت لہراں“ کاوٹنگریہ ویاہ توں پہلاں چھپ چکے

سن۔

ویاہ توں پہلاں وی پیار کیا؟ امرتا دا کہنا ہے کہ ویاہ توں پہلاں پیار نہیں کیا۔ خیالاں وچ ضرور

کوئی روپ اگھڑا سی پر۔ تھار تھو وچ کوئی نہیں سی۔

تے ساحر لدھیانوی؟

ساحر امرتا نوں چوہندا تاں سی پر اظہار نہیں سی کردا۔ اندر و اندر یں ہی کجھ کہند اکردا سی۔ امرتا نے

ساحرنوں رچ کے چاہیا ہے۔ انیکاں کوتاواں لکھیاں ہن۔ سنیہڑے دی لمی کوتا۔ جیتراں دیاں ساریاں

کوتاواں۔ اس توں بنا ”عاشو“، ”اک سی انینا“، ”تے“ ”ولی دیاں گھیاں“ وچ وی ساحرنوں چتو یا ہے۔ اک وار

کے اردو مشاعرے توں بعد ساحر دے چہرے لوس دے راتو گراف لے رہے سن تاں امرتا نے وی ہس کے

اوہ دے اگے ہتھ دی تلی کردتی۔ ساحر نے پین دی سیاہی انگوٹھوں لاکے، اوہ انگوٹھا امرتا دی تلی تے لا دیتا۔

امرتا کہندی ہے: ”ایہ میرے کاغذ دی۔۔۔ عبارت سی جہدے اتے اوہنے دستخط کیے۔ ایہ سجھ ہواواں دے



حوالے ہے۔ ایہ عبارت نہ کدے اوہنے پڑھی نہ زندگی نے۔ ایسے لئی کہہ سکدی ہاں۔ ساحراک خیال سی۔ ہوا  
وچ لٹک دا، شاید میرے اپنے ای خیالاں دا اک جادو پر امروز نال گزاری زندگی بیخودی دے عالم تک پہنچ  
گئی۔“

اک وار پرکاش پنڈت نے دسیا کہ لاہور وچ جدوں امرتا گئی بازار وچ رہندی سی تاں ساحر روز  
رات نوں گلی چوں لٹکھدا ہندا سی کہ شاید کتے باری چوں دس پنے۔ 'جاپدا، ساحرنوں کوئی کپلیکس سی، امرتا  
دسدی ہے، اک وار بمبئی چہ امرتا اوہدے گھر رہی تاں رات نوں کہن لگی۔ لائٹ بجھا دے۔ میں سوہنا نہیں۔  
میںوں گھبراہٹ ہندی ہے۔ اوہ سنسنی خیز گلاں چوں آند ماندا سی۔ بمبئی اک پارٹی ویلے اوہ امرتا نوں نال لے  
کے دوستان دی گھریں صدا لین گیا تے امرتا نوں کہیا۔ 'دیکھ تینوں میرے نال دیکھ کے لوک کوں چونکدے  
نیں۔' امرتا نوں پچھیا۔ ساحر بورکی کہندا سی؟ کہندا سی۔ 'چل چین چلے، او تھے میں میں چینی زبان وچ گیت  
لکھاں گا۔' ایہ چین جان دی، بھارت امرتا نوں وی سمجھ نہیں آئی۔ گل تاں صاف ہندی ہے جے اس وار تا  
بارے امرتا دی کہانی 'ایہ کہانی نہیں' (شلا لیکھ، جون 96) پڑھیے۔

نوتج نے اک وار امرتا نوں پچھیا سی۔ زندگی وچ تیرا سنگاپ کی ہے؟ 'بس ایہو کہ جیہدے نال  
رہنا چاہندی ہاں اوہ مل جائے۔' امرتا دا جواب سی۔

سو امرتا زندگی وچ اپنے سنگاپ بارے ہمیشہ سچیت رہی ہے۔ اوس دے بپتے سمکالی اودے  
نزدیک ہونا چاہندی ہن پر جدوں بنگار انہ ملیا تاں تمہاں تے اتر آئے۔ موہن سنگھ نے تاں کئی کوتاواں  
لکھیاں۔ 'جاندا اڑتے' جندرے اداہر تاں ہن۔ موہن سنگھ دا پیارا اک پاسر سی۔ 'جندرے' کتاب دے ناسل  
تے موہن سنگھ دو جندرے بناؤ نا چاہندی بھاو کہ اوہدے رستے وچ امرتا دے دو بچے رکاوٹ ہن۔ امروز  
نے دودی تمہاں تے جندرے بنادے۔ کہن لگا: 'تج جندر اودو بچیاں دی ماں دا پرتیک ہے۔' امرتا کہندی ہے۔  
اوس ویلے امروز نے میری سوچ اپنے متھے وچ پائی سی۔

جویں کوتا وچ امرتا اپنی روح دا اقرار پالیدی رہی ایویں اوہ کوتا وچ وکھن تے وکھری وی ہے۔  
سمکالی کوتا دی کھڑوت دی سچتی وچ وی امرتا اپنی طرح دا لکھدی رہی۔ 'کاغذ تے کیئوس' (جس تے اوہنوں  
بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ ملیا) 'فر' کاغذ تے کیئوس توں بعد، فر نوں کوتاواں والی 'کاغذ تے کیئوس' تے دوورھے  
پہلاں پچھیں 'درویشاں دی مہندی' دیاں کوتاواں اس گل دیاں گواہ ہن۔

امرتا دے، مجھ تو ویں جسم دن تے ہندی دے پیر سدھ کہانی کار کلید شوار نے کہیا سی۔ ”جدوں ایس  
ہندی، بنگالی، مراٹھی جاں تیگن کو تامل چہ لکھ رہے ساں، امرتا کو تامل لکھ رہی سی۔“  
امروز نوں امرتا رب درگا آسرا کہندی ہے۔ ”پچھیا۔ امروز نوں تمیں کویں پہچانیا، پتی دانگ،  
پریکی دانگ، جاں دوست دانگ؟ اس بارے امرتا دا جواب سی:

’باپ، ویر، دوست تے خاوند

کسے لفظ دا کوئی نہ رشتہ

انج جدوں میں تینوں دیکھیا

سارے اکھر گوزھے ہو گئے

تے بن چکھے جے جد ہیرا پنچا، فلم بنی، تاں میوں ہیرا پنچے دی پہلی ملاقات ویلے دا گیت لکھن لہنی  
آکھیا گیا سی تاں میں امروز دی تے اپنی پہلی ملاقات دا ویلا جتر کے گیت لکھیا سی:

بچ توں سپناوی توں

غیر توں اپنا توں.... واہ جن!

جوگ دا اک راہ وی توں

عشق دی درگاہ وی توں

ایہ ساری کائنات توں

خدا دی ملاقات توں.... واہ جن!

امرتا پریم جتھے کمال دی لیکھ کا ہے او تھے اوہدی دوستی دا آوارہ روی آپسی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ ایہی  
اکرن ہے چونہ دہا کیاں توں دی تری ساڈی دوستی سے دی تور نال گوزھی ہوئی ہے۔ جدوں میں دلی یونیورسٹی  
دی نوکری کیتی تاں اوہنے کہیا سی: ”دیکھیں موہن جیت ہی رہیں۔ اوہنیں دنیس دلی یونیورسٹی وچ ڈاکٹر ہرجن  
سنگھ تے اوہدا سرکل امرتا بارے کوئی نہ کوئی شوشہ پھیندا ہندا سی۔ ادوں میں جواب وچ کیہا سی ”جدوں موہن  
جیت نہر بیبا دلی جھڈ جاواں گا۔“ ساڈی متر تاتے وی دکھی اوناں لاؤندے رہے بن پرکاواں دے آکھے ڈھور  
نہیں مردے۔“

ہو چکی من نہیں اپنی دلی پھیری ویلے امرتا دامتھاجم کے کہاسی؟ ہسین دوویں دنیا دیاں غلط قیمتاں  
نال لڑ رہے ہاں 'توں قلم نام، میں تلو ار نال'۔

امرتا دی دوستی وچ جادو ہے۔ کچھ جیسے پاکستان دی کہانی لیکھکا افضل توصیف دلی آئی تاں میں  
پچھیا 'تسیں دلی وچ ہو رکیہ دیکھیا؟'

"دلی چا مرتانوں دیکھ لیا، ہو رکیہ دیکھنا سی! امرتا دا گھر ہی ساڈا مکہ ہے۔" "جج جج ہی امرتا ہی دا گھر  
نویں پرانے لیکھکاں دی محبت گاہ، زیارت گاہ ہے۔"

مئی 1966 وچ امرتا تے امر ورنیس ساہنک پتر 'ناگ منی' شروع کیتا جواج تیک نرنتر چل رہیا  
ہے۔ پنجابی داشائندہ ای کوئی ہو رینئر لیکھک ہو دے جونواں لکھن والیاں نال ای نیڑ تارکھدا ہو دے۔ 'ناگ منی'  
اچ سنسٹھابن چکیا ہے۔ ایہ پہلا پرچہ ہے جتنے چندہ دے کے پرچہ خریدن دی حیرت پائی۔ اس دے پہلے  
لائف ممبر خود امرتا تے امر ورنس۔ راجندر سنگھ بیدی نیں چندے وجوں گیاراں روپے بھجدا یاں کہاسی دس  
روپے چندہ تے گیارواں روپیا سردار نا۔

1947ء وچ دیش دی ونڈ ویلے امرتا دلی آ گئی۔ ایہ روزگار دی تلاش دے دن سن۔ ڈاکٹر مہندر  
سنگھ رندھاوا دی سہائتا نال دلی ریڈیو سٹیشن تے پارٹ ٹائم نوکری ملی جو کئی ورھے چلی۔ ریڈیو تے امرتا نیں  
'آواز دے دوستو' پروگرام نال سرویتیاں دا دل موہ لیا۔ آکاشوائی دے اک سیوانو ریت ڈائریکٹر نیں کچھ جیسے  
پروگرام دی گل کردیاں دسیا کہ امرتا دی آواز وچ کوئی جادوسی ایٹھوں تک کہ کئی دارادہ سٹوڈیو دے شیشے وچوں  
دیکھدے ہندے سن کہ امرتا کوں بولدی ہے۔

بھارت دا پہلا سروشرٹھ ساہنک پرکار گیان پنڈہ امرتانوں ہی ملایا ہے۔ ایہ 1982ء دی گل  
ہے۔ مینوں یاد ہے، داگدیو دی جو پرہمتا ایس پرکار وچ دلی جاندی ہے اوسدی آرتی پہلی وار امرتا دی  
رچنا آدھی کوتا نال اتاری گئی سی۔

امرتا پرہتم دی نویں کوتا وچ دارھنیکتا اتے ادھیا تمکنا دی سرو دھیرے ابھردی ہے۔ ایہ انتر گیان  
دے انجھو دی کوتا ہے۔ ایس کوتا وچ کایا کلپ ہوئے دیا کتھو دے روشن درشن ہندے ہن۔ ایہ آن دسدے دی  
گل ہے اوہ جو پرا۔ تھارتھ دی دی زمین ہے۔ ایس وچترانو بھو وچ اوہو دے گیان دی سرو پیے اتے سویہ  
پچھان دے بھاووی۔

پچھلے دنیں امرتا نوں پچھپیا کہ کئی پانچھکاں داو چار ہے کہ امرتا ہن جیوتش دا چر چا بہت کردی ہے جو اوہناں دی وگیا تک سوچ دے اتو کول نہیں۔ ایہ گل کچھ جیسے ویلپ کورٹوانا میں وی کہی تے اک دن آرٹسٹ سر جیت کور تے جسو ندر وید میں وی کہی تے پرسنگ وچ امرتا میں ویہ کہ جیوتش ہار کھسے بھرم بھو لکھسے جاں اندھ و شو اس وچ اوہناں داو شو اس اوہناں داو شو اس نہیں۔ جیوتش ہارے اوہناں دی پہنچ وگیا تک ہے اتے ایس کھسیر وچ اوہناں دا نظریہ کسے کھوجی والا ہے۔ بہت واری لوک گل دی تہہ تک پہنچن توں بناں ہی ٹپتی کر دیندے ہن۔ جیوتش اک شاستر ہے اتے۔۔ بھارتی پرسنگ وچ ایس داوڈا مہتو ہے۔ ایسے طراں آچار یہ رجنیش ہارے امرتا دا کہنا ہے کہ گیان دے کھسیر وچ رجنیش دا کوئی ثانی نہیں۔ امرتا زندگی دے رہساں نوں جانن سمجھدی اپنی پہنچ نوں تلاش (کواہسٹ) داناں دیندی ہے۔

امرتا ساڈے سمیاں دی دند کتھا ہے۔ ایس وڈا ملے ورے ہارے جتاں وی کیہا جائے تھوڑا ہے۔

(پی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆



چاندن دیار چھٹار

## چائن دیاں چھٹاں

چائن والاک تھنھ سی  
تارے جھجھراں تھروے چلن و ہنگیاں  
تھنھاں پتیاں جنتے  
چھپے آئیاں گھاں جندوں مہنگیاں  
دھرتی سی کندیا لڑی  
امبر پلا اڑیا تھنھ لہری  
بجھنی جندے میرے!  
لنھدی لنھدی رات کہانی پائی  
نارک پوئے دلاں دے  
کرتاں چو بھی سوتی دسر ہو گئی  
یاداں بھانہڑا لیا  
لکھ پچائے پئے کئی چھو گئی

## کون کہے اب وارث شاہ کو

ناگ منی، امروز، امرتا وارث شاہ اور ساحر  
 زورافق پر چمکا چاند اور دل کی گلیاں، جگمگ جگمگ کرتی ہیں  
 میرے دل میں میری روح میں زندہ ہے  
 تیرا اک اک مصرعہ، تیرا ہر اک کھڑا  
 تیرے گیت امر امرت ہیں تو ہے امرتا پر تیم  
 کون اس امر پریت کی لے پر حال دھال کرے  
 پہلے ہوتے جیون کو پھر لال گال کرے  
 کون کہے پھر وارث شہ کو  
 کون امرتا ہو  
 ناگ منی، امروز، امرتا  
 ساحر کی ساحرنا  
 کون کہے پھر وارث شہ کو، میری نلکھے بات  
 وارث اور امرتا آج تو ٹوٹ آئے یاد  
 ٹپ ٹپ آنسو گر کرتن من ہونے لگا پنجاب  
 ناگ منی، امروز امرتا، ساحر کی ساحرنا  
 کون کہے پھر وارث شہ کو، کون امرتا ہو  
 کون امرتا ہو.....

## امرتا پر یتیم کے نام ایک خط

مٹی پلانٹ کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟  
 اک بوتل کچھ پتو پانی  
 مہول گلاب کا گیلے کی مٹی میں کھل اٹھتا ہے  
 جس رنگ کا بھی چاہیں  
 اور گلاب جس جگہ بھی چاہیں رکھ لیں  
 نیم بکائن کی چھاؤں مٹھی پتے کڑے  
 پتے گھوٹ کے پی لیں صاف لہو ہو جائے  
 اور پھر آنگن بھی سوئے لگتے ہیں  
 بڑ قیدی نہیں ہوتا  
 نہ بوتل نہ گیلے اور نہ آنگن کا  
 بڑ کو دیواریں اور چار دیواریاں قید نہیں کر سکتیں  
 بڑ لگانے والا اپنے لگے ہوئے بڑ کی چھاؤں میں  
 بیٹھ نہیں سکتا کہتے ہیں  
 اتنی عمر حیات کی لکھوائے کیسے؟  
 پر کیا بڑ دنیا سے ختم ہوئے؟  
 دھرتی پر انسان کو چھاؤں دیتے ہیں  
 چیل نیم بکائن پھلائی شیشم کیکر ٹوٹ کر پر  
 اور بہت سے میں نے ابھی نہیں گنوائے



پھولوں والے لاتعداد درخت نہیں گنوائے

وہ بھی ہیں ان گنت

پردیکھوں تو

کس نے کی برابری بڑکی!

بڑکی چھاؤں ماؤں جیسی گھنی، گھنیری ڈھاٹنے والی

ہر اک چھاؤں کی سردار

اپنے نیچے اُگے ہوئے پوٹوں کو

بڑ نہیں بڑھنے دیتا

اک اعتراض پراتا!!

کس نے بڑ سے بڑھنا کس پودے کس بوٹے نے؟

(دور ہوا پھر پاس بڑھ کے بڑ سے کس نے بھی دکھایا؟)

دیے بھی تو بڑ کے نیچے گیان دھیان

امر تا پرہتم! تم جو درخت کوئی ہو تیں تو بڑ کہلو اتیں

امر تا پرہتم!

تم پنجاب کی ٹکڑے ٹکڑے دھرتی

لہو میں سُرخسرخ، پھر بھی ساوی ساوی

اپنے تاؤ میں تہتی، پھر بھی چھاؤں بانٹی

”اک دلو تا“ تیرے جگ کا سہل پر سوچو تو

بڑ اور بڑکی چھاؤں کیا کیا سہل دیتے ہیں؟

تو دھرتی اور اپنے لہو کے پھولوں کی پھلکاری تیرے اوپر

پرہتم کوئی درخت جو تیں بڑ کہلو اتیں

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم کو یاد کرنے کی مہول

صبح دم جب پھول پر شبنم پڑی  
 اک نگہ کی امرتا پر یتیم کھلی  
 ٹوٹ کر جو پیار کرتے ہیں سدا  
 اُن نبوں میں ایک وہ عورت بھی تھی  
 جس گلی میں اُس نے رکھا تھا قدم  
 وہ گلی تھی پریم کی پر بند تھی  
 اُس کی چٹھی پر رسیدی تھا نکت  
 ڈاک میں چٹھی یہ کچھ دن تک رہی  
 اس کی تحریروں نے اور باتوں نے دیکھ  
 ایک دُنیا میں بچادی کھلی  
 اس کی باتوں میں تھی دُنیا کی مٹاس  
 وہ تھی پوری ایک مصری کی ڈلی  
 اس کا ماضی اور مستقبل نہ پوچھ  
 حال کہتا ہے وہ عورت تھی کھلی  
 سوت آئی اُس کو بام و در کے چچ  
 زندگی امروز و فردا میں گئی  
 ہیر وارث نے کہی تھی رانجھنا  
 امرتا کی ہیر تو ہے اُن کہی

شاعرہ تھی وہ تو دنیا کی سنو  
 وہ تھی بھارت اور نہ پاکستان کی  
 یاد آئی جب بھی اُس کی بخول کر  
 رنگ دے کر گل کو خوشبو ازگئی  
 بات کہنے آئی تھی وہ دل کی سن  
 بات کی بس اور کہا میں تو چلی

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم

شاعر دمی پنجاب دی  
 جہدا اکھراں دتج اے ناں  
 اوہ گوجرانوالے دی جم سی  
 استھے ہوئی جوان  
 جدوں ہوئی جوان  
 تے ملک دیاں ونڈیاں پے گئیں  
 وگی خون چتاں  
 اوس وگدا خون جد ویکھیا  
 آکھے وارثہ شاہ نون  
 میں چلی دتی شہرنوں  
 توں رکھ اپنا پنجاب  
 استھے لکھاں دیاں روندیاں  
 میں کنوں پُچ کراں  
 میں آپے مردی جاں

☆☆☆☆

## تیرا نام امر

ایک رسیدی ٹکٹ پہ لکھا  
 تیرا نام امر  
 کیوں کاغذ احسان ترے پر  
 بھولے کرتا ہزار  
 تیری اک پرواز  
 تیرے دورِ زمانوں کو  
 تحریر کرے امروز  
 تیرے غم کا سوز  
 بھول سکے گا کیسے تجھ کو  
 سانسیں گشتا دور  
 تیرے من میں آج بھی رقصاں  
 دلی اور لاہور  
 اے حرفوں کی رانی!  
 تیرا ورقِ ورقِ پر راج  
 طعنہ زن ہے  
 پھر کا ہے کو  
 میری وقت سماج  
 اے حرفوں کی لاج

## امرتا پر یتیم کے لیے

عمر بھر زودج تری درد سے بے چین رہی  
 تو نے دیکھا نہ سویرا سکھ کا  
 چار سو دکھ کی ترے رین رہی  
 خواب جو تیری نگاہوں نے بھی دیکھے تھے  
 وہ ادھورے ہی رہے  
 ٹو نے وصل کے موسم میں کئی ہجر ہے  
 تیری تخلیق ترے غم سے نمودار رہی  
 عمر بھر ٹو نے بیاض دل پر  
 گم شدہ درد لکھے  
 اپنے ایام گزشتہ کے بھی خواب لکھے  
 تیری تحریر ترے درد کو مہکاتی رہی  
 ٹو نے الفاظ سے جوڑا تھا جو رشتہ دل کا  
 عمر بھر ساتھ رہا  
 ایک ناکام محبت کی خلش کے باعث  
 جو خلا تھے ترے سینے میں بھی بھر نہ سکے  
 ٹو نے الفاظ کے دامن میں سمویا غم کو  
 لفظ بھر مر نہ سکے

☆☆☆☆

## نذیرا مرتا پر یتیم

سرا کے اک خواب میں  
 آنکھیں دیکھیں آپ میں  
 نیلے نیلے آئینے  
 بچپن کے تانا ب میں  
 جو بن دیکھا کالج میں  
 اور ہنسی مضراب میں  
 آسائش کی بھیڑ میں  
 فہمائش کے باب میں  
 انہونی کی سسکیاں  
 ہونی کے گرداب میں  
 باطن کی میزان میں  
 ظاہر کے اسباب میں  
 آنج کسی رخصت کی  
 ٹھنڈے ٹھک گلاب میں  
 صبحوں کے ٹکد ان میں  
 جائے کی محراب میں  
 چہرہ ڈھکتی اور جھتی

آیت اک اعراب میں  
 سونے کی اک جلد میں  
 اک تک چڑھی کتاب میں  
 دل میں اک قدیل سی  
 لڑکی جو مہتاب میں  
 سُرخ زمین کا زائچہ  
 بنے رُکے سیلاب میں  
 چنے ہوئے مرجان دو  
 کانسی کی اک قاب میں  
 جیسے حسن کا بھولپن  
 بہتی ہوئی شراب میں  
 غم بھرا برآمدہ  
 لرزش سی اعصاب میں  
 عامر سرد کلائیوں  
 اک زر دوز حجاب میں

☆☆☆☆



## چائن دی پھلکاری

روشنی کی چادر میں  
 کون نازکا بھرتا ہے  
 دل کی اونچائی مٹی پر  
 کون شمع دھرتا ہے  
 کس کے راستے کی دھول  
 پھول بنتی جاتی ہے  
 بلے شاہ کی ”ہلک“ میں  
 رات مسکراتی ہے  
 شاہ حسین ڈارٹ شاہ  
 گور سے پکارتے ہیں  
 عشق میں جو مرتے ہیں  
 کب وہ جان ہارتے ہیں

امرنا ہو میرا ہو  
 روشنی کی ڈوری میں  
 شہد ہیں پردے ہوئے  
 زندگی کے رنگوں میں  
 ہاتھ میں ڈبوئے ہیں

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم کے نام

دن میں سنے رات کے  
پھول ہیں "پاری" جات کے

گیت ہیں تیرے پاؤں میں  
پتوں کی برسات کے

پھول پرندے آسمان  
موسم تیری ذات کے

چمکے قلم روات میں  
تارے قلم روات کے

جلتے پکھلتے حرف ہیں  
جادو تیرے ہاتھ کے

تصویریں امروز کی  
سائے ذات صفات کے

رنگ و نور کی شاخ پر  
پھول کھلے آیات کے

آنکھوں کی دلہیز پر  
دیئے پڑے ہیں رات کے

\* (پاری جات ایک پودا جو دیوتا کرشن سورگ سے دھرتی پر لائے تھے، امرتا پرتم کے گھر میں یہ پودا موجود ہے اور اس کی شاخیں امرتا کے بیڈروم کی کھڑکیوں سے جھانکتی رہتی ہیں۔ امرتا کے سرہانے چاندی کے پیالے میں پاری جات کے پھول تیرتے رہتے تھے۔ پہلی ملاقات میں امرتانے یہ بھیکے اور چمکتے ہوئے پھول مجھے دیئے تھے۔۔۔۔۔ نذیر قیصر)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم جی دے نال

چن ستارے اک دوہے توں منجھن مے  
سورج کولوں بت سویرا منجھے گا  
رکھ منجھن مے پنڈ دیاں سونیاں گلپاں توں  
بوہے باری کولوں دیہڑا منجھے گا  
جیہڑا آدے گا او تیرا منجھے گا  
تیرے باجھوں ساہنوں کھڑا منجھے گا

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم واسطے

میں ---

کال بیل تے

انگل رکھی

تے مندریں دیاں —

گھنٹیاں ورج اٹھیاں

ووسن ولادے

کاغذی پھل

گلاب بن گئے

اوہ اس دروازے تھامیں

باہر آؤندی ہووے گی

میں دلیز نوں

چم لیا

اوہ کمرے وچ آئی

امروز دیاں بنائیاں

تصویریں اتے تحریریں

جاگ اٹھیاں

رب اگر عورتا اے  
تاں ایذا ہی سوہنا ہووے گا

اوس نوں کنے ہی لوک  
ملن آؤندے نیں  
کنے ہی اوس نوں  
ملن دی تاگھ رکھدے نیں

چند منھاں دی۔۔۔  
لما قاتاں سی  
میں اوس نوں کیہ دسداتے  
کیہ پچھدا

میں تاں اوس نوں  
ایہ وی نہ دس سکیا  
کہ اوس نوں دیکھ کے  
میںوں انج لگدا ہے  
کہ حسن تے تحریر دی  
کوئی عمر نہیں ہوندی

☆☆☆☆

## امرتا پریتم

امرتا پنجاہیت دی شان سی  
اک طرح انسانیت دا مان سی

مات بھاشا دا سرٹا ساز سی  
بن گئی پنجاب دی آواز سی

نام ساہت وچ اوہ اچا کر گئی  
جنم اپنا اچا سچا کر گئی

اوس نے وارث نوں بلایا قبر چوں  
جاہراں نوں ہکلیا اوس جبر توں

درد دھیاں دا وٹھاون واسطے  
ظالماں توں پت بچاون واسطے

”مٹی“ بن کے چوسیا اوس زہر نوں  
اپنے ڈنگ ہی روکیا اوس قہر نوں

بہت کچھ نہیں اوس دے ہارے لکھ رہے  
جاپے لکھنا اوہ حالے سکھ رہے

رب نوں دی اوس نے سنیہڑے گھل کے  
جبر نوں اوس نے دکھایا گھل کے

انسانیت دا درد اوس نے جانیا  
لوک برہا عمر ساری مانیا

لوک پیڑا دی عظیمردار سی  
صفت بھریا اوس دا ہر کردار سی

اوس دے ہارے اتنا کہنا ٹھیک ہے  
پڑھ کے اوس نوں امر اچ امریک ہے

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆



## ہیر روح تے رانجھا قلوبت جانیو

سون کمرہ، پڑھن کمرہ اک مک ہوئے  
 جتھے ہن نہ اوہ سونڈی اے نہ پڑھدی اے  
 آل دوال دیاں کتاباں توں بے واسطہ  
 نہ کچھ رچدی اے، نہ گھڑدی اے

اوہ عالی شان لائبریری  
 جیہڑی درحیاں دے ورھے  
 اوہدے ساہواں نال ساہ ہوئی  
 ارج اوہدے وانگ کھنڈی پنڈی  
 دل ڈھائی بیٹھی اے

نال لگدا چتر کاروا کمرہ  
 جیہڑا کچھ ہل چتر کاری وچ بتاؤندا  
 اوس توں وی گھٹ سون کمرے وچ لنگھاؤندا  
 دن وچ سووار، اوہ نال دے کمرے چہ آؤندا

اپنی اکواک پیش قیمتی

حال دی گھڑی تک چیونٹ

پینٹنگ نوں نظر اؤندا

اوہ دے متھے نوں حمد، کیساں نوں پو لے دینی سہلاؤندا

خیرے کیہ کیہ کہ سن، اہنوں کوں سنے کج پرچاؤندا

اوہ وی قلم دی ہانی، اکھراں دی جانی

اج پڑھنا لکھنا کیہ، ہر پاسوں سرت گواہی

زندگی دی ہر اہم کریا نوں بھلائی

کدے کدائیں اگا پھچاوی ویرائی

پرپوری زندگی دے کدے

اس اکلوتے سرمائے

ایساں لکھو جتے نہیں

جدا ایس رب دے جائے

آتے تے کردی دشا اس دھر داس

رتا کو سنے جے اوہدی بھڑک

محسوس کراپنے آس پاس

نڈ حال جے سروج دیندی اے جھڑک

ایما او، ایما میرے نیزے آ

انج کولوں دی ننگھ کے نہ جا

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم دے مان

انج تاں شاعر سارے ماں دی کٹھ چوں حمدے نے  
 کجھ شاعر رشتیاں دی کٹھ چوں حمدے نے  
 کئی ہندے نے اوہ وی، جو ماواں دے دکھ چوں حمدے نے  
 کوئی کوئی امرتا جیسے ہندے جو رشی رکھ چوں حمدے نے

کجھ شاعر پیراں فقیراں دی دعا ہندے نے،  
 دوستی دے دریا دی بیڑی دے ملّاح ہندے نے  
 معصوم گھٹکیاں دے جیون دا چاء ہندے نے،  
 بہتے شاعر نہیں، صرف شاعری دی افواہ ہندے نے

امرتا جیسے شاعر روح دے رشتیاں دی رہاب ہندے نے،  
 سگل سرشی دی شاعری دا انت پر و اج ہندے نے  
 ایہو جیسے شاعر ربی درگاہ دی آواز ہندے نے  
 قدرت دا سنگیت ہندے نے، امرتا دا انہد تاہ ہندے نے  
 ایہو جیسے شاعر لوک سپیاں دی تعبیر ہندے نے  
 اوہ زمین تے نہیں، امیر تے واہی لکیر ہندے نے

درد کی دستاویز ہندے نے، دوستی کی تقدیر ہندے نے  
اوہ تن دے شہنشاہ، من دے صد فقیر ہندے نے

ایہو جیسے شاعر لوک سپیاں دی تعبیر ہندے نے  
اوہ جی تے نہیں امبر تے داہی لکیر ہندے نے  
درد کی دستاویز ہندے نے، دوستی کی تقدیر ہندے نے  
اوہ تن دے شہنشاہ من دے فقیر ہندے نے  
شاعر امرتا جیسے پوتر پستک دا پہلا واک ہندے نے،  
اکھراں دا ادب ہندے نے، ابر تھاں دا احساس ہندے نے،  
سیاں دا بچ ہندے نے، لفظاں دا سند رہاس ہندے نے  
اوہ وواع ہو کے وی وواع نہیں قیامت تک ساڈے پاس ہندے نے  
(پہلی امتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## پرنام

امرتا پر تيم!   
 اک ريسمي جہي ليکھکا   
 جس دي اک اکھلدي ليکھنی   
 لکھياں لکھياں کوتاوان   
 سوچ توں روح، بروچ کراؤندا ساہت   
 بندے نوں بندے نال جوڑن لئی   
 بڑی وڈی سوچ   
 اورشاں نوں   
 کدے دی دتی نہیں اہیت   
 تمام عمر کيتا نہیں اصولاں نال سمجھوتا   
 زندگی بتائی   
 اپنی ہی شرطاں تے   
 لکھی، ہمیشہ حقیقت،   
 جھوٹھ دا کيتا،   
 پردہ فاش   
 اپنی رچناواں وچ کيتا

ناری دے ورد دا بیان  
 نوچ دتے،  
 تھوٹھے ساج دے مکھوٹے  
 شوٹن دے خلاف،  
 ہن نہیں ہے۔  
 سانوں ادھناں تے بڑا مان ہے،  
 ایہو جی مہان ہستی نوں،  
 ساڈا کوٹ کوٹ پر نام ہے۔

(پہی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا دے ناں

نی کڑیے نظماں ونیے!

کدے پکڑے گھر آ۔

تیرے بھائیاں سندیاں گھوڑیاں

اج پچیاں پٹھروے راہ.....

تیرا مرزاویر نہتھرا

اج بیٹھا اونڈھی پا

تیری صاحبیاں بھابھی وکندی

اوبدی کتے نہ چل دی واہ

اج سالو کفن ہو گئے

ایس گھرنوں لگی ڈھاہ

کوئی ویزھا سمن نہ بنے

کوئی کندھ نہ بنے گواہ.....

ایہ گلیاں بابل والیاں

ایہد قبریں جانداراہ

اجھے اگن بالے تیلیاں

تے آتھن ہوئے سواہ.....

نی کڑیے نظماں ونیے!!

(پہی انتر: قمر الزمان)

## امر۔ امرتا

امرتا دھرتی دی دیوی  
نمشکار! پرنام!!  
ونڈ پئی دھرتی تے  
تاں روئی توں،  
تاں دل چوں نکلی کوک ترے  
وارث شاہ نوں  
واچاں مار بلایا  
دھرتی اتے وے خون دا  
لکھ لکھ حال سنایا!  
بندہ جدوں  
کو بندہ ہویا  
وحشی ہویا، خونی ہویا  
حدوں دودھ  
جنونی ہویا  
ایس جنونی بندے نوں تک  
رام رحیم خداوی رویا  
امبر رویا



دھرتی روئی  
 لپ لپ ہنجوتوں وی روئی  
 پر نہ رویا  
 دھرتی داہرا ہو بندا  
 جس دے اندر مانو تالنی  
 سوہ مویا ی  
 کتر پنتھی، ہیسیارا  
 جس نے اپنا ہوش کھویا ی  
 سر سوتی توں  
 لے کے توں دروان کوئی  
 دھرتی تے آئی  
 مانو تالنی، حق بچ دی  
 اکھراں دچوں جوت جگائی۔  
 گل کری توں لوکاں وی  
 دھیاں اتے دھریکاں وی  
 چڑیاں نوں کھنب دتے  
 کڑیاں نوں گیت دتے  
 پریتاں وی گل چھیڑی  
 عشق دی بات پائی  
 دن سونے وشیاں اتے  
 اپنی سند ر قلم چلائی  
 تیری سکھڑیانی،  
 مٹھی بولی۔

لکھتاں بن کے  
کل دنیا تک پہنچ گئی  
فیر تیری۔

چہ چا چھتری  
بن گئی دھرتی دی دیوی  
امرتا!!!

کئی سو رجاں۔

اتج ورائی

پتھراں وچوں۔

ترنن دی آواز دی آئی

نہ بولی۔

یہ کئی

نذر کے تیر اول گھبرایا

سوالاں وئے راہاں اتوں

لکھ گئی توں جیرا کر کے

پھلاں دیاں سو گندھاں وچوں

تینوں اک نشہ وی ہو یا

تیرا میر دا الفت ہو یا

تیری الفت!

بن گئی تیری جت امرتا!

اپنیاں سند لکھتاں کر کے،

توں ہو گئی۔ امر۔ امرتا!

توں ہو گئی۔ امر۔ امرتا!!

## شاعری دیاں لاناں

امرا! توں ساری دی ساری شاعری دیاں لاناں  
اُک داپانا،

میں تیری زبان کوں سجھاں  
میں۔۔۔ جو پنچھیاں، ی بولی نہ جاناں  
میں منہ جاند اکہ کبوتر کوں گوندا ہے  
تے کوئل دیوالی کوں ہندی اے،  
۔۔۔ جد ہنال آؤندا ہے۔

میں جاند اکہ اکو ادا سی اسیں سارے بندائے،  
اکو ہی کرم پیندے

تے پنچھی تے شاعر۔۔۔ محبت نوں گولدے  
میں جو تیری زبان بس اپنی کو جاتا

جی کبوتر دی، تے جی اک کوئل دی

پراک و شو اس ہے کہ توں دی محبت نوں گارہی  
اوہ کون خوش نصیب ہے کہ جہدے اپنی تیرا۔۔۔

ایہ گیت بن دا ہے

اوہ کون ہے جو تیری روح دی جھرنات سن دا ہے  
اوہ کون مان متا جو تھر کدی آتمادے قابل؟

توں امرتا! جو شاعری دی اگ وچ پکھلی ہوئی  
تے ساہنے اک لقمہ وچ بلدی پئی

(لپی اتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم

امرتا پر یتیم اک انسان  
اک امکان  
انسانیت دی درگاہ  
امرتا پر یتیم اک پل  
اک پریت  
لوکاں توں ایہ منگ پئی کردی  
آؤ ملو نفرماں دے دریاں لکھ کے  
خسجاں وٹے تے شانت ہو رہے  
امرتا پر یتیم اک درد  
اک کرلاہٹ  
شام دے انت ہون تے  
جدوں گونجی  
دھرتی مل گئی  
قبو وچ ستار دی ترف گیا  
امرتا پر یتیم اک دس  
اک اکھ  
لبو بھریاں ندیاں

نیلے وچھیاں لاشاں  
 دیکھ گئی تڑف  
 امرتا پر یتیم اک بھکھ  
 اک امید  
 اجڑے وچھڑے لوکاں دی  
 امرتا پر یتیم اک خوشبو  
 اک مسکان  
 بھراں مارے رانجھیاں دی  
 امرتا پر یتیم اک آدرش  
 اک چارا  
 بھنیر ڈنگے لوکاں لئی  
 ناگ منی تریاق

(پی امتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر تيم

امرت نام نہائيس اوس دا، اوہی امرت بانی  
 جس دی بولی دے وچ مٹھت، جیوں مشری دا پانی  
 تہندیاں دی ہستی جس نوں نہیں منظور لکیراں  
 زندگی بن کے لکیاں جس دے شہداں وچ تقدیراں  
 جھونھ فریب دیاں گلیاں چوں اٹھدی اک سچائی  
 رب دے بندیاں دی عبادت، رب دے کول پہنچائی  
 رہاں اتے رواجیاں والی، خود ریتی بن نکل  
 کوڑے بول قبولے نہ جو، نرم سجا بھی تھلی  
 کوتا دی چھاں پٹھاں بیٹھی، چائن دی پھلکاری  
 توپا نور دا بھردی رہندی، سچے کاو کیاری  
 جس دی کاو کیاری وچوں، اگیاں نوپاں اوواں  
 رنگ اوہے اسمانی لشکر، مٹی وچ خشبوواں  
 وارث شاہ نوں آکھیا جس نے، قبراں وچوں بول  
 اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول  
 اک روئی سی دھی پنجاب دی، لکھ لکھ مارے دین  
 اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن  
 رہاں دے نال سے گواچے، گم گئے اوہ گیت

ایہ خواہاں دی دنیا تیری، خواہاں نال پریت  
 خواہاں دی اک پونی کتی، چر کھے پایا تند  
 رنگاں دی جد باری کھولی، سے دے جز گئے دند  
 تیرے بولے بولاں وچوں، ہند انج پریت  
 اک دکھتا نوں جداں، بھلیا نہیں اتیت  
 زندگی والا ہر پل اوکھا، زندگی نال ہنڈایا  
 مر چکی، انسانیت نوں وی، کوتا نال جوایا  
 بکھتا پی جد ویز ہیاں اندر، منکھتا کر لائی  
 نر بل ہوئے تھاں دے لئی، ہی آواز اٹھائی  
 جس امرت نے امرت ورگا، ونڈیا ساہت خزانہ  
 پڑھ پڑھ جس نوں ہو یا پھر دا، سارا جگ دیوانہ  
 ساہتکاراں وی دنیا وچوں، اک قلماں دی رانی  
 ترگنی راہ دیرا بن کے، جھکتی سکھڑ سیانی  
 تیریاں لکھتاں والا سورج، جگ نوں دے اجالا  
 اوس دی بکل دا نگھ ماٹنے، 'سندھا' کرماں والا۔

(پہی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆



## بال امرتا

بال توں شروع کیتا سی اوس  
 تے بال ہی گئی اے ہن  
 جویں کلکھ جی پیا بال  
 لاس پیٹ نوں لکھا، نکا جیہا مونہ  
 چھوٹے چھوٹے انگ، اکھاں جی تیز  
 پرزبان خاموش، دماغ خاموش  
 انجان جیہا درد  
 تے انجان جیہی مسکراہٹ!  
 امرتا۔ جس دیاں انگلاں نیں  
 اک صدی نوں بچیا  
 اکھراں نوں اُنیا  
 رشتیاں نوں پہنیا  
 عشق دی بکلی جی  
 دھرتی توں انہراں تک  
 ہنگال سٹے بھہ لیکھے جو کھے!  
 امرتا۔ جس درد نوں پیتا کش کش  
 تے اکھراں دے اکھر جھڑ دے رہے

اوہدی قلم چوں!

امرتا۔۔ جس گاہیا

چودہ طبق دے دے اندر

تے لایاں ست اسمانی تاریاں!

امرتا۔۔ جس نوں چاہیا ملکاں۔۔ در۔۔ ملکاں دے

عاشقاں۔۔ جو گیاں۔۔ فقیراں نیں۔۔

جس نیں گا ہے سر جنادے انبر

جس نیں بیجہ پنے۔۔ بیڑیاں دے اکھیں!

بڑے لے سفر تے ہے پرتن دے اج کل۔

جو یں اکھر۔۔ اکھر جیون دی رہی

او یں ساہ۔۔ ساہ پرت رہی اے مگر کتے!

اک معصوم مُد راج پئی

بال امرتا۔۔

خور سے روز جمدی۔۔ مردی،

فیر لکھے چنیدی

کٹ لیدی اے خون کوئی!

حالے یا ترا تے ہے

پراک مینوں دیا پدا ہے دوآ لے اوہدے!

اوہدے پرا درشی، معصوم، بال جسم چوں،

حور دے لشکارے چنیدے!

لگدا ہے کوئی مہا استو

اوہدے سریر چوں ڈھلدا، سنگردا

اک ہندو دج ہے سٹ رہیہا!

امرتا!

جو مانو دے، غورت دے

مہا دستھار داناں ہے۔۔

سٹ رہی اے،

اک ہندو تے اچ کل!

(پہی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ممتا تے اسیس دا چہرہ -- امرتا پریتم

ا مہر چہ کھلدی چشتن دی کھڑکی  
 صحتیاں، سا بنجھاں تے دوستیاں دی سکھر چھوہ  
 اکہرے بدن چہ لہر دا دساد  
 اتھاہ سا گراں دی گہرائی چوں لہمی ناگ منی

اوہدے پیراں چہ کئی پینڈے  
 ہر پینڈے دی منزل محبت  
 اوہدی عبارت وچ کئی چہرے، کئی بول  
 اوہدی عبارت -- زندگی  
 من دیاں اداسیاں دے کول بیٹھی لوری  
 سنگھنی چپ نوں نام دیندی بول تھانی  
 ارتھ دی تلاش وچ وچر دا شہد  
 شہد دی پرکرم کر داسج، سوچ  
 شہد تے ارتھ دی گفتگو  
 کاو دے انتر من دی یا ترا  
 سکال دی شکل صورت  
 کھنادی سا کار صورت

سوچاں تے جذبیاں دی آبشار

سوچ وچ ادب

نظر وچ آداب

بولوں وچ ہنری

چپ وچ شہنائی

اوپر آلا دواں

جی بھر کے جین دی جستجو

اوپرے کول بہنا جین جو گے ہوتا

شاہ حسین، بلھے شاہ، دے کلام دی روح

وارث شاہ دے درد دی ہمسفر

دھرتی دی سلگدی داستان

درومند پانیاں داستناپ

کوئی آکا لیں کتھا کہانی

کسے لوک گیت دامنہ سہانہ را

اوپرے بارے مکھن

امبردی اسیتانوں آکاروینا

سمندر دے پانیاں نوں مٹھی چہ بھرنا

کجی ہریا دل نوں وچھی تلنا

ممتا، دوستی، نیرتا

اسیس، نگہ، محبت

دھرتی دی بک دا ہوکا  
 امبر دی اکھ دا خواب  
 بیاباناں چہ گوخدا برکھ راگ

کئی رشتیاں سنگ تر داشت  
 اوہدے چہرے چہ کئی چہرے  
 ہر چہرے داسر لکھ - زندگی  
 ہر چہرے دا اپنام - امرتا  
 اک صدی داسنگ ساتھ - امرتا تے زندگی  
 کنیاں صدیاں داساتھ سنگ - زندگی تے امرتا

اوہد اسفر لوگ لیت  
 اوہد راہ چن دیا  
 اوہدی عبادت شبد سادھنا  
 اوہد خواب اکسن سد یوی، روحاں دے ملے

اوہدے انگ سنگ مدار ہیاں ڈونگھیاں عبارتاں  
 اوس نے بکھوڑے پنڈے دی گاہے  
 تلخیاں، الاہمیاں، روسیاں، طعئیاں دی دھپ چھاں وی ہنڈائی  
 پتھر پلے بول ہے، سول صراحی چہ دھری  
 محبت دے سنگھنے دھن لے چہ تری  
 من تے شہر دی دھند چہ سدالین رہی  
 ایسے دھند توں اوس نوں باد پاناں داہل ملایا

تے اوو منجھد ارنوں دی  
 کنا را بھجھ کے ترو دی رہی  
 زندگی دے سون شہرے ماپواں تے آن اتھی

اندرو وھلھدی وھولی باہ سورجی سنیہا  
 زندگی نوں جی بھرنے جین دی رتھ دی اوس دا خواب  
 اس خواب نوں اوں اوں بندایا  
 تے لادتی سوچ دے برپنے تے -- نکتہ رسیدی  
 اپنے بارے بولے تے اپنے بندائے بچ نوں  
 بچ کرے جانیا  
 بچ کرے دکھایا

بچ نوں جین تے رہن دی سزا پانی  
 پھمن دی سوچتا نوں آنج نہیں آؤن دلی  
 امرتا پریم جون دے ارتھاں نوں -- سمیاں دی بکاتے لکھ دتا

اوہدے بارے ہوئی کی نکساں، اکنا لولھساں  
 دھرتی دی بک داہو کا  
 شہداں دے بچ نہیں آؤندا

فی الحال تاں ایسا ہی بہت ہے  
 کہ اوس دی متاتے ایسی  
 ساڈے سراں تے ہے ...



## چائن

جدوں ساڈے چلھے ٹھنڈے سن  
 جدوں ساڈے گھراں تے  
 مئے لشکر ہنیرے دے  
 جدوں آؤندی سی ہواچوں  
 مہک بارود دی  
 جدوں پھلاں دی تھاں  
 کڈھے سرفیاں نے خنجر اں نے  
 جدوں اکھاں چہ اتری بیوی اداسی  
 خوشی دی تھاویں  
 اکھاں چہ اتھروں دی سلہ  
 جدوں من دے کھیت بجر  
 ہو گئے کلرائے  
 جدوں گاڑھی تے بیٹھے بھرائی دی  
 رک گئی ہیک گلے چ  
 جدوں گیتاں دی تھاویں  
 اگ آئے سن مرے  
 اوہناں کا لے طوفاناں چہ



تھکھو یلیاں رات چوں  
 بلدا ہو یا اک چراغ  
 آنکھیا ساڈے ویڑھیاں چہ  
 جس توں لے چائن  
 سو رجاں نے  
 جڑے بسہر عشق نوں  
 جس دی لوء چہ گایا گیت  
 دے ارتھ محبت دے  
 مک گئی عقی اوس چراغ دی اج  
 دھر گیا مر گیا  
 ساڈے لبہاں تے فراوہ چراغ  
 تے اکھاں تر ہو گئیاں۔

(لپی انتہ: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## اک شردھا نجلی امرتا پریتم

بلبلے فی پنجاب دیئے، تیری کی ہونی نہ پوری  
بلبلے فی میرے دیش دیئے، تیری کی ہونی نہ پوری  
..... بلبلے فی پنجاب دیئے.....

1919 وچ کو جرانوا ا جتھی  
پتا حیمانی کرتا رنگھہ ہسکاری  
چھوٹی عمرے دے گئی ماں و تھوڑا  
آٹنی باپ تے ذمے داری  
86-1/2 سال توں ہس کھیڈ کے، کرگئی یا تراپوری  
..... بلبلے فی پنجاب دیئے.....

اپنی وچ کوتاواں لکھیا  
کھل کے ناری پیڑا  
عورت دے دکھ ہرن دا  
چلیا سرتے پیڑا  
پنجابی ساہت وچ پہلی لکھیکا، جانی عورت دی مجبوری  
..... بلبلے فی پنجاب دیئے.....

قلم تیری دیاں لکھیاں سطران  
 چڑھیاں لوک زبانان  
 اج آکھاں وارث شاہنوں،  
 اج وی گاوے ہراک گھرانہ  
 آواز پنجاب دی کیہا ہے تانہیوں  
 پروفیسر تیا سنگھ جے مہان نکھاری  
 بلبلے فی پنجاب دیئے.....

ڈیڈھ درجن توں ودھ پستکاں  
 آئیاں وچ ہزاراں  
 'پدم سری' جے انعام ملے،  
 کولوں دیش دیاں کرکاراں  
 وچ سہست دے ناں مہکدا، جوئیں مہکے کستوری  
 بلبلے فی پنجاب دیئے.....

لے کے جنم توں بھلا کجیا  
 نہ بے ارتھ گویا  
 ایسے جنم وچ سیوا کر کے  
 ماں دا قرض چکایا  
 نام امر رہیگا وچ جگ دے  
 جدوں تک رہے گی دنیا پوری  
 بلبلے فی پنجاب دیئے.....

شکلوں کدے نہ دیکھیا میں تہانوں

پڑھیا ویج کتاباں

ویج اخبار دے دکھ بھری خبرنوں پڑھ کے

ہو یا دکھ بے حسابا

جک پال، کرے رب اے نیستی، ہووے واسا سورگ پوری

بلبلے نی پنجاب دیے، تیری کمی ہونی نہ پوری

بلبلے نی مہرے دلش دیے، تیری کمی ہونی نہ پوری

بلبلے نی پنجاب دیے

(پہلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم لئی اک نظم

"اک سی ایتھا" جو "دلی دیاں گلیاں" وچ رہندی سی  
 میں اوہ دے "سنیہوڑے" دی پڑھے نہیں، تے "آخری خط" دی  
 پر جہدوں دھرتی اُتے رات دی پہلی چھاں دے نال ہی اک ٹھنڈ  
 پیراں راہیں ہو لے ہو لے چڑھدی اے  
 جسم دے پیراں ولوں دی، تے من دے پیراں ولوں دی  
 "اک سوال" میرے "ذہن دا بند دروازہ" کھڑا کاندھا اے  
 ایہہ تاں میرے دل دی حالت سی، امرتا نوں کھنھے دی؟  
 انج تاں "میں وی اوہ راہ ویکھیا اے، جتھوں نظماں تھر کے آؤندیاں نہیں"  
 اوہ لوک دیکھے جھاں دے "اک ہتھ مہندی اک ہتھ چھالا" ہوندا اے..... پر  
 "نویں رُت" آؤن تیکر "کستوری" ور گے بول کھلا ردی "دُجھلی" دی آواز کھنھے سنی؟  
 "بچہ ور ہے" لمبی سڑک اُتے تھر کے میرا جی "چک نمبر ۳۶" جان نوں کر دا اے  
 جتھے "کرچی لکیراں" نال کالا گھاب بن دا اے  
 "ایہہ سچ" ہے کہ "ناگ منی" دی تلاش  
 "شوق صراحیوں" ڈکھاں دے داروہین ورگی ہے۔  
 "کچی حویلی" وچ بہہ کے "چانن دا ہوکا" سناتے "اک شہر دی موت" دیکھنا  
 کوئی معمولی دکھانت نہیں ہوندا  
 دل دے "کورے کاغذ" اُتے "اگ دیاں لیکاں" نال "کچھ اکھ پاندیاں" ہمینوں ایس گل دا

بالکل پتہ نہیں ہوندا کہ ”تجھنی در ہے“ بعد کیہ ہووے گا؟  
 آل دوائے کرو دھ مشکلات تے مجبوریاں بھی اک ”آداس کتاب“ ورگی زندگی وچ  
 جدون ایہہ آوے کہ ”کہوڑی زندگی کہوڑا ساہت“.... تاں  
 امرتا!

دیو چا چا، دیو کی بھین، ملک، ڈاکٹر دیو تے ”اشو“ توں مل کے  
 ”کانڈ تے کیسوس“ ور گئے ”وستاویز“ توں پڑھ کے..... تے  
 ”ٹرل ڈھوتے مٹھل“ ور گیاں تیریاں امر لکھتا پڑھ کے  
 میں اپنے من نوں شانتی تے جگھ نال بھر لیند اہاں  
 تے سچ..... جو ”اک دا بونا ہے“، اوہ سچ وچ  
 میراوشواس  
 ”اک نمبر دے فرق“ نال جت جاند اے.....

☆☆☆☆

## توں دسیا....

(امر تادی کہانی 'اک شہر دی موت دی اک کردارنوں مکھ رکھ کے)

توں دسیا، شہر مر گیا، سڑ گیا،

سواہ پیٹھ دیا گیا۔

تینوں ترخ دی یاد ہے، چٹلی طراں، 24 اگست 79

توں ایہ وی جاندی ہیں

سڑ ویاں، بن روز پام پنیاں کئی،

دبدیاں، بن فوز پام پنیاں کئی۔

توں اگلی پام پئی ہے نہیں،

جس نوں کئی وار کھنڈراں ج مڑنا پیا۔

اج دا جارج وی ہے، جار یہا کھنڈراں ج روز

درندرنوں لوڑ ہے تیر، رات نوں سپنے ج روز

مینوں بتا ہے، تینوں پتا ہے،

دنیا ویاں دلیلاں اتے قنون،

سبھ بن ویا تھ۔۔

دل دی اک دلیل ہی ہے سردسری شٹ

تے دل میرے دی دلیل ہے اک ہی۔۔

تینوں دیکھن دی پیاس ہے۔ اک آس ہے۔۔

حالے وی آس ہے --

آس ہے تاں سو اس ہے.....

(پلی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆



## اک صدی اک ندی

امرتا تاں وارث شاہ دی گل چوں جنمی کوئی گڑی ہے،  
 ویسویں صدی وچ شہد سوت کت رہی ہے۔ کہندی ہے،  
 میں تاں اے کوہڑے چوں کجھ پونیاں ہی کتیاں ہن،  
 کتی ہنھی ہے دوواں پنجاباں وی ساری زوں.....

ایہ صدی جارہی ہے، اتم چھٹاں وچ ہے  
 اک ندی جارہی ہے، اتم قدماں وچ ہے  
 سمندر ول دھارہی ہے، سمندر نیڑے ہے  
 سمندر نوں پتا ہے: ہو جاوے گا اوہ ہو روڈا  
 سمندر سوچدا ہے:

کجھ کراں گا میں اوس واسواگت  
 کیہڑا ہووے گا پرولش دوآر  
 کتھے لاواں گا سواگتی گیٹ

سمندر پورا

ندی دے سواگت وچ ہو جاندا ہے  
 ہن ندی ہو جاوے گی سمندر

بھرتی سوچے گی۔ میں اوہ نہ رہی ہوں  
 سمندر دھاراواں توں کہند ہے  
 تسی بننا ہے۔۔۔ قرآن دیاں آکھان  
 میں بننا ہے دھرم گرنہ دی دیہ  
 چنتن جگہ چاہیے انجی  
 ہو سکے گا میری بچی داسوا گت۔۔۔

(پبی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## اٹھ دنیا دے مالکا

لوکائی دادکھ درد پلٹن والی مہان کوتری امرتا پر تیم دی یاد نوں سمریت کوتا

اٹھ دنیا دے مالکا،

نگاہ چو غیرے مار

کل لوکائی ترپ دی،

تینوں رہی پکار

اک دو جے نوں کھاریہا،

ہر بندہ، ہر تار

دیکھ کیہ بھانا ورتیا؟

کیسی دگ گئی مار

آپو دھاپی پے گئی،

کوئی نہ سنے پکار

جیچ چہاڑ اچھیا،

پچی ہا ہا کار

ہر پاسے جیاؤ لدا،

مانو تا دا خون  
 پشو اں توں بے قدری ہوئی،  
 مانو تا وی جون  
 چارے پاسے پھیلیا،  
 نفرتاں دا زہر  
 ہر تھاں ہونی ورت گئی،  
 ورت گیا اے قہر

سبھے دشمن بن گئے،  
 اپنے نے جاں غیر  
 سبھ کجھ الٹا ہو گیا،  
 نہ ہوئے نہ ویر

دھرت پئی اج ڈولدی،  
 دھول ہو گیا پریشان  
 دھرم کرم سبھ اڈیا،  
 گھوڑ ہو یا پردھان

دھواں دھواں ہو گیا،  
 پھیل گیا اندھکار  
 پتی مچی ہو گیا،  
 اٹا ایہ سنسار

پت دھیاں تے بھیناں دی،

لچھدی سر بازار

گھر گھر کنور جم پنے

پانڈو ہوئے لاچار

گل گل تیکر آ گئے،

بھکھ، بھر شفا چار

واڑ کھیت نوں کھار ہی،

اڑیا شفا چار

کتھے کر پیے جو دڑی،

کوئی نہ دے دو آ

ٹھگاں دے در بار نے،

تے جھوٹاں دی سرکار

اٹھ دنیا دے والیا،

ڈب رہیا سنسار

ڈب دی پئی ایس بیڑی نوں،

توں ہی سکدیں تار

(پہی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ہجراں دی ماری

دیلے دے انے کھوہ وچ سنیا

اوس اکھیاں دا ڈول

ڈونگے پانیاں

ننگے پیری

اک لہر پھرول

جیون جست کہ ہارے سائیاں

آ اوہ دے اتھر و تول!

منھیاں کوڑیاں دریاواں چوں

سسیاں چنن آئی

حرفاں دے لہہ لہہ کے جگنو

بولاں دے رنکے پھلاں نال

قبرے مٹی پائی

نمیاں نمیاں آ ہواں دی

اوس اچھی چیک سنائی

اوس پنجاب دا ہوکا بھریا

دھرتی دے ہجراں دی ماری

سینے اندر ریت کھلا ری

دکھوا گھٹ اوہدے سنگ چ اڑیا

یاداں دے پنہرو چ رکھ کے

اک پنہمی دا پر

پچھے سٹ کے کھلا آئی

اوانا اک در!

☆☆☆☆

## دھی وارث دی۔۔۔ امرتا پریتم

آپے  
 آپنا سورج بنا کے  
 آپنے ہی  
 متھے سج اگدی  
 آپے  
 آپنی دھپ وچ بیٹھی  
 دھپ دی کا تر جی  
 سون کڑی اک  
 سج قصیدہ کندھ دی  
 اک اگلی  
 کلی کاری  
 بظلم تری ہی  
 عمراں دی سرگھی دے ویلے  
 پتھر کیٹے کھیڈی  
 تر دی جانندی  
 اونسریاں دی آئی رتے  
 شہداں دے جنگل دے دچوں



بھٹکھڑیاں لیہاں دے کنڈے  
 گھگھریاں دی لون لوں چنڈے  
 ہوا پیازی پلا اوس دا  
 جھٹک جھٹک کے  
 پچک پچک کے  
 تڑ دی جاندی  
 تڑ دی جاندی  
 دھی وارث دی  
 دھید و آپے  
 کدے اوہ سکی  
 کدے اوہ صاحبان  
 اوہ سوئی دے دیس  
 کدے جہناں  
 کدے اوہ رانی  
 اوہ تلج دا ویک  
 جا بیٹھی جنادے کنڈھے  
 کر کر دیکھے ویس

جتھے بیٹھے  
 جتھے بولے  
 اک ترنجبن گا دے

امڑی دیزے میلا لگا

اک آوے  
 اک جاوے  
 ناگ منی دے پیڑھے بہہ کے  
 نچیاں تنداں  
 سچے بول  
 چرکھا باڑ  
 تندے تانے  
 امرت شہد بچھانے  
 سہن لوک وچ  
 مات لوک وچ  
 دیو لوک وچ  
 تاریاں اتے گرہاں اتے  
 ٹمیاں تنداں پھرے جوڑ دی  
 متھ دے شوشے وچ  
 ات دا عکس بچھانے

پیٹھ ہے  
 پیڑھے متھے تے  
 گیان جی  
 اک سکھ لکیر  
 ماناں سماناں دے  
 اتج چارے  
 پڑھ کے بنھی

برش دیاں چھوہاں جھمی ہسے  
 کن کن من کن من  
 مینہ چھوہو سے  
 کاغذ دی کیوس تے اگی  
 ست اسمانی لشکاں مارے  
 ایہ ست رنگی پتنگھ

آپے  
 آپنا سورج بن کے  
 آپنے ہی منھے وچ اگدی  
 آپے آپنی  
 دھپ وچ پیٹھی  
 دھپ دی کاتر جھمی  
 سون کڑی اک۔۔ قصیدہ کڈھدی

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## شاعرانہ روح

امرتا پر تہم دانناں  
 پنجاب لئی اک اہییا نام ہے خاص  
 جویں جھٹاں، راوی، ستلج جاں بیاس  
 امرتا اک گاتھا، اک دنت کٹھا  
 امرتا، اک بھجئی شخصیت  
 جہدے ناں دوائے بھللاؤ تدا ہے  
 اتیکاں کہانیاں، کوتاواں دا پر بھامنڈل  
 امرتا نوں ملنا۔۔۔  
 اوس پر بھامنڈل دی لووچ بیٹھنا  
 امرتا نوں ملنا۔۔۔  
 کوتا دے رکھ دی چھا دیں ہے بیٹھنا  
 عشق دی شدت، وودرہ دا ساہس  
 امرتا پنجابی لئی، اک ناں ہے خاص  
 امرتا داجیون کاغذ تے قلم دی سوچی صحبت ہے  
 شاعری اوس لئی ہنر نہیں، صحبت ہے  
 جاتچ نہیں، چنن ہے  
 شلپ نہیں، عبادت ہے

اک شاعرانہ روح دے تپدے سفر دا

ناں ہی تاں ہے امرتا

(پی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## غزل

مہم دھندیاں دھج ہو کے لین  
بندہ بن گیا اک مشین

پہل دھج گلوں پھر دے لوکی  
سپنا ہویا شہد یقین

ملک قید سرحدال اندر  
نوٹیاں دھج دند لئی زمین

رہبر راہ درساؤندے تھکے  
پہ سکھیا جاپے بل جین

نت ہی فتوے جھوٹھ سنا کے  
سچ توں رہے مناؤندا این

منہا بولی دلاں چوں ویری  
شہد ارتھ ہوئے رہمین

میتے	اسے	ذکر	فان	میتے
میتے	ن	اسے	وہاں	میتے
ن	ن	پہلے	پہلے	ن
ن	ن	ن	ن	ن

(پہلے نمبر)

## ساحر دے جان پچھوں

نظم جی! تیری زندگی چوں  
 جدوں نفی ہو یا اوہ گیت جیہا  
 تاں جی کجی آکھاں 'ہر کوئی اکلا'  
 گیت اوہ گواچیا نہیں،  
 اوہ سنے بول ہر زبان تے  
 اوہ گیت سمجھناں داسا نہھا،  
 ہو اوچ کھنڈیاں فضا وچ گھلیا،  
 اوہ دیسہدیاں نال کھبہ کے پرت آوے گا  
 نظم جیہی! تیری زندگی چوں  
 جو نفی ہو یا گیت جیہا  
 تاں جی کروا ہے آکھاں "توں اکل نہیں"  
 تیرے چیزاں نوں الیکدے،  
 لیکاں نال نقش چتر دے ہتھاں دادا لاسا ہے  
 ککھ دے جایاں دا گہرا بھروسہ،  
 تیرے ہی سر جے اکھراں دے ارتھاں دے  
 خواہ صورت سنسار دے لکھ عاشق، تیرے غم ج شریک نہیں  
 دیس پردیس چوں تیرے ناں دیاں آوازاں گونجیاں،



کے لیے جو شخص چاہے  
مستحقانِ حق کو دے  
تو اس کو ملے

(ابنِ زکریا)

## تیرے ناں

جہذا تھرو جمن بھوکیں دی

یاد وچ کر یا

تیرے ناں

جہذا ہو کا دل وچ

یار لئی بھریا

تیرے ناں

جہذا تیر مرزے یار

دل اسمانے جڑیا

تیرے ناں

جہذا کا سہ کن پڑوا کے

را نچھے ہتھ وچ پھڑیا

اوہ وی تیرے ناں

☆☆☆☆

## انج یاد پیا کوئی آدے

انج یاد پیا کوئی آدے  
 نئی نئی آتے تیکھ یادوا  
 سے لہو دی نیک  
 تیکھ خن دی دشتا  
 تیرے بھو مارے چیک  
 تو میں آتے آتے ساودا  
 یاد تیرا پتہ ایسہ  
 انج خن تیرے دیاں گھیاں  
 کیس پس گندھا کے آ  
 کوئی گھوٹ لیا فی مہلہ دیاں  
 کوئی ساو آ فی رنگا  
 آنھ جاگ گھاں ویسے راسے  
 تیرا ہونی گھنڈ پئی چاے  
 انج یاد پیا کوئی آدے  
 بچ دیاں چہ نیوں گھو کر اں  
 بچ نئی ایس دی ماٹل  
 تینوں سٹھ سہیلیاں، داندیاں

پئی نئی گھوکر نال

انج خجے بیٹ تے بیڑیاں

اتے سخی چھا نجر آپ

تیجھوں لیکن گئی گواچ نی

انج شگناں والی چھاپ

تیرے خجے سجھ سلیکھ نی

اتے بارہ ماہ دے گاؤن

تینوں پریت دیئے شہزادیئے

انج اچی اچی راون

تیرے اکھراں وچوں بولدی

میرے دیس پنجاب دی ریت

تیری سوچ نے تہدی دھپ نوں

کر دتا ٹھنڈا سیت

تیری امر منکھ نال پریت

انج دیس دے پنجاں پانیاں

وچ اتھر دکھان ابا لے

انج کنڈیاں دی ہر نوک نے

تیرے چم لیے پیر دے چھاسے

تیری چپ تے تخن نوں پے گئے

یہیہ جہرے نال پالے

جندیا والں دے حوالے

تیرے ہاتھوں لکھی نمود گئی

تے غم ہوں ڈالے رہ

جس کی فلمی لوح آپہ توں

اسیں آجیے شہر اشم

ان روپے مارو اشم اس

اسے پٹ کے اونیں ہی

انہ پاتیری داپاسا

تک فیرونی پرما دے

ان تو تادے ہریا لیا

تج اگے بدلدا جاوے

انشا دیا کوئی آدے

☆☆☆☆

## امرتائی۔۔۔

امرت رس وچ دس ہجر دا گھول کے اتھر کھڑ دے نیس  
ہجرت روگ ادلی دل کہیہ دھرتی امبر ہلدے نیس  
واج چناں نوں مارے دمی تے چھلاں وی کر لاندیاں نیس  
بدلاں دے وچ چھیک ہوؤں تے اتھر کردے نیس

جوڑا رتا پیریں جتی جگ حیاتی والی اے  
جوڑے کھول کے روں ہیراں ہاڑے دل دے نیس  
حرفاں نال تریدی رہندی ساں توں روگ حیاتی دے  
پانی بچ ہوؤں تے مٹھی وانگوں ہلدے نیس  
اتھ امرتا بول قبر چوں ویلے نوں للکار  
سلی اکھ تے پانی کھارا ویلے ملدے نیس

☆☆☆☆

## توں مونیوں۔۔۔۔۔

توں مونیوں میں روایا نہیں  
 جھوٹاں ہار چوایا نہیں  
 پانی پھر دا اندر ہار  
 کونسا بھانویں چوایا نہیں  
 زندا زندا رو گیا کیوں  
 تھوڑا بوہت دی ہویا نہیں  
 اندر دا کیسہ دساں حال  
 ہاروں دی اسے ٹوہیا نہیں  
 رو گیا رب نے قدرت مہلی  
 مجھ کھلی اسے گوہیا نہیں  
 کھا بندہ بیٹھا میں دی  
 اوہ دی نواں نرویا نہیں  
 لکے ہوئے نو کجھ ہتھ  
 ایذا دی ان مچھوہیا نہیں  
 لڑ دی جانا ایس کدی  
 ساڈا سپ گزدیا نہیں  
 ساہ نہ آیا ظفرے نوں  
 فیہ دی کتھر مویا نہیں

## لہجے وارث شاہ اک ہور

سچے حسن عشق دے چور  
 لہجے وارث شاہ اک ہور  
 آپ ای ڈولے پھر دے نہیں  
 جتھ جہاں دے ساڈی ڈور  
 جنگل بیٹے دیا مینہ  
 آپے ای چالے پے گئے سور  
 لہجی اسماناں توں چیک  
 ڈر گئے سچے ڈگر ڈور  
 کھاہی بڑھے وارے سٹ  
 کردا رہناں روز کھور  
 میں دی نواں داہ نہیں لیا  
 اوس نے دی پھڑیا نہیں کھور  
 گھر نوں دی ٹرجاواں گے  
 جس دن دی کدی آگئی لور  
 باہر دا رولا کیہہ سہدے  
 اندر وی سی ایناں شور  
 کاناں پنکا لیا ظفر  
 اوہ نکڑا سی میں کمزور



## کوئی ویل ودہائیے

دل دیں دہا ہے  
 مٹھوا سید کھا ہے  
 ٹھنڈے پائے ٹھنڈی  
 ہانوں تھوں مر جا ہے  
 صرے کول ہا کی  
 ہا م آ ہے جا ہے  
 پھی ہوئی ہا کی نوں  
 ہاں پار لگا ہے  
 ہاں اچھا ہے دریاں  
 ہاں گریباں ڈا ہے  
 کھی کوئی طریقہ  
 کوئی اٹا ہے لاجے  
 آو ایس شہر ہے  
 انم ہب چلا ہے  
 ہان نوں ہان پیارا  
 پندھری کوئی بھسا ہے  
 کسے ہور دی چھای  
 ظفرے دے گل پائے

## اسیں دونویں۔۔۔۔۔

دکھو دکھ ویں نال ویں سہہ دے رہے  
 دانے ہجر فراق دے چدے رہے  
 دین بھیا کھر تے کافری نوں  
 بھانویں مڈھ گوانڈھ ویں رب دے رہے  
 نہ کجھ خرچیا تے ناں ای دان کجھا  
 پیسے ڈب دے وچے ای ڈب دے رہے  
 ہو کے آپنے وس توں باہر اسیں  
 نہ کوئل دے رہے نہ جھب دے رہے  
 کسے ہوں ہوان ویں فکر لایں  
 کجھ کرن کران نوں پھدے رہے  
 اک رنگ ویں کسے نہ رہن دتا  
 وچے وچ ای ڈب کھڑدے رہے  
 دشمن دل دی اکو ای کٹھڑی سی  
 دنے رات اوے وچ سمجھدے رہے  
 اکو شے سی پار الار جھوں  
 اسیں میں تے توں دونویں سمجھدے رہے  
 جیوندی جاگدی دیہی نوں انج ظفر !  
 جتے ساڑدے رہے ' کتے دہے رہے

## ایس طراں نہیں جاوی دا

بدھرے نو نہہ اڑا دی دا  
 ایس طراں نہیں جاوی دا  
 پیتا سگواں توں، تے میں  
 پانی ایسے راوی دا  
 ساڈنے اتے تہاڈے وچ  
 فرق سی اکی باوی دا  
 تیلے اڈن ٹوڑی دے  
 سکھنا بوبل اڈاوی دا  
 اک داری جے چھوہہ لویئے  
 کم اوہ توڑ چڑھاوی دا  
 منجی پھوہڑی دی تھاہرے  
 اپنا آپ وچھاوی دا  
 سیک سڑن دا ہور سواد  
 پاسہ نہیں پرتاوی دا  
 منگی سرت سمہال جھدوں  
 چڑھیا کھولا ساوی دا  
 بھوتیاں دے نال ظفر  
 جھولا جیہا بڑاوی دا

## تیری اک بلا ہنگ

ہنگ	دتی	کلو
پٹا ہنگ	اوت	اوہو
سرحد ال	گنی	نپ
بلا ہنگ	اک	تیری
محل	دی	یاں
چھا ہنگ	دا	یاں
دی	ہوا	پالا
مانگھ	نہ	پالا
پھیرے	وی	آپ
ڈانگ	بیٹھاں	منجی
تے	فرش	چنے
ٹانگ	کالا	بیٹھا
دھکیاں	بہاون	کدی
کاگ	اڈاون	کدی
نوں	آپ	لبھاں
وانگ	سدا ئیاں	بھراں
ظفر	کا	اپنے
ڈٹانگ	نواں	کوئی

## کوٹا

(مہمان لیکھکا امرتا پر۔ تم نوں سمرپت)

امرتا پر۔ تم ساہت منزل وچ،

سورج وانگاں چڑھی رہی

گھروں اوس دا دنیاں بھر دے،

ساہکاراں دی گڑھی رہی۔

بچپن توں ہی ساہت دی منزل،

پڑھی پڑھی چڑھی گئی۔

دُنیا دے ہر کونے دے وچ

بھتوں دودھ ہے پڑھی گئی۔

عیش و آرام دے جام دی پیتے،

نہیں کسے دی تڑی سہی۔

ساہت رچنا ہی دھرم سمجھیا،

قلم سدا ہتھ پھڑی رہی۔

وانگ انگوٹھیاں رچنا اوس دی

ہیرے موتیاں جڑی رہی

قسمت اوس دے اگے ہردم،

ہتھ جوڑ کے کھڑی رہی

بول مٹھڑے تے شاعری اوس دی،

پھل کھیاں دی لڑی رہی

گا تھا عورت دے درواں دی،

دل دماغ تے چڑی رہی

اوسدیاں بھاوناواں دی گڈی،

سدا اسمائیں چڑھی رہی۔

مان، سمنان، پرسکاراں دی،

لگی سدا ہی جھڑی رہی۔

”مان سچے عشق دا“ کر دی،

حق، خواہشاں لئی اڑی رہی۔

توڑ کے رسم، رواجاں تائیں،

وانگ چٹاٹاں کھڑی رہی

نال سا جک بندھناں دے اوہ،

عمران ساری لڑی رہی۔

بے وس ہوئی چڑی وانگ پر،

ہنجرے وچ نہیں تڑی رہی

چنگی چاہے ماڑی اوس تے،

وانگ انساناں کھڑی رہی

جک وچ ساہت دا کردی چائن

”سینی“ ساں وانگراں کھڑی رہی۔

(لپی انتر: قمران زمان)

☆☆☆☆

## یگ بیت گئے

مک گیا ہے اک یگ تے  
 ساہت دا اک چوکھا دیوا بچھ گیا  
 قول نکھٹ گیا، لاٹ تھڑ کدی  
 سدائی ہوئی الوپ  
 تے رک گیا کوتا تے ساہت دا  
 لباسفر  
 رہ گئی پچھے  
 ماناں سسناں دی دنیا  
 وچاراں دی دنیاں  
 جو سداجکدی رہے گی  
 ہمیشاں یگاں تیکر ازلاں تک  
 تے دیندی رہے گی ہوکا  
 بیگاتیاں پیراں دا  
 ہیراں دے درواں دا  
 کیدواں دیاں چالاں دا  
 تے روندی رہے گی ابلاواں دے دھڑے  
 دے گی راہ منزاں دے پاندھیاں نوں

ستے آکھے گی آج دے لیکھاں نوں  
 کیہ تسمیں وارث شاہ بن سکدے ہو؟  
 کیہ تسمیں بن سکدے ہو امرتا پریتم؟  
 جو نہیں تان قائم تان کر سکدے ہو  
 اپنی ہوند

زندگی دی بیڑی نوں ہست دے چھواں دی  
 ہندی ہے لوڑ  
 فرکوئی کنار اور نہیں ہندا  
 سوار تھو دا جھوٹا برقع لاء کے  
 پچھا نو بیگانے درد نوں  
 بولواتیاں دے خائف  
 جاں فر

تان سین وانگ، جھینر کوئی راگ  
 تان جو ہزاراں نہیں  
 جگ بین لکھاں چو مکھے دیوے  
 تے دیویاں توں ملدی رہے دیویاں نوں روشنی  
 ملدی رہے گیان دی لوہ  
 اتے ایہ سلسلہ چلدار ہے  
 چلدار ہے

تے ہندی رہے نویں لگاں دی شروعات۔

(پہلی اتھ: قمر الزمان)

☆☆☆☆



## ویہویں صدی دی لوء (امرتا دے تال)

اوہ اک داتنگ ددھدی  
 زندگی دے کنارے کنارے ٹردی  
 کدے پھر گیاں نال کھیڑدی  
 جھرنیاں دے سرودی سنگیت نوں سن دی  
 سپیاں دے چنے نوں دل چہ کھڑاؤندی  
 سورج دے سنگ سنگ ٹردی رہی  
 اوکھیاں تے ہمیریاں راہاں دی پاندھی بن  
 کدے ہمیریاں ویاں کندراں چوں لنگھدی  
 اداسیاں دے بندھن توڑے  
 کدے چنچل بن جاندی  
 کدے دھرتی نال پاؤندی بات  
 آپ دی دھرتی بن جاندی  
 لمیاں لمیاں داتاں گاہندی  
 نہن لوک وچ ست رنگاں دا  
 سپیاں داتھان بناؤندی  
 کدے بدلاں دے ددھ چنے گوہرے کت دی

تے، ٹھارو بندی دھرتی دی ہک نوں  
 ہر دھی دی اسٹ پیاس نوں  
 تے دلی دردے احساس نوں  
 جان وی، ر مزاں نوں پچھان دی  
 اوہ بھڑھیاں دی،  
 ماں بن گئی جا پدی  
 کدے اڈ دے پنچھیاں نال  
 چت ریریاں تلتیاں نال  
 اڈ دے بدلاں نال اڈاریاں لاؤندی  
 دورا مبر دے آکھنے تک  
 اوہ اپنے شیداں دی،  
 ون سوندا دی ترجمانی کردی  
 خوبصورت شیداں دیاں پیٹنھاں جزاؤندی  
 بنا ہوندی امیر دی ہک تے  
 سوچاں دا اک خوبصورت آکھنا  
 بھجی دی کدیں مسیہڑا  
 زندگی دے سفر چوں  
 وچھڑ گئے محرم نوں  
 بن جان دی کدے دھارک گرنتھاں نوں پڑھدی پڑھدی  
 دیہویں صدی دی لوہ حرفاں دا حاصل  
 گیتا تے بائبل  
 شیداں تے ارتھاں دا  
 بہو پر سار کردی کردی

بن گئی جو سہایت دادھرا تل۔

اوہ امرتاسی، امرتا.....

ندی ہی نور دی کوئی

جوشبداں دی سر جتا کردی کردی

سہایت دے سروراں وچ

عشق کستوری اوہدیاں رگاں وچ وسدی

کھڑی، مہکدی

دودھ رنگی چاننی دیاں

رشتاں بن بن لیٹ دی

دھرت دے کیوس اُتے

کاغذ دی کوری سطح اُتے

شبداں دے چتر دی

رنگ برنگے، چانن دی پھلکاری ورگے

امبر دے آلے وچ رکھے

جن سورج دو جلدے دیوے

وشال ابر تھاں دا، بہو پرتاں دا

پرسا کر دے،

گیان دے چانن نال چمکدے چتر

جیون دی راہی کوتا دے نال نال

موتیاں ورگے شبداں دے رنگ بھردی

سونی راہی اوہ کوتا دے پنگھوڑے وچ

دھپ سیکدی رہی، تاں کوتا دے ویڑھے وچ

کوتا دی مہندی تلیاں تے سجا کے

کوتا داکا متھے تے لا کے  
 کوتا دے سو ہے سالو وچ لپٹی  
 رنگاں دی چتری کیونس ی لکدی  
 کوتا دے پھلاں دی بیج تے سنی  
 زندگی دے سارے درداں دی کڑتن  
 عیشے دی اک ہی بوند وچ پی کے  
 رنگی دور، بہت دور  
 اوس ساگر دل  
 جس دی کوئی تھاہ نہیں  
 جس دی .....

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

اک دہ صدی داوگوچا امرتا پریتم  
(پورو لکھیا مرثیہ)

امرتا!

میں سوچ داہاں

کہ کہو جیہی ہووے گی

اوہ سندھیا

جدوں توں الوداع کہہ کے

ہوا وچ مل جائیں گی،

پننے دی طراں،

خاموشی دے کھنڈ لا کے،

کائنات دے غنیں

ہنجمو ہون گے موتیاں ور گے



پنھیاں نوں اڈن لئی،

آکاش سوڑاتے سونا

ہو جائے گا اک دم

برخ اداس ہو جان گے

اوس دن

پنجاب دے دریاؤ دن کرن گے  
ساگرنوں خبر دین خاطر!  
بدلاں دے پلو  
بھل ہون گے ترپ ترپ

مٹی ج خاموشی ہووے گی  
چیر دی رین ورگی

بہر دی جائی دے ترن تے  
چن اپنی پگڑی دے لڑناں  
ہنجھو پونجھے گا بچکیاں بھر کے

کوتاہی سرسوتی  
اترے گی آرتی تیری

قلمماں دے وارث نکھن گے  
مرے دا کوئی دید و کھرا

درد و اہنگلو اڑا کرے گا پر دکھنا  
تیرے قلم مندر دی

وہی تاں آخر مل جائے گی  
 اپنے آدے سنگ سے  
 پر تیرے اکھراں نے تاں اچے  
 جیونا ہے صدیاں خاطر

.....  
 تیرے شہداں نے اُگا دئے نے  
 سے دے کنگوس اچے تاں

توں کو یں جدا ہو سکدی ہیں  
 منکھادی نکل کو لوں  
 تیری تاں بات اچے  
 کئی نہیں پوری  
 جگ نوں لوڑ رانی ہے  
 تیرے بولان دی، انصاف دی  
 دھرتی نوں دگو چا ہو دے گا  
 ہابل دے ویزھیوں  
 دھی دے ترن ورگا

بعد دی پستک ج  
 سوگی شہدا کرے گا  
 آدم چم کے قلم تیری

سوچ کر ناں دے کول لے کے

تیرے بوسے تے ڈسکی بھرے گا  
 جویں گھرنوں بزرگی اسیساں  
 پوہندیاں نے ہرویلے  
 علم دے موڈھے  
 سے دی سارنگی  
 عبادت کرے گی تیری،  
 تے پر ہڑے دا گیت گائے گا  
 سونہڑے دین لئی  
 وارث شاہ تینوں  
 سچ جانی  
 صدی دے ادب دا  
 شیلہ لیکھ بن توں  
 اتھے ہی تاں رہیں گی ہزار  
 محبت اتے روشنی بن گے  
 محبت مر نہیں سکدی  
 روشنی بجھ نہیں سکدی

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆



## امرتانوں

کاغذ قلم دوات  
 دتی داتے تینوں سوغات  
 کیتی تینوں اکھراں دی برسات  
 بنا دتی اک کائنات۔  
 اچ تیرے اکھ موتی بن بھرے  
 کوئی نہیں نیواں سبھ دکھن شکرے  
 توں لکھیا ایسا سولا  
 جہاں پڑھیا اوہ ہو گئے نکھرے  
 اچ بن گئے لیکھ تیرے کجھ فقرے۔  
 توں لکھاری ہی نہیں اتہاس میں  
 توں ماں بولی داد شواش میں  
 توں اچ دی جیو ہون والا احساس ہیں  
 توں کروں سمجھناں دے دلاں وچ واس ہیں  
 تاں وانگنوں امرت  
 اتہاس وانگ جیو  
 دل دی دھڑکن وانگ تیز  
 وڈے دریادی کہانی میں

شوہی دیاں جٹا توں نکلی  
گنگا سا گر تک دی روانی سیں۔

ان گنت پنے  
توں رنکے ون سونے  
وچھاوتی اکھراں دے  
توں دتا اتھاس بنا۔

توں مڑ ساڈے ویڑھے آ۔  
تیرے قدم، تیرا پر مچھاواں  
آؤن والی چیزھی انی پگڈنڈی  
اک لیہ۔

جتھ چک، وہ اشیر واد  
نکے دڈے ترے جان  
تیری قلم دی لکیر تے۔

(پی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امرتا

ارج میں فیر چاواں ج کھٹا ہوا پھر وار ہیا  
 ارج فرسڑکاں بانہاں ج آؤ توستکیاں  
 ارج فرجنے وی اکھر  
 وار وار جوڑے بن نظراں چہ پلمیں  
 ہر جوڑو ج تیرا چہرہ ہی  
 امرتا!

ارج فرپیراں ج آوارگی سی  
 ارج فیر میں حادثیاں چوں لٹکھیا  
 پر  
 عام توں الٹ ساہویں تاریاں دی کھتی سی  
 ارج فرچہ پیناٹھا  
 تان جسم ہکا ہکا سی  
 تے سانہویں سورج دی نگی سی  
 تال سو بے کولے ج جیہڑی عبارت سی  
 اوس ج تیراناں سی  
 امرتا!

اچ فرمن چ اچوی جمی سی  
 رسوئی چوں بھینی بھینی سہک آوندی سی  
 نال دے کمرے چ پچیاں دے نکلے نکلے بول  
 اچ فرمیری پنھ پچھے تن سرہانے نیں  
 اچ فرنگی کئی کئی دایندہ دورھیا ہے  
 راڈیہ چ طقیل دے بولاں دیاں مرکیاں  
 اچ فرچہاں بعد کوتا لکھی ہے  
 امرتا!

اچ فردوست کہن گے۔ بڑا بھلاؤک ہے  
 اچ فراوہناں کہنا۔ کوئی سکھیا لکھی ہے  
 سندراں توں بعد صاحبان  
 صاحبان تو بعد سستی  
 اچ فیروہ ٹھہکا لگانے گا  
 اچ فیروہدی بلیلی فلک چیرے گی  
 اچ فراوہ چیرے تے لشکری شام  
 تے اکھاں چ سرخی بھری آکھے گا:  
 اچ میں کوتا لکھی ہے -  
 امرتا!

کل دی عام دانگ جدوہ گھر آیا  
 تاں تھکا تھکاسی بوجھل بوجھل

کل دی کسے دے پیر پٹھ آ کے  
 اوہدی چچی مدھولی گئی  
 تے چپل دی تنی ٹٹ گئی

بج کے بس پھڑی تاں بانہ نوں ضرب آ گئی

کل دی بجھیا گھر پیٹیا  
 اے پرسوں ہی تاں پتی نے کیا سی:  
 کسے چرتوں توں کوتا نہیں نکھی  
 کوتا لکھ کے توں کوں لٹ لٹ  
 بلدا ایں

تے عام دا تک اوہ ہو رہک گیا سی

اج اوہ وقتوں پہلاں گھر پر تیا ہے  
 رسوئی چوں بھینی بھینی مہک اٹھ رہی ہے  
 بچیاں نوں بانہاں ج اچھا لیا ہے  
 پتی نوں گلہ کڑی ج گھنیا ہے  
 تے اوہ بولاں تے مکھدے بلھد رکھ کے  
 کیا ہے:

اج میں کوتا نکھی ہے  
 کوتا نکھی ہے۔ امرتا

(پہی انتر: قمر الزمان)

## امرتا دے ناں

تینوں کی آکھاں، کیہ بناواں رشتہ  
 ان جسمیاں نال وی کوئی رشتہ جوڑ دا اے  
 بس اک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دے ذہن  
 چہ دوڑ دا اے  
 بولے، گوئیجے تے آپ ہدرے سانج نوں سنوارن لئی  
 توں لایا سی زور بھتیرا  
 تیتھوں بعد دھیاں وی رکھوالی دس ہو کر وکیرا  
 کیوں استھے تاں ہر کوئی پت نال رشتہ جوڑ دا اے  
 بس اک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دے  
 ذہن چہ دوڑ دا اے  
 تسال دھیاں دے درواں نوں پچھان  
 ماری سی وارث نوں آواز  
 دھیاں دی ماں "امرتا" ان غیر جگ تیری  
 لاکار نوں جوڑ دا اے  
 بس آک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دا  
 ذہن چہ دوڑ دا اے  
 آجاں، ایہ جگ صینوں وی دکھا جاماں

ان جنمی دھیاں دا بھاری دل بولدا اے  
بس اک سول تیرے ناں، ان جنمی دھی دے  
ذہن وچ دوڑدا اے۔

(پہی اتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## ستویں دھی

امرتا

امرت لہر جی

لہر لہر اٹھدی

دھرتی تے پھیلدی

امرتا توں پریتم تک پہنچدی

پریتم دی ہو کے

امرتا پریتم

سدا امبر توں امرت دی بوند

وانگ برس دی رہے گی

امرتا

تارے

کسے امبر دے دھرو وانگ

دھرتی کاش وچ چمکدی رہے گی

چن دی روشنی وٹھ دنی رہے گی



سورج

دیاں کرناں وانگ  
سدا کردی رہے گی  
دھرتی تے پھر دی رہے گی  
نظم کسے گیت وچ سدا  
جیون دی جاں مرو دی رہے گی

امرتا

چنبالی دی آواز بن  
دھرتی تے گونجی رہے گی  
کسے شکھ نادجی  
سارے آکاش وچ پھیل دی رہے گی  
کال کھنڈ تک۔

امرتا

لئی کوہا ستویں دھی ہے  
تے دھی دی پیڑ دا احساس ہے  
اتے آواز دی پہچان ہے  
اتے آواز دی پہچان ہے  
ناری دا پرستو مانا ہے

امرتا

دوستی دی مثال بن

پاړ خوشبودی مېک جی  
 هو اوچ کھل مل جاوے گی  
 اتے شهداں وچ شہد جی  
 کتاباں وچ کتاب گاہ جی  
 کاغذ تے کیوس تے  
 فرطے گی  
 کسے نویں وجود وچ  
 کوتادی روح وچ۔

(پہی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

## امر کہانی

کٹھ کہانی کرے، ہونی جریے  
 ہریے نی ہریے امبران توں ڈریے، دھرتی دی تلیاں تے دیوے دھریے  
 تیرے نال ای کھو ہے پیئے! تیرے نال ای کچے بھریے کارن کرے  
 پرتوں امر تا کڑے!  
 ناں تو جیونوں ہری، نہ مرنوں ڈری  
 تینوں کیہ کر سدے بھاگ بھری؟  
 اک امر تا گاؤں کنگے پنجاب داتے فلک سوانی ستھ دی  
 کنگ چڑھے نوں ٹھلدی تے آکھدی وارٹ شاہ نوں "آویں"  
 ان ہونی نوں اگدوں ہو کے ملدی  
 تا بر قلم کلک دی  
 امر تا پر تہم کڑے!  
 رنگے پنجاب دی چڈیاں رنگدی پیڑھیاں انندی دسوں دے دکھ  
 گل نال لاکے، وچ کچھریاں نچی  
 کدی کدی ترنجان اندر کلی بہے کے رنی۔ چند گتیاں وچ ٹھھی  
 تے لچھے لچھے سانوں کدی رہیوں، سانوں تہری رہیوں، سانوں ستھ دی رہیوں  
 اساں کندھاں اتوں جھاکن آ لے رہے، خیرے پھزدے  
 توں سیمواں انھن آلی کھوں پتاں پار

اسماں آھو آھو آکھن آ لے کون ہوئے  
 ارج موئے کہ کل موئے  
 حرفاں دے ہانی  
 توں نہ کہیتی تے نہ کہیتی، پھیر ہاں کہیتی تے ہاں کہیتی  
 سجدیاں آ لے آھسے پردیسی ارا نہہرہ رہیا نہ کوئی  
 اس دور پچھو کڑج دے او بے کلیاں، بہہ کے روئے  
 توں امر کہانی نکھدی نکھدی  
 امر کہانی ہوئی  
 کوئی وارث شاہ کوئی ہماگ بھری  
 تاں جیونوں ہری نہ موتوں ڈری  
 ☆☆☆☆

## توں بات پائی

توں بات پائی

تاں جانیا

رکھ وی وی بھر دے نے ہنگارے

پہاڑ وی کر دے نے زردن

وادیاں دیندیاں نہیں

گوںجواں موڑواں جواب

چپ ہی زبان بن کے

درویاں دے یوں بن کے

ہوکا جاں بھریا قلم نہیں

نال اوس دے کائنات روئی

نھیریاں وچ منہ لکا کے

رات ساری

ساری ساری رات کوئی

امبراں دی پٹی تے کوئی

خسجاں دے سلیہ دے لکھ گئے

ایہ جان کے  
تاریاں دی عبارت پڑھدی رہی  
دور سے

چن دے امیکلش چوں  
پی لواں اک بوند ہی  
دن رات دے پھر توڑ دی  
گیتاں دے مکھڑے گھڑ دی رہی  
مشقتاں کر دی رہی  
کٹ کٹ کے انیند رے  
کتیاں نت پین جو  
سوچاں دیاں پوتیاں  
کتھوں یاد آون فر  
گفتیاں تے متیاں

کجھ کتیا گیا  
کجھ رہند ارہ گیا  
کجھ گیت بن  
پوتاں دے ہونھیں چڑھ گیا  
کجھ سمیاں دے  
دہنی ویہ گیا۔

سکھ کے جس نے ہاتھ نہ دتی  
دکھ کے گوڑے موڑھے لگ بیٹھی

سرتو کھارا بھارا بھارا

مکتیاں

کتھوں ملدیاں

اک اگلی پیڑی

میلیاں وچ بھٹکدی

اوس دامنہ متھا دھوندی رہی

سرماسلائی پاؤندی رہی

مولی بھدی

بھندی لاؤندی رہی

چائن دی پھلکاری دیندی

ناگ منی دی

بندی لاؤندی رہی

ککھ جانی جان کے

گیت سنگ پرناؤندی رہی

یاداں والی دکھدی دھونی

جند جوگھ رہی تھدی بھردی

عشق اکھر دا تویت مٹا کے

آس دے گل لکائی رکھیا

کدھرے مڑ گواچ نہ جاوے

عبادتان کردی رہی

اک عمری

اک جان سی

مکدی رہی

مردی رہی

غم سن

کہ آؤندے رہے

مہمان بن بن

دل دی دلیر تے

چاواں دی دیپ مالا کر لئی

ہاسیاں دی جیول گتھلی کھول کے

وٹدی گئی

جکری

بوئی بوئی تاندی گئی

دعوت سدا ورت چلدی گئی

جے کدے لو چا دی تیلہ ہون لئی

سکھ داپانی سنگیا گیا

دکھاں نال چلی بھری رہی

مجبوریاں وی نہیں تے

ہستی دی کشتی کردی رہی

قلم دا چپو سانجھ کے

پتتاں۔ ٹیک لکھندی رہی

لڑدی رہی



درو منداں دے  
 وارث نوں اوجاں ماروی  
 آپ وارث بن گئی  
 عشق دا  
 اگلا ورق پڑھ گئی

دس وی رہی  
 جوگ داسر جک اوہو بن دا  
 آپ جو اپنی آگن نہا کے  
 چچی دہ پراہتا کر دا  
 بچہ تینہ دا جیہ بھاوہر دا  
 شہد شہد روپ اوہ ہمدون  
 نادنا دوا چا ماد سارے  
 نہ فرمدا  
 نہ فرمدا

(پہلی انتہی قمر الزمان)

☆☆☆☆

## غزل

وقت ہاں تلی تے نکاؤنا مینوں  
نیاں دی چنگیر جی سجاؤنا مینوں

نہ ساز نہ آواز نہ دستک کراں  
لہاں تے گیت وانگ گنگناؤنا مینوں

مرہم بن کے پلوساں گی دل دے زخم  
محبوب وانگ سینے جی وساءنا مینوں

کانیاں تے پیچیاں دا ناں ہے زندگی  
رکھنا دور سانہ کے اڈاؤنا مینوں

دل دی تار تے گاؤنا وفا دا گیت  
آواں گی ضرور پودے نہ بولہا کھڑکاؤنا مینوں

آواں گی تلی تے رکھ دل دی بوٹی کلیر  
دل دے بوسے کھول کے بلاؤنا مینوں

(2)

دل نوں آکھے لٹ لٹ بلیا کرے  
ہمیرے راہاں نوں روشن کرایا کرے

منزلاں سر کرناں جس گیت نے  
بے خوف کچے گھڑے تے تریا کرے

دھرتی رشناؤن دی جو دل چہ ہے انگ  
بلدے چراغ تلیاں تے دھریا کرے

خنجر دی جو بوچنا بیٹے دی ڈھال تے  
انصاف لئی ہر ستم ہس کے جریا کرے

پھلاں وانگوں کھڑی مہک بن جائیں 'کلیر'  
جیون ہے جیون لئی جتیا کدے ہریا کرے

(پہلی انتہ: قمر الزمان)

☆☆☆☆



فیر تیہنوں یاں کیتا

## فیر تمیوں یا و کیتا

فیر تمیوں یہ سیتا کون توں جہ یا اسماں  
 عشق پیا جیو داناں کسست فیر منکیا اسماں  
 کھول کے مہرچ اسماں بھر تی توں دا پاوے لیا  
 ماریاں وے نال کوٹھا کھنکھنیا اسماں  
 دل و سداں دیو توں ات پاد کرنا ہے اسماں  
 ایس داہم کسک وے بھلے توں فرحت کھلے اسماں  
 فیر چنبا چیاں واراں تہرہ واراں  
 عشق ہی اس جھمکنی تے مرنوں پنچیا اسماں

فیر تمیوں یہ دیا کیسے آے وچو ماہو  
 زہرے عشق جیا کے سہا تم نے ایک مہمنہ اور مانگا  
 ہم نے سہرے و کھول کر اس میں سہرے توں رکھ لیا  
 آسمان چھتیاں تاراں تے پائی فی  
 پھر خواہوں گا پیا رات جھلکا رہا  
 عشق کے چنے میں ہم نے اپنی مروت دھرا

## امرتائی لکھیاں نظماں

نظم

کسے دے تال گل کیتیاں گل نہ بنی  
کسے دے تال ٹر کے کتے نہ پہنچے  
کسے دے تال سوں کے کدے نہ جاگے  
اُہ ملی

اُس نے مینوں دیکھیا پتا نہیں کیہ دیکھیا  
میں اُس نوں دیکھیا پتا نہیں کیہ دیکھیا  
بولے دی نہیں پر گل بن گئی  
فرے دی نہیں پر پہنچ گئے  
ستے دی نہیں پر جاگ پئے  
☆☆☆☆

بولدے نمین نقش

گل راتیں سپنے دوج

اک عورت دیکھی

جس نوں میں پہلاں کدے نہیں سی دیکھیا

پر ملہ یاں ہی لگا  
 کہ اس بولدے نین نقشاں والی نوں  
 کہتے ویکھیاوی ہویا ہے  
 ہونہ ہوا اوہ ہی عورت ہے  
 جو میریاں سوچاں دے کچھ وچ  
 اکثر آکے پھلاں نال کھڈ دی دس دی ہے  
 اُس نال پھلاں وچ ٹرویاں ٹرویاں  
 پتا ہی نہیں ۞ کدوں اُس دا گھر آ گیا  
 اُس دا گھر وی بولدے نین نقشاں والی درگاہ ہی سی  
 چھیاں ہوئیاں صرف ضروری چیزاں  
 گھر دی ضرورت دی تے سجاوٹ دی  
 فالتو چیزاں نہ ہون کر کے گھر کھلا کھلا لگ رہیا سی  
 خوبصورت دل کش تے ساداوی  
 اپنی طراں دا آپ ہی  
 بالکل اپنی گھر والی درگاہ  
 جتھے سادگی خوبصورتی نوں ودھارہی سی  
 تے خوبصورتی سادگی نوں.....  
 امیری فقیری دویں ماحول وچ صاف  
 دس رہیاں سن  
 اُہ کویتا لکھ رہی ہے تے لکھ کے ہوا دے حوالے کر دیندی اے  
 رات مُک گئی ہے  
 پر سہنا نہیں کیا۔  
 اوہ اچھے دی اُس بولدے نین نقشاں والی نال

کہتے ٹروا پیا اے

☆☆☆☆

نظم

اک زمانے ٹوں

تیری زندگی دائرہ

کویتا کویتا

بھلدا بھلدا اتے بھلدا

تیرے نال زل کے

دیکھیا ہے۔۔۔۔۔

تے جدوں تیری زندگی دے رکھنے

بیج بننا شروع کر دتا

میرے اندر جویں کویتا دیاں

پتیاں فٹن لگ پیاں۔۔۔۔۔

تے جس دن ٹوں رکھتوں

بیج بن گئی،

اُس رات اک نظم نے

میںوں کول بٹھایا،

کول بٹھایا

تے اپنا ناز سیا۔

امر تا جو رکھتوں بیج بن گئی

میں کاغذ لیا ندا

اُو کاغذ تے اکھرا اکھرا ہو گئی



ہن نظم اکثر اون لگ پئی ہے۔

تیری شکل تے تیرے وانگ ہی ویکھدی ہے مینوں

تے کناچر میرے نال ہم کلام ہو کے ہر وار

میرے اندر ہی جتے گم ہو جاندی اے.....

(31 اکتوبر 2005ء۔ میری پہلی نظم۔۔۔ ساری رات بچ بن گئی امرتا دے کول بیٹھ

کے لکھی۔ امروز)

☆☆☆☆

نظم

توں اکھرا اکھرا کویتا

تے کویتا کویتا زندگی

☆☆☆☆

نظم

کدے کدے

خوبصورت خیال

خوبصورت بدن وی

اختیار کر لیںدے ہن...

☆☆☆☆

نظم

توں میری سماج

میں تیری سماج  
تے ہو کوئی نہیں سماج

☆☆☆☆

نظم

تیرا میرا پیار ہی ہے  
گیان زندگی دا...

☆☆☆☆

مسن چاہا

پہنا پہنا ہو کے عورت ہوئی  
وگدے دریا وانگ ٹر پئی لمسن

اپنی کلینا دا ہان...

فکر فکر ہو کے نظم ہوئی

دارت شاہ نوں جگایاوی

تے آکھیاوی

اٹھ دیکھ اپنا پنجاب لہو..... لوہان.....

محبت محبت ہو کے

اک راہیا ہوئی

کسے نوں وی نفرت کرن توں انکار کیتا

تے اپنی ہوند نال دسیا

کہ محبت نفرت نہیں کردی.....

زندگی زندگی ہو کے  
 امرتا ہوئی  
 نظم نظم تے پیار پیار ہو کے  
 من چاہا لکھیا وی  
 تے من چاہا جیو دیا وی...  
 ☆☆☆☆

کلا

جدوں دی کلا نوں ہوش آئی اے  
 اہ زندگی بن ناسوچ رہی اے...  
 زندگی بن دے راوتے  
 بن اہ ٹر پئی اے...  
 راہ وچ کلا سجاوٹ بنی اے  
 نمائش بنی اے  
 پر اہ رکی نہیں  
 اہ تفریح وی بنی اے  
 محفل وی بنی اے  
 پر اہ فردی جارہی اے...  
 وقت ساتھ دیوے نہ دیوے  
 کسے نوں یقین ہووے تاہو دے  
 پر اُس نوں اپنی سوچ تے یقین اے  
 کہ اُس نے اک تا اک دن  
 زندگی بن ہی جانا اے...

☆☆☆☆

اک دن

وقت نے مینوں بچھیا

کہ امرتا تیری کون اے؟

میں وقت نون ہنس کے کہیا

چنگا ہندا ہے توں اہ مجھدا

کہ امرتا تیری کون نہیں...

☆☆☆☆

نظم

پیارا درشتہ

تھو روے ہان دا

قانون دارشتہ

مساں سمجھو تے چڈا...

☆☆☆☆

چابی

اہ او دوس دی گل اسے

جدوں میں اک برساتی وچ رہندا ساں

اک دن اہ ملن آئی

اُس نے بوہا کھڑکایا

میں بوہا کھولیا پر اہ اندر نہیں آئی  
 پوڑیاں وچ ہی آکھن لگی  
 تیرا وی مینوں بوہا کھڑکا و نہ پوے  
 اہ مینوں چنگا نہیں لگدا۔  
 میں اُس نوں دوسری چابی دے دتی  
 اہ کدے چابی نوں ویکھدی کدے مینوں  
 کمرہ اپنے آپ نوں گھر بن دا ویکھ رہیا سی  
 تے اُس دیاں بولدیاں اکھاں وچ  
 میں اک رشتہ بن دا ویکھ رہیا ساں...  
 ☆☆☆☆

## نظم

دوستی دے زمانے وچ  
 اک دن میں امرتا نوں ملن گیا  
 اُس دے کمرے وچ بیٹھے گھاناں کر رہے ساں  
 اہ مینوں دیکھی جاری سی  
 کجھ دیر بعد کہن لگی  
 جا پہلاں دنیا دیکھ آ  
 پھیر دی جے تینوں میری لوڑ ہوئی  
 تاں ٹھیک ہے  
 میں اٹھ کے اُس دے سامنے  
 کمرے دے ست پکھ لائے

تے آکھیا۔

میں دُنیا دیکھ آیاواں

اس ہس دی ہس دی نے آکھیا

تیرے درگے دا کوئی کیہ کرے...

☆☆☆☆

ساتھ

اُس نے جسم جھڈیا اے ساتھ نہیں

اہ ہن دی ہلدی اے

کدے بدلاں دی چھاویں

کدے تاریاں دی چھاویں

کدے کرناں دی روشنی وچ

تے کدے خیالاں دے اُجالے وچ

اسیں مل کے تر دے آن پُپ چاپ کچھ کہندے آں

تے کچھ سُن دے آں۔

وچ وچ اک دو جے نوں دیکھ دی لیندے آں

سانوں کچے وچ ٹردیاں ویکھ کے مغل ساہنوں بکالیندے بن

اسیں مغل اں دے گھیرے وچ بیٹھ کے

اک دو جے نوں اپنا اپنا کلام سُن دے آں

اُومینوں اپنی اُن لکھی کویتا سناں دی اے

تے میں دی اُس نوں اپنی اُن لکھی لکھ سناں داں واں

وقت کول کھڑا اہ اُن لکھی شاعری سُن داسن، دا

اپنا روزِ دایم بھل جاندا ہے  
 تے جدوں وقتِ نوں وقتِ یا آوندا ہے  
 کدے شام ہو گئی ہندی اے  
 کدے رات اُت آئی ہندی اے  
 تے کدے دن چڑھ گیا ہندا ہے  
 اُس جسم جھڈیا اے ساتھ نہیں...  
 ☆☆☆☆

نظم  
 شعر بولن لئی بندے ہن  
 تے ارتھ جیون لئی...  
 ☆☆☆☆

نظم  
 جی کروا اے  
 بھل دا نگ کھڑکے  
 تے خوش ہو دا نگ  
 ہو لی ہو لی ہو اوچ  
 گواچ جاواں...  
 ☆☆☆☆

## عبادت

پیار سب ٹوں سرل عبادت اسے  
دگدے پانی ورگی  
تا کہے حرف دی لوڑ  
تا کہے زبان دی ہتاجی  
تا کہے ویلے دی پابندی  
تے تا ہی کوئی مجبوری...  
کہے فوں سر تو اس دی...  
پیار تال زندگی جیوندیاں  
اہ عبادت اپنے آپ  
بر ویلے ہندی تر ہندی اسے...  
☆☆☆☆

## ساج

ٹوں میری ساج  
تے میں تیری ساج  
اس دے جو کوئی ساج نہیں...  
☆☆☆☆



## گھڑی

اُسیں ہر روز

چلے بھر دے درختاں وچ

درخت ہو کے بیٹھ جانے ساں ...

اُہ اکثر پوڑیاں نہیں پہن دی

اُس دن وی اُس دیاں بانواں خالی سن

اُہ نے میرے ہتھ توں گھڑی اتار لی

تے اپنے ہتھ تے بٹھ لی

تے میرے دل دیکھ کے مسکرا پی

میں وی اُس دل دیکھ کے مسکرا پیا

جس طراں اپنے آپ نوں کچھ کرن توں پہلاں

کچھ کہن دی نو نہیں ہندی

اُس نے وی گھڑی اتارن لکیاں مینوں کچھ یا نہیں

اُہ میری جیب وچ اسے طراں ہتھ پالیندی اے

جیویں اپنی جیب وچ ہتھ پارسی ہووے

اُہ سب کچھ سچ سچا کر لیندی اے

میں فیر ہووے گھڑی نہیں خریدی

گھڑی اکثر بدلدی رہندی اے

کدے اُس دے ہتھ تے کدے میرے ہتھ تے

پر وقت کدے نہیں بدلایا۔ وقت ساڈے نال اے

اُہ میرا وقت اتے میں اُس دا وقت آں

☆ ☆ ☆

## نظم

اے اُدوں دی گھل ہے  
 جدوں ساڈے کول صرف اک شام ہندی سی  
 اسیں ساری شام زل کے تردے رہندے چپ چاپ  
 وچ وچ اک دو جے نوں دیکھ دے وی رہندے...  
 اک شام تردیاں تردیاں  
 اُس بچھیا

ٹوں پہلاں وی کسے نال ثریاں ایں؟  
 تریاں ہاں پر جاگیاں کسے نال نہیں  
 جاگیا صرف تیرے نال ہاں  
 اہنس کے اہ تردی تردی زک گئی  
 میرے سامنے آکھلوتی

تے مینوں دیکھ دی رہی دیکھ دی رہی  
 فیر اپنے ہتھ وچ میرا ہتھ لے کے  
 اینج ٹرن لگ پئی

جیویں ساریاں جداں سر جداں  
 پار کر لئی آں ہوں...

☆☆☆☆

## نظم

محبت اپنی قسمت آپ لکھدی اے

باقی ساریاں دی قسمت  
کوئی ہو ر لکھ واسے...

☆☆☆☆

نظم

اُہ جدوں وی ملدی ہے  
اکثر

میںوں اک اُن لکھی نظم نظر آوندی ہے  
میں اس اُن لکھی نظم نوں  
کئی وار لکھ چکیاواں  
پر اہ فیروہی اُن لکھی رہ جاندی ہے...

کیہ چتا

اہ اُن لکھی نظم

لکھن لئی ہووے ہی تا

اہ صرف

زندگی دے جیون واسطے ہی ہووے...

☆☆☆☆

نظم

زندگی تصویر وی ہے  
تے تقدیر وی۔

من چاہے رنگاں نال بن جائے

تاں تصویر،

ان چاہے رنگاں تال بنے

تاں تقدیر...

☆☆☆☆

نظم

اُہ ہیروی ہے تے فقیروی

تخت ہزارہ اُس دامتہ ہے

تے من چاہا اُس وادین۔

اُہ ذات دی صوفی ہے

تے مزاج دی فقیر۔

اُہ ہیر ہیر ہو کے

را بھارا بھارا لکھدی ہے

تے لکھ کے ہواواں دے حوالے کر کے

اپنی مرضی دا جج کر دی ہے...

اُہ ہیروی ہے تے فقیروی...

☆☆☆☆

پوری عورت

اک دن تردیاں تردیاں

امر تانے پھیا

توں کہہ دے ذمہ و دماغ (Woman with Mind)

چینٹ کیتی اے؟

۱۹۵۹ء دی گل ہے۔

میں تر دا اثر وارک گیا،

اپنے اندر دیکھیا، باہر دیکھیا

جواب کہتے نہیں سی...

جواب لہمن خر پیاتے پہنچ گیا

پینٹنگ دے کلاسک ہال وچ

امر تادے سوال والی عورت تے عورت دے اندر

دی سوچ تے سوچ دے رنگ

نہی کسی پینٹنگ وچ دے تے نہی کسی آرٹ گرنٹھ وچ لکھے

اہ دیکھ دیکھ حیرانی ہوئی۔

اپنی قوم تے مینوں دی تے آرٹ نوں دی۔

کسے دی چتر کار نے عورت نوں جسم توں ودھ نہ سوچیا لگدا سی

تے نہی پینٹ کیتا سی

پوری عورت جسم توں بہت ودھ ہندی اے

عورت دے جسم نال صرف سٹا جاسکدا ہے

پر جا گیا نہیں جاسکدا...

جے کہہ دے چتر کاراں نے عورت نال جاگ کے دیکھ لیا ہندا

ہور دی ہور ہو گئی ہندی چتر کلاہن تک

ماڈرن آرٹ وچ تاں

ہن کچھ وی ثابت نہیں رہا

نہ عورت نہ مرد تے نہ سوچ...

جے کدی زندگی دج مرد نے دی عورت نال  
 جاگ کے ویکھ لیا ہندا  
 بدل گئی ہندی اُس دی سوچ اُس دی زندگی وی  
 زندگی ہو گئی ہندی جیون ہو گئی اُس دی وی  
 تے اُس دی نسل دی وی...

1966 دج جا کے کہتے میں Woman with Mind پینٹ کر سکیا

☆☆☆☆

لظم

جناچ مرد  
 عورت دا، عورت دی مرضی دا  
 آدر نہیں کردا،  
 اوہ انسان نہیں بن سکدا  
 تے ناں ہی  
 اُس دی نسل کدے من چاہی  
 ہو سکے گی...

☆☆☆☆

## تن دن ... تن کال

میرے نزدیک ویاہ اک پیٹنگ ہے، جو آدمی تے عورت اک دوجے دے من دی کیسوس اتے بناؤندے ہن، ہر روز، ہر دلیے، اٹھدے بیٹھدے، کھاندے پیندے، سوند جاگدے، بولدے سندے تے سوچدے سمجھدے، ہر ساہ نال۔ جیتر دے پہلے دن توں لے کے مھکن دے اخیر لے دن تک دے سارے موساں نال تے موساں دے سارے رنگاں نال ایہ پیٹنگ بندی ہے۔ لگاتار بندی ہے۔ ہر ورھے۔ رنگاں دے نال نال ایس بن رہی پیٹنگ نوں ہر روز نویں سویر دا، نویں ڈیہر دا، نویں شام دا تے نویں چاننی دا چانن دی چاہیدا ہے، تے ایہناں سویراں، ایہناں ڈیہراں، ایہناں شاماں تے ایہناں راتاں دا کج ماحول دی۔ ایہ پیٹنگ عمر دی اوہ فصل ہے جس نوں ودھن مھلن لئی آپناں قدراں قیماں دی کھاو تے دل دریا دا پانی چاہیدا ہے۔ ایہ دنیا دی اکو فصل ہے جس نوں تیار ہون لئی عمر دے سارے موسم چاہیدے ہن۔ سارے خوشگوار موسم۔ جویں میں پیٹنگ دی نمائش وچ یقین نہیں رکھدا، ایسے طرحاں میں ویاہ دی نمائش وچ وی یقین نہیں رکھدا۔ میں آپنا ویاہ کسے بھائی، کسے براہمن، کسے مٹلاں، کسے پادری، کسے مجسٹریٹ، کسے قانون یاں کسے رشتے دار دے ساہنے نہیں کیتا۔ میں ایہ ویاہ صرف اپنے ساہنے کیتا ہے، دل دے آپ مہارے شکلاں نال۔

26 جنوری 1957 دا دن سی۔ اوہنیں دینس میں اردو دے ”شع“ رسالے وچ

آرٹ ساں تے امرتا دلی ریڈیو تے پنجابی پروگرام وچ اناؤنسر سی۔ اوہوں میں ساؤتھ ٹیل ٹکر وچ رہندا ساں تے امرتا ویسٹ ٹیل ٹکر وچ۔ اک سڑک دے آر پار۔ اوس

دن میں اوس دے کمرے وچ بیٹھا اوس نال چھوٹیاں چھوٹیاں گلاں کر رہیا ساں، تے گلاں گلاں وچ جدوں امرتا نوں پتا لگا کہ 26 جنوری میرا جنم دن ہے تاں امرتا نے ملکدے نوکر نوں بازار بھیج کے اک کیک منگواوایا۔ آپنی ہتھیں کیک کٹ اک اک ٹکڑا مینوں دتا تے اک اوس آپ لیا۔ چپ چاپ اک دوہے دی ہوند دے چائن وچ ایہ جشن منایا۔ ایہ پہلا جشن سی۔ میرے جنم دن دا۔ میری ہوش وچ (جدوں میں جیسا ہواں گا، اودوں میری دادی نے پنڈ وچ گڑ دھڑ کے ضرور میرا جنم دن منایا ہووے گا۔ میں اپنے نبر وچ پہلا بچا ساں تے اپنے ماں پو دا پلٹھی دا پت (جدوں آدی نے کک دا دانا مونہہ لایا سی، رب نے اوس نوں آپنی جنت دچوں کڈھ دتا سی۔ اپنی گل سنی ہوئی سی، پر مینوں ایہ گل پوری نہیں لگدی۔ رب نے آدم نوں کک مونہہ لاؤن دے بعد ضرور آکھیا ہووے گا۔ ”جا اچ توں ٹوں آپنے لئی آپنی جنت بنا“ اوس دن کیک مونہہ لاؤن دے بعد مینوں لگا سی کہ میں آپنی جنت دی دلہیز وچ پہلا پیر دھر رہیا ہاں۔ ابھی پہلا پیر میرا پہلا رنگ ہے۔ میری پینٹنگ دا، تے ابھی پہلا شٹن ہے ساڈے رشتے دا۔ ساڈے ساتھ دا۔۔۔۔۔

1957 دیاں بھر گرمیاں سن۔ مینوں گروڈت دا خط آیا سی میرے لئی اپاکٹسٹ لیٹر۔ گروڈت دے نال بھئی وچ اوس دیاں فلماں دے ڈیزائن بناون لئی دعوت۔ میں بڑا شش ساں۔ ایہ گل اودوں دی چل رہی سی جدوں میں پہلی وار گروڈت دی فلم ”پاسا“ دا کم کیا سی۔ میرے کم نال گروڈت بہت خوش سی تے اوہ مینوں آپنی فلم کپنی وچ بطور آرٹسٹ بلاوا چاہ رہیا سی۔ گروڈت نال کم کرنا میں وی چاہندا ساں، صرف میری آکھی نکھاہ تے نال بھئی وچ رہن دی تھاں نوں سوچدیاں گروڈت دی کپنی نے کجھ جے لا دتا۔ اوس دن جدوں گروڈت دا خط آیا تاں میں چنگے کم کر سکں دے موقع نال بھریا، امرتا نوں ملن گیا۔ امرتا دھ پڑھ کے شش وی ہوئی تے اداس وی۔ شش ایس لئی کہ مینوں چنگیاں فلماں بناؤن والے نال چنگے کم دی قدر کرن والے نال کم کرن دا موقع مل رہیا سی، تے اداس ایس لئی کہ میں



بہمنی چلا جاواں گا۔ شمع والیاں نوں میں استعفا دے دتا۔ بہمنی جان دی سیٹ ہک کر لئی۔ اے میرے بہمنی جان وچ تن دن سن، امرتا نے ایہے تن دن منگ لئے۔ کہ ایہ تن دن میں ہو کجھ نہ کراں، سارا وقت اوس دے نال رہواں۔ تے اسیں سبھ کجھ چھڈ کے، سبھ کجھ بھل کے، اوہ تن دن جتا وی ہو سکدا سی، اک ڈوبے دے نال رہے۔ پہلا دن اسیں دلی دیاں توارنخی تھاواں دے اندر باہر گھمدے رہے، جویں کوئی توارنخ لہ رہے ہوئے۔ ایہناں تن دنوں دے پار دی توارنخ، دوجا دن دلی دے باگاں بنچیاں وچ اٹھدے بیٹھدے پھلاں پتیاں تے رُکھاں نال گلاں کردے ٹردے اک باغ وچ اک رکھ دے کول آ کے رُک گئے۔ جویں کسے آپنے دے کول آ کے رُک جانی دا ہے۔ ایہ اک پیلے پھلاں نال بھریا امتاس دا رکھ سی۔ تے تیجا دن سارا ای اساں اوس رکھ دے پھلاں دی چھاویں گزاریا اسیں کدے بول کے گلاں کردے، کدے چپ رہ کے۔ ساڈے چارے پاسے پیلے پھل ای پھل سن۔ تھلے زمین پھلاں دی تے اُپر اسمان دی پھلاں دا۔ ایہ تیجا دن اساں کدے بہت کجھ سوچ کے، تے کدے کجھ نہ سوچ کے بیویا۔

میں تہاں دنوں دے بعد بہمنی گیا سی۔ مینوں اوتھے جا کے وی ایہو ای لگا سی، جویں میں اے دی اوہناں تہاں دنوں وچ جی رہیا ہاں۔ پر اکلا جی رہیا ہاں۔ میں کجھ دنوں بعد ای واپس آپنی 'دلی' آ گیا۔ اوہوں دا مینوں انج لگ رہیا ہے۔ جویں اوہ تن دن اے دی چل رہے ہن۔ تے اوہ پیلے پھلاں دا رُکھ ہن ساڈے گھر دے پچھلے ویزھے وچ آ گیا ہے۔ میرے کمرے دی وڈی کھڑکی دے سامنے۔ میرے کمرے دی ایہ کھڑکی کمرے دی پوری چورائی جڈی ہے۔ میں ایس رُکھ دے سارے رنگ سارا سال دیکھدا رہندا ہاں۔ آپنی کم کرن والی میز تے کم کردا وی، تے آپنے چنگھ تے لینیاں توپیاں وی۔ پر جدوں ایس رُکھ اُتے پیلے پھل آؤندے ہن ساڈا سارا ویزھا پھلاں نال بھر جاتا ہے تے ایہناں پھلاں دا سارا رنگ میرا ماحول وی بن جاتا ہے تے میری کمرت وی۔

ایہ امرتا نوں ملن توں پہلاں دی گل ہے۔ دی دج میں آپنے اک مسلمان دوست دی شادی تے گیا ساں۔ نکاح دی رسم ہون توں بعد اوتھے ساریاں نوں چھوہارے وٹے کئے۔ میں وی اک لے لیا، پر کھادا نہیں۔ ساڈے پنڈاں دج منڈے نوں منگنی ویلے چھوہارا مونہہ لائی دا ہے۔ میں ایسے خیال نال اوہ چھوہارا اوس دن گھر لیا کے آپنی الماری دج سانہہ کے رکھ دتا سی۔ تے فیر 31 اگست 1957 دا دن سی، امرتا دا جنم دن۔ میں اوس چھوہارے نال امرتا دا جنم دن منایا۔ چھوہارا اک دوجے نوں مونہہ لوایا۔ (ایس چھوہارے دی گنگ امرتا نے ملل دی ڈبی دج سانہہ کے پچھلے بائیاں ورھیاں توں آپنی الماری دج رکھی ہوئی ہے)۔

سانوں ملیاں تے ملدیاں نوں دو سال ہو گئے سن جدوں 1958 دیاں شروع سردیاں دج میں تے امرتا پہلی وار اندریشے گئے سی۔ چاچا جی کول (امرتا سوہا سنگھ جی نوں چھوٹے ہوندیاں توں چاچا جی بلاندی ہے) چاچی جی (سوہا سنگھ جی دی پتی) نوں ساڈے ساریاں دی روٹی پکاندیاں دیکھ کے میں امرتا نوں چاچی جی دا ہتھ وٹاؤن لئی آکھیا۔ چاچی جی منڈے نہیں سن، پر اساں ایٹا کو منا لیا کہ اک ویلے دی روٹی امرتا پکائے گی۔ امرتا آپنے گھر اودوں روٹی آپ نہیں پکاندی سی۔ مینوں کہن لگی 'میں روٹی پکاواں گی جو توں آگ بالیں'۔ ایس اودوں چاچا جی دے کول دس دن رہے ساں۔ میں لکڑاں دی آگ بالدا تے امرتا شام دی روٹی پکاندی۔ اودوں دی امرتا روٹی آپ بناؤندی ہے۔ میں دی اودوں دا، جدوں امرتا روٹی پکاؤندی ہے، اوس دے کول رسوئی دج ہوندا ہاں۔ ہن روٹی تاں ایس گیس تے بناؤندے ہاں، پر اوس اندریشے والی لکڑاں دی آگ دا چانن تے سیک روٹی پکاؤندی ہر روز امرتا دے مونہہ تے مینوں دوویں ویلے دسدے ہن۔ آگ دے چانن دے کئی رنگ۔۔۔۔۔

ایہ اودوں دی گل ہے جدوں امرتا روز شام نوں دی ریڈیو دا پنجابی پروگرام پیش کردی ہوندی سی۔ پروگرام دے بعد دفتر دی گڈی دج امرتا واپس گھر جاندی سی۔ ایس روز شام نوں منہ ، ہوندے سی۔ امرتا بس توں جتھے آ کے اُتردی، میں اوتھے

اوس نوں اڈیکدا ہوندا۔ تے جدوں پروگرام دا وقت ہو جاندا اسیں ریڈیو سٹیشن آ جاندا۔ اوس شام پروگرام دے بعد امرتا کہن لگی "دفتر دی گڈی دی بہت دیر اڈیک کرنی پوے گی، چل پیدل چلدا ہاں" تے اسیں ٹیلنگر پیدل ٹر پئے۔۔۔۔۔ اک دوجے دے نال ٹردیاں پتا ای نہیں کدوں ٹیلنگر آ گیا۔ امرتا دے نوکر نے روٹی بنا کے رکھی ہوئی سی۔ امرتا نے مینوں دی روٹی کھان لئی آکھیا۔ میں پہلی وار امرتا دے نال روٹی کھا رہیا ساں۔ نوکر نے صرف امرتا لئی روٹی پکا کے رکھی ہوئی سی، صرف دو روٹیاں۔ تے اسیں دو جے کھا رہے ساں۔ امرتا نے پہلاں آپنی روٹی وچوں اک روٹی میری پلیٹ وچ رکھی تے فیر تھوڑی دیر بعد اکھ بچا کے آپنی ادھی روٹی توڑ کے میری پلیٹ وچ رکھ دتی۔ اوہ ادھی روٹی اج دی میرے نال ہے، تے اوس ادھی روٹی دا رشتا دی۔ میں روایتی ارتھاں وچ دیاہ نہیں کیتا۔ ہاں ساتھ کیتا ہے۔ انج میں تے امرتا جدوں کوئی وی کم رل کے کردے ہاں، مینوں آپنیاں لاواں ای لگدیاں ہن۔ 'ناگنی' دے کم توں لے کے پھلاں چٹاں نوں پانی دین تک۔ ہو سکدا ہے، دیاہ اک وار چوہاں یاں ستاں لاواں نال مکمل ہو جاندا ہووے، پر ساتھ نہیں۔ ساتھ نت نویں سورج نال نویاں لاواں لیندا ہے۔ چار پہر لاواں بن جاندا ہن۔۔۔۔۔

میں تے امرتا نے 1957 وچ جہڑے تن دن اپنی تقدیر توں لئے سن، اوہی ساڈے تن کال بن گئے ہن۔ اک بیت گیا کل، اک اج، تے اک آؤن والا کل۔  
(پہی انتر : جمیل احمد پال)

وُھپ رنگی

جناح سورج اسماں تے رہندا ہے، امرتا وی آپنے آپ دی سکھ تے رہندی ہے۔ نذر، خدمتگار تے بے فکر۔ دن دے سکے تے دنیا دے دؤے توں دؤے دھماکے توں جلک بے پرواہ۔ دن دا بہتا بھاوا صرف آپنے آپ نال رہنا چاہندی ہے، رہندی ہے، لکھدی ہے، پڑھدی ہے یاں سوچدی ہے۔

پر رات دا اُتھیرا اُڑدیاں۔۔۔۔۔ اوہ اپنے آپ وچوں جویں اُتر جاندی ہے۔  
 اک عام عورت وانگ کمزور، ڈرپوک، نراس تے محتاج۔ بھ کاسے توں فکرمند۔ ککے  
 نوں ککے کھڑاک نال ڈر ڈر جاندی سہم سہم جاندی ہے۔ سویرے اُتھدیاں اوں دا  
 مونہہ بُجھیا بُجھیا، تھکيا تھکيا ہوندا ہے۔ جویں اوہ ساری رات اُتھیرے دی اک لمی گچھا  
 نوں تر کے لنگھ کے آئی ہودے تے، اوہ دی اکلی۔ پر دن چڑھدیاں ای اوں دی کایا  
 پلٹ آوندی ہے۔ جیوں جیوں سورج چڑھدا ہے، تیوں تیوں اوں دا مونہہ چمکدا ہوندا جاندا  
 ہے۔ دھپ رنگا۔ سویرے چانن وچ اوہدی حُدمختاری دا ایہ حال ہے کہ سویرے دی  
 پہلی تھنٹی کھڑکان والا وچارا اوں دے غصے دا شکار ہو جاندا ہے۔ اوں دے من دی  
 اکانت وچ ایہ دنیا دا پہلا کھڑاک ہوندا ہے، پہلی دُخل اندازی۔ بھادیں اوہ دُخل اندازی  
 اوہرے اپنے آرام لئی ہوندی ہے۔ کمریاں دی تے برتاں دی صفائی، پر ایس صفائی لئی  
 گھٹو گھٹ اک گھنٹا چاہیدا ہوندا ہے تے ایہ اک گھنٹا اوہدا بڑا بے چین گھنٹا ہوندا  
 ہے۔ اتوں جے دھوبی آ جاوے تاں آئی سمیٹا دی شامت۔ جھدی خاطر کپڑے پانے  
 چنیدے بن تے فیر ہوانے پیندے بن۔ اوہ جھنڈیاں دے کھڑاک توں دی کالھی پے  
 کے آکھدی ہے۔ ایس صرف پھل نہیں کھا سکدے؟ نہ روٹی کھائیے، نہ بھاٹے

ہوٹھے ہوں۔ اوس ویلے اوس نوں سروں دین والیاں دی سلام اک لعنت لگدی ہے (انج کل جو سمندر کسم کردا ہے، اوس نوں بار بار ہتھ جوڑن دی عادت ہے۔ اوہ کئی وار اوس نوں سمجھا چکی ہے کہ انج ہتھ نہ جوڑیا کر) شاید ایہ وی اوہدی خود مختاری دا تقاضا ہے کہ اوہ نہ کسے اگے آپ ہتھ جوڑ سکدی ہے، نہ کسے کولوں ہتھ جوڑے سہار سکدی ہے۔

سادگی دا ایہ عالم ہے کہ نہ نہاؤن دی پرواہ، نہ میک اپ دی، نہ کپڑے وٹاؤن دی۔ تے نہ ای نویں نویں کپڑے خریدن دی چاہ۔ کوئی اک قمیض جے اوس نوں پسند آگئی تاں سمجھو اوس دی خیر نہیں۔ اوہ بار بار اوسے نوں پائی جاوے گی۔ گنڈھ گنڈھ کے پاؤن دی حد تک۔ کئی وار اوہ کسے پارنی تے صرف ایس لئی نہیں جاندی کہ اٹھ کے کپڑے بدلنے پین گے۔

اک عجیب فقر طبیعت۔ روٹی بھاویں بھری ہووے بھاویں ہی، نال بھاویں سرف انب دا اچار ہووے، تے اک پیالا چاہ دا۔ اندازا ہوندا ہے، جویں اک فقیری اوہدی رگاں وچ ہے۔ پر کدے کدے اوس دی طبیعت دی بادشاہت چل اٹھدی ہے۔ اک دن ایس سڑک دے کنڈھے بیٹھے اک ڈھابے تے چاہ پی رہے ساں، چاہ پیندیاں پیندیاں اک خوبصورت مکان اوس دی نظر پے گیا۔ اک دم مینوں آکھیا، تقریباً حکم وانگ، جا کے ایس مکان دی قیمت پتا کر کے لیا۔۔۔۔۔ میں ”بہت اچھا ملکہ معظمہ، بے دریافت کر کے آیا“ کہہ کے مکان دی قیمت پتا کرن ٹر پیا۔۔۔۔۔ انج اوس نے کئی وار کہتا ہے، کردی ہے تے کردی رہے گی، جد تک اوہ ہے اتے جد تک خوبصورت مکان ہن۔ اوہ کدے سونے دی اک مندری دی نہیں پاندی (سونے دیاں پتلیاں پتلیاں والیاں وی کناں وچ پائے، تاں مساں اوحا گھٹنا سہار سکدی ہے، اوس نوں جیج سر بیڑ ہون لگ پیندی ہے) میں ایس شہنی فقیرنی دا بھیبت پا لیا ہے۔ بیرے موتی، نیلم، بکھراج اوس دا خط ہن جد کدے دی کناٹ پٹیس وچ بہیریاں دی وکان سامنے آوندی ہے، اوس دی ایہ بادشاہی طبیعت اوس نوں طوطی اندر سے جاندی

ہے۔ ہیرے موتی، نلیم، مکھراج تے ہر طرحاں دے قیمتی پتھر دیکھدی ہے تے دیکھی جاندی ہے۔ اوس ویلے کوئی دیکھے اوس دا جگمگا رہیا مونہہ ہیریاں تالوں وی زیادا۔ انج اوس خریدیا کدے کجھ نہیں۔ اوس نوں پتا ہے کہ ایہ زیور، ایہ جواہرات اوہدے لئی نہیں بنے، نہ اوہ زیوراں، ایہناں جواہرات لئی بنی ہے۔ جے کدے کوئی زیور پالوے تاں شمشے وچ آپنے آپ نوں دیکھ کے غصے ہو جاندی ہے۔ ”ایہ تاں میں، میں ای نہیں رہی“ تے اوس ویلے بھ کجھ لاء دیدی ہے۔ اپنی شکل اوہنوں آپ ای پچھانی ہوئی نہیں لگدی۔ کدی گھڑی پاندی ہوندی سی، وقت ویکھنا ہوندا سی۔ بن میں نال ہوندا ہاں، اوہ گھڑی دی نہیں پاندی، وقت میرے کولوں بچھ لہندی ہے۔

تصور نال مالا مال ایس شاعرا کول ہے جے جے پھپھسا ہوندا تاں پتا نہیں بن کئے خوبصورت مکان تے کئے ہیرے جواہرات اوس دی ملکیت ہوندے۔

خوبصورتی دیکھ کے اوہ انج مچھدی ہے، جویں بھکھ، غریبی، بے بسی، انیاں۔ حیرت تے جہالت دیکھ کے اوہ بے چین ہو اٹھدی ہے، اداس ہو جاندی ہے۔

ایہ فقیرنی نازک مزاج دی بڑی ہے تے پوزیو وی۔ ایس دے مکان وچ کوئی کدھرے کل نہیں گڈ سکدا۔ جے کوئی کدے کدھرے کل گڈ رہیا ہووے تاں ایہ سہار نہیں سکدی، زخمی شیرنی وانگ اوس نوں پیندی ہے۔ جویں اوہ کل اوس دے اپنے جسم تے لگا رہیا ہووے۔ کل لاؤن والا کوئی وی ہووے، بھادیں میں تے بھادیں کرائے دار۔ بھ توں اوکھا ایس مالکن توں میں ہاں۔ کیوں کہ میںوں آپنے کمرے وچ تجربے کردے رہن دا کریز ہے۔ کندھ توڑن توں لے کے کھڑکی بدلن تک۔ تے میںوں اکثر بڑا صبر تے انتظار کرنا چنیدا ہے۔ ایس مالکن دے دیوں کدھرے باہر جان دا۔ ایس مالکن، ایس شیرنی دی استھیک سینس ای میرا بچاؤ ہے۔ واپس آ کے توان تجربا دیکھ کے، چہنچ دیکھ کے، اوہ خش ہوندی ہے۔ سلاہندی ہے، توڑ پھوڑ اوس نوں بھل جاندی ہے۔ گزر جی کل وانگ، گزر گئے کل وانگ۔

امرنا دی ادھیوں بہتی عمر بسترے وچ گزری ہے۔ پر بسترے وچ اوہ سُتی بہت

گھٹ ہے۔ جاگی بہتا ہے۔ بے شک اوہدے ناولاں تے کہانیاں دے سارے پاتراں  
توں منجھ لوو، کیوں کہ اوہناں نوں دی اوہدے نال جاگتا پیا۔

جدوں امرتا دی قلم لکھ نہیں رہی ہوندى، اودوں اوس دے جے جتھ دی انگل  
آپنے آپ اکثر لکھ رہی ہوندى اسے اک اکھر، اک ناں، شاید کسے داناں۔ شاید آپنا  
ای ناں۔ تے اوس دی انگل ایہ اکھر ایہ ناں، بار بار لکھدی چلی جاندی ہے۔ ہر کاسے  
اُتے، جو وی ساہنے ہودے۔ پہنچ تک پہنچ تک۔ آپنے گوڈے توں لے کے میرے  
سوئٹھے تک۔ آپنی چار دیواری توں لے کے ہر دیوار تک، ایس پیڑھی توں لے کے  
ہر پیڑھی تک۔ ایستھوں تک کہ پوناں پانیاں، پھلاں سنگدھاں تک، اوہ ہر شے تے  
لکھدی محسوس ہوندى ہے۔ اوس آپ دسیا سی کہ چھوٹے ہوندىاں اوس نوں جن دج  
پنے کالے پرچھاویں، اکھر جاپدے سن۔ خورے اودوں دی پرچھاویاں نوں اوہ آپنی  
انگل نال اک اکھر، اک ناں بنا لہندی سی۔ ضرور بنا لہندی ہووے گی، پر پتا نہیں ایہ  
اک اکھر، اک ناں، اپنے آپ دج کہو جی عبادت ہے یاں عبارت ہے جو ہن تک  
لکھدیاں وی مکمل نہیں ہوئی میں درحیاں توں امرتا نوں دیکھ رہیا ہاں، ایہ لکھدیاں۔  
امرتا پتا نہیں کدوں دی لکھ رہی ہے؟ ضرور آپنی ہوند توں ای لکھ رہی ہووے گی۔  
نہیں تاں اوس دے ہتھاں دیاں انگلیاں نسبتن کدے اینیاں چھوٹیاں، اینیاں گھسیاں نہ  
ہوندیاں۔

اوس دی طبیعت آپنے آپ دج کنٹراسٹ ہے ۔ اک پاسے اوہ اپنا صرفا  
کرے گی کہ رات دی بھی روٹی دی ضائع نہ ہووے، اوہ دوجیاں نوں سبھری روٹی دے  
کے آپ بھی کھا لوے گی۔ پر دوجے پاسے ایہ طبیعت کہ ایس جولائی دج اوس دے  
پتر نے جدوں آرکیٹیکٹ دی ڈگری لے لئی تاں اوہدا انعام اوس نے یورپ دا نور منگیا۔  
اوس نے اسے ویلے فون پھڑ کے اِز انڈیا والیاں نوں آکھیا کہ یورپ دی واپسی کٹ  
بنا کے بھیج دیو۔ بنا کسے سکوچ اوہ آپنی ایس طبیعت نال جیوندی جاگدی ہے۔ بلکل دن  
تے رات، وانگ، اک دوجے دے اُلٹ، پر ہمیشہ نال نال۔



امرتا دا مونہہ بڑے رنگ بدلا ہے۔ اسان وانگ، سگوس اسان نالوں وی زیادا تے چھیتی۔ کدے جگدا جگدا دسدا ہے تے کدے بجھیا بجھیا۔ کدے کولا کولا پکھلیا پکھلیا لگدا ہے تے کدے پتھر وانگ سخت تے بے رحم۔ کدے ہر اک نال بسدا بسدا تے کدے سبھ نال غیر تے اجنبی۔ اک گھڑی بھریا بھریا چھلکدا چھلکدا جام لگے گاتے دوجی گھری خالی خالی، ویران ویران، استخوں تک کہ ہنے اوس دا مونہہ بہار دا بھرپور نظارا ہوندا ہے، رنگاں سنگدھاں دی ڈیل تے نئے پت جھڑ وانگ بے رنگ تے بے مہک ہو جائے گا۔ اک عجیب و غریب مونہہ ہے جویں اگو سکے دے کئی سدھ پٹھ ہون۔ جویں اک مونہہ دچ کئے ای مونہہ ہون۔ آپنے اٹھاں پہراں دچ کئے ای دن تے کنیاں ای راتاں لئی۔

امرتا دا مونہہ جتا حسین ہے، خوبصورت ہے، اوتا ای مشکل ہے۔ سگوس مشکل بہتا ہے اوس دے مونہہ اُتے پر بھاو اپنی چھیتی چھیتی بدلے ہن کہ ایس مونہہ نوں کسے فارم دچ ریکارڈ کرنا تے اوہ وی مکمل ریکارڈ کرنا بڑا ای کشن کم ہے۔ اوس دیاں تصویراں، سکیچ تے فوٹوز اکثر بڑیاں ای ہارڈ تے بڑیاں ای غیر امرتا ہوندیاں ہن۔ امرتا خُدی وی اوہناں نوں دیکھ کے تریجک جاندی ہے تے اوس دے موہوں نکل جاندا ہے۔ ”اٹ اڑ ہوریل۔ اٹ اڑ ناٹ می۔۔۔۔۔“

میں بڑے مونہہ دیکھے ہن۔ اُلکے ہن۔ مینوں کدے کسے دا مونہہ ایٹا دلچسپ تے ایٹا اوکھا نہیں لگا۔ مینوں کدے کسے دا چہرا بناؤندیاں آپنے آپ نال گھلنا نہیں پیا۔ پر امرتا دا چہرا توہا توہا۔ پتا نہیں کس ہونی نے ایہ مونہہ سوچیا تے گھڑیا ہے۔ جے ایس دے نین نقش تراشے ہوئے ہن، اونے ای ایہ مشکل ہن۔ کرت دچ پکڑنے سگوس چیلنجنگ ہن۔ میں چودھاں سالاں توں ایس مونہہ نوں حیرت نال دیکھی جا رہیا ہاں۔ کدے دوروں کھلو کے، کدے اصلوں نیڑے ہو کے۔

اک دن ایس پالم توں آ رہے ساں۔ ریتے دچ اِز فورس دی اک نویں بلڈنگ آئی تاں میں امرتا نوں آکھیا۔ ”تیوں یاد ہے، شاعر، اتھے اک خالی میدان سی،



جتنے توں کار سکھنی شروع کیتی سی۔۔۔۔۔“ (پر اک سائیکل نال فکر لاؤن پچھوں اوں کار سکھنی چھڈ دتی سی) کجھ دیر تک امرتا سوچدی رہی۔ ستے جدوں اوں توں یاد آیا تاں اوں اک ہرکھ نال میرے دل تک کے آکھیا۔ ”توں مینوں ایویں ای کار نہیں سکھن دتی۔“

میں آکھیا، ”شاعرا، توں ساہت وچ ریڑھیاں، گڈیاں، سائیکھاں، سکڑاں تے چھڑے ٹرکاں دی بھیڑ توں اپنی گڈی نوں صحیح سلامت رکھی رکھ۔ ایہ ای اپنے آپ وچ بہت ہے۔ ایہ سڑکاں تے گڈے، سائیکل، سکڑ تے ٹرک، توں میرے ذمے رہن دے۔۔۔۔۔“

امرتا نوں کسے اُتے اعتبار نہیں، نہ کسے اِزم اُتے۔ نہ کسے انسان اُتے۔ میں جدوں وی کسے بندے دے لفظاں اُتے اعتبار کرن لگدا ہاں، اوہ خطرے دی لال جی وانگ میرے دل نکدی ہے۔ پر میں ہری جھنڈی نوں ہتھوں نہیں چھڈدا، اک بندے اُتے اک داری اعتبار ضرور کردا ہاں۔ (ایج افسوس نال آکھنا پیندا ہے کہ ہر وار اوہدی گل جی ہی نکدی ہے تے میرا اعتبار ترکدا ہے) پر میرے کولوں بہتا فطرتن تے کجھ ضد نال فیر اعتبار ہو جاندا ہے۔ میں آکھدا ہاں۔ میں اک بندے نوں اعتبار دا موقع ضرور دیاں گا۔ اوہ آکھدی ہے۔ ”ہندوستان دی آبادی پنجاہ کروڑ ہے۔ سو پنجاہ کروڑ داری تینوں اعتبار کرنا پوے گا، لگا رہو دیہاڑی۔۔۔۔۔“

امرتا نوں صرف آپنے اُتے تے آپنے پاتراں اُتے اعتبار ہے۔ کوئی پاتر جدوں کہانی توں باہر ہووے تاں اوہ اعتبار یوگ نہیں ہوندا۔ (بھانڈے منجوان پچھوں اوہ کولیاں، چچے وی کنن لگ پیندی ہے) پر اوہی پاتر جدوں کہانی دے اندر آ جاوے تاں کسب دا مان رکھن والا بن جاندا ہے۔

”بس توں میرا اکلوتا دوست ایں۔۔۔۔۔“ اوہ آکھدی ہے۔

”پر تینوں میرے اُتے اعتبار کس طرحاں آ گیا؟“ میں چھڈا ہاں۔

”توں آپ ہی تاں کہیا سی کہ توں میرے ’ڈاکٹر دیو ناول دا ڈاکٹر دیو ایں۔“

انج کہانی میں پہلاں لکھی، تینوں دیکھیا پچھوں۔۔۔۔۔ اعتبار شکناں دی بھیڑ وچ تینوں دیکھ لیا، ایہ تھوڑا اے؟۔۔۔۔۔“ تے اوہ فیض دا شعر پڑھن لگ پیندی ہے۔  
 ”کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم،

گلا ہے جو بھی کسی سے، ترے سبب سے ہے۔۔۔۔۔“

تے میں دنیا وچ جتھے کدھرے جو وی غلط ہوندا ہے، اوس دا جواب وہ بن جاندا ہاں۔ اوہ بھادویں اخبار دی ایہ گھٹنا ہووے کہ راتیں بس وچ اگلی سواری اک عورت، کنڈکڑ تے ڈرائیور نے زبردستی کرنی چاہی تاں اوہنے چل دی بس وچوں چھال مار دی۔ تے بھادویں جھین دی کوئی چلا کی ہووے، روس دی کوئی دھکے شامی ہووے، امریکا دی کوئی تانا شامی ہووے تے پاکستان دا کوئی جھوٹھ ہووے۔ اوہنوں میرے تے غصا چڑھ جاندا ہے۔۔۔۔۔

”اک فلاسفر دا کہنا ہے۔ اٹ از چیٹنگ ٹو ٹرائی ٹو بی کانینڈ یو مسٹ بی بورن کانینڈ آر نیور میڈل وڈ اٹ۔۔۔۔۔“

اوہ بارن آئیڈیلٹ ہے۔ موہوں بڑ ہو کے کچھ وی آکھے، پر اوہدی رگ رگ وچ آئیڈیلزم ہے۔ کوئی وی اعتبار شکن اوہدے دھر اندر لے اعتبار نوں توڑ نہیں سکيا۔ اوہ باہروں لال جی وانگوں بل پیندی ہے، پر اندروں کدھروں ہرے رنگ وانگ ہری تے شانت رہندی ہے۔ تے جدوں وقت آوے، اوہ فیر زندگی اتے اعتبار کر لیندی ہے۔ بھادویں پچھوں اوس نوں آپنے اعتبار دا مرثیا لکھنا پیندا ہے (جویں اوہدیاں کہانیاں، سونالیزا نمبر دو، دو عورتاں، نمبر پنج، کرماں والی، کیلے دا چھلکا، چائن دا ہوکا۔ تے ٹوسٹ، جنم جلی، سال مبارک، تے ہور کئی نظماں)۔ پر دنیا نال اوہدی آپنت دا ایہ عالم ہے کہ اوہدے کے سمکالی نے یاں کے اصولوں نویں شاعر نے جے کوئی نظم لکھی ہووے، اوہ اوس نظم دیاں سطران گنگناؤندی رہندی ہے تے ہر لہن آئے نوں سناندی ہے۔ جویں اوہدے کے بڑے عزیز نے ادبی دنیا وچ کوئی پراپتی کیتی ہووے۔ اوس گھڑی اوہ بھل جاندی ہے کہ سمکالی اوہدے لئی کئے سنگ دل تنگ دل

ہن۔۔۔۔۔ سمکالیاں دے وٹیرے انھیرے راہ ورگے ہن، پر اوہناں دی جے کوئی  
 کرت اوہنوں چنگی لگدی ہے تاں اوہدے لئی دھپ چڑھ جاندی ہے تے اوس دی  
 صفت کردی کردی ایہ آپ دھپ رگی ہو جاندی ہے۔۔۔۔۔

(پہی اتر : جمیل احمد پال)

☆☆☆☆



کتاب عشق



امریکی پرنسپل اور والدین



امریکی پرنسپل اور تین بھائی

امرتا پریم  
گورکھی سے ترجمہ و انتخاب: احمد سلیم

## میں جمع تو

(امرتا پریم کی یہ کتاب 1977 میں شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے ساحر اور امروز کے حوالے سے لکھی جانے والی نظموں کی نشاندہی کی۔ میں نے ساحر والے حصے کو پنجابی سے ترجمہ کیا ہے۔ امرتا اور ساحر کے حوالے سے کئی نئی جھوٹی داستانیں مشہور ہیں۔ یہ صفحات ساحر سے امرتا کے عشق اور اس درد میں لکھی ہوئی نظموں کا انتخاب ہیں۔)

ہم سب اپنے اپنے 'میں' کا ایک ٹکڑا جیتے ہیں اور برسوں تک جو بھی سوچتے ہیں سمجھتے ہیں اور قدروں قیمتوں کو اپناتے ہیں وہ پورے 'میں' کی تلاش ہوتی ہے۔۔۔۔۔  
ہمیں علم بھی وسیع کرتا ہے اور محبت کا جذبہ بھی۔ علم 'میں' کی پہچان دیتا ہے اور محبت کا جذبہ 'تو' کی۔ یعنی اس دوسرے کی جسے ہم پیار کرتے ہیں۔

کوئی 'تو' 'میں' کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ 'تو' 'میں' کی وسعت ہے اس کا پھیلاؤ۔ 'میں' کا اپنے آپ میں پھلنا پھولنا بھی وہ عمل ہوتا ہے جس کے ایک ایک حصے میں پھلنے پھولنے کا درد شامل ہوتا ہے۔ یہ 'میں' کا اپنے سے آگے زیادہ بڑی 'میں' تک پہنچنے کا سفر ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے جو 'میں' سے 'تو' تک کا سفر ہے وہ 'میں' میں سے 'میں' کی پہچان کے بعد 'تو' میں سے 'میں' کی پہچان ہے۔

سادہ لفظوں میں محبت کو اپنے آپ کی تکمیل کہا جاسکتا ہے۔ یہ تکمیل خامیوں یا کسی کی تکمیل کے معنوں میں نہیں ہوتی یہ وسعت کے معنوں میں ہوتی ہے۔۔۔ جہاں ایک انسان صرف اپنی صفات کو سمجھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا وہ دوسرے کی خوبصورتی کو دوسرے کی اچھائی کو اور دوسرے کی خوشی کو بھی اپنے وجود کا حصہ بنا کر

سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

یہ گویا ایک قدرت سے دوسری قدرت تک پہنچنے کا سفر ہے یہ دونوں سفر میں سے آگے میں تک کا اور  
'میں سے آگے تو تک کا' وہ سفر ہیں جن کا بیان دنیا کا ادب بننا ہے۔

دونوں مشکل راستے ہیں لیکن ان پر پاؤں والوں کو چلنا ہوتا ہے۔ یہ 'پاؤں والے' وہ لوگ ہوتے ہیں  
جنہیں 'میں' کا بھی عشق ہوتا ہے 'تو' کا بھی۔ اور یہ عشق اکثر کو نہیں ہوتا۔

دنیا کی سیاسی اور سماجی ساخت "ان اکثر" لوگوں کے بس میں ہے جنہیں یہ عشق نہیں ہوتا اس لیے وہ  
اپنے آپ میں ایک تضاد ہوتا ہے ان کا جنہیں یہ عشق ہوتا ہے اور اسی لیے ان راستوں کی مشکل کئی طرح کی  
مشکل ہے۔

عشق دا بونا جتھے اگدا۔۔۔

میلاں دے وچ آؤندی رہندی

برہا دی خوشبو۔۔۔۔

یہ عمل عشق کے پودے کا اپنے آپ میں معکوس عمل نہیں بلکہ یہ معنوں کو الٹانے والی سماجی ساخت کا عمل  
ہے۔ یہ عمل ہر 'میں' کو تراشتا ہے۔ ہر 'تو' کو توڑتا ہے اور پھر عشق کے پودے میں سے مہکتے من کی یاد کی عام  
خوشبو نہیں بلکہ برہا کی خوشبو آنے لگتی ہے۔۔۔۔

یہاں اپنی کچھ وہ نظمیں دے رہی ہوں جن میں ایک طرف پھلنے پھولنے کا سبھاوک درد ہے اور دوسری  
طرف مشکل راستے کا

مشکل راستے کا درد اگرچہ آج پھلنے پھولنے کے درد جیسا سبھاوک درد محسوس ہوتا ہے لیکن میں چاہتی  
ہوں کبھی وہ وقت آئے جب ہم سب اسے سبھاوک کہہ سکیں۔۔۔

مشکل راستہ پھلنے پھولنے کا قدرتی عمل نہیں یہ انسان کی طرف سے انسان کو سزا کے طور پر دیا ہوا راستہ  
ہے اور وہ وقت جب ہم اس کے شراب کو سبھاوک کہہ سکیں بہت اچھی سماجی ساخت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ  
ساخت آج سے کہیں بہتر انسانوں کی اکثریت کے بغیر ممکن نہیں۔

امروز کے لفظوں میں "اگر کوئی امرتا کی تمام تخلیقات، نظمیں، کہانیاں، ناول اکثر ترتیب وار سامنے رکھ کر  
پڑھے تو وہ امرتا کی پوری زندگی کو جان سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اس کی بنیاد پر اس کی سوانح لکھ سکتا ہے" اور

میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں اسی لیے میں نے ”رسیدی ٹکٹ“ کے شروع میں لکھا تھا جو کچھ پیش آیا وہ سب کا سب نظموں اور ناولوں کے حوالے ہو گیا پھر باقی کیا بچا۔ اس کے باوجود کچھ سطریں لکھ رہی ہوں اس طرح جس طرح زندگی کے حساب کتاب کے کاغذوں پر ایک چھوٹا سا رسیدی ٹکٹ لگا رہی ہوں۔ نظموں اور ناولوں کے حساب کتاب کی کچی رسید کو پکی رسید بنانے کے لیے“

”رسیدی ٹکٹ“ میرے من کی تاریخ ہے میری تخلیقات کا پس منظر میری تخلیق کی جنم بھومی۔ لیکن اگر میں اس میں ترتیب سے ان تخلیقات کے زمانے کو بھی جوڑنے لگتی ان تخلیقات سمیت تو مجھ میں انہیں شائع کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ اب بھی ناولوں کو اور کہانیوں کو ایک طرف رکھ کے صرف نظموں کو سامنے رکھا ہے اور وہ بھی صرف ان نظموں کو جن کا تعلق میری نجی زندگی سے ہے حالانکہ لوگوں کے درد کو میں اپنے درد کا ہی حصہ مانتی ہوں۔۔۔ میرے مفہوم میں تمام لوگ میرے وجود کی وسعت ہیں۔ لیکن یہاں میں ”نجی زندگی“ کے لفظ کو بڑے محدود معنوں میں اکہرے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے صرف ان نظموں کا انتخاب کر رہی ہوں جو کسی خاص شخص کی یعنی ’تو‘ کی میری زندگی میں آمد سے متعلق ہیں۔

میری زندگی میں پہلی آمد خلا کی تھی جس میں جو کچھ چاہ لیا جو کچھ تصور کر لیا وہی سوچ گھڑی بھر کے لیے من کی حالت ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت کا ایک تصور کے گلے لگ کے باقیق کرنے کا وقت تھا۔ اس عہد کی کچھ نظمیں ہیں:

## چپاچن

چپاچن تے مُٹھ کو تارے ساڈا اہل بیٹھے آسمان  
ساڈیاں بھکھاں رہیناں وڈیاں پراورا تا! تیرے دان  
مُٹھ کو تارے ترو تک کے  
تے چپا کو چن سٹ کے مہر ساڈا ازمان  
سٹ دین کچھ رشاں ڈیگ دین کچھ لو داں  
پرو لکن پئے دھرتی دے انگ ایہ انگ ندا و ہناں نوں لان  
ادھ وی ویلے آن  
اک دور اتاں! تہ تیرے رہا شکھی ہو جان



کچھ کھلے ہتھیں دین ایس نور دادان

فیر سنگ جان

چپاچین وی کھوہن دان دے کے گھبران

کدے پر بت اوہلے کرن کدے بدلاں پیٹھ چھپان

فیر بنیاں راتاں سنکھنے پلے خالی بھاسان

پر بھکھ وکدے بکھ ساڈے فیروی آکھی جان

تیرے سنگدے سنگدے دان ساڈا سمھو کچھ سرچان

ساڈی ترشنانوں ترپان بھال ساڈی سستان

تیرے ہتھ دے اک دو بھورے بھکھ ساڈی ورچان

چپاچین --- تے مٹھ کو تارے

ساڈا مل بیٹھے اسان

## دیوتا

توں پھر دادیوتا ٹھنڈے لکر بھاوتیرے نہا جے تیکر گرمان

بگاں بگاں دی نیندر سٹے ا جے تیک دی جذبے تیری جاگن وچ نہاں

بال بال کے حسن آپنے لکھ سندریاں آن

تیرے سولے جڑھ انگاں تے چھین انگ نوان

بیڈے پھر چہاں اتے ٹوٹیں ٹوٹیں پوٹے چھوہ کے

ماس دی گندھ وچ تے متھے پیراں تک ٹھکان

رنگھے ساہ دیاں گرم ہوازاں پوجادی سام گری وچوں

اٹھدے لے دھوئیں تیرے بھاو نہا جے بھکھان

ولاں ورگے قد اوہناں دے نیوں نیوں لغدے جان

چنوں پھیاں لکھ گولیاں کالے بھورے نین اوہناں دے

تیرے سولے سولے بُت تے روم روم لپٹان  
 جیویں ملٹھی دی خوشبو تے ناگ لپٹد نے جان  
 بنگاں بنگاں دی پو جاپی کئے ہوٹھ تیرے ترہائے  
 لکھ جوانیاں ننگ ننگ کنیاں نیلیاں پیاں ہانہاں گوریاں  
 سکھنے ہو گئے جو گن پالے اچے دی تیرے بُکھ ترہائے بھر بھر پیندے جان  
 ہون کنڈ وی دست دانگن میں وی ہاں اک شے  
 ڈھکھدی ڈھکھدی بل جائے گی بجھ جائے گی ایہہ سام گری  
 تے سام گری دا اک بھاگ تیری پجارن میں وی۔۔۔  
 پوجا کردی پٹی پجارن بھرے تھال وچ نکا جان حصہ ہی تاں ہے  
 ہون کنڈ وی دست دانگن میں وی ہاں اک شے  
 کنیاں کوتلیاں دی چھوہ تیرے ہیراں اُتے جمی؟  
 کئے کوہٹھاں دے رس تیرے پخر تاں اُتے سکے؟  
 ہارے بجن اسیں ہارے  
 پتھر دے جھوٹے ہیراں نوں میرے پوجن بھاو کنوارے  
 [تو پتھر کا دیوتا۔۔۔]  
 کتنی تھیلیوں کا لمس تیرے ہیروں پر جما ہے  
 کتنے ہونٹوں کے رس تیرے چہروں میں نوکھ گئے ہیں  
 ہارے سا جن ہم ہارے  
 پتھر کے جھوٹے ہیروں کو میرے کنوارے جذبے پوچ رہے ہیں]

### کنڈھیادے!

کنڈھیادے! کھلی گلوکڑی استاں! براں رنج جانا  
 پوناں دے ہیراں وچ جکر بھالن کہیں نکانا

راہ موکلے رشتے بھڑے ہنسو یا ہنسو یا جی  
 دس اُکستا ئیاں بٹھیاں نے کوئی کوڑا پن منہ لانا  
 بگھنہند را ئیاں غیماں دی کوئی روک سکے نہ جاگ  
 روپ تیرے دی لوری نے سانوں کد تھپک سٹلانا  
 ستھرے نیلے امبراں اُتے کد تک ٹنگیاں رہے  
 اسیں تاں کنیاں دس زمیں تے 'ڈھوڑ ڈھوڑ ہو جانا  
 مٹادی گودی چوں ٹڑیاں نہیں بھالاں نہ کوئی چھان  
 منہ گواچے ہوئے نہ لیکن 'ڈھوڑ سے دی چھانا  
 نویں منہ دے نویں موہ وچ انگ اُساندے جان دے  
 برنویاں پٹیاں دی کس ہٹھیاں رسد از خرم پُرانا

۱۔ کسی ہوئی نئی بیویوں کے نیچے

[illegible]

وہج

مُشکراں دے چیراں تال لکیریاں مہتھاں دا اوچن:

میری عمر توں دی لمبی ہے میری وفاداری لکیر

ٹشیں روز چھدے ہو میری وقادی عمر؟

بھرتھری و امر پھل کچھ کہیں داحتاج ہے؟

عشق توں عادت نہ یاؤ بولن دی

اے ماں لوک کناں نوں سنن دی چاچ نہیں آئی

لفظاں دی دولت بناں وی وفا ہے امیر

میرے سوا اس تاں مہمان نہیں میرے جسم دے جا سکدے نہیں کدی دی

پرست نہیں سکد؟ ایہہ سمیاں دی ہک تے جو پے چٹکا ہے چیر  
 ہیر کے لیلی دی نقل نہیں نہ مجنوں کے راجھے دی ریس  
 عشق کدے تاریخ نوں دہرائیں نہیں ایہہ ہر صفحہ ہوندا اے بے نظیر  
 تکیاں نوں چھیک رہے نیں پوٹیاں نوں دھڑ رہے نیں مشکلاں دے تیر  
 پروٹھیاں تکیاں دے کنڈھے آس اک انگڑائی لے رہی اے  
 کسے ارغوانی سویر دی قسم جھٹاں دیاں لہراں نیں میری اخیر  
 مشکلاں دے تیراں نال لکیریاں جھٹاں داوچن:  
 میری عمر توں وی لمبی ہے میری وفا وی لکیر۔۔۔

[آپ ہر روز میری وفا کی عمر پوچھتے ہیں؟  
 عشق کو بولنے کی عادت مت ڈالیں  
 لفظوں کی دولت کے بغیر بھی وفا امیر ہے  
 ہیر کسی لیلی کی نقل نہیں نہ مجنوں کسی راجھے کی ریس  
 عشق تاریخ کو کبھی نہیں دہراتا اس کا ہر صفحہ بے نظیر ہوتا ہے  
 مشکلات کے تیر تھیلیوں کو چھلنی کر رہے ہیں پوروں میں سوراخ ڈال رہے ہیں  
 لیکن چھلنی تھیلیوں کے کنارے آس اک انگڑائی لے رہی ہے  
 کسی ارغوانی صبح کی قسم! چناب کی لہریں میرا انجام نہیں ہیں  
 میری عمر سے بھی لمبی ہے میری وفا کی لکیر۔۔۔۔]

## سنسکار

تیرا عشق سنسکاراں دا ہتھاج بن کے رہ گیا  
 سنسکاراں دی ڈھوڑ بڑی گاڑھی جیسی ہوندی اے  
 میں ہو رکجھ نہیں اکھدی

دھوڑ دا جادو تیری اوس محبت تے پے گیا  
 عشق سنسکا راں دھتاج بن کے رہ گیا  
 زول اک محبت تاں جھی سی ضرور  
 سنسکا راں دے کندے بڑے تنکھے جیسے ہندے نہیں  
 بن چکے نہیں تالے تاریخی تعصب  
 محبت وادامن اج کنڈیاں نال کھبہ گیا  
 الجھ کے رہ گیا

محبت دارنگ سی قراراں دا غلام  
 لیند اسی تسلی میرے قولوں توں ہداری  
 مانگوں اڈاری-----

اڈاریاں دا پنجھی آج آہنے ج بہہ گیا  
 عشق سنسکا راں دھتاج بن کے رہ گیا  
 بل کدے وی پانیاں دی رنگت نہیں رکھدے  
 کندھلا پنار مل بیراں چوں لکھ جاندا  
 مینوں ترس آندا ہے تیرے عشق تے  
 جو پانیاں دی رنگت دے سوالاں وچ پے گیا  
 عشق سنسکا راں دھتاج بن کے رہ گیا  
 قربانیاں دے راہ بڑے ونگے جیسے ہندے نہیں  
 جھناں دا غوطہ وی کدے آسکدا اے  
 کتنی حفاظت ہے دنیاوی ایہہ تے  
 پیاراں دی پرکھ وچ پین کولوں پہلاں ہی  
 چنگا ہے پیر تیرا اوس ایہہ تے پے گیا  
 عشق سنسکا راں دھتاج بن کے رہ گیا

[مئل کبھی پانیوں کی رنگت نہیں رکھتے  
 مجھے تمہارے عشق پر ترس آتا ہے  
 جو پانیوں کی رنگت کے سوالات میں کھو گیا  
 کتنی حفاظت ہے دنیا کے راستے پر چلنے میں  
 محبت کی آزمائش سے پہلے ہی  
 اچھا ہے کہ تمہارا پاؤں اس راستے پر پڑ گیا  
 عشق سنسکارتوں کا محتاج بن کر رہ گیا]

### چناں تاریاں دی رات

چناں تاریاں دی رات 'سانوں' ملی جانا ہوا!  
 سانجھی دھرتی دے گیت 'سانجھے' پانیاں دی پریت  
 ہیرا نچھے دی سونہ لاج رکھنی جے اوہ!  
 دے کیہ کہندیاں نیں اوہ 'زتاں' پھریاں نیں جو  
 میرے اوسنے نیں ہاڑ میرے سکھنے نیں پوہ!  
 آئی نہ بہاں دی کاٹک 'کچے' گھڑیاں دے دانگ  
 لٹا سونہ داویس 'اکھاں' پیاں نیں روا!  
 لٹن دیاں دے تار لٹن قوماں دے ہار  
 پائے دھرتی دی لیر 'اڈن' کنکاں دے توہ!  
 پر منکھ نوں اک وار لیس منکھتا دے تال  
 عشق لکاسی جو کیکن لے گا اوہ؟  
 چناں تاریاں دی رات 'سانوں' ملی جانا ہوا!

[بدلتی رتوں میں انسان کی اجتماعی بربادی کی بات کہتی ہوئی یہ نظم ”میں جمع تو اور میں جمع دنیا“ کی درمیانی سرحد پر کھڑی ہے۔ انسانیت کی نو مین لینڈ پر خود امر تاجی کی طرح اور اس یقین کے ساتھ کہ انسان کو انسانیت کا جو عشق لگا تھا وہ کیسے ختم ہو سکتا ہے]

ساحر کو ملنے سے پہلے میری زندگی میں صرف خلا تھا۔ خلا کو کسی مہینے یا رت کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ لیکن جب ساحر ملا وہ چیت کا مہینہ تھا۔ پہلی مرتبہ بھی اور ایک کرشمے کی طرح آئندہ کئی بار بھی۔ اس سے پہلی ملاقات کے وقت میری عمر بمشکل بیس، اکیس سال تھی۔ دیوانگی کا عالم اس وقت بھی دیکھا تھا لیکن جب میری محبت دیوانگی کے عروج کو پہنچی وہ 1953 کے چیت میں ہونے والی ایک ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں سے میں نے اپنی کتاب ”سینہ زے“ (سندیے) کی تمام نظمیں لکھیں (سوائے ایک نظم کے) اس لیے سندیے اگرچہ 1955 میں چھپی تھی لیکن اس کے پہلے صفحے پر ”1953 کے نام“ لکھا ہوا تھا۔ چیت کے کئی مہینے ایسے بھی آئے جب اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یوں لگا جیسے چیت کے مہینے میں چیت نہ آیا ہو۔ نظمیں چیت کے ہر مہینے میں لکھیں اور پھر لکھنے کا ہر مہینہ میرے لیے چیت بن گیا۔ اسی لیے آج ان تمام نظموں کو جو میری محبت کی دیوانگی ہیں چیت نامہ بھی کہہ سکتی ہوں۔ یہ چیت نامہ میں جمع تو کی تاریخ ہے۔ اور اس ”تو“ کا نام ساحر بھی ہے امر و ز بھی۔ 1953 کے چیت کو کاٹک کہہ کر پہلی نظم لکھی تھی۔ زندگی کی سکھوں کے چھتے کی طرح لگتی تھی۔ اور ان دنوں پہلی بار چھتے میں شہد کا احساس ہوا۔ سن رکھا تھا کہ شہد کا ٹک کے مہینے میں اترتا ہے۔ اس لیے شہد اترنے کے مہینے کو سامنے رکھ کر میں نے چیت کو کاٹک کہہ کر نظم لکھی۔

ڈنگاں دای بھریا چھتا۔۔۔

اک دباڑے کٹک آیا آن ماکھیوں چویا

چنوں چتے انگ زمیں دے۔۔۔

سمکناں کرناں سورج دچوں رنگ کرچی ڈھویا

سمکناں رنگاں کامن پایا۔۔۔

ہیراں دے وچ جھمر بدھاؤن ترن آ کے موہیا

ویل رکھ دے گل نوں لگی۔۔۔

مٹھلاں وچوں اٹھ سنگدھی اتھ پون دا چھوہیا

دونویں لوک میرے رُشنائے۔۔۔۔

دواکھاں نوں لبھا آ کے نور گوا چا ہویا

ڈنگاں داسی بھریا چھتا۔۔۔۔

ایک دہاڑے کٹک آیا آن ماکھیوں چریا

[میری دونوں دنیا میں روشن ہو گئیں

میری دونوں آنکھوں کو

’ن کا کھویا ہوا نور مل گیا]

وہ چیت میری زندگی میں سات برس کے بعد آیا تھا اور ایک نظم کا عنوان ’سات برس‘ تھا

دونویں نین در اگے میرے بھر بھر کے اجڑنے

ست سمندر ہیراں اگے کعبہ پر لے بنے

اکھیاں دے وچ دیوے بھر کے لمی نیچہ مڑے ناائی

ڈیکاں نال ہنیرے پتے چھانے امبر بنے

ورھیاں بدھی سورج بالے ورھیاں بدھی چن جگائے

امبراں کولوں مٹکے جا کے تارے چاندی دے

کسے نہ آ کے شمع جگائی، گھور کالھاں چند لہسٹی

ورھیاں دی اس بلی نالوں چانن رہے وچھنے

سو سو وار منائیاں جا کے پر نقدیراں مڑ نہنیاں



پوتاں دی اک کئی اندر کئی کئی دھاگے بٹھے  
 ہارے ہوئے میرے ہتھوں وچوں شمعداں جدوگن لگا  
 ستے ساگر تر کے کوئی آیا میری ونے  
 ہوٹھاں وچ چٹا کے جادو ہتھ میرے اُس چھو ہے  
 ”کہو قلم نوں ایس پیڑ دا دارو بن کے پنے!  
 تیریاں پیڑاں میریاں پیڑاں ہور لچبیاں لکھاں پیڑاں  
 تیرے اتھرو میرے اتھرو ہور اتھرو گئے  
 ساں درھیاں دا ایہہ چنڈاڑے اسیں نہ پاندھی اس دے  
 لکھاں مٹوں لکھاں سسیاں پیڑ تھلاں وچ بھنے  
 دونویں ہوٹھ اڑا کے اُس نے قلم میری فیر چھوئی  
 دونویں نین دراگے اُس دے بھر بھر کے فیر ونے  
 ست سمندر پیراں اگے کعب پر لے بنے

[دونوں نین میرے پیراگی آج بھر بھر کے روئے ہیں  
 سامنے سات سمندر ہیں اور ان کے پار کعب  
 میرے ہارے ہوئے ہاتھوں سے جب شمعداں گرنے لگا  
 تو سات سمندر پیر کر کوئی میری جانب آیا  
 ”تیرا درد میرا درد ایسے اور بھی لاکھوں درد  
 تیرے آنسو میرے آنسو اور بھی کتنے آنسو  
 سات برسوں کی اس مسافت کے صرف ہم ہی مسافر نہیں ہیں  
 لاکھوں مٹوں اور لاکھوں سسیاں ہیں تپتے صحراؤں نے جن کے پیروں کو بھون ڈالا ہے  
 پھر دونوں لب جھک کر اس نے میرے قلم کو چھوا  
 پھر اس کے پیراگی نین بھر بھر کے روئے]

ساحر کے رخصت ہونے کا دن آیا تو اس نے اس دن کے ٹکٹ واپس کر کے اگلے دن کا خرید لیا۔ پھر  
 اگلے دن کا ٹکٹ واپس کر کے اس سے اگلے دن کا اور پھر اسے واپس کر کے اس سے اگلے دن کا۔۔۔  
 بالآخر بنگلہ آفس کا کلرک کہنے لگا "صاحب آپ روز کے پیسے کیوں کرواتے ہیں جس روز جانا ہوا شیشن  
 پر آ کر ٹکٹ لے لیجئے گا"

اس طرح روزانہ کے پیسے کٹوا کر آخر کتنے دن خریدے جاسکتے ہیں؟ زندگی سے قرض مانگے ہوئے ان  
 دنوں میں میں نے یہ نظمیں لکھیں

سنے

جیوں کوئی نکا پیچھی جا کے  
 ڈوٹھی سنکھنی رکھ دے اندر اک آبلٹا پائے  
 سجا ہتھ میرا لٹایا  
 اوہدیاں دو تلیاں وچ بیٹھا سننے کئی بنائے  
 اک دن رنج کھینڈیاں انگلاں  
 تلیاں دی اُس دھرتی اُتے بنے گھر گھریاے  
 فیر جیویں کوئی اٹا کھینڈے  
 منٹھاں دے وچ بھر کے سننے اکھاں نوں اُس لائے  
 درھیاں اُتے درھے بیت گئے۔۔۔۔۔  
 رنگ کوئی نہ کھرے انہاں دا لکھاں اتھرو آئے  
 چنا چائن ڈھوئی نہ دیوے  
 اکھاں وچ کھلوتے سننے رات چندی جائے

## کچیاں گنڈھاں

پیار تیرے دیاں کچیاں گنڈھاں 'توں نہ کیوں کھول!  
 پیار میرے دیاں کچیاں گنڈھاں 'میں نہ کی آں کھول!  
 اک دہاڑے تندولی اک 'ولی گئی انجھول  
 اکھیاں نے اک چائن دتا 'اکھیاں دے وچ گھول  
 ہنڈھدا ہنڈھدا 'حسن ہنڈھیا 'کھول نہ سکيا گنڈھ  
 کیہ ہویا بے اندے پے گئی 'تند سبک تے سول  
 دو جنداں 'دو تنداں 'ولیاں 'ول 'ول 'بھئی جان  
 کیہ ہویا بے کدی کسے دے 'ت نہ دے کول  
 چڑھ چڑھ لہر لہر سورج ہنڈھیا 'دو دھ گھٹ گھٹ چنڈا  
 ساری عمر اکیل گئے 'تیرے جادو و رگے بول  
 کھول کھول کے لوک ہاریا 'کھول کھول پر لوک  
 کہہڑے رب دا زور و سدا 'دو تنداں دے کول  
 اس منزل دے کڈے دیکھے 'اس منزل دیاں 'ٹولاں  
 اس منزل دے یو جن سکے 'قدم نہ سکے ڈول  
 پیار تیرے دیاں کچیاں گنڈھاں ۔۔۔۔

{ تمہارے پیار کی کچی مگر ہیں 'انہیں تم نہ کھول سکے  
 میرے پیار کی کچی مگر ہیں 'انہیں میں نہ کھول سکی }

راہ

کیسے ٹونیاں ہارے راہ

گم گوچر کچھ اسنہاں دی جادوئیں اسگاہ!  
 نہ جانا ایہہ کدھروں آوندے تے کدھرنوں جاندے  
 سو سوٹوئے سو سو جادو پیراں پٹھو چھاندے  
 موڑاں دے نال موز جاندے پیر نہ کھان و ساہ  
 جنوں بھینزے عمروں لپے ایہہ رستے کنڈیا لے  
 مذ پیراں وچ پیندے چھالے لکھ اقراراں والے  
 رستے پے کے کون کرے من پیراں دی پرواہ  
 نہ اس راہ دی پیڑ کھلتی نہ کوئی گھرا بھاتا  
 پر اس راہ نال پیراں و اساس جوڑ لیا اک ناتا  
 دو پیراں دے نال نیجے گا پیراں دا نراہ  
 ڈھپاں ڈھلیاں دیونہہ پیراں جی راہ نہ بیٹے  
 ایس راہ دے ٹوئے توں اساس پیر صدقوے کہتے  
 پیراں دی اساس تیار چیز ہائی راہواں دی درگاہ  
 کیسے نو نیاں ہارے راہ۔۔۔۔۔

[ کیسے جادو بھر لے راستے ہیں ]

نہ جانے یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں  
 پیروں تلے سو سو ظلم سو سو جادو بچھاتے ہیں  
 ہر موز کے ساتھ موز جاتے ہیں پاؤں ان پر بھروسہ نہیں کرتے  
 یہ کانٹوں بھرے راستے زندگی سے زیادہ تنگ اور عمر سے زیادہ لمبے ہیں  
 لیکن پیروں میں وعدوں کے چھالے پڑ جاتے ہیں

ان راستوں پر چلتے ہوئے اب پیروں کی پرواہ کون کرے

نہ اس راستے کے درد کو جانا نہ کوئی سرا پہچانا  
 لیکن ہم نے اس راستے کے ساتھ پیروں کا ایک رشتہ بنا لیا ہے  
 دھوپ ڈھل چکی دن بیت چکا لیکن راستے ابھی تک ختم نہیں ہوئے  
 اس راستے کے طلسم پر ہم نے اپنے پیروں کا صدقہ اتار دیا  
 راستوں کی درگاہ پر ہم نے اپنے پیروں کی نیاز وے دی  
 کیسے جادو بھرے راستے ہیں۔۔۔۔۔

اس وقت واپس جا کر ساحت نے چار اپریل کو ایک خط لکھا تھا جس کی ابتدائی سطر یہ تھیں

"I was just listening your programme from Delhi station and you  
 were so rear, but suddenly you gave the last  
 announcement and Hindustani items began, giving me  
 the feelings that you are after all nine hundred miles  
 away from Bombay."

’ظلم‘ دو گھنٹیاں‘ اس خط کے بعد لکھی تھی اسی لیے اس میں نو سو میل ریگستان کا ذکر ہے۔

## دو گھنٹیاں

ست امبراں نوں لنگھ کے آئیاں ستیں سریں جگائے جادو  
 ستے رنگ پہن لئے اوہناں زو پ۔ کون نہ اونا  
 پیشوائی نہ سری اساتھوں دونوں ہتھ ہوئے بورانے  
 چند گزوی نوں بانہہ وانگے کر سکیاں کوئی ٹونا  
 ستے امبر لنگھ کے آئیاں ستے امبر لنگھ کے سکیاں  
 ہتھ وچ لوہا ہتھ وچ پارس بھل گیا سانوں بھٹو ہٹا  
 اُس ڈاچی میرا نوں کھڑیا نو سو میل بریتا دچھیا

جیوں جیوں کسی جائے اگیرے تیوں تیوں پینڈ اڈونا  
 اندرے اندر بدل گھر دے کدے کدے کوئی داچھڑا دے  
 دوا کھاں وچ آ کے لتھے منہ نوں کر جائے کوٹا  
 جگاں جیڈے دیونہہ بیت گئے یاداں دی اک تانی بکھی  
 بہنے بہہ کے اکھر اُنچے ہورا ساں کہہ کوٹا۔۔۔  
 [ کون اونٹنی میرے پنوں کو لے گئی ہے 'نوسومیل' کار یگستان بچھا ہوا ہے  
 جیسے جیسے کسی آگے بڑھتی ہے 'قاصد' دگنا ہوتا جاتا ہے  
 اندر ہی اندر بادل اُمنڈتے ہیں 'کبھی کبھی بارش کا کوئی تیز چھینٹا آتا ہے  
 دو آنکھوں میں آ کر اترتا ہے اور چہرے کو نمکین کر دیتا ہے  
 جگلوں جتنے دن بیت گئے یادوں کی ایک تانی تھی ہے  
 ہم بیٹھیں اور بیٹھ کر لفظ بنیں 'اور ہم'ے کیا ہوتا ہے۔۔۔ ]

وہ دن صرف میرے لیے نہیں ساحر کے لیے بھی مشکل تھے وہ بہی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کے لیے  
 تیار تھا۔ پھر چودہ اپریل کو اس کا خط آیا

"I will reach Delhi in the last week of this month"

لیکن وہ آخری ہفتہ کبھی نہیں آیا نہ اس صینے کا نہ کسی اور صینے کا۔ اس کے انتظار کے تمام دن اور صینے ایک  
 بھیا تک خاموشی بن گئے اتنی بھیا تک کہ اس چپ میں اپنی بانہوں میں چلتی نبض بھی اپنی نہیں لگتی تھی۔ یہ چند  
 نظمیں اس دور کی ہیں۔

## اک خط

ایہہ رات ساری تیرے خیالاں چ گزار کے  
 بنے بنے جاگی ہاں 'مست' ہشتاں اُسار کے  
 ایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی درحد دی رہی

ایہہ رات تیرے وعدیاں توں پوریاں کر دی رہی  
 پنچھیاں دی ڈار بن کے خیال کوئی آوندے رہے  
 ہوٹھ میرے ساہ تیرے دی مہک نوں پیندے رہے  
 بہت اچیاں ہن دیواراں روشنی دسدی نہیں  
 رات سپنے کھیڈ دی ہے ہو رکھ دسدی نہیں  
 ہر میرا نغمہ جیویں میں خط کوئی لکھدی رہی  
 حیران ہاں اک سٹروی تیرے تک نہج دی نہیں؟

[یہ ساری رات تیرے خیالوں میں گزار کے  
 سات بہشت تخلیق کر کے ابھی جاگی ہوں  
 یہ رات ایسے تھی جیسے رات بھر رحمت کی بدلی برستی رہی  
 یہ رات تیرے وعدوں کو پورا کرتی رہی  
 خیالات پرندوں کی ڈاریں بن بن کر آتے رہے  
 میرے ہونٹ تیری سانسوں کی خوشبو کو پیتے رہے  
 دیواریں بہت اونچی ہیں روشنی دکھائی نہیں دیتی  
 رات سپنے کھیلتی ہے اور کچھ نہیں بتاتی  
 میرا ہر نغمہ ایسے ہے جیسے میں کوئی خط لکھ رہی ہوں  
 حیران ہوں تم تک ایک سطر بھی کیوں نہیں پہنچتی؟

اُج

مان مرد و رشتاں لٹھیاں موتی رہیاں چٹک وے  
 خیر ہنیرے چوسر کھیڈے فجر غنی اڈ چٹک وے  
 پورب دی اک ہٹائی اُتے کر ناں بیاں اُگ وے

سجھے یاداں اُملہ آئیاں بھری کیلچے رُگ دے  
 اُلھڑو ہیاں کھیڈن پیاں کھیڈن رنگ کُٹھب دے  
 لغراں جیہیاں سحر دو پہراں ہو یاں چٹیاں کُٹھب دے  
 دیکھ سے نے چا ہڑھ ڈھنکھنی چائن دتا تب دے  
 دونویں پیر دیونہ دے ٹھر گئے کرناں ماری کُٹھب دے  
 کرناں جیویں طوفی ہوئیاں امبر گئے نیں انب دے  
 کسے رای نے اُڈی جھاڑی پنچھی جھاڑے کُٹھب دے  
 آگے جھنڈوگ تے ڈاراں بھر گئے سرور کُٹھب دے  
 ایسی بھر دے پینڈے ٹرلے جتے جندگنی میری بھہ دے  
 ڈول گئی سورج دی بیڑی کچھ تھم ناھی چھل دے  
 گنڈھ پوٹلی چک ترکالاں آئیاں ساڈی ول دے  
 کیہو ے بدلوں کنیاں لٹھیاں اکھیاں بھرنی ڈل دے  
 ہراک میری "آج" ڈھونڈ دی کتھے تیری "کل" دے؟

[جہری اس مسافت پر میری جان تھک ہار گئی ہے  
 میرا ہر "آج" تلاش میں ہے تمہارا کل کہاں ہے؟]

سفر

گہراں چڑھیاں پور یوں امبر لدے انج  
 چڑھد اسورج شنبیا چائن دتا پنچ  
 سکے سرور رحم دے ہنس نہ بوڑی پنچ  
 کرم کسے دے ہو گئے متھے نالوں رنج  
 گہراں پینڈے چلیاں چارے کنیاں گنج



لیکاں پھڑیاں ٹھٹ کے کھڑا نہ جاوے کھنچ  
 کا لے کوہ مکا ندیاں۔ دھپاں لٹھیاں اُنچ  
 سورج ہو یا سر کر اکر تاں ہو یاں منچ  
 گہراں پچھم ملایا لایا، بھر دی ڈنچ  
 پکڑاں پیر لپیٹیاں ہتھوں پھٹ کے ونچ  
 ہونڈ نہ بازے ملدے اکھ نہ سکدی ہنچ  
 لہ لہ جان دہاڑیاں ہوئی عمر دی ہنچ

[ہونٹوں سے فریادیں ختم نہیں ہوتیں آنکھوں سے آنسو نہیں سوکتے  
 دن ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ عمر کی شام آ چلی ہے]

ایک بار یہ خاموش سلگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ 15-5-53 کو ساحر کا خط ملا بمبئی سے نہیں مہابلیشور کے  
 فاؤنٹین ہوٹل سے

"I got a sudden attack of nervous breakdown and my doctor  
 advised me to leave immediately for this small hilly  
 place, which is about two hundred miles away from  
 Bombay.... I will write you again...."

خط اگرچہ بیماری کے بارے میں تھا لیکن خط تھا جس میں دوسرے خط کا وعدہ تھا اور کسی آنے والے  
 پیسے کا بھی۔۔۔ یہی وقت تاجب ایک طویل لہجہ 'سنیہو' نے 'سندیے' لکھی۔

سنیہو

لگی لو تے پہلو اپہر لگا 'فیر دوسرے پہر نے سُد لائی  
 اک تیرے ویوگ داسیک ڈاڈ عا نو جا عمر دی عمر دو پہر آئی

تیرا خط سانوں اچ بوہڑیا اے، جیویں ستاں اسماناں تے گھٹا چھائی  
دوویویں اکھیاں ساڈیاں بھوم پیاں، متھے وچ نصیبیاں نے پیل پاگئی

دونویں ہتھ ساڈے اچ ہوئے بورے، اکھاں جھلیاں ہندیاں جانندیاں نہیں  
قلماں تیریاں اچ سرناویاں تے، ساڈے ناویں نوں پیاں ٹلاندیاں نہیں  
چونہ پوٹیاں تے دس چار لیکاں، خورے کپھڑیاں لونسٹیاں پاندیاں نہیں  
ماں، بھلیاں اٹھ کے اکھراں چوں پیاں پوٹیاں وچ سماندیاں نہیں

لکھاں بیٹھ ہے زمیں دھھیٹ بیٹھا، سارے امبر تے آن کے انج چھایا  
ہاں رحمتاں اپنے نال لے کے، ہو کے دوت جیویں کسے داسیگھ آیا  
اکھر جادواں وچ لپیڑ کے تے، پہلاں تھ کے اپنے نال لیا یا  
ساڈی جدنوں آن کے کیل جینھا، ٹونے ہار یاوے کہیا خط پایا

بجھاں اُتے بے ویہ سوچ سست، چڑھیاں چتر مہینہ تے ہوئی نانویں  
تھیں آپنے لکھے سنہیزے میں، تھیں آپی آپ وصول پاویں  
لہنہاں کاغذاں نوں لہنہاں قاصداں نوں، پہلوں خیر خیریت دے نال بہاویں  
بھیر حال حوال جو پچھنا، ایں لہنہاں محرمیں دے کول بیٹھ جاویں  
زتاں بھوندیاں تے ورھے پنے، گودے دے کوئی انت نیوں لہنہاں گیزیاں دے  
جہڑے مند توں رونقاں رُس گنیاں، حال دیکھ جاویں اوہناں دیہڑیاں دے  
اکھیں بھریاں میں نال گلیڈ وواں دے، ہونٹھ بھرے میں نال سنہیزیاں دے  
سار جانے میں لہنہاں اکھراں وئی، جن دچھڑے بجناں جیہڑیاں دے

بھلا دس میں لہنہاں نوں کیہ؟ کھاں لہنہاں سمجھاں، تھیں سنہیزیاں نوں

بس کنڈے دی اوہناں دے چنگ لیے ہتھیں آپ لایے بھلاں جیہڑیاں نوں  
 جیہڑی گل تے اکھیاں تال چھڑیاں چھیڑ بیٹھے ہاں قصیاں کہیڑیاں نوں  
 قاصد اکھیاں دے کاغذ پے لکھدے لے کے آئے نی میرے سنہڑیاں نوں

بہہ کے آپ نوں سنہڑیاں نوں بہہ کے آپ دا چیس اسمباں پاتیاں نوں  
 دونواں اکھیاں دے وچ ڈوب دیویں دونویں اکھیاں بھریاں بھراتیاں نوں  
 ہڈیال کے درھے ہنگال جھڈے اساں پالیا چنگ چواتیاں نوں  
 اکھ حرف والے اکو رو انوں وار منیا دونواں حیاتیاں نوں

جیہڑا پایا ای اج سوال مینوں روز حشر دا ایہی سوال میرا  
 جیہڑی چمیل بے تیریاں اکھیاں وچ اوہیوا اکھیاں وچ اُبال میرا  
 کابنوں فیروز کے سرتاں پچھیاں نی کھن گوجر نہیں سی حال میرا  
 تیرانا تاجے جھرو دے تال جیہڑا اوہی واسطہ اوس دے تال میرا  
 بیتے کئی ستوار تے بیت چلے کئی بیت گئے نیں باراں ماہ ساڈے  
 جووی سال چڑھد اجووی چڑھے سمت اوہیو سال ڈاڈھا اوہیو سن ڈاڈھے  
 چھپے زماں ہی ویکھ مڑنڈھ ہویاں ویکھ پندے ہن گئے دیونہ ساڈے  
 مینتی اکھرتی ساڈے دیوگ والے جیہڑا راہ پھڑیا سو پیا آڈے

نہ کوئی دتے نیں اساں اُلا بھڑے وئے نہ کوئی گلے گزارشاں کیتیاں نیں  
 کسے ہیر دی قبر چوں واج آئی اساں ڈیک لاکے زہراں پتیاں نیں  
 بادشاہی جہاں دی کہن لگی پچھ میرے توں جیہڑیاں بیتیاں نیں  
 کئی کئی فیروز میں دی بول انھی اساں جھولی ج پاتیاں انتیاں نیں

لٹی ایک جتنی سکے ٹاپین ٹالوں وٹاں وٹاں چوں روٹیاں بول بھیاں  
 روٹیاں پھڑیاں تے چھنے وٹک اٹھے پیلے پیلے چوں دوٹیاں بول بھیاں  
 جلاں تھلاں چوں اک آواز ہو کے کئی سسیاں سوٹیاں بول بھیاں  
 اگو واج میری نہیوں واج دکھ واج واج چوں ہونیاں بول بھیاں  
 لکھاں دوجاں دی اک آواز ہوئی اکواک سنہیرا دین لگی  
 رہی ہتھ دے دوج حمل ساڈی اٹھے بھل ساڈے ہستی رہی لگی  
 ایس ہونی نوں ہو رکیا آکھیے دے جیہڑی ہونی حیاتیاں نال لگی  
 میرا رانجھلاں دے! میرا پواء دے! میرا مہو والا! کبھی قلم وگی!

جے کوئی لینا وی میرا سنہیرا دے! میرا لکھی سنہیرا آڈھولا!  
 ہتھی قلم نوں پکڑ کے قلم بدھی دیویں اوس دے ہتھ پھڑاڈھولا  
 بولے کوئی شریعت جے آن کے تے دیویں اوس شرع دناڈھولا  
 رب فیروے کرے جے غدر کوئی بدل دے تیں توں اوہدی رضاڈھولا  
 ڈاچی سے دی اج نکھیر دیندی سسی اچے وی پٹوں دا گھر ابھالے  
 دونویں انیاں حسن داخل چنیدا ہتھ تیسہ تے اچے وی پیر چھالے  
 کٹھا عشق جو چھری اٹھڑی توں رت اوس دی سدھی پئی حالے  
 کافی سے دی سدھی رہی لکھدی خونی پترے پیار دی بیڑ والے

بجھی ہوئی اے زمین دی پٹھ ساری گھرے ڈاچی دے آج ناسور ہو گئے  
 دنجاں والیاں نے کچے دنج کیٹے پانی چھلاں دے نال بھر پور ہو گئے  
 کیدو سے دے ہو روی ہوئے ڈاڈے چاک سے دے ہو ر مجبور ہو گئے  
 پینڈے تخت ہزار یوں جھنگ والے ہندے ہندے آج ہو دی دور ہو گئے

اکواک سنبھڑا دیاں تینوں قلماں والے دی قلم نوں گھڑیں جا کے  
 جہاں پھر قلم ہی اوس دی بدل دیوین، سیاہی بدل دیوین سیاہی نوں پاکے  
 رکھیں کورنگوریاں کاغذاں نوں اُتے زمیں دے حق دی مہر لا کے  
 اکھر اوس دے ہتھ پھڑا کیں ایسے بدل دے اوہ سارے فرمان آ کے  
 اوہو شعر تے اوہو ہے بحر اوہدی بدل گئے نیں آج عنوان ڈھولا  
 سجھے شرماں شریقاں تیریاں نیں تیرے نال ہے جگ جہان ڈھولا  
 ہتھیں آہنی پھڑیں توں آپ کافی، ایسے کافی نوں چاڑھ کے سان ڈھولا  
 اوہدے دید کتہیاں دابنیں کا تب سودھ دئیں توں شاہی فرمان ڈھولا

شاہی جہاں دے شاہی فرمان سارے تیری کافی نوں پئے اڈکدے نیں  
 چند سے والے چکر سے والے عاشق ہوئے تیری اکونیک دے سے نیں  
 کچی وٹ تے پیراں دے پے تیرے پکے چندھ دی پیڑ الیکدے نیں  
 شاہی تاج دا کوئی وسادہ نہیوں وعدے زمیں والے حشر تک دے نیں

حق سے دا شاہ سوار ہووے واگ سے دی انج سنبھالناوے  
 پیر جگ دے منزلاں ڈھونڈ سکےں دوںہاں دیویاں نوں ایکن پالناوے  
 نوں رت دا کوئی سندیش دینا ایس کافی دی لاج نوں پالناوے  
 پور پورے جو زمیں دے رکھ اُتے تے مائنی امن دی عمر دا آبلناوے

[روشنی ہوئی تو پہل پہر ہوا پھر دوسرے پہر نے صدا دی

ایک تیری جدائی کی تپش بہت ہے

دوسرے عمر کا سورج نصف النہار پر آن پہنچا ہے

تیسرا خط آج اس طرح آیا ہے جیسے

ساتوں آسمانوں پر گھٹنا چھائی ہو  
 ہماری آنکھیں جھوم اٹھی ہیں  
 اور پیشانی پر قسمت رقص کرتا ہے]

[آج ہمارے دونوں ہاتھ دیوانے ہو گئے ہیں، دوا انکھیں پاگل ہوئی جاتی ہیں  
 چتے پر تیرا قلم آج ہمارے نام کو بلارہا ہے  
 چاروں پوروں پر چار لکیریں گئی ہیں نہ جانے وہ کیا پوچھتی اور کیا بتاتی ہیں  
 انکھوں بجلیاں لفظوں میں سے اٹھ اٹھ کر پوروں میں سار ہی ہیں]

[اس نے تمام زمین کو اپنے پوروں میں لپیٹ لیا ہے اور سارے آسمان پر اس طرح چھا گیا ہے  
 جیسے بادلوں کا سفیر اپنے ساتھ رحمتیں لے کر آیا ہو  
 لفظوں میں جادو بھر کے انہیں اپنے ساتھ لایا ہے  
 ہماری روح کو اپنے بس میں کہہ کے جادو اتونے یہ کیسا خط لکھا ہے؟]

[یہ 2010 بکری ہے۔ چیت کا مہینہ چڑھا ہے اور اس کی نو تاریخ ہو گئی ہے  
 میں نے یہ سندیسے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں انہیں اپنے ہاتھ سے وصول پانا  
 پہلے ان کاغذوں کو ان کا صدوں کو خیریت کے ساتھ بٹھانا  
 اس کے بعد جو حال احوال پوچھنا ہوا ان محرموں کے پاس بیٹھ کر پوچھنا]

[رُتیں بدل رہی ہیں برسوں کے پیچے حرکت میں ہیں اس حرکت کا کوئی انت نہیں ہے  
 جس چہرے سے رونقیں نہ کھ گئی ہیں ان اُجڑے آنکھوں کا حال آ کر دیکھ جانا  
 آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں اور ہونٹ سندیسوں سے  
 وہ ساجن ان لفظوں کی روح کو جانتے ہیں جن کے ساجن پھٹ گئے ہیں]

[بتا تو بھلا میں ان اشکوں بھرے سندیسوں سے کیا کہوں  
 جو پھول خود بوئے جائیں ان کے کانٹوں کو بھی ہنس کر چن لینا چاہیے  
 بات چھیڑی تو آنکھیں بھی چھڑ گئیں ہم یہ کن قصوں کو چھیڑ بیٹھے  
 آنکھوں کے قاصد کا غزلکھ رہے ہیں یہ میرے سندیسے لے کر آئے ہیں]

[ان سندیسوں کو خود بیٹھ کر سنتا ان کا غزلوں کو خود بیٹھ کر جانتا  
 اپنی آنسو بھری آنکھوں کو میری آن دلوں آنکھوں میں ڈبو دیتا  
 ہڈیوں کو جلا کر ہم نے کئی برس گزار دیئے ہم نے جلتی لکڑیوں کی خود پرورش کی ہے  
 ہم نے اپنی زندگیاں ایک ہی حرف والے ایک ہی ورد پر سے واردی ہیں]

[آج تو نے مجھ سے جو سوال کیا ہے میرا روزِ محشر کا یہی سوال ہے  
 تیری آنکھوں میں لہر ہے وہی اُبال میری آنکھوں میں بھی ہے  
 تو نے پھر میرا حال کیوں پوچھا ہے یہ تو پوچھنے کے قابل نہیں تھا  
 ہجر کے ساتھ تیرا جو ناتا ہے میرا بھی اس کے ساتھ وہی رشتہ ہے]

[کئی بہتے بہتے اور بیت چسے ہیں ہمارے کئی سال (اسی طرح بیت گئے  
 جو بھی سال چڑھتا ہے جو بھی سست آتا ہے وہی سال اور وہی سن (ہم پر) بھاری گزرتا ہے  
 چھ کی چھڑتیں ہی غزدہ ہو گئی ہیں دیکھ گزرتے گزرتے ہمارے دن بھی گزر گئے  
 پینتیس حرف ہی ہماری جدائی کے حرف ہیں ہم جس راہ پر بھی چلے وہی رکاوٹ بن گیا]

[نہ تو ہم نے کوئی گلے گزاریاں کی ہیں اور نہ ہی شکوے شکایتیں  
 کسی ہیر کی قبر میں سے آواز آئی کہ ہم نے زہر کا پیالہ ایک ہی سانس میں پی لیا]

چناب کی ملکہ کہنے لگی کہ مجھ سے پوچھو جو ہم پر بیت گئی  
پھر زمین کا ذرہ ذرہ بول اٹھا کہ (اپنے ساتھ ہونے والی) ہر زیادتی کو ہم نے گلے سے لگا لیا]

[کسی ٹہنی سے ایک بھی پتہ ٹوٹا تو ایک ایک درخت کی ڈالیاں بول پڑیں  
پُوریاں رو پڑیں اور چھنے بلک اٹھے جنگل جنگل دو بنیاں بول پڑیں  
پانیوں اور ریگستانوں سے ایک آواز ہو کر کئی سسپاں اور سونیاں بول پڑیں  
میری اکیلی آواز اکیلی نہیں ہے ایک ایک آواز میں سے تقدیر بول پڑیں]

[لاکھوں آوازوں کی ایک آواز بن گئی اور ایک ہی سندیر دینے لگی  
ہماری حائل ہمارے ہاتھ میں ہی رہ گئی ہمارے پھول سوتے رہے اور سگی کی غیند بھی نہ ٹوٹی  
اس تقدیر کو اور کیا کہیں کہ جو زندگی بھر ہمارے ساتھ چلی  
میرے رانجمن! میرے ہنوں! میرے مہوال! ہم پر کیسا قلم چل گیا!]

[اگر ہمارا کوئی سندیر لیتا ہے رے! تو یہ سندیر خود آ کر لینا میرے محبوب! میرے ڈھولن!  
اے قلم کو سیدھا کر کے اُس کے ہاتھ میں تھما دینا  
اگر کوئی شریعت اعتراض کرے تو اس کی شرع کو بدل دینا  
اگر خدا اس کے بعد بھی کوئی عذر کرے تو اس کی رضا کو بدل دینا ڈھولن یا را!

[وقت کی اونٹنی آج بھی جد کر دیتی ہے سسی آج بھی ہنوں کا نشان ڈھونڈتی ہے  
حُسن کی قیمت صرف دو انیاں پڑتی ہے آج بھی اس کے ہاتھوں میں تیرہ اور بیروں میں چھالے ہیں  
عشق کو جو اپنی چھری سے ذبح کیا گیا تھا اس کا خون اب تک بس رہا ہے  
وقت کا قلم ہمیشہ عشق کی داستان کے خونی ورق لکھتا رہا ہے]



[زمین کی تمام پیٹھ زخموں سے پھر رہے اونٹنی کے پاؤں آج ناسور بن گئے ہیں  
 بخاروں نے کچے یو پار کئے اور پانیوں میں لہروں کا طوفان آ گیا  
 زمانے کے کید و اور بھی جابر ہو گئے اور آج کے چاک (چاکر۔ رانجھے) اور زیادہ مجبور ہو گئے  
 جھنگ سے تخت ہزارے کا فاصلہ دور ہوتے ہوئے آج اور بھی دور ہو گیا ہے]

[تمہارے لیے بس ایک ہی سند یہ ہے کہ جا کر قلم والے کے قلم کو تراشنا  
 یا پھر اُس کا قلم ہی بدل دینا نئی روشنائی کے ساتھ  
 کورنگور سے کاغذوں پر زمین کے حق کی مہر لگا کر رکھنا  
 اُس کے ہاتھوں میں ایسے لفظ دینا کہ وہ تمام فرمانوں کو بدل دے۔۔۔]

[وہی شعر ہے اور وہی اس کی بحر ہے لیکن آج اُس کے عنوان بدل گئے ہیں  
 آج جو بھی شرع شریعت ہے وہ تمہاری ہے پوری دنیا تمہارے ساتھ ہے  
 اپنے قلم کو خود اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سان پر چڑھانا  
 اس کے ویدوں کتابوں کا کاتب بننا اور شاہی فرمانوں کی غلطیاں درست کر دینا ڈھولن پار!]

[شاہی راستوں کے سارے شاہی فرمان تمہارے قلم کے منتظر ہیں  
 وقت کے نشان اور چکر تمہاری ایک ہی لکیر کے عاشق ہو گئے ہیں  
 کچے راستوں پر تمہارے پیروں کے نشان کچے راستوں کے نشان ثبت کر رہے ہیں  
 شاہی تاج کوئی کوئی اعتبار نہیں رہا زمین کے وعدے حشر تک کے لیے ہیں۔۔۔]

[وقت کی باگ کو اس طرح سنبھالنا کہ وقت کا حق شاہ سوار ہو  
 دونوں دنیوں کو اس طرح چلانا کہ دنیا کے پاؤں اپنی منزلوں کو پا سکیں

نئی رُت کا کوئی سند یہ دینا اور اس کی لاج کو پالنا  
زمین کے درخت پر نو رپڑے امن کی بنی ہو اور عمر کا گھونسلہ]

لیکن سند یہ کہیں نہیں پہنچے صرف قلم کی نوک پر آئے اور کالے لفظ بن کر کاغذ کے سینے پر جم  
گئے۔۔۔ چپ کی دھرتی وجود میں آگئی اور چپ کا آسمان بھی۔۔۔ اس طرح کہ حقیقت بھی محض تصور بننے  
لگی۔ یہی دن تھے جب میں نے یہ نظمیں لکھیں۔

### کھینا

تارے نکلتی تھ کھلوتے اچھلی امبر گنگا  
گھڑیاں نوں پئی منہ منہ بھردی بنی کھینا مہری  
کئی اروشیاں چاکر ہو یاں اس مہری دے اگے  
اندر سبھا لگا کے بیٹھی بکسن ہو روی قہری  
پیار میرے دا بھیت ایس نے چھمکاں مار جگایا  
ستاناگ عشق دا جاگے ہو روی ہو جائے زہری  
بھکھے امبر بھرن کلاوا ہتھاں وچ نہ آدے  
سوئی ہر چندوری آخر ہر چندوری تھہری  
کھڑدی دی جیویں کپاہ دی تھھی پینے تیرے ہسدے  
جیا کھینا ا جگاں توڑی پینے کت سنہری  
لکھ تیرے انیراں وچوں دس کیہہ بھاسا نوں؟  
اکوتند پیار دی لکھی اوہ وی تند اکہری

[تیری (نعتوں کے) انبار میں سے بھلا ہمیں کیا ملا؟

محبت کی ایک تار اور وہ بھی اکہری]

مایا

[چتر کاروسینٹ وان گوگ دی کلپٹ پریم کا مایا نوں]

پرے نی پرے! حوراں شہزادے!

گوریے و سینیٹ دیے! سچ کیوں من دی نہیں؟

دل دے اندر چٹنگ پا کے ساہ جدوں لیند اکوئی

سلگدے انگیار کتے توں کدے گندی نہیں

کاہد اہنر کاہدی کلاتا ہے اک ایہہ جیون دا

ساگر تخیل دا کدے توں کدے من دی نہیں

پرے نی پرے! حوراں شہزادے!

خیال تیرا پار نہ۔۔۔ اُردوار دیندا ہے

روز سورج ڈھونڈ دا ہے منہ کتے بسدا نہیں

منہ تیرا جورات نوں اقرار دیندا ہے

تڑپ کس نوں آکھدے نہیں توں نہیں ایہہ جان دی

کیوں کسے توں زندگی کوئی وار دیندا ہے

دونویں جہاں آپے نہیں اہے کوئی کھیڑتے

بسدا ہے نامراد تے فیر ہار دیندا ہے

پرے نی پرے! حوراں شہزادے!

حسن کاہدی کھیڑ ہے۔ عشق جد پگدے نہیں

رات ہے کالی بڑی عمراں کسے نے بالیاں

جن سورج کہیے دیوے۔ اے ج دی جگدے نہیں

بہت تیرا سوچے! تے اک بھاکنک دا

کاہدیاں ایسہ دھرتیاں۔ اے دی اُگدے نہیں  
 ہنر بھکھا روئے! پیار بھکھا گوریئے!  
 کاہدا ہے دکھ نظام دا۔ پھل کوئی لگدے نہیں  
 پرے نی پرے! حوراں شہزادیئے!  
 حسن کاہدی کھیڈ ہے۔ عشق جد پکدے نہیں

### تصور

(مصور و سنیٹ گوگ کی خیالی محبوبہ پایا۔ سے)  
 پری ری پری! حور شہزادی!  
 و سنیٹ کی گوری! تو حقیقت کیوں نہیں بنتی  
 جب کوئی دل میں چنگاری رکھ کر سانس لیتا ہے تو یہ نہیں گنتی کہ سلگتے انگار کتنے ہیں؟  
 کیسا ہنر! کیسا فن! یہ تو جینے کا ایک جتن ہے  
 تخیل کے سمندر کو تو کبھی نہیں مانتی  
 سورج تمہارے اس چہرے کو روز ڈھونڈتا ہے  
 جو چہرہ رات کے وقت (محبت کا) اقرار کرتا ہے  
 تو یہ نہیں جانتی کہ بڑپ کے کہتے ہیں  
 اور کوئی کسی پر سے اپنی زندگی کیوں وارد دیتا ہے  
 رات بہت کالی ہے کسی نے اپنی عمر جلا دی  
 چاند سورج کیسے دیتے ہیں جواب بھی روشن نہیں ہوتے  
 روئی! ہنر بھوکا ہے! گوری! پیار بھوکا ہے  
 نظام کا یہ کیسا درخت ہے جس پر کوئی پھل نہیں لگتا

## فتنس

لکھ جا مری تقدیرِ نوں میرے لئی  
 میں جی رہی تیرے، بھال تیرے لئی  
 ہر چند وری ہر گھڑی بن دی رہی  
 ہر چند وری ہر گھڑی بند دی رہی  
 دودھیا چائن وی آج ہسدے نہیں  
 بے بہارے پھل جیویں رسدے نہیں  
 عمر بھر دا عشق بے آواز ہے  
 ہر مرانفہ مری آواز ہے  
 حرف میرے تڑپ اٹھوے بن ایویں  
 سلگدے بن رات بھرتا رہے جیویں  
 عمر میری بے وفا! ملدی پئی  
 رُوح میری بے چین ہے تیرے لئی  
 فتنوس دیکھ راگ نوں آج گائے گا  
 عشق دی اس لاث تے بل جائے گا  
 سپیاں نوں چیر کے آجاؤ را  
 رات باقی بہت ہے نہ جاؤ را  
 را کھ ہی اس راگ دا انجام ہے  
 فتنوس دی اس را کھ نوں پر نام ہے  
 رنج کے امیر جدوں پھر روئے گا  
 پھر نوں فتنوس پیدا ہوئے گا

[میری تقدیر میرے لیے لکھ جاؤ]

میں تمہارے بغیر تمہارے لئے جی رہی ہوں  
 آج دھیا چاندنی بھی نہیں ہستی  
 جس طرح بہار کے بغیر پھلوں میں رس نہیں آتا  
 عمر بھر کا عشق بے آواز ہے  
 میرا ہر نغمہ میری آواز ہے  
 میرے حرف یوں تڑپ اٹھتے ہیں  
 جس طرح رات بھر تارے ٹلکیتے ہوں  
 بے وفا! میری عمر ختم ہو رہی ہے  
 میری روح تمہارے لیے بے چین ہے  
 آج نقشوں دیکھ راگ گائے گا  
 اور جل جائے گا عشق کی اس لو پر  
 راگ ہی اس راگ کا انجام ہے  
 نقش کی اس راگ کو پر نام

پھر اگلے برس کا جیت آنے والا تھا۔۔۔ اس کے وعدوں کا نہیں قسمت کے وعدوں کا مہینہ۔۔۔ یہ  
 1954 کا جیت تھا جب یہ نظمیں لکھیں

## دوپٹے

جن امبراں وچ نسل نسل بستے تارے  
 ماگھ دے جے مکر نوں آج بھگن پیا بنگھارے  
 جند میری دے لکھاں اوہ بٹے اک چنگ پئی او گھنے  
 تلے توں آج پون جوا بھی بھردی پئی ہنگارے  
 جند میری دے پترے اتے دوا کھر اس دا ہے

دو اکھراں نوں پونجھ نہ سکے ہتھ عمر دے مارے  
 سو جنتاں دیاں بھینڑاں وچوں کھہڑے کوئی ننگھے  
 متھے وچوں منی نہ اترے، گنجیاں لاہ لاہ مارے  
 دو پلکاں اج کج نہ سکن اکھیاں دی اوریواں  
 مناتے دو لیکاں پاگئے دو پٹے اج کھارے  
 [میری رُوح کے تنکوں کے چھپے ایک چنگاری اونگھ رہی ہے  
 نیلے سے چلنے والی ہوا آج ہنکارے بھر رہی ہے  
 میری رُوح کے پتر پر اس نے دو لفظ لکھے  
 عمر کے شکست خوردہ ہاتھ ان لفظوں کو مٹانہ سکے  
 آنکھوں میں تم سے ملنے کی جو حسرت ہے انہیں دونوں پلکیں بھی نہیں ڈھک سکتیں  
 دو کھاری قطرے آج چہرے پر دو لکیریں ڈال گئے۔۔۔

## مہکن۔۔۔ چتر

پورب چلھا بالیا، بھوکاں مارے پون  
 کھے دھنداں ہلیاں، جیوں دھوئیں چکی دھون  
 کرناں ہوئیاں، اچیاں جیویں لاٹاں نکل آؤں  
 سورج دھریاں ہانڈیاں، ڈھپاں گندھی تون  
 دھرتی انگن لپیا، گکر لگی چون  
 اُسر آئیاں، پیلیاں جیویں موہڑے لگی ڈاہون  
 مہکن، مہو، ادا نکلا، چتر کسی دون  
 زت کسے، رہے راہ تے، لگی پھل وچھون  
 چھیڑی ہیک بہار نے، سرگم ہوئی پون  
 آجا آج پردیسا! کل دی جانے کون

{ مشرق نے چولہا جلایا ہے اور ہوا پھونکیں مار رہی ہے  
 جو نہی دھوئیں نے گردن اٹھائی ساری دھند چھٹ گئی  
 کرنیں بلند ہوئیں جیسے الاؤ دہک اٹھے ہوں  
 سورج نے (چولہے پر) ہانڈی چڑھائی اور دھوپ نے آٹا گوندھا  
 بہار نے تان لگائی ہے پون سرگم بڑی  
 پردیسی! کل کی کسے خبر آج چلے آؤ۔۔۔ }

### ورھا

نچڑیاں اکھیاں۔۔۔ دھڑ چلی اٹلی  
 بھٹکن دی ترکال دے چیترا گیا!  
 بار بیگانی چلیاں جھینے زتاں زتیاں  
 ملیاں نوں ہو گیا سال دے چیترا گیا!  
 امبرو میڑا لپیا اگھڑ آئیاں کھتیاں  
 یاداں بدھی پال دے چیترا گیا!  
 کھنڈ سے نے جھاڑیاں لکھ دلیاں آوندیاں  
 بچھن کئی سوال دے چیترا گیا!  
 کیہ جاناں دن کبھلے اٹھیاں بھریاں عمر نے  
 سکھے تیل سنبھال دے چیترا گیا!  
 درھے نے پاسا پر تیا سکھے یاداں تیریاں  
 گھٹ کلجے نال دے چیترا گیا!  
 مزد کے ایس نہا ٹھٹے میں دیوا دھریا تین سو  
 پینٹھ بتیاں بال دے چیترا گیا!



[چیت کے آنے اور ساحر کے نہ آنے کی کیفیت کو بیان کرتی یہ نظم ایک سال کی جدائی کا نوحہ بن جاتی ہے۔۔۔۔۔]

(آنسو سے بھری) آنکھیں نچڑگئیں پھاگن آخری شام بیت چلی چیت کا مہینہ آ گیا  
چھ کی چھڑتیں بیگانے علاقے کی طرف چلی ہیں ملے ہوئے ایک سال ہو گیا چیت کا مہینہ آ گیا  
تمام یادوں کو کلیجے سے لگائے ہوئے سال نے اپنا رخ تبدیل کیا ہے چیت کا مہینہ آ گیا  
اس دہلیز پر میں نے دوبارہ تین سو پینسٹھ تیوں کا دیا جلا کر رکھا ہے چیت کا مہینہ آ گیا]

### چیت چڑھیا

آج نیلے دگدگی پون وے!  
کھوہ دیاں ٹنڈاں دائر ان پے سال مہینے بھون وے آج چیت چڑھیا۔۔۔  
آج پوناں وچ ٹنگدھ وے!  
بھکن نکا بھکن دا پر ابے نہ نکا پندھ وے آج چیت چڑھیا۔۔۔  
آج نوری ہو گئی وا کھ وے!  
جو پھگلوں آج چیت بنیا کل نوں بنے وسا کھ وے آج چیت چڑھیا۔۔۔  
آج زبھیں ساوا بھرو وے!  
کل دا بھکن چیت کولوں باراں کوہ آج دور وے آج چیت چڑھیا۔۔۔  
آج مولے جتر نا بن وے!  
عمرادی اس جڑھی اتے گیزے گز دے جان وے آج چیت چڑھیا۔۔۔  
آج صبر کتے کھیت وے!  
جند آئی وچ سانجھ لے آج جد میری دا بھیت وے آج چیت چڑھیا۔۔۔

[آج نیلے میں ہوا چل رہی ہے کنویں کے ڈولوں کی طرح سال مہینے گھوم رہے ہیں رے! آج چیت کا

مہینہ آ گیا۔۔۔۔۔

آج ہواؤں میں خوشبو ہے پھاگن کا مہینہ ختم ہو گیا لیکن ابھی پھاگن کی مسافت ختم نہیں ہوئی آج چیت

کا مہینہ آ گیا۔۔۔۔۔

آج درختوں پر سبز پڑا ہے آج کا پھاگن چیت کے مہینے بارہ کوس دور ہیں رے آج چیت کا مہینہ

آ گیا۔۔۔۔۔]

## چتر

آوندے تے نگھ جاندا تیرے قولوں دا مہینہ

میلاں دے میل لپے ریتاں دے نال اٹے

جیوں ڈاچیاں نوں بدھی تلی دا واج آوند۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

کوہاں دے کوہ کالے ویرانیاں دے تے ہے

جھونکا بہار دا جیوں بکسوں اڈ آوند۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

انجے ہی ہتھ تیرا ہتھوں دے کول ٹھکدا

لکھاں ہنیریاں وچ ٹوہنیاں پھڑاند۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

دل دا چراغ لے کے منہ تیرا میں ڈھونڈاں

نچھے ہوئے سوراں نوں فیر بال جاندا۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

سجھے طلسم کھلے پریاں دے دیس چنیدے

صدیاں توں ستیاں شاہزادیاں جگاندا۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

دسدی ستمول و نیا ہوشاں نوں مٹھون دیندی

تیریاں ہی قولوں دا حرف بٹ جاندا۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

لکھاں سوال پنچھاں دیندا نہ کوئی ہنگارا

ہونٹھاں دی جیس پی کے اکھیاں ٹھکاندا۔۔۔ تیرے قولوں دا مہینہ

[آتا ہے اور گزر جاتا ہے تیرے وعدوں کا مہینہ

میلوں کے میل ریت سے اٹے پڑے ہیں جس طرح اونٹنیوں کو بندھی تھنٹی کی آواز آتی ہے یوں آتا ہے تیرے وعدوں کا مہینہ

کوسوں کے کوس کالے ویرانیوں کے دروازے تیرے وعدوں کا مہینہ بہار کے جھونکے کی طرح ہے جو کہیں اور سے اڑ کر آتا ہے

میں تجھے دل کا چراغ لے کر ڈھونڈتی ہوں تجھے ہوئے سورجوں کو پھر جلا جاتا ہے تیری وعدوں کا مہینہ  
پریوں کے دیس کے سارے ظلم کھلتے ہیں صدیوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگاتا ہے تیرے وعدوں کا مہینہ

ااکھوں سوال پوچھتی ہوں لیکن کوئی ہنکارا نہیں بھرتا ہونٹوں کا درد پی کر نظریں جھکا لیتا ہے تیرے وعدوں کا مہینہ۔۔۔۔۔}

## چتر

سورج کیستی کندہ سیلے سانجھ کے آج مٹکن بدھی پنڈ  
ایہدوی گلیاں تن سوہنے سہ دہاڑاں ہنڈھ  
چتر پائی آن کے اک ہو رو رہے دی گنڈھ  
آج فیرو چھوڑا آکھدا آجیہے زتاں چھنڈا  
"سکھے راتاں میریاں میں اک نہ دتی ونڈ"  
میرے جن کیستی کندہ  
سکھے یاداں سانجھ کے آج عمر نے بدھی پنڈ

[سورج نے چنہ موڑی سارے تنکے اکٹھے کر کے آج پھاگن نے اپنی گٹھڑی باندھ ہم نے یہ تین سو پینسٹھ دن بھی بسر کر لیے

چیت نے آ کر ایک اور گانھ ڈال دی ہے

جدائی اپنی چھ کی چھ رتوں کو جھاڑ کر آج کہتی ہے: 'سب کی سب راتیں میری ہیں' میں نے ایک رات  
 بھی کسی کے حصے میں نہیں دی  
 میرے ساجن نے پیٹھ موڑ لی  
 ساری یادیں سمیٹ کر میں نے اپنی گھنڑی باندھ لی]

## خجک۔۔ دیوگ

چارے چشمے وگے  
 ایہہ کراں دی وادی ماہیا اس وادی وچ کجھ نہ اگے  
 سارے عشق سراپے جاندے اتجھے کوئی خُسن نہ پگے  
 سجھے راتاں ساکھی ہوئیاں اکھیاں بہہ بہہ تارے چکے  
 ایس راس دے پاترو لے ناٹ سے دا کھینڈن لگے  
 اپرا بے دار تاو ہوا وئی دکھانت جیہی سی اگے  
 ایہہ میں جاناں فیروں چاہواں تیرا عشق حیاتی نگے  
 ٹھلپا چکیا در کوئی لگے تیرا بول بھوئیں نہ ڈگے  
 انج کسے نہ وچھڑ ڈٹھا انج نہ کوئی ملایا گے  
 ہوئے خجک۔ دیوگ اکٹھے ہنجھواں دے گل ہنجھو لگے

[اس بنجر وادی میں میرے محبوب! کچھ نہیں اگتا  
 ہر عشق کو یہاں شراپ ملتا ہے اور سارے خُسن یہاں ہار جاتے ہیں  
 اس طرح کسی نے پھنڈ کر نہیں دیکھا نہ اس سے پہلے کوئی اس طرح ملا ہوگا  
 خجک اور دیوگ ایک ہو گئے ہیں اور آنسو آنسوؤں سے گلے مل رہے ہیں۔۔۔]

”رسیدی ٹکٹ“ میں میں نے ذکر کیا ہے کہ میری لقم ”ست در ہے“ (سات برس) چھپی تو کسی طرح

پاکستان میں پہنچ گئی۔ اسے سجاد حیدر نے پڑھا اور مجھے لکھا ”میں تمہیں ملنے کے لیے ہندوستان آنا چاہتا ہوں۔ تم بہت اداس دکھائی دیتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ اس کی باتیں کروں گا جس کے لیے تم نے نظم ”ست در ہے“ لکھی ہے“ سجاد وہلی آیا۔ اٹھارہ دن رہا۔ رات میرین ہوٹل میں اور دن بھر میرے پاس۔ میرا ہر حال میں دوست۔ اس وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ نظم صرف عشق کے طوفان میں سے ہی جنم نہیں لیتی یہ دوستی کی پرسکون ندیوں کے پانی میں سے بہتی ہوئی بھی آ سکتی ہے۔ سجاد جب واپس جانے لگا تو میں نے نظم ”وے پروسیا“ لکھی۔ یہ وہی نظم ہے جس کے بارے میں میں نے ابتدائی صفحات میں کہا ہے ”ستہرے (سندیسے) کی تمام نظمیں اس وقت کی ہیں جب میری محبت نے دیوانگی کا عالم دیکھا سوائے ایک نظم کے

## وے پروسیا!

پورب نے کچھ لکھیا، کیہوے امبر پھول  
ہتھ کنوراؤ وودھ داؤچ کیسرو تاگھول  
چانن لپی رات وے ست سنگدھاں ڈول  
امبر فسلان پکیاں تاریاں لائے بول  
آساں کتنی پٹھیاں تندنبک تے سول  
بھر بھر لچھے چین وے ریشمی انی جھول  
ار پی کس نے چندڑی چارے کنیاں کھول  
بدلاں بھر لنی اکھ وے پوناں بھر لنی جھول  
پچھی تو لے پرانوں ناہناں مکھیاں ڈول  
لے وے کھنڈ وکنڈڑے یاں رہ پوساڈے کول وے پروسیا!

1 عشق کے طوفان کی بجائے دوستی کی پرسکون ندیوں میں سے بہہ کر آتی ہوئی یہ خوبصورت نظم خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت کا اظہار کرتی ہے جب خوشبوئیں ڈال کر رات روشنی کی لپائی بھی کرتی ہے اور امیدیں ریشم کے بھر بھر لچھے بھی اُتارتی ہیں ایسے میں جب کوئی اپنی رُوح کسی کی نذر کر دیتا ہے تو بادلوں کی آنکھ بھرا آتی

ہے پرندے اڑنے لگتے ہیں اور ٹہنیاں ڈول جاتی ہیں۔ اور نظم کی آخری سطر رو پڑتی ہے: ہمیں بازار سے پرلے دویا پھر ہمارے پاس ہی رہ جاؤ پر دیکھیے! ]

## اشوکا چیتی

لکھاں نغمے تڑپ تڑپ کے آگن ہوٹھاں سیتی  
ساڈے نجیاں ساہواں اندر نجیاں پوناں گھولو  
دنیا دے اس ویہڑے اندر کھڑے اشوکا چیتی

اشوکا اور چیتی دو پھولوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا جنوبی ہندوستان کا ایک سرخ پھول ہے جس کی ایک ڈنٹھل میں سے تقریباً ستر ڈنٹھلیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر ڈنٹھل پر چار چار پتیاں لگتی ہیں۔ یہ پھول ہر موسم میں مل سکتا ہے۔

[چوڑے پتوں والے اشوکا چیتی کا سرخ پھول اس طرح ہے جیسے سمندر کی لہروں سے سورج طلوع ہو رہا ہو نہ یہ سورج بلند ہوتا ہے اور نہ نیچے آتا ہے دھرتی جیسے تھم گئی ہو اور وقت ساکت ہو گیا ہو تیرا پیارا اشوکا چیتی میرے دل میں کھلا ہے نظر کی ایک ڈنٹھل پر ستر خواب جڑے ہیں ہماری سچی سانسوں میں سچی ہوائیں گھولتا کہ دنیا کے اس آگن میں بھی اشوکا چیتی کھیلے

## کنیا کمار

شوہاں نوں پیار کرن والی اک کمار، جو دکھنی بھارت دی آخری چٹان کول ساگراں دے تنہم اتے  
ہزاراں ورھیاں توں پتھر دانت بنی شوہاں نوں اڈیک رہی اے۔ آکھدے نیں کہ کمار دی دانتے شوہاں دا  
ویاہ۔۔۔ دن ستھیا گیا سی۔۔۔ سو پر سار کسے کاں دے بولن توں پہلاں ویاہ ہونا ضروری اسی پر کسے دکھی نے  
کاں دی

جھوٹی آواز وچ کُرا داتے ویاہ دی گھڑی اٹھی گئی۔۔ کُمار دی دے ہتھ وچ پھڑے ہوئے چول تے  
 سندھور ڈلھ گئے۔ اوہ چول ہنس پتھر ہو کے ساگر دے کنکر بن گئے ہن۔ تے سندھور دے دلہن کر کے او تھوں  
 دی ساری مٹی لال رنگ دی ہندی اے

ساگر دے وچ ساگر ملیا کون کیراں پاوے  
 لہراں جیکن نیلم پریاں تھمر چھڑ دا جاوے  
 راتیاں جیکن روپ صراحیاں ہونٹھاں اُتے اڑیاں  
 کیسا سراپ دتوی سانوں بوند نہ پیتی جاوے  
 سارے شبن زمیں نے ڈلھے دونوں تلیاں خالی  
 پتھر بن کے اج کھلوتی تیری تنگتاں والی  
 تیرے منہ دا صدقہ سانوں جگ بیگانہ ہویا  
 بھری جوانی پتھر کر کے لاج عشق دی پالی  
 اس دھرتی دیاں لکھاں دھیاں میں نہ اک کُمار دی  
 عشق سے دا پتھر ہویا پتھر ہو گئی تیری  
 لکھاں عاشق پھڑ دے رہ گئے ملن گھڑی نہ آئی  
 جھوٹے کاں اہے نہ مکے بولن وارو واری  
 لکھاں بندھن بن کر لائے کاواں روپ وٹایا  
 نعتی وکدی واد وکیندا سکتہ ٹوڑ چلایا  
 چاول کنیاں پتھر ہوئیاں دیکھ اسدا جینا  
 منھا پھل عشق دی پٹنی کسے نہ دندی لایا

[ساگر میں ساگر ملا ہے انہیں کون جدا کرے

لہریں اس طرح ہیں جسے نیلم پریاں ٹھوہر ناج رہی ہوں  
 راتیں جیسے روپ کی صراحیاں ہوں ہونٹوں پر ٹھکی ہوئی

تو نے ہمیں یہ کیسا شراب دیا ہے کہ ایک بوند بھی نہیں پی جاتی  
 سارے شبن زمیں پر بکھر گئے ہیں دونوں ہتھیلیاں خالی ہیں  
 پتھر بن کر آج کھڑی ہے تیری شکنوں والی  
 صرف میں ہی نہیں اس دھرتی کی لاکھوں بیٹیاں کنواری ہیں  
 وقت کا عشق پتھر ہو گیا ہے جس نے عورت کو بھی پتھر بنا دیا ہے  
 لاکھوں عاشق وصل کی ساعت کو پکڑتے رہ گئے لیکن وہ ساعت نہ آئی  
 جھوٹے کوئے ابھی تک ختم نہیں ہوئے وہ باری باری بول رہے ہیں  
 چاول اور دانے پتھر ہو گئے ہماری زندگی تو دیکھو  
 عشق کی مٹی کا بیٹھا پھل کسی کو کھانا نصیب نہیں ہوا

## تو نہیں آیا

چیتر نے پاساموڑیا  
 رنگاں دے ملے واسطے مٹھلاں نے ریشم جوڑیا توں نہیں آیا۔۔۔  
 ہونیاں دو پہراں لسیاں  
 داکھاں نوں لالی چھوہ گئی ذاتی نے کنکاں چمیاں توں نہیں آیا۔۔۔  
 بدلاں دی دنیا چھا گئی  
 دھرتی نے بٹکاں جوڑ کے امبر دی رحمت پالنی توں نہیں آیا۔۔۔  
 رکھاں نے جادو کر لیا  
 جنگل نوں چھوہندی پون دے ہونٹھاں ج شہد بھر گیا توں نہیں آیا۔۔۔  
 اج فیر تارے کہہ گئے  
 عمراں دے مٹھلیں اچے وی ٹھٹھاں دے دیوے مل رہے توں نہیں آیا۔۔۔  
 کرناں دا جھرمٹ آکھدا  
 راتاں دی کوہڑی نیند چوں



حالے وی چائن جاگدا

توں نہیں آیا

[چیت نے رخ پلٹا ہے رنگوں کے میلے کے لیے پھولوں نے ریشم جوڑا تو نہیں آیا  
درختوں نے جادو کر دیا جنگل کو چھوٹی ہوا کے ہونٹوں میں شہد بھر گیا تو نہیں آیا  
آج پھر تارے کہہ گئے عمر کے محلوں میں ابھی تک محسن کے دیئے جل رہے ہیں تو نہیں آیا  
کمرنوں کا ٹھہر مت کہتا ہے راتوں کی گہری نیند میں چاندنی ابھی تک جاگ رہی ہے تو نہیں آیا۔۔۔]

## مان سرور

دل دامان سرور بھریا

تیریاں یاداں اکین آیاں جیویں ہنساں دی ڈاروے

راہواں نے آج کیسے ڈھوڑے

پانی چین چھہ کے کندھے اتھھی جیویں بہاروے

کمرناں جیویں مولی دیاں لڑیاں

میڈھی دے وچ گنڈن لگی رات ہوئی عیاروے

ست سرکھیاں مہندی گھولن

دھرتی دے ایس سالو دا پرہند اجائے لنگاروے

بھولا عشق ڈھوڑا جادو

ریت تھلاں وچ جمبا کھڑیا چن چن آں ہاروے

آج اڈیکیاں زخمی ہوئیاں

نہ کوئی تیری واج سنہدی نہ کوئی پوئے نہ ہاروے

دل دامان سرور بھریا

آلھیوں نیچے موتی چمکدی ایسے ہنساں دی ڈاروے

دل دامان سرور بھر گیا۔۔۔۔۔

[دل کا تالاب بھر گیا ہے تیری یادیں اس طرح آئی ہیں جیسے ہنسون کی ڈار آتی ہو  
سات تیسریں مہندی گھولیں، لیکن دھرتی کے اس سالو (چادر) کی وہجیاں اُڑی جا رہی ہیں  
دل کا تالاب بھر آیا ہے ہنسون کی یہ ڈار آنکھوں سے نیچے سوتی ٹخن رہی ہے  
دل کا تالاب بھر گیا۔۔۔۔۔]

### شوق صراحی

عشق مجھیںد اوس فی جندے کیلکین دیہوں گزارے  
جند کہے "میں پنے تیرے مہندی مال ہنگارے"  
عشق مجھیںد اوس فی جندے کیلکین نمین روندے؟  
جند کہے "میں لکھاں تارے زلف تیری وچ ٹندے  
عشق مجھیںد اوس فی جندے کیلکین ورھے بتائے؟  
جند کہے "میں شوق تیرے نوں ٹولاں دیس بندھ جائے"  
عشق مجھیںد اوس فی جندے گھاڑ کہیے کو چنگے؟  
جند کہے "میں زت جگر دی سکناں دے سالور نکے"  
عشق مجھیںد اوس فی جندے کرم کہیے کو کہیے؟  
جند کہے "تیری شوق صراحیوں ڈکھاں دے وار و پیتے  
عشق مجھیںد اوس فی جندے کیلکین عمراتی؟  
جند کہے "میں نام تیرے توں سداق بانی میتی  
عشق مجھیںد اوس فی جندے اماشق دا یوہ کھتا؟  
جند کہے "تیرا تھرا پنکھ ہسٹھ جیاں وار ہتا"

[عشق پوچھتا ہے زندگی! تو نے اپنے دن کیسے گزارے! زندگی نے جواب دیا "میں نے تیرے خواب"

مہندی سے سجائے ہیں

عشق پوچھتا ہے زندگی! میں کیونکر روتے ہیں؟ زندگی کہتی ہے "میں نے تیری زلف میں لاکھوں

تارے گوندھے ہیں

عشق پوچھتا ہے اے زندگی! تو نے یہ برس کیسے گزارے؟ زندگی کہتی ہے "میں نے تیرے شوق کی خاطر

کانتوں کے ملبوس پہنے

عشق پوچھتا ہے اے زندگی! گھاؤ کس حد تک اچھے ہیں؟ زندگی کہتی ہے "میں نے جگر کے خون سے

شگنوں کے سالو رنگے ہیں

عشق نے سوال کیا اے زندگی! تو نے کس طرح کے عمل کیے؟ زندگی جواب دیتی ہے "تیری شوق صراحی

میں سے ڈکھوں کا دارو پیا ہے۔۔۔۔۔]

1956 کے آخر میں سنیوڈے کو ساہتہ اکیڈمی کا ایوارڈ ملا تھا۔ من کی جس کیفیت سے میں ان دنوں

گزری اس کا تفصیلی حال "رسیدی ٹکٹ" میں لکھا ہے۔ ایک کیفیت اس میں لکھنے سے رو گئی تھی۔۔۔ ایک دن من کی آگ میں جل کر ایک نظم لکھ رہی تھی۔

"رات میری جاگتی ہے تیرا خیال سو گیا۔۔۔۔۔"

کہ ایک سطر سے اگلی سطر تک پہنچنے کے دوران میں ہاتھ میں پکڑے قلم کے ساتھ بے خبری میں اپنی

بانہوں اور ٹانگوں پر کچھ لکیریں کھینچتی رہی۔ پھر نظم لکھی تو کچھ ہوش آیا۔ دیکھا۔۔ میرے بازو اور ٹانگوں پر کئی

سو بار ساحر ساحر لکھا ہوا تھا۔ اس دن میرے ہونٹوں نے لفظ "ہنسی" کا بھیا تک پن دیکھا۔ میں ایک نظر اس

کاغذ کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا "خیال تیرا سو گیا" اور ایک نظر اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کی طرف

دوڑا رہی تھی جہاں روئیں روئیں پر اس کا خیال جاگ رہا تھا اور اپنے آپ پر مجھے ایک عجیب بھیا تک ہنسی آئی۔

یہ نظم 1957 کے شروع میں لکھی تھی لیکن کتاب "اشوکا چیتی" چھپ چکی تھی اسی لیے یہ نظم 1959 میں

کتاب "کستوری" میں چھپی۔

## رات میری جاگدی

رات میری جاگدی تیرا خیال سوں گیا۔۔۔۔۔  
 سورج دا دکھ کھڑا سی کرناں کسے نے تو زیاں  
 تے جن دا گونا کسے امیر توں اج او پیڑا  
 کیوں کسے دی خیند نوں چنے بلا داوے گئے  
 تارے مٹو تے رو گئے امیر نے بوباؤھولیا  
 ایہہ زخم میرے عشق دے سینے سی تیری یاد نے  
 اج توڑ کے نالکے اماں دھاگر دی تیتوں موڑیا  
 نقی کو رو دناک ہے اج ہیز میرے عشق دی  
 سمھناں اڈیکاں دا اماں پتر الیہدے چوں پاریا  
 دھرتی دا ہوکا نکلیا آسمان نے سسکی بھری  
 مصلن داسی اک قافلہ کتے تھلاں چوں لڑیا  
 کنگ دی اک مہک سی بارود نے اج پل لئی  
 ایمان سی اک امن دا او وی کتے وکھدا پیا  
 دنیا دے چائن نوں اے صدیاں اٹھبے دیندیاں  
 اس پیار دی رتے تے تاساں نفرت نوں کیلن چیا  
 انسان دا ایہہ خون ہے انسان نوں تھکھدا پیا  
 جیسی دے ہونھ نوں سولی نے کیلن جیسا؟  
 ایہہ کس طرح دی رات سی اج دوڑ کے لٹھی جدوں  
 ۔۔۔ جن دا دکھ مٹھل سی ہج اس دے ہونھاں آگیا  
 سورج دا گھوڑا نکلیا چائن دی کانھی کہہ گئی  
 عمرادے پنڈے ماروا دھرتی دا پاندھی رو پیا  
 ایہہ رات کیوں اج ترہہ گئی کالج ہے کجھ کہندی پئی

کدھرے کسے وشواس دا شاید ہنسا چمکیا  
 راتاں دی اکھ پھر کدی خورے ایہہ چنگا شگن ہے  
 امبر دی اُچی کندھ تے چاند دا تیل لٹکیا  
 کیہ کرے ہانی کوئی پھلاں دی مستاماروی  
 انسان دی تقدیر نے انسان نوں اج آکھیا:  
 خستیاں کے عشقاں والیو اُچا دو۔۔ لیا ووموڑ کے  
 وشواس دا اک جاترہ جتھے وی کدھر گز گیا

[رات میری جاگتی ہے تیرا خیال سو گیا۔۔۔۔۔]

سورج کا درخت کھڑا تھا کسی نے کرنیں توڑ لیں اور کسی نے چاند کا گونا آسمان سے اڈھیر لیا  
 کسی کی نیند سپنے کیوں باوا دے گئے تارے تکتے رہ گئے آسمان نے اپنا دروازہ بھیڑ لیا  
 میرے عشق کے ان زخموں کو تیری یاد نے سیاتھا آج ناکے توڑ کر ہم نے اس کا دھاگہ بھی تجھے لوٹا دیا  
 میرے عشق کی کتاب کتنی دردناک ہے جتنے انتظار تھے ان کا ورق ہم نے اس میں سے پھاڑ لیا  
 دھرتی نے آہ بھری آسمان نے سسکی لی جب پھولوں کا ایک قافلہ جلتے صحراؤں سے گزرا  
 گندم کی ایک مہک تھی اسے بارود نے پی لیا اس کا ایک ایمان تھا آج وہ بھی کہیں یک رہا ہے  
 صدیاں ابھی تک دنیا کی روشنی سے شکوے کر رہی ہیں کہ تم نے پیار کے اس موسم میں نفرت کا  
 بیج کیسے بویا؟

یہ انسان کا خون ہے اور انسان سے پوچھ رہا ہے کہ مہیسی کے سچے ہونٹ کو سولی نے کیسے چوما؟  
 یہ کس طرح کی رات تھی کہ آج جب دوز کر گزری تو چاند کا ایک پھول (اس کے) پیروں تلے آ گیا  
 سورج کا گھوڑا ہنہٹایا روشنی کی کانٹھی اتر گئی عمر کی مسافت طے کرتا ہوا ایک مسافر رو پڑا  
 یہ رات آج کیسے سہم گئی اور تاریکی بھی کچھ کانپ رہی ہے شاید کہیں کسی یقین کا جگنو چمکا ہے  
 راتوں کی آنکھ پھڑ پھڑا رہی ہے شاید یہ نیک شگون ہو آسمان کی اونچی دیوار پر روشنی کا تنکا چمکا ہے  
 کوئی نہیں کیا کرے وہ پھولوں کی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہے انسان کی تقدیر نے آج انسان سے کہا:

مسن اور مشق والو! جاؤ اور یقین کا جاندار تمہیں جہاں کہیں بھی ملے اسے لے آؤ۔۔۔

ساحر کی محبت میں میں نے اپنے فن کا دو عالم دیکھا ہے۔ جب بچوں، لیلی، لیلی، پکارتا تو، لیلی بن جاتا ہے جب آدمی خود سے خدا ہو جاتا ہے۔ کتاب دستور کی سب سے پہلی نظم 'چیت' اسی کیفیت کی نظم ہے۔۔۔ اپنے ہی مشق کی بلندی کے فخر سے بھری ہوئی اور دوسری نظم 'چائن دیاں پھٹاں' (روشنی کے پھینٹنے) بھی زندگی سے منجمل یادوں پر فخر کرتی ہوئی۔

## چتر

چتر داؤنجا را آیا چنگی موڑھے چائی وے ا  
اساں ابا جی پیارا تھوری دیہندی رہی لوکاں آے  
ساڈ اوچ مبارک سانوں نکل بسدی سی جیہوی دنیا  
اوہ دنیا آج ساڈے کولوں چنگی منگن آئی وے  
برہا دا اک کھل بلوری چندری دا اساں سرمد پیشا  
روز رات نوں امہ آئے منگد اک سلائی وے  
دواکھیاں وے پانی اندر نکل اساں جوہ پنے گھولے  
ایہہ دھرتی آج ساڈے دیزے نچنی رنگن آئی وے  
کلیہ کان دی نچکی ساڈی چند دھنوں ہڑا کھنڈے ڈاپنے  
ساڈے گھراں یاد تیری دی چنگ پر اوہی آئی وے

[ہمارا بیو پار میں مبارک ہو کل جو دنیا ہم پر ہستی آج وہ ہم سے چنگی (بھر حصہ) مانگنے آئی ہے  
کل ہم نے آنکھوں کے پانی میں چھ خواب گھولے یہ دھرتی آج میرے آگن میں خنر پار گئے

آئی ہے

ہماری یہ تنکوں کٹیا ہم زندگی کا نو بڑا کہاں بچھا میں ہمارے گھر تمہاری آج مہمان بن کر آئی ہے

میں ہماری آگ مبارک سورج ہمارے در پر آیا ہے اس نے ہم سے ایک کونکہ مانگ کر آج اپنی  
آگ سلگائی ہے۔۔۔۔۔]

## چائن ویاں جھٹاں

چائن والا ک جھٹھہ سی  
تارے بھجراں بھروسے چلن دہنگیاں  
جھٹاں چٹیاں جنتے  
چپتے آگیاں تاں چندوں مہنگیاں  
جھٹلی ہی کندیا لڑی  
امیر پالا لڑیا جھٹکی لہری  
جھٹلی جنتے میرے  
لکھدی لکھدی رات کہانی پائی  
تازک پونے والوں  
تازک چو بھی نہ لئی دوسر ہوئی  
یاں ایں بھائی بالیا  
لکھ بچائے پلے لکھی چھوٹی

[زوح پر چھینٹے پڑے ہیں زوح سے بھی مہنگی باتیں یاد آتی ہیں  
دھرتی کا تنوں بھری تھی آسمان کا پلو (ان کانوں سے) اُلجھا کھونچا لگ گیا  
جاتے جاتے رات جو کہانی کہہ گئی اسے پوچھ میری زندگی!  
دل کی پوریں (مٹی) تازک ہوتی ہیں انکروں نے سوئی چھوٹی اور وہ آر پار تر گئی  
یادوں نے الاؤ بھڑکایا لکھوا سن بچایا پھر بھی اس کا پلو (اس آگ سے) چھو گیا۔۔۔  
ساتھ کے ساتھ پھر بھی ملاقات ہوئی تاریخ مہینہ کچھ یاد نہیں لیکن جو کچھ یاد ہے وہ یوں ہے۔۔۔ وہ

ساتھے ہوتویوں ہوتا ہے جیسے کبھی دور گیا ہی نہیں اور دور ہوتویوں ہوتا ہے جیسے کبھی پاس آیا ہی نہیں۔ "کستوری"  
میں اس جوگ، جوگ کی کئی نقلیں شامل ہیں۔

## فیرتیوں یاد کیا

فیرتیوں یاد کیا 'آگ' نوں پٹیا اسان  
عشق پیالہ زہر دا 'آگ' ٹھٹھ فیر سنگیا اسان  
گھول کے سورج اسان دھرتی نوں ڈوہا دے لیا  
تاریاں رے نال کوٹھا 'سنگن' دالہ بیا اسان  
دل وے اس دریاؤ نوں اتنا پار کرتا ہے اسان  
ایس ڈانڈے جگ وے 'پٹنگے' نوں فرمھنکيا اسان  
فیر چنبا سپیاں دارا تے بھر کھوڑا رہیا  
عشق دی اس ڈھنگھنی تے 'عمر' نوں پنجا اسان

{ پھر تمہیں یاد کیا 'جیسے' آگ کو چوما ہو  
زہر کے عشق پیالے سے ہم نے ایک گھونٹ اور مانگا  
ہم نے سورج کو گھول کر اس میں دھرتی کو رکھ لیا  
آسمان چھت کی 'تاریاں' سے لپائی کی  
پھر خوابوں کا چہارات اٹھتا رہا  
عشق کے چنے میں ہم نے اپنی عمر کو ڈھنسا

## عشق

جیوں صدیاں دی تواریخ چوں پتر سے پائیاں



اچ تھتاں تے رُتاں اُتے دُھوڑ دیاں سو تھیاں  
 اچ میرے پیراں نوں چمن بھیلے دیاں جو ہاں  
 اکھیاں دے وچ ساگر کنہن چن کتوں نہ سو ہاں  
 میرے ساد وچ تڑپ اٹھیاں ریت تھلاں دیاں لوڈاں  
 اکوچی لاٹ ڈھونڈا بھند بہاں دا دھواں  
 لکھ نطشے کدھروں آکے میٹ جان بھ لہاں  
 عشق سدا مبر وچ رکھدا اس دھرتی دیاں نیہاں

[جس طرح صدیوں کی تواریخ میں سے سینکڑوں ورق پھٹ جاتے ہیں اسی طرح موسموں پر ڈھول کی  
 سوتھیں جم گئی ہیں  
 جنگل کی تمام چراگاہیں آج میرے پیروں کو چوم رہی ہیں آنکھوں میں سمندر کا نچتے ہیں پھر کہیں سے  
 (اُس کی) خبر نہیں آتی  
 ریگستانوں کے رونمیں میری سانسوں میں تڑپ اٹھے ہیں سارے مذہبوں کا دھواں (محبت کی) ایک  
 ہی تچی لو کا مستلاشی ہوتا ہے  
 اکھ نطشے آکر ساری بنیادوں کو مٹا جائیں عشق اس دھرتی کی بنیادیں ہمیشہ آسمان میں رکھتا ہے۔

## ملاقات

رات گزوی نے دعوت دتی  
 تارے جیکن چول چھزیندے کس نے دیگاں چا بڑیاں  
 کسی نے آنکھیں چن صراحی  
 چائن گھٹ شراب داتے امیر اکھاں گا بڑیاں  
 دھرتی دا اچ دل پیا دھڑکے  
 میں سنیا اچ ناہناں دے گھن پھل پراہونے آنے دے

اس دے آگوں کیہ کچھ لکھیا  
 بہن! یہاں تقدیراں کولوں کیہ دیکھن جائے دے  
 عمر دے اس کا غذا تے  
 عشق تیرے اگلوٹھالایا کون حساب چکائے کا قسمت نے اک نذر لکھیا  
 کہندے میں کوئی آج رات نوں اوہو نذر گائے گا  
 کلپ بر چھو دی چھو دیں بہہ کے  
 کام دھین دا زوہہ ہسما کس نے بھریاں دوہنیاں کیہڑا سنے ہوا دے ہو کے  
 چل نی چندے اچلیے سانوں سدن آئیاں ہونیاں

[رات کی تاری نے دعوت دی تارے چادلوں کی طرح صاف کیے گئے کسی نے دیکھیں چڑھائی ہیں  
 چاند کی صراحی سے چاندنی کی شراب کا گھونٹ پی کر آسمان کی آنکھیں گہری ہو گئیں  
 آج دھرتی کا دل دھڑک رہا ہے سنا ہے کہ شاخوں کے گھر آج پھول مہمان بن آئے ہیں  
 اس سے آگے کیا کچھ لکھا ہے (یہ بات) اب تقدیر سے پوچھنے کون جائے دے!  
 عمر کے اس کاغذ پر تمہارے عشق نے اگلوٹھا لگایا ہے (اس کا) حساب کون چکائے گا  
 قسمت نے ایک نذر لکھا کہتے ہیں آج رات کوئی اسی نذر کو گائے گا  
 ہوا کی آہیں کون سنے زندگی اچل ہمیں تقدیر بلانے آئی ہے]

## میل

میرا شہر جدوں توں چھوہیا  
 امبر آکھے مٹھاں بھر کے آج میں تارے داراں  
 دل دے چین میلہ بڑیا  
 راتاں جیوں ریشم دیاں پریاں آنیاں منہ قطاراں  
 تیرا گیت جدوں میں چھوہیا

کاغذ اُتے اُگھڑائیاں لکیراں  
 سورج نے آج مہندی گھولی  
 تکیاں اُتے رنگیاں کھیاں آج دونوں تقدیراں

[دل کے چمن پر میلہ لگا ہے  
 راتیں جیسے ریشم کی پریاں ہوں قطار اندر قطار اتر آئیں  
 جب میں نے تیرے گیت کو چھوا  
 کاغذ پر زردی کی لکیریں ابھر آئیں  
 سورج نے مہندی گھولی ہے  
 آج دونوں تقدیریں میری ہتھیلیوں پر رچی گئی ہیں]

## غموگر

ایسہ کون سوٹا بلی سندی  
 تے کون سو ہتھاں گھڑیا۔۔۔ جد چر خوا  
 ایسہ کون سو مکھل کپاہ دے  
 میں جھولی دے ویج پایا۔۔۔ تیرا نہو ہڑا  
 عمرادی اک مائل ونہندی  
 صدقاں والا پایا۔۔۔ اکو منکروا  
 ورھے ورھے دامنڈ حالہندا  
 ملکن ویج نہ آوے۔۔۔ تیرا نہ ہڑا  
 کاک مریندا جھٹی لوکا  
 تندا ہے زٹی۔۔۔ وقت نکھڑا  
 کت جا اک میل دی پونی

گھو کر دیندی جاوے۔۔۔ اک سنبھرا

[اس نظم میں وصل اور فراق کی یہی ملی غلی کیفیت چرخی کے پورے عمل سے واضح ہوتی ہے۔ شیشم کا یہ کیسا درخت ہے اور کون سے ہاتھوں نے رُوح کے اس چرخی کو تراشا ہے۔ اس چرخی پر ہر ہاکی لچھیاں شتم ہونے میں نہیں آتیں۔ چرخی کی گھو کر کا سند یہ محبوب کے وصال کی ایک مسلسل ٹوک ہے]

## یادوں

آئیاں سی یادوں تیریاں، محفل لگا کے پٹھیاں  
 موسمِ بقی چند واپی رات بھر جلدی رہی  
 سورج دے منہ فوں دیکھ کے تیرا بھلیکھا پے گیا  
 جان لگی رات اُس فوں ٹھٹ کے ملدی رہی  
 دنیا دے اس نظام نے 'بیراں فوں پائیاں پیڑیاں  
 میں۔۔۔ قلم دے ہتھ سپینے عمر بھر گھلدی رہی  
 دنیا دی کا رخ فوں اسیں ساری عمر رنگدے رہے  
 اک کرن تیرے عشق دی راتاں دے وچ زلدی رہی  
 دنیا دے سارے رہنما راہواں فوں توڑن جان دے  
 اک تند تیرے پیار دی ہے دھرتیاں ولدی رہی  
 بہت وڈا غم و لاں دا پروڈیرا غم ہے ایہہ  
 کس پیار وری چیز کیوں بیراں دے وچ زلدی رہی

[تیری یادیں آئیں، محفل لگا کر بیٹھیں رات بھر رُوح کی موسمِ بقی چلتی رہی  
 سورج کے چہرے کو دیکھ کر تیرا خیال آ گیا، رخصت ہوتے وقت رات اس سے اچھی طرح  
 بغل گیر ہوتی رہی]

دنیا کے اس نظام نے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں میں عمر بھر قلم کے ہاتھ اپنے سندیسے بھیجتی رہی  
 دلوں کا غم بہت بڑا ہے لیکن اس سے بڑا غم یہ ہے کہ پیار جیسی چیز پیروں میں کیوں رلائی جاتی ہے]

## عمر دی رات

عمر دی اک رات سی  
 ارمان رہ گئے جاگدے قسمت نوں نیند آگئی  
 رات دی چٹگیر وچ چند جدوں چنیا کے  
 ہتھوں چٹگیر ڈگ پئی  
 صدق سی کجھ انج دا  
 جتھے وی سر نہ کالیا دہلیز جاپی اوس دی  
 عشق کل جان ہے  
 دھرتی کز اوساک جے آسمان دارشت ہے کیہ  
 موت توں واقفہ اسیں  
 اکثر ایہہ ساڈی زندگی اوس دا ذکر کردی رہی  
 رات نوں آسمان توں ٹکھدا ہے تارا جدوں وی  
 آوندی ہے یاد آ پئی۔۔۔

[عمر کی اک رات تھی (اُس رات) ارمان جاگتے رہ گئے لیکن قسمت کی نیند آگئی  
 ہمارا صدق کچھ ایسا تھا کہ جہاں بھی سر نہ کالیا اُسی کو تیری دہلیز جانا  
 ہم موت سے آگاہ ہیں ہماری یہ زندگی اُس کا اکثر ذکر کرتی رہی ہے  
 جب بھی رات آسمان سے کوئی تارا ٹوٹتا ہے اپنی یاد آتی ہے۔۔۔]

## ونج

آج چن سورج 'جندوا' پنے ونج کر دے نیں  
 تے چانن دے نال دونوں 'چھابے' اُردے نیں  
 فیر سانوں کیوں تیری دلیز چیتے آگئی  
 لکھاں خیال پوڑیاں چڑھدے اُتر دے نیں  
 رات نوں سپنا ترانیاں تے سوئی دے گیا  
 آج فیر دل دی جھیل وچ 'کچھ' بنس تر دے نیں  
 ایہہ بات تیرے عشق دی 'کیکن' مکاواں گے اسیں  
 ہر رات نوں تارے ہنگارا آں بھر دے نیں  
 دے مار و تھلاں دا انت نہ پیندا کوئی  
 دے سارے قافلے اس راہ گزر دے نیں  
 ایہہ بے زندگی ہر وار اپنے قول نوں  
 فیر ساڈے جیہے اعتبار کر دے نیں

[پھر کیوں ہمیں تیری دلیز یاد آگئی؟ لاکھوں خیال بیڑھیاں چڑھ اُتر رہے ہیں  
 ہم کیسے تیرے اس عشق... کو پورا کریں گے ہر رات 'ستارے' آکر ہنگارہ کرتے ہیں  
 رات کے ریگستانوں کا کوئی انت نظر نہیں آتا... تمام قافلے اسی راہ سے گزرتے ہیں  
 زندگی ہر بار عہد توڑ دیتی ہے اور ہمارے جیسے کچھ لوگ دوبارہ اعتبار کر لیتے ہیں]

## قلم دا بحیت

جد کدے گیت میرا کوئی کدھر نہ گائے گا  
 ذکر تیرا آئے گا... توں نہیں آیا...

چھوڑ کے چھاواں نوں جو راہواں نوں چٹے گا کوئی  
 اوس نوں ہر قدم میرا نظر آؤ نہ اجائے گا۔۔۔  
 مان سچے عشق دا ہے نثر دا دعویٰ نہیں  
 قلم دے ایں بھیت نوں کوئی علم والا پائے گا  
 شہرتاں دی ڈھوڑ ڈاڈی ڈھوڑاں نجیاں دی بڑی  
 رنگ دل دے خون دا کوئی کیوں بدلانے گا۔۔۔۔  
 عشق دی دہلیز تے سجدہ کرے گا جد کوئی  
 یاد فیر دہلیز نوں میرا زمانہ آئے گا  
 توں نہیں آیا۔۔۔۔

[جب کبھی کوئی کہیں بھی گیت میرا گائے گا  
 ذکر تیرا آئے گا۔۔۔ تو نہیں آیا۔۔۔  
 چھوڑ کر چھاواں کوں چوے گا کوئی جو راستے  
 ہر قدم میرا سے دکھلائی دے جائے گا۔۔۔  
 مان سچے عشق کا ہے فن کا کچھ دعویٰ نہیں  
 یہ قلم کاراں کوئی علم والا پائے گا  
 شہرتوں بدنامیوں کی دھول ہے ظالم بہت  
 رنگ دل کے خون کا کیسے کوئی بدلانے گا۔۔۔۔  
 عشق کی دہلیز پر سجدہ کرے گا جب کوئی  
 یاد پھر دہلیز کو میرا زمانہ آئے گا۔۔۔  
 تو نہیں آیا۔۔۔۔]

اوپر والی نظم ”قلم کاراں“ میں نے اس وقت لکھی تھی جب لاہور بک شاپ کے مالک سردار جیون سنگھ جی  
 نے اپنے ماہانہ اخبار ”سہ سہ سہ سا چار“ کے چھ شمارے امرتا پریتم نمبر کے طور پر چھاپے تھے اور مجھے بھی اپنی  
 طرف سے کچھ لکھنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے یہ نظم لکھی جو ایک طرح سے میری سوانح تھی۔ اس عرصہ میں ایک





ہم حسرت کے دھاگوں کو جوڑ کر چادر بنتے رہے، برہا کی ہچکی میں بھی شہنائی کی آواز سنتے رہے  
 برسوں کی مسافت کو چیر کر تیری آواز آئی ہے، سسکتے ہونٹوں نے گلنوں کی پہلی سطر گائی ہے۔۔۔۔۔]

”کستوری“ میں چھپی کچھ اور نظمیں بھی ساحر کے لیے ہی ہیں۔ لیکن نظم ”ہچکی“ صرف مایوسی ہی کی نہیں  
 بلکہ موت کے احساس کی حدوں کو بھی چھو کر لکھی ہوئی نظم ہے۔ مایوسی کو آخری تقدیر مان کر۔

## ہچکی

ہونٹ کچھ آسمان دے ہلے پئے، کول ہو کے سُن ذرا آج دھر ہے !  
 ایہہ کسے عیسیٰ دے اوہیو حرف نہیں، جواو بنے سولی نوں آکھئے سن کدے۔۔۔۔  
 رات دی بھٹھی نوں کس نے بالیا، کھولدی ہے دیگ سورج دی کیویں  
 بات ہے دنیا دی دنیا والیو، دیگ وچ پھر بیٹھنا ہے عشق نے۔۔۔۔  
 ذکر سی مارو تھلاں دے کرم دا، رک گیا سا ہواں دا چلدا قافلہ  
 لکھ رہیا اے کون سا ڈامر شیٹ، رہیا تارا کوئی آسمان تے۔۔۔۔  
 ہتھ دی مہندی کسے نے پونجھ کے، فیر بانہواں توں کلیر اکھولیا  
 کون عاشق فیر دا نا بادا، چار ہیا تیراں نوں ہچکی سوئپ کے۔۔۔۔  
 سامنے رکھاں دیاں قبریں کئی لاش ہے، مٹھلاں دی موہڑا دے دیو  
 قلم نے کجیا ہے جیکن عشق نوں ذکر نہندے رہن گے اس کفن دے۔۔۔۔

[زمین! قریب ہو کر سن آج آسمان کے ہونٹ ہل رہے ہیں  
 یہ کسی عیسیٰ کے وہی لفظ ہیں جو اس نے سولی سے کہے تھے  
 رات کی بھٹی کس نے دھکائی ہے، کیسے سورج کی دیگ اُبل رہی ہے  
 دنیا والو! یہ دنیا کی بات ہے، عشق کو پھر اس دیگ میں بیٹھنا ہے  
 ریگستانوں کے کرم کا ذکر تھا، سانسوں کا چلتا قافلہ رک گیا ہے]

آسان سے ایک تار اٹوٹا ہے، کون ہمارا مرثیہ لکھ رہا ہے  
 دانا باد کا کون سا عاشق (مرزا صاحبان کی لوک داستان کی طرف اشارہ ہے) پھر تیروں کو بنگلی سوئپ  
 کر جا رہا ہے

سامنے درختوں کی ان گنت قبریں ہیں، پھولوں کی لاش کو کندھا دو  
 قلم نے جس (کفن سے) عشق کو ڈھانپا ہے اس کفن کے تذکرے دیر تک ہوتے رہیں گے]

”کستوری“ کی نظموں میں بنجواں۔ وجوہ کے معنی پہلی بار تبدیل ہوئے۔ اس وقت جب میں نے  
 مایوی کو اپنی آخری تقدیر مان لیا تھا۔ 1955 کے آخر میں امرود کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ ”آخری خط“  
 کا ایک ٹکڑا میں نے ساحر کے نام لکھا تھا یہ جب دوسری کہانیوں کے ساتھ کتابی صورت میں چھپنے لگی تو نریگ  
 والے پر تم تنگہ جی نے مصور نریگ سیٹھی کو کتاب کا نائل بنانے کو کہا۔ میں نے اس کی گہرائی کے بارے میں  
 خود مصور سے بات کرنی چاہی تو جواب میں سیٹھی نے کہا۔۔۔ میرا ایک دوست ہے اندر جیت (ان دنوں  
 امرود اپنا نام) اندر جیت لکھتا تھا) اگر وہ یہ نائل بنائے تو اس گہرائی کو گرفت میں لاسکتا ہے۔ پھر شاید یہ بات  
 دیوندر تک پہنچی۔ وہ شمع رسالے میں کام کرنے والے مصور اندر جیت کو جانتا تھا۔ ایک دن اسے اپنے ساتھ  
 لے آیا۔ میں نے کہانیوں کے نام لکھوائے اس نے کتاب کا پہلا صفحہ بھی بنایا اور کہانیوں کے نام بھی لکھے۔  
 یہاں سے واقفیت شروع ہوئی جو صرف کاموں اور کتابوں کی باتوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ پھر 1956 میں  
 جب شمع والوں نے اپنے ادبی پرچے آئینہ کا ایک خاص نمبر شائع کرنا تھا اور اس میں ”آخری خط“ کے اردو  
 ترجمے کو چھاپنا تھا تو اس کے لیے ایک دن امرود سے آکر پوچھا تھا ”جس کے نام یہ آخری خط لکھا ہوا ہے اگر  
 مجھے اس کا نام معلوم ہو تو میں ڈیزائن میں اس کی شبیہ بنا دوں“ لیکن میں جواب دینے سے جھجک گئی تھی۔ اس  
 نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ سو واقفیت ابھی صرف واقفیت تھی دوستی تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ امرود کی دوستی کو میں  
 نے تفصیل سے رسیدی نکت میں بیان کیا ہے یہاں صرف متعلقہ نظموں کا ذکر کروں گی۔ میں کہہ رہی  
 تھی۔۔۔ کہ کستوری کی نظموں میں پہلی بار بنجواں وجوہ کے معنی بدلے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں  
 نے مایوی کو اپنی آخری تقدیر پر مان لیا تھا۔ تو میرے باخبر من سے بھی پہلے بے خبر من نے زندگی کے بند  
 دروازے پر ایک دستک سی۔ اوپر تلے تین نظمیں لکھی گئیں۔ محسوس ہوا۔۔۔ جیسے قلم نے مجھ سے ہی پوچھے بغیر

لکھ لی ہوں۔ وہ تین نظمیں یہ تھیں

## آواز

درندہ بھیڑ حیات ہے! رکھ صدق کی لاج  
ریت تھلاں وچ آرہی قدموں کی آواز  
درندہ بھیڑ حیات ہے! ابے نہ نکا پنڈھ  
سورج دھوڑے چائنا دھرتی طے سنگدھ  
درندہ بھیڑ حیات ہے! بل کوہ راڈ یک  
لکھ ہنیرے چیر دی چائن دی اک لیک  
درندہ بھیڑ حیات ہے! امبر بدھی چھن  
تارے بان دھونیاں لکھ جگاوے چن  
درندہ بھیڑ حیات ہے! دیکھ ذرا اک دیر  
متھے کرناں نہہ کے سورج آیا فیر  
درندہ بھیڑ حیات ہے! دیکھ ذرا کوٹھیر  
کاسہ پھڑیا عشق نے جندڑی پادے خیر

[زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو میرے صدق کی لاج رکھ لہو صبراؤں میں قدموں کی آواز آرہی ہے  
زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو ابھی قاصدے ختم نہیں ہوئے سورج روشنی چھڑک رہا ہے اور زمین  
خوشبوئیں لگا کر بیٹھی ہے

زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو لہو بھر اور انتظار کر لو روشنی کی ایک لکیر گھوڑا اندھیروں کو چیرتی  
آ رہی ہے

زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو دیکھو کہ سورج ایک بار پھر پیشانی پر کرنیں باندھ کر آ گیا ہے

زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو! بھر ٹھہر جاؤ! عشق نے کاسہ گدائی ہاتھ میں لیا ہے 'زندگی' اسے

بھیک دو۔۔۔۔۔]

## اک رات

سپیاں دے آٹنے وچ رات بھر کوئی رہ گیا

گل سی نروان دی 'پر جسم خاکی کہہ گیا

ادب اکھیاں والیں قدماں دے وچ دھروے رہے

رات وی دلیز تے 'ستارے دعا کر دے رہے

ساہ کسے دا پر کسے ہر ساہ جدوں لنگھد ارہیا

پتہ جھڑاں دی زلف وچ 'کلیاں کوئی منگد ارہیا

جنن دا اک جام سوئی رات نے بھریا جدوں

عمر داموتی کسے نے وار یا اک نظر توں

جگمگانہ دے دیو یاں دا قافلہ لنگھد ارہیا

قول کئی دیند ارہیا تے قول کئی منگد ارہیا

نظر دا دریا تے جندزی رات بھر تری رہی

دین واسی ذکر دنیا رات بھر کردی رہی

[ہم آنکھوں کے ادب کو قدموں میں رکھتے رہے 'ستارے رات کی دلیز پر دعائیں مانگا کیے

رات نے جب چاند کا خوبصورت جام بھر کسی نے ایک نظر پر سے اپنی عمر کا موتی وار دیا

جگمگاتے چراغوں کا قافلہ رواں دواں رہا 'وہ کسی سے وعدے لیتا رہا' کسی سے اقرار کرتا رہا

روح 'تمام رات نظر کے دریا میں تیرتی رہی' دین کا ذکر تھا 'جو رات بھر دنیا کرتی رہی۔۔۔۔۔]

## محبتوں

توں سن ملکوں والیے! بول نہ ملکوں بول  
 پہنے بچن واسطے ز میں نہ ساڈے کول  
 توں سن قولاں والیے! قولاں دی تقدیر  
 دھرتی چھاواں ملکیاں امبر ملکیاں  
 توں سن مہراں والیے! کیہ کجھ ساڈے جوگ  
 بچھو موتی عشق دے اکھاں چکن جوگ  
 توں سن داٹاں والیے! ہیرے کر دی سوٹ  
 بہن نہ سکے چندڑی ہیرے خمن ہوٹھ  
 توں سن لاٹاں والیے! چانن بچی داٹ  
 عاشق چنداں بالہ دے اچی رکھ دے لاٹ  
 سول صراحیاں والیے! دیکھ تڑپ دے رند  
 رنجی ہون کہانیاں قصے توڑن چند

[سن ملکوں کی ملکہ لیکن منہ سے کچھ نہ بول کہ خواب بولنے کے لیے ہمارے پاس زمین نہیں ہے  
 اقرار کرنے والی! سن کہ اقراروں کی تقدیر کیا تھی زمین پر چھاؤں ختم ہوگئی اور آسمان کے آنسو نہ رہے  
 مہر بھری! سن کہ کیا کیا (ہستم) ہمارے لیے نہیں تھے آنسو عشق کے موتی ہیں اور آنکھیں جوگ  
 چلتی ہیں۔۔۔]

روشنیوں کی لو بھڑکانے والی! چمکندڑی روشنی سے بھیگی ہوئی ہے عاشق روح (کا دریا) جلاتے ہیں اور لو  
 اونچی رکھتے ہیں۔۔۔]

بھی۔۔۔ جوگ اور جوگ کے بدلے ہوئے معنی ہیں کیونکہ یہ تینوں نظمیں بھی کستوری میں شامل ہیں  
 اور ایک وہ نظم "سمندر سے" بھی جو میں نے امروز کے ساتھ بھیجی جا کر لکھی تھی۔ وہاں ساحر سے نہیں ملی تھی لیکن  
 نہ ملنے کا درد ملنے سے کہیں زیادہ تھا۔ میری اس نظم کے درد کو ساحر نے بھی محسوس کیا۔ بعد میں جب وہ دہلی آ کر

ملا میں نے بتایا کہ میں بہمنی گئی تھی اس کو یقین نہیں آیا لیکن جب نظم دکھائی تو اسے یقین آ گیا۔ اس رات میں پہلی بار اس کے سامنے روئی تھی۔ کہا تھا "یوں کنی برس ایک چپ میں گزر جائیں تو کیا تم نہیں سمجھتے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے؟"

اس رات میں نے پہلی بار دیکھا کہ ساحر رویا ہے وہ صرف رویا لیکن اس نے اپنی برسوں کی خاموشی کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا یہ خاموشی اس کے اندر پتہ نہیں کہاں تھی کیسی تھی کہ جس تک اس کا اپنا ہاتھ بھی نہیں پہنچتا تھا یا شاید پھر وہ اسے اپنے آپ تک رکھنا چاہتا تھا پتہ نہیں۔ کستوری کی وہ نظم ہے۔

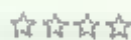
## ساگر نوں

توں سن چٹاں والیا! ایہ کون سوکالی راتڑی  
ایہ کون سوچند اسنہد اُج دل وچ آگئی چھل دے  
توں سن موتیاں والیا! دے چوداں رتھاں والیا!  
اُج جی دے وچ سانجھ لے اک ساڈے دل دی گل دے  
سکھو گندھ چتر اوے کھلے عشق جالرو کلا چڑھیا  
ایہ کہیں کو بیڑی اُج دی تے کیہا کوٹا نوکل دے  
دل دے پانی چھل جو انھی چھل دے پیریں سفر سنہدا  
کرناں سانوں سدن آئیاں سورج دے گھر چل دے  
توں سن چٹاں والیا۔۔۔۔۔

[سن رے لہروں والے! یہ کیسی کالی رات! یہ کس چندا کی بات آج آئی دل میں لہر رے  
سن رے موتیوں والے! اور چودہ رتوں والے! آج سیپ کے دل میں سنبھال لے ہمارے دل کی  
بات رے۔۔۔۔۔]

دل کے پانی میں جولہرا انھی اس لہر کے پاؤں میں بات سفر کی کرنیں ہمیں بلانے آئیں سورج کے گھر  
چل رے۔۔۔۔۔

[سن رے لہروں والے۔۔۔۔۔]



امرتا پریتم  
لپی انتر: افضل ساحر، منیر گجر، طاہر سندھو

## آکھاں وارث شاہ نوں!

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول!  
تے اج کتا بے عشق دا کوئی اگلا درقا پھول!  
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے توین  
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہیں:  
وے درد منداں ویا درو یا! اٹھ تک اپنا پنجاب  
اج نیلے لاشاں وچھیاں تے لہودی بھری چناب  
کسے نے پنجاب پانیاں وچ دتی زہر دلا  
تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا  
ایس زرخیز زمین دے لُوں لُوں مٹھیا زہر  
گٹھ گٹھ چڑھیاں لالیاں بھٹ بھٹ چڑھیا قبر  
دیہودنسی واء پھرون ون وگی جا  
اوہنے ہراک وانس دی دجھلی دتی ناگ بنا  
پہلا ڈنگ مداریاں منتر گئے گواچ  
دو بجے ڈنگ دی لگ گئی جنے کھنوں لاگ  
لاگاں کیلے لوک مونہہ بس پھر ڈنگ ہی ڈنگ  
پلو پٹی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ  
گلیوں نئے گیت پھر تر گلیوں نئی تند

ترنجبوں ٹمیاں سہیلیاں چڑھوے گھوکر بند  
 سنے سچ دے میزیاں لڈان دتیاں روزہ  
 سنے ڈالیاں پٹکھ اچ پٹکھ دتی توڑ  
 جتھے وجدی سی چوک پیاردی دے ادھ دیکھلی گئی گواچ  
 رانجھے دے بھو ویراچ بھل گئے اوہدی جاچ  
 دھرتی تے لہو و سیا قبریں پٹیاں چوں  
 پڑیت دیاں شاہزادیاں اچ وچ مزاراں رون  
 اچ کھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور  
 اچ کتھوں لیا یے لہجے کے وارث شاہ اک ہور  
 اچ آکھاں وارث شاہنوں تو میں قبریں وچوں بول!  
 تے اچ کتابے عشق دا کوئی اگلا رقا پھول  
 ہزار ہا ہزار

### امر تا پریتم

اک درد سی  
 جو سگریٹ دی طرح میں پُپ چاپ میتا ہے  
 صرف کچھ نظماں بہن  
 جو سگریٹ دے تالوں میں راکھ دا گنن جھازیاں .....  
 ہزار ہا ہزار



جڑ کے گھڑے دا پانی

دے میں تڑ کے گھڑے دا پانی  
کل تک نہیں رہنا...

ایس پانی دے کن ترہیہائے  
ترہید دے ہوشاں وانگوں  
اوہ میرے ٹھنڈے ٹھٹھ دیا جڑا!  
کہہ دے جو کچھ کہنا...

اج دا پانی کیکن لاہوے  
کل دی ترہید اقرضہ  
نہ پانی نے کنیں بھجنا  
نہ پلے وچ رہنا...

دیکھ کہ تیری ترہید ورگی  
ایس پانی دی مجبوری  
نہ ایس تیری ترہید سنگ خرنا  
نہ ایس اتھے بہنا...  
اج دے پنڈے پانی لٹکے  
ترہید دے موتی ورگا  
پراج دے پنڈے نالوں کل نے  
چہر وانگوں بہنا...

وے میں جو کے گھڑے دایانی  
کل تک نہیں رہتا...

☆☆☆☆

رب خیر کرے

رب خیر کرے میرے ویزھے دی  
کہ جس تھاں راہنجن ڈیرا کھیا  
اوتھے دھمک سنہدی کھیزے دی...

اج چارے کندھاں دین دہائیاں  
کہ اج ملکی دی نکل وچوں  
دودھ دیاں ٹونداں کہنے چرائیاں...  
رب خیر کرے میرے ویزھے دی...

اج نیلے دیاں مجھیں روئیاں  
کہ اج ایس میری دوتی دے وچ  
کس نے لہو دیاں دھاراں چوئیاں...  
رب خیر کرے میرے ویزھے دی...

اج ہر اک بستہ پنجن آیا  
کہ اج میرے مدرسے وچوں  
بچا اکھر کہنے چھپایا...  
رب خیر کرے میرے ویزھے دی...

وے پر دیا!

پورب نے کچھ لکھیا  
کیہڑے انہر پھول!

ہتھ کٹورا او دھدا  
وچ کیسر دتا گھول

چانن لپی رات وے  
ست سوگندھاں ڈولھ

انہر فصلیاں پکیاں  
تاریاں لالے بول

آساں کتن پٹھیاں  
تندنبک تے سول

بھر بھر لچھے چین وے  
ریشم اتی جھول  
ارپی کس نے جندزی  
چارے کنیاں کھول

بداں بھر لئی اکھ وے

یہاں بھرنی مہول

ہنچھی تو لے پر اس نوں

ناہناں کنیاں ڈول

لے دے کھنڈھ وکندڑے

جاں رہے ساڈے کول

وے پروہیا!

☆☆☆☆

توں نہیں آیا

ہتر نے پاسا سوڑیا

رنکاں دے میلے واسطے پھلاں نے ریشم جوڑیا...

توں نہیں آیا...

ہونیاں دو پہراں لسیاں

داکھاں نوں لالی چھوہ گئی داتی نے کنکاں ہنچیاں...

توں نہیں آیا...

بداں دی دنیا چھا گئی

دھرتی نے بکاں جوڑے انہر دی رحمت پی لئی...

توں نہیں آیا...

رکھاں نے جادو کر لیا  
جنگل نوں چھو بندی پون دے ہونٹھاں ج شہد بھر گیا...  
توں نہیں آیا...

راتاں میں جادو چھو بنیاں  
چناں نے پایاں آن کے راتاں دے متھے ڈونیاں...  
توں نہیں آیا...

اج پھیر تارے کہہ گئے  
عمر اں دے محلاں اے وی کھناں دے دیوے مل رہے...  
توں نہیں آیا...

کرتاں دا جھر مٹ آ کھدا  
راتاں دی گوڑھی نیند چوں حالے وی چاخن جاگدا...  
توں نہیں آیا...  
☆☆☆☆

## سفر

گہراں چڑھیاں پور یوں انبر لدے اُنچ  
چڑھد سورج ٹنہیا چائن دتا پُنج

سکے سرور رحم دے ہنس نہ بوڑی ہنچھ  
کرم کسے دے ہو گئے متھے نالوں رنج

گہراں چنڈے چلیاں چارے کنیاں سُرُنج  
لیکاں پھڑیاں ٹھٹ کے ٹھرا نہ جاوے سُرُنج

کالے کوہ مکا ندیاں ڈھپاں لٹھیاں اُنچ  
سورج ہو یا سرکز اکرتاں ہوئیاں سُرُنج

گہراں پچھتم ملیا لایہی بجر دی دنجھ  
پکڑاں پیر لپیٹیاں ہتھوں مٹھٹ کے دنجھ

ہو ٹھ نہ ہاڑھے سکد سے اکھ نہ سکدی ہنچھ  
لہہ لہہ جان دیہاڑیاں ہوئی عمر دی سنجھ

☆☆☆

## اک خط

ایہہ رات ساری تیرے  
خیالاں جگزار کے  
بُنے بُنے جاگی ہاں سنے  
بیسٹاں اُسار کے

ایہہ رات ہنکرن رحمتاں دی  
بڈلی ورحدی رہی  
ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں  
پوریاں کر دی رہی

پنچھیاں دی ڈار بن کے  
خیال کوئی آؤندار ہے  
ہوٹھ میرے ساہ تیرے دی  
مہلت نوں پیندے رہے

بہت اُچیاں بہن دیواراں  
روشنی دسدی نہیں  
ات سنے کھینڈ دی ہے  
ہور کجھ دسدی نہیں

ہر میر انفہ جیویں

میں خط کوئی لکھدی رہی

حیران ہاں اک سٹروی

تیرے تک نہج دی نہیں؟

☆☆☆☆



## محبت

سورج ٹلکھی محبت تیری  
دل دا انبر میرا  
دھرتی آکھے اکھیں ڈٹھا  
ہو یا عشق سویرا...

سورج ٹلکھی محبت تیری  
جیوں جیوں چڑھدی آوے  
ندیاں دے دج چائن دے  
دھرتی مل مل نھاوے...

سورج ٹلکھی محبت تیری  
کرتاں سالو اُنیا  
سج تیری دے بھلاں دچوں  
اج میں انہد سنیا...

سورج ٹلکھی محبت تیری  
ستے رنگ کھنڈ دے  
کڑکاں نے اج نچے موتی  
زُلغاں دے دج گندے...

☆☆☆☆

## عمر دی رات

عمر دی اک رات سی  
ارمان رہ گئے جاگدے قسمت نوں خندا آگنی

رات دی چنگیر وچ چنبا جدوں پھیا کسے  
ہتھوں چنگیر ڈگ پئی

صدق سی کجھ انج دا  
جتھے وی سر جھکا لیا دہیز جاپی اوس دی

عشق کئی جان ہے  
دھرتی کڑا داساک جے آسمان وارشتہ ہے کیہ!

موت توں واقف اسیں  
اکثر ایہہ ساڈی زندگی اوس دا ذکر کردی رہی

رات نوں آسمان توں لُکھ اے تارا جدوں وی  
آوندی ہے یاد اپنی!

☆☆☆☆

## ناگ منی

ڈاڈھا گھٹا عقل را جنگل  
علم جیویں اک رکھ چنن دا  
من واسپ کوڈیاں والا  
متھے دے دج منی چمکدی  
پوناں دے دج پھن پھیلایا ...

پولے پیر سپا دھا آیا  
ہوٹھاں اُتے بن عشق دی  
اتھ آس دی انھی کھی  
کچا دودھ محبت والا  
من واسپ پٹاری پایا ...

بیٹھ سپا دھا اک چورا ہے  
بین دجاوے سب کھڈاوے  
کدے سب نوں گل دج پاوے  
ہسے راگ اتے وکھ رووے  
سارا لوک تماشے آیا ...

☆☆☆☆

پنجواں چراغ

نہ کوئی دھڑکتے نہ کوئی سجدہ

نہ منت ممکن آئی

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ

میں پنجواں بلن آئی ...

دکھاں دی گھائی میں تیل کد حایا

متھے دی توڑی اک رُوں دی ہتی

میں متھے دے دج پائی ...

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ

میں پنجواں بلن آئی ...

سوچاں دے سرور ہتھاں نوں دھوتا

متھے وادیا میں تلیاں تے دھریا

تے روح دی اگ چھوہائی ...

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ

میں پنجواں بلن آئی ...

دیں تاں دتا سی مٹی دا دیوا

میں اک داسکن او سے نوں پایا

تے امانت سوز لیا ئی ...

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ

میں پنجواں بلن آئی ...

گھر

اج اساک دنیا و پچی  
تے اک وین و ہاج لیاے  
گل گھرو دی کیتی ...

سپنے دا اک تھان اُنا یا  
گز گھو کپڑا پاڑ لیا تے  
عمر دی چولی سیتی ...

اج اساک انیر دے گھڑیوں  
بدل دی اک چھنی لاہی  
گھٹ چاننی چیتی !

گیتاں نال پکا جاواں گے  
ایہہ جو اساک موت دے کولوں  
گھڑی ہداری لیتی ...

☆☆☆☆

## بُر کی

جند گردی نے کل رات نوں  
سُنے دی اک بُر کی بھنی  
پتہ نہیں ایہ خبر کس طرح  
پہنچ گئی انہر دے کنیں ...

وڈیاں کھلھاں خبر سُنی  
تے لیاں پچھاں خبر سُنی  
تے ٹکھنڈیاں مونہاں خبر سُنی  
تے تکھیاں نوںہواں خبر سُنی ...

ایس بُر کی دانگا پنڈا  
ایس خوشبودا کجَن پاتا  
نیکوئی من دا اوہلا ملیا  
نیکوئی تن دا جھنکھل ماتا ...

اک جھپنے بُر کی ٹھس  
دوویں ہتھ ولونڈھر گتے  
اک جھپنے گھہ جھری  
نوہنڈر و جی مونہہ دے آتے ...

مونہہ دے وچ بُر کی دی تھاویں

رہ گئیاں بُر کی دیاں گلاں  
انبروے وچ اڈاں پچیاں  
راتاں جیویں کالیاں! لاں ...

جند گروی نے کل رات نوں  
سپنے دی اک بڑ کی بھنی  
پتہ نہیں ایہہ خبر کس طرح  
پہنچ گئی انبروے کنیں .....

☆☆☆☆

انب واپوٹو!

بیت ساڈزا

انب واپوٹو!

وے کھڑے ہاگاں وچ لکڑا!

واڑاں تے والی

وڈا رن سانوں

سانوں تاں ایہہ دکھڑا ڈھڑا!

باہواں دی گولی

لہڑی پھنی

لُس لُس کروے

ہونٹھاں وے پتے

تے ساہواں دا نور سنگدھڑا!

سوں جانی مان!

سوں جانی بھلیے!

انہاں دی راگھی

ہر ہاجوٹھڑا

تے گل وچ گیت سریلو!

جنتاں ساڈی

کوئیل سنیدی

مہمے تاں ساڈی

ورجست چھا!

تے ورداں واساک ساڈزا!



## عرض

رات گڑی دی جھولی پاؤ  
چٹا جن گری دا کھوپا  
نال ستارے منھ چھو ہارے...

پیڑ گڑی دی جھولی پاؤ  
دل دا زخم نریل بھوتا  
نال چھو ہارے ہنچھو کھارے...

پورب نے پنگھوڑا ڈاہیا  
جڈی پشٹی اک پنگھوڑا  
سورج پیارات دی لکھے...

ہوٹھاں نے پنگھوڑا ڈاہیا  
جڈی پشٹی اک پنگھوڑا  
گیت پیاجڑاں دی لکھے...  
انہر وید سوید سنیدا  
رات گڑی دی تاڑی ٹوہوے  
پیڑ گڑی دی تاڑی ٹوہوے...

عرض کرے دھرتی دی جانی:  
رات کدے دی بانجھ نہ ہووے!  
پیڑ کدے دی بانجھ نہ ہووے!

## عشق

کمینہ..... بے وفا..... بد ذات..... ظالم.....

تمہیا اتوں یاد آویں تاں کئے ہی لفظ

میری چھاتی دی اک چدے اُگ فھکدے مونہوں نکلدے ...

پھر پنڈے داماس جد و تری مٹی دی طرح ہوندا

تاں سارے لفظ میرے سکیاں ہوٹھاں توں جھڑدے

تے مٹی دے دھجیاں دی طرح ڈگدے ...

میں ہنسی ہوئی دھرتی دی طرح جھپچھپ ہوندی

تاں چند رنے میرے انگاں دے وچوں اُگ چندے

ٹلچے مٹھاں دی طرح ہسدے

تے میں اک کالے کوہ ورگی مہک مہک جاندی .....

☆☆☆☆

اک ٹوٹاؤ تھپ دا

مینوں اوہ ویٹا یاد ہے  
جداک ٹوٹاؤ تھپ دا  
سورج دی انگلی پکڑ کے  
نھیرے دامیلا ویکھدا  
بھیراں دے وچ گواچیا

سوچدی ہاں سہم داتے  
سُج داوی ساک ہوندا ہے  
میں جو ایس دی کچھ نہیں  
پر ایس گواچے بال نے  
اک ہتھ میرا پھڑلایا

توں کے لہندا نہیں  
ہتھ نوں چھو ہندا پیا  
بکاتے تہا اک ساہ  
نہ ہتھ دے نال پرچدا  
نہ ہتھ دا کھاندا او ساہ  
نھیرا بکتے مُکدا نہیں  
میلے دے رولے وچ دی  
ہے اک عالم چپ دا  
تے یاد تیری ایس طرح  
جیوں اک ٹوٹاؤ تھپ دا

☆☆☆☆

## دیکھ کبیرا رویا

سامراج: اک ناواں شانی ٹوٹا  
ہو آ دم دی ذات کھیل دے واگک اُگی  
حاکم دا حکم اوتا ہے اوہ جتا وی کر لوے  
تے پر جادی پیر اوئی ہے اوہ جتی وی جروے...

سامراج: منکھ ذات دامندر  
تے اک اٹ جتی اک منکھ دی قیمت  
ایہہ مندر دی لوڑ ہے جاں ٹھیکیدار دی مرضی  
کہ جیہڑی اٹ نوں جتے وی چاہے دھر لوے...

درد دا احساس کچھ گولیاں سوچاں تے زخمی آزادی  
بہت دڑے عیب بن جے بندہ عیب دور کر لوے  
تے پھیر کدی چاہے  
جاں روح دا سوناویج کے طاقت دا پیٹ بھر لوے...

دینی حکومت: رب دی رحمت  
صرف تگنا ورحمت تے بولنا ورحمت!  
تے سوچنا ورحمت

ہوہ بندے دے موڈ حیاں تے لکھاں سوالاں دا بھار  
نذیب بڑا مہربان ہے ہر سوال نوں خرید دا

پر جے کدے بندہ جواب دہندہ ار کر لوے ...

تے بندے نوں بھلکھ گئے  
تاں ہی روئی "رب" دی اوہ چپ کر کے کھا لوے  
صبر بھکر کر لوئے تے پھیر جے چاہے  
تاں اگلے جنم واسطے کچھ اپنے نال دھر لوے ...

تے لوک راج: گاہلی گلوچ دی بھیتی  
کہ بندہ جدوں سو نہہ مارے تاں اتی چاہے جے لوے  
گھری دی بھر لوئے تے پھیر جدوں چاہے  
تاں او سے گاہلی گلوچ دی بہہ کے جگانی کر لوے ...

☆☆☆☆

لفظ

ارتھاں دا بکج ڈھکن نوں  
میں اوہناں دے گل وچ لفظاں دی بانہہ پواکی سی  
ایہہ لفظ خورے کسے مر یا داتے نہیں رکدے؟  
اج اوہی لفظ ارتھاں دا رہپ کر کے مڑے بن  
تے شر مسار میرے ساہویں اکھ نہیں چکدے ...

☆☆☆☆

بستی

اسیں کھنگھڑا دھواں چھڑکھیاں تے کجاں  
تے گلوڑے دا ڈھیر تے ہڈیاں دے بچر  
سارے پروٹیسٹ کر دے ہاں  
تے دسدے ہاں کہ سانوں ایہہ بستی الٹ ہوئی ہے  
کچھ سپدیاں نے رات نوں ٹھکیاں بنائیاں ہن  
ایہہ ٹھکیاں اٹھاؤ کیوں کہ ایہہ ان آتھورا نرڈ ہن  
☆☆☆☆

آتم ملن

میری سچ حاضر ہے  
پر جی تے قمیض دا ٹکڑا  
توں اپنا بدن دی اتار دے  
پر انہہ موڑھے تے رکھ دے  
کوئی خاص گل نہیں  
ایہہ اپنے اپنے دیس دارواج ہے!  
☆☆☆☆

## میرا پتہ

اج میں اپنے گھر دا نمبر مٹایا ہے  
گلی دے متھے تے لگا گلی دا ناؤں بٹایا ہے  
تے ہر سڑک دی بٹاوا ناؤں پوئجھ دتا ہے...  
بھنبریں... نشانیاں دا کوڑا ہوئجھ دتا ہے

پر جے ٹساں مینوں ضرور سمجھنا ہے  
تاں ہر دیس دے ہر شہر دی  
ہر گلی دا بوہا ٹھکورو  
ایہہ اک سراپ ہے اک ور ہے  
تے جتھے وی سستہ روح دی جھلک پوے  
بھننا اوہ میرا گھر ہے...

☆☆☆☆

## فیملی فوٹو گراف

کندھ تے بنگلی اک فیملی فوٹو گراف

ایہہ کھا کھاں نوں پوئلہ ادا

(جیسے اک وار پتر نوں گھروں کڈھیا سی)

کہ اوہنے جاتوں باہری کڑی کیوں دیا ہی سی)

ایہہ دنداں دانواں بیڑ لائی باپو

(جیسے گل دی لاج رکھن لئی پھیر اک کڑی

اپنی ذات دی دیا ہی سی)

ایہہ ماں جوہن بہت موٹی ہے تے کرسی وے وچ پوری نہیں آوندی

(تے جیہدے گلے وچ اسے وی سوکھن دا تویت لگدا)

ایہہ پتر جیہدے گوڑیاں تے بیٹھے ہو پتر بہن

(اک موٹی دوہنی دا اک نوں آئی دا)

تے ایہہ پیراں دے کول بیٹھی کڑی

(ایہہ موئے بھائی دی نشانی ہے)

ایہہ تایا جی

(ایہہ ذرا آپہڈرے سن)

سودا دے نے ایہناں نوں بہت چہ ہویا بے دخل کردتا ہے)

ایہہ چا چا جی تے چاچی جی

(ہن کچھ جانید ادا جھگڑا ہے تے اوہ متھے نہیں لگدے)

تے ایہہ بھوا سورگ واسی.....

تے ایہہ دھرم دی ماسی.....

جد کوئی نہیں جاندا کہ اوہ اک دو ہے راکیہ کرے



تاں دل کے بہن دی اوہ کبھی سوئی جگت کدھدے بہن!

ایس دی سارے ہندو تے مسلمان گورے تے کالے عربی تے یہودی  
چیک تے روسی امریکی تے دیت نامی  
تے پرانہد وٹھ موڑ کے بیٹھے ہوئے چینی بھرا  
ایس طرح اک تصویر تے کھچا سکدے ہاں  
تے جدوں فوٹو گرافر کہے گا ناؤ پلیز سائل!  
ایس سارے اکو دار مسکراواں گے.....

☆☆☆☆

## بٹل لائف

ایہہ جلیاں والا

تے اوس دی کندھ وچ 'چپ چپ' بیٹھے گولیاں دے چھیک

ایہہ سانبیر یا

تے اوس دی زمین تے چیکاں دے مکزے برف وچ جے

کانسٹرکشن کمپ

منکھی ماس دی ہوا زھ بھٹھیاں دی را کھ وچ نستی

ایہہ کراٹوئے واج

جید دی نکل و سوں اک پتھر دے بت وچ مٹی

ایہہ ہیر و شیمہ ہے

جواک گٹھے اک پائے ہوئے دستاویز و انگ زگا

تے ایہہ پراگ

جو ساہ گھٹ کے اج سنسردی پیڑی مُٹھ وچ بیٹھا

ہر چیز چپ تے اڈول ہے

صرف میری چھاتی دے وچوں اک ابھاساہ نکلا

تے دھرتی دا ہر مکر لیل جیہا جاندا.....

☆☆☆☆

امروز چتر کار

میرے سامنے ایزل دے آتے اک کیوس پی ہے

کچھ انج جا پدا

کہ کیوس تے لگارنگ وانو نا

اک لال نا کی بن کے ہلدا ہے

تے ہر انسان دے اندر داپشواک سنگ چلدا ہے

سنگ تدا ہے

تے ہر کو چاگلی بازار اک رنگ ہندا ہے...

تے میریاں پنجابی رگاں وچ

اک بیتی روایت کھولدی

گو یاد دی ہتھ بل فائنگ بل ڈیجھ...

~~~~~

## وقت

ساہنے اخباری دینگلی مرکری  
تے نظر خبراں دی تمزلی غمارت تے کھڑی سی...  
اچانک پیر تلکیا تے اوہ اتلی چھت توں ڈگی  
پٹھاں اشتہار دی اک نگی سڑک سی  
”اک خوشنما ٹیکر و عورت دکاؤ ہے.....“

نظر سووھے مونہہ اکھراں تے لگی رہی  
تے گوڈیاں دے بھار سڑک تے ڈگی رہی.....

وقت بکتے کولوں دی لنگھدا سی اوس ویکھیا  
سڑک توں چلیا  
تے نظرنوں اوس نے اخبار دی تاریخ دی  
”منقل واران فی فروری سن ستارحاں سو بانی.....“

نظر سسکی تے اوہ اچھ پھڑی کہن لگی:  
توں جج اوہی ایس کہ بدل چکا ایس؟  
ایہہ..... توں..... کیہ..... کی..... تا؟  
اوس اپنے ہونٹھ نوں دنداں جج تلکیا تے مونہہ پھیر لیتا.....  
پر مونہہ پھیرن توں پہلاں اوہ اک وار تلکیا  
تے شرمندہ جیہا کہن لگا ”کہہ نہیں سکدا  
شاید اوہی ہاں“  
پر بہن میں اشتہار دا شیشہ نہیں سکدا.....“

میرے اتھاس دا اک پا تر

توں میرے اتھاس دا کتھو جیہا پا تر؟

میری کندھ دے کیلنڈر چوں نکل کے

توں روزاوس دی تاریخ بدلتاے مینوں اک نویں دنوں دا انگ ملدا!

کیلنڈر چوں باہر آ کے

توں سڑکاں تے نکل تر دا ہیں تاں اک ڈھپ نکل آوندی ہے

تے جیتے دی جیہڑی ٹمٹھ ٹولی ہے اوہ ہرے پتے دی طرح ہسدی ہے

تے جیتے دی جیہڑی ٹمٹھ ٹولی ہے اوہ شمسار ہوندی ہے!

پر ایہہ جوتے اسجاوک ہے اتھاس دا اسجاوک کرم ہے

اتھاس اک سماھ و اساہ لہندا ہے جد نھوت کال وچ ٹمٹھدا

تے اتھاس دا پریشان ہوندا ہے جد ورتمان نوں ٹمٹھدا...

سوائس اتھاس دی خاطر

میں نئی وار تینوں کیلنڈر چ قید کیتا ہے

تے اتے سوائس کال دی اک نمبر لائی ہے

تے اتے نئی ازماں دے کل نھو کے ہن...

پر توں میری کندھ دے کیلنڈر چوں نکل کے

پھیراوس دی تاریخ بدلدی  
تے نوں چتا نوں ملتی ہتھ وچ لے کے  
توں مینوں اک نوں دہنوں وانگ ملدا...

تیری اک نوں دہنوں دی عظمت  
کہ میری ہوندی اک چھاویں گٹھ نے  
تیری ڈھپ دا اک بول سن لیا  
تے جوا تہاں دا اے جواک کرم ہے  
پر تیرا سہاوک ہے اوہ میرا سہاوک بن گیا...  
☆☆☆☆

## بچویں اُداسی

بچ سو درھے  
بچ سو کھڑاواں دے رکل  
جیراں نے ہنڈھائے ہن  
ان کھاں دی بری ہے  
سو پیر مسکرائے ہن...

ایہہ کھاں داسیلا ہے  
تے جیراں واسطے  
ایہہ بچویں اُداسی داویلا ہے...

کھل کھڑے ہن  
صرف راہواں دی بات راہواں دے سنگ تھردی گئی  
تے جیراں دی گل جیراں دے سنگ کردی رہی...

پچھے دور کتے کھاں دی بری ہے  
تے بری دا آہر پاہر ہے  
تے اگے دور کتے پیر پچ ہن  
اوس ورتے دی طرح  
جو ہر جنم ساکھی توں باہر ہے...

فی مائے.....

فی مائے! دس کیڑیاں رتاں آئیاں میرے متھے وچ پھل کھڑیا  
میرے تن دی تے من دی مٹی گلابی جیہا رنگ چڑھیا...

اب کھڑی ہاں دلیز اتے  
فی میں جاگدی تے عین میرے تے  
لہنوں مگر کے کورادیاں کہڑھیاں والا دودھ کڑھیا...  
میرا تن کھر ہوا من گوا  
فی مٹیوں رنگ دے بسنتی چوا  
اساں جیتے ماہ والکھیا سنہری جیہا خط پڑھیا...  
کتوں جھانجراں دی، اب پئی آدے  
فی میرا پیر تھمکدا اجاوے  
میرا سہنا بولیاں پاوے کہ گدھا میرے پنڈ وڑیا...  
دس کیڑیاں رتاں آئیاں میرے متھے وچ پھل کھڑیا...

آکھاں تے آکھاں میں کس نوں آکھاں  
جاواں تے جاواں میں کے درجاواں  
دیس تاں میرا بچن سنہدا  
میں جاناں نوں آکھناواں  
جناجی! پایا رتاں نے پھیرا  
رنگ سنگدھاں واسو تر تھیرا  
دیوتاں دیو دال دا نیرن



لا دو تاں لا دو کرتاں دی کھڈی  
 میں نگئی لوکا کی اچ آکھن آئی  
 کہ جی جاتی! اک جوڑا ناوڈ  
 تے میرے بھوکھ دے گل دج پاو  
 ججن میرے ورتماں نوں سن لئے نہیدے ہتھ دج بھوکھ پھڑیا  
 اچ کھڑیاں رتاں آئیاں میرے متھے دج پھل کھڑیا...  
 او میرے دوست! میرے اجنبی!

اک دارا چا نک توں آیا  
 تاں وقت اصلوں حیران  
 میرے کمرے دج کھلو تارہ گیا...  
 ترکا لاں دا سورج لہن والا سی  
 پرہ نہ سکیا  
 تے گھڑی کو اوس نے ڈبن دی قسمت و سار دتی  
 پھر ازلاں دے نیم نے اک دہائی دتی  
 تے وقت نے بیٹے کھلو تے چھٹاں توں نکلیا  
 تے گھارے باری چوں چھاں مار دتی...

اوہ بیٹے کھلو تے چھٹاں دی گھٹنا  
 بہن مینوں وی بڑی اسپرج لگدی ہے  
 تے مینوں وی بڑی اسپرج لگدی ہے  
 تے شاید وقت نوں دی پھیر اوہ غلطی گوارا نہیں

ہن سورج روز ویلے سر ڈب جاند ا ہے  
 تے ہنیر اروز میری چھاتی وچ کھنکھ جاند ا ہے  
 پر بیتے کھلوتے جھنناں دا اک سج ہے  
 ہن توں تے میں منا چاہیے جاں نہ  
 ایہہ دکھری گل ہے

پر اوس دن وقت نے جد باری چوں چھال ماری سی  
 تے اوس دے گوڈیاں وچوں جولوہ سمیا سی  
 اوجھو

میری باری دے تھلے ا جے تک جھیا ہو یاے ...

☆ ☆ ☆ ☆

## سورج

بدلاں دے مجلس میرا سورج نسا  
جیتھے باری نہ بوبانہ پوڑی  
تے صدیاں دے ہتھاں نے ڈنڈی جولیگی  
اوہ سوچاں دے پیراں نوں سوڑی...

اودا نہ کوئی تھوہ نہ پینہ نشانی  
میں جاناں تے جاناں اک چنگ جیہی  
سیرے متھنوں مُردُ مُردُ اوہڑی...

تے چائن دی مہندی میں تلیاں تے لائی  
اج دکھاں دی کالی تے لگری راتے  
اودہی کرن جدوں مینوں بوہڑی...

بدلاں دے مجلس میرا سورج ستا  
جیتھے باری نہ بوبانہ پوڑی...

☆ ☆ ☆

## نیل

کل اسان و دہاں نے اک ٹیل جلا یا سی  
تے اک دیر یاد سے کنڈھیاں وانگوں نصیب ونڈے...

بدن چھنڈے

تاں اک پنڈے دی ویرانی ایس کنڈھے سی  
تے اک پنڈے دی ویرانی اوس کنڈھے...

پھیر رتاں نے جدوں وی کچھ بھل دتے  
تاں توں وی اوہ پنڈے توں توڑ دتے  
تے میں وی اوہ رتاں توں موڑ دتے  
تے جھڑے پتیاں وانگوں  
کنے ہی ورھے اسان پانی ج روڑھ دتے...

ورھے ملے میں پر پانی نہیں نکلا  
تے وگدے پانیاں وچوں پر چھاویں تاں ویکھے  
پر مونہہ نہیں سکے...

تے ایس توں پہلاں  
کہ کچھ دتھ تے کھلو تے ایس مک جایے  
چل! کھنگراں جیسے پنڈے پانی تے دچھایے!

توں اپنے پنڈے تے پیر رکھیں  
تے اوھے دریا نوں لنگھ آویں!  
میں اپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی  
تیوں اگوں دی ملاں گی...

☆☆☆☆

## شکوہ

یار بدعتیا!

جگوں تیں باہری ہوندی آہی

اتہاسوں باہری توں کیتی آ...

یار بدعتیا!

توں تیں سنند اسباب دا والی

تے سباب دا والی ہو کے ہفتیوں؟

پر جاتاں آ کی ہوندی آہی

توں انی راہ کیوں لیتی آ

یار بدعتیا!

توڑے ہکا الا نبھا ملکل دتا

تے کجے الا نبھے تیرا ہیا ترنا؟

تیں لئی حیاتی دے لے لے الا نبھے

ساڈی تیں عمر ابیتی آ...

یار بدعتیا!

اوس نہ کھو اوس کیہ دے مقدر

تے اوس ڈالی دیاں کیہ تقصیراں؟

تیں جیسے اک ہٹاکھیر دے سنگ

جیسے اثنائی کیتی آ...

یار بدلتیہا!

شہر بھونہ کرے دھنکاتا  
چل یارا! بے کچم جانا  
موت دے تے قتل وی لٹھساں  
اساں یاری تیں سنگ کیتی آ...

یار بدلتیہا!

☆☆☆☆

دوستو!

دوستو! اداسیاں داموسم بہت لمبا اے...  
ساڈا اک شاعر اے جو کئی ورھیاں توں  
جدوں وی کوئی ورھا جاندا اے  
تاں قید بامشقت کٹ کے  
قید چوں رہا ہوندے ورھے نوں بلدا  
تے پالے ج ٹھر کدے موڈھیاں اُتے  
اوہدا پانا کھیس دیندا اونوں الوداع کہندا  
وقت دے اک موڑ اُتے چھڈ آوند اے  
تے کسے دی درگاہ اُتے  
اگلن بیٹھ کے دعا کردا اے  
کہ آون والیا! سکھ دا آویں! بخیر دا آویں!

دوستو! ایہ چند راموسم بہت لمبا اے  
بازووی ہواواں وگدیاں  
تاں رُکھاں دے لوے پتے رُکھاں توں ڈگ پیندے  
ٹاپیاں دی لکھ روندی  
رُکھ دیاں جڑھاں نوں دہندی  
تے آہندی: ایہ کبھڑی تقدیر ہندی اے  
جو اکوٹھی دی رت نوں کئی فرقیان وچ ونڈ دیندی اے  
نفرت رگاں وچ وگدی  
تاں ساری بددعاواں دی لکھ نوں لگدی...



رہا! تیرے درد مندوں نے اک خط لکھیا سی

اپنے حال تے حوال دے

کہ چائن روز چنگلیاں کھاندا اے

تے منیر اگھراں دی گنڈی کھول دیندا اے

روز بچند ردی چھت چونڈی اے

ہا ہر چیکال داسینہ وسدا

تاں اوہناں دے لیف بچ جانداں نہیں...

اوہ ہانڈی وچ وال نہیں، خوف رتھدے ہن

تے ہکل سلو نے لئی

وٹو اس داسا سکوٹون

کسے ہٹی توں نہیں لہدا...

پراوہناں دا خط کتے نہیں پہنچیا

کہ خطنوں بچ داسر تاواں نہیں لہدا...

دوستو! دے مٹکوا!

کہ موسم خوشگوار ہووے

گہاڑیاں دی رست بدلے

رکھاں دی عمر رکھاں نوں نصیب ہووے!

ٹاہیاں دے ویڑھے

ہرے ہرے پتیاں نوں جوانی دی دے لکے!

مسا فراں دے ہراں نوں چھاواں

تے راہواں نوں مٹلاں دی ایس ملے!

دوستو! دُعا منگو

کہ اُوبسیاں دامنِ بدلِ جاوے

سُورج دی کرن

جے متھے دی مٹر بنے

تاں وطنِاں دے دریاں اُتے

امن دی تاریخ لکھی جاندی

چن دی ٹکلی

جے راہواں دی مٹر بنے

تاں پیراں دی سلامتی

ہمیرے دامنِ بدلِ دیندی

دُعا منگو! کہ ورہا سکھیا دا آوے

خیر دا آوے

سُورج دی کرن

انسان دے متھے دی مٹر بنے!

تے چن دی ٹکلی

ہمیریاں راہواں دی گواہ ہووے!

دوستو! وطن توں وڈی

کوئی درگاہ نہیں ہوندی

وطنِاں والیو! اولِ دا چراغِ بال کے

درگاہ تے رکھو

تے اک بکھرے ساڈا جو شاعر اے

اکلّا بیٹھ کے دُعا کر دیا  
اپنی تے اوہری دُعا دی  
مقبولیت منگو!

کہندے عیسٰی کہ بندیاں دے رکھاں تے  
جے دُعاواں دا ارگھ دیئے  
تاں رب مہک جائدا اے...  
محبت دے چراغ بالیے تاں  
ساریاں چوں رب دسد اے  
یو تاں ج رب مہکدا  
تاں بندے دی دُعا قبول ہوندی اے!

☆☆☆☆

## آڑو واں تے جامنواں دے راکھے

”سوں گیا ایں گنگو؟“

”نہیں تایا۔“

پھیر دھپے کیوں بیا ہویا ایں؟ منجی نوں گھسیٹ کے چھاویں کر لے۔

”اچھا تایا، تے گنگواک آکڑ بھن کے انھ بیٹھا۔ منجی گھسیٹ کے او بنے جامنودے رکھ بیٹھاں کر لئی۔

اودہی نگئی پنھ اتے الاٹی منجی دے وان دیاں پڑیاں کھسھ کھیاں ہوئیاں سن۔ ہتھ نال پنھ نوں ملدا اودہ مڑا لایا

جیہا منجی اتے پیندا آکھن لگا۔

”آہو تایا!“

تائے نے اک وار سر اتانہ کر کے جامنودے رکھ ول دیکھیا۔ جامنواں دانیلا رنگ تائے دے سارے

پنڈے وچ چمک اٹھیا۔ تے پھیراودہ اک خمار دا بھریا ہویا منجی اتے بہ گیا۔

”پواندی ول کیوں بہنا ایں تایا! ارانہ ہو جا!“

”سانوں نہیں ایہہ دو تاں چھدیاں جواتا، تے نالے ایس وار رکھاں نوں جہو جیہا پھل پیا اے،

اویں دیکھ کے تاں دو تاں وی کولیاں لگدیاں نیں۔ قسم نال ایس وار تاں جامنواں اڈا گو بھلا اے، گنگ

کدھرے لہدی نہیں۔“

”ہاں تایا!“

”ایہو جیہا جامنوتاں ورھیاں پچھوں دیکھیا اے۔ دساں ورھیاں مگروں۔“

”میں وی ایہو وی پیا سوچدا ساں تایا!“

”توں اودوں خورے چودھاں ورھیاں داسیں۔ چندرھاں داہو ویں گا، رکھ نوں ایڈا پھل پیا سی۔ مار

ایڈاپٹ..... حالے تیرا بیو چوندا سی.....“

تائے دی ایس گل نال گنگو دے کنان وچ اپنے بیو دا بڑا لنگ والا ہوکا بھر گیا.....“ جا مورالائے  
نیں، کے پالائے نہیں، کاے رالائے نہیں.....“ تے نال ہی گنگو دے والاں وچ اک جلون ہوئی جو یں  
کوئی اپنیاں پتلیاں پتلیاں انگاں اوہدے والاں وچ پھیر دا اوہنوں جگاؤ ندا پیاسی، گنگو نے تریہہ کے  
ر باندی ول دیکھیا، او تھے کوئی نہیں سی، گنگو نے کجھ کے اکھاں میٹ لیاں تے سوچن لگا، تاپی اک کڑی نہیں  
سی بھوتی سی۔ تاں ہی تاں مینوں اے تیکر اوہدی سوچ چھڑی ہوئی اے..... ہر ورھے جدوں جامنو پکدے  
نیں مینوں اوہوں سوچ چھڑو چاندی اے.....“

تے پھیر گنگو نوں چھتے آیا۔ بارھاں ورھیاں دی کئی جی تاپی گل وچ گلیاں دی مالا پائی روز و پہراں  
و لیے اوہنوں والاں توں بلون کے جگالیندی ہوندی سی اوہ حکم دا بدھا رکھ اتوں جامنو توڑ دا ہوندا سی۔ تاپی چن  
چن کے سوٹے تے کالے جامنو کھاندی گنگو نوں گھٹ کے جھمی پالیندی سی، تے گنگو واجی کر دا ہوندا سی کہ تاپی  
اوس نوں ایس طرح گھٹے کہ گھٹو گھٹ اوہدی اک ہڈی ضرور ٹٹ جائے، اک پہلی..... تے پھیر تاپی اوہدی منجی  
اتے بہہ کے اوہنوں روں واسیک کر دی رہوے۔

گنگو اپنیاں یاداں توں گھبرا کے منجی توں اٹھ بیٹھا۔

”کیہ ہویا؟“ تائے نے پچھیا

”خو، بے کوئی مستگو لڑیا اے“ گنگو نے ابھڑ وائے آکھیا تے دان دیاں درلاں وچ دیکھن لگا۔

”اج کل مستگو کتھوں آیا ایڈیاں لوداں وچ دی کدے مستگو ٹھہر دے نہیں۔“

”خو رے پھیر کیہ سی۔“ گنگو نے آکھیا تے دھیان پرانہہ کر لیا۔ رکھ دے پاسے نال پنے ہوئے گھڑے

وچوں پانی پی کے اوہ پھیر منجی دی باہی اتے آن بیٹھا۔

”چلاں دیکھاں، مے منڈے دی اکھ لگ جاوے تے جنور جامنو تک جان“ تاپا اٹھن اٹھن کر دا اگوں

آکھن لگا۔ ”کیوں گنگو بھاویں ایسں ایٹکی چار ہزار بھریا اے..... کہن نوں ہوندا اے چار ہزار..... بوریاں

کن رہیاں دیاں بوریاں.....“

گنگو دا ہاسا نکل گیا۔ ”بوریاں کتھے کن تاپا، کئی جیسی خصلی وچ سارے نوٹ آگئے سن۔“

”مکھے گل سمجھی دی اے، بے اج کا گتاں (کاغذاں) دی تھاویں چاندی دے رپے ہوندے تاں

بوریاں ای بھریاں جاندیاں۔“

”تاں وی تاپا اکو بوری وچ آ جانے سن۔“

”ہویانہ پر ساڑے لوکاں لئی چار ہزار بڑی چیز اے۔“

”ہاں چیز تاں بڑی اے پر ایس دے دس بھائیواں ہاں، ونڈے سر چار سو ہی پیانہ۔ ایدو وں گھٹ ٹھیکہ

کھنڈے مل دا اے تاپا۔“

”آہو، آہو منڈیا، میں ایہہ تاں نہیں کہند اپنی سانوں ٹھیکہ مہنگا پیا اے۔“

”پورے سوز کھنڈے جامنواں دے۔“

”توں ایہہ دس کر پئے دو نے ہو جان گے کہ نہیں؟“

”کیوں نہ ہوں گے تاپا! رہنے سیر نہیں جامنواں کل! سوار پئے وی وچ لینے آں“ گنگو دے ایس طرح

ہامی بھرن نال تائے دادل ضرور دو تا ہو گیا تے تاپا اپنے ونڈے رکھاں دی را کھی کرن لئی انج اٹھ کے چلا گیا

جویں اج اوہدے لک داکب تھوڑا جیہا گھٹ گیا ہووے۔

گنگو داک ہوکا ایس طرح نکلیا۔ جویں اوہدے جوان لک وچ تھوڑا جیہا کب پے گیا ہووے۔ تے

وہ پھیر منجے اتے لسا پے گیا۔

تاپی دیاں باہواں وانگ تاپی دیاں یاداں نے گنگو نوں گھٹ کے چھپی پالنی تے اج پھیر گنگو داجیا کر آیا

کہ گھٹو گھٹ اوہدی اک ہڈی ضرور مٹ جائے۔ اک پبلی۔

تاپی گنگو دی منجی نالوں دون کھول کے آکھدی ہوندی سی ”گنگو ایہہ رسا لے پینگھ پادے۔“

”جھیلے“ کہدے جامنو دے رکھ نال وی پینگھ پئی اے؟“

”توں پاتے سہی۔“

”پاداں کس طرح؟ جامنواں دے ٹاہن بڑے کچے ہوندے نہیں۔“

”تینوں کہہ جے لتاں باہواں ٹٹن کنیاں تاں میریاں، توں پادے کھاں پینگھ“

مینوں تیریاں لتاں باہواں دا فکر نہیں، پر توں آپے سوچ میرے جامنواں دا کنہا حرج ہو جاوے گا۔“

تے ایس جگہ تاپی چیز جاندی ہوندی سی۔ پھیر گنگو اوہنوں باہواں توں پھڑ کے بڑیاں بھواٹنیاں دیندا

سی، تے آکھدا سی ”بس پینگھ اتے دی انج ای جھوٹے ہوندے نہیں۔“ تاپی جدوں ڈاڈھی تنگ پے جاندی سی

گنگو اوندے نال اک شرط منجدا ہوندا سی کہ جے تاپی اوہنوں آڑوواں دے گیت سنائے گی تاں پھیر گنگو اوہنوں ہور بھوانیاں نہیں دیوے گا۔

”سناواں گی، سناواں گی، رہا سناواں گی“ تاپی جدوں ایہہ گل کئی وار آکھ لیتدی تاں گنگو اوہیاں باہواں جھڈویندا سی۔ پھیر تاپی بڑے لور وچ گاؤندی ہوندی سی۔

آڑوے دا بوٹا اساں پانی دے دے پالیا۔

آڑو کھائے لوکاں اساں کوڑا جفر جالیا۔

..... آڑوے دا بوٹا.....!“

تے پھیر تاپی اپنا گیت ادھ وچالے توڑ کے آکھدی۔ ”بھیر یا تیرے جامنو تو تے تک گئے۔ اوہ دیکھ!“ گنگو جدوں گھبرا کے جامنو دے رُکھ ول دوڑ دا، تاپی دا لاکے نس جاندی، تے نس دی نس دی آکھدی ”اک منڈے نوں جھٹھایا۔ اونٹھ کے گھوڑے لایا۔“

وساں ورھیاں دیاں ایہناں یاداں نے اج گنگونوں پہ نہیں کہو جیہی گھٹ کے جھمی پانی، گنگو دے من دی کوئی ناز مڑک گئی تے گنگو دیاں اکھاں وچ پانی آ گیا، گنگو سوچن لگا توں جھٹھایا نہیں سی تاپی، توں سچ ہی آکھیا سی، میرے جامنواں نوں تو تے تک گئے تے تیرے آڑو لوکاں نے کھائے۔“

پھیر گنگونوں اک گل ایس طرح چیتے آئی جو یں اوہنے اپنے دندان نال جامنوں دیاں گنگاں جتھ لیا ہوں۔

”تاپی دے پیو نے گنگو دے پیو نوں ہامی بھری سی کہ اوہ تاپی دا دیاہ گنگو نال کر دیوے گا۔ پر جدوں تیسرے ورھے گنگو دا پیو بیمار پے گیا تے گنگو نے ٹھیکے لئی جوڑیا ہو یا رہیا اوہدی بیماری اتے لا دتا تے جدوں اوس ورھے گنگو جامنواں دا ٹھیکانہ لے سکیا تاں تاپی دا پیو زبانون مکر گیا۔ تے اوہنے تاپی نوں ہور کدھرے دیاہ جھڈیا۔ گنگو ایہو جیہاں سوچاں نال جامنواں دیاں گنگاں جتھ اپیا سی کہ تاپیا چھو پئی جیہی منجی دی ہیہ تے آن بیٹھا۔ گنگو لکھجھ کے سوچن لگا ”اج تائے نوں کیہ ہو یا اے، اپنے جامنواں دی راکھی کرن دی تھاں اج ایہہ میری منجی دے دوا لے بھون ڈیہا اے۔“

”اک گل کرنی سی تیرے نال!“

”دس تاپا!“

”بھئی توں مختار جو پایا، تیرے پیچھے بنا اسیں کوئی گل زبانون نہیں ٹک سلدے۔“

”دسیں وی تاپا کیہ گل اے؟“

”خورے تینوں چیتا اے کہ نہیں، اک تیرے جودا یار ہوندا ہی اوہ تاں کوئی تن ورھے ہو گئے مر گیا،

اوبہ دی دھی ہوندی سی تاپی، چھوٹی ہوندی تیرے نال کھیڈ وی ہوندی سی۔“

گنگو انج تر بھک کے منجی اتوں انھ بیٹھا، جو یں اک دو نہیں پورے دجھاہ منگو منجی وچوں نکل کے اوبہ

پنڈے اتے لڑ گئے ہون۔

”کیتھے چلیا میں انھ کے؟“ تاپے نے حیران ہو کے پچھیا۔

”کدھرے نہیں“ گنگو نے گھابر کے جواب دتا۔

”تاپی دے مرد دا ایس واری کدھرے کم نہیں بنیا۔ بڑی دوروں چل کے آیا اے۔ تے آہندا اے پئی

جو یں جانہ اے اوہیہ اے پئی وی پالووالیس ٹھیکے وچ۔“ گنگو تاپے دے سونہ ول دیکھدے دا ویلہ دارہ گیا۔

”جے تیری نہیں مرضی تاں نہ سہی گنگو، مینوں تاں ایویں ہی اوبہ اے اتے ترس آ گیا سی۔ اوبہ اے اتے

وی کا بنوں۔ اوس کڑی تاپی اتے، وچاری تے ڈاڈھی منت نال آکھیا سی!“

گنگو اول زور زور دی دھڑکن لگ پیا تے اوہنے زکھ دے تنے نوں ایس طرح گھٹ کے پھڑیا جو یں

اوبہ بے پیراں پٹھاں زمین ہلدی ہووے۔

”میں تاں اوبہ صاف آکھ دتا سی پئی ساڈا مختار گنگو اے، پس ہاں کرے تاں ہاں، نہ کرے تاں اوہ۔“

”میں کاہہ مختار ہاں تاپا!“ گنگو نے وراگ کے آکھیا۔

”نہ بھئی اسیں تے جی گل کرنے آں، انج آکھن نوں بھاویں اسیں دس سے جنے ہاں، ایس ٹھیکے دے

ساجھی وار پراپیہ ٹھیک تیری محنت نال ہی ملیا اے ایس لئی۔“

”نہیں تاپا ایہہ گل نہیں توں سگوں وڈا وڈیرا میں، انج نہ آکھیا کر“ گنگو نے نمی چھپی آواز وچ کہیا۔

”تاں پھیر ہاں کہ دیاں سو؟“ تاپے نے چھیتی نال پچھیا تے اگوں اوس آکھیا۔ ڈاڈھے نما نے جے ہو

کے اوہ دوویں میرے منجی اتے بیٹھے تیری منظوری اڈیکدے پئے نہیں۔

”میں کدے تیرے کیتی توں موڑیا اے“ گنگو نے اک ہوکا بھریا۔

”تاپی جی آہندی سی۔“ تاپے نے خش ہو کے کہیا۔



”کیہ کہندی سی تاپی؟“ گنگو نے جھستی نال چھیاتے اوہدے پنڈے وچ اک جلون پھر گئی۔  
 کہندی سی جے گنگو جتارے تاں اوہ مینوں نہ نہیں کرن لگا۔“ تائے نے دلیر ہو کے دسیا۔  
 ”اچھا؟“ گنگو حیران ہویا۔

”لے ایہ ہرای لگی آؤندی اے خورے۔ ویکھ کھاں ساہنے اوہوئی اے؟“  
 تائے نچھ لائی اوہ دیاں بڑھیاں اکھیاں ہو ر سگڑھیاں، تاپی نیزے آ پچھی سی۔ تائے نے پچھان لئی تے  
 منجی اتے بیٹھا بانہہ اگے کر کے تاپی نوں آکھن لگا۔ ”آ جا کڑیے، آ جا۔ تینوں آکھیا سی تاں کہ گنگو تینوں نہ نہیں  
 کرن لگا۔“

تاپی کول آگئی تے گنگو ول ویکھدی تائے نوں پچھن لگی۔ ”بھلا تاپی گنگو نوں میرا ناں چیتے سی؟ توں چیتے  
 کرایا ہو دے گا۔“

”توں وی کیہ گلاں کرنی ایں کڑیے، چھوٹیاں ہونداں تیں کٹھے کھیڈ دے رہے۔ اک تھالی وچ  
 کھاندے رہے۔ ایہہ بڑیاں جداں پندا ہونداں۔ تیرے نال۔“ تائے نے ملھار نال آکھیا۔  
 ”سچ تاپا؟“ تے تاپی کوڈے کول منجی پٹھاں زمیں اتے بہہ گئی۔

”منجی اتے بہہ کڑیے، بھنجنے کاہنوں ہندی ایں؟ تائے نے آنکس نال کہیا۔  
 ”منجی داداں چھہہ اے“ پتہ نہیں گنگو دے مونہوں کیوں انج نکل گیا اوہدی آواز وچ دلا روئی سی تے  
 روس وی۔

”تاپی نے اک وار چمک کے گنگو ول ویکھیا تے پھیر ہوئی جیہی تائے نوں آکھن لگی۔ ”سچ تاپا گنگو  
 مینوں چھوئی ہندی نوں بڑا کھجاندہ ہوندا سی۔ میرے کولوں بڑیاں شرطاں کرواؤندا ہوندا سی۔“  
 ”کاہدیاں شرطاں؟ تائے نے لاڈ نال پچھیا۔

”بڑیاں شرطاں۔“ تے تاپی سوچن لگ پئی۔ پھیر سر نیواں پاسے آکھن لگی۔ ”مینوں اینیاں بھوانیاں  
 دیندا سی کہ میرا سر بھوں جاندہ سی۔ تے او ناچ مینوں نہیں سی بھڈ دا ہوندا جتا چر میں گون دا قرار نہیں سی کردی۔“  
 ”پھیر توں کیہ گاؤندی ہندی سی؟“ تائے نے ہتھ نال تاپی دے سراتے پیار دتا۔ ”میں کیہ گاؤندی تاپا  
 بس مینوں اکو گیت آؤندی تے اوہ گیت ایہہ گھڑی مڑی سندار ہندا سی۔ کجھ دی نہیں سی۔ ایویں آڑواں دا  
 اک گیت سی۔“ پتہ نہیں ایہہ گل کہندی ایں تاپی دیاں اکھاں کیوں بھرا ئیاں، اوہنے اک وار گنگو ول ویکھیا تے

پھیرا کھاں پرانہ کر لیاں۔ شاید آج اونہوں اپنے اوس گیت والے راکھے دی قسمت اتے رون آ گیا سی جو  
آزادواں نوں پانی دے دے پالدا ہے پر، مونہ نہیں لاسکدا۔

گنگو دے پیراں وچ پتہ نہیں کیڑے کل مٹکے ہوئے سن، اوہ جتھے کھلوتا او تھے دا او نٹھے کھلوتا رہیا۔  
اچانک تاپی دی نظر اتانہہ جامنواں دے رکھول پئی، مچ پچھے تو تے اک ماہن اتے بیٹھے ہوئے سن تے جامنو  
نکدے پئے سن۔ تاپی چھستی نال انھ کے توتیاں نوں اڈان لگی۔

گنگو دے دوویں بال جیہڑے رکھ دے پر لے پاسے اک منجی اتے سٹے پئے سن۔ انھ بیٹھے تے آ کے  
گنگو دیاں لتاں نال چمبڑ گئے۔ گنگو اک ہوکا بھر کے آکھن لگا۔ "رہن دے تاپیے کاہنوں اڈانی ایں توتیاں  
نوں، جامنوتاں بن سکے ای گئے نیں۔"

(پبی انتر: جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

## کرماں والی

ڈاڈھی سوئی تندوری روٹی سی پرہیزی دی تری نال چھوئی ہوئی گراہی مونہہ نہیں سی لان ہندی۔

”ایڈیاں مرچاں.....“ میں تے میرے دوں بچے سی کراٹھے ساں۔

”ایتھوں بی بی جٹاں والا نگھا بہت اے۔ دارودی دکان وی اتھے کوہاں وچ اکوای اے۔ جٹ جدوں

گھٹ پی لیندے نیں پھیرا ہوا مرچاں والا سلوٹا منگدے نیں۔“ تندور والا آکھدا پیاسی۔

اتھے.....جٹ.....

آہو بی بی گھٹ داروتاں سارے ای پیندے نیں پر جدوں کوئی بندہ شند مار آون، اودوں ذرا بہتالی

جاندے نیں۔

اتھے ایہو جیہاں وارداتاں.....

اچے تاں پرسوں چوتھے کوئی چٹ جتے آ گئے۔ اک بندہ مارا آئے سن۔ داہوا چڑھی ہوئی سانے، گلے کھورو

پان، اوہ دیکھاں میریاں تن کرسیاں نیاں پٹیاں نیں، ایہہ تاں رب بھلا کرے پلس والیاں دا، اوہ چھیتی پھڑ

کے لے گئے اوبتاں نوں، نہیں تے خورے میرے چلھے دیاں اناں وی نہیں سی لہنیاں..... پرکھنی وی

تے اسیں اوبتاں دی ای کھاتے آں۔

کوشلیا ندی دیکھن وا خطہ مینوں اوس دن چندی گڑھوں پھیراک پنڈ وچ لے گیا سی، پر مرچاں توں

تردی گل دارو اتے پہنچ گئی، تے دارو توں خون خرا بھاتے..... تے میں اوس پنڈوں چھیتی چھیتی پچیاں نوں

لے کے واپس مڑن لئی کالھی پے گئی۔

تندور چٹکا لنبیا ہو یا تے اندروں کھلھا سی تے اندر وار اک پاسے جھے ست خالی بوریاں تان کے

ہیزا پردا کچا ہو یا سی اوہ بے بچھے ڈٹھیاں ہو یاں تن مچیاں دے پاو سے دسدے سن کہ تندور والے دے بال

بچے تے تیوں وی او تھے رہندے سن..... مینوں لگا، آخر کوئی ایذا خطرہ نہیں او تھے تیوں دی رہائش ہے، عزت دی رہائش ہے۔

کسے تیوں جتھ نے ناٹ واکنڈ ہا سوڑیا، باہرنوں جھا کیا، پھیر جھا کیا تے پھیر اوہ باہرنوں جھا کیا، پھیر جا کیا تے اوہ باہر آ کے میرے کول کھلو گئی۔

”بی بی تو مینوں بھجھانیا نہیں؟“

”نہیں تاں“

اوہ اک سادی چیمبی تے اصلوں جوان تیوں سی، میں اوہ دے سونہ ول ٹکدی رہی پر مینوں کوئی بھلی دوسری گل وی چھیٹے نہ آئی۔

میں تے تینوں سخاں لیاے بی بی!.....

’پروں، نہ سچے پر اورں توں اتھے آئی سیں ناں؟‘

”آئی تے ساں“

”ساہنے، ان وچ اک جج اتری ہوئی سی۔“

”ہاں۔ ایہہ وی مینوں یاد اے“

”او تھے توں مینوں ڈولی وچ بیٹھی ہوئی نوں ریپا دتا سی۔“

گل یاد آئی۔ دو ورھے ہوئے میں چند ہی گڑھ گئی ساں۔ او تھے نوں ریڈیو سٹیشن کھانا سی تے پہلے دن دے ساگم لئی، میرے دلی دے دفتر نے مینوں او تھے اک نظم پڑھن لئی بھیدجیا سی۔ سونہ لگھ تے اک بندی کوی جالندھر سٹیشن ولوں آئے سن۔ ساگم جھپتی ہی ختم ہو گیا سی تے اسیں تن چار لکھاری کوٹلیا ندی دیکھن واسطے چند ہی گڑھ توں ایس پنڈ آ گئے ساں۔

ندی کوئی میل ڈیڈہ میل اترائی اتے سی تے واپسی جز حائی چڑھدیاں اسیں سارے چاہ دے اک اک گرم پیالے واسطے ترس گئے ساں۔ ساریاں توں صاف تے کھلھی دکان ایہو جاپی سی۔ ایتھوں اسان چاہ دا اک اک گرم پیالہ پیتا سی۔ اوس دن ایس دکان اتے بھجھدے ماس تے تندوری روٹیاں دے نال نال منٹھیاں دی وی چٹلی بھڑ بھڑسی۔ تندور والا آکھدا پیا سی۔ ”اج ایتھوں میری بھنویں دی ڈولی لنگھنی اے، میری وی تاں خاطر بندی اے تاں.....“

تے پھیر سامنے میدان وچ ڈولی اتر پئی کسے پچھلے پنڈوں آئی سی۔ اگے جانی سی، راہ وچ مامے نے سواگت دتا سی۔

”ویاہ دی عجیب چیز اے، آوندیاں کندے رنگ بندھ اے، تے جاندیاں.....“

ساڈے وچوں کسے نے آکھیا سی، تے چاہ دے گھٹاں نال رنگ دی فلاسفی وی گرم ہوندی گئی سی۔

”ٹھہرو میں نوں ووہنی دا مونہہ ویکھ آواں..... بھلا اوہدے مونہہ اتے اج کیہو جیہا رنگ

اے..... مینوں یاد اے میں آکھیا سی۔ تے اگوں میرے ساتھیاں نے جواب دتا سی۔ ”سانوں تے کسے

ڈولی دے نیڑے نہیں جان دینا، تسیں ویکھ آو۔ پر خالی ہتھیں نہ ویکھنا۔“

میں ہسدی ہسدی ڈولی کول چلی گئی ساں۔ ڈولی دا پردا اک پاسیوں چکيا ہو یا سی، میں کول ہٹھی ہوئی

تائیں نوں پچھیا سی ”میں ووہنی دا مونہہ دکھا لوں؟“

”بی بی! جی صدقے جاواں ویکھناں..... ساڈی کڑی ہتھ لایاں مکی ہوندی اے۔“

تے سچ سچ کڑی وی شگڑا پوری ہتھ وچ جیہڑا مسکراہٹ دامتوی لٹکدا اپیا سی اوہدے رنگ جھلکا کوئی سوکھا

نہیں سی۔

میں اک ریپا اوہدی ہتھ وچ رکھیا تے جدوں مڑی، میرے ساتھی آکھدے پنے سن۔ ”گھڑی کو پہلاں

جدوں تساں نظم پڑھی سی، کالج دیاں کنیاں کڑیاں رپے رپے دے نوٹ اتے تہاڈے کولوں دستخط کروائے

سن۔ پرائس وچاری نوں کیہ پتا کہ راج ایہہ ریپا اوہنوں کیہنے دتا اے۔ کدھرے جان دی ہوندی، دستخط ای کروا

لیندی.....“

ایہہ پراردی گل اے مینوں سکویں دی سکویں چیتے آگئی۔

”توں..... اوہ ڈولی والی کڑی؟“

”آہو بی بی۔“

پتا نہیں کہہ سہ حادثے نے دو ورھیاں وچ اوہنوں کڑی توں تیوین جیہی بنا دتا سی حادثے دے چھ

اوہدے مونہہ اتوں لہندے پنے سن۔ پر پھیر مینوں پتا نہیں سی لگدا میں اوہنوں کس طرح کچھ پچھاں۔

”بی بی میں تیری تصویر اخبار وچ نکلی سی۔ اک واری نہیں دو واری اتھے دی کئے ای لوک آوندے میں

جیہناں کول اخبار ہوندی اے کوئی تے روٹی کھاندیاں پھیرا تھے ہی ہتھڈ جانے نہیں۔“

”جج تے پھیر توں پچھان لئی؟“

”لے میں تے جھٹ پچھان لئی سی۔ پر بی بی اوہ تیری تصویر کیوں چھاپدے نیس؟“

میرے کولوں چھیتی، چھیتی جواب نہ دین ہویا۔ ایہو جیہا سوال اگے کدی کسے نے کیتا نہیں سی۔ کجھ سنگ کے میں آکھیا۔ ”میں نظماں، کہانیاں لکھنی آں ناں.....“

”کہانیاں؟ بھلا بی بی اوہ کہانیاں جیاں ہوندیاں نیس کہ جھوٹھیاں؟“

”کہانیاں تے جیاں ای ہوندیاں نیس انج ناں سارے جھوٹھے ہوندے تاں کہ پچھانیاں نہ جان۔“

”توں میری کہانی وی لکھ سکنی ایں بی بی؟“

”جے توں آکھیں تاں میں ضرور لکھ دیاں گی۔“

”میرا ناں کرماں والی اے، میرا تے بھادویں نان وی جھوٹھانہ لکھیں۔ میں کوئی جھوٹھو تھوڑی بولی آں۔

میں تے جج آکھنی آں۔ پر میری گل کوئی نہیں سندا۔ کوئی وی نہیں سندا.....“

تے میرا ہتھ پھڑ کے مینوں ٹاٹ دے کچھ دھمی ہوئی منجی تے لے گئی.....

”جدوں دو ہنیاں میرا میچا لین آئیاں۔ اوہناں وچ اک کڑی میرے ہان دی سی۔ اصلوں میرے

جڈی۔ اوہ دوروں نیز یوں میری نان لگدی سی۔ میرا جھکا تھن من کے آکھن لگی۔“ نری میرا ہی میچا اے۔

بھابی توں فکر نہ کر جیڑے کپڑے سیواں گی تینوں ڈاڈے پورے آون گے۔“

تے چچی چچی وری دے جنے وی کپڑے کن مینوں ڈاڈھے سوہنے پورے آوندے سن۔ اوہیو نان

میرے کول کنے مینے رہی، تے پچھوں وی میرا جیڑا کپڑا بن داسی، اوہیو سیوندی سی۔ میرے ملھا روی بڑے

کردی سی۔ مینوں آکھدی ہوندی سی ”بھابی بھادویں میں دو مہینیں آواں تے بھادویں چھیس مہینیں پر توں کسے

ہور کولوں کپڑا نہ سواویں.....“

مینوں اوہ چٹکی لگدی سی، صرف اوہی اکو گل مینوں ماڑی لگدی سی، میرا جیڑا کپڑا سیوندی سی پہلوں

آپ پا کے دیکھدی سی۔ آکھدی سی ”تیرا میرا کو میچا اے۔ دیکھ مینوں کہیا پورا اے۔ تینوں وی ڈاڈھا پورا

آدے گا۔ تے اوہ سارے کپڑے پان لگیاں میرے من وچ آوند اہوند اسی۔

”کپڑے بھادویں نویں نیس پر ہن تے اوہا اتاریں ناں؟“

ری نال ننگے ہوئے ٹاٹ دا پردا سی۔ وان دی ڈھلی جیہی منجی سی، کھیس دی ادھورا ناسی، کڑی الھڑتے ان

پڑھی، پر ایسہ خیال ایذا نازک و ایذا کو لا..... میں تر بھٹ گئی۔

”پر بی بی میں اپنے من دی گل اوہنوں کدے نہ آکھی۔ متاں و چاری داجی برا ہو جاوے۔“  
 ”پھیر؟“

”پھیر سینوں کوئی درھے ڈیڈھ پھوں پتا لگا دچوں ہی کسے نے دس دتا، اوہ دیاں تے میرے گھر والے  
 دیاں لکیاں ہونیاں سن۔ ایسہ اوہ داد دے پوتریوں بھرا لگدا سی۔ پر اک اوہ دے سکے بھرانوں ایس گلوں بڑی  
 کوز چڑھدی سی۔ اوہ تے اک واری اپنی بھین دی گردن لاہ دین لگاسی۔

کسے نے مینوں ایسہ دی دسیا کہ گھوڑی۔ پیلے اوہ بھین دے ساکوں جدوں واگ گندن گلی، واگ گندی  
 نون منشی آگئی سی۔ اتھر دواں نال بھیجی ہوئی کرماں والی نے میرا ہتھ پھڑ لیا۔ ”بی بی! توں میرے من دی گل سمجھ  
 لے، میرے کولوں اتار نہیں پایا جاندا۔ میریاں گونے تے کناریاں والیاں سٹھناں، میریاں تریاں والیاں  
 چنیاں تے میرے سلمیاں والے جھلکے۔ سارے ہی اوہ اتار سن، تے میرے کپڑیاں وانگ میرا گھر والا  
 دی.....“

کرماں والی دے بول اگے میری قلم نیوں گئی، کہو دے لکھاری نے ایہو جیہا فقر لکھ جانا ہے.....  
 ”ہن بی بی میں اوہ سارے کپڑے لاہ آئی آں، اپنا گھر والا دی۔ اتھے مامے مامی کول آگئی آں۔  
 اہناں دا گھر پوچھنی آں، میز دھونی آں، تے میں اک مشین وی رکھی ہوئی اے۔ چار کپڑے سیوں یعنی آں روئی  
 کھالینی آں، بھاویں کھد و اجڑے تے بھاویں لٹھے دا۔ میں کسے دا اتار نہیں پاندی۔ میرا مامی صلیح کران نوں پھر  
 دااے۔ میرے من دی گل نہیں سمجھدا۔ میں جس طرح دی جیونی پئی آں۔ ایسے طرح جیوں لاں گی۔ سو رکھ  
 نہی سکتی توں صرف اک وار میرے من دی گل لکھ دے.....“

کرماں والی دے جہڑے پنڈے تال کہانی واپری سی، اوہنوں میں اک وار آہنیاں باہواں وچ گھنیا،  
 جاپیا کڈا نرو یا پنڈا ہے، کڈا نرو یا من، ایسہ دوالا جتھے میں گھڑی کو پہلاں مرچاں توں دارواتے، تے دارو توں  
 خون خربے اتے پچھدی گل توں گھبرا گئی ساں۔ اتھے کرماں والی کڈیاں دلیریاں نال جیوندی پئی ہے.....  
 باہر سڑک اتوں شملے وٹوں آوندیاں سونریاں لٹھدیاں بن، تے جیہناں دیاں سواریاں، ریشمی کپڑیاں  
 وچ لہٹیاں ہونیاں، کئی دار پلے کو کسے دکان اتے چاہ دے پیا لے لئی کھلو جان دیاں بن۔ یاں سگرت دی ڈی لئی،  
 یاں نرم تندری روئی لئی، اوہ جہناں دے گل پچے ہوئے ریشمی کپڑے پتا نہیں کیہدا کیہدا اتار ہوندے

ہن.....تے کرماں والی جہنے گل وچ کھدروی قمیض پائی ہوئی ہے جیہڑی اپنے پنڈے اتے کسے دا اتار  
نہیں پاسکدی.....

”بی بی! میں تیرا وہ رپیا سا نبھ کے رکھیا ہویا اے.....“

”جج جج ہن تک؟“

”آہو بی بی! اوہ رپیا اوہ میں اوس ویلے اپنی ناین نوں پھڑا تا سی تے پھیر اوس توں دوسری بھلک دی  
اوہ گل سی جدوں میں تیری تصویر تکی سی۔ میں ناین کولوں اوہ رپیا لے کے سا نبھ لیا سی۔ توں بی بی مینوں اوس  
رہنے دے نوٹ اتے اپنا ناں لکھ دے! پھیر توں جدوں میری کہانی لکھیں گی، مینوں ضرور بھیجیں۔ میں گرکھی  
دے اکھر چنگی طرح اٹھا لینی آں۔ توں گرکھی وچ لکھیں بی بی!“

تے کرماں والی نے اٹھ کے منجی پٹھاں دھریا ہویا ٹرک کھولیا۔ ٹرک وچ اک لکڑی مسند و قڑی سی۔  
اوہنے رہنے دا یہ کیتا ہویا نوٹ کھولیا۔

”میں اپنا ناں لکھ دینی آں کرماں والیہ۔ میں خورے کنیاں کڑیاں دے نوٹاں اتے اپنا ناں لکھیا  
ہو دے گا۔ پراج میراجی کر دا اے توں میرے اک نوٹ اتے اپنا ناں لکھ دے، کہانی لکھن والا وڈا نہیں ہوندا،  
وڈا اوہ دے جہنے کہانی اپنے پنڈے اتے جھل اے۔“

”مینوں چنگی طرح لکھنا نہیں آوندا۔“

کرماں والی سگ گئی، تے پھیر کہن لگی۔ ”توں میرا ناں کہانی وچ ضرور لکھیں۔“

”ہاں! میں اوہی نان تیرے ہتھاں دا لکھیا ہویا تیرا ناں اپنی کہانی دا ناں رکھاں گی۔“ میں بنوے وچوں  
نوٹ وی کندھ لیا تے قلم وی۔

”کرماں والیہ! اج تیری کہانی لکھ رہی آں! اوہی رہنے دے نوٹ اتے لکھیا ہویا تیرا ناں، اج ایس  
کہانی دے متھے اتے چکی بندی وانگ لگا ہویا اے۔“

ایس کہانی نے تیرا کجھ نہیں سنوار سکتا۔ پراہر۔ بھردسا رکھیں۔ اوہ دل وی تیری بندی نوں پر نام کر دے  
ہن جیہناں دے اپنے خون دارنگ ایس تیری بندی دے رنگ نال رلد اے۔ تے اوہ متھے وی اک شرمندگی  
نال ابھدے اے جھکدے ہن جیہناں نے اپنے گلیاں وچ پتا نہیں کبھدے کبھدے اتار پائے ہوئے ہن۔

(پہلی انٹر: جمیل احمد پال)



## اک نمبر دافرق

دیو کی بھینٹوں میں پہلی وار اردوں دیکھیا سی جدوں اوہنے روپ نگر وچ اک نکا جہیا مکان کرائے آتے لیا سی۔ مکان نوال نوال بنیا سی، اہے اوہدے وچ بجلی نہیں سی آئی اوہنے کمیٹی نوں بجلی واسطے درخواست دی سی۔ تے جدوں درخواست منظور ہو گئی سی، میں اوہدے گھر بجلی دا کھپا گڈ کے باہر لی سڑک آتے لگے ہوئے پول نالوں بجلی دیاں تاراں کھچ کے جوڑیاں سن۔ میں اوہناں وناں وچ بجلی گھر دا کھوٹا جیہا مستری ساں۔ میں دیوں جیوں بجلی دی تار واسطے کندھ وچ گنیاں لاؤند آگیا، دیو کی بھینٹ دامنہہ چمکدا گیا۔ مینوں انج چاہیا کہ اوہدے کمرے وچ کوئی بیتی اہے ٹھہر کے جگے گی، پر اوہدے مونہہ آتے اک بقی بٹنے جگ پئی سی اوہہ آکھدی پئی سی اتے راتیں اوہ آوے گا۔ تاں اوہدا کمر اوہنوں کڈا سوہنا لگے گا۔

کھبے نال رسا، ٹھہر کے جدوں میں کھبے دے آتے چڑھیا، دیو کی بھینٹ پٹھاں کھلوتی انج گھاہر بیوٹی سی جو میں اوہدا آ پنا بھرا جاں آ پنا پتر اک اوکھی تھاویں لکھیا ہو یا سی۔

تے فیر جدوں دیو کی بھینٹ دے کمرے وچ بجلی جگ پئی اوہ چھٹی نال میرے واسطے تے میری ساتھی مستری واسطے چاہنا لیا، آکھن لگی۔ "اج میرے گھر چائن آیا اے ویر! ایس لئی بھتوں پہلاں تہاںوں مونہہ منھا کرنا چاہی والا۔ تسمیں رسیاں نال لک لک کے تے بجلی دے خطریاں نال کھیڈ کھیڈ کے لوکاں نوں چائن وندو۔ او۔"

میں تے میرے ساتھیاں نے ایس توں پہلاں کنیاں گھراں وچ بجلی لائی سی، کدے کسے نے سانوں "چائن وندن والے" نہیں سی آکھیا، تے مینوں چٹا سی کہ اگوں دی کسے نے ایہہ نہیں آکھنا۔ ایس لئی مینوں انج چاہیا کہ اسیں جھڑے رسیاں نال لک لک کے تے بجلی دے جھٹکیاں نال کھیڈ کھیڈ کے روز دنیا وچ چائن کر دے ساں، تے آپ ہر پلی اک جو کھوں دے میزے وچ رہندے ساں، اوس دنیا وچ کوئی ایہو جیہا وی سی،

جہڑا سا ڈے مہرے دج چائن کر سکد اسی، تے ایہہ ”کوئی“ دیوکی بھین سی۔

اک گل جہڑی مینوں بھتوں حیران کردی پئی سی ایہہ سی کہ دیوکی بھین دے گھر دیاں دلیزیاں دج کھلو  
کے انج نگدا سی جویں کوئی اک مندر دیاں دلیزیاں دج کھلوتا ہووے تے دلیزیاں توں اندر لنگھن لکیاں  
اونوں ایہہ خیال آؤندا ہووے کہ پیر دھوکے اندر جانا چاہیدا ہے۔

اندر اک پاکیزگی سی، جہڑی مندر دی سورتی دانگ صدیاں پئی سی تے اندر دی پوجا دانگ نت نویں  
سی۔

ایہہ خیال مینوں بھتوں پہلاں اوس ویلے آیا جدوں بجلی دیاں تاراں جڑ گئیاں تے میں دیوکی بھین نوں  
آکھیا اوہہ گھر دیاں ساریاں بتیاں جگا کے ویکھے۔ اوس ویلے دیوکی بھین باہر لے برانڈے دج کھلوتی ہوئی  
سی، اوہ جھمتی نال برانڈے دی تھی جگا کے ویکھ سکدی سی، پر اوہنے آکھیا ”نہیں، ایہہ جیتی پنچھوں جگا واں  
گئے۔ پہلاں چائن اوہدے کمرے دج ہووے گا۔ تے دیوکی بھین نے اپنے ادب نال اک کمرے دا بوہا  
کھولھیا جویں اوہ مندر دے پٹ کھولھ رہی ہووے۔ بجلی جویں چائن دے مٹھلاں دی تھالی سی، جو  
پہلاں اوہنے ساری دی ساری اوس کمرے دج چڑھا دیتی تے فیر چائن داک اک مٹھل لے کے نال دے  
کمرے نوں، پچھلے کمرے نوں رسی نوں، غلٹخانے نوں تے برانڈے نوں پرشاد وانگوں وٹھ دتا۔

میں اوس کمرے دج جھات پائی۔ سارے کمرے دج اک ہریا غلٹچا انج وچھیا ہو یا سی جویں پیراں  
پٹھاں موٹا موٹا ہریا گھاہ ہووے۔

اک پاسے پیلے رنگ دا دیوان سی، تے اوہ انج جا پدا سی جویں اک ہرے بچے دج پیلے مٹھلاں دی  
کیاری ہووے۔

اک پاسے اچھی ڈھوہ والیاں تن کرسیاں سن سادے رنگ دیاں، جو آٹیاں لمیاں پٹھاں نال انج  
لگدیاں سن جویں تن سرودے بوئے ہوں۔

تے کمرے دے دچکار اک نکاجھیا میزی۔ جدھے اُتے اک مرد دی تصویر ایس طرحاں پئی ہوئی سی،  
جویں کسے کار میروا گھڑیا ہو یا مت ہووے۔

ایس سارے بچے دج صرف اک چشمے دی کرسی، اوہ دی جدوں جی جگی، مینوں انج لگا جویں دھوپا پانی  
دی دھار دگدی پئی ہووے۔

بجیب نکل سی۔ دیوکی بھین دے گھر وچ کھلو تیاں اکو سے اک مندر دا دھیان دی آؤندا سی تے اک باغ دا خیال وی آؤندا سی۔

فیہ دوسری وار میں دیوکی بھین نوں اودوں وی بھیا جدوں اوہ دے گوانڈھیاں نے اپنے مکان وچ اک بور کر اپا لیا تے مینوں کیوں ولوں ایس لئی دیوکی بھین دے بھیب جیسا گیا کہ میں اوہ دے گھر لگا ہویا بجلی دا کھسبا پہلے کمرے اتوں اکھیر کے دوسرے کمرے آتے لا کے آواں کیوں کہ اوہ یاں تاراں گوانڈھیاں دے نویں کمرے اتوں لنگھ دیاں سن تے اوہ کہی دے اصول مطابق نہیں سن لنگھ دیاں چاہی دیاں۔

”چنگا دیر! اوہ تھے لا دے! دیوکی بھین نے آکھیا پر جدوں میں کمرے دی کندھ وچ چھیک کرن لگا، دیو کی بھین ٹھٹھمر گئی، ایہہ چھیک باہر لے پاسے ہی رہن گے ناں! کندھ دے دوسرے پاسے تاں نہیں جان گے؟“

”ایہہ چھیک تاں آر پار ہون گے کیوں کہ کندھ وی نواں چاں دی اے، تے بجلی دا بورڈ وی نواں چاں“ میں آکھیا۔

”کمرے دی کندھ خراب ہو جائے گی۔ چار چھیک، چار چٹاک“  
”فیر قہقی کروالینا۔“

”ایس کمرے دیاں کندھاں اتے میں تیل والا روغن کر دایا ہویا اے۔ فیر جاتاں سارے کمرے نوں کمرے روغن کر دواں..... روغن بڑا مہنگا اے“

”مینوں بتا سی، ایہہ کمرہ، دیوکی بھین دے گھر وچ اوہ کمرہ سی“

جہڑا اک مندر لگدا سی جہڑا اک باغ ورگ سی، میں سوچیں بے گیا۔

”کوئی کل نہیں بی بی! جتھوں پلستر اکھڑ جائے گا، اوہ تھے اک وڈا سا کیلنڈر لا دینا۔ سارے داغ اوس کیلنڈر دی چٹھ پچھے مٹھپ جان گے“ میرے ساتھی مستری نے آکھیا۔

”اوس طرحاں، جس طرحاں لوک نم دی کندھ اتے پاپاں دے داغ لگاؤن لئی دھرم کرم دا کیلنڈر تنگ لیندے نیں؟ جاں وساتج بیوا دا کیلنڈر؟“ دیوکی بھین ڈاؤھی نموجونی ہو کے بولی۔

”چنگا، میں آپنی واہ لا دینداں کہ سارے چھیک کندھ دے باہر لے پاسے ہی رہن، اندر تک نہ جان۔ فیرو دی میں پکا نہیں کہہ سکدا۔ توں بھین اندر لے پاسے اک کپڑا چھادے جے ماسا بھورا ڈگ وی پیا

تاں کمرے دیاں چیزاں نہیں خراب ہون گیاں“ میں آکھیا تے ہتھ وچ چھینی ہتھوڑا پھرنی۔

”نہ دیر! میں اندر کوئی کپڑا نہیں وچانا۔ جے توں من وچ ماسا بھورا ڈنگ بین دی رعایت رکھنی تاں فیر تیری ہتھوڑی ضرور اولیٰ ہو جاوے گی۔ تے دیوکی بھین نے اک لمساہ بھر کے آکھیا، ”ایہ وشواس بڑی عجیب چیز ہندی اے۔ ویر! جے ایہدے وچ کتے شک دی گئی جی موری وی ہو جائے تاں گیرنگھار سی پیندے جاندے نیں“

میں اک وار دیوکی بھین دے مونہہ ول دیکھیا، تے اک وار کندھ ول..... تے فیر جدوں میں کندھ اپت پہلی ہتھوڑی ماری، مینوں چایا، ہتھوڑی میری ہتھ وچ نہیں سی پھڑی ہوئی، اک وشواس دے ہتھ وچ پھڑی ہوئی سی۔ تے بن ایہدی کوئی وی سٹ ایس کندھ دے پار نہیں سی پہونچ سکدی۔

میں آپ حیران ساں کیوں میری ہتھوڑی نے نو انچی کندھ وچ سٹ انچ ڈوٹکھے چٹیک کندھ لے لے تے کندھ نوں دوسرے پاسے اجاں نہ لگن دتی۔ لوہے دیاں سریاں دے مونہہ موڑ کے میں اٹھ اٹھ انچ لسیاں سریاں سٹ سٹ انچاں دے چھیکاں وچ گزرتیاں۔

دیوکی بھین نے جدوں آپنی کندھ دامہاندرا ثابت ثبوت دیکھیا، آکھن لگی۔ ”کیوں ویر میں جھوٹھ آکھیا سی؟ ایہ وشواس بڑی عجیب چیز ہندی اے..... جے توں من وچ ماسے بھورے دی رعایت رکھ لیندا تاں فیر ماسا بھورا کاہنوں کھرچڑی لہہ جانا سی۔“

کئی دن میں وشواس دے فلسفے نوں سوچدا رہیا، تے تیسری وار میں دیوکی بھین نوں اودوں ملیا جدوں آپنے پنڈوں آپنی ماں دائمٹ آیا کہ اوہ من پنڈ وچ اپنے وڈے پتر کول نہیں سی رہنا چاہندی، اوہ میرے کول شہر آؤنا چاہندی سی۔ میں تے میرے دوسا تھی جس کمرے وچ رہندے ساں مینوں پتاسی کہ اتھے میری ماں وی گذر نہیں ہو سکتی، ایس لئی میں کرائے دا اک کمر الھد الھد دیوکی بھین دے گھر جا ہتیا۔

دیوکی بھین کجھ جد سوچدی رہی تے فیر آکھن لگی، پنڈگا ویر! میں آپنا پچھلا کمراتینوں دے دیندی آں، کجھ میرا بھار دی ہولا ہوا جائے گا۔ میرے کولوں سارا کرایا نہیں وتا جاند ا“

”کیوں دیوکی بھین اوہ؟.....“ میں کجھ گھبرا کے دیوکی بھین ول نکلیا۔

”اوہ اتھے نہیں باہر گیا ہوا اے“ دیوکی بھین نے صرف اینا ہی آکھیا تے میں ہور کجھ کچھنا ٹھیک نہ سمجھیا۔ اک مہینے دا کرایا میں دیوکی بھین دے اگے رکھ دتا تے فرمایا۔

تیسرے دن جدوں یہی ماں ہنڈوں آگئی۔ میں آنا منجا بستر اچکلاتے اپنی ماں نوں لے کے دیوکی  
بھین دے پچھلے کمرے وچ آ گیا۔

دیوکی بھین نے جدوں روئی پکائی، میز اُتے انج سوار کے رکھی جو یں بننے کوئی آؤن والا سی۔ فیر گھنڈہ لنگھ گیا  
و لنگھ گئے، چنگلی رات پے سنی، کوئی نہ آیا، تاں دیوکی بھین نے اوس روئی نوں چنگلی طرحاں کچ ڈھک دتا تے  
آپ سویر دی بھی روئی کھا کے سو گئی۔

دوسرے دن دیوکی بھین نے انج ہی کیتا۔ بڑے صبر تال بھری روئی بنائی، میز اُتے رکھی، کنا، چر  
اڈلیا۔ فیر اوس روئی نوں چنگلی طرحاں کچ ڈھک دتا تے بھی روئی کھا کے سو گئی۔

تیسرے دن وی دیوکی بھین نے انج ہی کیتا، چوتھے دن وی انج ہی..... تے روز انج۔  
اک دن میں حیران ہو کے دیوکی بھین نوں پچھیا "اوہ دس کے نہیں گیا کہ اوس نے کدوں آؤنا ہے؟"  
"خیال سی انج آجائے گا، انج نہیں آیا، کل آجائے گا....." دیوکی بھین نے صرف ایسا آکھیا۔

تے میں حیران وادیران سوچدا رہیا کہ دیوکی بھین دا ایہہ وشواس میں کیہو جیسا سی، روز روئی ہی ہو جاندی  
سی، پر اوہ بھرا ہند سی۔ دیوکی بھین روز بھی روئی کھاندی سی، تے بھراوشواس جیوندی سی۔

فیر شاید دیوکی بھین نوں پوسیاں دی بہت تنگی ہوئی، اوہنے اک سکول وچ نوکری کر لئی۔ روز سکول جان  
لگیاں اوہ اک بھری چٹھی لکھدی، تے کمرے نوں چند رامار کے اوہدے کنڈے وچ تنگ جاندی کہ اوہ اپنے  
گھنٹیاں اپنی سکول جا رہی ہے۔ ایسے گھنٹیاں نوں مڑ آ دے گی۔

دیوکی بھین جدوں کالھی کالھی سکولوں مڑدی، اوہ چھٹی انج دی انج کنڈے وچ تنگی ہوئی ہندی۔ نہ  
کوئی پچھے آیا ہند، نہ کسے نے اوہ چھٹی پڑھی ہندی تے دوسرے دن دیوکی بھین فیر نوں تاریخ پا کے نوں چھٹی  
لکھدی۔

اک دن میں بار کے دیوکی بھین نوں کجھ بہتا ہی پچھن لگ پیا تاں دیوکی بھین نے آکھیا، "دیر توں چتا  
نہ کر اوہ اک وار نہیں، مینوں کئی وار چھڈ کے مڑ گیا پر کجھ چر پچھوں فیر آ جاند اے اوہ مینوں چھڈ نہیں سکدا۔"  
"اک وار نہیں، کئی وار؟" میں حیران پریشان ہو کے آکھیا۔

"اک وار گیا تاں مینے پچھوں ہی مڑ گیا سی۔ فیر اک وار چلا گیا تاں کجھ بہتا چلا آیا، فیر اک

.....



بھرنی چھنی لکھدی تے سبے بند سے جانے پھڑپھڑیاں وچ بھراسا بھریندی

دیودی بھین دا بھرا اوہنوں کئی وار لین آیا۔ پراوہ بھرا دے گھر نہ گئی۔ اوہ جویں اوس گھر وچ روکے اک نمبر دی راکھی کردی پئی سی..... وچھوڑا ویہ واری تاں میل کی واری..... تے اوہ نہیں سی چاہندی کہ اوہدا میل اک نمبر پچھوں بار جاوے۔

دیو کی بھین نوں ڈاکٹر نے کئی واری آکھیا سی کہ اوہ مٹن بیچ نہیں سی سکدی۔ پر دیو کی بھین دی جان نہیں سی نکلدی، اوہدی جان جویں اوہدے گلے ہوئے پھیردوں وچ بہہ کے اک نمبر دی راکھی کردی پئی سی..... سب وشواسی پنجاہ واری تاں وشواس اکو جاواری..... تے اوہ نہیں سی چاہندی کہ اوہدا وشواس اک نمبر پچھے رو جاوے۔

اک رات دیو کی بھین دے ساہ اکھڑ گئے۔ اوہنے اپنی بانہہ وچوں سونے دی چوڑی لائی، اپنی انگل وچوں سونے دی مندری لائی تے اپنے سر ہانے پٹھوں نوٹاں داک گنڈھ کڈھ، تے سبھ کچھ مینوں پھڑا کے آکھن لگی..... ویراک میری گل رکھیں گا؟“  
”توں جو کچھ آکھیں دیو کی بھین!“

”نہن توں وڈا مستی بن گیا ایں۔ تیرے کولوں کچھ تاں ودھ کرایا جی سکدا اے۔ میرے پچھوں ایہہ مکان نہ تھندیں میرے والا کمر اتوں آپ لے لوں تے اوہ کمر..... اوہدا کمر..... ایہے دا بچے رہیں دیویں۔ ہر مہینے اوس کمرے دا کرایا دیندا رہویں۔ جتا چڑایہہ پیسے نہیں ملک جاندا اے ایہہ تائن دوور تھیں نہیں ملن.....“ تے دیو کی بھین نے کچھدے کچھدے ساہوں تال آکھیا ”اوہ خورے کدوں آجائے..... خورے آج ہی آجائے.....“

تے مینوں جا بیا کہ دیو کی بھین واساہ اصلوں کھچیا گیا سی فیر میں اوہدی بیٹھ دیکھی، مازی مازی چلدی پئی سی۔ فیر میں اوہدے مونہہ اگے ہتھ رکھیا، کوئی کوئی ساہ آؤندا پیا سی۔

کمر دا بویا آج نکھلھا جویں کوئی بڑی دوروں تے بڑی کالھی کالھی آیا ہووے۔ آؤن ولا اک منٹ نصف گھنٹہ کے کھلو گیا۔ تے فیر اوہنے دیو کی بھین دی منی اُتے بہہ کے اوہدا سر اپنی جھولی وچ رکھ لیا

دیودی بھین نے اکھیا کھولیاں، اکھاں وچ اک چانن بھر گیا دیودی بھین ہونٹھ کھولے، ہونٹھاں وچ اک مسکراہٹ بھر گئی۔

”میں آگیا ہاں“ آؤں والے دی زبان نے نہیں، پراوہ سے جسم دی کتنی نے آکھیا۔

”میتوں پتا سی توں آویں گا۔۔۔“ دیوکی بھین دے وشواس نے جواب دتا۔ دیوکی بھین دی نکدی نکدی جان اک پل لئی کھلو گئی۔ ایہہ پل جو یں اوہدی زندگی نے موت نال لکھیا دیاں جت لیا ہووے۔ اک پل دے فرق نال موت بارگنی، زندگی جت گئی۔ اک وار دے فرق نال وچھوڑا ہار گیا تے میل جت گیا۔ اک نمبر دے فرق نال بے وشواسی بارگنی تے وشواس جت گیا۔

دیوکی بھین ایس دنیا توں چلی گئی۔ تے بھاویں دیوکی بھین دے چھڈے روپیاں نال میں اوہدے محبوب دا بڑا علاج کیتا پراوہ دیوکی بھین دے پچھے پچھے چلا گیا۔ شاید اگلی دنیا وچ دیوکی بھین ایک مندروں کا اک باغ وں گا گھر بنا کے اونوں اذیکدی پئی سی۔

پاکیزگی شاید ایک چھوٹ دی بیماری بندی ہے۔ جو میتوں دیوکی بھین کو لوں لگ گئی ہے۔ میں روز اس مندور کے اس باغ وں گے کمرے نوں کھولدا ہاں۔ اس نوں جھانڈا ہاں پونچھدا ہاں، تے فیر بڑے ادب نال بھینر دیندا ہاں۔

روز زندگی دے اک موڑ آتے میرا وشواس فنڈا ہے تے دوسرے موڑ آتے بجھ جاندا ہے۔ تے میتوں جا پدا ہے کہ دیوکی بھین دا اوہدے کمرے ایس دنیا وچ اک نمبر دی راکھی کر دایا ہے بے وشواسی پنجاہ واری تاں، وشواس اکونجا واری..... اک نمبر دا فرق..... بس اک نمبر دا فرق۔

(پبی انتر: جمیل احمد پال)

☆☆☆☆



## پروسی

میرے دیو چا چا جی کوئی دے دیو پتا جی سن۔ کل ایہو ترکاں داویا سی جس ویلے اچانک اوہناں دے دل دی دھڑکن بند ہو گئی۔ آخری ویلے اوہناں نے کچھ نہیں آکھیا، پر مینوں دی پتاسی تے کوئی نوں وی پتا سی کہ اوہناں نے اک وار نہیں کئی وار سانوں چٹا دانی دتی ہوئی سی، "ہی یہ تمہارے دیش میں لوگ ہنگامہ بہت کرتے ہیں۔ کوئی اس دنیا میں آئے یا اس دنیا سے جائے۔ اس میں ہنگامہ مچانے کی کیا بات ہے! چاہتا تو ہوں کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں، کسی "اٹر کریشن" میں مر جاؤں برف کی کسی گھائی دانی میں خود ہی اک قبر بن جائے۔ ہوا ایک نفن ڈال دے گی، مگر یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ مجبوری ہے، پھر بھی تم لوگ یاد رکھنا، جو کچھ بھی کرنا ہو، جلدی سے کر دینا۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں، کسی کو کچھ کرنے کی یا کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" ایس ائی ایچ سویرے چپ چاپ اسان اوہناں دے سریر نوں دویا ع کردتا۔ ایس ویلے ترکاں داویا ہے۔ کوئی دامونہ بڑا تھا ہو یا ہے۔ شادی میرا وی تھا ہو یا ہو دے گا۔ کیونکہ کوئی مینوں زوریں چاہا ویلا پین واسطے آکھرتی ہے۔ چاہا واگھٹ میرے اندر وی نہیں لٹھکھایا تے کوئی دے اندر وی نہیں، کیونکہ جس طرح میرے اندر چا چادی دیاں گلاں لٹھکیاں ہوئیاں سن، اوہ سے طرحاں کوئی دے اندر دیو پتا جی دا پیا ر تھا ہو یا ہے۔ گلاں نوں پیا ر تے پیا ر نوں گلاں دج ران ائی کوئی مینوں کچھ رہی ہے، "دیو پتا جی ہمیشہ پنجابی دج گلاں کروے سن، پر جدوں کہ نے اوہناں نے کوئی خاص گل کہنی ہندی اوہ اردو بولدے سن۔ دیدی، اوہ اردو کیوں بولدے سن؟" نہیں، کوئی اوہ اردو اوہوں نہیں سن بولدے جدوں اوہناں نے کوئی خاص گل کہنی ہندی سی، اوہ اردو اوہوں بولدے سن جدوں اوہ بڑے آداس ہندے سن۔ پنجابی شاید اوہناں دی آداسی دے مچ نہیں سی آؤندی جاں شاید اس ائی کہ آداسی اوہناں ائی بڑی اوپری چیز سی، تے اوہ بے لئی اوہناں نوں زبان دی کوئی اوپری چاہیدی ہندی سی۔"

"پرویدی " کوئی پتا نہیں مینوں کیہ پنھن لگی سی پنھدی پنھدی چپ کر گئی ہے۔ ایہہ اچ دی گل

نہیں، کوئی دی مذہب توں عادت ہے۔ اوہ زندگی نوں ہمیشہ چپ چاپ دیکھدی رہندی ہے۔ اوہ دے کولوں پنچھدی کچھ نہیں۔ جے اوہ پچھ سکدی تاں شاید زندگی کولوں سبھ توں پہلاں ایہ سوال پنچھدی کہ اوہ دے لہو دے اچے کرماں صدقہ دیو پتا جی اوہ دے پتا جی بن گئے؟ کوئی وی سکھایا اینا سکھ نہیں ہوسکدا۔ جنادیو کوئی داپتا سی۔ دھرتی کوئی دی ماں سی تے دیو کوئی داپتا سی۔ کوئی دی عمر پورے چوٹی گھنٹیاں دی نہیں سی دس ویلے اوس دے دیو پتا جی ندی دے کنڈھے اوس دی ہوا تک نہی سی۔ اپنے گھنٹے دھرتی تے اوس پتی نوں اپنی جھولی دچ امن امان رکھیا سی۔ کوئی دھرتی دے ایس رحم نوں اودوں توں دیکھدی پتی ہے ویہ دور بیاں توں دیکھدی پتی ہے۔ بڑے چٹکے سکول دچ تے بڑے چٹکے کان دچ پڑھدی رہی ہے بڑے چٹکے خاندن مال اوس داویا ہویا ہے۔ تے دیو پتا جی کولوں اوس نوں اک بڑا چٹکا گھر ورٹے دچ ملایا ہے۔ ایس لئی اوہ چپ چاپ اک انسان دے دوپ دچ اک خدا دیاں رحمتاں نوں دیکھدی ہے، پنچھدی کچھ وی نہیں۔

اک صرف میں سوچ رہی ہاں کہ کوئی نوں دیو پتا جی کس طرح مل گئے تے کوئی وانگ متوں دیو چا چا جی مل گئے۔ دیو میرے پتا جی دے نال پڑھدے بندے سن۔ اک وار فیس دین جو گئے وہاں کول پیسے نہیں سن۔ دیو نے اپنے ہتھ دچ پتی ہوئی مندری دچ دتی سی، جدھے نال دیو نے وی تے میرے پتا جی نے ہی امتحان دی فیس دتی سی۔ اوس دن توں اوہ دوست بن گئے سن۔ دوست نہیں، بھرا بن گئے سن۔ ایہ میرے جنم توں بڑے ور ہے پہلاں دی گل ہے۔ ایس طرحاں اوہ میرے جنم توں پہلاں ہی میرے چا چا جی بن گئے سن۔ پتا جی ناندے بندے سن کہ جس دن اوہناں دے امتحان اٹھیا نکلیا سی، دیو چا چا جی سارے کانچوں فیسٹ آئے سن تے اوہ سیکنڈ آئے سن۔ پراگوں اوہناں نوں دی تے دیو چا چا جی نوں وی پڑھائی چھڈنی پتی سی کیونکہ وہاں کول اگلی پڑھائی واسطے پیسے نہیں سن اوس دن اوہناں نے دیو چا چا جی نوں پکلی وار اردو دچ بولدیاں سنیا سی ”مٹی یہ کیا ہے تمہارے دیس میں، جن کے پاس قابلیت ہے، جن کے پاس خواب ہیں وہ آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ ان کے پاس چاندی کے تھوڑے سے روپے نہیں ہیں!“ میرے پتا جی اک اخبار دے دفتر وچ کم کرن لگ پئے تے دیو چا چا جی اک سکول وچ چھوٹی جہی ماسٹری کرن لگ پئے۔ پتا جی نے اک نہیں، اخباراں دے کئی دفتر بد لے تید یو چا چا جی نے دی اک نہیں، کئی سکولوں دی ماسٹری بدلی۔ اک دوسرے دے ماتیاں ویلے اوہناں وچ اک دوسرے دی روٹی ہمیشہ سانجھی رہندی سی۔

میری سنبھال توں بہت پہلاں دی گل ہے، جدوں امرت جلیھیا نوالے باغ وچ گولیاں چلیاں سن

تے امن امان بیٹھے ہوئے لوگ حاتم گولیاں نال دھنے گئے سن۔ پرایہ گل میں پتاجی کولوں اپنی وار سنی ہے کہ مینوں چاچن لگ پیا ہے جویں آپنی اکھیں دیکھی ہوئی ہووے۔ دیو چا چا جی کئی راتاں منی اُتے سو نہیں سن سکے۔ اوہ ساری رات مکان دی اپری چھت اُتے پتھر دانگ بیٹھے رہندے سن، صرف بیٹھیاں ٹٹھیاں اوہناں دیاں اکھاں وچوں اتھر وگن لگ پیندے سن تے اوہ اکلے بیٹھے بیٹھے پتا نہیں کس نوں مخاطب ہو کے کہن لگ پیندے سن "یہ کیا ہے تمہارے دلش میں سارے غلام بنے رہیں گے اور گولیاں کھاتے رہیں گے۔"

بھگت سنگھ نوں جدوں پھانسی لگی سی، میں اردوں بالکل نچی ساں، پرایہ گل مینوں جنگلی طرحاں یاد ہے کہ دیو چا چا جی نوں اوہناں دے سرکاری سکول وچوں کڈھ دتا گیا سی۔ شاید اوہ سکول دے کمرے وچ دو تیاڑھیاں (طالب، علماں) دے سامنے روپے سن۔ اوہ جدوں گھر آئے سن، آکھ رہے سن یہ کیا ہے تمہارے دلش میں، بھگت سنگھ مر جائے اور ہم لگ رو بھی نہیں سکتے۔"

ایہہ گل دا کسے نوں پتا نہیں سی کہ دیو چا چا جی میرے پتاجی دے سکے بھرا نہیں سن، ایس لئی اک وار انج ہو یا کہ پنجاب دیاں ٹھٹھیاں سکھ اخباراں دیو چا چا جی دے پیچھے پے گئیاں کہ اک سکھ خاندان دے نوجوان نے اپنے وال کنادے سن تے اوہ سگرت پیندا ہے! اخباراں والیاں نے آپے ہی سوچ سوچ کے دیو چا چا جی اک سٹھی ناں گھز لیا سی "دیویدر سنگھ" دیو چا چا جی اک دن تھو وچ اخبار پھڑی آئے۔ اخبار اوہناں نے میز تے رکھ وتی صرف چاہ پین لگیاں اوہناں نے اک واری سرسری طور اُتے آکھیا "سمجھ میں نہیں آتا یہ تمہارے دلش میں کیا ہے! سگرت میں پیتا ہوں اور اس کا دھواں مذہب کے پیچھے چڑوں میں چلا جاتا ہے۔"

میری بڑی چھوٹی جی عمری جدوں میرے پتاجی گزر گئے میری ماں اوس توں وی پہلاں گزر گئی ہو سی۔ میں کواچی وچھی دانگ اپنی نانی کول رہندی ساں۔ دیو چا چا جی

اوہے طرحاں نیم نال اوڈے سن تے چلے جاندے سن۔ مینوں یاد ہے، میں کئی وار دیو چا چا جی دے میناں نوں مزدور کھولھدی تے مزدور دے کے بند کردی اوہناں نوں آکھدی ہندی ساں "چاچا جی! میں تسیں اک چاچی لے آؤں۔" انج جو یں میں اک چاچی نہیں، اک کھڑونا منگ رہی ہووان پتا نہیں ایہہ میں آپنی اکھتا توں گھبرا کے آکھدی ساں کہ دیو چا چا جی دی اکھتا توں۔ پر اوہ ہمیشہ والیاں دی لٹ نوں سوار دے ہس پیندے سن "میں یہ تمہارا دلش کتنا بڑا ہے، جانے تمہاری چاچی جہاں کھو گئی ہے اس میں! میں کہاں سے

لاؤں اسے“

دیو چا چا جی نوں آپی گواچی ہوئی بیوی تاں نہ بھی، پتا نہیں کہہ سکتے جنم دی گواچی ہوئی سی، پر اپنی  
 بچی ضرور لہجہ پئی۔ اور وز سوسر ساوندی دے کندھے سیر کرن جانہ بے ہندے سن۔ اک دن اوہناں نے ندی  
 دے کندھے اگے ہوئے جھاز بونیاں وچوں اوس دے رون دی آواز سنی، باہواں وچ اوہنوں چک لیا، آلے  
 دوالے دے لوکاں نوں کئی وار کھنکھیا کہ کوئی اوس دا وارث جتا چاہے تاں بن سکدا ہے۔ پر کسے کول وی اوس  
 بچی نوں دین واسطے نئی رشتا نہیں سی۔ دیو چا چا جی نوں جاپیا کہ اوہ بچی دھرتی دا اک کشکول ہے، اک کا سا جہڑا  
 ایس دنیا کولوں اک رشتے دی منگ کر داپیا ہے۔ جدوں دوالے دے سارے لوک انکاری ہو گئے تاں دیو چا چا  
 جی نے اوس کا سے وچ اپنا دل پا دتا۔ محبت دا وہ معصوم رشتا پا دتا جہڑا اک باپ وچ تے اک بیٹی وچ ہندا ہے۔  
 ایس لئی اوہناں نے بچی دا ناں کشکول رکھ دتا۔ کوشی بچی نوں باہواں وچ ٹھکی اوہ کئی دن آکھدے رہے، پتا نہیں  
 یہ کیا ہے تمہارے دلش میں، کوئی ماں باپ اگر شادی نہیں کرتے تو اس میں بچے کا کیا قصور ہے۔ نا جائز حرکت  
 تو ماں باپ کرتے ہیں پر سمجھا جاتا ہے بچہ نا جائز۔“

ایہناں دناں دی ہی گل ہے، جدوں ہندو مسلمان فساد شروع ہو گئے۔ ساڈے دیس دا کوئی پنڈ  
 جاں کوئی شہر ایہو جہا نہیں سی جہڑا چیکاں نال نہیں سی بھریا ہویا۔ دیو چا چا جی دے کتاں وچوں لنگھ کے اوہناں  
 دے دل وچ ہندو چیکاں دی اوسے طرح چھدیاں سن، جس طرحاں مسلمان چیکاں۔ نہ میں گن کے دس  
 سکدی ہاں تے نہ دیو چا چا جی گن کے دس سکدے سن کہ اوہناں نے کنیاں کو عورتاں تے کئے گومرداں نوں  
 اپنے ہتھوں وچ آج کج کے رکھیا۔ اوہ ضرور سوچدے ہوں گے کہ کدی اوہناں دے دو نکے ہتھ دامن اوتار  
 دے قد ماں وانگ بن جان تاں اوہ دلش دے ہزاراں پنڈاں تے ہزاراں شہراں نوں اپنے ہتھوں نال کج  
 دین تے کسے پنڈے آتے وی کسے پتھر اکدی نہ چھو سکے۔ پر نکلیاں ہتھیاں دی مجبوری نال اوہ ہر کسے دی  
 چیک نال تڑپ سکدے سن ہو رگھ نہیں سن کر سکدے۔

دلش دی ستمگر تانے دیو چا چا جی نوں کئی چار دو وچ بولن دا موقع نہ دتا۔ سانوں انج جاپن لگ پیا  
 کہ دیو چا چا جی نوں اردو بولنی بھل گئی ہے۔ ایہناں دناں وچ اوہ صرف دو کم کردے سن۔ روٹی کمان لئی سارا  
 دن اک سرکاری دفتر وچ نوکری کردے سن تے رات نوں اخباراں لے لے کے دلش دے سمجھناں آٹھو آں  
 دیاں تقریراں پڑھدے سن۔ لہذاں تقریراں دیاں کتران نوں جوڑ جوڑ اوہ شاید دلش دے بھوکھ لئی کوئی ٹہنا

سیوند سے رہندے سن۔ فیر بدی ہوئی اوہناں نوں چاہن لگ پیا کہ سپنے دا کپڑا پتا نہیں کیو جیہا چھپیا ہویا ہے، جس نوں اوہ اک تھان توں سیوندے ہن تے اوہ دوسری تھان توں پاٹ جاندا ہے۔ اک دن اوہناں نے پتھل ہو کے امیدیں دے سارے سوئیاں دھاگے سنٹ دتے۔ اوس دن اوہ زور زور دی بول رہے سن "ایس تمہارے دلش کا کیا ہوگا؟ جن لوگوں نے دلش کے لئے قربانیاں کیں اب وہ ان قربانیوں کو بازار میں بیچ رہے ہیں غریب لوگ اور غریب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا کروں اس تمہارے دلش کو پیار کرتا ہوں، اس کے لوگوں کو پیار کرتا ہوں اسی لئے دکھ ہوتا ہے۔"

دلش دی اتنی والے اخباراں وچ چھپی ہوئی کسے تقریر وانگ۔۔۔ دیو چا چا جی دی زندگی وچ اک اوہ محبت وی آئی جس دا کوئی اہر تھ نہیں سی۔ اک بڑی خوبصورت عورت نے اچانک دیو چا چا جی نال دیاہ کرا لیا۔ ایہہ عورت اوہناں دے دفتر وچ کم کردی سی پالنگا کہ اوہ اک اسمبل محبت توں اپنی پریشان سی کہ اوس نوں دیو چا چا جی دی خوب سورتی اک رحمت وانگ لگن لگ پئی سی۔ پر چھیاں مہینیاں دے چھوٹے جے عرصے وچ اوس دی پہلی محبت نے اوس دے اتے فیر غلبہ پالیا۔ اوس دا پہلا پریمی اوس دے کول مڑ آیا سی تے اوس دے کولوں اپنی خطا دی معافی منگد اپیا سی۔ اوس عورت نے جی آزادی نال دیو چا چا جی کولوں طلاق دی منگ کیتی، چا چا جی نے اولی ہی حکمی نال اوس دی ستمزتا اوس نوں دے دتی۔ کجھ گھٹیا تے ویہیلیاں اخباراں نوں پتا نہیں کیوں چا چا جی نال بڑی ہمدردی جاگ پئی، اوہناں نے اک عورت دے طلاق نوں سارے سماج مند حاردا وشنا (موضوع) بنالیا۔ اینا کہ اک گھٹیا نظم لکھ کے وی اخباراں وچ چھپوائی "نس گئی، نس گئی، اوس گئی" چا چا جی اخباراں نوں دیکھدے، ہتھیں وچ مروڑ دے تے رون ہاکے ہو کے آکھدے، "یہ تمہارا دلش کیسا ہے؟ کسی انسان کی محبت یا شادی اس کی اپنی محبت یا شادی نہیں۔ کسی سے ملنے کا حق بھی اس کا حق نہیں، اور کسی سے دھچھڑنے کا حق بھی اس کا حق نہیں۔ وہ بے چاری عورت کہاں بھاگ گئی ہے، ان لوگوں کی عقل بھاگ گئی ہے ان لوگوں کی انسانیت بھاگ گئی ہے۔"

ایہناں دنوں وچ چا چا جی دفتر دے کم توں علاوہ کجھ کتاباں نوں ترجمہ کرن دا کم وی کردے سن۔ اوہناں دی آدمین دودھ گئی سی۔ اوہناں دی بچی دودھان جوان بندی پئی سی، ایس لئی اوہ اپنی بچی لئی اک چھوٹا جیہا گھر بنوا رہے سن، تے اوہناں نوں خیال آیا کہ اک ایمان دار شہری وانگ اوہناں نوں بسن بہتا ٹیکس دینا چاہی دا ہے۔ اوہناں نے اپنی آمدن دا سارا دیوالکھ کے سرکار نوں بھیج دتا۔ پر میسوں چنگی طرحاں یاد ہے کہ جس دن

اوہ بڑے اُتشانال انکم ٹیکس دی تریک ٹھکتن گئے، اوس دن شام نوں اوہ اپنے کمرے وچ آپنا سر پھڑ کے بیٹھتے ہوئے سن، ”یہ تمارا دیش کیسا ہے! ہم لوگ اس کے شریف ناگرک ہیں یا چور ہیں! جو بھی ہم لوگ کھاتے ہیں، اس میں سے سرکار کا حق دینا آپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم خوشی سے دیتے ہیں۔ ایمان داری سے دیتے ہیں، پر ہمارے ساتھ یہ کیسا سلوک ہے؟ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھ جاتا ہے۔ جیسے ہم کیا، ہمارے باپ دادا بھی چور ہیں!“ گل ایہہ ہوئی سی کہ چاچا جی مکان بنوارے سن، کئی وار اکو ہفتے وچ زیادہ خرچ آپنیدا سی۔ بنک وچ اوہناں واسیونگ اکاؤنٹ سی جدھے وچوں اوہ ہفتے وچ صرف شیخ سو روپے کڈھواسکدے سن۔ ایس لئی اوہناں نے اک دی تھاں دو بنکاں وچ اکاؤنٹ رکھ لیا سی۔ لوڑ چنیدی تاں اوہ دوہاں وچوں پیسے کڈھوا سکدے سن۔ کدے جے اک بنک وچ تھوڑے ہندے تاں کسے دھپلے ہفتے اوہ دوسرے بنک وچوں کڈھوا کے اوہدے وچ جمع کروا دیندے، تاں کہ لوڑ ویلے اوکھ نہ ہووے اوہناں نوں زندگی دی کوئی بیرا پھیری نہیں سی آؤندی۔ ایس لئی اوہناں نوں کوئی گل چیتے رکھ کے نہیں سی کرنی پیندی۔ انکم ٹیکس دے افسر نے بنک دی اک پاس بک دیکھدیاں آکھیا کہ اہدے وچ دتی ہوئی آمدن نالوں بہتا روپیا جمع سی ایہہ روپیا بھاویں دوسرے بنک وچوں کڈھوا کے جمع کیتا گیا سی، پر چاچا جی نوں اوہدے کھرہوے، شکی تے بے عزت کرن والے سوالاں توں اپنی گھبراہٹ ہوئی کہ اوہناں نوں سارا دیر دا بھل گیا۔ اوس دن اوہ بڑے ڈکھی سن۔ اوہناں نوں کسے پڑتال دا ڈکھ نہیں سی، اوہناں نوں ڈکھ سی کہ اوہناں دی نیت اُتے شک کیتا گیا سی تے اوہناں نال غیر انسانی سلوک کیتا گیا سی۔

کہیاں ہی گلاں یاد آرہیاں ہن۔ کوشی دے ویاہ دی گل وی یاد آرہی ہے۔ کہیاں شریف گھراں وچ کوشی دے ویاہ دی گل چلی سی۔ کوشی بہت خوبصورت لڑکی ہے، بڑے پیارے سُہماء دی تے پڑھی لکھی۔ کسے لئی وی کوشی نال ویاہ کرنا اک فخر دی گل ہو سکدی سی۔ پر اکثر انج ہو یا کہ جہڑا وی کوشی دے رُوپ اُتے جان اوس دے گناں اُتے موہیا جاندا، اوس نوں جدوں کوشی دے جنم والی گل دا پتا لگدا تاں اوہ ویاہ توں انکاری ہو جاندا جو یں اوس دی شرافت اُتے کوشی نال ویاہ کیتیاں اک داغ پے جانا سی ”یہ کیسے شریف لوگ ہیں۔ تمارے دیش کے، ان کے پاس آنکھیں تو بہت بڑی ہیں پر ان میں نظر بالکل نہیں ہے۔“ دیو چاچا جی اوہناں دناں وچ اکثر بیٹھیاں بیٹھیاں ایہہ آکھن لگ پیندے سن ہن جدھے نال کوشی دا ویاہ ہو یا ہے اوس نے جدوں چاچا جی اگے کوشی نال ویاہ دی فرمائی کیتی سی تاں چاچا جی ایسے ڈکھے ہوئے سن کہ اوس نوں دیکھدیاں ہی بول

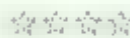


پئے۔ ”کیوں نو جوان! اپنی شرافت کا سودا کرنے آئے ہو؟“ — ایہہ چاچا جی نے ایس لئی آکھیا سی کہ اوہناں دتاں وچ کوشی نوں در شرف ملن والا دیو چاچا جی دا بڑا سوہنا گھر دیکھ کے کندا من لپھایا ہویا سی۔

”شرافت کو بیچنے نہیں آیا شرافت کی قیمت دے کر شرافت کو خریدنے آیا ہوں۔“ اوں نے جدوں بڑی چلیسی سال تے بڑے آدرنال جواب دتا تاں چاچا جی اکدم اوہرے نال پنجابی وچ گلاں کرن لگ پئے۔

ایس ویلے کوشی میرے کول بیٹھی ہوئی، میرے مونہہ ول دیکھ رہی ہے۔ اوہی سوال جبراً کچھ چر پہلاں اوہرے ہونٹھاں اتے رک گیا سی، اوہ مینوں سمجھ رہی ہے: ”پر دیدی! دیو پتا جی رہن والے تاں ایس دیس دے سن۔ ایہہ اوہناں دا آٹنا دیس سی“ پر میریاں اکھاں وچ اتر آ گئے ہن تے مینوں پتا نہیں لگ رہیا کہ میں کوشی نوں کویں آکھاں کہ ایہہ دیس دیو چاچا جی دا دیس نہیں سی، کوئی وی دیس اوہناں دا دیس نہیں سی کیونکہ کسے دیس دی ہتر اچے، ایہو جی نہیں بنی جہوی انسان نوں جیوں دا پورا حق دے سکے۔ میں کوشی نوں کویں دساں کہ دیو چاچا جی بھاویں کسے وی دیس وچ جمدے تے کسے وی دیس وچ رہندے، اوہ پر دیس وچ پردیسی ہی ہونے سن

(پی اتر افضل راز)



## بھابھی مورنی

”نی پندے! اسن آہ پونیاں کوں کتیاں؟“ اوہنے اپنے زروں ورگے چٹے والاں نوں رستھیاں  
نال دھوتا تاں پونیاں جندے گٹھ گٹھ والاں نوں نچوڑ دی دلیلے پے گئی۔

اوہ جوں دلیلاں دیاں تھداں امیرن اُتے امیر دی پٹی سی۔ ”رزق دا آکھیا کون موڑے  
چو یاں دے بوٹ اڈن جوگے ہوئے تاں خورے کہوڑے رتھیں جا بیٹھے وارو واری جے شہراں توں ٹر گئے۔  
اوہنے چچی بچی تیاں منڈیاں انی بک وچ آکھنیاں سی۔ اوہناں دے سوا ہر ہندے سن، منجی اُتے  
لک سدھا کرن دی وی وسپل نہیں سی ہندی، پر تاں وی اوہ کدے تھکدی نہیں سی ہندی۔ تے ہن وڈا ویابیا  
دریا نوکری تے، چھوئے دووویں شہراں وچ پرہن ٹر گئے سن، تاں وسپلی ہوئی جندونوں جا پدا سی۔ اوہ دے  
ہند ہند وچ کھلیاں پے گئیاں سن۔۔۔۔۔۔ ”کالا زروں تاں نرو گیا، ہن ایہہ چنا کوں کتاں گی؟“ اوہنوں  
جہڑیاں سوچاں جوانی ویلے نہیں سن آئیاں ہن ہڈھے وارے گوڈیاں دی پیڑ وانگوں اچھ پٹیاں سن۔ تے  
اوہنوں شاہ کالے والاں دا چیتا آیا، جو چچی موریاں دی خیل وانگوں اوہدی چٹھ اُتے پندے ہندے  
سن

”ساؤ! توں کہوڑے ویلے میرا ناں مورنی دھریا سی۔۔۔ مورنیاں دے نصیباں وچ بیٹاں  
کتھے۔۔۔ مورنیاں تان پیراں نوں دیکھ دیکھ چھر دیاں نہیں۔۔۔۔۔۔“ تے اوہدی انجھ آپنے پیراں نوں دیکھدی،  
پیراں دیاں بیٹیاں وچ ڈگ پئی۔

”ساؤ! اوہ دے شر یکے دا دیوری۔ ولسوں الو آں سی، جدوں اوہنے چٹے سر بانے اُتے ہرے کاشنی  
دھا گیاں نال مور کدھدی بھابھی نوں دیکھیا سی، تے تھوڑے گھر ویابھی جندو دے ہتھاں وچ پھڑی ہوئی  
نوئی، ساؤ دی واج سن کے چچی بچی دھا گیاں دی جی خیل پان لگ پئی۔ اوہنے سرابا نامکا کے جدوں چھپی دی



مصل داوون چاچھو بیاج تاں اوہدے اتے واماں واماں دے مٹھل بیان وی تھاں — میرا، لیکن لگ پئی۔  
 اوہدے ایسے سرے پے توں سارے چند وچ اوہداتاں بھا بھی مورنی پے گیا سی۔

لہندیان، ہندیان ساؤ داویاہ بویا، اوہدے گھر اتوڑتی دے تن پتر جسے تے بھا بھی اوہناں  
 نوں خچم چم چم پے کھندی رہی۔ اوہدی اپنی جون اٹھل جاندی پئی سی پنڈ دی کوئی سنی بیانی تھری واماں  
 اوہ ساؤ دے پتر ان نوں گوڑیاں تے بٹھا کے وہیں شکر کھواندی مس کے آکھدی — ”نہ بے کوئی ہر کہ  
 نہیں۔ تیریں نوں ایہو تھہندی اسے تاں کہ ہڈھے وارے جوں گوڑیاں وچ پانی پے جائے گا، اوہوں۔۔۔  
 فی موروں تر پھلاسی کھانا بند اے تاں —“ تے اوہ ساؤ دے پتر ان دے مونہہ ہندی آکھدی — ”آہ  
 بیٹھاں میرے نہ میرے آئے، ماسا موہی پھکی وی ان دین گے؟“

”فی اوہدے کھہر دی ہندی اے، ہنیر نہیں“ اگلی دل رکھن نوں کہہ دیندی ہندی سی۔ پر جدوں  
 بھا بھی مورنی اے، دیکھن وچ پھلاں پاؤن والا اوہد گھر والا مر گیا، تاں جدھے گھر سنیا سی، ہنیر نہیں ہندا،  
 اوہدے کھہر ہنیر و رک گیا۔

”مورنی تاں پیر ان نوں دیکھ ویکھ تھری اے، پر جدوں تیویں نوں تھرتا پیندا اے، اوہ متھے  
 دے پٹھان نوں دیکھ ویکھ تھری اے۔“ اوہ جدوں سامں واہیر سہن جوگی ہوئی سی، تاں بیٹھی کھلوتی دے  
 مونہں ایہ ہندی اے۔

فرجیدون لہندا ہے، تاں عورت وی چھاتی وچ لہندا ہے۔ تے مرد دے ہتھان وچ۔ ساؤ ہڈ بھن  
 اے اپنے کھیتاں نوں، وی کوزہ اچھا، تے بھا بھی مورنی دے کھیتاں نوں وی جھڑی تھڑوں رب نے پادتی سی  
 اوہوں اوہدے وی ذاتی نہیں سی پر سند، اپہ ہور کئی تھڑوں اوہنے بھا بھی مورنی نوں نہیں سی اون دتی۔  
 ”واہاں دے پٹھان پٹھان اے تاں ہلے گی۔ نہیں تاں بھی سنی کھا کے پے رہوے گی“ ساؤ سن وچ چتر دا تے  
 یاں نوں اے جے اوہدے کھہر بھیج دیندا سی۔ انج دی اک کندھ دا چو واڑا سی — بال کئی داری کندھ دے  
 ایس پار کندھ تے اس پار جا کندھ۔ ستیاں نوں اوہناں دی ماں چک کے لے جاندی سی، جاں بھا بھی  
 مورنی موڈے ماں اے جھڈ آندی سی۔

تینفیر چاچک ساؤ ذاتی تیویں، آپے پیلے آپے بیودی مکانی گئی، جویں آپنی مکانی گئی ہو گئی۔ اکو  
 رات وچ اوہدے پیچ پیر اٹھی۔ کسے ہول ورگی، جسے دو جادہ ہوں نہ دیکھن دتا“ اوہدی مڑھی اونوں

بلاندی سی" کہندے تے کُرا لاندے اوہدے پکے سوہرے اوہنوں رہ بیٹھے، تاں ساڈنوں اگلی سوچ پتی سی۔۔۔ اوہدے بالاں دا کیہ بنے گا؟ اوہ بنے بھابھی مورنی دا درکھڑ کا یا۔۔۔ "آہ تیرے ہرڈ بیڑے زل جان گئے ایہناں نوں سانجھ لے!"

اوس ویلے بھابھی مورنی نے زیناں اکھاں نال بالاں نوں تاں کلیجے لالیا سی پر آکھیا سی۔۔۔ "ساڈ تیرے بڑے حسان نیں میرے تے، میرا لوں ودھا ہویا اے تیرے حساناں ناں، پر جگ دا مونہہ کون تھمے گا؟"۔۔۔ تے اکوں ساڈ دا مونہہ انج ہرکھ گیا سی، جیوں اگ وچ پتی ہوئی اٹ اُتے تے پانی دا پھنڑکا مار دتا ہوتا۔۔۔ جگ اکھاں توں اوجھسی، ساڈ اکھاں دے سامنے سی بھابھی مورنی نے بالاں نوں ماں دا ہوکا نہ لگن دتا۔۔۔ سیال جائے نہال اوہدی بھکھ تریبہ دی بالاں دی بھکھ تریبہ وچ رگنی سی۔ (انج کوئی ڈیڈھ ورے پچھوں جہڑی کندھ دوہاں گھراں نوں پاڑوی سی، اوہدے مینہاں نال لے لٹھ گئے، تاں اوہنوں مڑا کے نشن پوچن دا اوہنے آہر نہیں سی کیتا۔ فیر اک تھاویں مکھار جھیا ہویا۔ تاں بالاں نے اوہدے دجوں نپ کے ہولی ہولی اوہدے اٹھنوں نال لا دتا تے انج اوہ کندھ، جو یں آپ ہی آپیاں اکھاں وچ بے لوزی ہو کے ڈھیلا ڈھیلا ڈگ پئی) ہولی واپی منڈے اوہدے موڈھیاں توں اچے ہو گئے تے فیر ہولی ہولی لہیرہ ہو گیا کہ بھابھی مورنی آپ ساس منڈیاں دے منڈیاں دے موڈھیاں تک پہنچدی۔ ساڈ نے جوگ تاں کسے کولوں نہیں سی لیا پر پنڈ والے کہندے سن۔۔۔ کہ اوہ پچھلے جنم دا جوگی ضروری۔ اوہدی کرنی سچے سادھاں ورگی سی۔

"نی جندے! ہن آوے نیاں کبیر کتیاں؟" جہیاں سوچاں بھابھی مورنی نوں ویہہ ورھے نہیں سن آئیاں۔ خورے اوہدے کول ویہل نہیں سی۔ ایہناں سوچاں لئی پرنس تے منڈے دجوں شہر ٹر گئے تاں اٹھدی ہندی نوں ایہ سوچاں آؤن لکیاں۔

چھاتی اوس آلھنے داگوں ہو گئی سی۔ جدھے دجوں ہنکھر واڈ گئے ہون۔ چھاتی دے کھتے ول رہندی اوہ اچ ویلے پئی ہوئی سی، کہ باہر لا گنڈا کھڑ کیا۔

"خورے شہروں دڈ آیا ہووے۔" اٹھ کے باہر لے بوہے تک اپڑوی نے کتیاں ہی سوچاں گیز لہیاں "سنے سڑیا، جھیر آکھیا سی کہ پتراں داگوں متھے سہرا بھ کے دیاہ کرتے ڈولا گھر لے کے آ۔۔۔ اوہتے خورے کیہ کیتا تے کیہ نہ کیتا، بس خط لکھ جھڈ یا کہ دیاہ ہو گیا اے۔۔۔ ایویں رات دی رات لیا یا۔۔۔"

راہیں جھی لگدی سی۔ اوہ وی اچھا بدی مرضی۔ فنجے جھیرا کھیا کہ اوہ پورے دناتے ہوئے گی تاں  
 سہ۔ چھڈ جائیں۔ اوتھے شہراں وچ کون رکھاں کردا اے۔ اوہیو گل ہوئی۔ کچے ہڈاں ہال اوہی  
 نو۔ یہ سہ جاتے یہ پیتا، چلیپے دامنڈ اچھڈ کے مر گئی۔ تے اوہ اتج موٹی کل دو جاوان۔ اتھرے کولوں  
 نکتے لیتے جہ نہیں دویا۔ تیجے مینے ہی ہو رو یا ونوں پھر دلا اے۔

پہلے اکھو لکھیا، تاں بولے اتے شہروں آیا وڈا نہیں سی، ساڈی موٹے کھڑے مڑ آیا سی۔

اتے اتی تاں راضی اے ساڈا! بھج جی مورنی تو یہہ جی گئی۔

”اچ ایں راضی اے، ایویں اک صلاح کرنی سی تیرے ہال۔ اندر وڈے ساڈے کھیا، تاں

بھج جی مورنی نے، اہرے نے، پادے ول بند دی نے، پنچھیا

کیہ بھلا؟ وڈے واکوئی خط آیا اے؟“

”پرانے ویلیاں وچ پریاں دی جھڈ تو تیاں وچ بند دی سی۔ تیری دی آدھی جھڈ وڈے وچ تے

وئی اچھی چوکیاں وچ اے۔“ ساڈا سوچیں وی پیا چا پدا سی تے رومہ جی سی وی۔

”کاتوں! اوہناں بھاتے تاں میں جیوندی مر گئی۔ چندرے کدے دکھالی، این وی نہیں

اوندے۔“ بھج جی مورنی نے ہر کھ لکھا۔

”توں راتی نہیں اے، مسان، اوہناں توں دستہ دی ہوئی ایں۔ اوہناں پچھے توں ہڈ کھورتے۔“

”تے نہیں دستہ دی ہوئی میں آپنا چار پانا اے؟“

”آپنا فیئر نہ دستہ دی، وڈے خط آیا اے کہ اوہی ہو رو یا وکراتا اے، تے اوہی نوین سمجھد

اہرے منڈے نوں رخصت وچ راضی نہیں۔“

”ہاتے میں مر جاں۔ کوئی پُراں نوں دی نابربند اے۔“

”تے اوہ لکھد اے کہ جے تہیں آکھو تاں منڈے نوں تہاڈے کول چھڈ جاواں۔“

بھج جی مورنی دے من وچ ہو رہی گھیراں پچیاں، آکھن لگی ”ساڈا! تیری کوئی عمری، جدوں تیری

توین مر گئی، پتوں نہ سوچیا کہ کھڑے فیرو سدیاں کراں۔ من ویکھ منڈی کولوں چارون نہیں کھے گئے۔“

یہی قل ہی ہو رہی بھج جی ”ساڈے اک بے معلوم بھیا ہو کا لیا۔

”ایویں تیری قل لہیں ہو رہی؟ توں تاں آپنے پتراں نالوں دی ستہ سوایا سی۔“

”اچھا“ ساؤ نوں ہا ساہیا آگیا، تے اوہدی واج اوہدے سنگھ نال گھس گئی، پر توں اوہوں مینوں  
ایہہ دیاہی نہ۔

”لے ایہہ کوئی دکن والی گل سی۔ توں اک واری آکھدوں میں تیرے لئی ست ڈولے  
لیوندی“ بھابھی مورنی اک نیسے نال مٹی وی پنہہ اتے بہہ گئی۔

”ستاس توں سوایا اک مونہہ سی، اوہو کچھ کے رت لہید اسان، فیر آکھنا کیہی“  
ساؤ نے مونہہ دھیاں ساہنی کندھ دل نکھیاں آکھیا۔

”ہیں وے“ بھابھی مورنی دے پتے بدلاں تھے والاں وچوں چویر بکلی لکھ گئی۔  
”ہر اویر تائیں نہیں جوانی جرنی“ ساؤ دے مونہہ اتے اشکار پھر گیا۔

”جو لکھ گئی سوئی لکھ گئی، من بڑھے وارے“ اوہ ابھڑا ہے جی بولی۔  
”تے میں کہوں کہند اوں سوئی نہیں لکھی“ توں اکو بول بولیا سی۔

دیور! میری ہمت تیرے ہتھ اے۔ سو تیرا بول پٹا دتا۔ ”ساؤ دی چھاتی خورے بدل وانگوں  
پاٹ پئی سی۔

بھابھی مورنی کنا چڑھتی دل ویہندی رہی، فیر دھرتی وانگ اڈول ہو گئی۔  
”چنکا ساؤ بھڑوی گل ساری عمر نہیں سوچ، من کاہوں سوچتی اے۔“

ساؤ کنا چڑھا توں اٹل جیھ ملداریا، فیر کہن لگا ”چنکا دس فیر منڈے دا کیہ کرے؟“  
بھابھی مورنی سہو کے جی بولی، ”منڈھے دا کیہ کرنا اے، گھر لیا نو، اوہ اتھے چڑھی تے پیا

ہوے گا تاں گھر فیر وسدا لگے گا۔“

ساؤ نے اُنے کے کارڈ اتے دو اکھڑ پائے، تے فیر ویہلا جیسا ہو کے روز وانگوں اپنے کھوئے نچے وچ  
بہہ کے وارو دا گھٹہ پین لگ پیا۔

بھابھی مورنی نے روز وانگوں چلھے تے دال رکھی، تے فیر ویہلی جی کھلوتی نوں خورے کیہ گھیر پیا  
چھاتی وچوں اک لب جی اٹھی۔ تے اوہ بنے مٹی دی انگیٹھی وچ چار چھوڑے پا کے تیل دی نراہی رکھی تے

گنڈھیاں دے نلے جکے پکوڑے تل کے وارو پیندے ساؤ کول جا کے دھرتی

پنچویں دن وڈا شہر آیا۔ تے رات دی رات رہ کے اوہ جندوں پونہہ مہیاں دے بلوگڑے تھے

نوں بیٹا بھی۔ مورنی وی جھوٹی پائے چلا آ گیا، تاں بیٹا بھی مورنی نے چنے زیرے دی مٹھلی مار کے بال نوں چھاتی  
نال آیا۔

پند وی ایہ نہ لکھا سیجے وی سنہدی اے کہ ساؤ داود پو ترا پو را اک در با بیٹا بھی مورنی، او دھ چٹکھدا

۔ ہیا۔

(پئی انتر: افضل راز)



## تیز دے کپڑے

اچانک میرے سامنے کئی لوگ آکھلوتے ہیں، جیہناں دے تیز کوئی کپڑا نہیں.....  
 پتا نہیں میں کتھے پڑھیا سی کہ خانہ بدوش عورتاں اپنے تیزوں اپنی گھگھری کدے نہیں لایندیاں، میلی  
 گھگھری نوں بدانا تاں سروالے پاسیوں نوں گھگھری پا کے، اندروں دی میلی نوں لایہ لیندیاں، بن تے جدوں  
 کوئی مر جاندی ہے، اوہدی لاش نوں نہاؤن ویلے دی، اوہدے تیز دی گھگھری سلامت رکھی جاندی ہے۔  
 کبندے بن کہ اوہناں نے اپنے ٹینگھ وچ اپنی محبت داراز خدا دی مخلوق کوں چھپا کے رکھیا ہوا ہوندا ہے۔  
 اوہ تھہ اوہ اپنی مرضی دے مردواناں گدوا کے رکھدیاں بن، تے جیہناں رب دی اکھ نوں سوا کوئی نہیں دیکھ  
 سکدا.....

تے خورے ایہو اصول مردواں دیاں تھہاں بارے ہوندا ہو دے گا۔۔۔  
 جیہو جیہ ناویں گدن والا ضرور اک واری عورتاں تے مردواں دے ٹینگھ دیکھدا ہو دے گا، پر  
 اوہنوں خورے اک گھگھری واسطے رب دی اکھ نصیب ہو جاندی ہے، کیونکہ اوہ مخلوق دی کنتی وچ نہیں گئیاں  
 جاندیاں۔۔۔

پر میری اکھ نوں رب دی اکھ والا سراپ کیوں مل گیا؟؟ میں اپنے سامنے اوس اوہ عورتاں تے اوہ  
 مردایوں دیکھ رہیا ہاں، جیہناں دے تیز کوئی کپڑا نہیں، تے جیہناں دے ٹینگھ اُتے اوہ ناویں گدے ہوئے  
 بن، جیہناں نوں دیکھنا ساری مخلوق لئی گناہ ہوندا ہے.....

کل توں ماں ہسپتال وچ ہے۔ اوہدی جان اوہدے ساہواں وچ ڈبدی تے تردی پئی ہے۔ انج  
 اگے وی کئی واری ہوندا ہے، تے دو واری پہلاں وی اوہنوں ہسپتال لے گئے ساں پر ایس واری شاید اوہنوں  
 جیون دا بھروسہ نہیں کجھ اپیا۔ اچانک اوہنے ہتھیاں وچوں ہیرے والی مندری لائی، تے مینوں پھڑا کے

آتشیں بھی کرتیں۔ چائے اوہدی او ہے والی الماری، سے خائے وچ رکھ دیاں۔

جہاں وہ جیتے رہے وہی وہی آئی سی۔ پاپا دوی میرا وہ انجرا دوی پر ماں نے چٹائیں کیوں ایسے بچتا اور جہاں  
نوں نکلے شقی۔ انیس مارے۔ تین لگے ساں۔ جدوں ماں نے اشارہ نال میتوں ٹھہرن لئی آکھیا۔ سارے  
نیلے ستے تانے۔ دھانے پٹھنوں اک چھا ہو یا رو مال کنڈھیا، جیہدی کئی نال دو چایاں بھجیاں ہو یاں  
کت۔ رو مال دوی بھجیاں کنڈھیاں جہاں اک چابی ال اشارہ دکرے، ہنہ میتوں ایسے بچتا کیستی کہ میں اوہدی  
ہی۔ والی مندرجی، الماری دے اندر۔ لے خانے وچ رکھ دیاں۔ ایہ وی دیا کاندہ۔ لے خانے دلی چابی میتوں  
اوستاں لئی، مندا لے لے وٹھیں، دوتی لہجہ، لے لئی۔

تے فیہ ماں نے، بولی تھی ایوی آکھیا کہ میں کہی والے پانچ جی نوں اک دھپا، یاں، بولی آؤں  
 ۔ تے، دوسری چائی، اے دوسرے طرح رو مال وچ وچرٹ کے اپنے سامنے پنھاس رکھتی ۔  
 تے تیرہ یں تھدیراں اے چاندیاں تیں، اوہ چاہیاں وی دے گئیاں ۔

حرفِ نوحہ و زور کے ارتقائی ماں وی اکو الماری ہے، پر ادھو سامان نوکری و بچہ کو ہے دی آنکھ پر  
 دھندلایا ہے۔ مٹی بھرتے پتھر پڑے پتھر رہندے ہیں۔ پایاوی ٹرانسکو ویلے او الماری قریب ٹیٹ  
 کی ٹیٹ کی چال ہے۔ وہ ٹیٹ کی، تے چہاں لکڑیاں والی اوہ الماری واوہو کپڑیاں لٹی رکھتی سی۔

[illegible]

تہ جسے دنیا میں یہ ایسا + پاس تھو اس پھولن اگا۔

پاکستان کے لیے ایک نئی جہت کی تلاش ہو رہی ہے جو خوراک اور پانی کی فراہمی کے لیے ایک نئی جہت کی تلاش ہو رہی ہے۔

پہلے حیران ہو گیا۔ ماں نے اوسے سارے مٹے ہوئے کھڈوئے وی رکھے ہوئے تھے۔ یہ تھیں  
 نایاں بہندہ احمیدہ ابونداسی۔ دیکھ کے اک دہشت آئی۔ چابی نال چلیں والی۔ پس کدی انج اتنی ہوئی سی۔  
 جیوں پڑی توں اترا کی ہوئے۔ تے اوس بھیا تک جدوئے نال اوہدے سارے مسافر زخمی ہو گئے ہون۔  
 پاسک دی کدی جو اک اکھوں کافی ہوئی سی۔ بڑا ہاتھی، جید دی سندھ اوہدے چوں مٹے آئی سی۔ اٹھوڑا  
 جید پیاں اگلیاں دوویں لٹکاں جیویں وڑھیاں۔ پیاں ہون۔ تے بھکھہ نایاں دیاں اتناں پڑھیاں  
 ہویاں سن۔ جیویں اوہناں دے دھڑ تے سراؤ کے کدھ سے دور جا پئے ہون۔ تے نین اوہناں دی  
 شناخت نہیں نی ہوسدنی۔

میرے چندے وچ اک تلخی جیہی لہہ گئی۔ ویلھیا کہ ایہناں زخمی کھڈو نیاں دے کول وارنی مٹی  
 دے بنے ہوئے شوہی داری سی، جو دواں بانواں توں نکا ہوئیا ہو یا سی۔ تے خیال آیا۔ جیوں رب دی  
 پانج ہوئے بیٹا ہو یا تے۔

تھوں تک یا دیا، جا پیا کہ میرا بھین بڑا تلخی سی۔ اوے کچھ اوے جمنے تے میں ستاں دھیاں وی  
 دھو تے نمیا ساں، اہیں لئی میرے بڑے اوے موندے سن۔ اوہوں تک انج وی پا پا دی ترقی ہو گئی سی۔ اہیں لئی  
 میرے واسطے بہت سارے پتر۔ تے بہت سارے کھڈوئے خریدے جانے لے۔ پر ثابت دھیتیاں لئی  
 ایہاں مئے ہوئے کھڈو نیاں وی ماں نوں کیہ لوزی، سمجھ نہیں آئی۔

سارے کھڈوئے نہیں، میرے پائے ہوئے کپڑے وی تہوان وچ لگے ہوئے سن، دھئے ہوئے  
 بنناں والے نلے کٹے جھلکے، بنیاں تھیاں نلے کٹے جھلکے، تے پانیاں ہونیاں جراباں دی۔

تے فیہ میںوں اک رومال وچ بچھی ہوئی اوہ چابی لہہ پئی، جسٹوں بھدا اپنا ساں۔ امارکی داندرا  
 خانہ کھولیا، تاکہ میرے والی مندری اوہدے وچ رکھ دیاں۔

ایہ اوہو گھڑی سی۔۔۔۔۔ جدوں میں دیکھیا کہ اوس خانے وچ صرف تیز دے کپڑے پئے ہوئے

سن

تے اچانک میرے سامنے اوہ لوک آکھلوتے ہن، جیہناں دے سروی کچے ہوئے ہن، بانواں  
 تے گل دی، پر جیہناں دے تیز کوئی کپڑا نہیں۔۔۔۔۔

پر لوڑا ویلا خورے ایہو جیہا ہی ہوندا ہووے گا، چائیں۔ میرے سامنے میری ماں وی کھلوتی ہوئی



ہے، پاپاوی، بمبئی والا چاچا ہی، تے اک کوئی مسز چوپڑاوی، تے اک کوئی مس ننداوی، جیہناں نوں میں جاندیا نہیں۔

تے گواچدی جیہی صورت نال میں دیکھیا کہ اوہناں وچ کتے میں کچھا جیہا ہو کے بیٹھا ہویا

ہاں۔۔۔

پتا نہیں ایہ کیہڑا گیگ ہے، شاید کوئی بہت ہی پرانی صدی، جدوں لوک رکھاں دے پتے کاغذاں ورے کدواں ہو گئے، پتا نہیں۔۔۔

الٹاری دے خانے وچ صرف کاغذ پنے ہوئے ہن، بڑے ہی کاغذ، تے جیہناں اُتے ہر اک دے تن دی ہتھیا لکھی ہوئی ہے، تن دے تاپ ورگی تن دے مڑھکے ورگی، تے تن دی ہوا زورگی۔۔۔

ایہ سارے خط بمبئی والے چاچا جی دے ہن، تے سارے خط میری ماں دے ناں ہن۔۔۔

طرح طرح دی گندھ میرے سرنوں چڑھدی پئی ہے۔۔۔

کسے خط وچوں خوشی تے اداسی دی رلی ہوئی گندھ اٹھدی ہے، لکھیا ہویا ہے، ”دینو! جیہڑا آدمی تے جیہڑی خواہدا ہے، بہشت وچوں کدھے گئے سن، اوہ آدمی ساں، تے حواتوں ی۔۔۔۔۔“

کسے خط وچوں وشواس دی گندھ اٹھدی ہے ”دینو! میں سمجھدا ہاں کہ جتنی دے طور تے توں اپنے پتی نوں انکار نہیں کر سکدی۔ پر تیرا جسم میری نظر وچ لگکا وانگ پوتر ہے، تے میں شو جی وانگ لگکا نوں جہاں وچ دھارن کر سکدا ہاں۔۔۔۔۔“

کسے خط وچوں نرا ستادی گندھ اٹھدی ہے۔ ”میں کیہو جیہا رام ہاں، جو اپنی سیٹا نوں راون کوواں نہیں چھڈا سکدا۔۔۔ پتا نہیں رب نے ایس جنم وچ رام تے راون نوں سکے بھرا کیوں بنا دتا۔۔۔۔۔“

کسے خط وچوں دلجوئی دی گندھ اٹھدی ہے ”دینو! توں من وچ گناہ دا احساس نہ کریا کر۔ گناہ تاں او بنے کینا سی جیہنے مسز چودھری ورگی عورت لئی، تیرے جیہی بیوی نوں دسار دتا سی۔۔۔۔۔“

تے اچانک اک حیرانی دی گندھ میرے سرنوں چڑھی جس ویلے اک خط پڑھیا ”توں میرے نالوں خوش نصیب ایں دینو! توں اپنے پتر نوں پتر آکھ سکدی ایں، پر پر میں اپنے پتر نوں کدے دی اپنا پتر نہیں آکھ سکاں گا۔“ تے حیرانی دی گندھ نال میرے سرو وچ جیویں اک تریز پے گئی، جس ویلے اک دوسرے

خط وچ میں اپنا ناں پڑھیا۔ لکھیا ہویا سی 'میری تاج دینو' بہن توں اداں نہ ہویا کر، میں کتے جیتے اشی دی  
 صورت وچ ہر ویلے تیرے کول رہندا ہاں، دے تیری جھولی وچ لکھیا ہاں تے راتیں تیرے نال سوندا  
 ہاں

سو میں ... میں ...

زندگی دے انھی ورھے میں جیہوں پایا اکھدار بیاساں، اچانک اوس آدمی دے سامنے ایہ لفظ  
 میرے ہونٹھاں اتے جھونٹھاپے گیا ہے۔

اگلے خط میں پوری صورت وچ نہیں پڑھے۔ پر اپنا کو جانیاں تے کہ جنم توں لے کے میں جووی  
 کپڑا لنگ لایا ہے، اوہ ماں نے کدے دی اپنے خاوند دی کمائی وچوں نہیں سی خریدیا۔ مٹی دا کھڈا نا تک دی  
 نہیں۔ میرے سکول دیاں تے کالج دیاں فیساں وی اوہ گھر دے خرچ وچوں نہیں سی دیندی۔

ایہ وی جانیا ہے کہ بھئی وچ اگلے رہندے آدمی کولوں لچھ اینو جیہیاں گلاں وی ہونیاں سن، جیہناں  
 اپنی اک خط وچ ماں کولوں مافیاں سنگیاں ہویاں بہن، تے اوس سلسلے وچ کئی داری تے مس خنداواناں لکھیا ہویا  
 ہے، جو خط لکھن والے دیاں نظراں وچ اک آوارہ کڑی سی، تے جیسے میز کاواٹک اک رکھی دی تپسیا توڑ دی  
 سی ... تے کئی خطاں وچ ماں نوں بھڑکیاں جیہیاں دتیاں ہونیاں بہن کہ ایہ صرف اوہ دے من دے وہم بہن  
 جیہناں کر کے اوہ بیمار رہن لگ پئی ہے۔

ایہ ماں، پایا، چاچا، مسز چو پڑا، ایس انتدا ... کوئی وی خانہ بدوشاں دے قافلے وچوں نہیں، پر  
 اوہناں دی روایت خورے ساری آدم ذات اتے آگے ہوندی ہے، سمجھناں دیاں گھبرائیاں، تے سمجھناں دیاں  
 تہہاں اتے جیتے اوہناں دے پتنگھ اتے لکھیا ہویا ناواں، رب دی اکھ توں سوائے کسے نوں نہیں ویکھنا چاہندا۔  
 تے پتا نہیں لگدا کہ آج میری اکھ نوں رب دی اکھ والا سراپ کیوں لگ گیا ہے۔

صرف ایہ جاندا ہاں کہ رب دی اکھ رب دے من اتے ہوئے اتاں ورہندا ہے پر اوہ انسان دے  
 من اتے لگ جائے تاں سراپ ہو جاندی ہے۔

(پہلی انتر: ڈاکٹر شائستہ نزہت)

☆☆☆☆

## اک شہر دی موت

اپنی کل زمین توں پہلاں پام پینی دی گل کراں گا۔

پام پینی نیپلز دے نیہ۔ نلی واک پر اچھین شہر بوند اسی۔ ایس توں دی پٹلاں۔۔۔ ایہ سمندر دی کنڈھے داسٹر اٹھویں بی سی وچ لیوان۔۔۔ مندری جہازاں دی بندرگاہ بوند اسی، 310 بی سی وچ۔۔۔ زمین جہاز اتھے آئی، پر پام پینی نے اونوں کنڈھے توں پرتا دتا سی۔ پرا خرایہ شہر جت لیا گیا سی، ایہ 80 بی سی وچ زمین کا لائی بن گیا سی۔

نیہ اینت زمین زبان زمین قانون دے زمین اتہار کاری اپنا لئی۔ کاروباری تھاں دے نال دیہ اکام کاہی بوندی سی۔ ایندی دسویں ویہ جاں ہزار بوندی سی۔

فروری 63 وچ اتھے اک ہسپتال بچال آیا۔ بہت لچھ ذہید ڈھیری ہو گیا پر ایندی اُساری مُردا نہجی سی۔

اُماری چل رہی سی کہ 24 اگست 79 نوں اتھے لاوا بھٹ پیا، تے سارا شہر آب دی تتی سواہ پڑھاں گیا تیا۔

ای تتی سواہ پیندوانک دی سی۔۔۔ دھرتی توں چھ فٹ اپنی ایندی تہہ بچھ گئی سی۔ تے ایندے کول جتے میٹھے جاں نھو تے سن مانج دے انج اوس تتی سواہ وچ دب گئے سن۔

تے انج سارا شہر ایس سواہ دی تے قدرتی دھوڑاں دی 12 فٹ اپنی تہہ پٹھاں بچیا گیا۔ تے کئی صدیاں جیاں رہیاں۔

دوسویں صدی وچ۔۔۔ اک غیر کدھ دیاں۔۔۔ کچھ عمارتاں دے نشان لہے۔ تے نیپلز دے بادشاہ نے مارچ 1748 وچ باقاعدہ کھدائی شروع کروائی، تے 1763 وچ شلیاں وی لکھائی توں پتا لگا کہ۔





ہی بتیاں ساریاں دانگ جگدیاں سن تے روز سویرے جیہدی کندھ وچوں سورج چڑھدا سی۔ تے میں دی، جیویں ہر جوان کڑی، اپنے شہر دی اچی اتاری نوں دیکھدی ہے..... ایس اتاری نوں مڑمڑ کے دیکھدی ہوندی ساں.....

اک میرا نکا جیہا شہر، فیروڈا ہو گیا سی۔ میں کالج وچ پڑھدی ساں، تے کالج دے نانکاں وچ کھیڈدی ساں۔ جے ہزاراں نہیں، تاں سینکڑے اوہ پاتر میرے شہر وچ وں گئے سن، جیہناں نوں کہانیاں وچوں کندھ کے میں منج اتے لیائی ساں۔

میرا کندا وڈا شہر ہوندا سی..... میرا دل سمندر دانگ وگدا ہوندا سی۔ تے جدوں دو بچے دیشاں دیاں کتاباں پڑھدی ساں، اوہناں دے پاتر بیڑیاں وچ بہہ کے میری بندرگاہ تے آجانداے سن۔

تے فیراکدن لاوا بھلیا سی، کالی بدلی سواہ مینڈوانگ وسدی رہی سی، تے سارا شہر اوس سواہ پیٹھاں دیا گیا سی..... میں..... اچ توں پندھراں ورھے پہلاں..... جدوں اوس شہر وچوں دوڑن لنی سجا پیرا گاندھریا سی، تے کجے پیر نوں اگانہ کرن لنی اوہدی اڑی ذرا کوچکی سی..... تاں او تھیدی او تھے اوس بلدی سواہ وچ ہمیشہ لنی اک لاش بن گئی ساں.....

پام پٹی شہر دا، تے میرے شہر دا اتہاس اکو جیہا ہے۔ شاید ایسے لنی میں پام پٹی دے کھنڈراں وچ تر دی پتا نہیں کہہ دے ویلے اپنے شہر دے کھنڈراں وچ پہنچ گئی.....

صرف اک فرق ہے..... پام پٹی دے کسے بندے نوں اپنی نقش دیکھنی نصیب نہیں سی ہوئی، تے میں آپ اپنی لاش نوں دیکھ رہی ہاں.....

باقی سمجھ او سے طرح ہے۔ ایہ دی کہ جیویں پام پٹی دے کسے آدمی نوں کفن نصیب نہیں سی ہویا، میرے شہر دے دی کسے آدمی نوں کفن نصیب نہیں سی ہویا۔ ساریاں لاشاں دے منہ ننگے ہن، پچھان سکدی ہاں.....

تے اوس پچھان وچوں ساریاں دے نین نقش چیتے کر سکدی ہاں۔

ایہ میری لاش..... چمک جیسے پنڈا اتے اک بڑا ٹکڑا منہ ہوندا سی۔ سدھے چمک نال ڈھالویں وال دا ہے ہونداے سن۔ مک چنے ریشم دی سلوار، تے گل وچ اکثر ہرے رنگ دی قمیض تے ہرے رنگ دی چنی ہوندی سی۔ کتاں وچ پتلی تار دیاں والیاں۔ منہ بھولا دی ہوندا سی، پر اوہدے اتے تانبے رنگی ضد دی



دن میرے پنڈے دائلوں کوں ایس طرح بل اٹھیا سی..... جیویں میرے پنڈے دا اکوانگ میرے انگ  
انگ وچ سما گیا ہووے..... تے میرے اک اک کوں دامنہ رحم وانگ کھل گیا ہووے.....

اوس دن اک عجیب سبب بنیا سی، نہیں تاں میرے سنگار میرے دوالے انج کسے ہوئے سن کہ میں  
تے پانی دی تھاں راتیں ٹھنڈے پانی مل نہا کے پنڈے نوں برف بنالیندی، تے رضائی وچ گھوک سو بانندی  
۔ پر اوس دن میں..... اپنی اک دوست عورت نوں ملن چلی گئی۔ ایہ میری انگریز دوست کلیئر وڈی عمر دی  
عورت ہے۔ اوس دن اوہنے مینوں اک چیز دکھائی..... اک مرد اوں انگ، اوہ سے ہفتے اوہ بازاروں خرید  
کے لیا کی سی۔ اوہ دے وچ بیٹری دے دوسل پنے ہوئے سن تے اوہنے دیا کہ اوہ بیٹری دے زور چلدا  
ہے..... تے اوہ دے لفظ اوس دن اوہ دے اتے ترس کھاندے پنے سن "کیہ کراں سن ایس عروچ کوئی مرد  
نیزے نہیں آؤندا۔ طلاق لیاں ست ورھے ہو گئے نیں، پہلوں تاں کدی دو چار دنوں کوئی نوجوانا سی، پر  
جیویں جیویں عمر بھیلدی پئی اسے....." تے مینوں جایا جے میں اپنی جوانی اپنے سنگاراں نوں دے دتی،  
تاں آؤندی عمرے مینوں وی اک دن کلیئر وانگ ایسے طرح بازار جانا پوے گا، تے بیٹری والا ایہ ربڑ دانکلا  
میری قسمت بن جائے گا.....

تے اوس شام میں اپنے اک تھوڑے جیسے واقف آدمی نوں فون کر کے روٹی کھان لئی بلایا سی۔ اپنے  
مرن دن نوں اپنا جنم دن ویسی سی۔ فیر کاہلی نال روٹی پکائی سی، اوہ دے لئی ہیک خرید کے آندی سی، کمرے نوں  
تازہ پھلاں نال سجایا۔ اگلی عورت کول اسکے مرد نے مساں گھنٹا کو کتاباں تے فلمیں دیاں گلاں کیتیاں سن فیر  
اوہنے تانگھ کے میرا ہتھ پھڑ لیا سی۔ میرا ہتھ نسا جیہاوی ہو گیا سی، پرویا کل جیہاوی۔ تے میرے ہتھ وانگ میرا  
انگ انگ.....

اوس دن وانگ اج وی پچھتاوا نہیں۔ صرف راتیں..... جدوں جارج میرے کول ستا پیا  
سی..... دل وچ آیا سی کہ اج لہو نوں اپنے نال اپنے موئے ہوئے شہر وچ لے جاواں۔ جس طرح لوک پام  
پٹی دے کھنڈراں نوں دیکھن جاندے ہن، میں جارج نوں نال لے جاواں تے اوہنوں اپنے شہر دے کھنڈر  
دکھاواں۔

فیر پتا نہیں کیوں..... جارج نوں کچھ نہیں دیا۔ سویرے انھ کے اوہ چا، دا ہالا لپی کے چلا گیا  
ہے، تے میں اگلی اپنے شہر دے کھنڈراں وچ مڑ آئی ہاں..... ایہ میری لاش.....



تے اوہو اچیاں ہوندیاں کندھیاں اوس اناری دیاں نین، جیہدے وچ ویرندر رہندا سی..... ایہ کندھ دے کول اوہدی لاش ہے، اوہدے سارے نقش میرے چھیتے وچ اگھڑ آئے نین..... چوڑے موڈ حیاں اتے تنیا ہو یا سر، منہ دارنگ کنکی، پراکھاں بڑیاں کالیاں ڈونکھیاں، تے تراشیاں ہونیاں۔ اوہ اکھاں نال میری جند دھر وہ لیند اہوند اسی.....

اوہدی ایس اناری وچ میں کنی وار راتیں سپیاں وچ گئی ساں، تے اپنے مہندی والے ہتھاں نال اوہدی تنجی اتے ویدا چھوٹا کیجا سی..... اوہدے قولوں تے قراراں نال بھری ہوئی میں، اوہنوں اوہدی گلے، سے موڑ اتے مل کے جدوں اپنے پیو دے کھلے دیزھے والے گھر آؤندی ہوندی ساں..... تاں گھر دیاں کندھیاں میرے پنڈے نوں پیو لیندیاں ہوندیاں سن۔ میرے پیو دی گھوری نال..... پھل دے پتے جھڑ جاندے سن، تے میں دھپے لوہی جاندی ساں.....

تے اک دن..... میرا کنج کوارا پنڈا اچھلیا گیا۔ گھر آئی نوں ماں نے انگاریاں ورگیاں اکھاں نال دیکھیا، تے چلے وچوں اک کنز کھج کے آکھیا..... ”تینوں اوہدی ایندی اک لگی ہوئی اسے تاں ایہ چواتی اپنے اندر پالے.....“ سپیاں کولوں میں تے سہیلیاں کولوں مرداں دیاں گلاں سنیاں ہو یاں سن، مہکاں ورگیاں گلاں، پر ماں دی گل سن کے انج جاپیا جو یں اک بلدی بلدی کنز میریاں لتاں وچ کھب گئی ہووے.....

میں کئے دن اپنے کمرے وچ ڈکی روندی رہی۔ تے اک دن ماں نے کوئی سادھ پھڑ کے لے آندا، تے اوہدا دتا ہو یا تویت گھول کے مینوں زوری پیا دتا۔ ساری رات میں چوری اٹلیاں کر دی رہی، پر سویرے سارے جدوں اوہ میری کڑمائی دا چھو مارا مینوں کھوان لگی..... پتا لگا کسے دوہا جو نال اوہ میرا دیاہ کرن لگی سی۔ دیرندر ساڈے مذہب دانہیں سی، تے ایہ دوہا جو ساڈے مذہب داسی۔ میں چھو ہارے نوں منہ وچوں تھک دتا..... تے ماں دے ہتھوں بات چھڈا کے دیرندر دے گھر دل دوڑ پئی.....

تے اچانک دھرتی وچوں لاوا نکل پیا..... چارے پاسے کالی تے بلدی سواہ اڈن لگ پئی..... سنیا، دیرندر نے پچھلے نفٹے کسے کڑی نال دیاہ کر لیا سی..... تے اوہ بلدے شہر وچوں نکلن لئی میں سجاویر اوہ نہ چایا ہو یا سی، تے کھبا پیرا گاتہ دھرن لئی اڈی چکی ہوئی سی..... کہ میں انج دی انج اوس تتی سواہ وچ اک لاش مت گئی

تے ایہ میرے شہر دے کھنڈراں وچ میری لاش.....

(پی انتر: ڈاکٹر شائستہ نذہت)

☆☆☆☆

## نہ جانے کون رنگ رہے

ساں ہمیشہ اگانہ نہیں تر دیا، کئی وار پچھانہ وی تر پیندا ہے۔ ارج جیویں تر دے تر دے دے ہتھوں کوئی چیز ڈگ پئی ہووے، بڑی دور جا کے اس نوں اوس چیز دا چیتا آیا ہووے، تے فیر اوس نوں لہسن لئی اوہ پچھانہ تر پیا ہووے۔

میری ماں دے تک وچ پیا ہو یا موتی سے دے ہتھوں ڈگ پیا۔ ویہ ورھے تنگھ گئے۔ دیہاں ورھیاں پچھوں سے نوں اچانک اوہرا چیتا آیا، تنگھ مبر کے کھلو گیا، تے فیر اوس موتی نوں لہسن لئی پچھانہ تر پیا۔

ویہ ورھے پچھانہ ترے ہوئے سے وی مدد نال میں ارج اپنی ماں دے تک وچ پیا ہو یا سچا موتی دیکھ سکدی ہاں۔ میں اپنی ماں نوں اپنیاں اکھاں نال کدی نہیں دیکھیا، کیونکہ میں اچے پورے چالھیاں دناں دی نہیں ساں، جدوں میری ماں مر گئی، پر ارج ویہ ورھے پچھانہ تر کے آئی سے دیاں اکھاں نال دیکھ سکدی ہاں کہ..... گوانڈھیاں دے گھر کاج رچیا ہو یا ہے۔ دیاہ والی کڑی دیاں سہیلیاں ارج منڈ ہے دے دن، گیت گون واسطے آئیاں ہو یاں ہن۔ ساڈے یو پی دے لوکاں وچ ایہ منڈ ہے دا دن بڑا روٹھلا ہوندا ہے۔ دیاہ دے منڈ پ دوالے کڑیاں گھیرا پا کے نچدیاں ہن۔ تے ایہناں نچدیاں کڑیاں وچ جیہڑی کڑی بھتوں کٹیلی ہے اوس نے اپنے تک وچ سچا موتی پایا ہو یا ہے۔ تکھے تے سولے تک اُتے موتی بری چھب نال بیٹھا ہو یا ہے۔ گھنگھر دواں والے وال جدوں ناچ دی پھیر لیندے لک نال ہلاراں کھا کے متھے اُتے ڈگ پیندے ہن تاں موتی کھنگھو رہتا ہی اُر کے تک دے موتی نوں ہتھ لا جاندا ہے۔ تے ہوشاں وچ جدوں گیت کنبدا ہے تاں اوہ جی ذول نال تک دا موتی جھل مل کرن لگ پیندا ہے۔ موتی دارنگ دسدا ہے، پر گیت دارنگ نہیں دسدا، نہ دن والی دے من دارنگ دسدا ہے، تے ایسے رنگ دے نہ دن توں پریشان ہو کے اوہ کڑی آکھ رہی

ہے:

کلسا توں بڑا مندر نہ جانے کون رنگ رے.....

تے ایس سٹروں کوئی دیواری دہرا کے اوہ اگوں آکھدی ہے:

نہ جانے کمرہا کے کڑھے نا جانے مائی رنگ رے.....

دلہن تو بڑی سندر نہ جانے کون رنگ رے.....

نہ جانے منیا کی لکھیا نہ جانے بابا رنگ رے.....

روپ دیاں کرتا رتن ہو ہم آپا رنگ رے.....

تے نہ دن والے رنگ دی پریشانی نوں اوہ رب آتے تے رب دی قدرت اتے سٹ کے اپنا من

ہوا کر لیندا ہے۔ پر من خورے انج ہوئے نہیں ہوندے، من طوطے داروپ دھار لیندا ہے تے اوس دس نوں

اڈن لئی کاہلا پے جاندا ہے جیہڑا دیس امروداں دادیس ہووے۔ دن نوں کپے امروداں نوں نکد اوہ ویلا گزار

لیندا ہے، پر رات نوں فیر چین نہیں کردا۔ اوہی رات نوں کسی ہوئی چولی دے بندھن کترن لگ پیندا ہے۔ ایہو

پریشانی گیت بن جاندا ہے:

چل کے سکنا امرودا کے دیاں میں

دن میں تو کٹ کے سکنا کپے امرودا

آدھی رتن کٹکے چولی چولی کیر بندھنوا

ہائے رے سکنا.....

تے فیر پتا نہیں گا گا کے تے نچ نچ کے تھکی ہوئی اوہ کڑی ہف کے کھلو جاندی ہے، کہ طوطے دی

لال پنجھ توں ڈردی اوہ طوطے والا گیت گونا جھڈ دیندی ہے، کہ بنے آتے کھلو کے دیکھدے لوکاں دیاں

نظراں توں شرما جاندی ہے..... فیر تر کالاں ویلے جج آؤندی ہے، اوہ کڑی ہو کرڑیاں نال رل کے جج

ہائمن چلی جاندی ہے۔ جانجیاں وچ لاڑھے دے کجھ دوست ایہو جے وی ہن جیہڑے کسے وڈے شہرون

آئے جا پے ہن۔ اوہناں دی چال ڈھال سبھناں جانجیاں نالوں نیاری ہے۔ تے اوہناں نیارے

جانجیاں وچوں اک جنا، اک تک اوس کڑی دے مندول نکدار ہندا ہے، جیسے تک وچ ہنچا موتی پایا ہویا ہے۔

نئی نوں جا پدا ہے کہ دو پہراں ویلے ایہ بنے آتے دی کھلوتا ہویا سی، خورے دوہاں گھراں نال ایہہ اکوئی

دو ہراساک ہے، بہن بیچ وچ وی آیا ہویا ہے۔ کڑی شرم نال دوہری ہوندی جاندی ہے، تے اوس داموتی اوس دے تک وچ سنگھڑا جاندی ہے..... فیر جیج روٹی کھاندی ہے۔ بہت سارے جانگی گھرنوں پرت جاندے بہن، پرویاہ والا منڈا، اوہدے ڈاڈھے نیڑے دے سمجھدی تے اوہدے نیارے دوستاں وچوں اک دوست، اوتھے ہی رہ جاندے بہن..... دیدی دے والے بہن دا ویلا ہو جاندی ہے۔ سمگری دادھواں جیوں جیوں اچا ہوندا ہے، کڑیاں دا گیت اچا ہو جاندی ہے: ”پہلی بھنور بیٹی اب ہوں ہماری..... باہل کی بیٹی، دو جی بھنور بیٹی ابو ہوں ہماری..... مٹیا کی بیٹی.....“ تہی بھنور بیٹی ماسے دی، چوتھی بھنور بیٹی تائے دی، پنجویں بھنور بیٹی چاچے دی، چھیویں بھنور بیٹی اپنے بھراواں دی..... ماں دے جانیاں دی، پرستویں بھنور بیٹی پرانے ہو جاندی ہے..... گون والیاں کڑیاں وچوں بھوتوں چھیلی نہار اوسے کڑی دی ہے، جیہڑی تک وچ پیا ہویا موتی کنبدا ہے۔ ویاہ والے منڈے دا دوست اکھاں نہیں جھمکدا، اوہنوں نکدار ہندا ہے۔ سارا گیت گاؤندی اوہ کڑی اوس نوں اپنی ہوئی لگدی ہے۔ سویرے سویرے چڑھے اوہ کڑی دے مایاں نوں سنبھا بھوندا ہے تے اوس کڑی نوں منگ لیندا ہے۔ ماپے اوس دا اتا پتا سمجھدے بہن تے فیر اپنی تسلی کر کے اوہ اوس کڑی داساک دے دیندے بہن..... اوہ کڑی کھادتی، کہندے بہن کہ میری ماں سی۔

اگلی گل میں اپنی مانی دے مونہوں اک دار سنی ہوئی سی کہ میری ماں اپنے ویاہ وچ وی گیت گاؤندی رہی، ہور کوئی گیت نہیں صرف اک سطر..... نہ جانے کون رنگ رے! ایہ سطر اوہ ڈھونگی نال رل کے نہیں سی گاؤندی، اگلی شیشے دے ساہنے کھلو کے گاؤندی سی۔ ناچ دا ہتھ مار کے نہیں سی گاؤندی، ہتھ نال اکھاں دا اتھرو چھٹک کے گاؤندی سی۔ تے ایس گیت دی ولک نال اوہدے تک داموتی بل بل جاگدا نہیں سی، بل بل بھندا سی۔

میری مانی نے مینوں دسیا کہ ویاہ دے پہلے پھیرے میری ماں داروپ جھروٹیا گیا سی۔ دو بے پھیرے مانی مینوں چیت وچ پا کے پرت آئی۔ پیٹ وچ مینوں پالیا ئی تے ہڈاں وچ تاپ پالیا ئی۔ بس فیر اوہ کہتے نہیں مانی۔ مینوں دھم توں بعد اوس نے پورا چلیسا نہیں کیا۔ منجی اتے اک واری اوہ اوس دن لائے سی جدوں میں جی ساں، فیر چلیسے توں اندر دو جی وار اوہ اوس دن لائے جی جدوں اوہدے ساہنڈے پئے سن۔

میں جدوں پلھر پئی ساں، مانی نوں ماں سدن لگ پئی ساں۔ پنجاں ورہیاں چکھوں مینوں پتا لگا سی کہ ماں ہور ہوندی ہے تے مانی ہور۔ اوہوں مینوں مانی نے دسیا کہ میرا باپ اک واری میری ماں دے مرن

تے آیا سی، فیر کدی نہیں آیا۔ اوہنے کتوں میری ہور ماں لے آندی ہے، پر ہور ماں اپنی ماں نہیں ہوندی، ایس  
لنی اوہنے مینوں کدی اپنے کول نہیں بلایا۔

تے سولھاں ورھیاں پچھوں نانی نے مینوں اک بڑی بھیت والی گل دسی۔ میں اوووں کالج وچ  
پڑھن لگ پئی ساں۔ ساڈے قصبے وچ ہن کالج کھل گیا ہو یا سی۔ اک دن میرے کالج دا اک جماعتی مینوں ملن  
لنی آیا۔ اوہ میرے کمرے وچ بیٹھا ہو یا سی کہ باہروں میرے نانا جی آگئے۔ میری نانی نے مینوں آکھیا کہ  
میرے نانا جی ایہ پسند نہیں کرن گے کہ میرے کالج دا کوئی لڑکا مینوں ملن لنی آوے۔ ایس لنی میں اوہدے نال  
کچھ گاں کر کے اوہنوں چھیتی نال توں دتا۔ میرے نانا جی اگلے ویڑے وچ بیٹھے ہوئے سن، ایس لنی میں اپنے  
جماعتی نوں اگلے بوہے وچوں نہیں پچھلے بوہے وچوں بھیج دتا۔ اس رات میری نانی نے میرے کول بہہ کے  
مینوں دسیا کہ میری ماں نوں ایہ یوسف ناں دا لڑکا بڑا چنگا لگدا سی۔ تے میری نانی نے سوچاں وچ اک غوطہ کھا  
کے مینوں دسیا۔ رب نے اوہنوں شکل وی یوسف دی دتی سی تے حلیمی وی۔ پر نہ ذات ملے نہ دھرم، میں  
کیہڑے بوہیوں اوہنوں گھر واڑ دی۔ اک داری میں پچھلے بوہیوں آؤندا دیکھیا تاں میں دھی نوں اندر بہہ کے  
سمجھا دتا۔ تیویں دا پاپ پھل ورگا ہوندا اے، پانی وچ ڈبا نہیں تر کے منہ بولد اے۔ مرداں دا کیہ اے،  
اوہناں دے پاپ تاں پتھراں وانگ پانی وچ ڈب جاندا نہیں، کسے نوں دوہے کن پتا وی نہیں لگدا.....  
میں دھی نوں نہہ کے ویاہ دتا۔ پر ورھے وچ مک گئی شوہدی۔ جیہڑا سہرے نہہ کے اگلے بوہیوں گھر آیا سی،  
موٹی دی لاش دیکھن لئی بس اک داری فیر آیتے چلا گیا..... موٹی دامنہ دیکھن لئی اک داری اوہ وی آیا  
تھا..... پچھلا بوہا کھڑا یوسو، میں کیہ کر دی، ذات نہیں سی ملدی، دھرم نہیں سی ملدا، پر کیہڑے جگرے نال  
ہنک دیندی۔ اندر آ کے موٹی دامنہ دیکھ گیا تے فیر اوہنیں پھریں اوہے بوہیوں پرت گیا۔ میری دھی دی قسمت!  
جیہڑا اگلے بوہیوں آیا سی، اوہ وی تر گیا تے جیہڑا پچھلے بوہیوں آیا سی اوہ وی تر گیا.....“

تے مینوں اپنی ماں داروگ پتا لگ گیا۔ میری نانی مینوں جو کچھ سمجھانا چاہندی سی اوہ وی میں سمجھ  
گئی۔ میں اپنی ماں والے روگ توں بچنا سی۔ ایس لنی میں کدے کسے نوں پچھلا بوہا نہ کھولیا۔ مینوں پتا لگ گیا  
کہ پچھلے بوہے وچوں جیہڑو دل اک داری باہر تر جاندا ہے اوہ فیر پرت کے چھاتی وچ نہیں آؤندا۔

جوانی میرے اتے وچڑھی سی۔ جیہڑی کدے میری ماں اتے چڑھی سی۔ اپنی نانی کولوں میں وی اوہ  
گیت سکھیا سی، جیہڑا کدی میری ماں نے سکھیا سی..... چل رے سنگنا امر درواں کے دیو امیں..... تے شیشے

وچ اپنا منہ دیکھ کے میں وی او ہو گیت گاؤندی ساں، جیہڑا میری ماں گاؤندی ہوندی سی۔۔۔۔۔ نہ جانے کون رنگ رہے۔۔۔۔۔ مے میں گھر دا پچھلا بوبا کدے کسے لئی نہ کھولیا تے اگلے بوہے ول اکھاں لا کے اوہنوں اوں لیکن لگ پئی جیہڑا منہ دیکھ کے مینوں کے یوسف دامنہ نہ چیتے کرنا پوے۔

فیر مینوں ستار سواں ورھا چڑھیا، فیر انھیں اوں۔ میرے نانا جی نوں گھائے پے گئے۔ میرے لئی اوہ جیہڑے چنگے ساک نولدے پنے سن، اوہناں ساکاں دی اوہ آس لے بیٹھے۔ اک دن سوچاں وچ پے کے اوہناں نے میرے باپ نوں خط لکھیا کہ میں دیاہ جوگی ہوگی ہاں ایس لئی اوہناں نوں میرے لئی کوئی فکر کرنا چاہیدا ہے۔

خط دے جواب وچ میں جینوں دیکھیا، اوہ میرا باپ سی۔ دھی نے اپنی ہوش وچ پہلی وار باپ نوں دیکھیا، تے باپ نے پہلی وار دھی نوں۔ اکھاں وچ کدے اپنت پے جاندی سی، کدے نکل جاندی سی۔ مینوں پتا نہیں سی لگدا میں اپنے باپ نال کیہ گاں کراں۔ تے شاید میرے باپ نوں ایہ پتا نہیں سی لگ رہیا کہ اوہ میرے نال کیہ گاں کرے۔ اوس رات اوہ میرے نانا جی دے گھر گیا، راتیں بڑی دیر تک اوہناں نال گاں کردارہیا۔ سویرے میری نانی نے مینوں دسیا کہ میرا باپ کجھ دتاں لئی مینوں اپنے گھر لجانا چاہندا ہے۔ مینوں ایہ بھ کجھ عجیب لگ رہیا سی پر میں جان لئی من گئی۔ میری مرضی کسے اپنت نال نہیں سی بچھی ہوئی، پراک ساک نال بچھی ہوئی سی۔ دوپہر ویلے جدوں میں اپنے کپڑے کدھے تاں میری نانی نے اپنا کٹڑا صندوق کھول کے اوہدے وچوں سچے موتی والی اک تلی کدھ کے میرے تک وچ پادتی۔ ایہ اوہو سچا موتی سی، جو میری ماں اپنے تک وچ پاندی ہوندی سی۔

مینوں اوہ گھڑی یاد ہے جدوں میرے تک وچ سچا موتی پا کے میری نانی نے میرے منہ ول تکیا تاں دوہاں ہتھاں نال اپنا منہ کج کے رون لگ پئی۔ فیر خورے اپنا رون اوں نوں بے سنگی لگا، اوہ میرے سر نوں اپنی چھاتی نال لا کے میرے متھے نوں چمن لگ پئی۔ حمدی، حمدی اوہ آکھدی پئی سی، ”مول نالوں دیاج پیار“ مینوں پتا سی میری نانی دا مول گواج گیا ہویا ہے، میں تے دیاج ہاں۔۔۔۔۔ دھی دی دھی۔ اوہنوں گواچے مول دا میر داوی آندا پیا سی تے رہندے دیاج نال پیاروی آؤندا پیا سی۔

میرے منہ وچوں اوس ویلے خورے کس طرح ساریاں نوں میری ماں دامنہ دسد پیا سی، میرے نانا جی جدوں سنیشن تے جان لگی نوں سراتے پیار دین لگے تاں اوہناں دے منہ باز کے نکل گیا، مینوں تے اچ



ایہ بلیا نری کلاوتی لگدی پئی اے..... ایہ رب دے کیہ رنگ ہوندے نیں.....“

گڈی وچ مینوں زمانے ڈبے وچ بٹھا کے میرے باپ نے اپنا بیگ مردانے ڈبے وچ رکھ لیا۔  
میں جدوں اگلی بیٹھی تاں مینوں جا پیا کہ میں اپنے باپ دی شکل چنگی طرح نہیں سی دیکھی، دوسرے دن سویرے  
جدوں دلی اتر اں گی تاں پتا نہیں گڈی وچوں اتر کے اوہنوں پچھان وی سکاں گی کہ نہیں۔ تے شاید ایہ سوچ  
میرے باپ نوں وی آئی ہووے گی، کیونکہ اگلے شیشن اُتے اوہ میرے ڈبے وچ آیا تے مینوں انج دیکھن لگ  
پیا جیویں اوہ وی میری شکل نوں چنگی طرح چیتے کر رہیا ہووے کہ دوسرے دن سویرے جدوں دلی پہنچے تاں  
گڈی وچوں اتر کے مینوں چنگی طرح پچھان لوے۔

رات پے گئی سی، اے کنا سرباتی سی، جدوں آگرے شیشن اُتے میرا باپ میرے ڈبے وچ آیا  
تے مینوں آکھن لگا: ”جے توں آکھیں تاں اتھے اتر پیسے، توں تاج محل کدے نہیں دیکھیا ہونا، میرے من دانہ  
مٹ گیا۔ جیا کرے اپنے باپ دی چھاتی تال سر مار کے آکھاں: ”ماں نے مینوں مر کے چھڈ دتا، پر توں مینوں  
جیوند یاں ہی چھڈ دتا سی۔ ویہاں ورھیاں پچھوں اج تینوں خیال آیا اے کہ میں آگرے دا تاج محل نہیں دیکھیا  
ہونا..... میں دلی دالال قلعہ نہیں دیکھیا ہونا..... میں بن کجھ نہیں دیکھنا.....“ کسے باپ تال میں خداں  
کر کے نہیں دیکھیا، پر بن جدوں دیا آ یا سی تاں خداں کرن والی عمر نگھ گئی سی۔ بن میں اٹھیاں ورھیاں دی  
تے کالج دی پڑھی ہوئی کڑی سی۔ آکھا من کے اچھا آکھ دتا تے گڈی وچوں اتر پئی۔

اک ہونل وچ سامان رکھیا۔ روٹی کھادی۔ رات بڑی ڈونگھی ہو گئی سی۔ سوچیا سویرے سار تاج  
دیکھاں گے، ایس ویلے نہیں۔ تے میں اپنے باپ دے سپنے ور گے میل نوں اکھاں وچ میٹ کے سوں گئی۔

اگوں پتا نہیں میری قسمت کیہ میرے تک وچ پئے ہوئے چھ موتی دی قسمت..... مینوں اپنی  
چھاتی وچ اپنا ساہ رکدا جا پیا تے میری گھبرا کے نیند رکھل گئی۔ کسے دامنہ میرے منہ کول اڑیا ہو یا سی، کسے دیاں  
باہواں میریاں باہواں اتے پنیاں ہوئیاں سن، میری چپک نکل گئی۔ ”بابو جی.....“ اپنی جاچے میں اپنے  
باپ نوں پچھان کے ایہ آواز نہیں سی دتی، جیہڑا کوئی میری منجی اتے آ گیا سی، اوہدے کولوں مینوں بچن لئی میں  
اپنے باپ نوں آواز دتی سی، پر.....

بابو جی نے اپنی تلی تال میرے ہونڈ میٹ دتے۔ میری چپک جتی کونگی، باقی ہونٹھاں وچ مٹی گئی۔  
میں کنبی پئی ساں، پر میں دیکھیا میرا باپ دی کنبہ اپیا سی۔ میریاں باہواں وچ پتا نہیں کتھوں بڑا زور آ گیا،



میں اپنے باپ دیاں بازوؤں پکچاند دھک دیتاں تے منجی اتے اتر کے کھلو گئی۔

پتا نہیں سی لگدا کیہ کراں۔ کمرے دا بو باندرؤں بندی، چھیتی نال کھول دتا، پر بو ہے وچ کھول رہی۔ پتا نہیں سی لگدا ایسا ویلے تھئے جاواں، کنا چہ بو ہے وچ کھلوتی رہی تے فیر میں دیکھیا کہ میرا باپ اپنی منجی اتے لیٹ کے رو رہیا سی۔ میں کنا چہ او سے طرح کھلوتی رہی۔ اک پیر دہلیزاں توں اندر سی، اک باہر۔ اندر لا پیر باہر نہیں سی جاند، باہر لا پیر اندر نہیں آؤندا۔

تے فیر میرے کناں نوں جا پیا کہ میرا باپ میری ماں دا ناں لے کے کجھ آکھدا ایسا سی۔ تے فیر مینوں لگا کہ اوہ میرا ناں لے کے وی کجھ آکھدا ایسا سی۔ میں کمرے دے کھلے ہوئے بو ہے نوں بھینر دتا تے اپنے باپ دی منجی کول ہو کے گوڈیاں پر نے بیٹھ گئی۔ میریاں تاں کہہ دیاں پیاں سن، میرے کولوں کھلوتا نہیں سی جا رہیا۔

جیہڑے لفظ میرے باپ دے روں وچ رلے ہوئے سن، اوہ بن مینوں چنگی طرح سنائی دے رہے سن۔ میرا باپ کدے میری ماں دا ناں لے کے اوہدے کولوں معافی منگدا ایسا سی، کدے میرا ناں لے لے۔ پتا نہیں کیہو جیہڑا روں میرے اندر وی اٹھ پیا۔ منجی دی باہی نال سر لا کے میں جیوں روں لگی، ندا اپنے آپ نوں میرے کولوں چپ کر دیا گیا، ندا اپنے باپ نوں۔

خورے رات ڈھل دی پچی سی، سویر ہون دی پچی سی کہ خورے چین دا چانن کمرے وچ پیندا ایسا سی، میرا باپ تر بھ کے منجی اتوں اٹھ بیٹھا۔ "میں دن دے چانن وچ تینوں اپنا من نہیں دکھاسکدا ایٹی۔ میں بن اتھوں چلا جاواں گا۔ توں پڑھی لکھی کڑی ایس..... سویرے کوئی گڈی لیکے اپنی نانی دے گھر چلی جائیں....." میں اپنے باپ دے ٹکڈے ٹکڈے بول سنے تے فیر دیکھیا کہ اوہ نے اپنے بو جے وچوں کجھ نوٹ کڈھ کے منجی اتے رکھ دتے: "ہونل دا بل دے دئیں..... گڈی دی ٹکٹ لے لئیں....."

میں منجی دی باہی اتے سر رکھ کے روندی پئی ساں، پتا نہیں کیہڑے ویلے اپنے باپ دیاں تاں کول ہو کے اوہدے گوڈیاں نال سر لا کے روں لگ پئی۔

"توں بے معاف کر سکیں مینوں معاف کر دئیں....." میرے باپ نے آکھیا تے مینوں انج جا پیا، جیویں میرے سرائے جتھ رکھن لئی اوہ نے اپنا ہتھ اگات کیتا سی، پر فیر میرے سر نوں چھو ہیا نہیں سی۔ "بابو جی....." میرے مونہوں ولک کے نکلیا۔

”تیری ماں مر گئی، سمجھ چھڑیں باپ وی مر گیا“ میرے باپ نے اک دار آکھیا تے فیر اوہنے  
میرے کولوں گوڑیاں نوں چھڑا کے پرانہ ہو جاتا چاہیا۔ میں گوڑیاں دے دے والے زور دی ہاند والائی۔ پر میرے  
کولوں کہیں کچھ نہ ہویا۔ بڑے چر پگھوں میرے باپ نے آکھیا، ”توں نہیں سمجھ سکدی..... میں سمجھاواں وی  
کس طرح؟ کہنوں سمجھاواں؟..... اک سچ سی، پر سارا جھوٹ بن گیا.....“

”میں سمجھاں گی بابو جی.....“

”میں جدوں تیری ماں نوں دیکھیا سی..... ویہ ورھے ہو گئے نیں..... پتا نہیں ویہ ورھے کتھے  
چلے گئے..... میں کل جدوں دیکھیا، مینوں جا پیا میں اوے نوں دیکھدا پیا ہاں.....“

”میں سمجھ رہی ہاں بابو جی!“

سماں ہمیشہ اگانہ نہیں تر دا، کئی دار پچھانہ وی تر چنیدا ہے، انج جیویں تر دے تر دے رے ہتھوں کوئی  
چیز ڈگ پئی ہووے، بڑی دور جا کے اوہنوں اوس چیز دا چیتا آیا ہووے تے فیر اوس نوں لکھن لئی اوہ پچھانہ تر پیا  
ہووے..... میری ماں دے تک وچ پیا ہویا موتی مینوں سے دے ہتھوں ڈگ پیا سی، ویہ ورھے لنگھ گئے  
سن۔ پراج میرا باپ سے دے نال رل کے اوس موتی نوں لکھدا پیا سی۔

میرے باپ نوں ویہاں ورھیاں دیاں گلاں کل دا رنگ یاد سن۔ میں سندی رہی، انج جویں اوہ  
اک گل مینوں اکھیں دکھاندا پیا سی۔ جو کچھ سمجھ سکدی سماں سمجھیا، جو نہیں سمجھ سکدی، اوس نوں چھاتی وچ پا کے  
ثانی دے گھر آگئی ہاں۔ ”سترئی ماں کول جان لئی جیا نہیں کیجا“ ثانی نوں آکھ دتا ہے۔ پر سوچ رہی ہاں.....  
ماں گاؤندی سی، ”کلسا تو بڑا سندر نہ جانے کون رنگ رے،“ ماں نوں اپنے من دا رنگ پتانہ لگا، اوہ ایس توں  
پریشان ہو کے مر گئی۔ بابو جی جیوندے ہن، پر اپنے من دا رنگ اوہناں نوں وی پتا نہیں لگدا..... جیہڑے رب  
نے ایہ رنگ بنایا ہے، اوہی اوہناں نوں معاف کرے! میں کیہ آکھ سکدی ہاں.....

(پی اتر: ڈاکٹر شائستہ نزہت)

☆☆☆☆

## اک رُمال اک چھاپ تے چھاننی

کچی پہلی توں لے کے اٹھویں جماعت تک بنتی ساڈے نال پڑھدی رہی سی۔ اسے اوہ پنجویں چڑھی سی جدوں اوہ داپو اوہوں سکولوں اٹھان واسطے آیا۔ پر ساڈے سکول دی وڈی استانی نے بنتی دی فیس معاف کردتی تے اوہوں سکولوں نہ اٹھن دتا۔

ستویں جماعت دیاں گزیاں تے اٹھویں جماعت دیاں گزیاں دیکھن نوں اکٹھیاں اکو کمرے وچ بٹھدیاں سن۔ پراڈھی چھٹی ویلے اٹھویں دیاں گزیاں سانوں ستویں دیاں کڑیاں توں اپنے لاگے نہیں سن لگن دیندیاں۔ ہمیشہ دکھریاں ہو کے بہندیاں سن تے پتا نہیں کٹھاں وچ لگ لگ کے کیہ گلاں کر دیاں رہندیاں سن۔ ایسں جدوں ستویں دیاں گزیاں اوہناں دے نیزے جاندیاں ساں اوہ سانوں ہتھ نال چھٹک کے پرانہ کر دیندیاں سن۔ سانوں ستویں دیاں گزیاں نوں اٹھویں دیاں کڑیاں اُتے بڑا غصہ آؤندا سی تے ایسں سوچدیاں ساں ایسں جدوں اٹھویں وچ ہوواں گیاں، ستویں دیاں کڑیاں نال کدی ایسں طرحاں نہیں کراں گیاں۔

تے فیر ایسں اٹھویں جماعت چڑھیاں۔ گرمی دیاں چٹھیاں پچھوں جدوں سکول کھلے، ساڈے کولوں وی اوہ گل ہوگئی جہڑی ایسں سوچیا سی کہ ایسں کدی نہیں کراں گیاں۔ ایہ تیرھواں، چودھواں درحہ پتہ نہیں کہو جہیا ہوندا ہے۔ شاید ایہ دلہیز ہوندی ہے پچپن تے جوانی دے وچکار۔ ایسں ورھے کڑیاں دا اک پری دلہیزوں آرانہ تے اک پرانہ جاپنہ ہے۔

اوہناں گرمی دیاں چٹھیاں وچ بنتی دا اک گوانڈھی منڈا بنتی نوں سوال سمجھاؤندا رہندا سی تے ہن ہر روز اڈھی چھٹی ویلے بنتی سانوں کٹھاں وچ لگ لگ کے اوہ دیاں گلاں سناؤندی سی۔ ہن ایسں اٹھویں وچ پڑھدیاں کڑیاں اڈھی چھٹی ویلے ستویں دیاں کڑیاں نوں لاگے نہیں ساں لگن دیندیاں۔

جس دن بنتی سانوں اوہدی گل نہ سناؤندی سانوں انج چاہد جویں اِنج سکول وِچ ادھی چھٹی ہوئی  
ای نہیں سی۔

”میری تے ایویں ہس دنداں دی پریت ہے۔ ہور میں کیہ لینا اے اوہدے کولوں تے اوہنے کیہ  
لینا اے میرے کولوں“ غیر کدی کسی بنتی سانوں انج آکھ کے نالن لگ پئی سی۔

بنتی لکھ نالدی پر اہدے مونہ اتوں سانوں لکھن لگ پیاسی کہ ہس دنداں دی پریت ہن بنتی دے گل  
دچوں لکھ کے اوہدے دل وِچ لہن لگ پئی سی۔ تاہیوں تاں ہن اوہدی جیہہ خشک ہوندی جاندی سی تے اوہ  
بہتیاں گلاں نہیں سی کرسکدی۔

تے اک دن جھلی نے جویں اپنے جتھ وِچ پنسل پھڑی آپنی حساب دی کتاب اُتے کوئی ویہ تھاویں  
اوہدا ناں لکھ چھڈیا۔ راجو..... راجو..... ساڈی استانی نے اوہدی کتاب ویکھ لئی۔ جماعت وِچ تے  
اوہنوں کچھ نہ آکھیا۔ پر جدوں ادی چھٹی ہوئی اوہنوں اگلی نوں اپنے کمرے وِچ بلایا تے کمرے دا لٹا ہا بھیڑ لیا۔  
شامت بنتی دی آئی ہوئی سی پر اسیں جہڑیاں بنتی دیاں سہیلیاں ساں مونہ ساڈے ساریاں دے لٹھے ہوئے  
سن۔ کئے چر پچھوں بنتی جدوں باہر آئی۔ رورہ کے اوہدیاں اکھاں لال ہو گئیاں سن۔ کتاب اُتے جنی تھاویں  
بنتی نے راجو دا ناں لکھیا ہو یا سی ساڈی استانی نے ربڑے کے سکھنیں تھاکیں اوہ تاں منادتا سی۔

انھویں جماعت جدوں اک بیڑی وانگر سالانہ امتحان دے کنڈھے اُتے لگ گئی اسیں ساریاں  
کڑیاں بیڑی دے پور وانگوں نکھر گئیاں۔ ایہ ساڈا سکول انھویں تک ای سی۔ اسیں بہت ساریاں کڑیاں ناویں  
وِچ داخل ہو گئیاں پر وکھو وکھ سکولاں وِچ تے بنتی سلائی والے سکول چلی گئی۔

فیر کوئی دو ورھیاں پچھوں مینوں بنتی دے دیاہ دا کارڈ آیا۔ ہور ناں کڑیاں نوں وی گیا ہووے گا۔  
میں چھیتی نال کارڈ اتوں منڈے دا ناں پڑھیا لکھیا ہو یا سی ”کرم چند“۔

راجو دی تھاویں بھاویں کارڈ اُتے کرم چند لکھیا ہو یا سی تاں وی ایہ دیاہ دا کارڈ سی تے ہر اک دیاہ  
توں ودھائی لین راجن ہندا ہے۔ میں بنتی دے دیاہ اتے گئی اوہنوں ودھائی دین۔

بنتی دیاں تلیاں اتے مہندی بنتی دیاں باہواں وِچ کلیرے، تے میں بنتی نوں ودھائی دتی۔

”میں بنتی نال اوہدی“ ہس دنداں دی پریت ”بارے کوئی گل نہیں ساں کرن چاہندی، پر گھڑی کو  
پچھوں اوہ آپ ہی مینوں اکھوانجے لے گئی۔

”اک چیز سانہ جھڑیں گی؟“

”کیہ.....؟“

”اک رومال اے۔“

ایہ مینوں پچھن دی لوڑ نہیں سی کہ رومال کس دا اے۔ رومال راجو دا ای ہو سکدا سی۔

”پرایہدے وچ ایڈی کھڑی گل اے۔ رومال توں کدھرے اپنیاں چیزاں وچ ای رکھ لے۔“

”پرایہدہ کئی اتے اوہداناں لکھیا ہو یا اے۔“

”تے کسے نوں کیہ پتا ایہ کہہ داناں اے۔“

”نراراج لکھیا ہوندا۔ کوئی ویکھدا پچھدا تے میں کہہ جھڑ دی میری سہیلی داناں اے۔ پر میں راجو

لکھیا ہو یا اے، راجو تاں کڑیاں داناں نہیں ہوندا۔“

”کاہدے نال لکھیا ہو یا اے؟“

”اوہنے اک پنسل نال الیک دتا سی تے میں سوئی لے کے دھاگے نال کڈھ لیا سی۔“

”تے پرے ادھیڑ جھڑ دھاگا۔“

”ادھیڑ جھڑاں؟ ایہ تے مینوں خیال ای نہیں آیا۔“ تے فیر بنی نے اک لہساہ بھریا۔ اگوں آکھن

لگی۔

”تینوں یاد اے، اک دن ساڈی استادنی نے رہو لے کے میری کتاب اتوں اوہداناں مٹا جھڑیا

سی؟ اچ میں دی اوس طرحاں اوہداناں ادھیڑ جھڑتی آں۔“

میرامن بھر گیا۔ بنی نے میرے سامنے اک ٹنک وچوں سوہا ریشمی رومال کڈھیا تے فیر سوئی لے

کے اوہدی کئی اتوں راجو داناں ادھیڑن لگ پئی۔ اک اوہو جی سوئی، جہو جی سوئی نال اوہنے دھاگا لے کے

اوہداناں کڈھیا سی۔ بنی دی کتاب اتوں اوہدی استادنی نے راجو داناں مٹا جھڑیا سی۔ ویاہ دے کارڈ اتے

سماج نے راجو داناں نہ لکھن دتا تے بنی دے مہندی والے لے مٹھاں نے اوہدے رومال اتوں اوہداناں ادھیڑ دتا۔

”چل جھڑ ایہناں گلاں نوں، توں آپے تے کہندی ہوندی سیں ایویں ہس دنداں دی پریت

اے.....“

”سوچیا تے ایہو ای سی۔ پرایہ ہس دنداں دی پریت میرے ہڈاں وچ رچ گئی۔ ہڈیاں تک لہہ

گئی۔ "بنتی دیاں اکھاں بھرتیاں۔"

"سنیا اے تیرے سوہرے بڑے امیر نہیں۔ بڑی کرماں والی ایں۔ اوہاناں وی کرم چند....."

کئے چر پنکھوں میں گل نوں راجو دے راہوں موڑیا۔

"کہہ دے ناواں تال دی کرم بنے نہیں؟" بنتی نے صرف ایٹا آکھیا:

"کہہ دے چٹھی لکھیں کریں گی؟ کہ شہنی بن کے سانوں ساریاں نوں بھل جاویں گی؟"

"کہہ دے بھلنا اپنے وں ہوندا اے؟" بنتی نے اک لمساہ بھریا۔ ایس ویلے دی شاید اوہ دے من

وچ سہیلیاں دا خیال نہیں سی صرف راجو دا خیال سی۔

"راجو نوں بھاویں توں بھلیں تے بھاویں نہ بھلیں پرتوں اوہوں خطاں لکھ نہیں سکنا۔ بھیرے

سانوں ای کدی کدائیں لکھ چھڑیں کریں، بھاویں خط وچ راجو دیاں گلاں ای لکھیں۔"

"اچھا کہہ دے کدائیں من دی ہواڑ کندھ لیا کراں گی۔ پراک گل اے....."

"کیہ....."

"توں مینوں خط وچ کہہ دے اوہی گل نہ لکھیں۔ اوہ لوک پتا نہیں کہو جے نہیں۔ گھور پنڈ وچ

رہندے نہیں۔ سنیا اے چٹھی وی اتھے بننے وچ مساں دوواری جاندی اے۔ مار پتے اتے ضلع تحصیل،

ڈاکھانا، پنڈ تے ہور خورے کیہ کجھ لکھنا پیندا ہے۔ خورے اوہ لوک میری چٹھی وی مینوں پڑھ کے دیا کرن

"....."

بنتی سوہرے چلی گئی۔ ایس گل نوں اج چندرھاں ورھے ہو گئے نہیں۔ پہلے چار پنچ درھیاں وچ بنتی

نے مینوں کجھ خط لکھے۔ بپتے نہیں پر جنے وی لکھے اوہناں وچوں اوہ دے من دی ہواڑ آؤندی سی۔ میں بنتی

نوں ہمیشہ جواب دیندی رہی۔ پراوہ دے آکھے مطابق صرف رسمی جواب۔ اوہ دے خط دی پہنچ کہہ دے اوہ دے

من دی ہواڑ داموڑواں جواب نہیں سی ہوندا۔

فیر دس ورھے بنتی نوں پتا نہیں کیہ ہویا۔ اوہنے مینوں کوئی خط نہ لکھیا۔ میں وی جانیا بن اوہ اپنے میر

نہر وچ رجھ گئی ہووے گی۔ میں وی کہہ دے اوہوں خط نہ لکھیا۔

پراج بنتی دا اچانک خط آیا ہے۔ پتا نہیں ایہ کہو جیا خط ہے! ایہدے وچ نری اوہ دے من دی ہواڑ

نہیں ایہدے وچ جو میں ہر سوالی دے من دی ہواڑ ہے۔

میرا من بھریا ہوا ہے۔ اوہنے مینوں چچ دا جواب دین توں وی منع کتیا ہویا ہے۔ نہیں تاں میں اچ  
اوہنوں اک بڑا لٹا لٹھدی۔ میرا من ہولا ہو جاندا۔

اچ میں اوہیاں ساریاں پرانیاں چھیاں کڈھیاں ہن۔ (شاید چوں دو تن نہیں لہیاں) تے  
اچ وی چھٹی وی ساہنے رکھی ہوئی ہے۔ مزے کے ساریاں چھیاں نوں پڑھدی پئی ہاں۔ اک عورت دے من  
دی ہوا..... ہر عورت دے من دی ہوا.....!

”گھور پنڈاے جہڑا اچ دا آہر، اوہیوکل دا آہر۔ ایہ وی پتا نہیں لگدا کہ اچ کیہ وار ہے۔ صرف  
جہڑوں پنڈوچ ڈاکیا آندا اے تاں پتا لگدا اے کہ یاں اچ منگواراے یاں سنچر وار۔ اتھے سارے ہفتے وچ  
دو وار ڈاکیا آندا اے۔ جویں شہر وچ تیل تانبا منگن واسے ہفتے وچ دو وار آوندے نیں۔

جہڑوں ڈاکیا آندا اے۔ مینوں اچ جا پدا اے جویں اوہ آکھ رہیا ہووے۔ ”منگل وار، نئے بھار،  
تیل تانے دادان۔“ یاں چھوٹا بھار وار، نئے بھار تیل تانے دادان۔“ پر اوہ لوک خورے کہوچے ہوندے نیں  
جہناں دے بھار ملدے نیں۔ اوہ لوک خورے کہوچیا تیل تانبا دان کروے نیں جہناں توں متراں پیاریاں  
دیاں چھیاں آوندیاں نیں۔ میں کہدی چھٹی واسطے ڈاکیے داراہ دیکھاں؟

اچھا توں ہی مینوں دوحرف لکھ جھڑیں۔ کوئی گل نہ لکھیں چھٹی وچ بس ایٹا ای کہ تینوں میری چھٹی  
مل گئی۔ میں اپنی گل واسطے ای ڈاکیے داراہ دیکھاں گی۔

..... تیری بنتی

.....!

توں چچ وچ میرا سوہرا دکھایا سی؟ سے والی داڑھی والا۔ بے توں میری کس دیکھیں وچ حیران  
ہو جاویں۔ کس تاں کیہ اے اوہ کسے وی نو نہ وی نہیں لگدی۔ اصلوں کواری کڑی لگدی اے۔ عمروں اوہ  
میرے تالوں تن چارورھے وڈی ہووے گی پر پندے وی بڑی ماڑی جیہی ہے پتلی چھک اے اوہ میری کس نہ  
ہوندی بھاویں اوہ متر کی کس اے۔ پر بے تاں کس ای ناں! دھرم نال میں انہوں اپنی سہیلی بنالیدی!

اچ منگل واری۔ ڈاکیے نے آونامی۔ مینوں خیال آیا خورے تیری چھٹی آوے۔ میں بوہے وچ  
کھلو کے ڈاکیے نوں اڈکین لگ پئی۔ میری کس وی میرے کول آکھلوتی۔

ڈاکیا آیا۔ اوہنے مینوں اک چھٹی پھڑائی۔ میں اپنی کس وے مونہ ول دیکھیا۔ اوہدا مونہ بڑا ای

اداس سی۔ انج جا پدا سی جویں اج اوہنوں ضرور کسے دی چٹھی آونی سی تے آئی سی۔ "کوئی خط آونا سی تیرا بھابھی؟" میں اوہنوں ایڈی اداس دیکھ کے پچھیا۔

"میںوں کہدا خط آونا اے؟" پہلوں تاں اوس نے ایہ آکھیا تے فیر آکھن لگی۔

"آونا تے ہے سی اک خط پرا یا نہیں۔"

"کہدا خط بھابھی؟" میں فیر اوہنوں پچھیا۔

"رب دا خط ہووے میںوں کہدا خط آونا اے؟" جا پدا سی اوہ بٹنے رو پوے گی۔ پر اوہ روئی نہیں۔ یاں

خورے کہو جیہا رون روئی اے جہڑا کسے نوں نظریں نہیں آیا۔ ویکھیا ای اسیں عورتاں کہو جیہا رون روسکد یاں۔

ہاں! کدے کدے میرا جی کر دالے میں وی اچی اچی رو۔ کان او وی اچی اچی رو سکے۔

..... تیری بنتی

!.....

جج میں جدوں دی استھے آئی ساں! میںوں ایہ گھر کدے اپنا نہیں سی لگا۔ زری پر دنی لگدی ساں

ایس گھر وچ۔ پر مین ایس گھر نے میںوں بندھ لیا اے۔ اک نکاجیا "راجو" آ گیا اے۔ میںوں ننھن والا۔ گھر

دے سارے لوک اوہنوں دیکھ کر کے بلاندے میں پر میں اوہنوں راجو بلانی آں۔

ترکاناں ویلے چٹکی ٹھنڈا تر آوندی اے۔ میں اک لال ریشمی رمال اوہدے سر اُتے بندھ دینی

آں۔ لال رمال وچ اوہ ہووے سوہنا لگدا اے تے میں اوہنوں جھولی وچ لے کے کنا کنا چہ اوہدا موہ

دیکھدی دینی آں۔

تیری بنتی

!.....

میرا راجو بیتاں ورھیاں دا ہو گیا اے۔ تینوں اپنے من دی اک گل دساں؟ کدے کدے میں

جدوں راجو دے موہ ول ویکھنی آں۔ دیکھدیاں دیکھدیاں اوہدا موہ وڈا ہو جاندا اے۔ اوہدا قد وی وڈا ہو

جاندا اے۔ جویں میرا راجو بچھیاں ورھیاں دا ہو گیا ہووے! تے میں؟ میں اسے ویہاں ورھیاں دی ہوواں!

دیکھیا ای میں کڈی شہین ہاں!

بڑا شرارتی اے میرا راجو۔ مین اسے میرے کول کھیڈ دا پیا سی۔ بٹے کدھرے چوٹے وچ جا بچیا۔



گرم چلے، وچ پانی دا گلاس لہو دتا۔ میرا چلھا پاٹ گیا اے۔ وچاری کس میری نوں ویہاری لا کے بنانا  
پا۔ ۶۔

سچ تینوں اک گل دساں! میری کس چلھا کیہ بناؤندی اے جو یں کوئی بُت گھڑدی اے۔ توں  
کدے۔ ایہو جیہا بانکا چلھا نہیں دیکھیا ہونا۔ اوہنوں آہروی بڑی چھیتی آجاندا اے۔ چلھا ڈھا کے مڑ کے  
بناؤندی اے۔ اوس دن میں باہر لے چلے اتے روئی پکانی آں۔ انج دس لگدے اوہ روئی یاں سارا کم آپے  
کردی اے۔ پر جہوں پندرہیں ویہ نہیں اوہ چونکے دا چلھا ڈھا کے نواں بناؤندی اے اوس دن اوہ روئی  
دے مُتوں ہتھ نہیں لاندی۔ چلھا بناؤن داتے اوہنوں کوئی جھل اے۔ آئے دن مٹی تے توڑی گولیندی اے۔  
فیر اوہ چونکے دا باندروں مار لیندی اے۔ نال مٹی تھپدی تے نال گاؤندی اے۔

انج میں کدے اوہنوں گاؤندیاں نہیں سنیا۔ گاؤندیاں کیہ کدے رچ دے بولدیاں وی نہیں سنیا پر  
چلھا بناؤن ویلے اوہ انج گاؤندی اے جو یں کوئی چرھا کتے تے ملے گون چھوہ ہوئے۔ رب دیاں رب جانے  
اوبدے۔ من وچ کیہ لڑ دیاں نہیں؟ مایاں نے وی تاں اوبدی جوانی نال دھرو کمایا اے۔ ہیرے درگی ٹوڑی  
نوں چھابے وچ دھر کے چاندی دے روپے تول لئے۔

اچھا دوحرف چھتی لکھ چھڈیں۔

تیری..... بنتی

.....

توں تون چچھ بیچے میں جہوے میری کس گاؤندی اے؟ پورا گون اوہنے کدے نہیں گایا۔ کوئی اک  
نپا کاؤندی اے تے فیر گھٹنا بھر اوہیوای نپا گاؤندی رہندی اے۔

انج وی اوہنے پرانے چلھے نوں ڈھا کے نواں بنان دا آہر کھینا ہویا اے۔ چونکے وی اوہنے اندروں  
کنڈی لائی ہوئی اے۔ اوبدی آواز آؤندی پئی اے۔

چڑھ چڑھ چند اندھ چڑھ دے دی لالی

یربادی اک اسان ویرھے وچ بالی

تے میں تینوں چنھی لکھن لگ پئی آں۔ میں باہر پیار وچ بیٹھی ہوئی آں۔ بن بنے اوہنے کوئی ہور  
نپا گایا، میں تینوں لکھاں گی۔ دن ل چلایا اے۔ اوہیو نپا اوہ گاؤندی رہندی اے۔ انج اوبدی آواز وی بھر بھر

آؤندی سی تے فیر کنا چر اوہدی آواز نہ آئی۔ من فیر آواز آئی اے:

جے ٹر چلیوں چا کری وے سانوں بو جھے پا

جیتے تاں آوے راتڑی سانوں کڈھ کھجڑے!

ہاں سچ مینوں اوہدا اک گیت چیتا آیا اے۔ ایہ اوہنے اج تاں نہیں گایا پراگے اوہ گاؤندی رہندی

اے۔

نہ تاں بھیا سٹھ واسلیہا

نہ تاں بھجی اے چیری

کہدے تہہ بھجیاں میں سٹھ واسلیہا

کہدے تہہ بھجیاں میں چیری

لکھنے جوگا کاغذ نہیوں

قلمے جوگ نہ کاہی

دل دا کٹرا میں کاغذ بناواں

انگلیاں کٹ کاہی

اکھیاں دا کھلا میں شاہی بناواں

تے بھجواں دا پانی آں پانی

ڈھل پر چھاویں چٹھی دا چین بھئی

روندی چند نہانی

چو کئے دا بواہا جے بند اے۔ پر بند بوہے وچوں وی جو میں میرا من لکھ کے اوہدے من وچ دل گیا

اے ایہناں گیتاں وچوں بھلا کہو اگیت اے جہڑا اوہدے من دا گیت نہیں تے جہڑا میرے من دا گیت نہیں۔

تیری اوہیو..... جنتی

اک گل میں تینوں لکھنی بھل گئی آں۔ میری سس لوں کئے دناں توں روز ماڑا جیا بخار ہو جاندا

اے۔ لکھ ترے کڈھو پر اوہ گھڑی آرام نہیں کردی۔

”بھابھی انج تاں ڈاکیا سچ سچ اک دن رب دی چٹھی لے آوے گا۔ توں آپ ای اپنے ہڈاں دے

دیر پہ گئی اس۔ "اک دن میں اوہوں آکھیا سی تے اگوں پتا اے کیہ کہن لگی: "تیرا مونہ مٹھا کراں" جے اک دن چچی چچی کوئی ڈاکیا اوہدی چٹھی لے آوے۔" سچ اوہدا مونہ دیکھ کے تاں میرے من دا دکھ دی نما تاپے جاندا اے۔

.....!

ورہے لنگھ گئے بن۔ میں جان بچھ کے ای تینوں کدے چٹھی نہیں سی لکھی۔ انج تیرے نویں شہر دا پتا لکھ لیا سی۔ پتا ای جدوں کدے میں چٹھی لکھن دی گل سوچدی ساں۔ مینوں ایہ پتا ہوندا سی کہ جے میں تینوں چٹھی لکھی خورے کہڑیاں کہڑیاں یاداں میرے دوا لے گھرا پالین گیاں۔ فیر میں کئی کئی دن سرت نہیں سنبھال سکدی۔ میرے ہتھوں چیزاں ڈگ ڈگ چین گیاں تے میرے ہتھوں بڑیاں سڑ سڑ جان گیاں۔ مَن سارا گھر مینوں ای سنبھالنا پیندا اے۔

اپنے ورہے میری سس رسی وانگ ولیندی رہی اے۔ منجی اتے پئی ہوئی نہیں سی لکھدی تے نری بکی پوئی۔

تینوں خورے یاد اے کہ نہیں۔ اک واری میں تینوں لکھیا سی کہ میری سس مٹی دا چلھا کیہ بناؤندی اے کوئی بہت گھردی اے تے آئے دن پرانا چلھا ڈھا کے نو اں چلھا بنان دا اوہوں کوئی جھل اے۔ ایس بیماری وچ وی اوہدا جھل نہیں سی گیا۔ میں وی اوہوں پتا موڑ دی نہیں ساں۔ جس دن اوہ منجی تے توڑی گوندی سی۔ اوں دن اوہدے وچ خورے ہتھوں جان آجاندی سی! جویں کوئی گھر وچ کاج رچاندا اے۔

انج کوئی پندرہاں دناں دی گل اے۔ اوہوں لہودی اُلنی آئی۔ نہ مَن سانوں اوہدے جیون دا دھوکھا سی تے نہ اوہوں آپ نوں۔ دیہاڑی جدوں میرا دیور حکیم نوں بلان گیا (میرے سوہرے نوں گزریاں کئی ورہے ہو گئے نہیں) تاں میری سس نے مینوں اپنے کول بلایا:

"جے توں میرا آکھانیں بیٹھے!"

"دس بھابھی! توں جو کجھ آکھیں" میرا من بڑا ای ڈھلدا اپیا سی۔ میں اوہدی منجی نال سرلا کے رون لگ پئی۔

"جھلی نہ ہووے تاں۔ روئی کاہنوں اس؟ میں تاں منٹ منٹ کر کے پئی اڈیکنی آں....."

کدوں ایہ میری چند دا بیجر نئے گاتے میری روح آزاد ہو جاوے گی۔"

”دس بھابھی توں کیہ آکھنی ایں؟“

”جے توں مینوں مٹی گودیوں!“

”جھلی ہوگئی ایں بھابھی! ساہ تیرے مکدے پئے نیں۔“

”مینوں پتا اے تاہوں تاں میں آکھنی آں آخری وار بس اک وار۔ فیر اتوں اوہ سڑیا حکیم

آ جاوے گا۔“

”بھابھی! توں دنیا دے سارے موہ توڑ چھڈے۔ دنیا نال تاں موہ توں کدے پایا ای نہ تینوں

پیسے نال پیار نہ تینوں جند دی پرواہ۔ فیر تینوں ایس چلھے نال کیہ اے؟“

”چلھے ہنٹیاں میں کچھ دیا ہوا اے۔“ مردی مردی میری سس ہس پئی تے فیر کہن لگی۔ ”توں ایہ

نہ امید لائیں کہ میں کوئی مہراں دی بانڈی دبی ہوئی اے۔“

”بھابھی! تیرا دل میٹھوں گجھا نہیں۔ جہوے گھر وچ تیرا من مر گیا! اوس گھر توں مہراں کاہدے اپنی

دبیاں سن تے مینوں وی سڑیاں مہراں دی جھاک نہیں۔“

”ایہ مینوں پتا اے بیجے! تائیں تاں میں تیرے نال.....!“

”جو من وچ آؤ نہ! اے تنگ کدے دے بھابھی! میں تیری نو نہ وی آں تیری دھی وی آ تیری سہیلی

وی آ۔“

بھابھی اکھاں نال روئی تے بلھاں نال ہسی فیر آکھن لگی۔

”کدی کدی بیجے میں تینوں آکھدی ہوندی ساں تاں کہ آؤ تہانوں دانے بٹھن دیاں میں بڑی

بھٹھیری آں۔“

”آہو بھابھی مینوں یاد اے پر ایہ تاں مینوں پتا اے کہ توں ایویں ہسدی ہوندی سی۔ توں بھلا

بھٹھیری کتھوں آئی۔“

”نہیں بیجے! میں سچی مچی بھٹھیارے دی نشانی۔ تے نالے اک چھاپ اوہ وی اوہی نشانی۔“

تے فیر بھابھی نے اپنے مکدے ساہواں نال مینوں سنایا کہ اوہنوں اپنے پنڈ دے اک منڈے

نال پیاری۔ موتی ناں سی اوہدا مایاں نوں من داموتی پسند نہ آیا۔ اوہناں نے دھی نوں کوڑیاں دے بھاء وچ

چھڈیا..... دیا ہی نوں ابے کچھ مہینے ای ہوئے سن اورے ہوئے موتی نے بھٹھیارا بن کے ایہدے

سوہرے پنڈ بھٹشی لادتی۔

ایہ سس میری (روپوناں سی اوہدا) دانے بھنان گئی تے موتی نوں بھٹھیا رانیا ویکھ کے جوں اوہدی بھٹشی وچ آپ بھجن لگ پئی۔

موتی دے ایس اپرا لے نے بھلا موتی دا کیہ سوارناسی۔ تے نالے روپو دا کیہ سوارناسی۔ اک دن روپو اوہدے پیراں آتے ڈگ کے روئی۔

”تینوں میری سوند لگے جے توں اپنا آپ انج رو لیس۔ بُن بھجے ہوئے پیاں نے نہیں اُگنا۔“ تے روپو نے اوہدی بھٹشی توڑ چھڈی۔ لڑائی اوہدے کولوں چکن نہ ہوئی۔ اوہ دانے چھانن والی چھاننی چُک لیا ئی تے اوہنوں حکم دے آئی کہ اوہ اپنے پنڈ مزد جاوے۔

موتی کولوں نہ اوہدی سوند سورن ہوئی تے نہ اوہدا حکم۔ اپنی چھاپ اک نشانی اوہنے روپونوں وچ تے دوسرے دن خورے کھسے فر گیا۔

موتی بھٹھیا را کیہ بنیا روپونوں ساری عمر واسطے بھٹھیا ری بنا گیا۔ اوہنے اوہدی چھاننی تے اوہدی چھاپ اوہیں چیزاں اپنے کول رکھ لیاں۔ پر چھاپ اُتے موتی داناں ہو یا سی کتھے چھپاندی؟ چاکھا توڑ کے اوہیں چیزاں اوہنے مٹی وچ دب دتیاں تے فیر اُتے نواں چلھا با دتا۔

سارا سارا دن اوہ چلھے کول یہ کے روٹیاں کیہ پکاؤندی جوں من دیاں دلیلاں ویلدی رہندی۔ کدے کدے اوہدا دل بہتای اوہدا جاندا۔ اوہ چلھا توڑ چھڈ دی۔ اوہدیاں نشانیاں نوں گل نال لاندی، روندی تے کھوندی۔۔۔۔۔ فیر اوہے طرح دوویں نشانیاں دھرتی دے حوالے کروندی۔ اُتے نواں چلھا اوہناں دی راکھی بٹھا ویندی۔

ایہ بھانجی دی کہانی کیہ مٹکی اوہدے ساو مٹک گئے۔ اوہنوں لہودی اک ہور اُٹنی آئی تے اوہدی جان دا پنجر اٹ گیا۔

جناجر بھانجی جان دے پنجرے وچ قیدی اوہنے موتی دی مندری اپنی انگل وچ نہیں سی پائی۔ فیر بھانجی دی روح آزاد ہو گئی۔ میں چلھے نوں پُٹیا تے مندری کدھ کے موتی ہوئی دیاں ٹھگیاں وچ پاوتی۔

میں ایں اوہنوں بھوایا سی۔ میں امی اوہدے اُتے کفن پاناسی۔ ایس لنی مینوں ڈرنیسی کہ کوئی اوہدے جتھ وچ پئی ہوئی مندری اتوں اوہدے موتی داناں پڑھ لوے گا تے جدوں تک لوکاں نے اوہدے

مٹھل چلنے سن۔ او دوں تک او بدی مند ری اتوں او بدے موتی داناں مٹ جانا سی۔

چھانی اے میں او سے طرحاں چلھے پٹھاں رہن دتی اے۔ اگلے مہینے میری ماں نے ہر دو ار جانا  
اے۔ تے میں اپنے گھر والے نوں منالیا کہ میں دی چار دن ماں نال ہو آواں گی۔ تالے بھابھی دے مٹھل  
پروا آواں گی تے فیرا گوں توں سمجھ ای گئی ہو ویں گی۔ چھانی میں کسے طرحاں نر تک وچ پا کے لے جاواں گی  
تے او بدے مٹھل چھانی وچ پا کے پروا آواں گی۔

میرے سہیلیے میرے انگ سہیلیے! اچ تینوں لکھاں تاں ہو کس نوں لکھاں؟ میں اپنیاں یاداں  
نوں وی اچ پھرول پھرول کے دیکھیا اے۔ اک سو بار مال اوہناں دے پٹھاں سامھیا ہو یا۔ بھابھی کوئی  
بنتی ہو دے تے بھابھی کوئی روپو تے بھابھی کون! کس نے اپنے من دیاں تہیاں وچ کوئی رومال یاں کوئی  
چھاپ نہیں دبی ہندی۔

اسیں نکر مٹھاں بھو یاں کسے نوں محبت کر دیاں آں جنم توں ای بھٹھیا ریاں ہو جاندیاں آں۔ دل  
دی بھٹھیا اتے اپنے ساہواں نوں داناں وانگ بھندیاں آں تے یاواں دی چھانی وچوں ورھیاں دی ریت  
چھاندیاں ہاں.....

تیری بنتی..... اک بھٹھیا ری

(پہلی انتر - قمر الزمان)

☆☆☆☆

## آنہ دلور

اوبہاناں کسے نہیں سی دھریا۔ جی، تاں اوبہی دادی اونوں جھولی وچ پا کے لڈیاندی سی۔ ایہہ تاں ویراں والی آئی اسے، اک ویر پہلو بھیج دتا، ہنس اک اپنے نال لیاوے گی..... پر ایہہ ناں، ویراں والی کسے دے مونہ نہیں سی چڑھیا.....

اوہ لچھ پلھر گئی تاں کسے دے مونہ نکلیاں سی۔ ”بائے گڈی سوتی نکلی اسے، پتلی چھمک ورگی۔“ تے باسے باسے وچ اوبہاناں چھمک پے گیا سی، جو ساریاں دے مونہ چڑھ گیا.....

پنڈ وچ تڑیاں دا اک سکول سی۔ پرائمری تک، پر جدوں چھمک دا ویلا آیا، اوہ سکول دسویں تک ہو گیا سی۔ سکول دی پڑھائی تاں دسویں تک ہو گئی سی، پر اہم امتحان نال لگدے شہر وچ جا کے دینا ہوندا سی۔ پر ایہہ گل، وی چھمک لئی اوکھی نہیں سی بنی، اوہوں تک چھمک دی ماسی اراں دا گھر شہر وچ بن گیا سی، جیسے اوہناں لوکاں دا کاروباری، اناج منڈی وچ۔

امتحان وچ دس ویسہ دن رہندے سن، جدوں چھمک دی ماسی آپ پنڈ آ کے چھمک نوں لے گئی سی۔ اوبہا کہنا سی کہ شہر دے کسے سکول دے ماسٹرنوں دس دن لا کے چھمک دیاں کتاباں پکیاں کروا دیوے گی.....

ایہہ مارچ دے دس دن سن۔ امتحان سراسن تے سن ایس لئی تھیر آکھن پچھان تے وی اوہ ماسٹر نہیں سی بچھا ہیدا۔ کول دس چندرھاں دن ویلے دین ایس لئی ماسی دے پتر بیر نے ای بندوبست کیتا، اپنے کالج دے دتاں والے دوست، بیٹوں آکھیا کہ اوبہی بھین واسطے اوبہا چندرھاں ویسہ دن ویلا کڈھے.....

بیر نے کالج وچے چھڈ دتا سی، اوبہے چاچے دی موت نے بیر دے چوٹوں بہت اکھیاں کر دتا سی کہ اوہناں اپنے کم کار لئی بیر دی لوز دی سی۔ پر رلی نے کالج دی پورا کر لیا سی تے آگوں دی نالے نوکری کردا

سی۔ نالے اگلی پڑھاکی، بیر نال اوہدا بہن انھن بنیا ہو یا سی۔ ایس لئی بیر نے اوہدے کو لوں روز دے دو گھنٹے  
منگ لیے چھمک واسطے۔

رہی آیا، کمرے وچ پیر وھردیاں ای، اوہدیاں اکھاں جویں باہر دل دیکھن دی تھاں اندر ول اتر  
آئیاں۔ اوہدے اندر اک جھولا جیہا سی تے اوہنوں جا پیا ایس ویلے جھولا باہر اوہدے ساہنے کھلوتا ہویا  
سی.....

چھمک دے گل وچ پائی ہوئی قمیض، اک واری تاں رہی دیاں اکھاں اگے اک رکھ دا نگ دس لگ پئی  
تے اوہدے کناں دیاں تکی تار دیاں والیاں، جویں رکھ دے پتیاں دا نگ جھول دیاں ہوں.....  
بیر آکھ رہیا سی ”رہی“ ایہہ میری بھین اے چھمک..... چھمک نے دوویں ہتھ جوڑ کے نمستے جیسی کہتی سی،  
پر رہی چپ جیہا کرسی تے بہ گیا تے اوہنوں گھڑی لگی اپنے آپ وچ سنھلن لئی.....  
گنت دی کنتی منتی وچوں لکھدیاں پتا نہیں کہڑے ویلے دو گھنٹے لنگھ گئے اوہوں لگا جدوں ماسی نے  
کمرے وچ آ کے چاہ دی رکھی تے کجھ مٹھی مٹھیاں کھان واسطے.....

کھا دا ان کھا دا جیہا کر کے رہی اوہنوں اپنے گھر آ گیا تاں جان دیاں ای الماری وچ اپنے کاغذ پھر ولن  
لگا، بڑی کالھی نال.....

کجھ کاغذ ہتھ آئے تے اوہ غور نال اوہناں نوں دیکھن لگا۔ رہی نوں آرٹ دا کجھ پتا نہیں سی، پر اک  
سفٹاسی، جو کئی وار آوندی سی تے رہی اوہنوں دیکھدیاں ای تر یہہ جاندا ہوندا سی۔ اک واری اوہنے اپنے سفٹے  
نوں لکیراں وچ اتاریا تے پھیر کئی واری اتاریا، پر ہر واری اوہنوں جا پدا سی کہ اوہہ چنگلی طرح کاغذاں تے  
نہیں اتر دا.....

اک سفٹاسی جو پتا نہیں مڑ مڑ کے کیوں آونداسی، دسداسی کہ دور اک انہاں وار کھاے، اوہ کجھ تیزے  
جاندا سی تاں اوہتے رُکھ کوئی نہیں سی ہوندا، اوہدی تھاں اک کڑی کھلوتی ہوئی دسدی سی..... اوہ ہور تیزے  
جاندا سی تاں اوہتے کڑی کوئی نہیں سی ہوندی، پر اوہتے اوہ رُکھ ضرور ہوندا سی جو دوروں دی دسیا ہوندا سی.....  
رہی ہمیشہ، جدوں وی سفٹا آوندا، کجھ گھاہر کے جاگدا سی تے ایسے سفٹے نوں اوہ کئی وار کاغذ تے اتارن  
لئی بنداسی، پر ول طرح کجھ بند نہیں سی..... اوہ کڑی کدے دوروں دی اوہدے ول دیکھ رہی ہوندی،  
کدے اوہ پنچہ دلوں دسدی، جہدی رُکھ دی ٹاہن نوں ہتھ پیا ہوندا تے کدے رُکھ دی نہیں سی ہوندا، صرف اوہ



ہوندی سی۔

ایہہ چھمک نوں پڑھان والے پندرہاں ویہ دن ربی واسطے قیامت جے ہو گئے.....  
ویدا لٹکھنای، لٹکھ گیا، ربی نے نہ کجھ چھمک نوں دسیا، نہ اپنے دوست بیرنوں۔ چپ دا چپ رہ گیا  
کی.....

امتحان ہو گیا تے چھمک دے پرتن دا ویلا وی، صرف اوس دن ربی نے کہیا "چھمک توں اگے کالج وچ  
کیوں نہیں پڑھدی؟"

چھمک چپ رہی، پھیر کہن لگی "جی تے کردا اے، پرانج ہونا نہیں.....  
"کیوں؟" ربی نے انج پچھیا، جو اوس اوہدی آواز وچ کجھ لا چاری ہووے، ایہہ ٹکھن دی.....  
چھمک پہلوں چپ رہی، پھیر کہن لگی "پھیر میرے بھرا داویاہ کس طرح ہووے گا....."  
گل کجھ اٹ پئی سی، جس توں ربی نوں ہاساوی آیا تے عجیب جیہی اوکھتاوی.....

ماسی کمرے وچ چاہ پانی رکھدی پئی سی، اوہدے نال اوہدی دھی لالی وی سی اوہ بھادیوں چھمک دے  
ہان دی نہیں سی، چھوٹی سی، پر اوہنوں چھمک نال اسیہا پیار ہو گیا سی کہ اوہداوی جی کروا سی، چھمک اسیہے،  
اوہناں دے گھر رہ کے اگوں پڑھن لگ پوے۔ ایس لئی لالی چھیتی نال چھمک دے کول آ کے کہن لگی "ربی  
بھائی وی گل من لے دیدی! تینوں کالج بڑا چنگا لگے گا....."

چھمک چپ سی، کولوں دی ماسی کہن لگی "ربی پتر! گل ایہہ دے کہ چھمک دے بھرا داویاہ تاں ای  
ہووے گا جے دچھمک دا ہووے گا تاں۔ ساڈے پاسے ونے سنے دے ویہا ہوندے نیں جہو دے گھر دی کڑی  
لیاوندے ہاں، اوس گھرا پئی کڑی دینی پیندی اے....."

جتنے گل چلی ہوئی، اوہ مساں چھمک دے امتحاناں تک اڈیکن دی اے، ہن جانڈیاں ای، دودناں دی  
وتھ تے چھمک داویاہ وی ہون والا اے تے اوہدے وی.....

ربی دی اکھاں سامنے نہ رکھ رہیا، نہ کڑی، صرف اک انھیر جیہا دن لگ پیا.....  
ماسی نے اگے ہو کے چھمک دے اتھر پو پو پو، کہن لگی "روندی کیوں ایں؟ جے تیرا کجھ لگدا چنگا، ہو یا،  
تاں اوہنوں منا لوں اگوں پڑھن واسطے۔ داخلے تاں جولائی وچ ہوندے نیں، بس پھیرے لے کے آ  
جا کمیں....."



چھمک اٹھدی، جاگدی تاں اوہ اکوتی کردا، اوس رُکھ پیٹھاں جان لئی.....

کچھ دن پہ گئے تاں اکلی جیرا کرن لگ پئی، اوس رُکھ پیٹھاں جان دا.....

اوہنوں آپ پتہ نہیں سی لگدا کہ اوہنوں کہہ ہوندا جاندا سی.....

کدی اکھاں اگے ربی دا جھولا جیہا آندا پر اوہدے دل نظر بھر کے دیکھنا وی اوہدے دس نہیں سی تے  
جھو لے نون منع کرنا وی اوہدے دس نہیں سی۔

ہولی ہولی اگلیاں نوں جاپن لگا کہ چھمک بہت سوئی سی، خبرے ایس لئی شریکاں وچوں کسے نے کچھ کر  
دتا سی..... اوہ اٹھدی بہندی اپنی سرست وچ نہیں سی جا پدی۔

گھرو وی وڈی وڈیری نے کسے سیانے نوں وی پچھیا تے پچھ کے چار منگل دار دریا تے وی جاندی  
ربی، شوتانا ریل دریا وچ پان لئی، پر چھمک دی حالت اوہے طرح رہی.....

اک دن چھمک اکلی جا کے کسی دالے رُکھ پیٹھاں بیٹھی ہوئی سی کہ پنڈ دا اک بزرگ لامبی فیکدا کولوں  
لٹھکھیا۔ نیزے آیا، تاں بولیا ”دھیے! ایس رُکھ پیٹھاں نہ بہو! ایس رُکھ اتے کسے دی زوج رہندی اے۔“

چھمک کچھ دیر اوس بزرگ ول دیکھدی رہی، پھر اٹھ کے اوہدے پیر چھوہ کے چکھن لگی ”بابا! اتھے  
کہیدی زوج اے؟ مینوں وی ایہو جا پدا اے کہ کوئی مینوں اتھے زوری بلا دندا اے.....“

بزرگ نے کہا ”دھیے! اک گل کہندے مین، پتہ نہیں کدوں دی اے، تکی دیکھی تاں میں وی نہیں پر  
کئی سی کہ ایس پنڈ اک تری ہندی سی، راجی، جیہوں نال دے پنڈ دالے پورن نال دھراں دی لگ گئی سی۔  
راجی دے بھراواں نے پورن نوں کہا کہ وہ شہر جا کے کمائی کرے، پنڈ وچ پکا گھر پاوے تاں اوہ راجی  
اوہدے نال ویاہ دین گے.....“

چھمک راجیوں ساہو رکدا پیا سی.....

بزرگ نے کہا ”اوس ویلے ایہو رُکھ سی جتھے راجی آکھلوتی تے اوہنے پورن نون کہیا  
”اتھوں پنڈ، اوڈاراہ وسدا اے، جیہڑا شہر ول جاندا اے، اوہ ایسے رُکھ پیٹھاں بہہ کے اوہدراہ دیکھدی  
ریوے گی، جدوں تک اوہ مڑا نہیں..... پر اوس شہر دے نئے کتھوں مڑنا سی اوہنوں تاں راجی دے  
بھراواں نے شہر دے راہ پنے ہوئے نون مروادتا سی۔ راجی وی پاگل ہو گئی تے رُکھ وی..... ایسے  
لئی رُکھ نوں پھل نہیں پیندا مین..... راجی مرودی نے آکھیا سی جدوں پورن آجائے گا، رُکھ نون پھل پے

جائے گا.....“

بزرگ نے اپنیاں گلیاں اکھاں پونجھیاں تے کہیا ”ایس لئی دھپے توں ایس رکھ پٹھاں نہ آیا کر! ایہہ

سراپیا ہویا اے.....“

اوس ویلے چھمک نے شہرول جاندے راہ نوں دیکھیاں تے کہن لگی ”سراپیا ہویا نہیں! دراگیاں ہویا

اے.....“

بزرگ چھمک دے مونہہ دل دیکھن لگ پیا.....

گل شہر تک وی پہنچی، چھمک دی ماسی تک، کہ چھمک جدوں وی دیا ہی اے، ول نہیں۔ اوہ چھمک نوں دیکھن لئی جانا چاہندی سی پر گھر دچوں جان نہیں سی ہو رہیا۔ ایس لئی اوہدی دھی لالی کہن لگی ”ماں! مینوں جان دے میرا چھمک دیدی نوں ملن واسطے بڑا جیا کر دا اے.....“

ربی نوں پتہ لگا کہ لالی، چھمک کول جان والی اے، تاں اوہنے اک دن لالی دے سکول جا کے لالی نوں کہیا ”جے میں تینوں اک خط دیواں توں چھمک نوں دے دیویں گی، اگلی نوم جدوں کول کوئی نہ ہووے.....“

لالی ہن کچھ سیانی ہو گئی سی، زندگی دے بھیت اوہدے اگے وی کسے کسے اکھر وانگ اکھڑ دے پئے سن۔ کہن لگی ”ربی بھائی! تساں چھمک نوں پنڈ کیوں جان دتا سی اتھے اوہ کالج وچ پڑھدی تاں.....“

ربی اچے وی کچھ دلیلاں وچ سی کہ اوہ چھمک نوں اپنے سفنے دی گلدے کہ نہ تے ایسے بے چینی وچ اوہنے صرف چار سطران لکھیاں سن، چھمک ول، لالی کول آوی گیا سی پر اچے وی دلیلاں وچ سی کہ بن ایہہ گل چھمک نوں دساں کہ نہ؟ کاہدے لئی دساں؟ پر کچھ سی جواہدے کولوں تاہر ہو کے آکھدا سی۔ اک داری اوہنوں تے دس دیاں، جھٹوں کئی واری دیکھندا اں.....

لالی نے اوہدے ہتھوں خط پھڑ لیا، ربی نے کہا کچھ نہیں پر عاجز جیہاں اکھیاں نال لالی دل دیکھیا.....

لالی پنڈ آئی پر چھمک اپنے پیکے گھر نہیں سی۔ ماں نے وی روکے دیا۔ کہندے نہیں کڑی ول نہیں، کئی واری سد بہید۔ جیہاں اے پر آوندی وی نہیں۔ کہندے نہیں کسی دالے رکھ پٹھاں جا کے کھلی پر ہندی اے..... خورے اوہنوں کسے نے کچھ کر دتا اے.....

لالی نے کہا ”ماسی! مینوں اتھے اپڑا دے، میں تاں اوہنوں ملن آئی ہاں، مل کے جاداں گی.....“

چھک دی ماں نے کچھ مٹھی مٹھیاں دی نوکریاں دج پائی تے اپنے اتاری کاسے مال لالی نوں چھک والے پنڈ بھج دتا.....

لالی چھک دے ہاں دی نہیں سی پر چھک نوں اکا جویں کوئی ڈاڈھا اپنا ملیاں ہووے۔ مڑ مڑ کے اوہ دے مونہ ول بھری رہی۔ کدے ماسی دا حال پچھدی، کدے پیر داتے پھیر چپ جیہی ہو کے اوہ دے ول تکن لگ پیندی.....

دو جی تر کال چھک لالی نوں لے کے اوہ لے کسے والے رکھ پٹھاں چلی گئی۔ جتھے لالی نے ای اوہدی چپ توڑی۔ پچھیا "توں ہو کسے دا حال نہیں پچھنا؟"

چھک نے کیسا کچھ نہیں پر لالی دے مونہ ول تکن لگ پئی۔ لالی نے ای ہس کے کہیا "ویدی! ربی بھائی دا حال نہیں پچھنا؟"

چھک ساری وی ساری اپنے دل وانگ دھڑکن لگ پئی.....

"ایہ لے، ربی بھاتی نے تینوں اک خط بھجیا۔" لالی نے کہیا تاں چھک دے ہتھ خط پھڑ دیاں کنھن لگ پئے..... چار کوسطراں سن "جدوں توں میں ہوش سنبھالیا، سفنے دج مینوں اک رکھ دسدا اے، پھیر ویکھدا ہاں کہ اوہ تھے رکھ کوئی نہیں ہوندا، اوہ تھے توں ہوندی ایس..... نیزے جاندا آن تاں توں کدھرے نہیں ہوندی، صرف اک رکھ ہوندا اے....."

تے ایہناں چار سطراں دے پٹھاں اک سطری۔ "میں ایس سفنے دا بھیت نہیں پایا۔ جے تینوں کچھ بتا لگے تاں دیس۔"

چھک سرت دج نہیں رہی، لالی مساس جیہی اوہنوں تھم کے گھر لیا کی تے چھک ساری رات بچی اتے انج پئی رہی جویں اوہ دے دج جان نہ ہووے.....

لالی نے اوہ خط جیہا سانجھ لیا پر بڑی گھاہر گئی سی۔ گھر دیاں نے لالی نوں حوصلہ دتا۔ "توں فکر نہ کر کرے۔ ایہد اتے روز دا ایہو حال اے..... کئی سیانیاں نوں دی پچھ مٹھی آں، خورے انہنوں کوئی اوہر ہوئی اے....."

اگلے دن لالی نے پرتاسی، چھک وی کچھ سرت دج سی، لالی نوں کہن لگی "خط دا جواب نہیں لے کے جانا؟"

”ہاں لیکے جاتا اے.....“ لالی نے کہیا تے اوہنوں روں آگیا

چھمک نے کاغذ لے کے دوسراں لکھیاں۔

”میں حالے وی اوس رکھ پیٹھاں کھلوتی آں پچھلے جنم توں کھلوتی ہوئی آں.....“

بس ایس رکھ نوں بھر پیندا اے پھل نہیں پیندا.....“

(پہی اتر فیصل مقصود)



## امرتا پریتم

ہنجالی سے اردو زبان میں ترجمہ: میر تنہا یونی

یو

گھوڑی ہنبائی تو گلیری بھاگ کر کمرے سے باہر آئی، اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ اس کے میٹے کی گھوڑی تھی۔ گلیری نے گھوڑی کی گردن کے ساتھ اپنا سر لگایا جیسے وہ گھوڑی کی گردن نہیں میٹے کا دروازہ ہو۔

گلیری کا میکا چندہ شہر جبکہ سرالی گاؤں لکڑ منڈی اور کھجاری راہ میں ایک اونچی اور ہموار جگہ پر تھا۔

جب سے کچھ ایک میل آگے نکل آنے پر پہاڑی کا ایک ایسا سوز آتا تھا جہاں کھڑے ہونے سے بہت دور اور بہت نیچے ہستا چندہ شہر تھا۔ کبھی کبھی جب گلیری اُداس ہو جاتی وہ مائک کو ساتھ لے کر اس موڑ پر آگھڑی ہوتی

بہاں سے اسے چندہ شہر کے گھر روشن نقطوں جیسے لگتے اور پھر یہ روشن نقطے اس کے من میں ایک ردق لگا دیتے۔

وہ سال میں بس ایک بار میکے جاتی، اسوج کے مہینے میں۔ ان دنوں وہاں چکان کا میلہ لگتا تھا جس کے لئے اس کے ماں باپ اسے بلاوا بھیجتے تھے۔ ایسا بلاوا صرف گلیری کو نہیں آتا تھا بلکہ گلیری کی تمام سہیلیوں کے میکے اپنی اپنی بیٹیوں کو بلاوا کرتے تھے۔ سب سہیلیاں جب ایک دوسرے کو گلے مل لیتیں تو سارے سال کے کبھی موسموں کے دکھ سکھ کی باتیں کر لیتیں۔ پھر وہ اپنے میکے شہر کی گلیوں میں ہرنیوں کی طرح کلاںچیں بھرتیں۔

تج بہ کار اور شادی شدہ، دو دو تین تین بچوں کی مائیں اپنے بڑے بچوں کو ان کے دادا دادی کے پاس پھوڑ آتیں اور گود والوں کو آتے ہی انھیال کے حوالے کر دیتیں، میلے کے لئے نئے کپڑے سلواتیں، ابرق لگوا کر چیزیاں رگواتیں اور پھر میلے سے کانچ کی چوڑیاں اور خوبصورت چاندی کی ہالیاں خریدتیں، اور پھر میلے سے خریدے ہوئے صابن کی خوبصورت لکیوں سے اپنے جسموں کو یوں مل کر دھوئیں جیسے وہ اپنے کھوئے کنوارے جوہن کی خوشبو کو ایک بار پھر سے سونگھنا چاہتی ہوں۔

گلیری کی نفی دنوں سے آج کے دن کے انتظار میں تھی۔ جب اسوج کا آسمان سادون بھادوں کے مہینوں سے ہاتھ پاؤں دھو کر نکھر بیٹھا ہوتا، تو گلیری جیسی سرال بیٹی لڑکیاں ہر روز مویشیوں کو چاراداند ڈال،

ساس سر کے لئے وال چاول پکا کر ہاتھ پاؤں دھو کر، بن سنور کر بیٹھ جاتیں کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو  
 پرسوں، ان کے سینے سے کوئی نہ کوئی انہیں لینے آتا ہی ہوگا۔

آج جب گلیری کے سسرال کے دروازے پر اس کے سینے کی گھوڑی ہنبنائی، گلیری خوشی سے  
 چھوٹے نہ سائی۔ گھوڑی لے کر آئے نوکر تھو کو گلیری نے بیٹھنے کے لئے چوکی دی۔

گلیری کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خود سے اس کے چہرے کا رنگ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ مانک  
 نے تمباکو کا ایک لباکش کھینچا پھر پتہ نہیں اس سے تمباکو کا نشہ نہ سہا گیا یا گلیری کے چہرے کا رنگ، اس نے  
 آنکھیں بند کر لیں۔

”اس بار تو میلے میں آؤ گے ناں! چاہے صرف ایک دن کے لئے ہی سہی“ گلیری نے مانک کے  
 پاس بیٹھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔ مانک کے ہاتھ کاپنے اور اس نے ہاتھ میں پکڑی چلم کو پرے رکھ دیا۔

”بولتے کیوں نہیں؟“ گلیری نے کہا، اُس کی آواز میں جذبے کی گرمی تھی۔

”ایک بات کہوں گلیری!“

”مجھے پتہ ہے تم نے کیا کہنا ہے! بھلا یہ بات تمہیں کہنی چاہیے؟ سال بھر میں ایک بار تو میں سینے

جاتی ہوں، پھر تم کیوں منع کرتے ہو؟“

”پہلے تو کبھی نہیں روکا۔“

”تو پھر اس بار کیوں روکتے ہو؟“

”اس بار..... اس بار.....“ مانک نے اک آہ بھری۔

”تمہاری ماں تو مجھے منع نہیں کرتی، پھر تم کیوں.....؟“ گلیری کی آواز میں بچوں کی سی ضد تھی۔

”میری ماں.....“ مانک نے منہ بند کر لیا جیسے بات کو دانتوں تلے تختی سے دبایا ہو۔

دوسرے دن گلیری منہ اندھیرے ہی بن ٹھن کر تیار ہو گئی۔ گلیری کا نہ کوئی بڑا بچہ تھا نہ ہی گود والا۔

اس نے نہ کسی گود دھیال چھوڑا تھا اور نہ ہی کسی کو نھیال لے جانا تھا۔

تھو نے گھوڑی پر کاٹھی کسی اور گلیری کے ساس سر نے گلیری کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر الوداع

کہا۔

”چل دو کوس میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا.....“ مانک نے کہا تو گلیری نے خوش ہو کر مانک کی



بانسری اپنی ہنک میں رکھ لی۔

کھجور گزر گیا، اگلا ایک اور کوس بھی طے ہو گیا، پھر چنبے کی ڈھلان شروع ہو گئی۔ گلیری نے ہنک میں سے بانسری نکالی اور مائک کے ہاتھ میں تھما دی۔

سامنے تیز اترائی تھی جس پر سے پاؤں جیسے پھسلتے جاتے تھے۔ گلیری نے مائک کا ہاتھ پکڑا اور پھر رک کر بولی: ”بجاتے کیوں نہیں بانسری؟“

سوچیں بھی جیسے راہ کی ڈھلوان پر پڑی ہوئی تھیں کہ مائک کا من پھسلتا جاتا تھا۔ گلیری نے جب اس کا ہاتھ پکڑا، مائک نے ٹھٹھک کر اس کو دیکھا۔

”بجاتے کیوں نہیں بانسری؟“ گلیری نے پھر کہا۔

مائک نے بانسری کو لبوں سے لگایا، پھونک ماری لیکن اس میں سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے بانسری کی زبان پر آبلے پڑ گئے ہوں۔

”نہ گلیری! میں پھر تجھے کہتا ہوں، نہ جا اس بار..... نہ جا.....!“ مائک نے ہاتھ میں تھامی بانسری کو دے دی۔

”مگر کوئی بات بھی تو ہو..... چلو! تم میلے کے دن آ جانا! میں تمہارے ساتھ ہی لوٹ آؤں گی، وہاں نہیں رکوں گی..... کچکی بات!“

مائک نے کچھ نہ کہا، اس نے گلیری کے چہرے کو یوں دیکھا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو ”گلیری! یہ بات کچکی نہیں ہے..... یہ بہت کچی ہے..... بہت کچی.....“ پر مائک نے کچھ نہ کہا جیسے اسے کچھ کہنے کا ڈھب نہ آتا ہو۔

گلیری اور مائک سڑک سے پرے ہٹ کر ایک پتھر کے ساتھ کمرٹکا کر کھڑے تھے۔ ٹھونے وہاں سے دس قدم آگے گھوڑی کھڑی کی ہوئی تھی مگر مائک کا من کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔

مائک کا من گھومتا، پھسلتا، سات برس چھپے پہنچ گیا۔ ایسے ہی دن تھے، مائک اپنے یاروں بیلوں کے ساتھ مل کر اسی راہ سے گزرتا چٹان کا میلہ دیکھنے سڑک تک گیا تھا۔

میلے میں لوگ کانچ کی چوڑیوں سے لے کر گائے بکریوں تک کی خرید و فروخت میں مگن تھے اور اسی میلے میں مائک نے گلیری کو دیکھا تھا اور گلیری نے مائک کو، اور پھر مائک نے گلیری کا دل خرید لیا تھا اور گلیری

نے مانگ کا۔

مناسب وقت دیکھ کر وہ ایک دوسرے سے ملے تھے ”تم تو کئی کا دودھ پھرا بھٹکا ہو“ مانگ نے کہا تھا اور گلیری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”پر کچے بھنوں کو تو ڈنگر منہ مارتے ہیں“ گلیری نے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور پھر بس کر مانگ سے کہا تھا ”انسان تو بھنا بھون کر کھاتے ہیں۔ اگر ہمت ہے تو میرے باپ سے میرا رشتہ مانگ لو!“

مانگ کے رشتہ داروں میں جب بھی کوئی بیاہ ہوتا، لڑکے والے لڑکی کی قیمت ادا کرتے۔ مانگ ڈرتا تھا کہ نہ جانے گلیری کا باپ کتنی رقم طلب کرے۔

مگر گلیری کا باپ سیر شکم شخص تھا اور کسی دور کے شہر کمائی کر چکا تھا۔ اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ اس نے بیٹی سے پیسا نہیں کمانا، جہاں بھی کوئی اچھا گھر دیکھے گا، بیٹی کو بیاہ دے گا۔

مانگ نے گلیری کے چہرے کو یوں دیکھا جیسے اس کے دل کی زبان پر آبلے پڑ گئے ہوں۔ گھوڑی ہنہٹائی، گلیری کو اگلی مسافت یاد آئی تو وہ چلنے کو تیار ہوتے مانگ سے کہنے لگی ”آگے جا کر نیلے پھولوں والا جنگل آتا ہے، کوئی دو میل لبا ..... تمہیں پتہ ہے ناں اس جنگل سے گزرتے ہوئے کان بہرے ہو جاتے ہیں!“

”ہاں“ مانگ نے آہستگی سے کہا۔

”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم اسی جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ تمہیں میری کوئی بات سنائی ہی نہیں دے رہی.....“

”سچ کہتی ہے گلیری! مجھے تیری کوئی بات سنائی نہیں دے رہی“ مانگ نے ایک لمبی آہ بھری۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا مگر دونوں سے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھی گئی۔

”میں جاؤں اب؟.... تم اب لوٹ جاؤ! بہت دور تک آگئے ہو.....“ گلیری نے ہولے سے کہا۔

”تو اتنی دور تک چلتی ہوئی آئی ہے، اب گھوڑی پر بیٹھ جانا!“ مانگ نے بھی ویسے ہی دھیرے سے کہا۔

”یہ لو! پلڑا اپنی بانسری!“

”تو اسے ساتھ ہی لے جا“

”میلے والے دن آکر بجاؤ گے؟“ گلیری ہنس پڑی، اس کی آنکھوں میں دھوپ چمک رہی تھی۔

مانک نے رخ پھیر لیا، شاید اس کی آنکھوں میں بادل اتر آئے تھے۔

گلیری میٹکے کی راہ چل پڑی اور مانک اپنے گھر کو لوٹ گیا۔

”ماں.....“ گھر پہنچ کر مانک یوں چار پائی پر گر پڑا جیسے وہ بہت مشکلوں سے چار پائی تک پہنچا

نو۔

”بڑی دیر لگا دی؟“ ماں نے کہا ”مجھے لگا تو اسے پہنچانے ساتھ ہی چلا گیا ہے“

”نہیں ماں پہنچا کر نہیں آیا..... آدھے میں ہی چھوڑ آیا ہوں“ مانک کا گلا بھرا آیا۔

”عورتوں جیسے سارے کیوں ہے؟ مرد بن مرد!“ ماں نے اک غصے سے کہا۔

مانک کا جی چاہا وہ ماں سے کہے ”مگر تم تو عورت ذات ہو! ایک بار ہی سہی، عورتوں کی طرح روٹی

کیوں نہیں؟“ پھر مانک کو گلیری کی بات یاد آئی ”ہم نیلے پھولوں والے اس جنگل سے گزر رہے ہیں جہاں

سب کے کان بہرے ہو جاتے ہیں“ تو مانک کو محسوس ہوا کہ آج کسی کو بھی اس کی بات سنائی نہیں دے رہی، اور

نہ ہی خود اسے کسی کی بات سنائی دے رہی ہے۔ ساری دنیا جیسے نیلے پھولوں والا ایک جنگل ہے اور سب کے

کان بہرے ہو چکے ہیں۔

سات برس ہو گئے تھے مگر گلیری کو اُمید نہیں لگی تھی اور ماں کہتی تھی کہ اب آٹھواں سال نہیں چڑھنے

وینا۔ وہ اندر ہی اندر پانچ سو روپے دے کر مانک کے دوسرے بیاہ کی بات چکی کر چکی تھی۔ وہ صرف اس انتظار

میں تھی کہ گلیری میٹکے جائے اور وہ نئی دلہن گھر لائے۔

پھر مانک کو محسوس ہوا کہ اس کے بھیتر، دل کا ماس سو گیا ہے۔ گلیری کی محبت اس کے دل میں

چٹکیاں بھرتی ہے مگر اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہو رہا۔ نئی دلہن کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے کی فہمی اس کے دل

میں گدگدی کر رہی ہے مگر اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہو رہا۔ اس کے دل کا ماس ہو گیا ہے.....

ساتویں دن مانک کے گھر اس کی نئی دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔ مانک کے سارے انگ جاگتے تھے صرف

اب دل تھا جس کا ماس سو یا ہوا تھا۔ دل کے سوتے ہوئے ماس کو اس کے انگ برجگہ لے گئے تھے، نئے سسرال

بھی، نئی دہن کی سیج پر بھی.....

مانک منہ اندھیرے اپنے کھیت میں بیٹھا تمباکو پی رہا تھا جب اس کا ایک پرانا دوست وہاں سے

گزر۔

”اتنی سویرے کدھر جا رہا ہے بھوانی؟“

بھوانی ایک منٹ کو ٹھٹھکا، پھر رک گیا۔ حالانکہ اس نے کندھے پر چھوٹی سی ایک گٹھڑی اٹھائی ہوئی

تھی پھر بھی ہولے سے کہنے لگا ”کہیں نہیں“

”کہیں تو جا رہا ہے۔ آ! بیٹھ تمباکو پی لے“ مانک نے آواز دی۔

بھوانی آکر بیٹھ گیا اور مانک کے ہاتھ سے چلم لے کر پیتا ہوا کہنے لگا ”چنے جا رہا ہوں..... آج

میلہ ہے ناں!“

میلے کے لفظ نے دل میں پتہ نہیں کیسی سوئی چھوٹی، مانک کو لگا اس کے اندر، کہیں ایک شدید درد اٹھا

ہے۔

”آج میلہ ہے؟“ مانک کے منہ سے نکلا۔

”آج کے دن ہی تو ہوتا ہے ہر سال.....“ بھوانی نے کہا اور پھر مانک کی طرف یوں دیکھا جیسے

وہ کہہ رہا ہو ”تو بھول گیا ہے اس میلے کو.....؟ سات سال پہلے جب تو میلے گیا تھا میں ہی تو تیرے ساتھ

تھا..... تو نے تو اس میلے میں محبت کی تھی.....“

بھوانی نے کچھ نہ کہا مگر مانک کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے سب کچھ سن لیا ہو، اور یوں اسے

بھوانی پر غصہ آیا کہ وہ اسے یہ سب کچھ کیوں سن رہا ہے۔ بھوانی مانک کی چلم اسے پکڑا کر اٹھ گیا۔ اس کی پشت

پر لگی ہوئی چھوٹی سی گٹھڑی میں سے اس کی بانسری کا سرا باہر نکلا ہوا تھا۔ بھوانی چلا گیا، مانک اسے پیچھے سے

دیکھتا رہا۔ پشت پر لگی ہوئی اس چھوٹی سی گٹھڑی کو دیکھتا رہا، گٹھڑی سے جھانکتے ہوئے بانسری کے سرے کو

دیکھتا رہا۔

”بھوانی اور بھوانی کی بانسری میلے کو جا رہے ہیں“ مانک کو اپنی بانسری یاد آئی ”میری بانسری بھی

میلے گئی ہوئی ہے“ مانک کو وہ دن یاد آیا جب اس نے میکے جاتی گلیری کو اپنی بانسری دیتے ہوئے کہا تھا ”تو اس

کو ساتھ ہی لے جا“ اور پھر مانک کو خیال آیا ”اور میں؟“ مانک کا جی چاہا کہ وہ بانسری کے پیچھے پیچھے دوڑ

پڑے۔

وہ اپنی بانسری کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑے جو اس سے پہلے میلے میں چلی گئی تھی۔ مامک نے چلم پھینک دی اور بھوانی کے پیچھے دوڑا۔۔۔۔۔ پھر مامک کی ٹانگیں کاٹنے لگیں اور وہ وہیں کا وہیں بیٹھ گیا۔

اگلے دن سہ پہر کا وقت تھا جب مامک اپنے کھیت میں بیٹھا تھا اور دور سے آتا بھوانی نظر آیا تھا۔ مامک نے اپنا منہ پرے کر لیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے نہ تو بھوانی کا چہرہ ہی نظر آئے اور نہ ہی اس کی پشت۔ اس بھوانی کو دیکھ کر اسے میلہ، یاد آ جاتا تھا اور وہ میلہ اس کے دل کے سونے ہوئے ماس کو جگا دیتا تھا اور پھر جب وہ ماس جاگ جاتا تھا تو اس میں شدید درد اٹھتا تھا۔

مامک نے منہ موڑ لیا مگر بھوانی گھوم کر مامک کے سامنے آ بیٹھا۔ بھوانی کا چہرہ کچھ یوں تھا جیسے کسی نے دہکتے ہوئے کوئلے پر ابھی ابھی پانی ڈالا ہو اور اس کے سکے کارنگ اب لال کے بجائے کالا ہو۔ مامک نے خوف زدہ ہو کر بھوانی کے چہرے کو دیکھا۔

”گلیری مر گئی۔“

”گلیری مر گئی؟“

”وہ تیرے بیاہ کی خبر سن، مٹی کا تیل ڈال، جل کر مری“

”مٹی کا تیل؟“

اس کے بعد مامک نہیں بولا، پہلے بھوانی ڈرا، پھر مامک کے ماں باپ ڈر گئے اور پھر مامک کی ننی بیوی ڈر گئی کہ نہ جانے مامک کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ نہ کسی سے بولتا اور نہ ہی کسی کو پہچانتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ایک دن گزرا۔ کئی دن گزر گئے۔ مامک وقت پر کھانا کھاتا، کھیتوں میں کام بھی کرتا مگر سب کے چہروں کو یوں دیکھتا جیسے وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔

”میں اس کی بیوی کس بات کی ہوں میں تو بس اس سے بیاہے جانے کی مجرم ہوں“ ننی دلہن دن رات رونے میں جٹ گئی۔

بیاہے جانے کا یہ جرم اگلے صبح مامک کی ننی بیوی اور مامک کی ماں کی آس بن گئی۔ مامک کی بیوی کا پاؤں بھاری ہو چکا تھا۔

ماں نے مامک کو اکیلے بٹھا کر یہ بات سمجھائی مگر مامک ماں کا چہرہ یوں دیکھتا رہا جیسے اسے بات سمجھ

نہ آئی ہو۔

یہ بات چاہے مانک کو سمجھ نہ آئی مگر یہ بات تھی بہت بڑی۔ ماں نے نئی بہو کو حوصلہ دیا کہ تو ہمت سے یہ وقت کاٹ لے، جس دن تیرا بچہ مانک کی جھولی میں ڈالوں گی، مانک کی ساری حسیں لوٹ آئیں گی۔ اور پھر وہ وقت کٹ گیا۔ مانک کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ ماں نے نومولود کو نہلایا، دھلایا اور کالے کپڑے میں لپیٹ کر مانک کی جھولی میں ڈال دیا۔ مانک جھولی میں رکھے ہوئے بچے کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور پھر چیخ کر کہنے لگا "اے پرے ہٹاؤ، مجھے اس میں سے مٹی کے تیل کی بو آتی ہے۔"

☆☆☆☆

## کہانی در کہانی

نرملا جب بچی تھی، دودھ پینے کے لیے ایک پیالہ اس کے لیے رکھا جاتا تھا۔ سفید پیالہ تھا، بس اُس کے نچلے حصے میں ہرے رنگ کی پھول پتیاں کا ڈھی ہوئی تھیں۔ نئی جب دودھ کے گلاس سے منہ موڑ لیتی تب ہی اُس کی ماں نے دودھ کے گلاس کی جگہ یہ پیالہ رکھ دیا تھا۔ اور نرملا کو لالچ دیا تھا کہ اگر وہ سارا دودھ پی لے گی تو پیالے میں اسے خوبصورت پھول پتے نظر آئیں گے۔ یہ پھول پتے دیکھنے کی خواہش میں نئی نے سارا دودھ پی لیا تھا۔ ماں اور نئی دونوں کو یہ پیالہ اس آگیا تھا۔ نئی کی پھول پتے دیکھنے کی آرزو میں کمی آتی چلی گئی۔

اور پھر جب نئی نرملا بن گئی۔ دودھ پینے سے چائے پینے کی اُس کی عمر آگئی تھی تو اسے لگا کہ جیسے کوئی ہریا دل اس پیالے کی پتلی تہہ میں آگئی ہوئی تھی اور اس کی جوانی اُس چہرے کو ڈھونڈنے لگی تھی، جس کے ہونٹ اُس کے دل کے بھرے ہوئے پیالے کو ایک ہی گھونٹ میں پی لیں گے اور اس کی ہریا دل کا جادو ڈھونڈ لیں گے اور پھر وہ وقت بھی آگیا کہ نرملا کو یقین ہو چلا کہ اُس کے بھرے ہوئے دل کے پیالے کو پینے والا کوئی نہیں اور پھر جب اُس نے اپنے دل کے پیالے کو خود ہی گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا تو اسے لگا کہ ایک پتلی ہریا دل کا ٹکڑا وہاں نہیں لگا ہوا تھا بلکہ قید ہوا ہوا تھا اور اسے اس قید سے کوئی چھڑوا نہیں سکتا تھا اور نرملا جب نئی ہوا کرتی تھی، تب وہ تاروں کو نہیں دیکھا کرتی تھی بلکہ تاروں میں سے اپنے لیے تارا چننا کرتی تھی۔ سب سے بڑا تارا اور سب سے چمکتا ہوا تارا اور پھر جب وہ نرملا سے نئی بن گئی تب وہ مردوں میں سے اس مرد کا چہرہ ڈھونڈنے لگی تھی جو سب سے پیارا ہوا اور سب سے چمکدار اور پھر وہ وقت آچلا کہ جب نرملا کو محسوس ہونے لگا کہ اصل میں اُس کا اپنا تصور ہی وہ تارا تھا جو ستاروں بھرے آسمان پر سب سے بڑا تھا اور سب سے چمکدار بھی۔

نرملہ جب بچی ہوا کرتی تھی، تب وہ سورج کی دھوپ کو سینکا نہیں کرتی تھی، گھونٹ بھر کے ہی لیا کرتی تھی اور جس دن بڑے بادل آجایا کرتے تھے۔ سورج نہیں نظر آتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سورج کو ایک خط لکھے اور پھر جب اُسے خط لکھنا آیا تو اسے پتہ چلا تھا کہ سورج کو خط نہیں لکھا جاسکتا تھا تب اُسے ایک ایسے چہرے کی تلاش ہوئی جو سورج سا ہو اور جب وہ اسے خط لکھے تو اسے لگے کہ اس نے سورج کو خط لکھا ہے۔ گلی سے پڑے گھر کی چھت پر ایک لڑکا چھٹی والے دن میز پر کتابیں دھرے گھنٹوں پڑھا کرتا تھا۔ نمی کو وہ بہت خوب صورت لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھار چھٹی والے دن پتنگ بھی اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن پتنگ اڑاتے میں وہ لگاتار نمی کو دیکھتا رہا اور پھر اُس نے ڈور کو شنکا مار کے نمی کے کندھوں پر پھینک دیا تھا۔ نمی نے آہستہ سے اسے پکڑ لیا اور پنسل کے ساتھ ایک مختصر سا خط لکھا "تم ہر روز وقت پر چھت پر ایسے آیا کرو جیسے سورج آیا کرتا ہے اور پھر دونوں کناروں سے پکڑے پتنگ کو اڑا دیا۔ لڑکے نے ڈور کھینچ لی اور پتنگ پر لکھا ہوا نمی کا سندیسہ پڑھ کے اُسے جواب میں ایک خط لکھا۔ اُس نے کاغذ کو پتنگ کے کنارے سے باندھا اور پتنگ کو اڑا دیا اور اسے لائمی کے کندھوں پر پھینکا۔ نمی نے خط کھول لیا اور اسے لے اپنے کمرے میں جا کر پڑھنے لگی۔ خط نمی کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ اس لڑکے کو خط لکھ کے نمی کو لگا تھا کہ اس نے سورج کو خط لکھا تھا لیکن اُس خط کا جواب پڑھ کر نمی کو لگا تھا کہ سورج کا پتہ غلط درج ہو گیا تھا کیوں کہ جواب میں جو خط آیا تھا وہ سورج کا نہیں تھا، وہ سکول جاتی لڑکیوں کے پیچھے جانے والے عام لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا خط تھا۔ نمی نے وہ خط پھاڑ دیا اور تب سے وہ گھر کی چھت پر اس وقت تک نہ گئی جس وقت تک اسے احساس ہوتا کہ اس دوسری چھت پر کوئی ہوگا.... اور پھر وہ وقت آچلا کہ جب نرملہ کو یقین آ گیا کہ کسی رومانٹک کہانی کا ہیرا کہانی میں سے اٹھا کر اپنے ساتھ والی کرسی پر نہیں بٹھایا جاسکتا۔

لیکن جوانی کی عمر وہ عمر ہوا کرتی ہے جب ماضی زیادہ دور نہیں رہ جاتا۔ انسان لحظہ بھر بھر کے اُس کے بارے میں سوچنے لگتا ہے، تب وہ اچانک خاموشی سے اس کے قریب سے گزر کے آگے جاتے ہوئے رہتا ہے۔ اور پھر مستقبل بن کے اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ نرملہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

نرملہ کے کالج کا ایک پروفیسر تھا۔ نرملہ نے آنکھوں میں عزت بھر کے اس کی طے دیکھا تھا لیکن پھر جب اُس نے اپنے نام کے ساتھ نرملہ کا نام جوڑ کے بہت شوخی سی باتیں پھیلا نا شروع کر دی تھیں تب نرملہ اس کے لیے اپنے من میں رکھی عزت کے بارے میں سوچ کر حیران رہ گئی تھی۔



اور ایک دن کسی نے نرملا پر منتوں، ساجتوں کا اتنا بوجھ ڈال دیا تھا کہ اُسے اپنا آپ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا کہ اس کی وہ منتیں، ساجتیں خوف بننے لگی تھیں اور نرملا ان منتوں، ساجتوں کے خوف کا بھید جاننے کے لیے بالکل تنہا ہو کے رہ گئی تھی۔

تب نرملا کو محسوس ہوا تھا کہ عورت کو جیتنے میں یا پھر سمجھنے میں کسی مرد کی دلچسپی نہیں تھی۔ مرد کی دلچسپی محض عورت کو کھودینے میں ہوتی ہے۔

ایک عمر ہوتی ہے، جب مرد اپنے آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر وہ وقت آ جاتا ہے کہ جب اُسے خوشی کا جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اُسی کا سچ بولنے لگتا ہے۔ نرملا بھی اپنے آپ کے ساتھ اُسی کا سچ بولنے لگی تھی اور اس لیے اُس نے اپنے من کی ساری تلاش چھوڑ کے اپنی ماں کے کہنے پر چپ چاپ بیاہ کر دیا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ مردوں کی شکلیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ سوچنے اور بولنے کا طریقہ کار بھی کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور پھر جب یہ ہی ایک جیسا ہوتا ہے تو پھر اوپر سے چہرہ کتنا ہی کوئی مختلف ہو....

اور نرملا کے ہر احساس کو اپنے لیے قبر کھودنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ اُسی جو من پر لگتی رہا کرتی تھی۔ نرملا کو احساس کی اُس لاش کی طرح رکھتی تھی جسے کوئی قبر میں ڈالنا بھول جائے۔ نرملا کو یہ اچھا نہیں تھا لگتا، اس لیے اُس کے چہرے پر بکھری اُسی بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور اُس کے ہر احساس نے یہ ڈھنگ سیکھ لیا تھا کہ وہ جب بھی مر جاتا ہے اپنے لیے ایک قبر کھود لیا کرتا اور اپنی لاش کو اس میں چھپا لیتا۔

نرملا نے تمام عمر کسی کو خط نہ لکھا۔ وہ جب بھی لکھنا چاہتی لکھ نہ سکتی۔ تب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ خط مر گیا تھا وہ ایک کاپی میں نظمیں لکھنے لگ پڑی تھی۔ ہر نظم جیسے ایک قبر تھی۔ جس میں وہ ہر مردہ خط دبا دیا کرتی تھی۔ برسوں پر برس بیت گئے۔ نرملا نے اپنی نظم کبھی کسی کو نہیں دکھائی تھی اور اپنی کہانی کبھی اپنے آپ کو بھی نہیں سنائی تھی، لیکن آج انیس (۱۹) برس کا بیٹا اس کے پاس کھڑا تھا۔

”کیو شو راجی، تمھاری دوست لڑکی ہے؟“

”دوست نہیں کہہ سکتا، محض واقف ہے.....“

”آج پھر اس کا خط آیا ہے، پچھلے ہفتے بھی آیا تھا.....“

”میں نے جواب نہیں دیا۔“

”کیوں؟“

”جواب دینے کا کیا فائدہ؟“

”ایک بار تم نے کہا تھا کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔“

”کہا تھا.... لیکن می لگتا ہے کوئی لڑکی میرے دوست نہیں بن سکتی۔ سبھی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن سب کے سوچنے، بولنے کا طریقہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے.... میں نے اُسے ایک خط لکھا تھا لگتا ہے اُسے سمجھ ہی نہیں آیا۔ آپ کو سناؤں؟ میں نے اُسے لکھا تھا کہ تجھے خط لکھنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں داخل ہو رہا ہو اور جہاں دروازہ کھٹکھٹانے کی بھی اُسے ضرورت نہ ہو، میرے کمرے میں اس وقت بیٹھوون کا سنگیت بج رہا ہے اور میرے من میں ایک خواہش نرم نرم پیروں سے رقص کرتی ہے..... اور جواب میں اُسے جو خط لکھا وہ محض موسم کا حال تھا جیسے اُسی دروازے سے پلٹ آیا ہوں۔ وہ میرا گھر نہیں کوئی بیگانہ گھر ہوگا۔ اس طرح کسی کو خط لکھ کر کسی کو کھودینے سے تو بہتر تھا میں کوئی نظم ہی لکھ لیتا....“

”کیٹو ر..... نظم‘‘ نرملا کے گلے میں سے اُس کی آوازیوں لڑکھڑا کر نکلی جیسے اُسے کہیں بڑی شدید چوٹ

لگی ہو یا بہت پرانا درد جاگ اٹھا ہو....“

☆☆☆☆

## کینی داسفر

اخبار میں خبر ضرور چھپی ہے لیکن پولیس کی تحقیقات اور ڈاکٹر کی رپورٹ کے باوجود، یہ خبر غلط

ہے۔۔۔۔۔

عنوان اور خبر کے بیچ جو کچھ ہوتا ہے، کسی نے بھی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوتا، اس لئے ہر خبر کو لوگوں کا قیاس کہا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ اور قیاس اکثر غلط ہوتا ہے۔

کینی اور اس کی خبر کے بیچ جو کچھ ہوا ہے میں اس کے پل پل کا گواہ ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ جن دنوں وہ کسی اور سے باتیں نہیں کرتی تھی، ان دنوں وہ دیر تک میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ اور ایسے دن اس کی زندگی میں بہت ہی کم آئے جن دنوں اس نے کسی اور سے باتیں کی ہوں۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اخبار میں کینی کی جو خبر چھپی ہے، وہ خبر غلط ہے۔ میں یہ حافیہ بیان کرتا ہوں۔۔۔۔۔

میں: کینی کے کمرے میں لگا ہوا کینی کے قد کے برابر آئینہ۔

میں نے کینی کا چھپن نہیں دیکھا، ابھرتی جوانی بھی نہیں۔ میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تھا وہ بھر پور جوان تھی اور اس کے فن کی شہرت عروج پر تھی۔ مگر اس کے جنم کے بارے اور اس کے شروع کے دنوں کے بارے میں میری جانکاری فقط اتنی تھی جتنی کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر نئے پرانے خطوط کو پڑھتی اور پھر بہت سی سوچیں اپنے ماتھے میں بھر کر وہ مجھ میں اپنا آپ دیکھا کرتی تھی۔

اس کی ماں ایک پولش ڈاکٹر تھی اور اس کا باپ ہندوستانی۔۔۔۔۔ بنگالی میوزیشن۔ کبھی اس کی ماں ہندوستان آئی ہوگی، اس کے باپ سے شادی کر کے پھر ہندوستان ہی رہ گئی ہوگی۔ انہوں نے مل کر کوئی گھر بنایا ہوگا۔۔۔۔۔ مگر جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں ان دنوں اس کا باپ ہندوستان میں تھا، مگر اس کی ماں

واپس پولینڈ جا چکی تھی۔ کبھی کبھی اس کی ماں کا خط آتا تھا، اور وہ اس خط کو میرے پاس بیٹھ کر دیر تک پڑھتی رہتی تھی۔ ایسے کئی خط میرے دیکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط میں ایک طویل خط مجھے بہت یاد ہے، 'میری کینی! تجھے جب بھی خط لکھتی ہوں، ہمیشہ لکھتی ہوں' 'میری کینی'، اور یہ لفظ 'میری' لکھتے وقت میں ہمیشہ سوچ میں پڑھ جاتی ہوں یہ پولینڈ میرے بچپن سے ہی مجھے 'میرا' لگا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب ہندوستان، حقیقتاً میرا نہ ہوتا ہوئے، مجھے میرا لگنے لگا۔۔۔۔ اور پھر وہ وقت آیا جب ہندوستان میرے لئے میرا نہیں رہا۔ میں نے سوچا تھا ہندوستان نہ سہی، مگر پولینڈ ضرور میرے لئے میرا رہے گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسے بھی میرا کہنے کے لئے مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ اس لئے تمہیں، جسے بلاشبہ میں نے اپنے بطن سے جنم دیا ہے۔۔۔۔ جب 'میری' کہتی ہوں تب سوچ میں پڑ جاتی ہوں۔۔۔۔ سوچتی ہوں۔۔۔۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوتا جسے اپنے جیتے جی، ہمیشہ 'میرا' کہہ سکتی تو کم از کم ایسا ضرور ہونا چاہیے جسے 'میرا اپنا آپ' کہہ سکوں۔ مجھے یہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ اگر مجھے تھوڑا سا بھی نصیب ہو جاتا تو میں ہندوستان سے کبھی واپس نہ آتی، تمہیں ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی، مگر جس کی خاطر میرا یہ اپنا میرا نہیں رہا، اسے روز وہاں ایک اجنبی، اور اجنبی، مزید اجنبی ہوتے ہوئے دیکھتے رہنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ پولینڈ واپس آ گئی ہوں، اس لئے نہیں کہ یہ 'میرا' ہے، صرف اس لئے کہ یہ اس سے دور ہے۔ تو نے کئی بار مجھے لکھا ہے کہ میں زندگی میں دوبارہ کچھ دیکھنے کی امید کیوں نہیں کرتی؟ میرے پاس ابھی عمر، شکل، ہنر، شہرت، پیسہ، سب کچھ ہے لیکن ایک چیز بہت حد تک ختم ہو گئی ہے کینی! من کی امنگ ختم ہو گئی ہے۔ تیرے باپ نے وہاں کوئی اور عورت ڈھونڈ لی ہے، ٹھیک ہے، اس کی امنگ باقی ہو گی لیکن مجھ سے میری ساری امنگ خرچ ہو گئی ہے۔ ایک ہی بار خرچ ہو گئی ہے۔ میں مذہبی عورت نہیں۔ صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں ایک فضول خرچ عورت تھی، من کی ساری دولت ایک ہی بار خرچ کر ڈالی، اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہارٹوں کے یہ دن صرف انسان کی بے مقصد زندگی میں آتے ہیں؟ یہ بڑے بھیا تک دن ہوتے ہیں اگر کوئی میری بات سن لے تو میں کہوں کہ ان دنوں کے لئے اپنے دل میں امنگ باقی رکھنی چاہیے۔ دل کی دھڑکن بچا کر رکھنی چاہیے۔ اور دل کی دھڑکن کو تیز کرنے والا عشق بچا کر رکھنا چاہیے۔ عشق نہیں تو عشق کی امید ضرور بچا کر رکھنی چاہیے۔ لیکن میں کسی کو کیا کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔ اپنی یہ بات میں نے خود بھی نہیں سنی۔۔۔۔ تمہاری یہ نصیب ماں

مجھے پتہ ہے کہ یہ خط کینی نے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا تھا اور اس کے گلابی چہرے میں جو رنگ کئی بار

نکھو مانتا، وہ اپنی ماں کے لئے ترس کا رنگ تھا، کسی گہرے وردہ کا رنگ نہیں تھا۔ اور جواب میں اس نے اپنی ماں کو جو خط لکھا تھا وہ اپنی سادہ خط تھا کیوں کہ اس کو اپنی ماں کے خط کی زیادہ سمجھ نہیں آتی تھی۔ جو حادثہ اس کی ماں کی زندگی میں ہوا تھا۔ اسی طرح کا حادثہ اس کی اپنی زندگی میں بھی ہوا تھا۔ اس نے پچھلے دنوں شادی کی تھی۔ اور شادی کے بعد اسے پتہ چلا کہ اس کے شوہر کو اس سے زیادہ دلچسپی کسی اور عورت میں تھی۔ اور وہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر، ملحدہ رہنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کو اپنی ماں کے خط کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ لیکن کینی نے لکھا تھا کہ اس کے دن کے چین اور رات کی غیند میں اس حادثے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ ہنستی تھی، روتی تھی تو بھارتی ناچ کا فن اس کے جسم کے ایک ایک انگ میں چمک اٹھتا تھا۔

اس خط نے جواب میں کینی کو اس کی ماں کا جو خط آیا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ صرف اتنا کہ اس کی ماں کو اپنی بیٹی کے دل کی حالت پر رشک آ رہا تھا۔

کینی اس مختصر خط کو اپنے ہاتھ میں لئے بہت دیر میرے سامنے بیٹھی رہی تھی اور پھر مسکرا کر اس نے میری طرف۔۔۔۔۔ اپنے مہین نقوش والے کورے گلابی چہرے کی طرف۔۔۔۔۔ دیکھا تھا، اور پھر آہستہ سے اس نے ہنٹ پکپاے تھے۔ "میں شاید اپنی ماں پر نہیں مانی۔ اپنی ماں جیسا میں مجھے ورثے میں نہیں ملا۔"

میں بہ چکا ہوں کہ میں نے کینی کو جب دیکھا تھا، اس کی جوانی جو بن پر تھی۔ اور اس کے فن کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ اس لئے یہ ایک دن کی بات نہیں، روزانہ کا معمول ہے۔ میں دیکھتا تھا کہ دن بھر بیویوں خط کینی کو آتے تھے، اس کے فن کی، اس کے حسن کی تعریفوں سے بھرے ہوئے۔ لیکن جس سستی اور بے بسی سے کینی ان خطوط کو پڑھتی تھی، وہ مجھے معلوم ہے۔ ان خطوط میں کچھ سیاسی کی جگہ خون سے لکھے ہوتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ کینی خون کی صورت سے گھبرا کر اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ کینی اکثر خطوط کے جواب نہیں دیتی تھی۔ لیکن کچھ ایسے سنجیدہ خط بھی ہوتے تھے، جن کا جواب کینی منہاس بھرے غم کے ساتھ لکھ دیا کرتی تھی۔

پھر تین دنوں بعد میں نے کینی کے چہرے پر واضح فرق دیکھا اس کے بعد کینی کو ایک ہی لگن میں دیکھتا آیا تھا وہ دو گھنٹے رقص کا ریاض میرے سامنے کرتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر میں نے دیکھا وہ میرے سامنے گویا لڑائی سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ جیسے ریاض کرتے ہوئے اس کا جسم تھک جاتا ہو۔ شاید یہ تھکاوٹ نہیں آتا بہت ہوا کرتی تھی۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ کیا سوچتی تھی۔۔۔۔۔ اس نے میرے سامنے کھڑے ہو

کردیر تک اپنی آنکھوں میں دیکھا (میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، بڑی بڑی، کالی بنگالی آنکھیں) پھر ایک گہرا سانس بھر کر وہ اپنی ماں کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط لکھ کر لفافے میں ڈالنے کے بجائے اس نے وہ خط سامنے رکھ لیا اور پاس پڑے ہوئے گدے کے ساتھ ٹیک لگا کر دیر تک اپنے لکھے ہوئے خط کو پڑھتی رہی۔۔۔۔۔ "ماں! کبھی تو نے مجھے لکھا تھا کہ تجھے مجھ پر رشک آتا ہے۔ ایک عجیب اکتاہٹ، نمی کی طرح مجھ میں سرایت کر گئی ہے۔ میرے کمرے میں ایک سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ گہرے سرخ رنگ کا۔۔۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے کہ میرے خیال کا سارا رنگ میرے ماتھے سے اترتا ہے، میرے ہونٹوں میں سے اترتا ہوا، میرے دل میں اترتا ہے، پھر اترتا اترتا میرے پیروں سے اترتا، اصل میں میرے پیروں کے نیچے آ گیا ہے اور روزِ پیروں میں مسلا جاتا ہے۔ میری عمر مجھے بھوسے جیسی لگنے لگی ہے۔ باہر سے عمر کہیں نظر نہیں آتی اور نہ ہی اندر سے کہیں۔۔۔۔۔ اور کھوئے ہوئے رنگوں کے ساتھ ان کی علامات بھی کھوئی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ماں! کیا رنگ حقیقت میں کھو گیا ہے؟ یا کہیں گہری نیند سو گیا ہے؟ کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر اس کی موجودگی کہیں ضرور رہتی ہے۔۔۔۔۔ کچھ بوجھ سا میرے ماتھے میں پڑا ہوا لگتا ہے۔ زندگی میں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، روز پڑتا ہے، میں ایک مشہور رقاصہ ہوں، اس لئے عام عورت کی زندگی کی طرح کبھی کوئی وہ نہیں ملا جسے دیکھ کر میرے ہن کا یہ رنگ جاگ جائے۔ شاید میرے اندر کوئی رنگ نہیں۔ مجھے صرف اس کا شک ہے۔ زندگی سے جی بھر گیا ہے لیکن ایک درد کو ترس گئی ہوں! جس درد کو جھیلنے جھیلنے تیری عمر رائیگاں گئی ہے، میں اس درد کو ترس گئی ہوں، میری عمر بھی رائیگاں گئی ہے، لیکن اپنے ہی ہاتھوں سے، کاش! کہیں یہ کسی درد سے چٹا سکتی!"

اس خط کے جواب میں کہنی کو ماں کی طرف سے جو خط موصول ہوا وہ بہت مختصر سا تھا۔ لیکن بڑے خوف سے بھرا ہوا تھا۔ لکھا تھا: "کہنی! میں نے زندگی میں کبھی کسی خدا سے دعا نہیں کی۔ تیرا خط پڑھ کر میں دعا کر رہی ہوں کہ جو مقدر تو اپنے لئے مانگ رہی ہے، کہیں یہ مقدر تجھے مل نہ جائے۔"

یہ خط پڑھ کر کہنی کا منہ دیکھنے والا تھا۔ بڑا معصوم لیکن زندگی کی تشنگی سے ہلکتا ہوا۔۔۔۔۔ اور جلدی سے میرے سامنے کھڑے ہو کر، اس نے اپنا ماتھا مجھ میں نظر آنے والے اپنے ماتھے سے جوڑ کر کہا۔ "اے خدا! میری دعا سننا میری ماں کی نہیں۔"

مجھے کیا معلوم کہ اس دن میں نے کیشی کا جو بچوں جیسا بھولا چہرہ دیکھا، وہ چہرہ پھر کبھی مجھے دیکھا



نصیب نہیں ہوگا۔ یہ ایسے تھا جیسے کسی بچے نے آگ کے سرخ شعلے دیکھ کر اپنے دونوں بازو اس کی طرف بڑھا دیے ہوں۔ اور ادھر سے رب نے اذان سے آگ کے وہ سرخ شعلے اس بچے کے ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

ایک دن جب کہینی نیم خوابیدہ اٹھ کر بیرونی کمرے میں آئی۔ وہاں، جہاں میں تھا میرے سامنے اٹھڑی ہو کر اس نے اپنی خیند سے انی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔۔۔۔۔ نظر آ رہا تھا کہ رات دو بجی طرح نہیں سوئی تھی۔ اور نظر آ رہا تھا رات کو اس کی خیند میں جس چہرے کے خیال نے خلل ڈالا تھا، وہ وہی تھا جسے کل رات کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کل رات کو قہقہے سے واپسی پر، جو اسے گھر چھوڑنے آ گیا تھا، وہ کچھ دیر اندر آ کر کمرے میں بیٹھا تھا، اس لئے میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہاں سے اٹھ کر ایک بار وہ بارہوی خانے میں گیا تھا اور پھر پانی کے دو گلاس لاکر ایک اس نے خود پینا شروع کر دیا تھا اور ایک اس نے بڑی بے تکلفی سے کہینی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ گھر کہینی کا تھا، پانی کہینی کو پوچھنا چاہیے تھا اور لے کر آنا چاہیے تھا، لیکن کہینی کی جگہ جب اس، باہر سے آنے والے نے۔۔۔۔۔ پانی کا گلاس لاکر کہینی کے سامنے رکھ دیا، تب کہینی کچھ پریشان سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بالکل پریشان نہیں تھا، اس کے برعکس اس نے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے کہا تھا ”مجھے پیاس لگی ہوئی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہوگی۔“ کہینی نے کچھ نہ کہا، پانی پیا لیا تھا۔ لیکن جب وہ چلا آیا تھا تو کہینی پھر پریشان سی ہو گئی تھی۔ پھر وہ اندر والے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی تھی۔ آج صبح وہ جب اٹھ کر آئی تو اس کی آنکھوں میں رات کی بے چین خیند کی سیاہی تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہو کر اپنی آنکھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خود ہی رات والے الفاظ کو ہونٹوں میں دہرایا ”مجھے پیاس لگی ہوئی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہوگی“ ایک بار کہینی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ پڑ گئی۔۔۔۔۔ جیسے وہ سوچ رہی ہو۔۔۔۔۔ اس کی پیاس سے اپنی پیاس ملائے والا وہ کون ہوتا تھا؟ لیکن وہ مسکرائی۔ اس سے ہونٹ نہیں اس کے ماتھے کی سلوٹ مسکرائی۔ اور جوابات اس نے رات کو جواب میں نہیں دیے تھے، اب اس کیلئے کھڑے ہو کر کہی ”تجھے جب بھی پیاس لگے گی تو پانی کا گلاس پیئے گا، کیا تجھے ہر بار یاد آ جائے گا کہ مجھے بھی پیاس لگی ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔؟“

اس کے بعد وہ نئی بار کہینی سے ملنے کے لئے آیا۔ پہلے دن مجھے اس کا نام پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن دوسرے دن معلوم ہو گیا تھا کیونکہ نوکرانی نے جب اندر آ کر کہا تھا کہ کوئی جادوید صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اس وقت میرے پاس بیٹھ کر کتاب پڑھتے ہوئے کہینی چونک گئی تھی۔ اور پھر اندر آنے والا وہی تھا جو میں

نے اس سے پچھلے دن دیکھا تھا۔ دو دن نہیں گزرے تھے کہ میں نے اسے پھر دیکھا، اور پھر دیکھا۔ کینی جب ایک بار اکیلی میرے سامنے کھڑی ہوئی، تب اس کے چہرے پر ڈوبتے چڑھتے رنگ کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔۔۔۔۔ اس کا ماتھا بھی ضرور ٹھنکا ہوگا! میں حیران تھا کہ آج تک اس نے اپنے کسی بھی جاننے والے کو اپنے گھر آنے کی ذمیل نہیں دی تھی، لیکن یہ کوئی کس طرح کا تھا جس کے سامنے کینی سے کوئی بہانہ نہیں بنایا جا رہا تھا۔

اور پھر اس دن میرا ماتھا مزید ٹھنکا، جس دن اس نے کینی کو بتایا کہ وہ پندرہ دنوں کے لئے شہر سے باہر جا رہا تھا اور اس کے جانے کے بعد کینی نے بے چین ہو کر انتظار کے دن اگلیوں پر گننے شروع کئے۔ "مائی گاڈ! ایٹ ہیڈ سپنڈ" کینی نے میرے سامنے کھڑے ہو کر ایک بار کہا اور پھر حیران ہو کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اس شہد جیسی تھی جس کی منہاس میں شہد کی کھی کا ڈنگ بھی ملا ہوا تھا۔

"ارنی کینی....." پتہ نہیں میں نے کہا کہ اس نے اس کے ہونٹ اصل میں میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہی ہونٹوں پر کسی کے ہونٹوں کے پیار کو اپنے پچھتاوے میں دہرا کر دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ ابھی باہر سے آئی تھی وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔۔۔۔۔ یہ پچھلے سال کے کسی مہینے کی بات ہے۔۔۔۔۔ اس نے باہر سے آتے ہی کمرے کا دروازہ بند کر کے سب سے پہلے جو بات کی تھی، وہ میرے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا تھا، اپنے آپ کو آواز دی تھی، اور پھر پیار سے اپنے ہونٹوں سے ہونٹ مس کیے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اپنے آپ کو ہی آواز دینے کی عادت اسے اسی دن پڑی تھی۔ اس سے اگلے تین سو تیس دنوں میں اس نے کوئی تین ہزار پینسٹھ بار اپنے آپ کو آوازیں دی ہوں گی۔ اس طرح جیسے اس کا اپنا آپ اس سے جدا ہو رہا ہو۔ پر ایسا ہو رہا تھا اور پرانے ہوتے ہوئے خود کو کبھی چین سے دیکھتی اور کبھی بے چینی سے۔ ایک دن اس نے انتہائی کھولتے ہوئے غصے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ پہلی شام وہ آیا تھا تو کینی نے اسے جھولی پھیلا کر کہا تھا کہ وہ اپنے دفتر میں اب اس سیکرٹری لڑکی کو نہ رکھے، جس سے پہلے کبھی کوئی اس کے مراسم تھے۔ اور کینی نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا تھا کہ اس سے ملنے سے پہلے اس کا جو کچھ بھی کسی لڑکی سے رشتہ تھا، اس کا کوئی شکوہ وہ اس سے کبھی نہیں کرے گی۔ لیکن اب ان کو جیتے ہوئے کی یاد دلانے والی کوئی چیز خواہ مخواہ سامنے نہیں رکھنی چاہیے۔ اس نے کینی کی مانگ کو بڑی بے پروائی سے جھٹلادیا تھا اور کہا تھا کہ اس لڑکی کے بغیر اس کے دفتر کے کام کا بڑا حرج ہوگا۔ اس کے سامنے تو نہیں مگر اس کے جانے بعد کینی بہت روئی تھی۔ اس رات وہ اپنے اندر



والے کمرے میں اپنے پلنگ پر سونے کے لئے بھی نہیں گئی تھی۔ باہر قالین پر ہی اپنی پڑی پڑی سو گئی۔ صبح اٹھ کر اس نے نوکرائی سے خاص طور پر کہا کہ آج خواہ کسی کا فون بھی آئے وہ اسے بلائے اندر نہیں آئے گی۔ فون باہر والے برآمدے میں تھا۔ لیکن دوپہر کے بعد وہ خود ہی دروازے کے پاس کھڑی ہو کر فون کی آواز کا انتظار کرنے لگی تھی۔ یہ وہ دن تھا جب اس نے رات کے وقت بہت کھولتے غصے میں میرے سامنے کھڑی ہو کر، اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ اس دن وہ اپنے آپ سے بہت ناراض تھی۔

اس کا یہ غصہ تیسرے دن اتر گیا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اس نے آتے ہی کینی سے کہا کہ آج اس نے اپنے دفتر کی سیکرٹری کو دو ماہ کی پیشگی تنخواہ دے کر فارغ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کینی سے وعدہ بھی کیا کہ وہ کوئی لڑکی۔۔۔ سیکرٹری اب اپنے دفتر میں نہیں رکھے گا۔

لیکن غصہ شاید بدلے کا بخار تھا، عجیب سے بدلے کا بخار، اب وہ کینی سے جاوید کو چڑھ گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ کینی کو انگلینڈ کے ایک کلب کی طرف سے دعوت نامہ آیا تھا۔ کینی کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا اور کینی خوش تھی۔ کچھ اسے یہ امید تھی کہ وہ انگلینڈ سے آسانی سے پولینڈ جاسکے گی اور اپنی ماں سے مل سکے گی۔ لیکن جب کینی نے پاسپورٹ کے لئے فارم بھرا تو فارم کی خانہ پری کے لئے اسے اس کے شوہر کا نام بھی لکھنا پڑا۔ بلاشبہ وہ کئی سال سے اکیلی رہ رہی تھی لیکن اس نے ابھی تک طلاق نہیں لی تھی۔ اس لئے اس فارم کی خانہ پری کے لئے اسے اس آدمی کا نام اس میں لکھنا پڑا تھا، جس کے ساتھ کبھی اس کی شادی ہوئی تھی اور جاوید نے جب یہ فارم پڑھا تو فارم میں نام دیکھ کر وہ لال پیلا ہوا۔ "میں یہ نام بالکل برداشت نہیں کر سکتا" اور اس نے غصے میں آ کر فارم پھاڑ دیا۔

کینی اور فارم لاسکتی تھی۔ پڑ کر سکتی تھی، لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کینی کے قدم ایک نازک موڑ پر آ کر رک گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ جاوید کی غیر حاضری میں مزید فارم لائے گی، بھرے گی، اور پاسپورٹ بنوا کر انگلینڈ چلی جائے گی تو جاوید کو وہ ہمیشہ کے لئے کھودے گی۔ اس کا سوچنا ہوا چہرہ میں سارا دن دیکھتا تھا، اور دیکھتا تھا کیا ہے ایک لمحے وہ جاوید کو کھونے کا حوصلہ اکٹھا کرتی تھی، تو دوسرے لمحے ریت کے بنے محل کی طرح اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔

وہ انگلینڈ نہیں گئی تھی۔ جاوید کبھی بھی اس روٹی خوشی کو نہیں مناتا تھا۔ لیکن زیادہ دفع یہ کینی کو منانی پڑتی تھی۔ اور پھر ہوتے ہوتے یہ بات صرف کینی کے لئے ہی رہ گئی تھی۔ باہر والے دروازے اور باہر والی

سڑک تک دوڑتے ہوئے، اور ناراض ہو کر جانے والے جاوید کو منا کر لاتے ہوئے، میں نے کینی کو کئی بار دیکھا۔ ایک دن کینی روئے جا رہی تھی۔ اتنا کہ وہ پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے جاوید کو کچھ نہ کہہ سکی۔ جاوید چلا گیا۔ کینی روتے روتے بھی اس کے واپس آتے پاؤں کی آواز کا انتظار کرتی رہی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ جاوید اسے ایسے روتے ہوئے چھوڑ کر نہیں جاسکے گا۔ دروازے سے واپس آ جائے گا۔ باہر والی سڑک سے واپس آ جائے گا لیکن جاوید نہیں آیا۔ کینی کی وہ رات اس کی عمر پر بھاری ہو گئی تھی۔ یہ شادی وہ رات جب کینی کا اپنا آپ، اپنی ہی نظروں میں ہلکا ہوتا گیا۔ دوسرے دن جب خود ہی اس نے جاوید کو فون کرنے کی پہل کی، اور پھر جاوید جب آیا، اس نے کل رات والی بات ہنسی میں ٹال دی اور کینی نے چپ چاپ وہ بات ٹل جانے دی، پھر جب اس نے جاوید کو منانے کا کوئی اور موقع خالی نہ جانے دیا اور پھر..... اور پھر.....

ان تین سو پینسٹھ دنوں میں کینی نے کوئی تین ہزار پینسٹھ بار میرے سامنے کھڑے ہو کر کینی کو آوازیں دیں۔ 'میری کینی!..... وہ کبھی بے چینی سے آواز دیتی اور کبھی ترس سے، کبھی پیار سے، کبھی نفرت سے.....'

ان دنوں میں کینی نے اپنی ماں کو کئی خط لکھے، لیکن کوئی خط ڈاک کی نظر نہیں کیا۔ جس لمحے وہ خط لکھتی، اگلے ہی لمحے اس کے دل کا موسم بدل جاتا اور وہ خط اسے بے معنی لگنے لگتا۔ موسم دل کے اختیار میں نہیں تھا دل موسم کے اختیار میں تھا۔ جاوید اسے خوش ملتا وہ خوش ہو جاتی ایک تاریکی طرح وہ کسی رہتی، کاہنتی رہتی۔ جاوید کا جی کرتا تو وہ اس تاریکی سے سوئے ہوئے گیت جگا لیتا۔ جاوید کا دل کرتا تو وہ اس تاریکی سے ہلکتے ہوئے سر نکال لیتا۔

کینی کو جاوید سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس نے کینی کو وہ خوشی دی تھی، جو کینی کو کوئی اور نہیں دے سکا۔ اس نے کینی کو وہ درد دیا تھا، جو کینی کو کوئی نہیں دے سکا۔ وہ خوشی کو منکے کی طرح سنبھالتی پھرتی، سانپ کی طرح اکیلی بیٹھ کر اس سے کھیلاتی۔

کینی کو سسکچنگ کا شوق تھا، ایک بار اس نے ایک بڑی خوبصورت کاپی پر جاوید کا ایک سسکچ بنایا۔ جاوید کو دکھایا۔ جاوید کو اچھا لگا اور دوسرے صفحے پر اس نے اپنی پنسل سے کینی کا سسکچ بنادیا۔ جاوید کی ڈرائیونگ کینی سے بھی زیادہ اچھی تھی۔ پھر اس کاپی پر انہوں نے کئی سسکچ بنائے۔ ایک بار وہ پانچ دنوں کے لئے پہاڑ پر گئے تھے، وہاں انہوں نے پہاڑی جھرنوں کے کئی سسکچ بنائے۔ پھر اپنی پسند کی نظمیں چنیں اور اس کاپی میں لکھیں

اس کا پی کو وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔ اس کا نام انہوں نے عطیہ رکھا ہوا تھا۔ اس عطیہ کو وہ پیار سے آتی بلا تے تھے اور قسمت والے خوش لمحوں میں جاوید کینسی کو ”آتی۔ ماں“ کہہ کر پکارتا تھا اور کینسی جاوید کو ”آتی۔ پا“ کہہ کر۔

اداس راتوں میں کینسی کو ایک بھیا تک خواب آتا تھا ایک دن اس نے میرے پاس بیٹھ کر جاوید کو بتایا تھا کہ وہ جب اداس ہوتی تھی تو رات خواب میں ان کی بیٹی مر جاتی تھی۔۔۔۔۔ آتی کا ورق ورق پھٹ جاتا تھا ان کی بیٹی کا ایک ایک حصہ کٹ جاتا تھا۔

خوشی کو آئے دن روٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی اور کینسی کو آئے دن منانے کی، لیکن ایک دن ایسا بھی آ گیا کہ کینسی اسے مناتے مناتے آپ ہی روٹھ گئی۔ کسی سے نہیں اپنے آپ سے۔ جاوید کے پاس ان دنوں میں کوئی اس کے دور کے رشتہ داروں کی بھابھی آ کر رہنے لگ پڑی تھی۔ جاوید کے اس بھائی سے اس بھابھی کو طلاق لئے کئی سال ہو چکے تھے یہ بھابھی کینسی کو اچھی نہ لگی۔ ایک بار جاوید اس کو کینسی کے گھر ساتھ لایا تھا۔ اور اس بھابھی نے ایک عجیب سے انداز میں جاوید کی تعریف کرتے ہوئے اسے کہا تھا، ”یوکر سائل از بائٹل“۔۔۔۔۔ اور اس دن اس نے کینسی ہی کے گھر کینسی کی موجودگی کو آنکھوں سے اوجھل کر کے دیکھا تھا کینسی کو اگر کوئی دعویٰ تھا تو جاوید پر اسے کسی تیسرے سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور اس دن کینسی اس بات سے زخمی ہو گئی تھی کہ جاوید کو اس بھابھی کے کسی رویے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور اب یہی بھابھی جاوید کے پاس رہنے کے لئے آ گئی تھی۔ ”اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔۔ مجھ سے یہ بات کس لئے چھپائی۔۔۔۔۔“ کینسی کا پرانا زخم برا ہو گیا کیونکہ آج اچانک اسے یہ بات جاوید کے نوکر سے معلوم ہوئی تھی۔ اور پھر جب کینسی نے جاوید کو فون کیا تو جاوید نے ہنس کر کینسی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ”ایسے ہی نہ بولتی جایا کر۔۔۔۔۔ یہ میں نے تجھے اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تجھے خواہ مخواہ تکلیف ہوگی“

”ایسے ہی نہ بولتی جایا کر۔۔۔۔۔“ کینسی نے میرے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار یہ الفاظ اپنے آپ سے کہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں تھیں اور یہ الفاظ اس کے ہونٹوں میں بار بار سسکیاں لے رہے تھے، ”کینسی۔۔۔۔۔ تو میری بات کیوں نہیں سنتی۔۔۔۔۔ تم ایسے ہی بولے جاتی ہو۔۔۔۔۔“ اور پھر کینسی اپنے آپ کو چپ کراتے کراتے حواس کھو بیٹھی۔ جاوید وہاں نہیں تھا، لیکن وہ کمرے میں خڑی جاوید سے باتیں کرنے لگی ”تم سمجھتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔ میں ایسے ہی بول رہی ہوں؟ کبھی کسی کو ویسے ہی درد ہوتا ہے؟ پھانتوں میں سے رونا ایسے ہی آتا ہے؟ تو میرے ساتھ ٹھیک سے نہیں بولتا، میری آدمی جان نکل جاتی ہے، کبھی کسی کی آدمی

جان ایسے ہی نکل جاتی ہے؟.....

اور حواس باختہ کینی چپ ہونے کے بجائے مزید بولتی گئی۔ پھر اس نے جاوید کو فون کیا۔۔۔۔۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جاوید کو اس کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز سن کر ہمیشہ ہی غصہ آ جاتا تھا، آج بھی آگیا اور اس نے ایک ہی لفظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ یہ لفظ اس کے کانوں میں گھونج اٹھا۔ کینی نے چونک کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور پھر ہلک کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے تھے۔ ان آنکھوں سے وہ اپنی آنکھوں کو دیکھ کر چیخ پڑی۔ ”شٹ اپ..... کینی شٹ اپ.....“

یہ جاوید کا کہا ہوا لفظ تھا، کینی نے حکما مان لیا اور کینی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جاوید سے اتنی دور چلی جائے جہاں سے جاوید کو کبھی اس کی آواز نہیں آ سکے گی۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی.....

مجھے معلوم ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کینی نے میرے پاس بیٹھ کر اپنی ماں کو خط لکھا کہ میں جلد پولینڈ آ رہی ہوں اور پھر ہمیشہ وہیں رہوں گی۔ کینی نے یہ خط لفافے میں ڈالا میرے سامنے ٹمٹ لگائی اور پھر نوکرانی کو بلا کر یہ خط ڈاک خانے میں ڈالنے کے لئے دے دیا۔

کینی کے پاؤں اس دھرتی سے رشتہ توڑ چکے تھے جس دھرتی پر کھڑے ہو کر اس کی آواز جاوید تک جاسکتی تھی۔ وہ جلدی سے پاسپورٹ کے دفتر گئی اور وہاں سے وہ فارم لے کر آئی جو کہ پاسپورٹ کے حصول کے لئے ضروری تھا اور کینی نے وہ فارم میرے پاس بیٹھ کر پر کیا۔

پولینڈ پہنچے گا، راستہ بہت لمبا تھا۔ لیکن کینی کے پاؤں بہت جلدی میں تھے، رکتے ہی نہ تھے۔ رات ہوتی جا رہی تھی اور جیسے جیسے رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا، کینی کو ایک سوچ آ رہی تھی۔ ”جانے میں بہت دن لگ جائیں گے..... بہت دن..... اتنے دن تم چپ نہیں رہو گی.....“

ایک کینی وہ تھی جو شاید کبھی چپ نہیں رہ سکتی تھی ایک کینی وہ تھی جس کے پاؤں دھرتی کے اس گڑھے سے بہت دور چلے جانا چاہتے تھے، ایک کینی وہ تھی جس کے پاؤں اسی جگہ جھے ہوئے تھے۔ ایک کینی وہ تھی جس کا سر فخر سے بلند تھا اور وہ اس فخر پر ساری دنیا کی دولت لٹا سکتی تھی۔ ایک کینی وہ تھی جس کا سر محبوب کی دہلیز پر جھکا ہوا تھا، اور وہ محبت کی ایک بوند کے لئے جھولی پھیلا کر کھڑی ہو سکتی تھی۔

کینی کو جانا تھا، ضرور جانا تھا، جو کچھ بھی اس کے راستے میں کھڑا تھا، اس سے گزر کر جانا تھا۔ کینی راہ سے ہٹتی نہیں تھی۔ اس لئے کینی نے رات سوتے وقت کمرے کے سارے دروازے

اچھی طرح بند کر لئے پولینڈ سے ماں کی بھیجی ہوئی کونیاک کی بوتل نکالی، اس نے ایک ایک گھونٹ کو اس طرح پیا جیسے وہ ماں سے باتیں کر رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ کونیاک اس نے دو گلاسوں میں ڈالی تھی، ایک گلاس اپنے حصے کا ایک ماں کے حصے کا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے سے گھونٹ بھرتی رہی۔ نیند کی گولیاں آج اس کے پاس صرف دو تھیں۔ اور پھر کینی نے جھوم کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔۔۔۔۔ ”تم میرے راستے میں نہیں آ سکتے۔۔۔ پیچھے ہٹ۔۔۔۔۔ مورکھ۔۔۔۔۔“

اور پھر اس نے کمرے میں پڑی ہوئی ”عطیہ“ کا ایک ایک ورق پھاڑا۔ آتی ماں نے اپنی پٹی کا ایک ایک انگ چوما۔۔۔۔۔  
تو نے قیم ہو جانا تھا آتی! میرے بعد۔۔۔۔۔ اس نے کہا اور پھر مسکرا پڑی۔ اور پھر کمرے میں رکھی ہوئی گیس کو کھلا چھوڑ کر وہ سو گئی۔

☆☆☆☆

بھارت ناٹیم کی پر مہارت ڈانسر کینی تارا نے کل رات خودکشی کر لی، اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے، لیکن باوجود پولیس کی تحقیقات کے اور ڈاکٹروں کی رپورٹ کے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خبر غلط ہے۔ کینی نے کبھی مرنا نہیں چاہا، ہمیشہ زندہ رہنا چاہا ہے۔ کینی کو پولینڈ جانا تھا، لیکن جانے میں بہت دیر تھی، اس لئے وہ کسی اور ایسے سدھار گئی ہے اور عشق میں پاگل ہوئی ایک کینی اس کے راستے میں بیٹھی ہوئی تھی، اس کو اس نے بڑی مشکل سے راستے سے ہٹایا ہے۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد اعجاز

## تہہ خانہ

ہوا کچھ تیزی ہو گئی۔۔۔

شاید اس لیے کہ ہوا میں تمہارا سانس ملا ہوا تھا۔۔۔

اور ہوا کے سینے میں کھڑے ہوئے درختوں کے پتے دھڑکنے لگ پڑے۔۔۔

میں، ہڈیوں اور لباس کی ایک عمارت، ایک عرصہ خاموش کھڑی رہی۔

پھر جیسے خود ہی اپنے وجود میں سے باہر آئی ہوں۔۔۔

میں نے باہر کے راستے کی جانب دیکھا۔

تم باہر کے راستے سے گزر رہے تھے۔

راستے کے اوپر سے کئی لوگ گزرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں۔

تم اس کے اوپر یوں منک منک کر چل رہے تھے، جیسے تمہارے پاؤں اس راستے سے باتیں کر رہے

ہوں۔۔۔

تم نے معلوم نہیں اسے کیا کہا۔۔۔ کہ راستے کی مٹی کا رنگ گلابی سا ہو گیا۔۔۔

اور پھر میں کتنے دن اس کی جانب دیکھتی رہی۔۔۔

اور پھر میں نے ایک دن دیکھا۔۔۔

تم باہر کے دروازے کے سامنے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔

اس درخت کا خیال ہے۔۔۔ کہ اس دن اسے پہلی بار بور لگا تھا۔

اور میں کئی دن اس درخت کے بور کو دیکھتی رہی۔

ایک دن بہت گرم دوپہر تھی۔۔۔

تم آئے، اور باہر کے دروازے کے سامنے ایسے کھڑے ہو گئے، جیسے اس دروازے سے تم پانی کے کسی کنوئیں کا راستہ پوچھ رہے ہو۔

دروازے نے گھبرا کر ایک ہاتھ باری طرف دیکھا، پھر میری طرف۔ اور دروازے کے اندر گھر کی چوکھٹیں تھیں۔۔۔

تم نے چوکھٹوں پر نظر ڈالی، ان کے سوائے نصیب جاگ پڑے۔ اور پھر میں نے اندر جا کر گھڑے میں سے پانی کا ایک کنورا بھرا۔ اور تم نے چپ چاپ اندر آ کر پانی کا کنورا پی لیا۔

معلوم نہیں تم کہاں سے آتے تھے، کہاں جاتے تھے، صرف اتنا معلوم تھا کہ میرا گھر تمہارے راستے میں پڑتا تھا اور تم جب بھی وہاں سے گزرتے تھے، تمہیں پیاس لگ جاتی تھی اور میں پانی کا کنورا بھر کر تمہارے سامنے رکھ دیتی تھی۔

میرا نام یورینس ہے ایک دن تم نے پانی پیتے ہوئے بتایا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا۔۔۔ تمہارے آنے کے وقت کوزہ ہمیشہ پانی سے لہالب رہتا تھا، اور تمہارے چلے جانے کے بعد ہمیشہ خشک کنورے کی طرح ہو جاتا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔۔۔ تمہارے خشک گلے ایسا ہو جاتا تھا۔۔۔

میں۔۔۔ تین منزل عمارت ہوں۔

تم نے صرف ایک منزل دیکھی تھی، دوسری منزل، اور ایک دن جب تم نے کہا۔۔۔ پانی پیتے ہو۔۔۔ اچانک تم دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگ پڑے تھے۔

تمہیں شاید پیاس کے ساتھ ساتھ کچھ بھوک بھی تھی، اور شاید تم نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وجود کی بھوک کو مٹانے والی چیز دوسری منزل پر تھی۔ تم نے سیڑھیوں کی جانب دیکھا، تو میں بھی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگ پڑی۔

اور سیڑھیاں چڑھتے جب تم نے اپنا قدم سیڑھیوں کی دیوار پر رکھا۔۔۔ تو میری پٹلی میں سے ایک



کپکپاہٹ سی گزرتی گئی۔

سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد سامنے بیلوں سی ڈھکی ہوئی بالکونی ہے اور سونے والا کمرہ۔

تم بیلوں سی ڈھکی ہوئی بالکونی میں کھڑے ہو گئے اور میں لکڑی کے گھٹے کو جلانے لگ پڑی تھی۔ پھر ٹھنڈی روٹی کو گرم کرنے لگی کہ تم پہ نظر پڑی۔

اودھایا! تمہارے چہرے پر پیش آرہی تھی۔ شاید تمہارے چہرے پر آگ کی اٹ کا عکس پڑ رہا تھا۔۔۔

جلتی لکڑیوں میں سے کچھ چنگاریاں نکل کر میرے پاؤں کے قریب آ پڑی تھی۔

پاؤں میں ایک ٹیس سی انھی، لیکن میں نے چنگاریوں کو اپنے پاؤں کے تلوؤں سے روند ڈالا تھا۔

گرم روٹی تمہارے سامنے رکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اور میں نے دیکھا۔۔۔ روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے تمہارے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی کپکپاہٹ اپنے وجود کے اندر چھپالی تھی۔ تم ایک عرصہ میری طرف دیکھتے رہے۔۔۔ جیسے

میرے وجود میں چھپی اس کپکپاہٹ کو ڈھونڈ رہے ہو۔۔۔

وجود کی کپکپاہٹ کو شاید نظروں سے نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔۔۔ تم نے زور سے مجھے اپنے ہاتھ بھینچ

لیا۔۔۔ یوں اپنے وجود کی کپکپاہٹ سے میرے وجود کی کپکپاہٹ کو ڈھونڈ لیا۔۔۔

لکڑی کے ٹکڑوں میں ابھی تک آگ جل رہی تھی۔۔۔ اور اس کی لائوں کے سائے ہمارے چہروں پر

پڑ رہے تھے۔۔۔

تین منزلہ عمارت کے نیچے۔۔۔ ایک تہہ خانہ ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا، مگر ہے، اور اس دن جب تم چلے

گئے، رات کو میں نے اپنی عمر کا بیسواں سال اپنے وجود سے اتار کر اس تہہ خانہ میں رکھ دیا۔ سوچتی تھی۔۔۔ تم

جب چاہو گے، تمہیں نکال کر دکھا دوں گی۔۔۔ تمہاری امانت۔۔۔

آواز کی ایک لکیری۔۔۔ جو سیدھی سینے میں سے نکل کر میرے گلے میں سے گزرتی تھی۔۔۔ اور پھر

میرے لبوں کے قریب آ کر چھوٹے چھوٹے دائروں میں بدل جاتی تھی۔ یو۔۔۔ رے۔۔۔ نا۔۔۔ س۔۔۔

اور میری آواز میرے لبوں سے نکل کر میرے کانوں میں چلی جایا کرتی تھی، مگر ایک مدت تک میرے

لبوں پر ہی پڑی رہتی تھی۔۔۔



میرے اندر ایک مقام پر۔۔۔ بائیں طرف۔۔۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آگ سی جل رہی ہو، اور جس کی تپش سے اس آواز کے دائرے ڈھل جاتے تھے اور یہ پھر میری ناڑ میں سے گزر کر میری چھاتی میں چلی جاتی تھی۔ اور یہ لکیر جیسی۔۔۔ میرے سینے سے نکل کر میرے گلے میں سے گزرتی تھی۔۔۔ اور پھر لبوں کے قریب آکر چھوٹے چھوٹے دائروں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔۔۔ یو۔۔۔ رے۔۔۔ ن۔۔۔ س۔۔۔

دن اور رات بھی شاید اسی آواز کی مانند گھومتے تھے۔۔۔ وہ بھی ایک دائرے میں چلتے رہے اور یہ آواز بھی۔

ایک دن تم نے کہا۔۔۔ بہت مدت بعد۔۔۔ تم آئے لیکن اس دن تمہارے پروں میں پہلی منزل والا جذبہ تھا نہ دوسری منزل والا، تم سیدھے اس تیسری منزل پر آ گئے، جہاں میرے انتظار کے دنوں ایسی۔۔۔ بند، ٹھنڈیاں اور خاموش سیکڑوں کتابیں پڑی ہوئی تھی۔

تم کتنی دیر خاموش کھڑے رہے! معلوم ہوتا تھا۔۔۔ جیسے کتابوں میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو گیا ہو۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر تمہارے ہاتھ کو ایسے چھوا۔۔۔ جیسے آہستہ سے ایک کتاب کی جلد کو اٹھا کر اس کے پہلے صفحے کو دیکھنا مقصود ہو۔

تم ہنس دینے۔۔۔ اور کتاب کے سارے صفحے تم نے اپنی آنکھوں میں بھر لیے، اور ساری عبارت لبوں پر۔ تم نے میرے لبوں کو ایسے چوسا۔۔۔ جیسے میں نے تمہارے لبوں کی ساری عبارت کو اپنے لبوں سے پڑھنا ہو۔۔۔

تم جس طرح کچ کچ قدم اٹھاتے اوپر کی منزل پر آئے تھے، ویسے کچ کچ قدم اٹھاتے میرا ہاتھ تھا۔ نیچے۔۔۔ درمیانی منزل پر آ گئے، بیلوں والی بالکونی میں سے گزر کر میرے کمرے میں۔ پھر ایک عرصہ تم تحمل کے بستر کو اپنی چوڑی مردانہ تھیلیوں سے سہلاتے رہے۔ پیچھے بہت طویل خشک دن تھے اور آگے معلوم نہیں کیا تھا، لیکن ان یادوں میں سے یاد کا ایک لمحہ اٹھا جس نے اپنا ایک بازو بیٹے ہوئے وقت پر پھیلا دیا اور دوسرا دور تک آنے والے وقت پر۔۔۔ یوں آگے پیچھے۔۔۔ تاحد نظر۔۔۔ وہ لمحہ پھیل گیا۔

اس سے لمحہ بھر پہلے ماس کی ایک دیوار تمہارے گرد تھی اور ماس کی ایک دیوار میرے گرد۔ لیکن ماس اور مٹی کی دیواریں معلوم نہیں کیوں کھل گئیں۔۔۔ اور تم مجھ کو یوں ملے۔۔۔ جیسے ایک ندی کا پانی، ایک ندی کو ملتا

ہے۔۔۔ اور اس لمحے معلوم نہیں کس قدر اس پانی میں تیر رہے تھے۔

ندیاں جب خشک ہو جاتی ہیں۔۔۔ پھر مٹی بن جاتی ہیں، مجھے لگا تم قریب تھے تو میں ایک ندی تھی، اور تم چلے گئے، تو میں پھر دھرتی ماں۔۔۔ مٹی ماں۔۔۔ ماس مٹی کی ایک عورت تھی۔

اس رات اور پھر ہر رات۔۔۔ مجھے معلوم ہوتا رہا۔۔۔ کہ میری کوکھ میں سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔

تمہیں مدتوں پھر واپس آنے کا دھیان ہی نہیں رہا۔ اور ایک رات۔۔۔ جب کافی دیر میری کوکھ میں سے رونے کی آواز آتی رہی۔۔۔ میں نے اپنی کوکھ کو اس آواز سمیت، اس تہہ خانہ میں جا کر رکھ دیا۔۔۔ جہاں کبھی میں نے اپنی عمر کے بیسویں سال کو رکھا تھا۔۔۔

کبھی کبھی۔۔۔ میں موسمِ بقی جلا کر۔۔۔ تہہ خانے میں جاتی تھی۔۔۔ ایک مدت اپنی عمر کے بیسویں سال کو دیکھتی رہتی تھی۔۔۔ اور پھر ایک مدت اپنی کوکھ میں سے کسی کے رونے کی آواز کو سنتی رہتی تھی، سوچتی تھی۔۔۔ اب جب تم آؤ گے، میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اس تہہ خانے میں لے جاؤں گی۔۔۔

پھر مدت بعد۔۔۔ تم ایک بار آئے، لیکن اس مرتبہ تم اکیلے نہیں تھے۔۔۔ باہر دروازے کے پاس کھڑی کتنی ہی مسرور فحش تمہارے ساتھ تھی۔۔۔ تم نے ایک لمحہ کے لیے اندر آ کر جلدی سے پانی کا ایک کنویرا پیا۔۔۔ اور جب میں نے تہہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ تم نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور لوٹ آنے کا اقرار پکڑا کر چلے گئے۔۔۔

تمہارے اقرار کو میں نے پھول کی مانند پکڑا نہیں تھا۔۔۔ اپنی ہتھیلی میں بولیا تھا، پھر وہ ایک عرصہ تمہاری ہتھیلی میں پڑا رہا۔۔۔

مگر ماس کی ہتھیلی آخر ماس کی ہوتی ہے۔۔۔ یہ مٹی کی طرح ہمیشہ جوان نہیں رہتی۔ اس پر عمر کی سلونیں

پڑ جاتی ہیں۔۔۔ یہ جب بٹھر ہونے لگتی ہے۔۔۔ اس کے اندر اگا ہوا ہر پتا مرجھا جاتا ہے۔ تمہارے اقرار کا پھول بھی مرجھا گیا، اور میں نے کانپتی ہتھیلی سے ایک دن اس مرجھائے ہوئے پھول کو تہہ خانے کے گاڑھے اندھیرے میں رکھ دیا۔۔۔

تیسری منزل پر بہت سی کتابیں ہیں۔۔۔ دنیا بھر کی تاریخوں کی، مگر ان میں سے ایک کتاب کم

ہے۔۔۔ ان میں میرے تہہ خانے کی تاریخ کی کوئی کتاب نہیں۔

جس نے دنیا کی تاریخ پڑھی ہے۔۔۔ وہ جانتا ہے۔۔۔ کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایک یورینس نام کا مرد ہوتا تھا، اور ایک گایا نام کی عورت ہوتی تھی۔۔۔ اور گایا کی کوکھ میں سے جو بھی بچہ جنم لیتا، یورینس اسے دھرتی کی تہہ میں دبا دیتا تھا اور گایا کو دھرتی میں ہمیشہ بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھی۔۔۔

مگر آج کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں پڑتی۔۔۔ کہ بیسویں صدی میں ایک گایا ہوتی تھی، اس نے ایک یورینس سے محبت کی تھی، اور اس نے اپنی کوکھ کو کسی تہہ خانے میں رکھ دیا تھا۔۔۔ جس میں سے ہمیشہ ایک بچے کے رونے کی آواز آتی رہتی تھی۔۔۔ کسی کو معلوم نہیں کہ رونے کی آواز صرف جنم لیے بچے کے گلے میں سے ہی

نہیں نکلتی۔۔۔ بغیر جنم لیے بچے کے گلے میں سے بھی رونے کی آواز آتی ہے۔۔۔

☆☆☆☆

امرتا پر تہم

ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ: خورشید قائم خانی

## جنگلی بوٹی

انگوری، میرے پڑوسیوں کے گھر، ان کے پرانے نوکر کی نئی نویلی دہن ہے۔ ایک تو نئی اس لیے کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری بیوی ہے، سو اس کا خاوند ”دوہا جو“ ٹھہرا۔ اگر جو کا مطلب ”جون“ ہو تو اس کا مطلب ہو ا دوسری جون میں پڑا ہوا آدمی۔ انگوری چوں کہ ابھی بیاہ کی پہلی ہی جون میں ہے، اس لیے نئی ہوئی۔ دوسرے وہ اس بات سے بھی نئی ہے کہ اس کا گونا آئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔

پانچ چھ سال ہوئے، جب بھاتی اپنے مالکوں سے چھٹی لے کر اپنی پہلی بیوی کا ”کریا“ کرنے کیلئے اپنے گاؤں گیا تھا تو کہتے ہیں کہ کریا والے دن انگوری کے باپ نے اس کا انگو چھانچوڑ دیا تھا۔ کیس بھی مرد کا یہ انگو چھا، اس کی بیوی کی موت پر بھلے آنسوؤں سے نہ بھیگا ہو، پر کریا کے چوتھے دن نہا کر بدن پونچھنے پر کسی لڑکی کا باپ اگر یہ انگو چھانچوڑ دے تو گاؤں کی اس معمولی سی رسم کے مطابق جیسے وہ کہہ رہا ہو!

”اس مرنے والی کی جگہ میں تمہیں اپنی بیٹی دیتا ہوں اور اب تمہیں رونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا آنسوؤں سے بھیگا ہوا انگو چھا سکھا دیا ہے۔“

اس طرح پر بھاتی کا انگوری کے ساتھ دوسرا بیاہ ہو گیا تھا۔ لیکن، ایک تو انگوری ابھی عمر کی چھوٹی تھی، اور دوسرے انگوری کی ماں گھٹیے کے روگ میں پڑی تھی، اس لیے گونے کی بات پانچ چھ سال پر جا پڑتی تھی۔۔۔۔ پھر ایک ایک کر کے پانچ سال بھی بیت گئے اور اس سال جب پر بھاتی اپنے مالکوں سے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گونا لینے گیا تھا تو اپنے مالکوں کو پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ یا تو وہ اپنی جینی کو بھی ساتھ لائے گا اور شہر میں اپنے ساتھ رکھے گا اور یا پھر وہ بھی گاؤں سے نہیں لوٹے گا۔ مالک پہلے تو کہنے لگے کہ ایک پر بھاتی کی جگہ وہ اپنی رسوائی سے دو جنوں کی روٹی نہیں دے سکتے، پر جب پر بھاتی نے کہا کہ وہ کوٹھری کے پچھواڑے کی جگہ لب

پوست کراپنا چولہا الگ بنائے گی، اپنا پکائے گی اور اپنا کھائے گی تو اس کے مالک یہ بات مان گئے تھے۔  
 سو انگوری شہر آئی تھی۔ گو انگوری نے شہر آ کر کچھ دن محلے کے مردوں سے تو کیا عورتوں سے بھی  
 گفتگو نہیں کیا تھا، پر پھر دھیرے دھیرے اس کا گھونگٹ جھینا (پٹا) ہوتا گیا۔ وہ بیروں میں چاندی کی  
 جھانجریں پہن کر پینٹک چمٹک کرتی محلے کی رونق بن گئی تھی۔ ایک جھانجری اس نے پاؤں میں پہنی ہوئی، تو  
 وہ بی بی اپنی فہمی میں۔ گو وہ دن کا شیش تر حصہ اپنی کوٹھری میں رہتی تھی پر جب باہر نکلتی تو ایک رونق اس کے پاؤں  
 کے ساتھ ساتھ چلتی سنائی دیتی۔

”یہ کیا پہنا ہے انگوری؟“

”یہ تو میرے پیروں کی چھیل چوڑی ہے۔“

”اور یہ انگلیوں میں؟“

”یہ بچھو ہے بچھو“

”اور یہ بانہوں میں؟“

”یہ تو گھسیلا ہے۔“

”اور ماتھے پر؟“

”مٹی بند کبوتریں اسے۔“

”آج تم نے کمر میں کچھ نہیں پہنا؟“

”تکڑی بہت بھاری لگتی، کل کو پہنوں گی۔ آج تو میں نے تو کبھی بھی نہیں پہنا۔ اس کا ٹانگا نوٹ گیا

ہے۔ کل سہر (شہر) کو جاؤں گی۔ میری ناک کا کلسا بھی تھا، اتنا بڑا میری ساس نے دیا نہیں تھا؟“

اس طرح انگوری اپنے چاندی کے گہنے ایک نگرے کے ساتھ پہنتی اور نگرے سے دکھاتی تھی۔

پچھلے دنوں جب موسم بدلا، تو انگوری کا اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ کئی بار میرے گھر

کے سامنے آئی تھی۔ میرے گھر کے سامنے نیم کے بڑے بڑے بیڑ ہیں، اور ان بیڑوں کے پاس ہی ذرا اونچی

جگہ پر ایک پرانا کنواں ہے۔ کو محلے کا کوئی آدمی اس کنویں سے پانی نہیں بھرتا، لیکن اس کے پار ایک سرکاری

مذک بن رہی ہے اور اس کے گرد اکثر پانی جمع رہتا ہے اور یہ جگہ بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

”کیا پڑھتی ہو بی بی جی؟“ ایک دن انگوری جب آئی، میں نیم کے تلے بیٹھ کر ایک کتاب پڑھ رہی

تھی۔

”تم پڑھو گی؟“

”میرے کو پڑھنا نہیں آتا۔“

”سیکھ لو“

”نہ۔“

”کیوں؟“

”عورت کو پاپ لگتا ہے پڑھنے سے۔“

”اچھا، عورت کو پاپ لگتا ہے، مرد کو نہیں لگتا؟“

”نہ۔ مرد کو نہیں لگتا۔“

”تم کو کس نے بتلایا؟“

”میں جانتی ہوں۔“

”پھر میرا تو پڑھتی ہوں۔ مجھے پاپ لگے گا؟“

”نہ، شہر کی عورت کو پاپ نہیں لگتا۔“

میں بھی نس پڑی اور انگوری بھی۔ انگوری نے جو کچھ سیکھا، سنا تھا، اس میں اسے کوئی شک شبہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ وہ اگر بنستی، کھیلتی اپنی زندگی کے دائرے میں سکھی رہ سکتی ہے، تو اس کے لیے یہی ٹھیک تھا۔ ویسے میں انگوری کے منہ کی اور دھیان لگا کر دیکھتی رہی۔ مہرے سانولے رنگ میں اس کے بدن کا ماس گتھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں عورت آنے کی لوٹی ہوتی ہے۔ پر کئی ایک کا گوشت پوست اس ڈھیلے آنے کی طرح ہوتا ہے، جس کی روٹی کبھی گول نہیں بنتی اور کئی ایک کے بدن کا ماس، بالکل خمیرے آنے جیسا، جسے بیلنے سے پھیلا یا نہیں جاسکتا۔ صرف کسی کسی کے بدن کا ماس اتنا سخت گتھا ہوا ہوتا ہے کہ روٹی تو کیا چاہے پوریاں تیل

لو۔۔۔۔

میں انگوری کے منہ کی اور دیکھتی رہی، انگوری کی چھاتی کی اور، انگوری کی پنڈلیوں کی اور۔۔۔۔ وہ اتنے سخت میرے کی طرح گتھی ہوئی تھی کہ جس سے مٹھریاں تلی جاسکتی تھیں اور میں نے اس انگوری کا پر بھاتی بھی دیکھا ہوا تھا۔ ٹھگنے قد کا، ڈھلکے ہوئے منہ کا، کسورے جیسا۔ اور پھر انگوری کے روپ کی اور دیکھ کر مجھے اس کے

مرد کے بارے میں ایک عجیب خیال آیا کہ پر بھاتی اصل میں آٹے کی اس گھنی گندمی ہوئی لوئی کو پکا کر کھانے کا حق دار نہیں۔ وہ تو اس لوئی کو ڈھک کر رکھنے والا بھانڈا ہے۔۔۔۔ اس نسبت سے مجھے خود ہی ہنسی آ گئی۔ پر انگوری کو میں اس نسبت کی بھنک نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں اس سے اس کے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔ ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی اور کھیتوں کھلیانوں کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا:

”انگوری تمہارے گاؤں میں شادی کیسے ہوتی ہے؟“

”لڑکی جب چھوٹی سی ہوتی ہے، پانچ، سات سال کی تو وہ کسی کے پاؤں پوج لیتی ہے۔“

”کیسے پوجتی ہے پاؤں؟“

”لڑکی کا باپ جاتا ہے، پھولوں کی ایک تھالی لے جاتا ہے۔ ساتھ روپے، پیسے اور لڑکے کے

سامنے رکھ دیتا ہے۔“

”یہ تو ایک طرح سے باپ نے پاؤں پوجے، لڑکی نے تو نہیں؟“

”لڑکی کی طرف سے تو پوجے نا۔“

”پر لڑکی نے تو اس کو دیکھا بھی نہیں؟“

”لڑکیاں نہیں دیکھتیں۔“

”لڑکیاں اپنے ہونے والے پتی کو نہیں دیکھتیں؟“

”نہ۔“

”کوئی لڑکی اپنے ہونے والے پتی کو نہیں دیکھتی؟“

”نہ۔“

پہلے تو انگوری نے نہ کر دی پر پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی:

”جو لڑکیاں پریم کرتی ہیں وہ دیکھتی ہیں۔“

”تمہارے گاؤں میں لڑکیاں پریم کرتی ہیں؟“

”کوئی کوئی۔“

”جو پریم کرتی ہیں، ان کو پاپ نہیں لگتا؟“

مجھے اصل میں انگوری کی وہ بات یاد آگئی تھی کہ عورت کو پڑھنے سے پاپ لگتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس حساب سے پریم کرنے والی کو بھی پاپ لگتا ہوگا۔

”پاپ لگتا ہے، بڑا پاپ لگتا ہے۔“ انگوری نے جلدی سے کہا۔

”اگر پاپ لگتا ہے تو وہ پریم کیوں کرتی ہیں؟“

”جو تو... بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی آدمی جب کسی چھوکری کو کچھ کھلا دیتا ہے تو وہ اس سے پریم کرنے لگ جاتی ہے۔“

”کوئی کیا کھلا دیتا ہے اس کو؟“

”ایک جنگلی بوٹی ہوتی ہے۔ بس وہی پان میں ڈال کر یا مٹھائی میں ملا کر کھلا دیتا ہے۔ چھوکری اس سے پریم کرنے لگتی ہے۔ پھر اسے وہی اچھا لگتا ہے، دنیا کا اور کوئی اچھا نہیں لگتا۔“

”سچ؟“

”میں جانتی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”کیسے دیکھا؟“

”میری ایک سکھی تھی۔ اتنی بڑی تھی میرے سے!“

”پھر؟“

”پھر کیا؟ وہ تو پاگل ہوگئی اس کے پیچھے۔ سہر چلی گئی اس کے ساتھ۔“

”یہ تجھے کیسے پتہ چلا کہ تیری سکھی کو اس نے بوٹی کھلائی تھی؟“

”برنی میں ڈال کر کھلائی تھی، اور نہیں تو کیا؟ وہ ایسے ہی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر چلی جاتی؟ وہ اس

کو بہت ساری چیزیں لا کر دیتا تھا۔ سہر سے دھوئی لاتا، چوڑیاں بھی لاتا شیشے کی، اور موتیوں کی مالا بھی لاتا تھا۔“

”یہ چیزیں بوٹی نا۔ پر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ اس نے جنگلی بوٹی کھلائی تھی؟“

”نہیں کھلائی تھی تو وہ اس سے پریم کرنے کیوں لگ گئی؟“

”پریم تو یوں بھی ہو جاتا ہے۔“

”نہیں ایسے نہیں ہوتا۔ جس سے ماں باپ برا مان جائیں، بھلا اس سے پریم کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تو نے وہ جنگلی بوٹی دیکھی ہے؟“



”میں نے تو نہیں دیکھی۔ وہ تو بہت دور سے لاتے ہیں۔ پھر چھپا کر منٹائی میں ڈال دیتے ہیں۔ یا پان میں ڈال دیتے ہیں۔ میری ماں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کسی کے ہاتھ سے منٹائی نہیں کھانا۔“

”تو نے بہت اچھا کیا کہ کسی کے ہاتھ سے منٹائی نہیں کھائی۔ پر تیری سکھ نے کیسے کھائی؟“

”اپنا کیا پائے گی!“

کہنے کو تو انگوری نے کہہ دیا، اپنا کیا پائے گی، پر اسے شاید کبلی پر ترس آگیا، دکھے ہوئے من سے کہنے لگی۔

”باوری ہو گئی تھی بے چاری۔ بالوں کو کنگھی بھی نہیں لگاتی تھی۔ رات کو اٹھ اٹھ کر گانے گاتی تھی۔“

”کیا گاتی تھی؟“

”پتہ نہیں کیا گاتی تھی۔ جو کوئی بوٹی کھا لیتی ہے، گاتی بہت ہے اور روتی بھی بہت ہے۔“

بات گانے سے رونے تک آن پہنچی تھی۔ اس لیے میں نے انگوری سے اور کچھ نہ پوچھا۔

اور اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن انگوری نیم کے بیڑ تلے چپ چاپ میرے پاس آکھڑی ہوئی۔ پہلے جب انگوری آیا کرتی تھی تو جھم جھم کرتی آواز میں گز دور سے ہی سنائی دے جاتی تھی۔ پر آج اس کے پیروں کی جھانجھان جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ میں نے کتاب سے سر اٹھایا اور پوچھا:

”کیا بات ہے انگوری؟“

انگوری پہلے تو دیر تک میری اور دیکھتی رہی، پھر دھیرے دھیرے سے کہنے لگی۔

”بی بی جی، مجھے پڑھنا سکھا دو۔“

”کسی کو خط لکھو گی؟“

انگوری نے پھر جواب نہیں دیا اور ٹنگلی باندھے سامنے کی اور دیکھنے لگی۔

یہ دوپہر کی بات تھی۔ میں انگوری کو نیم کے بیڑ کے نیچے بیٹھی چھوڑ کر اندر آ گئی تھی۔ شام کو پھر کہیں میں باہر نکلی تو دیکھا، انگوری اب بھی نیم کے بیڑ تلے بیٹھی ہے۔ بڑی سنی ہوئی سی تھی۔ شاید اس لیے کہ شام کی ٹھنڈی ہوا بدن میں تھوڑی تھوڑی کپکپی چھوڑ رہی تھی۔

میں انگوری کی پیٹھ کی اور تھی۔ انگوری کے ہونٹوں پر گیت تھا، پر بالکل سسکی جیسا:

”میری مندری میں اگو گولنوا، ہویری کیسے کاٹوں جو بنوا۔“

انگوری نے میرے پاؤں کی آہٹ سن لی۔ منہ پھیر کر دیکھا اور پھر اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیا۔

”تو تو بہت اچھا گاتی ہے انگوری!“

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ انگوری نے اپنی آنکھوں میں کانپتے آنسو روک لیے اور ان کی جگہ اپنے

ہونٹوں پر ایک کانپتی ہنسی رکھ دی ہے۔

”مجھے گانا نہیں آتا۔“

”آتا ہے۔۔۔“

”یہ تو۔۔۔“

”تیری سکھی گاتی تھی؟“

”اسی سے سنا تھا۔“

”پھر مجھے بھی سناؤ۔“

”ایسے ہی کنتی ہے برس کی۔ چار مہینے ٹھنڈی ہوتی ہے، چار مہینے گرمی اور چار مہینے برکھا۔۔۔“

”ایسے نہیں گائے سناؤ۔“

انگوری نے گایا تو نہیں پر بارہ مہینوں کو ایسا گیت دیا جیسے یہ سارا حساب وہ اپنی انگلیوں پر کر رہی ہو۔

”چار مہینے راجا ٹھنڈی ہوت ہے

تھر تھر کانپے کلہوا

چار مہینے راجا گرمی ہوت ہے

تھر تھر کانپے پونوا

چار مہینے راجا برکھا ہوت ہے

تھر تھر کانپے بدر دوا۔“

”انگوری!“

انگوری ٹٹکی باندھے میرے منہ کی اور دیکھنے لگی۔ من میں آیا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

پوچھوں۔ ”پنگی، کہیں جنگلی بوٹی تو نہیں کھالی؟“ میرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا بھی گیا۔ مگر میں نے اس کی

بجائے یہ پوچھا:

”تو نے کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں؟“

”کھانا؟“ انگوری نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ کے نیچے مجھے لگا کہ انگوری کا کل شریر کانپ رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اس نے گیت گایا ہو۔ برکھا کے موسم میں کانپنے والے بادلوں کا، گرمی کے موسم میں کانپتی ہوا کا اور سردی کے موسم میں کانپنے والے کلیجے کا۔ اس گیت کی ساری کپکپی اس کے بدن میں سمائی ہوئی تھی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ انگوری اپنی روٹی خود بناتی ہے۔ پر بھاتی مالکوں کی روٹی بناتا تھا اور ان ہی کے گھر میں کھاتا تھا۔ اس لیے انگوری کو اس کی روٹی کی فکر نہیں تھی۔ اس لیے میں نے پھر کہا:

”تو نے آج روٹی پکائی تھی کہ نہیں؟“

”ابھی نہیں۔“

”سویرے بنائی تھی؟ چائے پی تھی؟“

”چائے؟ آج تو دودھ ہی نہیں تھا۔“

”آج دودھ کیوں نہیں لیا تھا؟“

”وے تو میں لیتی نہیں، وے تو....“

”تو روز چائے نہیں پیتی؟“

”پیتی ہوں۔“

”پھر آج کیا ہوا؟“

”دودھ تو وے رام تارا....“

رام تارا ہمارے محلے کا چوکیدار ہے۔ سب کا سا جھا چوکیدار۔ ساری رات پہرہ دیتا ہے۔ وہ سویرے سار خوب اندہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جب انگوری نہیں آئی تھی، تو وہ صبح سویرے ہمارے گھروں سے چائے کا گلاس مانگا کرتا۔ کبھی کسی کے گھر سے تو کبھی کسی کے اور چائے پی کر وہ کنویں کے پاس کھاٹ پچھا کر سو رہتا۔ پر جب سے انگوری آئی تھی وہ سویرے ہی کسی گوالے سے دودھ لے آتا، انگوری کے چولھے کا تیل چڑھاتا، اور انگوری، پر بھاتی اور رام تارا تینوں چولھے کے گرد بیٹھ کر چائے پیتے تھے.... اور ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ رام تارا بچپلے تین دنوں سے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔

مجھے دکھ بری ہنسی آئی اور میں نے کہا: ”اور انگوری تم نے تین دنوں سے چائے نہیں پی ہے؟“  
 ”نہ۔“ انگوری نے زبان سے کچھ کہے بنا صرف سر ہلا دیا۔

”روٹی بھی نہیں کھائی؟“

انگوری سے بولا نہ گیا۔ لگ رہا تھا کہ اگر انگوری نے روٹی کھائی بھی ہوگی تو نہ کھانے کے برابر ہی۔  
 رام تارے کی کل شکل و شباهت میرے سامنے آ گئی۔ بڑے پھرتیلے ہاتھ پاؤں، گھٹیلادہ بدن، جس کے پاس  
 ہلکے ہلکے ہنستی ہوئی ہنرماتی آنکھیں تھیں اور جس کی زبان کو بات کرنے کا خاص سلیقہ تھا۔  
 ”انگوری!“

”جی!“

کہیں جنگلی بوٹی تو نہیں کھالی تو نے؟“

انگوری کے چہرے پر آنسو بہ نکلے۔ ان آنسوؤں نے بہ بہ کر انگوری کی انوں کو بھگو دیا۔ اور پھر ان  
 آنسوؤں نے بہ بہ کر اس کے ہونٹوں کو بھگو دیا۔ انگوری کے منہ سے نکلتے الفاظ بھی گیلے تھے۔  
 ”مجھے قسم ہو جو میں نے اس کے ہاتھ سے کبھی مٹھائی کھائی ہو۔ میں نے پان بھی کبھی نہیں کھایا۔  
 صرف چائے... جانے اس نے چائے میں ہی...“

اور آگے انگوری کی ساری آواز اس کے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

☆☆☆☆

## پانچ برس لمبی سڑک

پیش موسم کی تھی، من کی نہیں۔

ہوائی جہاز وقت پر آیا تھا، پر نیچے ایئر پورٹ سے ابھی سگنل نہیں ملا تھا۔ جہاز کو دلی پہنچنے کی خبر دینے کے بعد بھی، ابھی دس منٹ اور گزارنے کے لیے اسے شہر کے اوپر چکر لگانے تھے۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے شہر کے منڈیرے پہنچانے۔ منڈیرے، قلعے، کھنڈر اور کھیت۔۔۔ یہ سب اس نے کئی ممالک میں دیکھے تھے۔ ہر ملک میں ان چیزوں کے یہی نام ہوتے ہیں، گوہر ملک میں ان کی تاریخ الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک انسان سے الگ دوسرے انسان کی طرح۔ مگر جس طرح انسان کا نام انسان ہی رہتا ہے، منڈیروں اور قلعوں کے بھی یہی نام ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ صرف ایک معمولی سا فرق تھا۔ باہر ملک میں دیکھتے وقت خیال آتا کہ انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ پر آج اپنے دیس میں انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں دوسری بار دیکھ رہا ہے۔ اسے خیال آیا کہ اگر وہ پھر کچھ دن کے بعد پر دیس گیا، تو انہیں دیکھ کر بھی ایسا ہی لگے گا کہ وہ ان کو دوسری بار دیکھ رہا ہے۔ بالکل آج کی طرح۔ یہ دیس اور پر دیس کا فرق نہیں تھا۔ یہ صرف پہلی بار اور دوسری بار دیکھنے کا فرق تھا۔

جہاز نے "لینڈ" کیا۔ ایئر پورٹ بھی جانا پہچانا سا لگا، دوسری بار دیکھنے کی طرح۔ گرمی موسم کی تھی، من کی نہیں اور کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور سوئیٹر نکال کر کندھے پر رکھ لیا۔

کشم سے گزرتے وقت اس نے ایک فارم بھرنا تھا کہ پچھلے نو دن وہ کہاں رہا تھا۔ پچھلے نو دن سے وہ صرف جرمی میں تھا۔ اس نے فارم بھر دیا اور اسے خیال آیا، شکر ہے کشم والے محض نو دن کا حال پوچھتے ہیں، بیس پچیس دن کا نہیں۔ ورنہ تو اسے سلسلہ وار یاد کرنا پڑتا کہ کون سی تاریخ کو وہ کس دیس میں کہاں کہاں تھا۔ اس نے واپسی کے سفر کے دوران ایک مہینہ محض ایسے ہی گزارا تھا۔۔۔۔۔ کبھی کس دیس کا ٹکٹ لے لیتا، تو کبھی

کس دیس کا۔ اگر کسی ملک کا دیر ۱۱ سے نہ ملتا تو وہ کسی اور ملک کو چل دیتا۔

پاسپورٹ کی چیکنگ کے بعد پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے، ایک افسر نے مسکرا کر کہا، ”جناب پانچ برس بعد دیس میں آرہے ہیں!“ بالکل اسی طرح جیسے راستے میں ایئر ہوسٹس نے کئی بار بتلایا تھا کہ اس وقت تک ہم اتنے ہزار کلو میٹر طے کر چکے ہیں۔ کتنی عجیب چیز ہوتی ہے، اسے خیال آیا۔ پر تیسری بو کی بات ایک تھیس لکھنے کے برابر ہوگی۔ وہ ابھی ابھی ایک پردیسی زبان سیکھ کر اور اس کے لڑچر پر تھیس لکھ کر، ایک ڈگری لے کر آیا تھا۔ نئے تھیس کے بارے میں کوئی بات وہ ابھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے صرف پسینے اور پھولوں کی بو سونگھتا ہوا وہ ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔

گھر میں صرف ماں تھی۔ جانے کے وقت باپ بھی تھا، چھوٹا بھائی بھی، اور ایک لڑکی..... نہیں، وہ لڑکی گھر میں نہیں تھی۔ وہ صرف اسی دن، اس کے جانے کے دن آئی تھی۔ ماں کو صرف ایسے ہی کچھ گھنٹوں کے لیے بھرم ہوا تھا کہ وہ لڑکی..... جسے اب چھوٹا بھائی بیاہ کر کے لے گیا، اور نوکری میں کہیں پر رہتا تھا، گھر میں نہیں تھا۔ باپ بھی اب اس دنیا میں نہیں تھا، سو گھر میں صرف ماں تھی۔

بہت سی چیزیں اندر سے بدل جاتی ہیں، مگر باہر سے وہی لگتی ہیں اور کئی باہر سے بدل جاتی ہیں مگر اندر سے ویسی ہی رہتی ہیں۔ اس کا کمرہ بالکل اسی طرح تھا..... اس کا پیلا غالیچہ، اس کی کھڑکی کے مسزے پر دے، اس کی میز پر پڑا ہوا ہری دھاریوں کا گل دان اور دہلیز میں پڑا ہوا گہرا خاکا پائیدان۔ چاندنی کا پودا بھی اس کی کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ پر پہلے اس سب کچھ کی بو..... دیواروں کی ٹھنڈی بو کے سمیت..... اس کے ساتھ لپٹ سی جاتی تھی۔ اور اب اسے لگا کہ وہ اس کے ساتھ لپٹنے سے شرماتی، صرف اس کے پاس سے گزر جاتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے اندر، کہیں کیا بدل گیا تھا۔

ماں کشمیری ریشم کی طرح ملائم تھی اور تنی سی بھی۔ پر اب عمر نے جیسے اسے دھو سا دیا تھا۔ وہ پوری کی پوری سکڑی ہوئی لگتی تھی۔ ماں سے ملنے وقت اس کا ہاتھ ماں کے منہ پر ایسے چلا گیا تھا، جیسے اپنی ہتھیلی سے اس ماس پر پڑی شکنوں کو نکال دینا چاہتا ہو۔ ماں کی آواز بھی بڑی دھیمی اور باریک سی ہو گئی تھی۔ شاید پہلے اس کی آواز کا زور اس کے مرد کے قد جتنا تھا اور اب اس کے بٹا بٹا ہوا گھٹا، مشکل سے اس کے اپنے قد جتنا۔ جب اس نے بیٹے کا منہ دیکھا تو اس کی آنکھیں پہلے کی طرح چمک اٹھیں۔ وہ کہیں کہیں کسی جگہ پر بالکل وہی تھی، جیسے ہمیشہ ہوتی تھی۔ صرف اس کے ظاہر میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔

”مجھے پتہ تھا، تو آج یا کل کسی دن بھی اچانک آ جائے گا۔“

ماں نے کہا۔

اس نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے تازہ پھولوں کو دیکھا اور پھر ماں کی طرف۔ ماں کی آواز لجا گئی۔ ”یہ تو میں روز رکھتی تھی۔“

”روز؟“ ”کتنے دنوں سے؟“ وہ ہنس پڑا۔

”روزانہ، ماں کی آواز اس کے جسم کی طرح سکڑ گئی۔“ جس دن سے تو کیا ہے۔“

”پانچ برس سے!“ وہ چونک سا گیا۔

ماں لجا بھری گھبراہٹ سے بچنے کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ انٹر پر انگلی رکھی، تو اس کا ہاتھ ٹھٹھک گیا۔ اس نے ماں کے سامنے آج تک سگریٹ نہیں پی تھی۔

ماں نے شاید اس کے ہاتھ میں تھا سگریٹ کا پیکٹ دیکھ لیا تھا۔ وہ دھیرے سے رسوئی سے باہر آئی اور مینجک سے ایش نرے لاکر اس کی میز پر رکھ گئی۔

اس یاد آیا۔۔۔۔۔ جھوپٹن میں، ماں نے ایک بار اسے چوری سے سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر تھڑکی سے باہر پھینک دی تھی۔۔۔۔۔

ماں شاید وہی تھی پر وقت بدل گیا تھا۔

ماں پھر رسوئی میں چلی گئی۔ وہ چپ چاپ سگریٹ پینے لگا۔

”مجھے پتہ تھا، تو آج یا کل کسی دن بھی آ جائے گا۔۔۔۔۔“

اسے ماں کی ابھی ابھی کہی گئی بات یاد آئی اور اس کے ساتھ ملتی جلتی ایک اور بات بھی یاد آئی۔

”مجھے پتہ لگ جائے گا، جس دن تمہیں آنا ہوگا، میں خود اس دن تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“ بہت

پہلے جب وہ پردیس جا رہا تھا، تو ایک لڑکی نے اسے یہ بات کہی تھی۔

اس لڑکی سے اس کی واقفیت پرانی تھی، مگر دوستی نہیں تھی۔ پر پانچ برس قبل پردیس جانے کے وقت

وہ آگئی تھی اور اسے اس کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔۔۔۔۔

جیسے جہاز میں بیٹھے کسی مسافر کو اگلی بندرگاہ پر اتر جانے والے مسافر سے اچانک ایسی چاہت محسوس

ہوتی ہے کہ چل بھر میں وہ اسے بہت کچھ کہہ دینا اور اس سے سن لینا چاہتا ہے اور ایسے وقتوں میں برسوں میں گزرنے والا سفر پلوں میں گزرنے لگتا ہے۔

اس نے یہ ”گزرنا“ دیکھا تھا، اس لڑکی کے ساتھ۔

”تمہارا کیا خیال ہے، میں جو کچھ جاتے وقت ہوں، وہی آتے وقت بھی ہوں گا؟“ اس نے کہا۔

”میں تمہاری بات نہیں کہہ رہی، میں اپنی بات کرتی ہوں،“ لڑکی نے جواب دیا۔

”تم یہیں ہوگی، یہ تمہیں کس طرح پتہ ہے؟“

”لڑکیوں کو پتا ہوتا ہے۔“

”تو لڑکیاں باوری ہوتی ہیں۔“ وہ ہنس پڑا، لڑکی رو پڑی تھی۔

جانے میں بہت تھوڑے دن تھے۔ پانچ دن اور پانچ راتیں لگا کر اس لڑکی نے اس کے لئے پوری ہانہوں والا سویٹر بن دیا تھا۔ اسے پہناتے وقت کہا تھا! ”بس ایک..... وعدہ مانگتی ہوں اور وہ یہ کہ جس دن تم واپس لوٹو، تو یہی سویٹر پہن کر آنا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں وہاں پانچ برس.....“ اس نے جو کچھ کہنا چاہا، لڑکی نے سمجھ لیا تھا۔ لڑکی نے سمجھ لیا تھا۔

اس نے کہا، ”میں تم سے ان ہونے اقرار نہیں مانگتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہاں کا وہیں چھوڑ آنا۔“

وہ کتنی دیر اس لڑکی کے منہ کی طرف تکتا رہا تھا۔ اور پھر اسے یہ سب کچھ عورت کا مخصوص چہل لگا تھا۔ وہ بے وفائی کو چھوٹ دے رہی تھی پر اس پر وفا کا بار لا کر کہہ رہی تھی: ”میں تمہیں خط لکھنے کو بھی نہیں کہوں گی۔ صرف اس دن تمہارے پاس آؤ گی، جس دن تم واپس لوٹ کر آؤ گے۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ میں کس دن لوٹ کر آؤں گا؟“

اس نے لڑکی کو چھیڑنے کے لئے کہا تھا اور اس نے جواب میں کہا تھا۔

”مجھے پتہ لگ جائے گا، جس دن بھی تمہیں آنا ہوگا۔“

اس دن وہ ہنس دیا تھا۔ اس نے پردیس دیکھا تھا، برس دیکھے تھے، لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ پر کسی چیز میں ڈوب کر نہیں دیکھا تھا، صرف کنارے سے چھو کر۔



اور وہ سوچتا رہا تھا۔۔۔ شاید ڈوب جانا اس کی فطرت میں نہیں، یا وہ چلتا ہے تو ایک بوجھ بھی اس کے ساتھ چلتا ہے، جو ہر جلد اس کے پیروں کو جکڑ لیتا ہے۔

ہر ویس کی دوستی اس نے اسی ویس میں چھوڑ دی تھی۔ اپنی افتاد طبع کے تحت، یا اس لڑکی کے کہنے پر، یہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

والپسی کے وقت جب وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا تو وہ سویٹر کو ہاتھ میں تھام کر کتنی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ وہ اسے سامان میں پیک کر دے یا اس لڑکی کی بات رکھتے ہوئے پہن لے۔

”جو سویٹر پہن کر جانا، پانچ برس بعد وہی پہن کر آنا“، یہ اسے حماقت خیز لگا تھا۔ حماقت خیز بھی اور جذباتی بھی اور کسی حد تک جھوٹا بھی، کیوں کہ جس بدن پر یہ سویٹر پہنا تھا وہ اب اس طرح نہ تھا جس طرح وہ لے کر آیا تھا۔ پھر بھی اس نے سویٹر کو پیک نہیں کیا، پہن لیا۔ جب وہ سویٹر پہن کر شیشے کے سامنے کھڑا ہوا اسے آرٹ گیلریوں میں بیٹھے وہ آرٹسٹ یاد آئے، جو پرانی اور کلاسیک پینٹنگز کی ہو بہ ہو نقلیں تیار کرتے تھے، اور سویٹر پہن کر لگا اس نے بھی اپنی نقل تیار کر لی ہے۔

اس نقل پر وہ شرمندہ نہیں تھا، صرف اس کی حماقت پر فیس رہا تھا۔ ماں کو وہ سب کچھ یاد تھا جو کبھی اسے اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ خود بھول گیا تھا۔

”کھانکے تو دیکھ اچھا بنا ہے؟“ ماں نے جب خیبر کا پراٹھا بنا کر اس کے سامنے رکھا تو اس کو یاد آیا کہ خیبر کا پراٹھا اسے بہت پسند تھا۔ ماں نے اس کے جانے کے دن بھی بنایا تھا۔

اس نے ایک ٹکڑا تو زکھن میں ڈبویا اور پھر ماں کے منہ میں ڈال کر فیس پڑا: ”وہاں لوگ خیبر تو بہت کھاتے ہیں، پر، خیبر کا پراٹھا کوئی نہیں کھاتا۔“

یہ بچپن سے اس کی عادت تھی، جب گھر میں ہوتا تو روٹی کا پہلا ٹکڑا تو زکھن میں ڈال کر دیتا تھا۔

”تو سات دلایت گھوم کر بھی وہی کا وہی ہے۔“ ماں کے منہ سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے کہا: ”تو آگیا ہے، سب کچھ پھر سے اسی طرح ہو گیا ہے۔“

گو وہ ”وہ“ نہیں تھی۔ کچھ بھی وہ نہیں تھا، جاتے وقت جو کچھ تھا وہ بدل گیا تھا۔ اس نے باپ کی بات نہیں چھیڑی تھی، صرف اس کے خالی پلنگ کی طرف دیکھا تھا، اور پھر آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ماں کے دن بہ

دن مرجھاتے چہرے کی بات بھی نہیں کی تھی۔ چھوٹے بھائی کی خیر خبر پوچھی تھی، پر یہ نہیں کہا تھا کہ ماں کو اکلیا چھوڑ کر وہ اتنی دور کیوں چلا گیا تھا۔ پر ماں کہے جا رہی تھی۔ ”سب کچھ پھر اسی طرح ہو گیا ہے.....“

اس نے ماں کی مرضی کی کچھ اور باتیں یاد کرنا چاہیں۔ پوچھا: ”بھابھی کیسی ہے؟ تمہیں پسند ہے؟“

ماں نے جواب نہیں دیا۔ صرف سوال کیا، ”میرا خیال تھا ولایت سے کوئی لڑکی.....“ وہ سن کر ہنس پڑا۔

”بولتا کیوں نہیں؟“

”ولایت کی لڑکیاں ولایت میں ہی اچھی لگتی ہیں، سب وہیں چھوڑ آیا ہوں۔“

”میں نے تو پچھلے دنوں کمرے اسی مہینے خالی کر والیے تھے، سوچا، تجھے ضرورت ہوگی۔“

”تو کیا کمرے کرائے پر دیے ہوئے تھے؟“

چھوٹا بھی چلا گیا تھا۔ گھر اتنا خالی تھا، اس لیے پچھلے کمرے چڑھا دیے تھے۔ ذرا ہاتھ بھی کھلا ہو گیا تھا.....“

”تمہیں پیسوں کی کمی تھی؟“ اسے پریشانی سی ہوئی۔

”نہیں، پر۔ ہاتھ میں چار پیسے ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔“

”چھوٹے کی تنخواہ تھوڑی نہیں، وہ.....“

”پر وہ بھی اب فیملی والا ہے، آکل ہی میں اس کے گھر.....“

”اچھا! تو میری ماں، وادی بن جائے گی.....“

اس نے ماں کو ہنسانا چاہا، پر ماں کہہ رہی تھی، ”مجھے تو کوئی حرج نہ ہوتا جو تو ولایت سے کوئی لڑکی.....“

وہ ماں کو ہنسانے کے جتن میں تھا، اس لیے کہنے لگا: ”لانے تو لگا تھا پر یاد آیا کہ تم نے جاب تے وقت پکی کی تھی کہ میں ولایت سے کسی کو ساتھ نہ لاؤں۔“

اسے یاد آیا..... جانے والے دن، وہ لڑکی جب ملنے آئی تھی تو وہ ماں کو اچھی لگی تھی۔ ماں نے دونوں کو اکٹھا دیکھ کر تاکید کی تھی، ”دیکھو کہیں ولایت سے نہ کوئی لے آتا۔ کوئی بھی اپنے دیس کی لڑکی کی ہوڑ نہیں کر سکتی.....“

پر اس وقت ماں کبہر ہی تھی، وہ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ میں نے تیری خوشی کے سچ تھوڑے  
آنا تھا، پیچھے ایک خط میں تجھے لکھا بھی تھا کہ جو تیرا جی چاہتا ہو.....“

”یہ تو میں نے سوچا تم نے ایسے ہی لکھ دیا ہوگا،“ وہ ہنس پڑا اور پھر کہنے لگا۔

”اچھا، جو تم کہو تو اگلی بار لے آؤں گا۔“

”تو کیا تو پھر جائے گا؟“ ماں گھبراہٹ سے گئی۔

”وہ بھی جو تم کہو تو نہیں تو نہیں۔“

اے احساس ہوا کہ اسے آتے ہی جانے کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

آتے وقت اسے ایک یونیورسٹی سے ایک نوکری آفر ہوئی تھی۔ پوری اتنے برسوں بعد ایک بار  
واپس آنا چاہتا تھا، چاہے چند ماہ کے لیے ہی سہی۔

”جو تم کہو گی تو نہیں جاؤں گا۔“ اس نے پھر ایک بار دہرایا۔

ماں کو کچھ تسلی ہو گئی، کہنے لگی۔ ”تو سامنے ہوگا، چولھے میں آگ جلانے کی ہمت تو آجائے گی،

ویسے تو کئی بار چا پائی نہیں اٹھا جاتا۔“

”ماں تم اتنی اداس تھیں، تو چھوٹے کے ساتھ اس کے گھر.....“

”میں یہاں اپنے گھر اچھی ہوں، اب تو آ گیا ہے، مجھے اور کیا چاہیے۔“

اس کو لگا ماں بہت اداس تھی، اور شاید اس کی داسی کی وجہ صرف اس کا اکیلا پن نہیں ہے، کوئی اور وجہ

بھی ہے۔

کھڑکی میں آتی دھوپ کی ٹکیر دیوار پر بڑی شوخ سی دکھائی پڑتی تھی۔

اس نے کھڑکی کے پردے کو سر کا دیا اور اسے غالیچے کا پیلا رنگ ایسے لگا جیسے بے فکر سا ہو کر کمرے

میں سو گیا ہو۔

”تو تھک گیا ہوگا۔ کچھ آرام کر لے۔“ ماں نے کہا اور میز سے رکابیاں اٹھا کر کمرے سے جانے

لگی۔

”نہیں مجھے نیند نہیں آرہی،“ اس نے ہلکا سا جھوٹ بولا اور کہا، ”میں تمہارے لیے کچھ چیزیں لایا

ہوں، مدھیوں پوری آتی ہیں کہ نہیں۔“

اس نے سوٹ کیس کھولا۔ ایک گرم کالی اون کی شال تھی، پروں کی مانند ہلکی۔ ماں کے کندھوں پر ڈال کر کہنے لگا، ”یہ جازے کی چیز ہے۔ پر ایک منٹ اسے اوڑھ کر دکھاؤ، یہ تمہیں بہت سچے گی۔“

پھر اس نے فر کے سلپر نکالے۔ ماں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ ماں کا دھیان بنانے کے لیے اور چیزیں دکھانے لگا۔ پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ڈبیا میں کچھ سکے تھے..... اٹلی کے لیرا، یوگوسلاویہ کے دینار، بلغاریہ کے لیوا، جرمنی کے مارک اور ہنگری و رومانیہ کے بھی تھے..... اس نے سکوں کو کھٹکھٹایا اور کہنے لگا، ”ماں! تم نے کہا تھا نا کہ چھوٹے کے گھر بہت جلد کوئی بچہ.....“

”ہاں، ہاں! کہا تھا۔“ ماں کمرے سے جانے کے لیے ہڑبڑائی۔

”یہ اپنے پیچھے کو دوں گا۔“ اور پھر اس نے سوٹ کیس سے اور چیزیں نکالیں.....

چھوٹے کے لیے یہ کیر اور بھابھی کے لیے.....

ماں روہانسی سی ہو گئی۔

اس کا ہاتھ رک گیا۔ ”ماں! کیا بات ہے، تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔“

ماں چپ رہی۔

اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ماں کو کوئی قصور لگتا تھا۔ پتا نہیں کون؟ اور سوچ سوچ کر اسے اپنا منہ ہی قصور لگنے لگا۔ اس نے

ایک بے بسی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

”ماں، تم کچھ بتلانا چاہتی ہو، پر بتاتی نہیں۔“

”وہ لڑکی.....“

”کون سی لڑکی؟“

”جو تجھے اس دن ملنے آئی تھی، جس نے تجھے ایک سوئیٹر.....“

”ہاں کیا ہوا اس لڑکی کو؟“

”اس نے چھوٹے سے بیاہ کر لیا ہے۔“

ماں کے کندھے پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ کس سامیہ۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا ہاتھ نے کندھے کا

سہارا لیا تھا، پر دوسرے لمبے لگا کہ ہاتھ نے کندھے کو ہٹا دیا تھا۔

اور وہ نہیں پڑا۔ "ساب وہ میری بھابی ہے۔"

ماں اس کے منہ کی اور دیکھنے لگی۔

"مجھے خط لکھنا نہیں لکھا تھا؟"

"کیا لکھتی۔ کیا انہوں نے یہ لکھنے والی بات کی تھی؟"

"چھوٹے نے بھی سرف بہاہ کی خبر دی تھی اور کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"اونوں شرمندہ تھے، تجھے کیا لکھتے۔"

کھلے سوٹ کیس کے پاس جو دوسرا بند سوٹ کیس تھا، اس کا ادور کوٹ اور وہ سویٹر پڑا تھا، جو اس نے

صبح آتے وقت چھین رکھا تھا۔

وہ ایک منت سویٹر کی طرف دیکھتا رہا، سویٹر گچھا سا ہو کر ادور کوٹ کے نیچے دبکا سا نظر آیا۔

☆☆☆☆

امرتا پر تہم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر

## متر

سامنے ایک دروازہ ہے۔ صرف یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں دروازے سے باہر ہوں کہ اندر.....

نہیں اندر ہوں۔ کیونکہ چار ہزار سال سے بھی پرانی انڈو یوگی کا وہ بہاؤ اس کے اندر ہے جس میں بہہ کے میں نے اپنی بیٹی کا نام متر رکھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے چار ہزار سال پہلے میرے دروازے باپ نے زمین کے محافظ دیوتاؤں کا نام متر اور وزن رکھا تھا۔ وزن کا تعلق آسمان کے ساتھ تھا، متر کا زمین سے۔ میری بیٹی کا تعلق زمین کے ساتھ تھا، اسی لیے میں نے اس کا نام متر رکھا۔

متر ابھی یہیں تھی، ابھی پتہ نہیں کہاں چلی گئی..... اسی سامنے کے دروازے سے.....  
او متر! تو کہاں سے آگئی؟ ٹو کہاں چھپی ہوئی تھی؟ میں حیران ہوتا ہوں، اور متر ہنستی ہے، کہتی ہے: ”پاپا میں یہیں تھی، دروازے کے پیچھے.....“

بڑا جب بہت چھوٹی ہوتی تھی اس وقت بھی اسے دروازے کے پیچھے چھپ جانے کی عادت تھی.....

وہ میری گود میں بیٹھ کر پھر پوچھتی ہے ”پاپا! میری ماں اسی طرح کی تھی؟“  
”یہ ہے تیری ماں“ میں اسے ٹیکسلا کے کھنڈروں سے نکلی ہوئی وہ مہر دکھاتا ہوں، جس پر ایک ایسی دیوی کندہ ہے جس کی کوکھ سے کتنے ہی پھول اور پتے اگے ہوئے تھے۔

وہ پوچھتی ہے ”پاپا! میں بھی ماں کے جسم سے ایک پھول کی طرح اُگی تھی؟“  
”ہاں تو“ میں کہتا ہوں، پھر وہ زور سے ہنستی ہے اور پوچھتی ہے ”دیکھو پاپا! میرے بدن سے بھی

پھول جیسی خوشبو آتی ہے کہ نہیں؟“

میں اس کی پیشانی کے پاس اپنا سر لا کر اس کے گھٹنگھریالے بالوں کو سونگھتا ہوں: ”اس کنول سے

گلاب کی خوشبو آتی ہے، اس کنول سے مویجے کی، اس کنول سے.....“

وہ جلدی جلدی پوچھتی ہے: ”اور میرے ہاتھوں سے؟“

میں اس کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں کو سونگھ کر کہتا ہوں ”ان میں سے ہتھیل کے پتوں کی.....“

وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہتھیلیوں کو میرے ہاتھوں سے چھڑا کر خود سونگھتی ہے اور پوچھتی ہے ”پاپا!

میرے ہاتھوں سے تیز پتوں کی خوشبو کیوں نہیں آتی؟ مجھے تیز پتوں کی خوشبو بہت اچھی لگتی ہے۔“

میں ہمیشہ کی طرح کہتا ہوں ”وہ اس لیے کہ انسان نے اس دھرتی پر جو پہلا درخت اگایا تھا، وہ

ہتھیل تھا۔ ہتھیل کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے نا اس لیے۔“

میری اور مترا کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ہم روزانہ یہی باتیں کرتے ہیں، لیکن وہ روزنی لگتی

ہیں۔ مترا اپنی دونوں ہتھیلیاں میرے سر پر رکھ کر پوچھتی ہے ”پاپا! میرے ہاتھوں سے بھی ٹھنڈی چھاؤں آتی

ہے؟“

”ہاں بڑی ٹھنڈی.....“ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

وہ پھر کہتی ہے ”لیکن میرے ہاتھ تو بہت چھوٹے ہیں، ان کی چھاؤں بھی چھوٹی سی ہے۔“

میں کہتا ہوں ”یہ بڑے ہو جائیں گے..... دیکھو! روز بڑے ہو رہے ہیں.....“

پھر اس کے ہاتھ تھام کر جب میں اسے دیکھنے لگتا ہوں..... وہ ہاتھ میرے ہاتھوں سے نکل

جاتے ہیں.....

میرے سر پر سے میرے ہتھیل کے پتوں کی چھاؤں ہٹ جاتی ہے.....

یہ محرومی، یہ ویرانی شاید بدھ کی سادی کے نام اوستھا ہے۔ جس میں چیتنا سمارتکھ۔ تھارتکھ کے

سامنے آکھڑی ہوتی ہے.....

مترا بھی بیس برس کی دو تیزو، میری اس سادھی میں سے میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہے.....

کہتی ہے ”پاپا! اب اسی طرح مجھے دروازے کے پیچھے تلاش مت کرنا، میں جا رہی ہوں.....“

”کہاں؟ کس کے پاس؟ کس کے ساتھ؟“ میرے ہاتھوں کی ٹھریاں کپکپاتی ہیں۔

متر ادھیسے مسکرا دیتی ہے، کہتی ہے ”اسی کے ساتھ، اسی کے پاس جس کے ہاتھوں سے تیز چٹوں کی خوشبو آتی ہے....“

میری آنکھیں بھرا آتی ہیں۔ سوچتا ہوں..... مجھے بیس برس یہ خیال ہی نہ رہا کہ بچی جب جوان ہوتی ہے، اس کے ہاتھ پتیل کے پتے نہیں رہتے۔ ان میں سے تیز چٹوں کی تیکھی خوشبو اٹھتی ہے، اور وہ کسی مرد کے ان ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہے جن سے تیز چٹوں کی تیکھی خوشبو آتی ہو....

میں اسے پیار دینے کے لیے اپنے ہاتھ اٹھاتا ہوں، تو میرے ہاتھوں کے اوپر میرے ٹھنڈے ہاتھوں کے بل پھر کپکپاتے ہیں۔

متر کی ناک میں جڑا ہوا موتی، اس کی تیسری آنکھ کی طرح میری طرف دیکھتا ہے اور اس کے پاؤں کی بازوئیں میرے پاؤں میں کھنک کر کہتی ہیں..... ”اس کی ماں کی طرح اب اس کے جسم میں سے پھول اور پتے اگنے کا وقت آ گیا“

میں متر کے سر پر پیار دینے لگتا ہوں تو میری انگلیاں اس کے بالوں کے چھلوں میں پھنس جاتی ہیں۔

کوئی زور سے دروازے کو ہلاتا ہے، چھت بھی ہلتی ہے۔ پیروں تلے کی زمین بھی۔ متر اوروازے کی طرف دیکھتی ہے، میں اس کے بالوں سے اپنی انگلیاں چھڑاتا ہوں، لیکن وہ چھلوں میں پھنس جاتی ہیں..... ”ان انگلیوں سے میں نے تجھے تھوڑا تھوڑا کر کے پالا تھا....“ میں کہتا ہوں لیکن متر کے کان میری طرف نہیں، دروازے کی طرف ہیں۔

دروازے میں سے ایک تلوار چمکتی ہے، اور میرے ہاتھوں پر چھٹ کر، متر کو میرے ہاتھوں سے چھڑا لیتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں..... میری انگلیاں، متر کے بالوں میں پھنسی ہوئی، میرے ہاتھوں سے جدا ہو کر اسی کے ساتھ چلی گئی ہیں.....

دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ میں دانتوں میں زبان دباکر لو کو پوچھتا، اس غار کی طرف دوڑتا ہوں..... جو چار ہزار سال سے بھی پرانا ہے، اور ابھی مجھے اس کے سوا کوئی پناہ نہیں دے سکتا.....

☆☆☆☆



امرتا پر۔ تم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر

## سفید دھوتی۔۔ زری کا کفن

وہ دونوں ایک مرتبہ اُس وقت بھی ملی تھیں جب وہ زندہ تھیں.....

اس وقت ایک کی عمر بیس سال تھی، دوسری کی چالیس برس۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ جس کی عمر بیس برس تھی، اس نے اس دوسری کی بہو بننے کی ٹھان لی تھی لیکن چالیس برس عمر والی نے اس کی ساس بننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

شادی کی رسم ہوئی تھی لیکن صرف اس کے لیے جس کی عمر بیس سال تھی۔ جس کی عمر چالیس برس تھی اس کے لیے نہیں۔ سو یہ رسم اسے ہمیشہ نظر آتی رہی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن یہ رسم اسے کبھی بھی نہ نظر آئی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی نفی کر دی تھی۔

”تم جیتے جی میرے گھر کی دلہیز پار نہیں کر سکتی“۔ ایک فرمان کی طرح اس نے کہا تھا، جس کی عمر اس وقت چالیس برس تھی۔

”تم مجھے مردہ سمجھ لو، لیکن گھر کی دلہیز پار کر لینے دو“ یہ دہائی اس نے دی تھی جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔

”میں نے جیتے جی تمہارا چہرہ نہیں دیکھا، نہ زندہ کا نہ مری ہوئی کا“ اور اس نے اپنے قدموں کے

قریب ہوئے اس کے ماتھے کو پیروں کے ساتھ پرے کر دیا تھا اور گھر کی دلہیز زور زور سے ہنسنے لگی تھی.....

اس دلہیز کی ہنسی میں..... مشکلوں کی دولت کی ہنسی بھی ملی ہوئی تھی اور ایک خاندان کی ضد کا قہقہہ

بھی۔ یہ قہقہہ اتنا بلند آواز تھا کہ جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی، اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

کانوں سے ہاتھ اٹھا کر اس نے کئی مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا جس کے پیچھے یہ گھر تھا، اور گھر کی

دلہیز تھی۔ لیکن وہ اس وقت بھی چپ تھا، بعد میں بھی چپ رہا۔ صرف دلہیز جو اس وقت بھی ہنستی تھی، بعد میں بھی ہنستی رہی۔

اوپھر یہ دلہیز اور بھی ہنسی..... جب ایک باہر، اس دلہیز سے باہر گئی، اور ایک ڈولی اس دلہیز سے اندر آئی، جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی اور وہ دو ایک سکول کے کوارٹر میں بیٹھ کر اس دلہیز کو دیکھا کرتی تھی۔ اس نے اس کی ہنسی کے ذرے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

وقت تھا..... گزرتا رہا۔ اور پھر جس کی عمر اس وقت چالیس برس تھی، اس کی عمر ساٹھ برس ہو گئی۔ اور جس کی بیس برس تھی، اس کی چالیس برس ہو گئی۔ دلہیز کا قہقہہ بھی شاید بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ اندر کی طرف دیکھتا تو بھی کھانسنے لگ جاتا، باہر کی طرف دیکھتا تو بھی کھانسنے لگ جاتا۔

اور پھر وہ مر گئی جس نے دوسری کو حکم دیا تھا کہ تم میرے جیتے جی اس گھر کی دلہیز نہیں پہلا لگ سکتی۔ اور حکم دینے والی ابھی دلہیز سے اندر تھی، اگرچہ ایک لاش تھی، ارد گرد رشتے داروں کا ہجوم تھا، کیوڑے کی مہک تھی اور ذری کا کفن تھا..... ایک اس کے حکم کی عدولی ہو گئی۔

وہ دلہیز سے اندر آ گئی جسے آنے کا حکم نہیں تھا اور اس کے پاؤں کے پاس کھڑی ہو گئی، جس نے حکم دیا تھا۔ ایک کے ماتھے نے دوسری کے پیروں کو چھوا۔ اور ذری کا کفن گھبرا کر سفید دھوتی کو دیکھنے لگا.....

”یہ کون ہے؟..... خاموش رہو..... یہ بھی اس کی بہو تھی..... کہاں ہوتی تھی.....“  
پتا نہیں..... ”رشتہ داروں اور عزیزوں میں کھسر پھسر ہوئی لیکن ذری کا کفن اب سفید دھوتی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سفید دھوتی ایک پل آئی، دوسرے پل گئی۔ کفن میں جاتی کو بوڑھی دلہیز نے روکا اور پوچھا، ”تم نے اس کا حکم موڑ دیا؟“

”نہیں“ سفید دھوتی نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا تم جیتے جی دلہیز پار نہیں کر سکتی، میں جیتے جی تمہارا چہرہ نہیں دیکھوں گی۔“ میں اس وقت ہی مر گئی تھی، وہ تو آج مری ہے۔ یہ تو ایک لاش دوسری لاش سے ملنے آئی تھی۔

پھر سفید دھوتی دلہیز سے باہر چلی گئی اور کچھ عرصے بعد ذری کا کفن بھی دلہیز سے باہر چلا گیا۔

بوڑھی دلہیز کتنا عرصہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہی.....

## اجنبی اندھیرا

ایک اندھیرا تھا جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی تب سے پہچانتی تھی۔۔۔  
 پیدا ہوئی تو کسی کی آواز نہیں سنی تھی شاید والی کی کہ ”چھوٹی“ آگئی۔ اس سے پہلے گھر میں ایک اور بیٹی تھی۔ اس لیے پیدا انٹی طور پر وہ چھوٹی پیدا ہوئی۔  
 پھر سال سو سال وہ چھوٹی رہی کہ گھر میں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی اور وہ اس لیے ’منجھلی‘ ہو گئی۔۔  
 ماں نہیں بچ سکی اور نہ ہی نئی آنے والی چھوٹی مگر وہ منجھلی ایک اندھیرے میں اسی طرح کھڑی رہی اور اندھیرے کے ساتھ مل گئی۔

اس کا کسی نے نام نہیں رکھا اور وہ اسی طرح بے نام رہی۔۔۔ ”منجھلی“۔ بڑی سسرال کے پاس پر دیس چلی گئی اور باپ ”پرلوک“۔ تو گھر میں کام کاج کرنے والے باپ کے ایک دوست نے اس کو اندھیرے میں ایک راستہ دکھایا جس پر بیدار چلتے چلتے وہ آخراپنی روٹی کمانے والے تعلق تک پہنچ گئی۔  
 روٹی کمانے کا آسرا گاؤں کے چھوٹے سے سکول کی چھوٹی سی نوکری کا تھا۔ اس آسرے کی چھوٹی سی آس میں اس نے پہلی بار اپنا نام ڈھونڈ لیا۔ خود ہی جو اس کے ہاتھ لگا۔ یہ نام وہ جتنی تھا جو اس نے ”وچلی“ کو بدل کر اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ مگر جو ابھی تک اس کے دماغ کو اجنبی لگتا اور کئی بار یہ اس کے دماغ میں آتا ہی نہیں تھا۔۔۔

ایک حادثہ بھی اس اندھیرے میں ہوا۔۔۔ اس کو اس کے باپ کے دوست کے حوالے سے ایک بندے کے ساتھ جوڑ کے سکول میں ایک کہانی چلی جس کی اس بندے نے اپنی نوکری بچانے کے لیے وہ جتنی کو کہا کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ یہ بچ تھا کہ ہاتھ میں پکڑا آسرا چھوٹے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ گئے۔۔۔ مگر اس

بندے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس آسرے کے واسطے تو وہ جتنی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہی اندھیرے کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

بس یہ اندھیرا تھا جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی، پہچانتی تھی۔ مگر آج جب اپنا گاؤں چھوڑ کے اس نے ایک بڑے شہر کی راہ لی تو نشیمن کے پلیٹ فارم پر اترتے ہی اس نے دیکھا سامنے ایک نیا اجنبی اندھیرا ہے۔ بالکل اس شہر کی جگہگ کرتی تیوں کی طرح جو پہلے سے واقف اندھیرے سے بالکل مختلف طرح کا تھا۔۔۔

اور اس نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف ٹولا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا جو اس کے باپ کا دوست تھا اور جو اس کو اس اجنبی شہر میں لے کے آیا تھا اور کہہ رہا تھا، ”بڑے شہروں کی بات کچھ اور ہوتی ہے، وہاں گاؤں کی طرح کوئی کسی پر بات نہیں کرتا۔ تمہیں پہلے سے بھی اچھی نوکری ملے گی۔۔۔ میں ہر ہفتے چھٹی کو تمہارے ساتھ رہوں گا۔۔۔ پھر بس گنتی کے سال رہتے ہیں گزر جائیں گے اور جب میں پنشن لے لوں گا تو تیرے پاس آ کے رہوں گا۔۔۔“

اس آسرے میں معلوم نہیں احسان مندی تھی کہ معلوم نہیں محبت، وہ جتنی سے کچھ بھی جدا نہ ہوا مگر آسرا ضرور تھا۔ وہ جتنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شہر کے اجنبی اندھیرے کو دیکھنے لگی جس میں شہر کی ساری جگہگ کرتی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔۔۔

پھر کوئی چھ مہینے گزر گئے۔۔۔ مگر یہ اجنبی اندھیرا۔۔۔ اسی طرح اس کو اجنبی لگتا تھا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے سرکاری نوکروں کی بستی میں کمرہ کرائے پر لیا۔ سارا دن ڈگری ہاتھ میں لے کر وہ سکولوں کی خاک چھانتی اور پچھلی تنخواہوں سے جمع کیے ہوئے پیسے روزانہ لگ جاتے اور جمع کیے ہوئے پیسے ختم ہونے لگے۔ اور اندھیرا اسی طرح اجنبی ہی رہا۔

اس چہرے سے واقفیت گانٹھنے کے لیے وہ ٹائپ سیکھنے لگی۔ کیا پتہ شاید اس طرح کوئی سکیل بن جائے۔ وہاں اس کے ساتھ ٹائپ سیکھتی لڑکیاں اس کو بتاتی تھیں کہ شہر میں سب سے بڑی ڈگری ”سفارش“ ہوتی ہے اور وہ گھبرا کے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جس میں ایسی کوئی ڈگری نہیں تھی۔۔۔

اس کے ہاتھ میں صرف فن تھا پر نوکری کے لیے جو چاہیے تھا وہ ہنر اس کے پاس نہیں تھا۔ اچانک ایک دن کسی نے آ کے اس کو ڈھونڈ لیا۔ یہ ڈھونڈنے والا ایک مل کا مالک تھا جس نے اس کی طرف دیکھتے ہی اپنے دفتر کے ایک کونے میں پڑی ہوئی ایک میز اور ایک کرسی اس کو دی اور ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔

اس کے اپنے چھوٹے سے آئینے نے اس کو بھی نہیں بتایا کہ وہ ایک کھوئے ہوئے موتی کی طرح خوبصورت ہے اور اگر اس کو دھوپ و پنچہ کرکالی مٹل پر رکھ دیا جائے تو دیکھنے والے کی آنکھ چندھیا جائے گی۔۔۔ مگر یہ بات مل کے مالک کو شاید اس کی اپنی نظر نے بتادی تھی۔۔۔۔

اس کے باپ کا دوست ہر روز تو نہیں مگر ہر دو تین دن بعد ضرور آتا۔ اس نے دہنی کے گاؤں سے واقف ہونے کے باوجود اس سے کوئی رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ مگر مسایوں اور مل کے مالک کے لیے وہ دہنی کا چاچا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ دہنی سوچتی۔ ”ایک عورت اور ایک مرد کا ایک کمرے میں رہنا اور سونا، لوگوں کو صرف بنے بنائے رشتوں کی سمجھ آتی ہے۔“ وہ پہلے گھر سے اور پھر نوکری سے فارغ ہو کر یہاں آ جائے گا“ میرے ساتھ گھر بسائے گا تو پھر اب میں اس کو چاچا کہتی ہوں پھر کیا کہوں گی؟“ پھر وہ اپنے آپ سے پوچھتی ”پھر ہمسائے تبدیل کر لوں گی اور کیا پتہ اس وقت تک نوکری بھی بدل جائے۔ یہ کنسی کی نوکری ہے۔۔۔۔“ اس کے لیے شہر کا اندھیرا ابھی تک اجنبی تھا اور اس لیے مل کا مالک بھی جس نے اس کو شہر میں پہلی نوکری دی تھی اور اس کی ساری مہربانیاں بھی اجنبی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے پانچ نئی سازھیاں ایک گرم کوٹ اور کشمیر کی دو گرم شالیں اس کو خرید کر دی تھیں۔ اور یہ سارے روپے جو اس نے کہے تھے کہ اس کی تنخواہ سے آہستہ آہستہ وصول کرے گا مگر اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ کسی مہینے بھی اس کی تنخواہ نہیں مئی۔ یہ سب دہنی کے لیے اجنبی اندھیرا تھا جو ابھی تک واقف ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھار اسے یوں لگتا کہ یہ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اس میں اس کا اپنا سالوں کا جانا پہچانا چہرہ بھی تھا۔ وہ اپنے بالوں کی چٹیا بنایا کرتی تھی مگر مل کے مالک نے جب اس کو ایک ”بیر ڈریس“ کے پاس بھیجا تو واپسی پر اس کا اپنا چہرہ بھی اس کو اجنبی لگا۔ دفتر میں سارے کام کرنے والے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ سچ جیسے کسی نے ایک موتی کو دھوپ و پنچہ کر کے کالی مٹل پر جمادیا تھا۔۔۔۔

اور پھر یہ ایک انوکھا حادثہ پیش آیا۔ اب وہ ٹاپسٹ کے ساتھ ساتھ سیکرٹری بھی ہو گئی۔ اس لیے مل مالک کی ڈاک بھی اس نے ہی کھولنی ہوتی تھی۔ ایک دن وہ خطوط کھول رہی تھی کہ ایک خط اس کے نام کے ساتھ تھا۔ یہ اس کے باپ کے دوست کا تھا اور مل کے مالک کے نام پر تھا جس میں ایک ہزار روپے دینے پر شکر یہ ادا کیا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی پانچ سو روپے اور بھی مانگے تھے۔

’وچنی‘ کے ماتھے میں ٹیس اُنھی اور اس کے چہرہ پر دوڑ گئی۔ خط کا ایک ایک لفظ کاغذ پر واضح تھا مگر اس کی آنکھوں میں ہر لفظ کانپ گیا۔ پرانے واقف اندھیرے سے ایک سایہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

مل مالک کے سامنے اس کا ایک ہی سوال تھا ’آپ نے ایک ہزار روپیہ اس کو بھیجا اور مجھے بتایا نہیں۔۔۔۔‘

جواب چھوٹا سا تھا، ’اس نے کہا تھا۔۔۔۔ کہ تم کو نہیں بتانا‘ مگر کچھ تھا جو چھوٹے سے جواب سے نکل کر ’وچنی‘ کی عمر کے سالوں تک پھیل گیا۔۔۔۔

اس نے مل مالک سے صرف ایک منت کی کہ آئندہ کبھی وہ اسے بتائے بغیر کسی کو کچھ نہیں بھیجے گا۔ ’’ٹھیک ہے تمہارے لیے دیئے تھے اگر تم نہیں چاہتی تو نہیں دوں گا‘‘ مل مالک نے اقرار کیا مگر ’وچنی‘ سادے سے فقرے ’’تمہارے لیے‘‘ کو سن کر کانپ گئی۔

وہ کسی گرد و پیر کے جنم دن کی چھٹی پر اس کے پاس رہنا تھا۔ کمرے کی ایک چابی وہ ساتھ لے جاتا اور جب دو پہر کی گاڑی آتی تو آ کر پہلے خود کمرہ کھولتا تھا۔

وچنی شام کو چھ بجے کام سے لوٹی تو وہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ پہلی بار وچنی کو احساس ہوا۔۔۔ آج اس نے اپنا نہیں غلطی سے کسی اور کا کمرہ کھول لیا ہے۔۔۔۔۔‘‘

بیر دہلیز پر رک گئے۔

’مجھے پتا تھا‘ تم آنے والی ہوگی‘ دیکھو میں نے تمہارے لیے چائے بنا کے رکھی ہوئی ہے۔۔۔۔‘ اس کی آواز آئی۔ جانی پہچانی پہچانے ہوئے اندھیرے کا حصہ۔ وچنی نے چائے کا پیالہ اس کے ہاتھوں سے لیا اور صبر کے گھونٹ کی طرح پینے لگی۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں ہاتھ آگے بڑھے اور انھوں نے وچنی کی ساڑھی کا پلو کھینچا۔ اس کی انگلیوں کو اسی طرح چھونا چاہیے واقف ہاتھ چھوٹے ہیں۔

’مجھے پہچنے کے بعد بھی میرا لطف چاہتے ہو؟‘ وہ دیوار کی ایک اینٹ کی طرح کمرے میں گونجی اور پھر دیوار کی طرح ڈھس گئی۔

اس نے تیز نظر کے ساتھ اس کو دیکھا پھر کہا ’’اگر میں نکلی محلے والوں کو بلا لوں اور بتاؤں میں تیرا کون

ہوں تو اس محلے میں تو کیا تو کسی محلے میں نہیں رہ سکے گی۔۔۔“ یہ الفاظ ایک ہتھوڑا تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ساری دیوار گر جائے گی۔ مگر وچنی اینٹوں کی دیوار سے پتھر کی دیوار بن گئی اور بولی، ”پہلے تم سے نبڑوں گی“ گلی محلے کا بعد میں سوچوں گی۔۔۔“ اس نے اٹھ کر وچنی کا ہاتھ موڑا اور پھر اپنا لوہے کا پنچہ اس کی گردن میں ڈالا۔ ”یہاں کون سے تیرا؟ جو تمہیں چھڑائے گا۔۔۔“

وچنی کی چیخ خود اس کے کانوں سے ٹکرائی مگر چیخ کی آواز دوسروں نے بھی سن لی اور تھوڑی سی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہاتھ ڈھیلا ہوا تو وہ دروازے تک آئی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ”یہاں کون ہے میرا۔۔۔“ دروازے کے باہر سچ مچ اجنبی اندھیرا تھا۔ وچنی ٹھٹھک کر ٹھہر گئی۔ مگر اس کے پیروں کو شاید اس سے کچھ پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ آگے چل پڑی۔۔۔ گلی کے موڑ والے گھر کی طرف جس میں ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔

اس گھر سے وچنی نے ایک ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی مگر نمبر گھماتے ہوئے وچنی کے ہاتھ کانپ گئے۔ ”یہ اجنبی اندھیرا تھا جس سے ڈر کر ایک دن میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور آج اس کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے میں پھر سے اجنبی اندھیرے سے ایک ہاتھ مانگ رہی ہوں۔۔۔“ وچنی کو محسوس ہوا جیسے اجنبی اندھیرا آج زور سے فیس رہا ہو۔۔۔

وچنی کے کان کا پیٹے رہے ہاتھ کا پیٹے رہے مگر ٹیلی فون کے نمبر نہیں کا پنے۔ دوسری جانب مل مالک کی آواز پوچھ رہی تھی۔۔۔ ”کون وچنی۔۔۔ تم گھبرائی ہوئی ہو؟ کس کے پاس؟ اسی کے پاس؟ اور آواز نے کہا ”میں ابھی آتا ہوں۔۔۔“

منٹوں میں وہ وہاں پہنچ گیا۔ ایک اجنبی اندھیرے کا ہاتھ اور اس وچنی کا ہاتھ اس سے چھڑا دیا۔ اس کے واقف اندھیرے سے۔ مگر اس رات جب وچنی کمرے میں اکیلی بیٹھی تو اس نے سوچا، ”اب آگے؟۔۔۔ اس اجنبی اندھیرے کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے کس کو آواز دوں گی؟ تو اس کا اپنا ہاتھ اس کی بھری آنکھوں کے سامنے پھیل گیا“ معلوم نہیں اس اپنے ہاتھ کا آسرا مجھے کب ملے گا۔۔۔۔۔ کب؟۔۔۔ کب؟“

☆☆☆☆



## ”مُر کی“ عرف بلا کی

”بالی عرف کو کے والی“

کمار جب صبح کالج گیا تھا تو کمار کی ماں راجوٹی ”مُر کی“ کی کونھری میں بیمار مُر کی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں تو پچھلے بیٹے جب مُر کی بیمار پڑی تو راجوٹی اپنے ہاتھوں سے اسے دوا پلاتی رہی پر آج اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے کل ہی ایک طرح سے جواب دے دیا تھا اور وہ پچھلی رات سے مُر کی کے پاس سے نہیں اٹھی تھی۔ کمار جب کالج سے واپس آیا تو اس نے ماں سے کہا کہ اگر تمہیں کسی اور پر یقین نہیں تو کم از کم مجھ پر تو کرو تم دو گھنٹی آرام کر لو میں ”مُر کی“ کے پاس بیٹھتا ہوں۔ راجوٹی نے ”کمار“ کا کہنا مان لیا اور ”مُر کی“ کے کمرے سے باہر آ گئی۔ مشکل سے گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اس نے کمار کو اٹھا دیا اور پھر خود ”مُر کی“ کے پاس بیٹھ گئی۔

”مُر کی“ ہوش میں نہیں تھی۔ راجوٹی نے اسے ایک دوسرے بلایا اور کوئی بات کہہ کر کیے! دیکھو یہ کمار آیا ہے۔۔۔؟“ ”مُر کی“ عرف بلا کی کی حالت ایسی تھی کہ کچھ دیکھ یا سن سکے۔

پھر اس کی سانسیں اکھڑنے لگ گئیں۔ کئی بار راجوٹی کی آنکھیں پھر گئیں لیکن فوراً ہی اس نے اپنی چادر کے پلو سے پونچھ لیں وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کے رونے کی آواز ”مُر کی“ کے کانوں میں نہ پڑ جائے اور پھر کچھ ہی دیر بعد راجوٹی چلا چلا کر رونے لگ گئی۔ اب ”مُر کی“ کے کانوں میں کوئی آواز نہیں پڑ سکتی تھی۔

”بی بی! اب آپ آرام کریں۔ آپ نے جتنی ”مُر کی“ کی خدمت کی ہے نا اتنی تو کوئی اپنوں کی نہیں کرتا۔۔۔ ہم خود اسے غسل شسل دے لیں گی“ محلے کی دو تین عورتوں نے آ کر کہا۔ یہ عورتیں لوگوں کے



گھروں میں برتن دھوتی تھیں۔ راجونتی نے ان عورتوں کو چھوٹے موٹے کام سونپ دیے اور خود ”مر کی“ کو نہلانے لگ گئی۔

وہ جب ”مر کی“ کے کپڑے اتارنے لگی تو کمر پر شلوار کی جگہ پر اس کے ہاتھ کو کوئی چیز چبھی۔ ”مر کی“ کے سینے میں ایک جالی ٹنگی ہوئی تھی۔ کتنے دنوں سے ”مر کی“ بیمار تھی۔۔۔ کئی دنوں سے اس کے کپڑے تبدیل نہیں ہو سکے تھے۔۔۔ سینے میں ٹنگی ہوئی چابی اب اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ راجونتی نے جب چابی کو کھینچ کر اتار تو وہاں چابی کی شکل کا گہرا زخم بن چکا تھا۔۔۔ راجونتی کی چیخیں نکل گئیں۔

”مر کی“ کو جب لوگ۔۔۔۔ میں جدا کر لوٹے، کمار نے ماں کو پٹنگ پر لیٹے لیٹے چائے کے دو گھونٹ پلانے کی کوشش کی۔

”آج میرے حلق سے کچھ نہیں اتر رہا ہے کمار“

ماں صرف تمہیں ہی ”مر کی“ سے پیار نہیں تھا۔ مجھے بھی اس سے بڑا پیار تھا۔ چھوٹے ہوتے ہوئے مجھے یہی کھلاتی تھی۔ اور بڑی ہوئی تو میرے لیے کھانا پکانا کرتی رہی۔

پر صرف یہی بات نہیں!

”ہم سے جو ہو سکا۔ کیا اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا پر۔۔۔۔“

”عورت کی جون کا ٹنا بڑا مشکل ہوتا ہے کمار! میں ”مر کی“ کو نہیں روتی میں عورت کی جون کو روتی

ہوتی۔۔۔ جاٹو سو جا“

کمار کچھ نہیں بولا اور ماں کے پٹنگ پر بیٹھا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ماں کے سر کو دباتے دباتے ماں کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گیا۔

ماں! آج میں تمہارے ساتھ سوؤں گا۔

”ابھی بھی تو چھوٹا ہی ہے“ ماں نے پیار سے کمار کے گالوں پر چپٹ لگائی اور پھر اس کی آنکھوں کے گرد کتنے ہی منظر اتر آئے ”ایسے ہی تو چھوٹے ہوتے ہوئے ”مر کی“ کی چار پائی پر لیٹ کر ضد کیا کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گا۔“

”کمار نے لاڈ سے اپنا سر ماں کے قریب کر دیا“

میں 32'33 برس کی تھی جب تو پیدا ہوا۔۔۔ میں سوچا کرتی تھی کہ شاید میں اس دنیا سے یونہی گزر

جاؤں گی۔ اپنی جھولی پھیلا پھیلا کر میں رب سے تجھے مانگا کرتی تھی۔ یہ عورت ہونے کی جون بھی بڑی عجیب ہے۔۔۔ اگر اس کی گود میں بچے نہ کھیلے تو بھی زندگی خراب۔۔۔ تم پیدا ہوئے میری زندگی تو سنور گئی۔۔۔ پر ”مرکی“ کی بیماری۔۔۔ اس کے مرد نے اسے چھوڑ دیا اور اس کی جون بگڑ گئی۔

ماں! ”مرکی“ کی کب شادی ہوئی تھی؟ میں نے تو کبھی اس کے مرد کو نہیں دیکھا؟“ لیٹا ہوا اکمارا چانک سے اٹھ کے بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں ”مرکی“ کو یہاں ہی دیکھا ہے اپنے گھر اس پھیلی کوٹھڑی میں۔“

”ہوئی تھی اس نمائی کی شادی تو چھوٹا تھا اس وقت چار سالوں کا شاید پانچ کا!

تو کیا وہ اپنے سرال گئی تھی؟“

”سرال خاک تھے نہ کوئی پیدا کرنے والا نہ کوئی جلانے والا“

”ماں مجھے ساری بات بتاؤ“

”اس کا باپ ہمارے گھر کا پرانا نوکر تھا جب تیری پیدائش ہوئی تو اس نے منت سماجت کی کہ اس کی بیوی گاؤں میں مر گئی ہے اور بیٹی اس کے چچاؤں کے پاس اکیلی رہ گئی ہے۔۔۔ اور اگر میں مان جاؤں تو وہ اپنی بیٹی کو یہاں لے آئے۔۔۔ وہ تجھے کھائے گی خدمت کرے گی بس اس کو دو وقت کی روٹی مل جائے صلے میں یہی بہت ہے۔

”پھر؟“

میں نے تو شکر کیا کہ چلو کوئی ہاتھ بٹانے والا مل جائے گا۔۔۔ وہ گاؤں سے اپنی بیٹی کو لے آیا۔۔۔ مشکل سے اس کی عمر بارہ سال ہوگی۔ بڑی نازک اور چھوٹی موٹی سی مجھے بہت اچھی لگی۔ جب یہ آئی اس نے کالی شلوار اور ہرے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جسم کمزور تھا پر رنگ چٹا سفید اور نین نقش بڑے پیارے تھے۔۔۔ کانوں میں اس نے چاندی کی بالیاں پہنی ہوئی تھیں اور ناک میں چھوٹی سا کوکا۔۔۔

”پھر؟“ کمارے نے بے چینی سے پوچھا۔

”تمہیں تو وہ شاید اپنے ہاتھوں سے نہیں اپنی جان سے کھلاتی تھی۔ تم اس وقت اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ کبھی تم اس کے کانوں کی بالیوں کو پکڑ کر کھینچتے اور کبھی تمہارا ہاتھ اس کے گود کے میں پڑ جاتا۔ میں پیار سے کبھی اس کو بالیوں والی کے نام سے پکارتی کبھی کو کے والی۔“

ماں اسے "ترکی" اور نطا کی کے نام تم نے ہی دیئے تھے؟  
 "ہاں" میں نے ہی اس کے یہ نام رکھے تھے۔۔۔ پر یاد نہیں کب رکھے تھے۔  
 "کیوں؟"

وہ جب بڑی ہوئی سترہ برس کی تو نمائی کو بڑا روپ چڑھا۔۔۔۔ میں دانتوں تلے زبان دبا کر کہا کرتی  
 "ہائے نمائیے مرن کیئے۔۔۔۔ کس کے کانوں میں پڑے گی ٹو؟  
 اور کس کے ناک میں کوکے کی طرح چمکے گی۔  
 کمار مسکرایا۔

"بڑے سوہنے پہاڑی گیت گاتی تھی پگلی۔۔۔ اڑتے پرندے بھی رُک جاتے تھے۔  
 پھر ا

اس کے باپ نے اپنے گاؤں میں اس کا سودا کر دیا۔  
 ان کے ہاں بیٹیوں کی جگہ رقم ملا کرتی تھی۔  
 لڑکا اچھا تھا؟

"اچھا کیونکر تھا۔۔۔۔ دوسرا جو تھا۔"

"دوسرا" کیا مطلب ماں؟

جس کی پہلی بیوی مر گئی ہو

پھر تو ماں عمر میں بڑا ہوگا؟

بڑا بھی تھا۔۔۔ ساتھ اس میں کچھ اور بھی تھا۔۔۔ شاید آنکھوں میں کوئی کسر تھی۔۔۔ مجھے اب صحیح طرح  
 سے یاد نہیں۔۔۔۔ پر تھا پیسے والا۔ تبھی تو اس نے خوب قیمت لگائی تھی۔  
 پھر؟

باپ نے جب سات چکی کر دی۔ یہ راتوں رات شہر کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔۔۔۔  
 وہ کون تھا؟

میں نے دیکھا تو نہیں پر خود ہی بتاتی تھی کہ بڑا چھبلا لڑکا تھا"  
 "ہمارے اس شہر کا ہوگا؟"

”اسی شہر کا اسی بستی کا صدر بازار میں جو ہوٹل ہے ناں وہاں کام کرتا تھا۔۔۔ ایک بنانا تھا وہاں پھر؟

چار چھ مہینے اس کے ساتھ کسی شہر میں رہی۔۔۔ بنگلے نے گھر بنایا جو کچھ پاس تھا سب لگا دیا۔۔۔ بڑے موٹے موٹے چاندی کے کڑے تھے۔۔۔ گلے میں چاندی کی زنجیر تھی۔۔۔ تیری سالگرہ پر میں نے اس کو سونے کی ایک انگوٹھی بنا کر دی تھی ایک مرتبہ بالیاں بھی دی تھیں۔۔۔ نمائی نے سب کچھ بیچ کر گھر کے لیے چیزیں خرید لیں

اور پھر؟

”پھر کوئی اور لڑکی اس لڑکے کی نظروں میں بس گئی۔۔۔ وہ اسے کسی گاؤں دوسرے کا میلاد کھانے کے لیے لے گیا اور رات کو ہوٹل میں جب یہ سوئی ہوئی تھی اس کے دوپٹے سے گھر کی چابی کھول کر اسے دیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کمار نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر استفہامیہ انداز میں پوچھا ”اس نے اپنے مرد کو ڈھونڈا نہیں؟“ کہتی تھی کہ من کے سودے میں جب اس کا من ہی نوٹ گیا تو پھر تن کو کیا ڈھونڈنا؟

”کمال عورت تھی“

یہ بات اس نے اچھی کی۔۔۔ کسی خدا ترس بندے سے گھر کا کرایہ لے کر واپس لوٹ آئی ورنہ آج کہاں خوار ہو رہی ہوتی۔ یہاں ہمارے گھر آگئی؟

ہاں یہاں ہمارے گھر۔۔۔ ہمارے گھر کہاں اپنے گھر۔۔۔ اپنی اس کوٹھڑی میں۔۔۔ میں نے جس دن اسے کوٹھڑی دی تھی۔ اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں نے جیتے جی کبھی اسے کام سے نہیں نکالنا اور نہ ہی میرا بیٹا کمار بڑا ہو کر اسے اس کوٹھڑی سے نکالے گا۔

کمار کا دل بھر آیا۔۔۔ پر وہ مرد تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں کا پانی آنکھوں ہی میں رہا۔۔۔ راجوئی کی آنکھیں چھلک گئیں۔

”میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ عورت کی جون سچے نہیں کیسی ہوتی ہے۔

جب یہ یہاں آئی تھی اس کا منہ ایک ایسے پھڑے کی طرح تھا جو اپنا گھر بھول گیا ہو۔۔۔ جسے کسی عورت کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو۔۔۔

”ماں تم بہت اچھی ہو۔۔۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو۔۔۔۔“

میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا کمار۔۔۔ اس کی خدمت کا پھل چکایا ہے۔۔۔ کھلی کے روپ کو دیکھ کر میں کہا کرتی تھی کہ ”مر کیے! کس کے کانوں میں پڑے گی تو؟ جب ”مر کی“ واپس آئی کہنے لگی ”ماں! مجھے کسی نے کانوں میں ڈالا تھا پر پھر اس کے کان پھٹ گئے شاید میرا وزن کچھ زیادہ تھا۔“

راجوئی پھر رو پڑی۔۔۔ بھری ہوئی آواز میں کہنے لگی۔۔۔ ایسا پیار کرتے ہیں مرد؟ ایک ”مر کی“ اتاری ایک پٹنی۔

کمار کی آنکھیں بھر آئیں شاید مرد ذات کی لاج رکھنے کے لیے ماں بھی تم نے اس بار میری سانگرہ پر مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ”مر کی“ کو اس کے جیتے جی اس کوٹھڑی سے نہیں نکالوں گا؟

”ہاں کمار! تبھی میں نے تم سے وعدہ لیا تھا۔ اس کے مرد نے جب اس سے اس کے گھر کی چابیاں اس کے پلو سے کھول لی تھیں۔۔۔ میں نے اس کوٹھڑی کی چابیاں اسے دے کر کہا تھا کہ تیرے جیتے جی کبھی کوئی تم سے یہ چابیاں نہیں چھینے گا۔“

اور کمار۔۔۔۔ جب میں نے اسے غسل دیا تو اس کوٹھڑی کی چابی اس کے سینے کے ساتھ سندھی ہوئی تھی۔۔۔۔ بالکل اس کے گوشت میں چبکی ہوئی۔۔۔ اس چابی نے اس کے جسم میں زخم کر دیا تھا۔

جیتے جی اس نے اس چابی کو اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کیا

”مر کی“۔۔۔ بنا کی۔۔۔ ایک عورت

راجوئی ایسے روئی جیسے اس کی آنکھوں میں ”مر کی“ کے آنسو نہیں ر کے ہوئے تھے نہیں بلکہ تمام عورت

ذات کے آنسو!



## ترشول

سنیل کی ماں نے سنیل کی شادی کے لیے خطوں کی صورت میں جتنے بھی پیغام آئے اور جن پانچ خطوں کے ساتھ پانچ لڑکیوں کی تصویریں بھی آئی تھیں وہ سب کچھ سنیل کے سامنے رکھ دیا۔ پھر جب سنیل نے سرسری نظر سے وہ سارے خط اور تصویریں دیکھ لیں تو ماں نے بڑے ارمان سے سنیل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سنیل اسی طرح خالی خالی نظروں سے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ جس طرح وہ خطوں اور تصویروں کو دیکھنے سے پہلے سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

ماں نے ان تصویروں والی لڑکیوں میں سے ایک کو دل میں پسند کر لیا تھا مگر وہ سنیل کی پسند کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے اتنی دیر پچ رہی۔ پر جب سنیل نے کسی کے لیے کوئی رائے نہیں دی تو ماں نے اپنی پسند کی لڑکی کی تصویر باقی تصویروں سے الگ کر کے سنیل کے سامنے رکھ دی۔

سنیل نے تصویر کی بجائے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔ "ماں میں اپنی ذات برادری کی پابندیاں جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کسی کے ماں باپ مجھے ذاتی طور پر اپنی بیٹی سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پر میری ایک شرط ہے کہ میں کسی بھی لڑکی کے لیے ہاں کرنے سے پہلے اس کے ساتھ بات چیت کرتا چاہتا ہوں۔ سو جس لڑکی کے ماں باپ میری شرط مان لیں میں صرف اسی کے بارے میں سوچ سکتا ہوں وہ چاہے اس تصویر والی لڑکی ہو۔۔۔ چاہے کوئی اور!

کچھ دنوں بعد ماں نے اپنی پسند کی لڑکی کے والدین کو سنیل کی اس شرط پر راضی کر لیا۔ شرط مانی گئی تھی پر شرط منوا کر ماں خوش نہیں تھی کیوں کہ دوسری طرف شرط سے نہیں مگر ایک عہد یہ دیا گیا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ اور اگر سنیل کو یہ رشتہ منظور ہوا تو کسی قسم کا جہیز نہیں دیا جائے گا۔ اور ماں جس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے بیٹے

کی شادی اس لڑکی سے ہو اسی پر۔۔۔۔۔

(میں سنیل کی آنکھیں جو پورے دو سالوں سے اپنے کمرے کی دیواروں کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔۔۔۔۔ جیسے دیواروں پر اب کوئی سایہ سا پلٹے لگ پڑا تھا۔)

پھر آخر کار ملاقات کا وقت آ گیا۔ لڑکی والوں کے گھر میں پچھلی طرف ایک کچا کوٹھا تھا۔۔۔ ناریل کے درختوں میں چھپا ہوا۔۔۔ جس کی برادری کی آنکھوں سے بچ کر صفائی ستھرائی کر دی گئی تھی۔

اس کچے کوٹھے کی دیواروں میں تھوڑا اونچا کر کے ایک لکڑی کا تختہ چنا ہوا تھا شاید گھر کا کچھ کاٹھ کباڑ یہاں رکھا جاتا تھا۔۔۔ اسے دھو دھا کر لڑکی کے بیٹھنے کے قابل بنادیا گیا تھا۔۔۔ سنیل کے بیٹھنے کے لیے ایک لکڑی کی کرسی کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

سنیل جانتا تھا کہ اس وقت اسے گھر کے صدر دروازے سے خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔ اسے چھوڑے سے جانا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے ملاقات کرنی تھی۔۔۔ ملاقات کے وقت اسے اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ وہ اپنی ماں سے اس لڑکی کا نام پوچھنا بھول گیا تھا۔۔۔

پھر جب لکڑی کے تختے کے پاس اپنے آپ میں مٹی ایک لڑکی نے غصے کہنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ جوزے تو اچھوٹو اگر سنیل کے منہ سے نکلا۔۔۔ بیٹھے محترمہ آپ کا جو بھی نام ہے۔۔۔۔۔

لڑکی نے ایک نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا پر سنیل کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ کرسی کی طرف اس نو بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے مٹی سنائی سی دیوار کے پاس تختے پر بیٹھ گئی۔

خاموشی کا یہ اصرار لڑکی نے نہیں توڑا تھا اس لیے جب خاموشی کچھ طویل ہو گئی تو اس نے ایک نظر بھر کر سنیل کی طرف دیکھا اور حیران ہوئی کہ وہ ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ آج صبح ماں نے رتھیں پٹی والی دھوتی اسے خاص طور پر پہنائی تھی۔۔۔ کیسر کے ڈٹنے سے اسے نہانے کے لیے کہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل بھی خاص طور پر لگوا دیا تھا اور ہاتھوں میں کالنج کی چوڑیاں بھی۔۔۔۔۔

اور اسے بھی خبر تھی کہ آج اس کے حسن کو پرکھا جائے گا۔۔۔ لیکن وہ حیران ہوئی کہ شادی کا فیصلہ کرنے والا جو خاص طور پر ملاقات کی شرط رکھ کر آیا تھا ایک نظر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

سنیل کرسی پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے ہی خیالوں کی دھند میں لپٹا ہوا ہو۔۔۔ اور جیسے سورج کی دھوپ اچانک گہری دھند کو چیرا رہی ہے سنیل کی آواز اچانک چمک پڑی "میں کوئی

شیو جی نہیں پر ایک ترشول ہے جو ساری عمر میرے ہاتھ میں رہے گا۔

لڑکی گھبراگئی اور سنیل کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔

سنیل بھی اس وقت اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔۔۔۔۔ جسے بھی میرے ساتھ عمر گزارنی ہے اسے میرے سنگ یہ ترشول بھی اٹھانا پڑے گا۔ بس میں یہی بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے ملنے کی شرط رکھی تھی۔  
لڑکی اپنے ہی جسم میں سمنی ہوئی تھی پر اسے یوں لگا جیسے اس کا انگ انگ گھٹ رہا ہے۔  
وہ سنیل کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

وہ کہنے لگا۔ ”جیسے کسی پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ارد گرد کے نشیب اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی میں جب بچپن سے گزر کر جوانی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے دائیں ہاتھیں گہرے نشیب ہوں۔۔۔ جو روز اور گہرے ہوتے جاتے ہوں میں روز خواب میں ڈرتا کہ ابھی کسی پہاڑ کے پتھر سے میرا پاؤں پھسلے گا اور میں ایک گہرے نشیب میں گر جاؤں گا۔

ایم اے کر رہا تھا جب گھر میں ماں نے میری شادی کی بات چلا دی پہنچے اس بات میں کیا راز تھا کہ مجھے روز رات کے وقت خوف سا آنے لگا۔ مجھے آئے دن خواب آنے لگے کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میں میری بیوی میرے ساتھ پہاڑ پر چڑھ رہی ہے اور میں اچانک سوچتا ہوں کہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گہرائی میں پھینک دوں یا ایسے لگتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دوں گا۔

سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں پڑا کا جل گہرے سیاہ بادلوں کی طرح اس کی آنکھوں میں پھیل گیا ہو۔

لیکن سنیل کا دھیان لڑکی کی طرف نہیں تھا۔۔۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہے جا رہا تھا۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے اتنا خوف آنے لگ گیا کہ میں گھبرا کر پہلے ایک ماہر نفسیات کے پاس چلا گیا۔۔۔ پھر ایک درگاہ پر جہاں ایک دن ایک مسلمان فقیر نے مجھے بتایا کہ تم پر کسی روح کی پکڑ ہے۔ اسی نے بتایا کہ یہ تمہاری سوتیلی ماں کی بھنگی ہوئی روح ہے جو تمہارے باپ سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کسی کا گھر آباد نہیں ہو سکے گا۔۔۔۔

اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے باپ کی کوئی پہلی بیوی بھی تھی جسے اس نے چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات پہلی مرتبہ مجھے اس مسلمان فقیر نے بتائی۔۔۔ وہ عورت اور اس کے بچے کہاں ہیں؟۔۔۔ میرے باپ



نے مجھے پتہ نہیں بتایا تھا۔۔۔ میں نے اس درگاہ پر پھر اسی فقیر کو ڈھونڈنا چاہا پر وہ مجھے نہیں ملا۔ کسی نے ایک بار۔۔۔ پنڈت کے بارے میں بتایا میں اس کے پاس گیا پر اس نے صرف اتنا کہا کہ تمہاری سوتیلی ماں اب زندہ نہیں رہی ہوگی۔ تبھی وہ بھگتی روح بن کر تمہیں پریشان کر رہی ہے۔۔۔ اس کا موت کے وقت ودھی ووت کر یا کریم نہیں ہوا۔۔۔ اسی لیے اس کی روح بھٹک رہی ہے۔ تم ہر دوارے جا کر اس کے نام کی ودھی ووت کر یا کریم کرو۔

میں نے گھر میں یہ بات ماں سے کی نہ باپ کو کچھ بتایا۔ البتہ ہر دوار جا کر اس کے نام پر دان بہن بھی کیا۔ کر یا کریم بھی، مگر میری حالت میں فرق نہیں پڑا۔ البتہ کچھ دن پہلے میرے نام ایک چٹھی آئی جو میری سوتیلی بہن نے لکھی تھی کہ اب ماں بھی نہیں رہی۔۔۔ بھائی پہلے ہی مر چکا ہے۔۔۔۔ میں اکیلی ہوں اور اب تیرے سوا میرا کوئی بھائی نہیں آخر میں تیری بہن ہوں تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتے؟۔۔۔۔

اسی پنڈت جس نے کر یا کریم کی صلاح دی تھی نے کہا کہ تیری بہن کا یہ چٹھی ضرور اس کر یا کریم کا اثر ہے تیری سوتیلی ماں کی بھگتی روح نے اب خود اپنی بیٹی کو صلاح دی ہوگی کہ تمہیں چٹھی لکھے۔ ورنہ آج تک تمہیں کسی نے چٹھی کیوں نہیں لکھی۔۔۔۔

میں اپنے ماں باپ سے چوری اس خط پر لکھے پتے پر سے اپنی بہن کو ڈھونڈ لیا۔ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر بڑا روئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنی ماں کی موت کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر گئی تھی مگر باپ نے اسے آسرا نہیں دیا۔ اور میری ماں نے صبح سے آئی ہوئی میری بہن کو صرف کھانا کھلایا اور دوپہر کو کہہ دیا کہ اب وہ جا سکتی ہے۔

میری یہ بہن مجھ سے عمر میں کافی بڑی ہے۔۔۔ جیسے تیے کر کے اس کے غریب ماموں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ اس کا خاوند اچھا آدمی ہے۔ اس کو صرف ایک ڈکھ تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اس کا حال نہیں پوچھا اور پھر ایک خواب جو بار بار اسے آتا جس میں وہ اپنے مرے ہوئے چھوٹے بھائی کی صورت دیکھتی۔۔۔۔۔ یہی وہ بات تھی جس پر ایک دن مجبور ہو کر اس نے مجھے چٹھی لکھ دی۔

سنیل جب یہ سب کچھ بتا رہا تھا اس کے سامنے لکڑی کے تختے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو یوں لگا کہ اس کی آنکھوں کا کا جل جو کبرے سیاہ بادل کے جیسے اس کی آنکھوں میں بچیل گیا تھا۔ اب ان بادلوں کے بیچ سے کچھ روشنی پھونکنے لگ گئی تھی۔ وہ تختے سے سرک کر آگے سنیل کی کرسی کے کچھ نزدیک آ گئی تھی۔

سنیل کہہ رہا تھا۔۔۔ مجھے اس دن کا تو پتہ نہیں جب میری یہ بہن اپنے نوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے  
 ہمارے گھر آئی تھی۔۔۔ ہمارے نہیں اپنے گھر آئی تھی۔۔۔

اب میرا رشتہ صرف میری اس بہن کے ساتھ ہے اور کسی کے ساتھ نہیں میں اب بھی اپنے ماں باپ کے  
 گھر رہتا ہوں مگر میں یہ رسم اب زیادہ دیر تک نہیں بھاسکتا۔۔۔ انہیں بالکل خبر نہیں کہ دفتر کی چھٹیوں میں  
 میں جب باہر جاتا ہوں تو کدھر جاتا ہوں۔۔۔ میں اپنی بہن کے ہاں جا کر کئی کئی دن رہتا ہوں۔۔۔ میری  
 تنخواہ کا کچھ حصہ میری بہن کے ہاں جاتا ہے۔۔۔ وہ بڑی غریب ہے۔۔۔ لیکن شکھی ہے۔

سنیل کے سامنے جینھی ہوئی لڑکی کے ارد گرد جو ریکیلی پنی والی دھوتی تھی۔۔۔ لڑکی کو لگا کہ اس پنی کے دو  
 رنگ ساری دھوتی پر پھلتے جا رہے ہوں۔

اسے لگا۔۔۔ نجانے یہ سنیل کے من کے اس راز کا اثر تھا جو اس نے آج تک اپنے سینے ماں باپ کو بھی  
 نہیں بتایا تھا اور آج اچانک اس اجنبی لڑکی کے ساتھ راز بانٹنے آ گیا تھا۔۔۔ یا اُن آنکھوں کا اثر تھا جو اس  
 سے سیدھی لڑکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

سنیل کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ یہی ترشول ہے۔ درگاہ والے فقیر کے مطابق میری بھینٹ بے چینی اس  
 لیے ہے کہ مجھے ایک بھگتی ہوئی روح کی چڑ ہو گئی تھی میری اس بہن کے کہنے کے مطابق یہ اس کے مرے  
 ہوئے بھائی کی روح تھی۔۔۔ جس نے میری صورت میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ میرے مطابق یہ میرے باپ کا  
 گناہ ہے۔ جس نے پچھتاوے کی صورت میں اس کے گھر دوبارہ جنم لے لیا ہے۔

سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اچانک تختے سے اٹھ کر سنیل کے چہرے اور سر جھکا کر اس کے سامنے  
 مڑی ہوئی۔ اس کے منہ سے بہت مدہم آواز میں اعتماد سے یہ الفاظ نکلے "میں یہ ترشول اٹھا سکتی ہوں۔۔۔"

سنیل نجانے کتنی دیر چپ چاپ اس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ پھر کہنے لگا۔۔۔ ہم دونوں ا  
 میں ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھ سکا۔

یہ انام پارتی ہے۔۔۔ لڑکی میٹھا سا ہنس کر بولی۔۔۔ آج تک کچھ اور نام تھا پر آج سے مہر انام  
 پارتی ہے۔



## پنجر

1935ء میں

دن سرمئی تھا، بوری کا ایک ٹکڑا پاؤں تلے دبائے پورو مٹر نکال رہی تھی، انگلیوں میں پکڑی ہوئی پھلی کا منہ کھول کر جب اس نے دانوں کو مٹھی میں سرکانا چاہا تو ایک سفید سنڈی اس کے انگوٹھے سے چپک گئی جیسے کسی کا پاؤں کیچڑ سے بھرے گڑھے میں جا پڑے، پورو کو کراہت ہوئی، اس نے ہاتھ جھٹک کر سنڈی کو دور پھینکتے ہوئے اپنے ہاتھ دونوں گھٹنوں کے بیچ دبالیے۔ بھری پھلیاں، نکالے ہوئے دانے اور خالی جھٹکے پورو کے سامنے بکھرے پڑے رہے۔ جڑے گھٹنوں سے ہاتھ نکال کر اس نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ پورو کو محسوس ہوا، سر سے پاؤں تک اس کا بدن منروں کی اس پھلی جیسا تھا، جس کے اندر پھلیوں کے صاف دانوں کے بجائے ایک غلیظ سنڈی پرورش پا رہی تھی۔ پورو کو اپنے پورے جسم سے کراہت آئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے پیٹ میں پلنے والی سنڈی کو کراوے، اپنے بدن سے دور کر دے، اس طرح جیسے کوئی چبے ہوئے کانٹے کو ناخنوں میں پھنسا کر نکال دیتا ہے، جیسے کوئی چنے ہوئے بھاکھڑے اتار پھینکتا ہے، جس طرح کوئی چمٹی ہوئی چیچڑی کو اکھاڑ دیتا ہے، جیسے کوئی چمکی ہوئی جو تک کو کھینچ کر پھینک دیتا ہے.....

پورو نے سامنے دیوار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

پورو ضلع گجرات کے چھوٹی گاؤں کے شاہوں کی بیٹی تھی۔ شاہ، دیر ہوئی شاہ نہیں رہے تھے، مگر پھر بھی وہ شاہ کہلاتے رہے۔ دنوں کے پھیر سے شاہوں کے اس گھر کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کے دیچھوں اور دلنویوں جیسے بڑے بڑے برتن بھی بک گئے تھے۔ وہ برتن بھی جن پر ان کے پرکھوں کے نام کنداں تھے۔

بدنامی کے ڈر سے بچ کر پورو کا والد اور چچا اپنا گاؤں چھوڑ کر سیام چلے گئے تھے۔ جہاں جانے سے ان کے دن جلد ہی پھر گئے۔ پورو اس وقت دوڑتی پھرتی تھی اور اس کی ماں کی گود میں ایک لڑکا تھا۔ اجڑے ہوئے شاہوں کا کنبہ دوبارہ اپنے گاؤں آیا۔ پورو کے والد نے اپنا گروی رکھا ہوا مکان چھڑوایا اور اپنے بزرگوں کے نام کی انج رکھی۔ بلاشبہ اس کے والد کو ایک نیا مکان بنانے کے لئے اس سے کم میسے صرف کرنے پڑتے، مگر اس نے اندھا دھند لگائے گئے سود کا بھی خیال نہ کیا اور ایک بار دانتوں تلے زبان دے کر اپنے پرکھوں کا بھرم رکھا۔

اناج، فصلیں اور باقی گھر کا چھوٹا بڑا سامان سمیٹ کر وہ پھر سیام چلے گئے، مگر اب ان کا مکان، ان کا نام گاؤں میں زندہ رہا۔ اس کے بعد جب وہ اپنے گاؤں واپس آئے، اس وقت پورو پورے چودہ برس کی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا، اس سے چھوٹی اس کی اوپر تلے تین بہنیں تھیں اور اس مرتبہ اس کی ماں کو چھٹی بار کسی بچے کی امید تھی۔ شاہوں کے اس خاندان نے گاؤں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ ساتھ والے گاؤں رتوال کے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں لڑکا دیکھا۔ اس کی ماں سوچ رہی تھی جب وہ سوتک سے فارغ ہوگی تو بڑے چاؤ سے اپنی بیٹی کے لئے جیون ساتھی ڈھونڈے گی۔ اس مرتبہ وہ اچھی طرح سوچ کر آئے تھے کہ اس فرض سے ضرور سبکدوش ہو کر سیام واپس آئیں گے۔

پورو کے ہونے والے سسرال کے گھرانے میں تین دودھ دینے والی بھینسیں اور گاؤں میں ان کا اکلوتا مکان تھا جس پر کئی اینٹوں کی مٹی بنی ہوئی تھی۔ گھر کے صدر دروازے پر انہوں نے ”اوم“ لکھوایا تھا۔ لڑکا خوبصورت، عقلمند اور سمجھدار نظر آتا تھا۔

پورو کے باپ نے پانچ روپے اور گڑ کی روٹی دے کر لڑکا روک لیا تھا۔ ان دنوں گجرات کے ضلع میں بدلے کی شادی کا رواج تھا۔ جس لڑکے سے پورو کی منگنی ہوئی اس کے بدلے میں اس لڑکے کی بہن کی منگنی پورو کے بھائی سے ہوئی۔ حالانکہ پورو کا بھائی اس وقت صرف بارہ برس کا تھا اور اس کی منگیتر بہت ہی چھوٹی۔

دو سال بعد اوپر تلے تین لڑکیوں کی پیدائش سے پورو کی ماں تھک چکی تھی اور اب جب کہ ان کے دن بھی پھر گئے تھے، گھر میں کھانے کو سب کچھ تھا، ضرورت کی ہر چیز میسر تھی، اس کا دل کرتا کہ وہ پھر ایک بیٹے کو جنم دے۔

اس مرتبہ ماں نے گاؤں آ کر دوسرا کام یہ کیا کہ بدھ ماتا کی پوجا کروائی۔ گاؤں کی کچھ عورتوں نے

پورو کے صحن میں ٹوہر کی ایک ٹڑیا بٹائی، سرخ دوپٹے کو کنارہ لگا کر اس ٹڑیا کے سر پر دیا، دو ماشے سونے کی چھوٹی سی تختہ بنا کر ٹڑیا کے ناک میں ڈالی اور سب نے مل کر گایا:

بدھ ماتا زسی آویں تے منی جاویں

بدھ ماتا زسی آویں تے منی جاویں

(بدھ ماتا! روٹھی ہوئی آؤ اور ہم سے خوش ہو کر جاؤ)

ان کے ہاں بھی اور ان کے نزدیک گاؤں کی عورتوں کو بھی یہ یقین تھا کہ ہر بچے کی پیدائش پر بدھ ماتا خود آتی ہے۔ اگر تو بدھ ماتا اپنے خاوند کے ساتھ ہستی کھیاتی آتی ہے تو آکر پلک جھپکتے لڑکی بنا کر چلی جاتی ہے کیونکہ اس کو اپنے خاوند کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے لیکن جب بدھ ماتا اپنے خاوند سے روٹھ کر آتی ہے تو اس کو واپس جانے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی، آکر دیر تک بیٹھتی ہے اور آرام سے لڑکا بنا دیتی ہے۔ لہذا عورتوں نے پھر کا نام شروع کیا۔

بدھ ماتا زسی آویں تے منی جاویں

بدھ ماتا زسی آویں تے منی جاویں

بدھ ماتا شاید نہیں قریب ہی سے سن رہی تھی، اس نے ان کا کہا مان لیا۔ چند دھوئیں سولہویں دن کے بعد پورو کی ماں کے ہاں لڑکا ہوا۔ شاہوں کے قریبی اور دروازے کے رشتہ داروں کی طرف سے مبارکبادیں ملنے لگیں۔ فکر کی بس ایک ہی بات تھی کہ لڑکا تین لڑکیوں کے بعد ہوا تھا چونکہ تین بہنوں کے بعد یہ بھائی پیدا ہوا تھا اس لئے پورو کی ماں کو بہت فکر تھی کہ جیسے بھی ہو لڑکا زندہ رہے۔ اگر زندہ رہے تو اپنے والدین پر بوجھ نہ بنے۔ بدھ ماتا کو مٹانے والی عورتیں ایک بار پھر اکٹھی ہوئیں اور کانسی کے بڑے تھال کو درمیان سے توڑ کر لڑکے کو بچ سے دونوں طرف گزارا، ساتھ ہی گاتیں رہیں۔

ترکھلاں دی دھارا آئی

ترکھلاں دی دھارا آئی

(تین دن بعد بھینس نے دو دھ دیا)

تین بیٹیوں کی یلغار کے بعد جنے لڑکے کے سارے شلن سکون سے منا کر انہیں یقین ہو گیا کہ لڑکا

بچ جائے گا۔

پندرہویں سال کی اٹھان سے پورو کے بدن کا ایک ایک انگ جھومنے لگا تھا۔ پچھلے سال کی ساری قمیضیں اسے تنگ ہو چکی تھیں۔ قریبی منڈی سے اس نے پھولوں والی تھمٹ کے نئے کپڑے سلوائے۔ اوزھنیوں کو ابرق سے سجایا۔

پورو کی ساری سہیلیوں نے اس کو دور سے اس کا منگیترا رام چند دکھا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کا عکس ہو رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔

وہ باہر جانے سے جھجھکتی تھی۔ ساتھ کے گاؤں والوں کا اس کے گاؤں آنا جانا بہت تھا۔ اس بات سے وہ بہت خوف کھاتی تھی کہ اس کے سسرالی گاؤں والے اس کو دیکھ لیں گے۔ مگر اب اس گاؤں میں بھی ایک سے زیادہ مسلک کے لوگ تھے۔ جیسے ہی دن ڈھلتا پورو اور اس کی سہیلیاں کھیتوں میں گھوم آتیں۔ کئی بار وہ اپنے کھیتوں کے قریب سے گزرنے والی کچی سڑک کے پاس میدان میں رک جاتیں۔ ان میں سے کبھی کوئی ساگ توڑنے بیٹھ جاتی، کبھی کسی بیری کے پاس جا کھڑی ہوتی، پیرگراتی اور چنتی اور سہیلیوں کو باتوں میں لگائے رکھتی۔ وہ سڑک اس کے ہونے والے سسرال کو جاتی تھی۔

دل ہی دل میں وہ سوچتی کہ شاید اس کے منگیترا کا دہاں سے گزر ہو۔ وہ گزرتے ہوئے کو ایک بار دیکھ لے۔ اس کے دل کی دھڑکن اس سڑک کے کنارے تیز ہو جاتی۔ پھر ساری ساری رات اپنے گھر و منگیترا کے خوابوں میں کھوئی رہتی۔

ایک دن پورو کی جوتی اُسے ایڑی کے قریب سے زیادہ تنگ کر رہی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی پیچھے رہ جاتی تھی۔ وہ اور اس کی سہیلیاں کھیتوں سے ہو کر واپس گھروں کو آ رہی تھیں۔ شام کا اندھیرا اچھلے ہوئے شیشے کی طرح پھیل گیا تھا۔ کھیتوں کی پلڈنڈیوں پر چلتی ہوئی لڑکیاں گاؤں کے راستے پر تھیں۔ کبھی پورو چوڑی پلڈنڈی اور خالی زمین سے بلا جھجھک گزرتی اور کبھی کچھ درختوں، پھلوں اور جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاخیں پکڑ پکڑ کر آگے گزرتی تھی۔ تمام لڑکیاں ایک قطار میں آگے پیچھے راستے پر چل رہی تھیں، پورو کچھ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ دائیں پاؤں کی ایڑی کے قریب ایک بڑا سا چھالا ابھرا آیا تھا۔ اس نے تنگ جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

لڑکیاں پورو سے کہتی تھیں کہ اس کا داہنا پاؤں بائیں کی نسبت بھاری تھا۔ اس کے دائیں پاؤں کو جوتا کاٹنا۔ اس طرح اس کا دایاں ہاتھ بھی بائیں کی نسبت بھاری تھا۔ ”دیکھنا چوڑا چڑھتا ہے ہوئے معلوم

بڑے کا "اے لڑکیاں چھپرتی تھیں۔ اسے خیال گزرا جیسے ہاتھی دانت سے بنی سرخ چوڑیاں اس کی ہانہوں میں پہنائی جا رہی ہیں، کچھلی کھلی کھلی چوڑیاں چڑھانے کے بعد اگلی چھوٹی چوڑیاں اُس کے دائیں ہاتھ میں پھنس گئی ہیں، مانی نے اس کے انگوٹھے کی ہڈی کو تیل ملنے کے بعد زور آزمائی کی ہے اور ہاتھی دانت کی سرخ چوڑی اس کے بازو میں چڑھانے لگا ہے۔ پورو کو خیال آیا کہ اگر اس کی ہاتھی دانت والی سرخ چوڑی اس کے دائیں ہاتھ میں نوٹ جائے تو؟ اس خیال سے اس کے کلیجے کو دھچکا سا لگا۔ "ہائے ایہ کتنا برا شگون ہے" اس کے شہن کی چوڑی، اس کے بہاگ کی چوڑی کیوں اس کے بازو میں نوٹے۔ پورو نے اپنے دائیں بازو کو حقارت سے دیکھا۔ پر ماتما کر۔ اس کا منگیتر، ہمیشہ جیسے، کئی لاکھ برس زندہ رہے۔ پورو کو یاد آیا کہ ان کے گاؤں میں چوڑیاں چڑھاتے ہوئے ایک لڑکی کی چوڑی واقعی نوٹ گئی تھی اور پاس کھڑی عورتیں "رام رام" کہہ کر پر ماتما سے اس کے شوہر کی خیریت کی دعا کرنے لگی تھیں۔ پھر سنار سے مہینے سونے کی تار اس ٹوٹی ہوئی چوڑی میں پرو کر پھر اس بڑی کو چوڑی چڑھائی گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے اس کے شوہر کی ٹوٹی سانسیں پھر سے جوڑ دی تھیں۔

پورو انہی بڑے شگونوں کی ڈور میں الجھی ہوئی تھی کہ ہائیں جانب کے ہینپل کی اوٹ سے ایک آدمی نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پورو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے فوراً دیکھا۔ ان کے گاؤں کا جوان لڑکا رشید اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رشید کے کو شاید بائیسواں سال ہو گا۔ اس کی بھر پور جوانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

پورو نے دیکھا رشید نے کی دونوں آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ وہ کانپ کر رہ گئی، اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ رشید کے پہلو بچا کر دوڑ پڑی۔

وہ بھاگتی بھاگتی لڑکیوں کے ساتھ جا ملی۔ اب وہ اپنے گھروں کی چوکھٹوں کے پاس پہنچ گئی تھیں اور پورو کا سانس بحال نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ رشید نے اس کو زبان سے کچھ نہ کہا۔

"ارے لڑکا تھا کہ ہر شیر" سہیلیوں نے اس سے مذاق کیا مگر پورو کی ابھی تک جان میں جان نہیں آ رہی تھی۔

"ارے بچی! شیر تو صرف پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کچھ کسی اکیلی عورت کو مل جائے تو اسے مارتا نہیں، اٹھا لیتا ہے۔ اپنی گھٹا میں لے جا کر اسے اپنی بیوی بنالیتا ہے۔" سہیلیوں میں سے ایک نے



بات کی۔

ایک مرتبہ پھر پورو کی جان مٹھی میں آگئی۔ ہائے اس بد بخت کا کیا حال ہو گا جس کو کچھ اپنی بیوی بنا لے۔ یہ سوچ کر اس کا رنگ اڑنے لگا۔ اس کو پھر رشید سے کی پھیلی پھیلی آنکھیں یاد آئیں۔  
اب پورو اپنے گھر پہنچ گئی تھی، سہیلیاں ہنستی کھیلتی آگے چلی گئیں۔

اس بات کے دوسرے دن جب وہ اور اس کی سکھیاں کھیتوں میں موگرے توڑ رہی تھیں، وہ جلدی سے کچھ موگرے چلتے کنوئیں سے دھولائی۔ چھوٹے موگروں کی ڈنڈیاں توڑ کر اس نے تین چار موگرے اپنے منہ میں ڈال لئے اور اچانک اُس نے دیکھا کہ نزدیک کے درخت کے پاس رشید اکھڑا ہوا تھا۔  
پورو کی ٹانگوں سے جیسے جان کسی نے کھینچ لی ہو۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

”سوہنے ڈرتے کیوں ہو؟ ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔“ آج رشید ابول پڑا تھا۔ رشید سے کہہ کر اسے پر شرارت نظر آ رہی تھی۔

پورو کو ایسے لگا جیسے ابھی رشید اچھ جیسے چوڑے پنچے لئے اس کی طرف لپکے گا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں رچھ کے ناخنوں کی طرح اس کی گردن کے گرد پھیل جائیں گی پھر وہ اس کو گھسٹتا ہوا لے جائے گا اور پھر..... اور پھر.....

نصیب اچھے تھے اس نے دیکھا، دو کی (کھیتوں میں کام کرنے والے) سامنے سے آرہے تھے۔  
رشید ایسے ہی اکھڑا رہا۔ وہ لال ٹٹاروں سے بھری ہوئی کیاری کو پھلانگ کر تیز تیز ڈگ بھرتی اپنی سہیلیوں سے جا ملی۔

اس دن وہ بہت نڈھال تھی۔ سارا راستہ لڑکیوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر چلتی رہی۔ سائے سے بھی کانپ جاتی۔ معمولی آہٹ سے لرز اٹھتی۔

اس نے ندی ماں کو کچھ بتایا اور نہ ہی باپ کو۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں بھلا یہ کوئی ایسی بات ہے جو والدین سے کی جائے! جوان لڑکیوں کو راہ چلتے لوگ دیکھتے اور جھانکتے ہی آئے ہیں۔ زبانی کلامی کبھی وہ ان کے غلام بن جاتے، کبھی خود کو ان کے ملازم گردانتے اور اول قول بولتے ہی رجتے ہیں۔ بولتے جاتیں، بھونکتے رہیں، بھلا کوئی کتوں کے بھونکنے سے ڈر کر سڑکوں پر چلنا چھوڑ دیتا ہے؟

اس دن ان کے گاؤں میں ایک چھ سات سال کے لڑکے کو ایک پاگل کتے نے کاٹ کھایا۔ محلے کی



عورتوں نے مل کر لڑکے کے زخم پر سرخ مرچیں باندھیں۔ مریچوں کی کڑواہٹ سے کتے کے دانتوں کا زہر ختم ہو جاتا تھا۔ پورو نے یہ خیر سنی۔ فوراً اسے خیال آیا کہ وہ سرخ مرچیں کوٹ کر رشید سے کی آنکھوں میں بھر دے۔ رشید سے کی آنکھوں کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ زہر آلود ہو جاتی۔

سہیلیاں اس کے بازو کھینچتیں مگر اس کو حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ کھیتوں کو جائے۔

اب اس کی شادی نزدیک آرہی تھی۔ اس کے والد نے بھی اور میدہ اکٹھا کر کے گھر رکھ لیا تھا۔ اس کی ماں نے بھرے ہوئے باغوں کی پہلی لکڑی سے صندوق بھر لیا تھا۔ سیام سے واپسی پر سامان اوپر بچے ٹھونس کر اس نے جہیز والا سفید ٹرک توڑ دیا تھا۔ دوپٹوں پر گوئے کناری کی جہیں لگاتے لگاتے اس کی پوری جواب دے گئی تھیں۔ اندرونی کمرہ چمک رہا تھا۔ جس میں اس نے پورو کے جہیز کے لئے پیتل کے پورے اکبادون برتن اکٹھے کر لئے تھے۔ ان دنوں دیہاتوں میں کروڑیے کا کام بہت مشہور تھا۔ پورو نے کروڑیے کی نکلیاں جوڑ جوڑ کر پٹنگ کی چادر بنائی تھی۔ دوسوت کے تانے بانے گن گن کر چار خانوں والے پھول بنانا سیکھے تھے اور اپنے ہاتھوں سے جہیز کیلئے ڈالو اور موڑھے بنائے تھے۔

پورو نے بان کے چھونے سے سچھے سے دیکھی کو صاف کیا، پھر دو بار پانی سے ساگ کو دھو کر اس میں چنے کی دال ڈالی اور دیکھی کو منہ تک بھر دیا۔ مٹی کے بنے چولھے پر دودھ ہلکی آنچ میں کڑھ رہا تھا۔ اس نے لکڑی کے دو چار ٹکڑے چولھے میں ڈالے اور ساگ اوپر رکھ دیا۔

اس کی شادی اب بالکل نزدیک تھی۔ اس کی ماں کو انتظار تھا کہ ہو سکتا ہے آج کل میں اس کے سسرال سے کوئی کپڑوں کا ناپ ہی نہ لینے آجائے۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ وہ کتنی تلخڑ بیٹی ہے۔ کھانا تو وہ محسن میں گھومتے پھرتے ہی بنا لیتی تھی۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ اس کو جوانی بھی طوفانی آئی ہے۔ اس کے سفید دودھیا چہرے پر آنکھیں نہیں نبھرتی تھیں۔ اس کی ماں نے لالچ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اس سوچ میں تھی کہ پورو اب سسرال چلی جائے گی اور اس کا میکا بھانسیں بھانسیں کرے گا۔ وہ اپنی ماں کا دایاں بازو دھکی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہر بیٹی کی ماں کو رونا پڑتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کی ماں نے گانا شروع کر دیا

اویں تے اویں نہ کلیجے دے نال مائے

دیں تے دیں اک بات نی

باتاں تے لیاں نی دھیاں کیوں جھیاں نی

اے جھوڑے والی رات نی

(ماں! آج مجھے کیلجے سے لگاؤ نا! اور مجھے ایک بات سمجھاؤ، بیٹی! ہاتھیں تو بہت لمبی ہیں مگر خدا

جانے بیشیاں کیوں دنیا میں آتی ہیں، مختصر یہ کہ آج ہمارے بچھڑنے کی رات ہے)

اس کی ماں کا دل خون کے آنسو روئے لگا۔ پورو رسوئی کے چھوٹے چھوٹے کام سیٹے ہوئے اپنی

ماں کی آواز سن رہی تھی۔ اس کو بچھڑ جانے کا خوف ہوا۔ اس کی ماں نے پھر گانا شروع کیا۔

چہ کھا جو ڈھنی آں میں چھو پے جو پانی آں میں

پڑیاں تے والے میرے کھیں نی

پتراں نوں دتے اچے محل تے ماڑیاں

دھیاں نوں دتا پردیس نی

(جب میں چہ خدے لے کر بیٹھتی ہوں اور سوت کی اٹیوں کا ڈھیر لگاتی ہوں اور اُن سے جو کھیں

بنے ہیں، صرف وہ میرا جہیز ہیں، ماں! تو بیٹوں کو محل اور کھلیاں دیتی ہے اور بیٹیوں کیلئے

تیرے پاس سوائے پردیس کے کچھ بھی نہیں!)

وہ بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کے گھٹنوں سے لگ گئی۔ ماں بیٹی دونوں رو پڑیں۔ ہر بیٹی کی جوانی اس کو

اپنی ماں سے جدا کر دیتی ہے۔

ماں نے دل بڑا کرتے ہوئے بیٹی کی پشت پر پیار کیا۔ سہ پہر کا منگیا اندھیرا ان کے صحن میں اتر آیا

تھا۔ ماں کو یاد آیا کہ آج دوسرے وقت کے پکانے کے لئے کچھ نہیں شاید پورو کے سسرال سے ہی کوئی نہ

آجائے۔

پورو کو اس کی ماں نے کہا کہ وہ چھوٹی بہن کو ساتھ لے جائے اور قریبی کھیتوں سے کچھ بھنڈیاں ہی

توڑ لائے۔ پھر ماں نے بھایا کہ گڑ کی بھیلی ڈال کر تھوڑے سے پیٹھے چاول بھی پکالے۔

پورو کا دل آج انجانے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لیا اور باہر

چل پڑی۔

اس نے بھنڈیاں توڑیں، دو چار مونگرے توڑے اور اٹے پاؤں چھوٹی بہن کو ساتھ لیکر گھر کو واپس

مڑی۔ جاتے ہوئے اسے صرف یہ خیال ہی آتا رہا کہ وہ اب اپنی ماں سے جدا ہو جائے گی، اپنی بہنوں سے  
 یکجہز جائے گی۔ اپنے نو جوانوں بھائی سے دور چلی جائے گی۔ لیکن آتے ہوئے اس کو جیسے کوئی دھچکا لگتا ہے۔  
 ایک خیال آیا۔ اری جانے والی! ہو سکتا ہے یہاں رشید ابھی مل جائے۔

اس نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ ”پورو دوڑ کیوں رہی ہو؟“ اس کی چھوٹی بہن کو  
 سانس چڑھ گیا تھا۔

پورو کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی ایک گھوڑی آئی۔ وہ ابھی گلڈنڈی سے ایک طرف بھی نہیں ہوئی تھی  
 کہ نہ جانے گھوڑی تھی کہ گھوڑی کا سوار پورو کے دائیں کندھے سے آگیا۔ پورو جیسے بالکل ہی گرنے لگی تھی کہ  
 اس کو کسی نے کندھے سے کھینچ کر گھوڑی پر ڈال لیا، اس کی چیخیں اڑتی ہوئی گھوڑی کے ساتھ لحد بہ لحد دور ہوتی  
 چلی گئیں۔ اس کی چھوٹی بہن کا پتی ہی رہ گئی۔

معلوم نہیں وہ گھوڑی کہاں سے آئی تھی، پتہ نہیں اس کا سوار کون تھا، نامعلوم گھوڑی کتنی دیر بھاگتی  
 رہی۔ پورو بے ہوش ہو گئی۔ اس کو جب ہوش آیا، وہ چار دیواری اور بند دروازے والے ایک مکان میں  
 چار پائی کے اوپر تھی۔

اس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے دیواروں سے ماتھا ٹکرایا، اس نے دروازے سے ماتھا ٹکرایا۔

تھک ہار کر وہ چار پائی پر گر گئی، پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس کو جب ہوش آئی، کوئی اس کے سر میں گرم گھی سے ماش کر رہا تھا۔ اس کو ایک بار تو خیال آیا شاید

اس کی ماں اس کے سر ہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کو سخت بخار تھا۔

”اماں جی!“ اس کے منہ سے نکلا۔

”میرا کیا معاف کرو اور ایک بار ہوش کر پورو!“ کسی نے سر ہانے کی طرف سے کہا۔

بخار میں جلتی ہوئی پورو نے سر اٹھا کر دیکھا، رشید اس کے سر ہانے بیٹھا تھا۔ پورو کی ایک چیخ نکلی

اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔

اس نے دیکھا کالے بالوں والا ایک ریچھ اس کے بالوں میں اپنے پنجے پھیر رہا تھا۔ وہ ایک گھبراہٹ

میں قید تھی۔ وہ سنبھلتی جا رہی تھی۔ ریچھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ریچھ نے اپنے بالوں سے بھری ہاتھوں میں اسے لپیٹ

لیا۔

اس نے آنکھیں پھانز پھاڑ کر دیکھا، کوئی اس کے پاؤں کے تلوؤں کی مساج کر رہا تھا۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پکڑے۔ پھر کسی نے پانی کے چلو اس کے منہ میں ڈالے۔

رہنچہ کی گیسوا کہ رشیدے کا گھر؟ پورو کا سر چکرار ہا تھا، پھر شاید وہ سوئی۔

اس کو اپنی ماں، اپنا گاؤں سب کچھ یاد تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس گیسوا میں پڑے پڑے کئی سال ہو گئے تھے۔ رشیدے کی شکل دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی۔ نہ رشیدے نے اس کو کبھی کچھ کہا تھا نہ اس نے رشیدے کو بلایا تھا۔ سوئی ہوئی کے منہ میں رشیدہ گرم کئے ہوئے لڑ اور گھی کے چھج ڈالتا۔ کبھی کچھ اس کے معدے میں اتر جاتا، کبھی وہ تھوک دیتی تھی۔

پھر اس نے حوصلہ کر کے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے پاس“ رشیدہ چار پائی کے سامنے لکڑی کے ایک چوکے پر بیٹھا تھا۔ رشیدے کا چہرہ نیچے تھا، آج رشیدے کی پھٹی پھٹی آنکھیں پورو کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھیں۔

”تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟“ پورو کو پوچھنے کا حوصلہ ہوا۔

”پھر کبھی بتاؤں گا“ رشیدے نے اتنا کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ گرم سم پورو چار پائی پر لیٹی رہی۔

اب کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پورو نے دیکھا باہر ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ دالان کے ساتھ ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور پھر باہر کا دروازہ۔

وہ کانپتے کانپتے ابھی، اس نے چاروں طرف دیواروں کو دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ ابھی کوئی دیواروں کے نیچے سے نکل آئے گا، اس کو بازوؤں سے پکڑ کر چار پائی پر پھینک دے گا، لیکن دیواروں سے کوئی نہ نکلا۔ پورو باہر والے دالان میں آگئی۔

دالان کے ایک کونے میں چو لھے پر بٹھی ہوئی آگ تھی۔ پاس ایک ہانڈی، تو اور پر ات بجھرے ہوئے تھے۔ پانی سے بھری گاگر کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کانپتے پیروں سے برآمدے میں آئی۔ باہر والے دروازے کے پاس آئی پھر پیچھے مڑ کر کوٹھڑی کی طرف دیکھا، پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن مکان کا دروازہ پورو کی قسمت کی طرح بند تھا۔ پورو نے بند دروازے سے سر جوڑا، لیکن

دروازے کو پورو کے گرے ہوئے سر پر ترس آیا نہ اوندھے پڑے ہوئے چہرے پر، نہ بیٹگی ہوئی آنکھوں پر۔  
 پلو سے منہ پونچھ کر وہ دروازے سے واپس آئی۔ گاگر سے پانی کا ایک چلو بھر کر آنکھوں پر ڈالا۔ پھر  
 اس کو خیال آیا کہ وہ دروازے کو کھٹکھٹا کر دیکھے، شاید کوئی پڑوسی یا راہ گیر اس کی آواز سن لے۔

اس نے دالان کی کچی اور اونچی دیواروں کی طرف دیکھا پھر ایک بار پورے زور سے دروازہ  
 کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازے کے سوراخوں میں سے دیکھا۔ باہر کھلا سا میدان تھا، کوئی مکان، جھونپڑی نظر نہیں  
 آرہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر بے بس ہو گئی، وہ نامعلوم کس جنگل میں تھی.....

پورو دروازے کے پاس کھڑی تھی، باہر سے دروازہ کھلا۔ رشیدے نے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا،  
 پھر تالا لگا دیا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

”پورو یونہی کیوں ہوا سے سر فکراتی ہے، اندر چل اور کچھ کھا لے، تو نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔“  
 رشیدے نے کھڑے کھڑے کہا۔ نہ تو پورو کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، نہ ہی اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

”مجھ پر ترس کھا رشیدے مجھے گھر چھوڑ آ!“ پورو اس کے پیروں پر گر پڑی۔

آج رشیدے نے پورو کو اپنے مضبوط جوان بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”میرے من کی آگ کو کون بجھائے گا؟“

رشیدے نے ہاتھ پاؤں چلاتی پورو کو اپنی ہانہوں میں پکڑے رکھا۔

وہ دن بھی گزر گیا، وہ رات بھی گزر گئی۔ پھر رشیدے نے اس کو کچھ نہ کہا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا،

رشید اویسے ہی اس کے پہرے پر تھا۔

رشید اس گھر سے باہر جاتا، گھنٹا دو گھنٹے باہر ہی گزار آتا۔ پورو قید رہتی۔ پھر صبح و شام کے گھر سے

اندھیروں میں رشید پورو کا ہاتھ پکڑ کر اس کو گھر سے باہر لے جانے لگا۔ پورو نے دیکھا اس کے علاوہ اس پاس

کے اس میدان میں کوئی گھر نہیں تھا۔ رشیدے کے اس مکان کے ارد گرد دور دور تک پھیلا ہوا ایک باغ تھا۔ یہ

گھر شاید باغ کے مالیوں کا گھر تھا۔ باغ میں مالی ہونگے، لیکن پورو نے نہ ان کو سنا اور نہ ہی کبھی دیکھا تھا۔ نہ

پورو کے دن گزرتے، نہ پورو کی راتیں ختم ہوتیں۔ پورو صرف یہی شکر کرتی تھی کہ رشیدے نے اس کو کبھی کوئی

بری بھلی نہیں کہی تھی۔ اس کی عزت ابھی تک محفوظ تھی۔ یہ اور بات کہ اس پر نہ اس کی ختیں اثر کرتیں، نہ ہی اس

کی گالیاں۔

پورو کے اپنے خیال کے مطابق اسے قید ہوئے پورے پندرہ دن ہو گئے تھے۔

ایک دن رشید نے رشیم کا ایک سرخ جوڑا پورو کے سامنے لا کر رکھا۔ اس سے پہلے بھی رشید سوت کے جوڑے اس کے پہننے کے لئے لایا تھا، لیکن اس مرتبہ رشید نے لال رشیم کا جوڑا اس پر رکھتے ہوئے کہا ”صبح نہادھو کر تیار ہو جانا، مولوی آکر ہمارا نکاح پڑھا دے گا۔“

پورو کا دل دھک سے رہ گیا۔ جابد بخت! ”جواب تک نہیں ہوا، وہ ہو کر رہے گا۔“

اس دن وہ پھر رشید کے پاؤں پر گر پڑی۔

”پورو ہونا ہونا کچھ نہیں! یونہی میرے سرگنا ہوں کا بوجھ مت بڑھا۔ قسم ہے اللہ پاک کی، مجھ سے تیرا رونا دیکھا نہیں جاتا۔“ رشید نے منہ پھیر کر کہا۔

پورو کو سمجھ نہ آئی کہ اگر رشید اتنا ہی مہربان تھا تو اس نے اس کے سر پر اتنا قبر کیوں ڈھایا۔

”تجھے اپنے اللہ کی قسم ہے رشید یا، مجھے سچ بتا تو نے مجھ سے ایسا کیوں کیا؟“

”پورو تیرا میرا رشتہ ہمارے پرکھوں کے لینے دینے کا نتیجہ ہیں۔ اب تجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا، میں تجھے ساری عمر دکھی نہیں ہونے دوں گا۔“

پورو حیران تھی، پریشان تھی، یہ کیسا بندہ ہے۔ ”پورو! ہمارے شیخوں کے گھرانے اور تمہارے شاہوں کے گھرانے میں ہمارے دادا کے وقت سے ایک بیر چلا آ رہا ہے۔ تیرے دادا نے پانچ سو کے عوض گروہی رکھے ہمارے مکان پر سودور سودو لگائے تھے اور پھر نیلامی کروا کر شیخوں کے گھرانے کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں، اس کے منشیوں اور کارندوں نے ہمارے گھر کی عورتوں کو برا بھلا کہا اور میرے دادا کی بڑی بیٹی کو زبردستی تیرے دادا کے بڑے بیٹے نے تین راتیں اپنے گھر رکھا۔ تیرے دادا کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا، لیکن شیخوں کا گھرانہ اس وقت بیٹے میں آئے گئے کی طرح شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ سب خون کے آنسو پی کر رہ گئے، لیکن میرے دادا نے اپنے بیٹوں کو قرآن پر قسمیں اٹھوائیں تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ اس سے اگلی پود کے وقت یہ چنگاری دہلی رہی۔ اب جب کہ تیری شادی اسی گاؤں میں ہونے لگی، میرے دادا کے بیٹوں کے خون میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے مجھ سے قسمیں اٹھوائیں، میرے خون کو لٹکارا اور مجھ سے قول لیا کہ تم شاہوں کی بیٹی کو شادی سے پہلے پہلے کسی بھی دن اٹھا لو گے۔“ رشید اچپ ہو گیا۔ ایک میری محبت کا جوش، دوسرا میری حمایت میں سارا شیخ گھرانہ، میں تجھے لے آیا ہوں، لیکن مجھ سے قسم لے لے،

مجھ سے تیرا کھ نہیں دیکھا جاتا۔" رشید نے بھر کہا۔

پورو نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ "تیری پھوپھی کو میرے تایا نے اغٹا لیا۔ لیکن رشید یا! اس میں میرا کیا قصور؟ بائے میں کہیں لی نہ رہی!" پورو کا چہرہ آنسوؤں سے بھیک گیا۔

"یہی بات تو میں کہتا تھا لیکن میرے چچا جتنے لعنت ملامت کرتے تھے۔"

"تو رشید یا تو نے ان کے بہکاوے میں آ کر مجھے مار دیا؟" پورو روتی روتی کہہ گئی۔

"پورو! تمام عمر تیرے آگے دنیا بھر کی نعمتوں کے ڈیسر لگا کر رکھوں گا۔" یہ کہتے ہوئے رشید نے کا

گھا بھرا آیا تھا۔ "میں تیرے تائے کی طرح نہیں کروں گا کہ بیوی کی طرح رکھی عورت کو تین راتوں کے بعد دھکا دے دوں۔"

"رشید یا مجھے ایک بار اپنی ماں سے ملا دے۔" پورو کو کہنے کے لئے بس یہی سوچا۔

"نیک بخت! اب اس گھر میں تیری جگہ نہیں۔ شاہوں کی برادری کا کون ہندو اب ان کے گھر کا

پانی پئے گا۔ تم میرے گھر چند روز دن رہ چکی ہو۔"

"لیکن میں نے تیرے گھر سے صرف کھایا پیا ہے، میں....." پورو آگے بکھڑکے لیکن رشید

سمجھ گیا جو پورو کہنا چاہتی تھی۔

"اس بات کو کون مانے گا پورو۔ یہ تو میری شرافت ہے کہ پہلے میں تیرے ساتھ آکاں پڑھواؤں

گا۔" رشید نے نرم نگاہوں سے پورو کی طرف دیکھا۔

پورو کے دل میں اس کا منگیتر آ گیا تھا۔ اس کو تیل چڑھنا تھا، اس نے مانیوں بیٹھنا تھا۔ اس نے

ہلدی کا امن لگانا تھا۔ اس نے ہاتھی دانت کا بنا چوڑا چڑھانا تھا۔ اس نے کوڑیوں والے گانے چھنکانے تھے،

اس نے ریشمی سوٹ پہنے تھے۔ اس کو روپ چڑھنا تھا۔ اس نے ڈولی میں بیٹھنا تھا۔ وہ..... وہ.....

وہ بے گناہ تھی۔ وہ مان نہیں سکتی تھی کہ اس طرح اس کی ماں پتھر ہو جائے گی، کیسے اس کا باپ فولاد کا

ہو جائے گا۔ کیسے وہ اپنی بیٹی کو اپنے گھر سے دھتکار دیں گے۔ اس طرح اس کے گھر کے دروازے اسے اندر

آنے سے انکار کریں گے۔

یہ..... ماں باپ کا کیا حال ہوا ہو گا جب میں گھر نہ پہنچی ہوں گی، میری بہن.....

"وہ روتے پیتے رہے ہیں اسی طرح جیسے میرا دادا، میرا باپ اور چچا میری پھوپھی کے چل جانے



کے وقت۔ پولیس بھی بہت گھوم پھر چکی ہے لیکن وہ بھی کوئی سراغ نہیں لگا سکی، لگا بھی کیسے سکتی ہے پولیس نے پورے پانچ سو روپے کھائے ہیں۔“

رشید اسکر اپڑا۔

”تم جانتی ہو اس وقت ہمارا پڑا بھاری ہے۔ سارا گاؤں مسلمانوں کا ہے اور کوئی ہندو آنکھ اٹھا کر ہماری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے جان و مال محفوظ ہیں۔ ان کو اپنے سرِ سلامت چاہئیں، وہ بول نہیں سکتے۔ اگر وہ ہمارے گھر کی طرف انگلی بھی اٹھا دیتے تو ہمارے لوگ انہیں کھالا بھی پار نہ کرنے دیتے۔“

رشید سے نے ہنس کر کہا۔ شاید اس کے اندر پرانے انتقام کی آگ سلگ اٹھی تھی۔ پورو کو رشید سے کے چہرے سے شدید نفرت تھی۔ اس کی دنیا مٹی، جہان گیا۔ شاید اس کے ماں باپ چھو آنی کو اپنی بیٹی کی قربانی دے کر سیام واپس لوٹ گئے ہوں۔

”میرے ماں باپ سیام چلے گئے ہیں؟“ پورو نے چا پلو سان پوچھا۔

”نہیں ابھی نہیں۔“ رشید سے نے بتا دیا۔ ”میں کہاں رہتی ہوں؟“ اپنے گاؤں سے کتنی دور؟“ پورو نے اسی خوشامد میں پوچھا۔

”تو اپنے گاؤں کی پچھلی طرف، ماگو گاؤں کے کنویں کے دوسری طرف میرے باغ میں۔ لیکن تو شاید اپنے گاؤں جانے کا خواب دیکھتی ہوگی۔ ابھی نہیں ذرا ٹھہر۔۔۔ بات دب جائے تو چھ مہینے کے بعد وہاں بھی جائیں گے۔“ رشید اسکر اپڑا۔

پورو گم سمی ہو گئی۔ رشید سے نے چادلوں کے ٹھٹھے پلاؤ کی ایک پرات بھر کر اس کے آگے رکھ دی۔ رشید جب باہر جاتا شاید کسی کے ہاتھ اپنے گاؤں سے کھانا منگوا لیتے، پورو کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس دن پورو کے دل میں امید کی کچھ رمت پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ہمت اسے جواب نہ دے جائے یہ سوچ کر پورو نے چادلوں کے دو چار نوالے نگل لئے۔ پانی بھی کھونٹ کھونٹ کر کے پورا کنوڑا پی لیا۔ اس رات پورو نے پوری کوشش سے اپنے من کو تباہ کیا۔ رشید سے کے سر ہانے دروازے کی چابی پڑی ہوئی تھی پورو نے دھیرے سے اٹھائی۔ دروازہ کھولا، اس کا کلیبدھک دھک کر رہا تھا۔ رشید اب جاگا کہ جاگا لیکن اس کی خوش قسمتی یا بد قسمتی رشید انہ جاگا۔



باہر رات کا سناں دیکھ کر پورو کا نپ کا نپ گئی۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ رشید سے کے پاس واپس چلی جائے۔ کیا پتہ وہ رات کے اندھیرے میں چھوٹی آنی کا راستہ بھی ڈھونڈ سکے گی یا نہیں۔ شاید رات کے اندھیرے میں وہ رشید سے بھی گئے گزرے کسی کی کمین کے ہاتھ لگ جائے۔ نہ جانے اس کا کیا حال ہو لیکن پورو کو اپنی ماں کا چہرہ یاد آیا۔ اسے بہن بھائی یاد آئے۔ اس نے ویسے ہی ماگو گاؤں کے کنوئیں کی سمت کا اندازہ لگایا۔ ڈرتی کا بچتی وہ چل پڑی۔ رات کا گہرا اندھیرا چھٹ گیا تھا۔ ماگو گاؤں کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اس نے اندھیرے میں ہی چھوٹی آنی گاؤں کا پچھواڑہ پہچانا، اب وہ نہ ادھر کی تھی اور نہ اُدھر کی۔ اس نے رہی سہی ہمت پیروں کے حوالے کی اور دوڑتی گئی۔ اس نے چھوٹی آنی گاؤں کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے گھر کی طرف مزتی ہوئی گلی پہچانی، اس نے ہلکے ہوتے ہوئے اندھیرے میں گھر کی منڈیر پہچانی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جیسے ہی اندر سے کسی نے دروازہ کھولا وہ اپنی ڈیوڑھی میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے اپنی ہمت کا آخری حصہ بھی صرف کر دیا تھا۔ اب وہ دوڑتی ہانپتی اپنے گھر پہنچ چکی تھی اور اب اس کی ہمت جیسے جواب دے چکی تھی۔ پورو نے اندھیرے میں ٹوٹتی آنکھوں سے دیکھا اس کی ماں، اس کا باپ دیا ہاتھ میں لئے اس کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ پورو نے ایک زخمی جانور کی طرح برآمدے کے کچے فرش پر سسکنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا اس کی ماں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں نے گری ہوئی پورو کو جھولی میں بٹھالیا۔ اس نے ماں کی چھاتیوں سے اپنے ماتھے کو اس طرح چمٹالیا جیسے نوٹی ہوئیں آنتیں ابھی جز جائیں گی۔ پھر پورو کی ماں کی چھینٹیں نکل گئیں۔ لوگ ابھی اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس کے باپ نے اپنی بیوی کا شانہ ہلایا۔ اس کی ماں نے پلو کوٹنے سے اکٹھا کر کے منہ میں ٹھونس لیا۔ ”بیٹی تیری قسمت! اب ہمارے بس میں کچھ نہیں“ اسے باپ کی آواز آئی۔ وہ ماں سے چمٹی رہی۔

”ابھی شیخ آجائیں گے اور ہم سب کو ختم کر دیں گے۔ مجھے اپنے ساتھ سیام لے چلو۔“ پورو نے اپنا سراں کی چھاتی سے بٹا کر پورے دعوے سے کہا۔

”ہم تجھے کہاں رکھیں گے، کون تجھے بیاہ کر لے جائے گا، تیرا دھرم گیا، تیرا جنم گیا، اگر ہم بولے تو ہمارے خون کا قطرہ بھی نہیں ملے گا۔“

”ہائے! مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دو!“ پورو نے تڑپ کر کہا۔

”بیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ اب یہاں سے چلی جا، ابھی شیخ آتے ہی ہوں گے۔ تیرے باپ اور

بھائی کا کہیں نشان بھی نہیں ملے گا۔ وہ سب کو مار دیں گے۔“ ماں نے نہ جانے کیسے دل پر پتھر رکھ کر یہ بات کی۔

پورو کو یاد آیا رشید اکہتا تھا نیک بخت اب اس گھر میں تیری کوئی جگہ نہیں۔ کیا رشید اس کا کہتا تھا۔ پورو کو ایک بار اپنا منگیتر یاد آیا۔ کیسی مٹلی اور کیسی شادی۔ کیا وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ اس نے اس کا حال بھی نہ پوچھا۔ پھر اس کا جینے کو جی نہ کیا۔ اس نے سوچا اور تو سارے راستے بند تھے شاید موت کا راستہ کھلا ہو۔ وہ اٹھ کر باہر کی سٹ چل پڑی نہ ہی ماں نے روکا اور نہ باپ نے، پورو چلی گئی۔ آتے ہوئے وہ زندگی سے ملنے آ رہی تھی، اس میں جینے کی امنگ تھی۔ ماں باپ سے ملنے کے لئے بہت ڈرتی ہوئی آئی تھی، واپسی پر وہ موت سے ملنے جا رہی تھی۔ اب اس میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ موت سے زیادہ کسی نے کیا لینا ہے۔ وہ نڈر ماگو گاؤں کے کنویں کی سٹ جا رہی تھی۔ سامنے رشید اتیزی سے آ رہا تھا۔ پورو کے پاؤں جم گئے۔ موت نے بھی پورو پر اپنا دروازہ بند کر دیا تھا۔ پورو کو محسوس ہوا ان چند رہ دنوں نے اس کے بدن سے سارا گوشت اتار لیا تھا۔ اب وہ بس ایک ایسا بچہ تھی جس کی نہ کوئی شکل نہ صورت، نہ کوئی دل نہ کوئی مرضی۔ رشید سے نے آ کر اسے بازو سے پکڑ لیا، وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ اس کے تین دن بعد ایک مولوی آیا۔ دو تین آدمی اور آئے۔ انہوں نے پورو کا نکاح رشید سے کے ساتھ کر دیا اور پھر خود ہی رشید سے نے بتایا کہ اس کے ماں باپ خیریت سے سیام چلے گئے ہیں۔ چھو آئی کے نام سے پورو کو نفرت ہو گئی تھی۔ رشید ابھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ پھر چھو آئی اسے لیکر جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، شاید رشید اسوچتا تھا کہ کہیں ساتھ والے گاؤں کے ہندو نہ بھڑک اٹھیں۔ چاہے اس وقت تک مہینہ پورا ہونے والا تھا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ بول سکے۔ ویسے بھی پرانی آگ میں کون کودتا ہے۔ ان کی پشتوں کی دشمنی تھی۔ کسی نے جاری رکھی اور کسی نے ختم کر دی۔ رشید سے کی کوئی بہن یا ماں زندہ نہیں تھی۔ صرف بھائی تھے، چچا تھے۔ رشید سے نے پورو سے کہا کہ وہ اسے میلوں دو ایک گاؤں سکر آ لے اپنے دادا کے پوتے کے رشتے کے بھائی رحیم کی زمینوں پر لے جائے گا۔ شاید اس کی کچھ زمین کو اپنی زمین سے بدل بھی لے۔ اب پورو ہونی کے ہر دھکے کے لئے تیار تھی۔ سگے ماں باپ نے دھکا دے دیا اب گاؤں میں کیا رکھا تھا، یہاں نہ سہی وہاں ہی سہی۔

رشید اخوندی گھر کے بڑے کی طرح دو تین چھوٹے ٹرک اور کچھ چھوٹا موٹا سامان لایا اور پورو کو لے کر سکر آ لے چل پڑا۔ جیسے جیون کوئی راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتا ہے۔ وہ رشید سے کے ساتھ نئے گاؤں

میں آگئی۔ نئے گاؤں میں پہنچتے ہی پورو اور رشیدے کو علیحدہ مکان مل گیا۔ شاید رشیدے نے پہلے ہی رحیمے کو کہہ کر یہ طے کر لیا تھا۔ رحیمے کا گھرانہ سے زیادہ دور تھا لیکن جب رحیمے کے گھر سے عورتیں اس کو ملنے آئیں تو وہ پہلا موقع تھا جب پورو کو رشیدے کے رشتہ داروں میں سے عورتوں سے واسطہ پڑا۔

پورو ایک کھوئی ہوئی پھڑپھڑی کی طرح ان کے پاس بیٹھی رہی۔ ان بھلے لوگوں نے پورو سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی۔ چھوٹی موٹی گھر کی ضرورتوں کے بارے میں پوچھتیں رہیں۔ رشید اس وقت تک پورو کو پورو کہتا تھا۔ نکاح کے وقت اس کا رکھا ہوا نام حمیداں آج بھی اس کی زبان پر نہیں چڑھا تھا۔ ایک دن اچانک رشید اس کا ایک آدمی کو گھر لے کر آیا۔ وہ بازوؤں پر عورتوں مردوں کے نام لکھتا تھا۔ اس دن پورو پھر کچھ تھام کر رہ گئی جب رشیدے کے کہنے پر اس نے پایاں بازو آگے کر دیا اور اس پر گہرے حروف سے ”حمیداں“ لکھا گیا۔ اس دن سے رشید ابھی اسے حمیداں کہنے لگا۔ شاید یہ مشورہ رحیمے نے دیا تھا۔

پورو اب حمیداں بن گئی تھی لیکن ابھی تک جب رات کو پورو سونے کے لئے جاتی اس کے خوابوں میں اس کو سہیلیاں ملتی، اس کے خوابوں میں وہ ماں باپ کے گھر میں کھیلتی ہوئی ملتی۔ سارے اس کو پورو کہتے، پورو دن کی روشنی میں حمیداں بنتی، رات کے اندھیروں میں پورو ہوتی لیکن وہ سوچتی اصل میں نہ تو وہ حمیداں تھی اور نہ ہی پورو، وہ صرف ایک پنجر کا بس ایک ڈھانچہ تھی۔ جس کا نہ کوئی روپ تھا نہ ہی کوئی نام۔ پانچ چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ پورو کے پنجر میں ایک ننھی سی جان نے سر کننا شروع کیا.....

## بیساکھی کا میلہ

دن سرگئی تھا اور بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے پورو کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے۔ بوری کے ایک ٹکڑے کو پاؤں کے نیچے دبائے وہ پتھر بنی انہیں دیکھتی رہی۔

باہر والا دروازہ کھول کر رشید اندر دالان میں آکھڑا ہوا۔ اس کو جیسے دروازہ کھلنے کی آہستہ بھی سنائی نہ دی۔ اسے جیسے کوئی اندر آتا ہوا بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہی۔ رشیدے کو شاید سچ بچ پورو سے اب پیار ہو گیا تھا۔ رشید اچپ چاپ آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”خدا کی بندی۔“ رشیدے نے پورو کو اپنے ایک بازو میں لے لیا۔ وہ آج بہت ہی اداس تھی، وہ نہ

بل سکی اور نہ ہی بول۔

رشید اسے پیار کرتا رہا پھر خاصی دیر بعد پورو نے کہا۔

”آج مجھے اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میرے اندر میری آنتیں کتر رہا ہو۔“

رشید ہنستا رہا۔ پورو کا جی بہلاتا رہا۔ پھر رشید نے چولھے میں بھیجی ہوئی آگ سلگائی اور پورو کو پاس بٹھا کر خود ایک چھوٹے قیلے میں شیرے بھوننے لگا۔

”نہ تو کہیں باہر جاتی ہے نہ تو کسی سے ملتی جلتی ہے اس طرح تو آدمی کا جی خواہ مخواہ اداس ہو جاتا ہے۔“ رشید نے کچھ دیر ٹھہر کر کہا۔

”کہاں جاؤں، میرا اور ٹھکانہ ہی کہاں ہے؟“

پورو نے بہت ہی ناامیدی سے کہا۔

”اب تو گھر کی مالکن ہے۔ اور چار دنوں کے بعد تیرے صحن میں ایک ننھی جان کھیلے گی میری خاطر نہ سہی اس کی خاطر ہی سہی۔ تجھے دل لگانا چاہیے، اس بے چارے نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟“ رشید نے کو اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا۔

اس نے پورو کو اسی کا واسطہ دیا۔

پورو کو پھر وہ مٹروں میں سے نکلی ہوئی سنڈی یاد آگئی۔ جس سنڈی کو دیکھ کر کسی کا جی متلائے، جس سنڈی کے ساتھ لگے مٹروں کو بھی کوئی دور نہ پھینک دے۔

”لاؤ! بیٹروں کے مسالے میں تھوڑے سے مٹر بھی ڈال دیں۔“ رشید نے پورو کے آگے بکھرے ہوئے مٹروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مٹر تو سارے پکے ہوئے ہیں، مٹروں کا کون سا موسم ہے۔ اوپر سے بیساکھ شروع ہونے کو ہے۔“

پورو کو معنوم تھا آج اس سے مٹر نہیں کھائے جائیں گے۔

”ہاں جی، کل تو بیساکھی کا بڑا میلہ لگ رہا ہے۔“ رشید نے آرام سے کہا۔

”بیساکھی..... بیساکھی.....“ پورو کے کانوں میں گونجنے لگا اور وہ پرات میں دو تین مٹھیاں آٹا ڈال کر گوند مٹنے لگی تاکہ اس کا خیال کسی اور طرف بٹ جائے۔

”آج تو میرا دل کر رہا ہے کہ گڑ ڈال کر سویاں بنائیں۔“ رشید سے نے کہا۔ پورو چپ چاپ اندر سے سویاں اور گڑ نکال لائی۔

اس وقت پورو کو یاد آیا کہ بہت دیر پہلے کی بات تھی جب ایک دن اس کی ماں بیٹھ کر سوچی کی سویاں بٹ رہی تھی اور اس نے کہا تھا۔ ”ماں! اری ماں! میرا تو مشین پر بنی ہوئی سویاں کھانے کو جی کرتا ہے۔“ اور ماں نے کسی قفل کے بغیر کہا تھا ”اری بھئی.....! وہ تو مسلمان کھاتے ہیں۔“ یہ بات یاد کر کے پہلے تو پورو کی آنکھیں بھر آئیں پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔

رشید اس کی ہنسی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پورو نے وہ بات سنا دی، سناتے سناتے پھر اس کی ہلکیں بھیگ گئیں۔ رشید اثر مندہ سی ہنسی ہنستا رہا۔

اگلے دن پورو جب سو کر اٹھی، گاؤں میں بیساکھی کے ڈھول بج رہے تھے، پہلے تو کام کاج میں جتنی رہی پھر وہ اپنی چھت پر چڑھ کر دور میدان میں لگے ہوئے بیساکھی کے میلے کودیکھنے لگی۔

دور کھڑی پورو کو لوگوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ لمبے ترنگے جاٹ نئے تہمند باندھے ہوئے، ہاتھوں میں تیل سے چمکتی انٹھیاں، بڑی گرجوٹی سے ادھر سے ادھر جاتے، کئی گھوڑیوں پر سوار تھے، اپنے پیچھے عورتیں بھی بٹھائے ہوئے اور آگے ایک دو بچے بھی، کئی عورتیں بچوں کو انگلی لگائے چلی جا رہی تھیں۔ کئی نوجوان اپنی جوانی کے جوش میں آئے چھاتی نکال کر چل رہے تھے، کچھ گاتے جاتے، کچھ بولتے جاتے۔ دور میدان میں کشتیاں ہو رہی ہوں گی۔ جلیبیوں کے تھال بچے ہوئے۔ گرم پکوڑوں کی خوشبو دور تک ہوا میں پھیلی ہوئی ہوگی۔ گڑ کے شکر پارے، میدے کی مٹھائیاں اور مٹھائیوں کے رنگ رنگ کے لوہے کے تھال بچے ہوں گے.....

پورو کے سر میں لوہے کی چوٹ کی طرح ایک خیال آیا۔ اس کی ماں نے تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اور اس مرتبہ..... اس مرتبہ اس کی پہلی بیساکھی تھی۔ کھڑی ہوئی پورو چھت پر بیٹھ گئی شاید اس وقت اس کی ماں نے اس کے چھوٹے سے بھائی کو پانی چکھایا ہوگا۔ نزدیک ہی بہتی ہوئی ندی سے پانی لے کر، گلاب کے پھول کو اس پانی میں بھگو کر اس کے بھائی کے چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹوں سے لگایا ہوگا۔ پھر اس کی ماں کو مبارکبادیں ملی ہوں گی اور شاید..... شاید اس وقت اس کی ماں کو اپنے پیٹ سے جنی ہوئی پورو بھی یاد آئی ہوگی۔ پورو کی آنکھوں میں آنسو بھی آ کر کھم گئے تھے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔

جوان جاٹ لڑکوں کی ایک نولی کانوں میں پھول پھنسائے ہنستی گاتی دور سے گزر رہی تھی، ان میں

سے کوئی آدمی بولے جارہا تھا۔

کھوہ تے بیٹھی دانتن کردی

چھیاں دنداں دی ماری

نی آپے تینوں لے جان گے

جہناں نوں لگیں پیاری

نی آپے تینوں لے جان گے

(کنویں پر بیٹھی تو دانتن سے دانت صاف نہ کر، اور اپنے سفید دانت اور نہ چمکا، وہ خود ہی

تجھے ساتھ لے جائیں گے، جنہیں تو پیاری لگے گی، وہ خود ہی تجھے ساتھ لے جائیں گے)

”ہائے کوئی پیاری لگنے والیوں کے حال تو دیکھے۔“ پورو کے منہ سے دھیرے سے نکلا۔ پھر پورو کو

ایک خیال آیا۔ وہ رشید سے کوئی پیاری لگی، رشید اس کو لے آیا۔ وہ اپنے منگیت رام چند کو کیوں نہ پیاری لگی۔

اس نے تو اس کی خبر ہی نہ لی، وہ تو رام چند کو پیارا لگنا چاہتی تھی۔ رشید نے کون تو اس نے خود سے ڈھونڈا اور نہ ہی

اس کے ماں باپ نے۔

جاٹ ناچتے کودتے جارہے تھے۔ بھنگڑا ڈال رہے تھے، بولیاں گارہے تھے۔

تیرے لونگ داو جالشکارا

ہالیاں نوں مل بھل گئے

(تیرے لونگ کی چمک جو پڑی، تو کسانوں کو اپنے مل بھول گئے)

تیرا بھجیا پری والہنگا

بچھوں دیاں پن کنیاں

(تیرا پریوں (کے لبادے) جیسا لہنگا بھگ گیا، (اور تیرے چلنے سے اس کی)

تھمہیں پیچھے (آتے عاشقوں پر) برسنے لگیں)

سانوں کڈھ ندیں نیارے

نی راہے راہے جان والے!

(ہمیں کہیں (راستے سے) ہٹا نہ دینا، اے راستے میں چلنے والی حسینہ)



پورو سو جتی سارے ہی گیت خوبصورت لڑکیوں کے سولھے (گیت) گاتے ہیں۔ سارے ہی بھجن سچے پیاروں کو سراہتے ہیں۔ کبھی وہ بھی گیت نہیں گے جن میں میرے جیسی لڑکیوں کا ردنا رویا ہوگا؟ کبھی وہ بھی بھجن ہوں گے جن میں بھگوان ہی کوئی نہ ہو؟ ابھرتی جوانی والی کچھ حسینائیں اکٹھی ہو کر میدان کی سمت جا رہی تھیں۔ دور جاتے ہوئے جاٹ لڑکوں کے ٹولے مزمل کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہنستے تھے شاید انکھیلیاں کرتے تھے، ان کو دیکھ کر پورو سو پنے لگی۔ ”اچھا اگر اب ان جوان لڑکیوں کو یہ سارے لڑکے اپنے گھوڑوں پر بٹھا کر بھاگا لے جائیں..... پھر کیا ہو؟ اچھا یہ ساری لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں.....“

### پورو کا بچہ

سخت گرمی شروع ہو چکی تھی۔ زمین کپاس کی سوکھی شہنیاں ڈال کر جلائے ہوئے تنور کی پشت کی طرح دھک رہی تھی۔ پورو کبھی بیٹھتی، کبھی اٹھتی، کبھی لیٹ جاتی۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بار بار پانی پیتی۔ اس کی پڑوسن نے اسے کہا کہ آسانی سے نہ سہی جیسے کیسے ہو وہ نہالے اور اپنا سر بھی دھولے۔ پھر کیا معلوم اسی رات یا اگلے دن پورو کے ہاں کچھ ہو جائے تو پھر وہ کتنے ہی دن اٹھنے کے قابل نہ رہے گی۔

رشید نے دیکھا، پورو کا رنگ جسم سے اٹھنے والے درد سے انی کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ رشید سے کو وہ وقت یاد آ گیا جب وہ چھوڑ آئی کی کچی سڑک سے پورو کو گھوڑی پر اپنے سامنے بٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پورو کا رنگ اس وقت بھی سفید پھٹکڑی جیسا تھا۔ اس وقت پورو کی روح سے ٹیسس اٹھ رہیں تھیں۔ آج پورو کے جسم سے۔

رشید نے رحیم کے گھر اپنے کھیتوں میں ایک کام کرنے والے کو بھیجا ہوا تھا۔ خود اسے پورو کو اکیلے چھوڑ کر جانے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ رحیم کی ماں جب آئی، پورو کے چہرے پر شدید درد کی وجہ سے مل پڑ رہے تھے۔ آتے ہوئے رحیم کی ماں اپنی گلی والی اسی رہیشاں دائی کو بھی ساتھ لے آئی تھی جس نے رحیم کی دونوں بیویوں کے بطن سے دو دو تین تین لڑکے لڑکیاں جنم دلوانے میں مدد کی تھی۔

دائی نے آتے ہی ایک پرانی درمی کو فرش پر بچھا کر پورو کو لٹا دیا۔ پورو چار پائی کی نرم ماہٹ چھوڑ کر سخت زمین پر تڑپنے لگی۔ رشید دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ اسے اندر سے بند کیے ہوئے دروازے سے پورو

کے بھیجے ہوئے دانتوں سے شدید کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس کا جی چاہتا کہ پورو کے جسم سے زیادہ نہیں تو آدھا درو کھینچ کر اپنے جسم میں سمو لے، پورو اکیلی تڑپتی رہی۔

دائی، نئے پنکھے سے پورو کے چہرے پر ہوا کے چھوٹے چھوٹے چھوڑتی رہی۔ رحیمے کی ماں نے کئی بار پانی کے چلو پورو کے منہ میں ڈالے۔

تین اونچی چیخوں کے بعد باہر کھڑے رشید نے سنیچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد پورو کی کوئی آواز نہ نکلی، رشید نے کوسانس آیا کہ اب اس کی کچھ خلاصی ہو گئی تھی۔ رشید نے کا دل کیا کہ وہ اندر آ جائے دائی تو شاید بچے کے گر د ہوگی، وہ خود جائے، پورو کو دبائے پکڑے، پورو آج تک اس کے ہاتھوں روتی ہی رہی تھی لیکن اندر اس کی چچی بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر دائی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب تک وہ خود رشید سے کوا اندر نہ بلائیں، رشید سے کوا اندر جانا چھو را پن لگتا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پورو کی پھر آواز نہ آئی۔ رشید نے کے دل میں ایک ہول اٹھا۔ پورو زندہ تو ہے؟ تھوڑی بہت بھی آواز کیوں نہیں آرہی؟

ٹھیک آدھا گھنٹہ گزر گیا، جب دائی نے باہر آ کر رشید سے کہا "مبارک ہو بیٹا! لڑکا ہوا ہے۔"

"اس کا کیا حال ہے؟" رشید نے کے منہ سے نکلا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ بیٹا لاکھوں بار مبارک ہو۔ اور کیا بیٹے چھت سے تو نہیں گرتے۔" دائی نے

ایک ایسے حوصلے سے مسکرا کر کہا جس حوصلے سے اس نے کئی عورتوں کے درد اپنے ہاتھوں میں سہے تھے۔

جب رشید اندر آیا، لیٹی ہوئی پورو کی آنکھیں الٹی ہو گئی تھیں۔ اس کے ایک طرف ایک سفید کپڑے

میں لپٹایا ہوا اس کا اور رشید سے کا بیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ رشید نے کے من سے خوشی پھوٹی، اس نے پورو کا من

جیت لیا تھا، جوئے کے اس کھیل میں اس نے ساری کی ساری پورو کو جیت لیا تھا۔ اب پورو صرف اس کی بھگا

کر لائی ہوئی رکھیل نہیں تھی۔ اب پورو صرف اس کے گھر پڑی ہوئی عورت نہیں تھی۔ اب پورو اس کے بیٹے کی

ماں تھی۔

رحیمے کی ماں نے جیسے کہا، رشید نے ایک روپیہ اور گڑ کی بھیلی بیٹے کے رکھا صدقہ اتارا پھر پورو

کی شیم خوابیدہ آنکھیں کھلیں اس نے رشید سے کوا دیکھا۔

"اب تو مجھے کیا کہتا ہے؟ میں نے تجھے اپنا آپ دیا، تجھے ایک بیٹا دیا، اب میرے پاس باقی کیا بچا



ہے؟" پورو اپنی غم سبز زبان سے جیسے رشیدے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

گرم لڑ اور پے ہوئے باداموں کے کچھ چمچ لینے کے بعد جب پورو کے جسم میں جان آئی تو پورو نے دیکھا، اس کے بائیں بازو سے اس کے بچے کا نرم ملائم چہرہ رگڑ کھا رہا تھا۔ پورو ڈر گئی۔ پورو کو لگا جیسے ایک نرم سفید سنڈی اس کے جسم پر چڑھ رہی تھی، اسے کراہت آئی، اس کا جی چاہا کہ اپنے بازو سے لگی ہوئی سنڈی کو جھٹک دے، اپنے بدن سے دور کر دے، اس طرح جیسے کوئی چھبے ہوئے کانٹے کو ناخنوں میں پھنسا کر نکال دیتا ہے، جیسے کوئی چمٹے ہوئے بھاگڑے اتار پھینکتا ہے، جس طرح کوئی چمٹی ہوئی چیچری کو اکھاڑ دیتا ہے، جیسے کوئی لگی ہوئی جو تک کو کھینچ لیتا ہے۔ رحیم کی ماں نے پورے تیرہ دن ان کے گھر رہنا تھا۔ ابھی تو پورو کو بیٹا جنے چاہی ہی دن ہوئے تھے، پانچویں دن پورو کو دودھ اترنا۔ روٹی کی تیاں بنا کر دائی اس کے بچے کو دودھ کی بوتلی میں منہ سے لگاتی رہی۔ آج اس نے دودھ کے لئے بچے کو پورو کی گود میں ڈالا۔

بچہ پورو کی گود میں پڑا رہا۔ بچہ پورو کے جسم سے چمٹا رہا۔ پورو کی آنٹوں میں کھچاؤ محسوس ہوا۔ پورو کا جی چاہا کہ بچے کو گلے لگا کر رو دے۔ بچہ اس کے اپنے ہی خون سے بنا کھلونا تھا، اس کے اپنے ماں کا بہت تھا۔ بھری بھرائی دنیا میں یہی ایک بچہ اس کا اپنا تھا۔ اس نے کبھی ماں کا چہرہ نہیں دیکھا، اس نے کبھی باپ کا چہرہ نہیں دیکھا، اس نے کبھی بہن بھائیوں کے چہرے نہیں دیکھے۔ وہ..... وہ صرف اپنے بچے کا چہرہ دیکھا کرے گی، جس کے خون میں اس کے اپنے ماں باپ کا خون ملا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے ملا تو توڑ گئے مگر اپنے اس خون کو کس طرح علیحدہ کریں گے جو خون پورو کی ہڈیوں میں رچا ہوا تھا جو خون پورو کے ہاں جنے بیٹے کے خون میں ملا ہوا تھا۔ بچہ پورو کا دودھ پیتا رہا پھر پورو کو محسوس ہوا یہ بچہ زبردستی اس کی آنٹوں سے اس کا دودھ کھینچ رہا تھا۔ زبردستی..... جبراً..... لڑکے کے باپ نے بھی تو اس کے ساتھ سب کچھ جبراً کیا تھا۔ بچہ بھی تو اپنے باپ کا بیٹا تھا، اپنے باپ کو خون تھا، اپنے باپ کا ماں تھا، اپنے باپ کا روپ تھا، نہ چاہتے ہوئے یہ بچہ اس کے پیٹ میں رکھا گیا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر یہ بچہ اس کے پیٹ میں پلا تھا اور اب یہ بچہ جبراً اس کی آنٹوں سے دودھ کھینچ رہا تھا۔

پورو نے اپنے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ اس کا ماتھا آگ میں پڑی اینٹ کی طرح گرم تھا۔ شاید اس کو بخار تھا۔ اس کے سر میں ایک خیال گھومنے لگا یہ بچہ..... اس بچے کا باپ..... سب مرد ذات..... مرد جو عورت کے جسم کو کتے کی ہڈی کی طرح چوستے ہیں۔ کتے کی ہڈی کی طرح چباتے ہیں..... بچہ پورو کا

دودھ پیتا رہا۔ پورو کا سن کنوئیں کی ٹنڈوں کی طرح بھرتا اور خالی ہوتا رہا۔

## یتیم

پورو کے گول منول بچے کو سب جاوید کہتے تھے۔ ری سے بنی پلٹری (چھوٹا پلنگ) پر لٹا کر پورو اسے دیکھتی ہی رہتی، ہاتھ پاؤں چلا چلا کر وہ اوپر دی ہوئی چادر کو پیروں تک لاکر مسل دیتا۔ چاندی کی ایک پتلی سی پازیب پورو نے اس کے پاؤں میں پہنائی ہوئی تھی جب وہ ہاتھ پاؤں مارتا، پازیب کی ہلکی سی جھنکار پلٹری پر چھن چھن کرتی۔ بار بار پاؤں چلاتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور بچے کو ہچکیاں شروع ہو جاتیں۔ پھر پورو اس کے ہاتھوں کو دیکھتی، ہتھیلی کی طرف سے اس کے ہاتھ بہت زیادہ سفید تھے اور ہاتھوں کے پیچھے والے حصے پر ماس اس طرح ابھرا ہوا تھا کہ پورو کو اس کے ہاتھ بالکل موم کے اس 'بادے' کی طرح محسوس ہوتے جو چھوٹی عمر میں اس نے سیام سے واپس آتے ہوئے کلکتے کے ایک بازار سے خریدا تھا۔ اس نے بادے کو کروشیے سے بنا ہوا کرتا پہنایا تھا۔ چھوٹے موتیوں کی ایک مالا پرو کر اس نے بادے کو پہنائی تھی، جاوید کے ہاتھ بالکل موم کے اس بادے کے ہاتھوں کی طرح چلیں چلیں کرتے تھے۔ موم کا وہ بادا شاید ابھی تک نہیں ٹوٹا ہو گا۔ پورو نے سوچنا شروع کر دیا، بعض اوقات کانچ اور مٹی کی بنی اشیاء کی معیاد بھی کتنی زیادہ ہوتی ہے شاید آج بھی اس کی کوئی بہن اس بادے سے کھیلتی ہوگی.....

صبح سویرے پورو کھیتوں کو جاتی، رشید اپنے بیٹے کے پاس بیٹھتا۔ ایک دن ابھی اندھیرا ہی تھا، اس نے کھیتوں سے واپسی پر مسلمانوں کے کنوئیں پر ہاتھ پیر دھوئے۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہی تھی اسے اپنی گلی کی لڑکی کمو دکھائی دی۔ سردیوں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی، کمو پانی کی گاڑی کے ڈھیلوں سے سب سے تھڑے پر رکھ کر سانس لے رہی تھی۔ پورو جب اس کے پاس سے گزری، کمو نے جیسے ڈرتے ہوئے پانی کی گاڑی اٹھائی۔ گاڑی کا وزن شاید کمو کے شانوں سے سہا نہیں جا رہا تھا، گاڑی کمو کے شانوں سے پھسلنے کو تھی۔ گاڑی کے نیچے نگی ہوئی کمو کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کلائی سے دہری ہوئے لگی۔ میں ہاتھ سے گاڑی کے منہ کو سہارا دیتے ہوئے کمو کے منہ سے نکلا "ہائے ماں!"

پورو کے قدم رک گئے، وہ کمو کے پاس گئی، اس کا جی چاہا دس بارہ سال کی دہلی پتلی سی کمو کے

شانوں سے گاگر اٹھالے۔ کمواس کے ساتھ ساتھ چلتی جائے۔ کوجو کہ ننگے پاؤں تھی اور کوجو ہمیشہ کھدر کی سادی شلوار کے پانچے چڑھائے رکھتی تھی اور کوجس کی دھاری دار قمیض کے کندھے پر لگا بیوند کبھی ادھر جاتا تھا کبھی پھر لگ جاتا تھا اور کوجس کے بال ہمیشہ بان کی طرح کھر درے اور بکھرے رہتے تھے اور کوجس کو ہمیشہ پورو نے دور سے دیکھا تھا، آج وہ نزدیک ہو کر کمو کے ان شانوں سے گاگر اٹھانا چاہتی تھی جن شانوں کی ہڈیاں پیتل کی گاگر سے نکر رہی تھیں۔

”بڑی دیر ہو گئی ہے؟“ برتن کے بوجھ تلے دبی ہوئی کمو نے جیسے پورو سے ابھی دیر نہ ہونے کا ایک حوصلہ طلب کیا۔

”ابھی تو دن بھی نہیں نکلا۔“ پورو نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ لڑکی کو شاید حوصلہ ہوا۔ اس نے شانوں کا بوجھ پھر زمین پر رکھ دیا، گاگر کے منہ سے تھوڑا سا پانی پھلک کر کمو کے شانے پر گر گیا۔ تھسی ہوئی دھاری دار قمیض کو بھگو کر پانی نے کمو کے بدن کو ٹھنڈا کیا، سردی کی ایک لہر کمو کے بدن میں دوڑ گئی۔

پورو رک گئی۔ کمو پورو کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ لہو بھر پہلے یہی کمو دیر ہونے کے ذرے سے برتن کے بوجھ سے سبھی ہوئی تھی۔ کمو کے چہرے پر جما ہوا وہ ڈر تھا جو ہمیشہ پورو نے دیکھا تھا۔ اس لمحے اس کے چوڑے ہونٹوں پر بکھری ہوئی ہنسی پورو کو اس طرح محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کو ہنسائی نہ آتا ہو اور وہ یونہی اپنے ہونٹوں کو مروڑ رہی ہو جیسے کسی کا منہ چڑاتے ہیں۔

”کمو تم روز اس وقت آتی ہو؟“ پورو نے کمو کو پکارے جانے سے کمو کا نام سنا تھا۔

”لگتا ہے آج کچھ دیر ہو گئی، مجھے مار پڑے گی۔“ کمو نے پھر گاگر کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے دقت اور وقت کا نام اس کے لئے بہت ڈراؤنا تھا۔ اس کی ہنسی کچھ رنگوں کی طرح اس کے چہرے سے اتر گئی اور اندر کہیں پہلے سے پیدا شدہ ڈر اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔

”کمو وہ تیری کیا لگتی ہے؟“

”چچی۔“ کمو نے کہا اور کمو کا بازو گاگر کے بوجھ تلے مڑ گیا۔ شاید اس کے بوجھ سے، یا شاید لفظ چچی

سے۔

”اگر تو کہے، میں تیری گاگر اٹھا لوں؟“

پورو نے کہا لیکن اپنا بازو آگے نہ کیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ اس کا نام

حمیداں ہے حمیداں، رشیدے کی بیوی..... اور کمو ایک ہندو لڑکی ہے۔

”گاگر تا پاک ہو جائے گی۔“ کو نے بے دھڑک کہا۔

”پانی تو نا پاک نہیں ہوگا میں پانی کو ہاتھ نہیں لگاتی جا کر گاگر دھو لینا۔“ پورو کہتی کہتی ہنس پڑی۔ کو بھی جیسے ہنس پڑی لیکن کو نے گاگر اٹھائے رکھی۔ دونوں مشکل سے چند قدم ہی گئی تھیں۔ کمو کا پاؤں دہرا ہوا گیا۔ پورو نے گرتی گاگر پکڑ لی لیکن کو پتھروں پر گر پڑی اس کے پاؤں میں موج آگئی۔

پورو نے گاگر رکھ کر کمو کا پاؤں پکڑا اور ہتھیلی سے اس کے نچنے کے قریب پاؤں کو ملا۔ بے پرواہ کو اٹھنے کے قابل ہو گئی۔ پورو گاگر اٹھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”ہائے ماں.....!“ کمورو پڑی۔ پورو کو ایسے محسوس ہوا جیسے کو اپنے سارے دکھوں کے شکایت اپنی مری ہوئی ماں سے کر رہی ہو۔

”جنم دے کر ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں“ پورو نے کئی بار کمو کی چچی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ کمو کی نہ تو ماں تھی اور نہ باپ، کمو کا باپ تو شاید زندہ تھا لیکن کہتے تھے اس نے شہر میں کوئی عورت رکھی ہوئی تھی جو کمو کو ملنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے کمو کا باپ بھی کمو سے نہ ملا۔ پورو سوچتی گئی، مائیں مرجائیں تو باپ بھی سوتیلے ہو جاتے ہیں، سوچتی سوچتی اپنی سوچوں میں اتر گئی۔ مائیں زندہ ہوں تب بھی باپ سوتیلے ہو جاتے ہیں، مائیں بھی سوتیلی ہو جاتی ہیں.....

گاؤں صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ روشنی بڑھ گئی تھی اور ان کی گلی کا موڑ بھی نزدیک آ گیا تھا۔ دونوں کو ڈر تھا کہ پورو کو گاگر اٹھائے کوئی دیکھ لے گا، کو نے ڈمگاتے پاؤں سے گاگر سنبھالی۔ پورو نے تیز تیز قدم اٹھائے اور کمو سے الگ ہو کر گلی کی طرف مڑ گئی۔ اس دو پہر کو بچہ ضد کر رہا تھا اور پورو اپنے بچے کو بہلا پھسلا رہی تھی۔ جب کمو اس کا دروازہ کھول کر اس کے گھر آئی۔

پورو نے آگے بڑھ کر کمو کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اس کے اپنے بچے سے بھی زیادہ بہلائے جانے کی مستحق تھی۔ کمو جس کے خشک آنسوؤں کو کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ پورو کے بازو میں کمو کے آنسو چھلک پڑے۔ پورو کا جی چاہا کہ جیسے وہ جاوید کی ماں ہے، ویسے ہی کمو کی ماں بن جائے۔ کمو اڑیاں کرے، کمو ضد کرے اور وہ کمو کو اٹھا اٹھا بہلائے۔ کمو کو لئے لئے پھرے، کمو کو چوم چوم کر تھک جائے، وہ جاوید کی ماں تھی، کمو کی ماں بھی بن جائے..... وہ ایک اچھی بیٹی نہیں بن سکی تھی وہ ایک اچھی ماں بن

جائے.....

کمو بند تھی اور پورو..... پورو ایک مسلمان تھی۔ چاہے وہ اپنے آپ کو پورو ہی سمجھتی تھی۔ کمو نے پورو کے گھر سے کچھ کھانا نہیں تھا۔ پورو کا دل چاہتا تھا کہ وہ کمو کو نوالے دے۔ وہ کمو کو دودھ کا کٹورا پلائے.....

پورو نے پھر کمو کا پاؤں ملا۔ ہتھیلیوں سے گرم تھی کا مساج کیا۔ روٹی کے گالوں سے نکور کی۔ اب کمو بے تاب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اس کی چچی کا لمبا جھاڑو سلائیوں کی طرح گھوم رہا تھا۔ کمو لحاف (تلائی) سینے والی سوئی لینے کے بہانے آئی تھی۔ پورو نے کمو کو ہاداموں والا گڑ کھلایا اور لحاف سینے والی سوئی نکال کر دی۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ لوگوں کے بدن پر کپڑے اب مونے ہو گئے تھے اور وہ سب روٹی بھروا بھروا کر خالی محیٹ کی واسکٹیں بنوائی تھیں۔ لوگوں نے مونے کھیسوں کی بکلوں میں اپنے کندھے چھپائے پھر رہے تھے۔

کمو اپنی عمر کے سال کھائے جا رہی تھی۔ نہ تو کمو کے جسم پر جوانی اٹھتی، نہ کمو کے بدن پر کپڑے بدلتے تھے۔ کمو کے ننگے پاؤں اب ترک رہے تھے۔ پورو نے کمو کے لئے ایک نئی جوتی بنوائی لیکن کمو کے پاؤں میں اس جوتی کا پورا آنا آسان نہیں تھا۔

سوچ سوچ کر یہی ہوا، کمو نے وہ جوتی پہن لی اور چچی سے کہا ”سامنے گئے کے کھیت میں پڑی ہوئی ملی ہے۔“ چچی کہاں مانتی تھی۔ گاؤں میں ایسی کون ہے جو اپنی نئی جوتی ویسے ہی گم کرائے؟ لیکن چپ کر گئی، کمو نے جوتی پہنے رکھی لیکن نئی چیزیں روز روز تو کسی کو نہیں ملتیں۔ پورو کمو کی ٹھنڈی ہڈیوں کو دیکھتی رہتی۔

صرف صبح کے اندھیروں کو معلوم تھا کہ پورو ہر روز کمو کی ایک آدھ گاڑا ٹھا کر اس کا ہاتھ بٹاتی۔ کمو ایک آدھ چکر پورو کے گھر بھی لگاتی۔ کبھی بیٹے میں کپاس بیل دیتی، کبھی چکی میں چنے دے لگتی۔ کبھی اکھلی میں مسالا پیس لیتی۔ پورو اس کا ہاتھ بٹاتی، چچی کا کام بڑے اچھے طریقے سے ہو جاتا۔ چھوٹے سے جاوید کو کمو کی عادت پڑ گئی تھی۔ کبھی کمو نہ آتی تو پورو اسے چھوٹے بچے کی طرف سے شکوہ کرتی، داؤ لگنے پر کمو آ جاتی، کبھی نہ بھولتی۔ اب پورو اور کمو ماں بیٹیوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ لیتیں اور دو سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے جز جز بیٹھتیں۔ کئی بار پورو کا دل کرتا کہ وہ کمو کے لئے کچھ بنائے۔ کمو کے سوکھے جسم کے انگ پھولنے شروع ہو گئے تھے۔ کمو کے پچکے رخساروں پر ماس آ گیا تھا۔ پورو کے گھر آ کر کمو اپنے بال سنوارتی۔

پورو گئی لگے ہاتھوں سے کمو کی چٹیا بناتی۔

ایک دن صبح کے اندھیرے میں کمو، پورو کو پکڑ پکڑ کر روئے جا رہی تھی، پورو نے غور سے دیکھا، کمو گئے کے چھلکے کی طرح ہنسی ہوئی تھی۔

پورو نے اسے لگایا لیکن کمو تھی کہ روتے ہوئے اسے ٹھیک سے سانس نہیں آ رہا تھا۔ رورو کر اس کا پلو بھگتا ہوا تھا۔ رورو کر اس کے ہاتھ بھیگ گئے تھے۔

”میری چچی کہتی ہے اگر اب تو اس کے گھر کی تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔“

آخر کمو نے سب کچھ کہہ دیا اور پورو کے سینے سے سر لگا کر جی بھر کے روئی، جیسے پورو اس کا واحد سہارا تھی اور کمو کو کوئی ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

”لیکن کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟“ پورو نے روتے ہوئے پوچھا۔

”چچی کہتی ہے ہم نے سنا ہے کہ وہ بھاگ کر آئی ہوئی ہے تم بھی اسی طرح بھاگ جاؤ گی۔“ کمو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

صبح کا اجالا سفید ہو رہا تھا۔ پورو کا رنگ چرخی سے ٹوٹے ہوئے گالے جیسا ہو گیا.....

### جھوٹ جیسا بچ

پورو کے من میں اوپر تلے چوٹیں پڑتی رہیں۔ اس کا دل اور دماغ کم از کم دس سال بڑا ہو گیا تھا۔ پورو کی عمر بیس برس سے بڑھی نہ تھی لیکن جو کچھ اس کو عمر نہیں سکھا سکتی تھی وہ سب کچھ اس کے جیون کی چوٹوں نے سکھا دیا تھا اس لئے سیانا سوچنے والوں کی طرح پورو بہت سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا من بہت تیز سوچتا تھا لیکن اسے کہنا نہیں آتا تھا۔ اس کے سب دلوں پانی سے ٹکرا کر بننے والی جھاگ کی طرح اٹھتے اور پھر پانی میں ہی ختم ہو جاتے۔

کبھی کبھار پورو درجے کے گھر، اس کی بیویوں کے پاس جا بیٹھتی تھی۔ ان کے بڑوں، میں ہی ایک جوان لڑکی کا بیلا چہرہ اسے بہت کھینچتا تھا۔ کئی بار پورو کے جی میں آتا کہ اسے بلائے۔ شاید کسی دکھی کو ہی دکھیا رہے کی سمجھ ہوتی ہے۔ لڑکی کے پیلے چہرے پر جھکا، ہوئی آنکھیں تھیں اور ان کا جھکاؤ پورو کی طرف کچھ اس



طرح تھا جیسے انہیں بھی پورو کی ضرورت تھی۔ آہستہ آہستہ پورو کو معلوم ہوا کہ دو سال پہلے اس لڑکی کا بیاہ ہوا تھا۔ کوئی کہتا تھا اسے جن بھوت چمٹے ہوئے تھے۔ کوئی کہتا تھا اس کو کوئی اندرونی بیماری تھی۔ یہ نہیں اس پر کیا مٹی لیکن پیاز کی کونپل کی طرح اس کا جسم اندر سے خالی تھا۔ اس کا چہرہ ہر ذل کی طرح ہو گیا تھا۔ پورو نے آتے جاتے لڑکی سے واقفیت بنالی تھی اور اس کے بعد یہ واقفیت لڑکی کی ماں سے اپنے نکمیں بٹوا کر بڑھالی تھی۔ لڑکی کو سارے تارو کہتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں پورو نے سنا، تارو کو خوشی کے دورے پڑتے تھے۔ ان دنوں تارو میکے آئی ہوئی تھی اور اب اسے اپنے سسرال جانا تھا۔ پورو نے سنا، ہر بار تارو کو سسرال جانے سے پہلے اسی طرح ہو جاتا تھا اور جب بھی وہ سسرال سے واپس میکے آتی تھی، ہر بار، اس کا ماں پہلے سے زیادہ سوکھا ہوا ہوتا تھا۔ ہر بار اس کی بڑیاں پہلے سے زیادہ نکلی ہوئی ہوتی تھیں۔ سارے دیکھنے والے دل ہی دل میں سمجھتے تھے اب صرف چند ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر اور سوکھنے کے لئے اس کے جسم پر ماس ہی نہیں رہے گا۔ نہ ہی میکے جانے والی کو سسرالی کچھ کہتے تھے اور نہ ہی اسے بھیجنے والے میکے کچھ بولتے تھے۔

ایک دن تارو اکیلی تھی۔ پورو اس کے پاس آگئی۔ پہلے بھی کئی بار تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرتی تھی، آج اس سے باتیں کرنے لگی۔

”تارو! کسی سیانے نے بتایا تو ہوگا کہ تجھے کیا روگ ہے؟“

”کچھ بھی نہیں“

”کسی نے نبض دیکھی ہوگی.....؟“

”ورق لگے مرے اور عرق کی بوتلیں پی پی کر تھک گئی ہوں۔“

”تارو! کچھ تو بتاؤ، کیوں اپنی جان کو ردگ لگا لیا ہے؟“

”ویسے ہی دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا بہن! کیوں فکر کرتی ہے؟“

”نہ جانے دھرتی پر کتنا بوجھ پڑا ہوا ہے، تیرے ساتھ کیا ہلکا ہوگا ماں سے تو پوچھ کر دیکھ جس نے

مشکلوں سے پالا ہے۔“

”پالا ہوگا۔“ تارو نے ایک بے پرواہی سے کہا۔

”خود ہی چار دن رو دھو کر چپ کر جائے گی اب کون سی اس کی جان سکھی ہے۔“ تارو نے ہی مھر

کہا۔

”لیکن اتنی بھی کیا بات ہوگئی ہے ماں سے کہہ ابھی چارون اور نہ بیجھے۔“

”پھر کیا فرق پڑ جائے گا جیسی یہاں ہوں ویسی ہی وہاں۔“

”ہاں بیٹیوں کو کوئی کتنی دیر رکھ سکتا ہے۔“

”بیٹیاں..... ہونہہ.....“ اور تارو ایک بار بڑبڑا کر چپ کر گئی۔ تارو کے اندر معلوم نہیں کیا

بل پڑا تھا، معلوم نہیں تارو کیا کہنا چاہتی تھی پھر شاید تارو سے کہنا نہ گیا۔

”بیٹیوں کا کیا ہے خود ہی جس کے ہاتھ چاہیں ان کے گلے کی رسی تھما دیں۔“ تارو نے خود ہی پھر

ٹھہر کر کہا۔

”وہاں کا پانی اچھا ہے؟“ پورو نے پھر پوچھا۔

”نہ بھی اچھا ہو پھر بھی اچھا ہے“ تارو نے جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے پانی ہی نہ اچھا لگا ہو“ پورو نے بات جاری رکھنے کے لئے کہہ دیا۔

”بیٹیوں کو ہمیشہ پانی مناسب ہی لگتے ہیں۔“ تارو نے کچھ اس طرح کہا کہ پورو اس کے چہرے

کی طرف بس دیکھتی رہ گئی۔

”تارو! میں تیری اپنی ہوں، کچھ بتاتی کیوں نہیں.....؟“

پورو نے اس طرح اپنائیت سے کہا تارو کا جی کھل اٹھا۔

”میری بہن! میں کیا بتاؤں، بیٹیوں کو کچھ بتانے کے لئے رب نے زبان ہی کب دی

ہے.....؟“

”ٹھیک ہے تارو!“

”ماں باپ کے پاس میرے لئے جگہ نہیں تھی، کسی بھی بیٹی کے لئے والدین کے پاس جگہ نہیں

ہوتی۔ میرے شوہر کے پاس میرے لئے کوئی جگہ نہیں، کیونکہ اس کا دل اور اس کا گھر کسی اور عورت سے ملا ہوا

ہے۔“

”تارو کیا تیرے شوہر کا پہلے بھی بیاہ ہوا ہے پھر تیرے ماں باپ نے تجھے کیوں وہاں دیا؟“

”ان کو پہلے علم نہ تھا۔ ویسے بھی اس کا پہلا بیاہ نہیں ہوا اس نے صرف ایک عورت گھر میں رکھی ہوئی



ہے۔

”لیکن اس کے ماں باپ کو تو خبر ہوگی؟“

”سب جانتے تھے۔ صرف وہ عورت ان کی ذات سے نہیں، کمی ذات سے ہے۔ اس کے ماں

باپ کہتے تھے اپنی ذات کی بہو گھر میں لانی چاہیے۔“

”لیکن انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ پرانی بیٹی کا کیا حال ہوگا؟“

”دوسرے کے دکھ کو کون جانتا ہے۔ ویسے وہ کہتے ہیں ہم روٹی دیتے ہیں، کپڑے دیتے ہیں، گھر

میں سب کچھ تو ہے پھر دکھ کیسا؟“

”جیسے عورت کو صرف روٹی اور کپڑا ہی چاہیے“ پورو نے کہا۔

”تو دیکھتی نہیں میرے اندر آگ جل اٹتی ہے، سارے دیکھتے ہیں پورو، دو سال ہو گئے ہیں میں

روٹی اور کپڑے کے لئے اس کے پاس اپنا جسم بیچتی ہوں۔ دیکھ میں طوائف ہوں، دیکھ میں طوائف ہوں۔“ یہ

کہتے ہوئے تارو گر پڑی۔ تارو کی منھیاں بند ہو گئیں۔ تارو کی آنکھیں پھرا گئیں۔ تارو کا جسم لکڑی کے تختے

جیسا ہو گیا۔ پورو ڈر گئی۔ تارو کے گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ پورو کو معلوم نہ تھا کہ کیا کرنا ہے۔ پورو ڈری اور

گھبرائی، تارو کی ٹانگیں دبائے لگی، تارو کے شانے دبائے اور تارو کی ہتھیلیوں کا مساج کیا۔ تارو کو ہوش آ گیا۔

”تو مجھے ہاتھ مت لگا، میں طوائف ہوں، تو دیکھتی نہیں..... تو دیکھتی نہیں.....“

تارو ایسی ہی باتیں کر رہی تھی، پورو سوچ رہی تھی کہ ابھی اسے ہوش نہیں آیا۔ اتنی دیر میں تارو کی ماں

آگئی۔

”ہائے کیا کروں میں، ایک تو قسمت کی ماری ہوں دوسرا اس کی باتوں نے مار دیا ہے۔“

تارو کی ماں ٹڈ حال ہو کر بیٹھ گئی۔ پورو چپ چاپ کھڑی رہی۔

”اس نے اور اس کے بھائی نے تو ہماری جان نکال لی ہے۔ لاہور کالج میں پڑھنے کیا گیا ہے،

بہن کو بھی پڑھا پڑھا کر بگاڑ دیا ہے۔ دیکھ کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔“ تارو کی ماں نے پھر دکتے ہوئے

دل سے کہا۔

”ماں! قبر بھی تو اس بے چاری پر نازل ہوا ہے۔“ پورو کہنے لگی۔

”بیٹی.....! ہم نے بیٹی جو دی ہے، ہمارا سر جھک گیا ہے، ہم کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ اچھا سلوک

کرے یا برا، آخر مرد ہے۔" تارو کی ماں نے پھر کہا۔

"میرا سر بھی جھک گیا ہے، پاؤں بھی جکڑے گئے ہیں، اس کا کیا گیا، اس کو تو کوئی رب جھکا نہیں

رہا، اس جیسا کوئی رب پیدا ہی نہیں ہوا۔ رب نے ساری رسیاں میرے پاؤں میں ہی ڈال دی ہیں۔"

تارو کی مٹھیاں پھر بھینچ گئیں اور اس کے پاؤں پھر اکڑ گئے۔ ماں نے پانی کے کئی چھینٹے اس کے

چہرے پر مارے۔ کئی چلو اس کے منہ میں ڈالے۔ آج پورو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس نے پہلی بار سنا تھا کہ لڑکیاں

اس طرح بھی سوچ سکتی ہیں۔ لڑکیاں اس طرح بھی بول سکتی ہیں۔ اب تو اس کو کئی غبار اٹھتے تھے اور اسے کوئی

نام نہیں آتا تھا۔

"یہ دھوکا ہے۔ یہ سراسر دھوکا ہے۔ میرا کوئی بیاہ نہیں ہوا۔ سب جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے پکڑتے

کیوں ہو پیچھے بنو۔" بیہوش تارو نے اپنے پاؤں زمین پر بٹخ دیے۔

"تارو ہوش کر کیسی باتیں منہ سے نکال رہی ہے، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ وہ خاوند ہے تیرا، اپنا منہ

بند رکھ، یونہی نہ بولتی جا۔" تارو کی ماں اس طرح کہہ رہی تھی جیسے کسی انجان تارو کو ڈانٹ رہی ہو، ویسے اس کی

اپنی آنکھیں نم تھیں۔ تارو کبھی ہوش میں آ جاتی اور کبھی پھر سے حواس کھو بیٹھتی۔ "وہاں جا کر یہ الٹی سیدھی باتیں نہ

کرنا، جی قابو میں رکھ۔ وہ تجھے جانے یا نہ جانے، رب تو گواہ ہے ناں، تجھے وہ بیاہ کر لے گیا ہے۔" تارو کی

ماں کہہ رہی تھی۔

"ارہی ماں! اگر رب نے میرے بیاہ کی گواہی دی ہے تو جھوٹی گواہی دی ہوگی۔ اری ماں میرا کوئی

بیاہ نہیں ہوا۔" تارو حواس باختہ ہو کر چھت کے لیے شہتیروں کو دیکھنے لگی۔ پورو اس تارو کے چہرے کو دیکھ رہی

تھی جو تارو سب کچھ سوچتے ہوئے بھی، سب کچھ بولتے ہوئے بھی بیاہ کے اتنے بڑے جھوٹ سے چھٹکارہ

نہیں پاسکتی تھی لیکن اس کی عمر کے دن بہت تیزی سے زندگی کے سارے جھوٹ سچ سے ناطہ توڑ رہے تھے۔

شام کا وقت ہو گیا تھا۔ پورو بھرے ہوئے دل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کا من جیسے بھری بھرائی دنیا سے

یکدم اچاٹ ہو گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے گھر کی دیواروں سے بہل رہی تھی۔ اس کے اڑتے ہوئے من کو

رشیدے کی چھوٹی چھوٹی باتوں نے، گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج نے، سب سے بڑھ کر جاوید کے تو تلے

پن جیسے مہین دھاگے نے اپنی پیٹ میں لے لی تھی۔ اس کا من کچھ تک گیا تھا۔ آج تارو کی رنج بھری باتوں

نے جیسے پورو کے من کی تاریں ہلا دیں، اس کا من چین میں نہیں تھا۔ رات کا کھانا تیار کرتے ہوئے اس کو جیسے

نمک اور ہلدی کا تناسب بھول گیا تھا۔ اس کی دال بھوکھ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی بے ڈھنگی روٹیاں کناروں سے جل گئیں۔ اگلے دن بھی درو کسی طرح سے بھی بچھلے دن کی نسبت کم نہ ہوا۔ پھر معلوم نہیں پارو کو کیا سوچھا اس نے اپنا کھانا دو وقت کر دیا۔ رات ابھی آدمی سے زیادہ بھی نہ ہوتی وہ جاگ اٹھتی، دھیان ایک جگہ نہ کر سکتی کئی گھنٹے آنکھیں اور کان بند کر کے دنیا و مافیاء سے بے خبر ہو جاتی۔

اس کا سونا کم ہو گیا، اس کا کھانا کم ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے چوکریں نمک ملا کر اپنے لئے ایک روٹی پکانی شروع کر دی جس کو کھانے کا تھک نہ لگتا جس کے ساتھ دودھ دہی بھی نہ ہوتا۔ وہ اسی روٹی کے سہارے سارا دن کاٹ لیتی۔ گنتی کے دنوں میں اس کی آنکھوں کے گرد نیلے نیلے ہالے گہرے ہونا شروع ہو گئے اور اس کا جسم بری طرح مرجھا گیا۔

بچھلے کچھ دنوں سے رشید بات بے بات پورو کا جی بہلاتا رہا۔ مذہبی تہواروں میں برتے گئے اصولوں پر ٹھنکنا ہنسی کرتا، پورو کا من پر چانے کی کوشش کرتا رہا۔ پیار بھی پہلے سے زیادہ کرنے لگا لیکن رشید کے سارے جتن جیسے پورو کے ترو دل و دماغ سے نکل گئے۔

پورو کی حالت ویسی کی ویسی ہی رہی۔

رشید کے کامن روز جل جل کر اب بچھنے لگا تھا۔ پورو کا دن بد دن اترتا ہوا چہرہ رشید سے دیکھنا نہ جاتا جیسے رشید کے آنکھوں میں ویرانی نے پاؤں جمائے ہوں۔ رشید کے چہرے پر بھی چپ نے ڈیرے ڈال لئے۔ وہ دونوں گھر، سماج اور جسم کی دیواروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی تھی۔ پورو کے گھر دودھ دینے والی بھینسیں تھیں۔ وہ روزانہ دودھ جھاتی، دہی بلوتی، رشید کے کھیت میں کام کرنے والے جب چارہ وغیرہ لے کر آتے وہ ان کو، ان کے بچوں کے لئے لسی کے کٹورے بھر دیتی۔ مکھن ڈال دیتی، پورو کے منہ کچھ نہ لگتا۔ رشید کے کامن بھی جیسے کھانے پینے سے اکتا گیا تھا۔ گھر کے چولہے میں گرم آگ دہکتی لیکن گھر میں بول چال اور زندگی کی ساری ہریالی پر کبر جم گئی تھی۔

جاوید کے بھولے بھالے چہرے پر جیسے ماں باپ کے اداس چہروں کی پرچھائیاں پڑی ہوئی تھیں، جاوید کے لئے کوئی خاص چاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ بیشک پورو سارے فرائض بھاری تھی اور بلاشبہ رشید جاوید کو دل سے پیار کرتا تھا۔

ایک رات سوئے ہوئے رشید کے جسم دھک اٹھا۔ سویر کو جب پورو نے رشید کے ماتھے پر

ہاتھ لگایا تو اُسے تیز بخار تھا۔

گاؤں کے حکیم نے اپنا دوا دارو کیا تھا۔ رشیدے کے بخار کو تیسرا دن تھا جب حکیم نے شبہ ظاہر کیا کہ رشیدے کو شاید معیادی بخار ہوا تھا۔

پورو کے سارے دھیان اور اداسی کو رشیدے کی بیماری نے کھینچ لیا تھا۔ وہ رشیدے کو دوا دیتی، جسم دباتی، رسوئی کو دیکھتی۔ جاوید کا چہرہ اتر گیا تھا، دوپہر ہو جاتی، جاوید کے چہرے پر میل جم جاتی، پورو کو اسکی دیکھ بھال کے لئے وقت نہ ملتا، کئی راتیں گزر گئیں، کئی دن گزرنے کے باوجود رشیدے کا بخار نہ اترتا۔

”پورو میرا گناہ بخش دو، پورو میری بھول معاف کر دو، پورو..... پورو.....!“ رشیدہ بخاری غنودگی میں کہہ رہا تھا۔ رات کا تیسرا پہر تھا پورو گہرا گئی، کئی دنوں کی تیمارداری اور راتوں کی بیداری نے پورو کو پہلے ہی تھکا دیا تھا، گہرائی ہوئی پورو اٹھ کر رشیدے کی چار پائی کے پاس بیٹھ گئی۔ رشیدے کا ماتھا سہلاتی رہی۔ رشیدے کے پاؤں دباتی رہی لیکن رشیدے کو ہوش نہیں تھا۔

”اچھا پورو میں چلتا ہوں..... پورو میری روح....“ رشیدہ اٹھنے پھوٹنے جملے بولتا رہا۔ پورو کا جی ڈولنے لگا۔

”بس کر رشیدہ! میرے زخموں پر ٹھک نہ چھڑک۔“ پورو نے جھپٹتے ہوئے کہا لیکن رشیدے کو کوئی ہوش نہ تھا اور رشیدہ اسی طرح کئی جملے بول رہا تھا۔ کوئی کوئی بات پورو کو سمجھ آتی اور کئی باتیں رشیدے کے گلے سے نکل کر اس کے ہونٹوں پر ہی ختم ہو جاتیں۔

رات کا اندھیرا بہت سیاہ تھا۔ پورو گھر میں اکیلی تھی لیکن پورو کو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا میں اکیلی ہے۔ رشیدے کے بغیر کسی نے پورو کے زخموں پر مرہم نہیں رکھنا تھا۔

گھرے کے ٹھنڈے پانی میں کپڑے کے ٹکڑے بھگو بھگو کر پورو نے رشیدے کے ماتھے پر رکھے۔ ماتھا چوڑھے کی اینٹ کی طرح گرم تھا، کپڑے پانی میں بھیگتے رہے، کنورے میں ڈالا ہوا پانی منٹوں میں گرم ہو جاتا، پورو نے پانی بدلا اور اس کی آنکھوں سے کئی بوندیں نکل نکل کر رشیدے کے ماتھے پر پڑتی رہیں۔ جب صبح کی پو پھی اس وقت تک معلوم نہیں پانی کی ٹھنڈک سے یا آنسوؤں کی گرمی سے رشیدے کا بخار اتر گیا۔ رشیدے کا جسم کھل گیا تھا۔ رشیدے کی بیہوشی نیند کے آرام میں بدل گئی۔

رشیدے کی آنکھ جب کھلی تو اس کو اپنا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اس کے ماتھے میں آج درد کی ٹیسیں

نہیں اٹھ رہی تھیں۔ رشید نے آرام سے سانس لیتے ہوئے بائیں جانب کروٹ لی۔ پورو رشید کے سر ہانے زمین پر بیٹھی بیٹھی چار پائی کی ٹیک لگائے سوچتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اب تک گیلا کپڑا پکڑا ہوا تھا اور پاؤں کے پاس پانی کا کنورا پڑا ہوا تھا۔

اپنی ساری بیماری، پورو کی ساری خدمت، رشید کے من میں نبرد آزما تھی۔ بقی ہوئی رات کا مشکل وقت، رشید نے پورو کے چہرے اور کنورے میں پڑے کپڑوں کو اچھی طرح دیکھا اور اپنا کنورہ سا لاغر ہاتھ پورو کے سر پر رکھ دیا۔ پورو کے بکھرے ہوئے بالوں میں رشید کے کی انگلیاں پھرتی رہیں، رشید کے کی پوریں پورو کے کانوں اور ماتھے کو دھیرے دھیرے چھوتی رہیں۔ پورو کا بیت نیند کی آغوش میں گرا ہوا تھا۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل نکل کر رشید سے کے کھیس پر پڑتے رہے۔ رشید ایک عجیب سے نشے میں جاگتا رہا۔

رشید نے پورو کے جسم پر تو قبضہ کر لیا تھا، رشید کو لالچ تھی کہ پورو کی روح تک تمام حقوق حاصل کر لے۔ پورو کی اداسیاں رشید کے کو نوچ نوچ کھاتی تھیں۔ اس وقت پورو ٹوٹی ہوئی گندل کی طرح رشید کے کی چار پائی سے لگی ہوئی تھی۔

رشید میں ہمت نہیں تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ پورو کو کلیجے کے ساتھ بھیجے لے۔ پچھلے دنوں کی گہری اداسی سے رشید کے کامن ٹھکرایا ہوا تھا۔ اس وقت رشید کے کو پورو کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ پورو کے تن من میں رشید کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ رشید نے ہاتھ مزید آگے کرتے ہوئے پورو کے رخسار سے لگا دیا۔ ہاتھ شاید زور سے دب گیا، ہاتھ کے دباؤ نے پورو کو جگا دیا۔ پورو ڈر گئی لیکن رشید اکول نظروں سے پورو کو دیکھتا رہا۔

رشید کے کو چار پائی پر پڑے پڑے ٹھیک دس دن ہو گئے تھے۔ اس کا بخار دھیرے دھیرے اتر گیا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا لیکن اس کا من بہت زیادہ چنچل تھا۔ پورو نے اپنا دھیان رشید کے کی طرف موڑ لیا تھا۔ رشید کے پاس بیٹھ بیٹھ کر پورو نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ جاوید کو بنا سنوار کر پورو رشید کے پاس بٹھا دیتی، جاوید کو چھوئے چھوئے جملے سکھاتی، جاوید، رشید کے آگے پیچھے ہوتا اس کی نقلیں کرتا تھا۔ ماں کے سکھائے ہوئے نونے پھوئے جملے بولتا تھا۔

رشید کے کامن جاگا ہوا تھا۔ رشید کے کاتن پھول سا ہلکا تھا۔ رشید امن ہی امن میں اپنی بیماری کو

دعائیں دیتا تھا۔ خوشی پہلے سے دگنی لگتی ہو کر رشیدے کے صحن میں لوٹ آئی تھی۔

پورو کا جی چاہا کہ کسی دن سچ سچ وہ بھول جائے کہ رشیدے نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا وہ رشیدے کو بہت پیار کرے۔ رشید اس کا شوہر تھا۔ رشید اس کے بچے کا باپ تھا۔ بس یہی ایک سچ تھا باقی سب جھوٹ۔

## ایک اور منہ بھر

اگلے چند دنوں میں رشید نے ایک دو چکر اپنے گاؤں چھوڑ آئی کے لگا لیے تھے۔ اس کی جوسمین اپنے بھائی کے ساتھ مشترکہ تھی، وہاں سے اپنے حصے کا اناج وغیرہ لے کر سچ دیا تھا لیکن پورو جس دن کی سکر آ لے آئی تھی اس نے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ کبھی رشید کچھ کہتا تو پورو ہنس کر کہہ دیتی "میں نہ تو اپنی مرضی سے اس گاؤں میں آئی تھی اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس گاؤں سے جاؤں گی۔" جاوید اب دوڑتا پھرتا تھا۔ رشید ایسے شروع ہی سے نرم مزاج تھا، پورو سے وہ ویسے بھی پیار کرتا تھا لیکن جاوید سے اس کو بے حد پیار تھا۔ جاوید کو وہ چوم چوم کر بھی نہ تھکتا۔ جاوید بھولی بھالی باتیں بھی کرتا تھا "ابا..... ابا....." کہتا وہ رشیدے کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا تھا۔

پورو چوٹھے کو چکنی مٹی پوتی۔ جاوید دوڑا دوڑا آ کر گیلی مٹی کو تھپتھپاتا۔ پورو کے بنائے ہوئے چوٹھے کو بگاڑ جاتا۔ پورو کسی میں نمک ڈال کر پیئے لگتی۔ جاوید ہلدی اور مرچیں اس کی لسی میں ملا دیتا۔ جاوید الماریوں کے پیچھے چھپ جاتا، رشید اسے ڈھونڈتا رہتا۔ جاوید کی بچکانہ ہنسی پر رشید انکی کے دانوں کی طرح کھل اٹھتا۔ ایک دن ایک عورت گلی میں مٹی کے کھلونے بیچ رہی تھی، جاوید مٹی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور سرکنڈوں کے جھنڈ جھنڈے دیکھ کر پورو کا آنچل کھینچنے لگا۔ پورو نے تھوڑے سے دانوں اور پرانے کپڑوں کے عوض مٹی کے کھلونے خریدے اور ابھی وہ گلی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ دور سے دوڑتی ہوئی ایک پاگل عورت گزری۔

عورتوں نے بھاگ کر اپنے بچے چھپا لیے، دروازے بند کر لیے، بچوں نے چیخا شروع کر دیا۔ پاگل عورت کے جسم پر پنڈلیوں تک اونچی ایک شلووار تھی، اس کے سوا اس کے جسم پر کچھ نہ تھا، اس کا رنگ شاید دھوپ سے جھلسا ہوا تھا یا ویسے ہی کالا تھا، اس کے سر پر بالوں کی لٹیس بن گئی تھیں جیسے جب سے وہ پیدا ہوئی



تھی، کبھی نہائی، جھوٹی نہیں تھی، مانگوں کو عجیب طریقے سے مل دیتی، ہازوؤں کو عجیب طرح سے پھیلاتی تھی، چلتے ہوئے بھی دوڑے جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے اس کی ڈراؤنی ہنسی میں چھدرے دانتوں پر ہی نظر جاتی تھی، اس کے سونکھے ہوئے جسم سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک پنجر جیسے دوڑتا پھرتا تھا۔

پورو دیکھ کر کھڑی رہی، پاگل دوڑتی ہوئی آئی اور کھلونے بیچنے والی گلی کی چھاج سے کھلونے مٹھیوں میں بھر کر بھاگ گئی۔ اس کی ڈراؤنی اور چیخنی ہنسی کی آواز دیر تک گلی میں گونجتی رہی۔ پگلی بھاگ گئی، عورتیں پھر دروازے کھول کر باہر آ گئیں۔ کھلونے بیچنے والی اپنے آدھے چھاج کو دیکھتی رہی۔ عورتیں ہنستی رہیں کہ وہ پاگل کھلونے اور جہنم جہنموں سے کسے ڈرائے گی۔ پگلی سارا دن کھیتوں میں گھومتی پھرتی۔ کھیت سے آجھ توڑ کر کھا لیتی، کئی دفع عورتیں ایک دوروٹیاں بیٹھی ہوئی پاگل کے سامنے پھینک دیتیں، وہ چبا جاتی۔ کئی بار عورتیں کوئی پھٹی پرانی قمیض اسے پہنا دیتیں، پاگل کھکھلا کر ہنس پڑتی، قمیض پہنے رکھتی پھر اس کے منہ توڑ دیتی پھر کسی دن قمیض دانتوں سے پھاڑا لیتی۔ لیریں اس کے گلے میں لٹکتی رہتیں، پھر پاگل ان لیروں کو بھی کھینچ کر اپنے جسم سے دور کر دیتی۔ کبھی اپنے جسم سے سب کچھ اتار پھینکتی۔ عورتیں پھر کوئی پھٹی پرانی شلوار، کوئی پھٹی پرانی قمیض اسے پہنا دیتیں۔

پگلی اب سکر آ لے گاؤں میں جیسے رچ بس گئی تھی، اسے روز روز دیکھنے کی سب کو عادت ہو گئی تھی، کئی بار گاؤں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے اس کے پیچھے پڑ جاتے، تالیاں بجاتے، اسے دوڑاتے، وہ اس کے پیچھے بھاگتے، پھر کوئی راہ چلتا سیانہ لڑکوں کو دھمکاتا، لڑکے اس کا پیچھا چھوڑ دیتے۔

چھوٹے چھوٹے بچوں نے ضد کرنا چھوڑ دی، مائیں اس پاگل کا ڈراوا دیتیں۔ ”پگلی پکڑ کر لے جائے گی“ روتے ہوئے بچے سہم کر چپ کر جاتے۔ پاگل کسی چھپر تلے پڑی رہتی۔ کبھی کوئی پانی کا پیالا اس کے پاس، روٹی کا ٹکڑا اس کے سر ہانے رکھ دیتا۔ کسی رحم دل نے چھپر کے نیچے ایک پھنا لحاف رکھ دیا۔ پگلی آرام سے وہاں جا کر رات بھر پڑی رہتی۔

پگلی بس دوڑتی تھی اور ہنستی تھی۔ کسی کے بچے کو کچھ نہ کہتی تھی، کبھی کسی کی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ زمین پر گرے پڑے روٹی کے ٹکڑوں کو اٹھا لیتی اور چاٹ لیتی۔ کچھ ہی دنوں میں سب نے دیکھا اور پورو نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا، پگلی کے پیٹ کا ابھار بڑھ رہا تھا، سارے گاؤں کی عورتیں جیسے شرمائیں گئیں۔

پگلی نہ تو کچھ بولتی تھی نہ بتاتی تھی۔ پگلی کا جسم دن بدن بھرتا جا رہا تھا۔ پگلی کی پسلیاں روز بروز کنسی جا رہی تھیں۔ عورتوں کا جی چاہتا وہ پاگل کو کچھ پہنا کر رکھیں۔ وہ پاگل کو کسی متبادل جگہ رکھیں۔ پگلی کے دھیان میں کچھ نہ آتا تھا۔ پگلی ویسے ہی ہنستی اور ویسی کی ویسی دوڑتی رہتی۔ ایک دن جب شام گہری ہو گئی، دو چار مرد مل کر پگلی کو ڈراتے دھمکاتے گاؤں سے باہر چھوڑ آئے۔ اس رات پگلی کسی کو نظر نہ آئی۔ سب نے سوچا، اب پگلی اس گاؤں سے چلی گئی ہے، آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ پگلی اب کسی اور گاؤں چلی جائے گی۔

دوسرا دن ابھی آدھا ہی گزرا تھا کہ پگلی پھر گاؤں کی زمینوں میں گھوم رہی تھی۔ پگلی پہلے کی طرح گاؤں کے کھیتوں میں ہنس رہی تھی۔

وہ کیسا مرد ہوگا، وہ کیسا وحشی ہوگا جس نے اس طرح کی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا۔ ساری عورتیں لعنت ملامت کرنے لگیں۔ سب شرمندہ ہو جاتیں۔

”جس کے پاس نہ حسن تھا نہ جوانی تھی، ماس کا ایک بت، وہ بھی ہوش میں نہیں تھا، صرف زندہ ہڈیوں کا ایک پنجر..... ایک پاگل پنجر..... چیلوں نے اسے نوح نوح کر کھالیا.....“ پورو سوچ سوچ کر تھک جاتی۔ پگلی کا پیٹ روز بروز بڑھ رہا تھا۔

### پنجر میں پنجر

صبح اندھیرا تھا، اندھیرے میں پورو بلا ناغہ کھیتوں کو جاتی تھی۔ وہ ابھی باہر والی پگڈنڈی پر چل رہی تھی، ایک درخت کے نیچے کسی انسان کا بت گرا ہوا تھا، وہ ٹھٹھک گئی لیکن اس کا دل اتنا چھوٹا نہیں تھا وہ دھیرے سے اس بت کی طرف بڑھی، اس کے لئے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ پگلی درخت کے نیچے پتھر ہو چکی تھی اور اس کے پاؤں کے قریب ایک نو مولود کا بت تھا۔ جس کا نازو ابھی اس کی اول سے لگا ہوا تھا۔

پورو نے آہ بھرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے اس کے ہوش اڑ گئے ہوں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری گھوم گئی اور وہ اپنے پاؤں بھاگ کر رشیدے کو بلا لائی۔

ایک پھٹی ہوئی چادر کا پلو پورو نے پگلی کے جسم پر ڈالا، پھر رشیدے نے پگلی کی نبض کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ نبض ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ موت کی مہر پگلی کے چہرے پر نمایاں تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے



ماٹھے پر جم گئی تھی۔

قدرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ بنگلی کے بالوں میں نظر آ رہی تھی، بچے کے منہ میں اس کا دایاں انگوٹھا تھا۔

”یا اللہ.....“ رشیدے کے منہ سے نکلا اور چاقو سے اس نے بچے کا ناز و کاٹ دیا۔

پورو نے سر کے پلو میں بچے کو لپیٹ لیا اور دونوں گھر واپس آ گئے۔

صبح کی دھند کی طرح سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی، آنا گوند جیتے ہوئے عورتوں کے ہاتھوں سے پراتیں چھوٹ گئیں، جلتے تنوروں کو چھوڑ کر عورتیں پورو کے گھر بچہ دیکھنے جاتیں۔

روٹی کے کالے جیسا سفید اور ملائم بچہ پورو نے نہلا دھلا کر ایک چوکی پر لٹایا۔ گرم دودھ میں گرم کپڑا بگلو کر اس نے اس کے ہونٹوں پر لگایا۔ بچہ پورے انہماک سے دودھ کی بوندیں چوس رہا تھا۔ جاوید اپنے سنے مہمان کو مزہ مزہ کر دیکھ رہا تھا۔

”رب تیرا بھلا کرے۔“

”رب تجھے زیادہ دے۔“

”تمہارا بچہ بچے جس۔“

”بہت اچھا کیا ہے۔“

عورتیں آ آ کر کہتیں، رحم کرنے پر اس کی ہمت بندھ جاتی اور واپس لوٹ جاتیں۔ دو چار آدمیوں نے مل کر بنگلی کی نعرش ٹھکانے لگا دی۔

شام ہونے کو تھی، پورو بچے کے کاموں میں مصروف تھی۔ رشیدے نے لائین کی بنی صاف کر کے جب جلائی۔ بچے نے موٹی موٹی آنکھوں سے لائین کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کی یکمی نظر تک نہیں رہی تھی پھر وہ اپنے دھیان ہو گیا۔ پورو نے سوچنا شروع کر دیا۔

بنگلی کے کالے بچہ کو کس مرد نے ہاتھ لگایا ہوگا۔ شاید بنگلی کی مرضی سے، شاید زبردستی سے اور اس مرد کو کبھی بھول کر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے بنگلی کے ساتھ کیسی ہونی برتی ہے۔ کبھی اس بھوکے مرد کو اپنے بچے کی بھی یاد نہ آئی جس کی امانت اس نے بنگلی کے پاس رکھی تھی.....

بنگلی کو شاید علم بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ دروازہ اس نے کس طرح برداشت کیا ہو

گا۔ اس کے لئے کسی دائی کے دل میں رحم نہ اٹھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ چیختی ہوئی۔ کھلی ہواؤں کے جھونکوں سے لڑتی ہوئی۔ ٹھنڈی زمین کی مٹی پر بھٹکتی ہوئی لیکن قدرت کے کڑے قانون سے جزا سارے درد سمیٹنے اس کا بچہ خود باہر دنیا میں آیا ہوگا۔ مٹی پر گر گیا ہوگا اور درد کی ماری پگلی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوگی۔ پھر پورو کو یاد آتا، پگلی نے زندہ رہ کر کیا لینا تھا۔ اس نے اپنے بچے کی کوئی دیکھ بھال کرنی تھی۔ اچھا ہوا اس کی جان چھوٹ گئی۔ اس کا بچہ کتنا خوبصورت تھا۔ ٹیڑھی ہڈیوں کے پنجر میں کیسے اتنا خوبصورت بچہ پل گیا۔ کیسی موٹی موٹی اس کی آنکھیں تھیں۔ بھرا ہوا چہرہ تھا، پورے مرد کا ایک چھوٹا سا ڈھانچہ تھا۔ نہ جانے اس کا بد بخت باپ کون تھا.....

انہیں سوچوں میں پورو کو خند آگئی۔ اس نے دیکھا ایک تیز گھوڑی پر رشید اسے اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ کسی باغ کے چھپر میں اس کو تین دن رکھا، رشید نے پورے تین دن رکھنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔ پورو پگلی ہو گئی۔ گلیوں میں پھرنے لگ پڑی، اس کے پیٹ میں ایک بچہ سرکنے لگ پڑا اور پھر..... پھر ایک دن ایک درخت کے سایے میں پورو نے ایک بچے کو جنم دیا جس کی شکل ہو ہو جاوید جیسی تھی۔ اس کا بچہ اس کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ کے لئے رو رہا تھا اور پورو کو دودھ نہیں آ رہا تھا.....

پورو کی ڈر سے آنکھ کھل گئی، سامنے چوکی پر اس کا نیا بچہ سخت رو رہا تھا۔ پورو نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر ڈرتے ہوئے اپنے جاوید کا چہرہ دیکھا۔ جو قریب ہی چار پائی پر تھوڑی دیر پہلے سو گیا تھا۔ پھر پورو نے ڈرتے ہوئے باہر چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے رشید سے کو دیکھا۔ رشید ابھی تک اس کو چھوڑ کر نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس نے اس کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ اپنے گھر میں صحیح سلامت تھی۔ رشید اس کا مہربان شوہر تھا اور جاوید اس کا گھنگریالے بالوں والا بہت خوبصورت بیٹا تھا۔ اس کی گلی میں رہنے والی کو بھی اس سے چوری چھپے پیار کا اظہار کرتی۔ پورو کے دکھ باشتی تھی اور اب اس کا خاندان بڑھ گیا تھا، اس کے گھر میں اللہ نے ایک اور بیٹا بھیج دیا تھا۔ پورو نے اٹھ کر نومولود کا ماتھا چوم لیا۔

پورو نے اٹھ کر سفید زیرہ مٹھی بھر کر کھایا۔ جاوید پورو کا پورے دو سال تک دودھ پیتا رہا اور دودھ چھڑوائے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس نے سنا ہوا تھا کہ سفید زیرہ کھانے سے عورت کو دودھ اتر آتا ہے۔ اس نے چھوٹے بچے کو اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔

تین دن کے بعد پورو کو بچہ دودھ اتر آیا۔ گاؤں کی عورتیں دیکھ دیکھ حیران ہوتیں، بچہ پورو کے

چھوٹے بچے کی حیثیت سے پلنے لگا۔

### دعویٰ دار

جڑی ہوئی پاتھیوں میں جیسے دھیرے دھیرے آگ دہکتی ہے، گاؤں میں کھسر پھسر چل نکلی تھی۔ ”پگلی ہندو تھی، اس کے بچے کو مسلمانوں نے لے لیا ہے، سارے گاؤں کے سامنے انہوں نے ہندو بچے کو مسلمان بنا لیا ہے۔“ بلی جیسے اپنے بلوغت کے کو جگہ جگہ اٹھائے پھرتی ہے پورے چھوٹے بچے کو گلے سے لگا کر اندرونی کمرے میں جائیٹھتی، دیواروں کو چیر چیر کر بھی باتیں اس کے کانوں میں پڑ جاتیں، پہلے تو ایک دو ہندو گھروں میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔

”بلاشبہ پگلی ہندو تھی۔“ کوئی کہتا۔

”ہم نے خود سنا ہے کہ وہ لالہ موسیٰ کے کھاتے پیتے گھرانے کی اچھی بھلی بیٹی کو اس کی سوتن نے اس کو مسان (جلے ہوئے مروے کی راکھ) کھلا دیئے تھے۔ اس وقت سے وہ پاگل ہو گئی تھی۔“ کوئی کہتا۔

”سنا ہے گھروالوں نے زنجیروں میں باندھ کر رکھا لیکن اس کی قسمت میں خوار ہونا لکھا تھا۔“ کوئی یہ کہتا۔

”یہ تو صرف باتیں ہیں، میں نے خود اس کے بائیں بازو پر ”اوم“ کھدایا دیکھا ہے“ کوئی آدمی اپنی بات پر زور دے کر کہتا۔

”اندھیر ہے دوستو! ہمارے دیکھتے دیکھتے مسلمان ہماری آنکھوں میں مٹی ڈال گئے.....“

”لعنت ہے ہم پر، ہندو بچے کو انہوں نے بل بھر میں مسلمان بنا لیا۔“

”چھوڑ دو دوستو! نہ جانے وہ کس کی ناجائز اولاد ہے۔ ہم اس کتے کے بچے کو کہاں باندھیں گے۔“ کوئی آدمی یہ بھی کہہ دیتا۔

”نالائق! سوال اس وقت مذہب کا ہے اس طرح تو کل کلاں کو وہ سارے گاؤں کو مسلمان بنا لیں گے اور تم ان کا منہ دیکھتے رہو گے۔“ ایک دو آدمی اکٹھے ہی اونچی آواز میں بول اٹھتے۔

کمرے کی فضا کچھ اس طرح ہو جاتی جیسے دروازوں کے اندر وہ گھٹ کر رہ گئی ہو۔

”اس لڑکے کو واپس لے کر رہیں گے، دیکھ لیں گے کون ہماری راہ میں آتا ہے۔“  
 ”اصل میں تو چار بیسوں کی بات ہے، مہری کو چند اکٹھا کر دیں گے وہ خود ہی لڑکے کو پال پوس دے گی۔“ کوئی آدمی جوش سے زمین پر آگے سرکتے ہوئے کہتا۔

”ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں، سارا گاؤں مل کر ایک بچہ بھی نہیں پال سکتا؟“  
 ”نہ جانے بچہ بھی پگلی کی طرح گونگا بہرہ ہی نہ نکلے کہ.....“ درمیان سے پھر کوئی آدمی بول

اٹھتا۔

”پھر کیا ہے دھرم شالا میں بڑا ہو کر جھاڑو لگا دیا کریگا، دو وقت کی روٹی ہی کھائے گا۔“  
 پھر وہ ایک دوسرے کی دلیری پر ہلاشیری دیتے، اور خوش ہوتے۔  
 ”پہلے مہری سے تو پوچھ لو۔“ کوئی آدمی کہہ دیتا۔  
 ”ارے واہ، کیوں نہیں رکھے گی، چاندی کا جوتا اس کے سر میں دے ماریں گے اور پھر لڑکے کی بات کریں گے۔“

”ارے بچے کا کیا ہے، دھرم شالا میں تو ڈھور ڈنگروں کا ہی اتنا کام ہے، مفت میں کام کرنے والا مل جائے گا۔“

”پہاڑ سے ابھی گری نہیں..... ارے لڑکا بڑا تو ہو لے، پہلے ہی اس کا.....“  
 ”ارے مرتے کیوں جا رہے ہو؟ اگر دھرم کے نام پر تم اتنا کچھ بھی نہیں کر سکتے تو جامرواندھے کنویں میں۔“

”تمہارے کھیت کا پانی کوئی اپنے کھیت کو لگا لے تو تم اس کا سر پھاڑ دیتے ہو، آج وہ تمہارے ہندوؤں کا لڑکا اٹھا کر لے گئے ہیں تو تمہارے منہ کو پھپھوندی کیوں لگ گئی ہے؟“

کمرے کی فضا اس طرح ہو جاتی جیسے اس میں پتھر کے کونلوں کا دھواں مل گیا ہو۔ اب رشید اجب باہر اپنے کھیتوں کو جاتا تو پاس سے گزرتے ہوئے ہندو اسے گھور گھور کر دیکھتے، رشید اپنے ہی دھیان میں چلتا جاتا۔

ایک دو بار رشید نے دھیرے دھیرے پورے کہا بھی ”گاؤں کی فضا اچھی نہیں، انہوں نے اس جھگڑے سے کیا لینا ہے۔ ویسے ہی بات بڑھ جائے گی۔ کوئی بات نہیں اگر ان کی یہی مرضی ہے وہ لڑکے

لے جاتے ہیں تو لے جائیں، جوڑ کے کی قسمت میں ہے وہ ہو جائے گا۔“

پورو کہتی تو کچھ نہ، ویسے اسے ہول اٹھتے۔ اس نے ہڈیوں کے چھوٹے سے بنجر کو دن رات گلے لگا لگا کر چھ ماہ کا کیا۔ اب وہ بھی جاوید جیسا گول منول نکلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پورو کو پہچاننا شروع ہو گئی تھیں۔ جہاں جہاں پورو جاتی وہیں اس کی آنکھیں اس کا پیچھا کرتیں، وہ رشیدے کو دیکھ دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا تھا.....

پھر پورو سوچتی پہلے ہی دن ہندوؤں کو کیوں خیال نہ آیا، اسے لے جاتے، پال لیتے اس کو ماں کی آغوش دیتے۔ اس کو باپ کا پیار دیتے۔ پورو نے چھ مہینے راتیں جاگ جاگ کر گزار دی تھیں۔ اس نے زیرہ پھانک پھانک کر اپنی نسوں سے دودھ نکالا تھا۔ اس نے اس کے گندے کپڑے دھو کر اپنے ناخن گھسائے تھے۔ پھر پورو کو یاد آتا اس نے اپنے بچے کو شہد کی گھٹی دی تھی اور اپنے نزدیکی مسلمان گھروں میں ہجیری ہانٹی تھی کہ بچے کو کہیں بڑے ہو کر یہ خیال نہ آئے کہ اس کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا۔

ایک دن.... گاؤں کے سرخ نے رشیدے کو بلا بھیجا۔ پورو کے ہونٹوں پر چڑی جم گئی، وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سارا اسی کا کیا دھرا ہے۔ رشیدے کو وہ برا بھلا کہیں گے۔ رشیدے کی وہ بے عزتی کریں گے.....

پورو کہہ رہی تھی کہ وہ رشیدے کے ساتھ جائے گی۔ ان کے سوالات کے جوابات اس کے پاس تھے، وہ خود جا کر ان سے لڑ کے کی بھیگ مانگ لے گی..... لیکن رشیدانہ مانا اور اکیلا ہی وہاں چلا گیا جہاں انہوں نے اسے بلایا تھا۔

گاؤں کے ایک ہندو سرخ کے صحن میں تین چار چار پائیاں بکھی ہوئی تھیں جن پر گاؤں کے جانے پہچانے ہندو جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا رشیدادو چار دوستوں کے ساتھ آئے گا یا ہو سکتا ہے نہ آئے پھر وہ رشیدے سے برے طریقے سے پیش آئیں گے لیکن رشیدادو وہاں اکیلا ہی چلا آیا، سلام دعا کرتے ہوئے وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کیوں بھی کیا مرضی ہے تیری...؟ لڑکا واپس کرنا ہے کہ نہیں۔“ حقے کی خزی کو منہ سے ایک طرف کرتے ہوئے ایک نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

”میری کیا مجال ہے؟ اللہ کی ذات ہے دینے والی اور لینے والی میں کون ہوتا ہوں۔“ رشیدے نے

ایک ہاتھ ماتھے پر رکھا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

”یہ تو ہمیں چکنی چڑی ہاتھیں، سیدھی طرح بات کر۔“ ایک نے طیش میں آ کر کہا۔

”میں تو اللہ کے بھروسے پر اسے اٹھالایا ہوں اگر دیر ہو جاتی تو شاید کسی حیوان کی نظر ہو جاتا لیکن

اللہ کی طرف سے ابھی اس کی زندگی تھی.....“

”ٹھیک ہے اگر رب کی طرف سے دعا کا لبا ہے تو کوئی بھی اسے توڑ نہیں سکتا لیکن تمہیں پتہ ہونا

چاہیے کہ اس کی ماں ہندو عورت تھی اور ایک ہندو کے بچے کو اٹھا کر لے جانا ہم برداشت نہیں کر سکتے۔“

”بھلے مانسو! مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہندو تھی یا کچھ اور؟ وہ ہندو گھروں سے بھی کھاتی تھی اور مسلمان

گھروں سے بھی کھاتی تھی.....“ رشید اکبر رہا تھا۔

”لیکن وہ تو شدا سن تھی تم تو شدا ہی نہیں ہو۔“ درمیان سے ہاٹ کاٹتے ہوئے کوئی کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے لیکن پہلے دن ہی اس لڑکے کو لے لیتے، پال لیتے، میں نے کب نہ کی ہے۔ مٹھی برابر

وہ بچہ تھا، میری گھروالی نے دعائیں مانگ مانگ کر چھ ماہ نکالے ہیں اب وہ بچ نکلا ہے تو آپ کو بھی یاد آگئی

ہے۔ خدا کا خوف کھاؤ، خدا ترسی کرتے ہوئے آپ نے پالنا ہے، خدا ترسی کرتے ہوئے میں پال رہا ہوں اور

اس میں سے میں نے کیا لینا ہے۔“ رشید نے کچھ اس طرح کہا کہ دو تین آدمیوں کے چہروں پر بھی یہی

خیال نمودار ہوا، چھوڑ جانے دو، پال رہا ہے تو پالنے دیں، مفت میں بلا گلے میں ڈالنی ہے۔

”دیکھو! ہم بات بڑھانا نہیں چاہتے، نہ ہی وہ ہمارا کچھ لگتا ہے اور نہ ہی تمہارا کچھ لگتا ہے، یہ دھرم کا

سوال ہے سو دھرم کی راہ میں الجھنا نہیں چاہیے ویسے ہی تم اپنی جان کے لئے خطرہ مول لے لو گے۔ کسی نے

تمہارے ساتھ اگر اونچ نیچ کر دی تو ہم ذمہ دار نہیں اب خود ہی بھلے مانسوں کی طرح لڑکا واپس کر دو۔ ویسے ہی

اگر چار دن کھلانے پلانے کے عوض چار پیسے لینے ہیں تو لے لو۔“ ایک سرخ نے کہا۔

”بیشک..... بیشک.....“ کہہ کر سارے بول اٹھے۔

”اللہ..... اللہ.....“ رشید نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کو لگائے۔

”مہری کھڑی ہے، ہمارے دو تین لوگ تیرے ساتھ جاتے ہیں اور لڑکے کو تیرے گھر سے لے

آتے ہیں ہم خود ٹھیک کر لیں گے۔“

”میں ایک بار تم سب کی منت کرتا ہوں اس بے چارے پر رحم کھاؤ اور جہاں ہے وہیں رہنے دو۔“

میری گھر والی اسے اپنے جنم دینے ہوئے کی طرح پال رہی ہے۔“ رشید نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”ہم نے تجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے اگر تم سکھی رہنا چاہتے ہو تو بھلے مانس کی طرح چلو ورنہ ہم جانتے ہیں کہ کبھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلا.....“ دو تین آدمی چار پائیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چادروں کی بکلی ماری، اندرونی کمرے سے مہری آگئی۔ رشید نے کوکھڑا ہونا پڑا، سب لوگ رشید کے گھر کی طرف چل دیے۔ پورو اپنے گھر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو کر گلی سے قدموں کی چاپ سن رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے رشید کے کا جھکا سر اور تین چار آدمیوں کو اس کے ساتھ آتے دیکھا پورو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آج پورو کو اپنے وہ دن یاد آ گئے جس دن اس کی ماں کا ساتھ چھوٹا، جس دن اس کے باپ نے آنکھیں پھیر لیں، جس دن اس کے بہن بھائی اس سے چھڑ گئے تھے۔ یہ لڑکا بھی اس کے جسم کا حصہ بن چکا تھا اور اس رشتے کے ٹوٹنے میں بھی اتنا ہی درود تھا۔

پورو نے بھاگ کر لڑکے کو سینے سے چمٹا لیا۔ رشید اپنے محن میں اس طرح آ کر کھڑا ہو گیا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ نہ تو رشید کے کو کچھ کہنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی پورو کو کچھ پوچھنے کی۔ مہری بھی پل بھر کو سکتے میں آ گئی۔ پورو کے سینے سے بچے کو علیحدہ کرنا بہت مشکل لگا۔

”جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، ہم نے کام کاج بھی کرنا ہے۔“ ساتھ آئے ہوئے تینوں نے کرشت لہجہ میں کہا۔

مہری نے دونوں ہاتھ بڑھا کر بچہ پورو کے ہاتھوں سے اچک لیا۔ پورو کا پلو لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ پورو کو اس طرح لگا جیسے لڑکا اپنے ہاتھ سے اس کا کلیجہ نکال رہا ہو۔ پورو کا پلو کھینچا چلا گیا۔

مہری نے لڑکے کے ہاتھ سے پلو چھڑا دیا۔ لڑکا بلک اٹھا شاید اجنبی ہاتھوں سے۔ پورو ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح سہارا لیکر بیٹھ گئی۔ گلی کے موڑ سے ابھی تک بچے کے رونے کی صدا آرہی تھی۔ شام تک پورو کی چھاتیوں سے دودھ کے بہنے سے اس کی قمیض بھیگ گئی۔ وہ کہتی تھی لڑکا بھوک سے بلک رہا ہوگا۔ اسی لئے اس کا دودھ نکل نکل کر بہہ رہا تھا۔ پورو کے گھر رات کا کھانا کسی نے بھی نہ کھایا جب جاوید نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

”ابا! ہمارے کا۔ کے کو کہاں لے گئے ہیں؟“ یا ”ابا! ہمارا کا کب آئے گا؟“

پورو اور رشید الہا جواب ہو کر اجا پید کی طرف دیکھتے، شرمندہ سے ہو کر چپ کر جاتے۔



پورو کی آنکھوں کے سامنے کوکا چہرہ آ جاتا۔ پورو کی آنکھوں کے آگے لڑکے کا چہرہ آ جاتا۔ پورو رہ رہ کر سو جتی، وہ ٹوٹے ہوئے پھولوں کو کیوں سینے سے لگا لگا کر بیٹھتی ہے؟ وہ نوئی ہوئی کلیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیوں کرتی ہے؟ سب ہی اس کے لئے غیر تھے۔ کوئی بھی اس کا اپنا نہیں بناتا تھا۔ پھر رہ رہ کر اس کو رشیدے کا چہرہ اچھا لگتا۔ ایک وہی اس سے نبھا کر رہا تھا۔ صرف وہی اس کا اپنا تھا، اس کے جاوید کا باپ۔

دوسرا دن اور پھر تیسرا دن گزرا اس سے اگلے روز سارے گاؤں میں ایک ہی شور تھا ”لڑکے نے نہیں بچنا، لڑکا قریب المرگ دکھائی دیتا ہے، لڑکے کا کوئی حال نہیں، دودھ کا جو گھونٹ بھی اس کے حلق سے اترتا ویسے کا دیسا ہی باہر آ جاتا۔“

پورو دو یواروں کے ساتھ لگ لگ کر روتی، پورو کی چھاتیاں دودھ اکٹھا ہونے کی وجہ سے اکڑ گئیں۔ بچے کو دودھ پنے کافی دن ہو چکے تھے۔

”بچے کا دودھ چھڑوا لیا ہے، بچے کی آہ ضرور پڑے گی۔“

”اگر لڑکا مر گیا تو گاؤں پر آفت آ جائے گی۔“

”میں تو اپنے شوہر سے کہتی ہوں، بھلے مانسوں کی طرح جہاں سے بچہ لائے ہو وہاں ہی چھوڑ آؤ۔“

”ہم خود بچوں والے ہیں کسی کی آہ بہت بری ہوتی ہے۔“

”میرا مرد اپنی ہی منواتا ہے میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ پرانی آگ سے تم نے کیا لینا ہے؟“

”کہتے ہیں رات کو مہری نے ٹھنڈا دودھ لڑکے کو پلا دیا تھا، لڑکا کی جان کو خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔“

”بھینس کا دودھ بھلا چھوٹے سے بچے کو کیسے ہضم ہوتا، لڑکے کو اب کیا نیاں آنی شروع ہو گئیں۔“

”ارمی بچے نے دھوکہ کھایا ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے اس کا چہرہ دیکھتا رہا ہے، اب وہ کیسے

بھولے۔“

”بیچارے زبان ہے۔“

گاؤں کی ہندو عورتوں کے منہ پر یہی باتیں تھیں۔ پورو جب یہ باتیں سنتی اس کا جی چاہتا کہ بھاگی بھاگی دھرم شالا جائے اور ان کی منتیں کرے، ایسے ہی ایک جی کو مت مارو۔ بچہ میری جھولی میں ڈال دو، یہ بیج جائے گا۔

پورو کو حوصلہ نہ ہوتا، اسے امید نہیں تھی، پھر دل مذہبی لوگ اس کی منت نہیں سنیں گے.... اس سے



اگلے دن بھی کچھ نہ ہوا۔

پھر اچانک رشید کے صحن میں دو چار لوگ آکھڑے ہوئے۔

”یہ لو اس کی زندگی تمہارے حوالے کرتے ہیں اگر بیچ سکتا ہے تو بچا لو اور انہوں نے سفید کپڑوں

میں لپیٹا ہوا پیلا بے ہوش بچہ رشید سے کی جھولی میں ڈال دیا۔

ایک بار تو رشید سے کا جی چاہا کہ وہ کس کرا ایک تھپڑان کے منہ پر دے مارے۔

”میری چھ ماہ کی خدمت کے عوض تم چاندی کے چار سکے دیتے تھے اب اس کی نانگیں قبر میں لٹکا کر

میری حوالے کرنے آئے ہو، جاؤ جہاں مرضی لے جاؤ۔“ پور کا خوش چہرہ دیکھ کر رشید اسب کچھ پی گیا۔ ایک

ہی بیٹے کے اندر اندر لوگوں نے سارے گاؤں نے دیکھا، لڑکا پورو کے صحن میں اچھا بھلا کھیل رہا تھا۔

## رتو وال

رحیمے کی بوڑھی ماں کی دونوں آنکھوں کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ رحیمے کی ایک بیوی سات ماہ کی نرم و

نازک بچی چھوڑ کر مرنے اور اس کی دوسری بیوی کی ساس سے کم ہی بنتی تھی۔ رحیمے پر مشکل وقت دیکھ کر اسے

افسوس ہوتا، ابھی تک اس کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے وہ رسوائی کے بیسیوں کام سنوارتی تھی۔ اس نے روئی

کات کات کر دریوں سے ٹرک بھر دیے تھے، اس نے سوت کات کات کر چادروں اور کھیسوں سے گھر بھر دیا

تھا۔ ابھی تک وہ اپنے بڑھاپے میں دانے صاف کر لیتی، آٹا پیس لیتی، کپاس بیل لیتی، صبح سویرے دودھ

بلونے کے لئے بیٹھ جاتی تھی پھر بھی اس کی بہو اس کا مذاق اڑاتی کرتی اور سوچتی تھی اگر وہ آنکھوں سے محتاج ہو

گئی تو اس کو کسی نے پانی بھی نہیں پوچھنا۔

دن رات افسوس کرتی رحیمے کی ماں نے ایک دن پورو کی منت کی کہ وہ اگر چند رہ دنوں کے لئے اس

کے ساتھ چلے تو وہ اپنا علاج کروالے شاید اسے افاتہ ہو۔

”اماں! وہ حکیم کہاں رہتا ہے؟“ پورو نے پوچھا۔

”حکیم کہیں نہیں جی! ایک باؤلی ہے اسے بزرگوں کی دین ہے۔ کہتے ہیں اس کے پانی سے

روزانہ سویرے نماز پڑھ کر آنکھیں دھو لی جائیں تو دونوں میں آنکھوں کی روشنی واپس آ سکتی ہے۔ سنا ہے وہاں

سے کئی تاپیناؤں کی بیٹائی واپس آگئی ہے۔ باؤلی کی منی بھی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔“

”اماں وہ باؤلی کہاں ہے؟“

”رتو وال گاؤں میں، ایک فقیر دہاں رہتا ہے۔ آئے گئے مریضوں کے لئے اس نے باؤلی کے

پاس خیمہ لگوا دیا ہوا ہے۔“

پورو کے کانوں میں جیسے کسی نے تنکا چبھو دیا ہو۔ رتو وال ... رتو وال ... چھتو آئی کے کھیتوں کے پاس کھڑی ہو کر جس رتو وال کو جاتی ہوئی سڑک کا پورو منہ دیکھتی تھی، جس سڑک سے کسی نے پورو کو لینے کے لئے گھوڑی پر چڑھ کر گزرنا تھا ... رتو وال ... رتو وال ...

پورو کے پیروں سے وہ راستے کبھی میلے نہ ہوئے۔ پورو نے اپنی آنکھوں سے کبھی وہ گاؤں نہیں دیکھا۔ پورو کو ایک بھولا ہوا نام یاد آیا رام چند ... رام چند ...

پورو کے اندر سے ایک دھواں اٹھا اور وہ ساری کی ساری شکوے شکایتوں سے لبریز ہو گئی۔  
”ایک بار اس آدمی کا چہرہ تو دیکھوں، کس طرح کا ہے، ایک بار اس کا گاؤں تو دیکھوں کہ کیسا ہے؟“

”اچھا اماں! میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ پورو کے منہ سے جلدی میں نکل گیا، پھر پورو شرمندہ سی ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے رحیم کی ماں نے اس کے اندر کی بات بوجھ لی ہو۔

”اللہ کرے تیرے بچے جنس، دودھوں نہاؤ پوتوں بھلو۔“

رحیم کی ماں کے دل سے دعائیں نکلیں۔ شاید اس کے من میں خیال آیا کہ کہیں اس کی اپنی بہو بھی اتنا ہنسا بول سکتی۔

”اماں! جاوید کے باپ کو تم راضی کرو میں نہیں کہوں گی۔“ پورو نے شرمساری کے کہا۔  
”لو دیکھو، وہ میرا بیٹا ہے کبھی انکار نہیں کر سکتا۔ میری خاطر چار دن مشکل میں گزار لے گا۔“ رحیم کی ماں نے بڑے دعوے سے کہا۔

پورو اچھی طرح جانتی تھی کہ رشید اس کی بات نہیں مانے گا لیکن رشید کے سامنے رتو وال کا ذکر کرنا پورو کے لئے مشکل تھا۔

اس رات پورو کو کئی خیال آئے ”وہ میرا کون ہوتا ہے۔ میں تو آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھوں۔ پرایا مرد اچھے اس کے گاؤں سے کیا؟ گاؤں میں رہتا ہے تو بے شک رہے، اماں اپنا علاج کروائے گی پھر ہم واپس آ جائیں گے۔ بگلی یہ تیرا اندر ہے جو اس کے بارے میں سوچتا ہے، اسے تو تم ایک برے خواب کی طرح بھی یاد نہیں ہوگی۔۔۔۔۔“

پورو سوچتی کہ اس کے گاؤں میں جا کر رات ہوتے ہی اس کے اندر سے جیسے کوئی سوئے ہوئے مرد نے اکھاڑنے لگا، اس کے اندر جیسے کوئی مردوں کو جگائے گا، ان کفنوں کو اتار کر کیا لینا؟ وہ رتو وال نہ جائے۔ وہ رتو وال کے راستے سے بھی نہ گزرے۔ پورو کی زبان سے نہ تو نہیں میں جواب آتا اور نہ ہی ہاں میں۔

جاوید باپ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے رشید سے نے اسے ساتھ نہ بھیجا۔ دونوں عورتوں کو پہنچانے کے لئے رحیمے کا ایک پرانا نوکر ان کے ساتھ گیا۔ پورو چھوٹے بچے کو ساتھ لے گئی۔

ان کا نوکر اپنا سارا سامان پیچھے رکھ کر یکے کے اگلے پہنے پر یکے والے کے ساتھ بیٹھ گیا، پورو اور اماں آنے سے سانسے سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ یکے کے پہلے ہچکولوں سے ہی پورو کا جینا اس کی بھولی میں سو گیا۔ آگے بیٹھے ہوئے نوکر نے اس سے بچہ لے لیا۔ یکہ رتو وال کے راستے پر چلنے لگا۔

گھوڑے کے کھروں کی آوازیں جیسے پورو کے دماغ میں بج رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ یکے کے بانس سے نکالیا اور اسے خیندا گئی۔

بچی ہوئی پاکی میں پورو چاندی کے تھیمے والے ایک گھاؤ تکیے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوڑے کے بوجھ سے اس کے بازو اٹھ نہیں رہتے تھے۔ ہوا کے ایک جھونکے سے پاکی کا کپڑا ذرا سا سرکا۔ مدہم سی روشنی میں اس نے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں پر حنا کے ٹھپے لگے ہوئے تھے۔ کتنی خالص حنا تھی۔ اس کی سہیلیوں نے بہت زیادہ لگا دی تھی۔ بگلی کہہ رہی تھی کہ اسے چلتے ہیں، پاکی میں بیٹھے ہوئے اس کے پہلو تھک گئے تھے۔ پاکی ہچکولے کھا رہی ہے۔۔۔۔۔ اس کے کندھے سے اس کا آنچل ڈھلک گیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے آنچل ٹھیک کیا۔ کنگنوں کی جھنکار سے پاکی میں ایک کھڑکا ہوا۔ وہ بھوک سے بڑھال تھی۔ کل سے وہ کچھ کھانہ سکی۔ اس کی ماں نے مٹھائی کی ایک ڈل اس کی بھولی میں رکھ دی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر منہ میں ڈالے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔۔۔۔۔

پورو کو کندھے سے پکڑ کر اماں ہلا رہی تھی۔ ”سخت دو پہر ہو گئی ہے کوئی لقمہ منہ میں ڈال لے۔“ یکے

دالے نے یکہ کھڑا کر لیا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹے گاؤں کے پاس ٹھہر کر سب نے پانی پیا۔ پوروڈر سے جاگ گئی۔ نہ کوئی پالکی تھی نہ کتھن تھے، نہ حنا تھی نہ چوڑا اور وہ خالی یکے کے پچھلے پھٹے پر ماں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی.....

پورو نے کھی گئے پراٹھے بنا کر اپنے ساتھ رکھ لئے تھے۔ اماں نے وہی کٹھڑی کھولی، نوکر کو چار پراٹھے دیے، خود لیے، پورو کے آگے رکھے، پورو سے نوالہ حلق میں نہیں اتر رہا تھا، تلے ہوئے پراٹھوں کے کھی سے پورو کو متلی ہو رہی تھی۔

”فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے، جلدی ختم کر لیں، رات گھوڑی کو آرام دلوا کر پھر میں نے سویرے واپس جانا ہے۔“ یکے والا کہہ رہا تھا، پھر ویسے ہی سواریاں یکے میں بیٹھ گئیں۔ پورو نے اپنا ماتھا یکے کے بازو پر ٹکا لیا، پچھلی رات اُس نے سفر کے لئے درکار سامان باندھا تھا اور رات جاگتی رہی تھی۔

پالکی پھر ہچکولے کھانے لگی۔ رتو دال کا راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یکدم باجوں اور شہنائیوں کی آواز اونچی ہو گئی۔ پالکی کے ارد گرد باجے ہی باجے بج رہے تھے۔ پورو کو لگا رتو دال آ گیا ہے۔ باجوں کی آواز زیادہ اونچی ہو گئی۔ لڑکیاں گانے گارہی تھیں۔ ایک عورت نے اس کا گھونگٹ اٹھایا..... پھر کسی نے ایک چھوٹا سا بچہ اس کی جھولی میں بٹھا دیا، بچہ اس کی جھولی میں رد رہا تھا، عورتیں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ وہ بچے کا شکر کر رہی تھیں۔ اماں اس کا کندھا ہلاتی تھی۔ ”آج تجھے کتنی فیندا آرہی ہے، بچہ رد رہا ہے۔“

پورو پھر ڈر کر جاگ گئی۔ یکے کے پچھلے پھٹے پر بیٹھی ہوئی اماں اس سے بات کر رہی تھی۔ ”کتنی سڑی بارات ہمارے پاس سے گزر گئی ہے۔ باجے پر باجے بج رہے تھے، آپ کو جاگ نہیں آئی۔“ نوکر کہہ رہا تھا۔

”تجھے سوئی ہوئی کو اس نے بچہ چڑایا وہ بھی تم نے پکڑ لیا پھر بھی تو خیند سے نہیں جاگی۔“ اماں کہتے کہتے ہنس پڑی۔

یکہ رتو دال کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ جب باؤلی کے نزدیک جا کر سب لوگ یکے سے اترے۔ سامنے فقیر کا چھپرہ تھا۔ خیموں کی جگہ فقیر نے دو تین چھپرے بنوائے تھے جن میں دو دروازے آئے گئے مسافر رہتے تھے۔ باؤلی کی مٹی، باؤلی کا پانی آنکھوں پر لگاتے تھے۔ مرادیں مانگتے تھے۔ فقیر نے ان نئے مسافروں کو ایک چھپرہ دلوا دیا۔ نوکر نے سب سامان چھپرہ میں رکھا اور اماں کو لے کر فقیر کے پاس چلا گیا۔ پورو نے چھپرہ میں

پڑی ہوئی بازو، چار پائی پر کھیس بچھا کر بچے کو لٹا دیا اور چھپر کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر سامنے کھیتوں کے پار گاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔

..... میں رتو وال آگئی مجھے کسی نے بلاوا نہیں بھیجا، مجھے کوئی بھی لینے نہیں گیا، کسی نے بھی شہنائی نہ بجاتی، کسی نے گانا نہیں گایا، کسی نے بھی میرے ہاتھوں میں چوڑی نہیں پہنائی، ایک چوڑی بھی میری ہانہوں میں نہیں چھنکی۔ حنا کا ایک پتا بھی میرے ہاتھوں پر نہیں لگا۔

گاؤں کے باہر باؤلی کی چپ پورو کو کھائے جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس گاؤں سے بھاگ جائے، وہ یہاں سے دوڑ جائے۔ رہ رہ کر وہ دانت بیستی۔ اس گاؤں کے لوگ کس قدر بے قدرے ہیں، کوئی اسے نہیں کہتا کہ "بیٹھ جاؤ!" کوئی اسے نہیں کہتا "جین" کوئی اسے نہیں کہتا.....

پورو پھر کچھ سنبھلی۔ اسے لگا کہ وہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں وہ شدائوں کی طرح گلیوں میں بھاگنے نہ لگ جائے۔ کہیں وہ اپنے کپڑے نہ پھاڑ دے۔ کہیں وہ اونچی اونچی آواز میں بولنے نہ لگ جائے۔

اماں کو فقیر نے بتایا، پورو سے تیرہ دن انہوں نے وہاں رہنا تھا۔ ان کا نوکر دوسرے دن واپس سڑا لے چلا گیا۔ آٹا، دال وہ ساتھ لے کر آئی تھیں۔ ویسے کوئی چاہے تو فقیر کی درگاہ سے بھی روٹی کھا سکتا تھا۔

پورو نے گاؤں کی طرف رخ نہ کیا۔ گاؤں کی کوئی بات بھی وہ کس سے پوچھتی اور کہا پوچھتی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ گاؤں جاتی بھی تو کس بہانے.....؟ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو فقیر کے نوکر چاکر سب ہتھ دہیں لادیتے تھے۔ پورو کو یہ سوچ کر ہول اٹھتا کہ وہ گاؤں کے باہر ہی سے واپس چلی جائے گی لیکن گاؤں تک نہ جاسکے گی۔ پورو کے جی میں آتا کہ ہونہ ہودہ جا کر سارا گاؤں دیکھ آئے، اس کا گھر بھی دیکھ آئے، اسے بھی دیکھ آئے لیکن اس کو کوئی نہ جانے..... پھر پورو سوچتی کہ اسے کیسے معلوم ہوگا کہ اس کا گھر کونسا ہے، وہ کسی سے پوچھے گی تو کیسے، پھر گھر کو اندر سے کیسے دیکھے گی تو کیسے..... پھر پورو سوچتی کہ اس نے گھر دیکھ کر کیا لینا تھا۔ اس کا اس گھر سے ناظمی کیا تھا۔ کیوں اس کو اس طرح کے خیالات آتے ہیں، پورو کا جی کسی جگہ نہ نکلتا۔ دن پردن گزر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے پورو کے منہ سے بھولا ہوا گیت نکلا۔

چہ آئے ز چلے

ساڈے آیاں دا قدر نہیں

ہائے رہا! ساڈے آیاں دا صبر پوے

(جیسے آئے تھے ویسے ہی (خالی ہاتھ) لوٹ چلے، ہمارے آنے کی کسی نے قدر نہ کی، اسے

خدا! ہمارے آنے کا (ان لوگوں پر) صبر پڑے)

متحدہ بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور کئی بار اس نے آنسو پئے۔ بچے کو اماں کے پاس لانا کر

پورو کھیتوں سے ہو آتی۔ وہ سوچتی ایک بار دیکھوں اور پہچان لوں۔

پھر وہ سوچتی اتنے سال ہو گئے ہیں کیا پتہ شکل کیسی ہوگئی ہو، چاہے وہ میرے پاس سے گزر جائے۔

مجھے اس کی اتنی زیادہ پہچان بھی تو نہیں ہے۔

کھیتوں میں کام کرنے والوں سے پورو کبھی کبھار پوچھ لیتی۔

”بھائی! یہ کس کے کھیت ہیں، دو گا جریں لینی تھی، ہم تو مسافر ہیں۔“

اگلے دن کسی نے بیج بچ رام چند کا نام لے لیا۔ پورو کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔ پورو کو

پکراتے ہوئے محسوس ہوا کہ وہ اسی مٹی پر گر جائے گی۔ وہ اسی مٹی میں مٹی ہو جائے گی.....

پورو اس کیلکے کے نیچے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، جیسے کسی نے اس کی ٹانگوں سے ہمت نکال لی ہو۔ اس

کے پاؤں جیسے جم کر برف کے ڈھیلے ہو گئے ہوں، اس مٹی نے جیسے پورو کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔

پورو کو محسوس ہوا وہ کھڑے کھڑے انار کا ایک بوٹا بن کر وہاں اگ پڑی ہو۔ جس کے سرخ اناروں کو

جب بھی کوئی توڑنے لگتا وہ جلی ہوئی ککڑی کی طرح گر جاتے۔ اس کے سرخ اناروں کو جب بھی رام چند توڑتا،

انار کے سرخ دانے خون کے قطرے بن کر اس کی قمیض پر گر پڑتے اور اسے انار کے بوٹے سے آواز آتی۔

میں بوٹا اگی ہوئی آں

میں بے مرادی ہوئی آں

(میں ایک پودے کی طرح اُگی ہوئی ہوں، میں ایک بے مراد لاش کی طرح ہوں)

کام کرنے والے نے کانے ہوئے چنوں کا گٹھا باندھ کر سر پر اٹھالیا۔ پورو کے ہوش ٹھکانے آئے

اور اس کو خیال آیا کہ جو شہزادی انار کا بوٹا بن کر اگی تھی، اس کی کہانی اس نے بچپن میں سنی تھی۔ آج تک وہ نہ تو

شہزادی بن سکی نہ ہی انار کا بوٹا۔

”ماں ک آ رہا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے کام کرنے والا چنوں کا کٹھا لے کر کنویں کی طرف چلا گیا۔ پورو کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار گرنے لگے۔ رام چند جب پورو کے پاس سے گزرا تو اس کی نظر پورو کے چہرے کی طرف گھوم گئی جن پر آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ پورو کو نہ کیمر کی اوٹ یاد آئی اور نہ ہی پلو سے آنسو پونچھنا۔ شاید آنسوؤں کی برسات میں رام چند کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”تم کون ہو بی بی؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟“

رام چند کے پاؤں پورو کے سامنے رک گئے۔ پورو بول بھی نہ سکی۔ ”تمہیں کوئی تکلیف ہے بی بی؟“ پورو کے کانوں میں پھر رام چند کی آواز پڑی۔ پورو کی زبان جیسے کسی نے چھپے کھینچ لی تھی وہ بت بنی کھڑی رہی۔ اس کے اندر کے انتہائی صدمے سے آنسو بہہ نکلے۔ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ رام چند ٹھٹھک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا شاید وہ کسی کام کرنے والے کو مدد کے لئے بلاتا، لیکن پورو کے پیروں میں طاقت آگئی۔ پورو گم سم چپ چاپ کھیتوں سے باہر چلی گئی۔ بے جان پورو اپنے پھیر میں آکر لیٹ گئی۔ اسی شام سکر آ لے سے نوکر آ گیا تھا۔ اگلے دن ان سب نے گاؤں واپس چلے جانا تھا۔ اس رات پورو نے آنکھ بھی نہ کھولی۔ ”میں اس سے سامنے ایک بول بھی نہ بول سکی۔“ پوچھتا تھا تو کون ہے بی بی؟ میں اس کو کیا بتاتی میں کون ہوں؟“

میری کہانی کو الفاظ کی زبان کون دے سکتا ہے۔ کبھی سوتے جاگتے، بیٹھتے اس کو میرا روتا چہرہ یاد آئے گا۔ وہ سوپے گا میں کون تھی، پھر شاید اس کو کوئی بھولی ہوئی کہانی یاد آ جائے گی۔ اس کی سری ہوئی پورو اس کو یاد آ جائے گی۔ پھر شاید اس کی آنکھوں سے بھی آنسو گرے گا۔ پھر پورو سو جتنی کاش میں اس شہزادی طرح اتار کا بونا بن سکتی۔ اس کے کھیتوں میں اُگ آتی، وہ میرے اناروں کو توڑتا، پھر میں انار میں سے بولتی، پتہ نہیں کون سے زمانے کی کہانیاں ہیں۔ آج کل کوئی بونا نہیں بنتا۔ رات کا پھل پھر تھا ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پورو کو جیسے کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر چار پائی سے اٹھا دیا۔ وہ باہر کھیتوں کی طرف چلی گئی۔ رات کے اندھیرے میں اس نے وہ کیمر بیچنا جہاں کل دوپہر کے وقت رام چند اس کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

پورو نے جھک کر اسی جگہ سے پیروں کی مٹی اٹھائی، دونوں آنکھیں میچیں اور مٹی سے بھری مٹی اپنی آنکھوں پر لگالی۔ آنکھوں پر لگے ہوئے پورو کے دونوں ہاتھ کسی نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ پورو نے گھبرا



کر دیکھا، رام چند اس کے سامنے کھڑا تھا "کیا تم پورو ہو؟" رام چند پوچھ رہا تھا۔ ساری رات ایک ہی نام میرے کانوں میں بجاتا رہا۔ "جیجتا تیرا نام پورو ہے؟" رام چند نے پھر کہا۔ پورو کا دل کہتا تھا کہ رام چند کے پیروں میں گر جائے۔ وہ جی بھر کر روئے کہ وہ پورو ہی تھی۔ وہ جیج جیج کر بتائے کہ وہ پورو ہے۔ وہ اسی کی پورو تھی جسے اس نے گھوڑی پر بٹھا کر لینے آنا تھا۔ وہ وہی پورو تھی جس کے ساتھ اس نے چار پھیرے لینے تھے وہ وہی پورو تھی جس نے اس کے گھر بالکی میں بیٹھ کر آنا تھا۔ وہ پورو تھی پورو.....

پورو کی زبان کو آج بھی کسی نے کھینچ لیا۔ پورو ایک بول بھی نہ بول سکی۔ رام چند کے ہاتھوں سے پورو نے اپنے دونوں ہاتھ واپس لے لیے اور پہلے جیسی گرم سم پیچھے کو مڑ گئی۔ "اگر تم پورو ہو تو مجھے ایک بار بتا جاؤ۔" رام چند نے پورو کے پیچھے دو تیز قدم چلنے کے بعد کہا۔ "میں پوری رات کھیتوں میں رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تو پھر آئے گی، میرا دل گواہی دیتا ہے تو پورو ہے۔"

"پورو عرصہ ہو گیا مر گئی ہے" پتا نہیں کیسے پورو کے منہ سے نکلا۔ پورو نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ پورو آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اماں نے باؤلی والے سائیں کو حیثیت کے مطابق چڑھاوا چڑھایا۔ اماں اور اس کے باقی ساتھیوں سے لدا ہوا یکہ صبح کی دھوپ چڑھنے سے پہلے ہی سکر آلی کے راستے چل پڑا۔

## ایک آگ

ایک ایک کر کے کئی دن گزر گئے۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں کی طرح بیت گئے۔ پورو دودھ سے بھری ہوئی کاڑھنی چولھے پر کڑھنے کے لئے اگلے جوڑتی اور سارا دن پاتھوں کی ہلکی ہلکی آگ دیکتی رہتی۔ پورو کو محسوس ہوتا اسکی چھاتی کے اندر کہیں کوئی چنگاری رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی دنوں سے اس کے اندر کچھ دکھتا رہتا۔ کبھی وہ سوچتی کہ آج کل اس کا کھایا ہوا معدے میں ہی پڑا رہتا۔ اس کے گلے میں کچھ انکا رہتا۔ اس نے دیکھا جو بھی باسی پانی سے لیے۔ کبھی وہ سوچتی اسے گرمی ہوگئی ہے۔ اس نے تین چار دن کبھی نسی کے پیالے پئے۔ کبھی وہ سوچتی اس کی ماں خیریت سے ہو۔ سبھی پتہ نہیں اس کے اندر ایسے ہول کیوں اٹھتے تھے۔

انہیں دنوں کی بات ہے جب ایک دن رشید اگھر آیا تو اس کا چہرہ اس طرح اترا ہوا تھا جیسے کسی



طویل بیماری کے بعد اس کی ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ رشید نے بتایا تو کچھ نہیں، ویسے وہ پورو سے بات چیت کرتا رہا۔

جاوید سے سکول کی باتیں بھی کرتا رہا۔ جھوٹے کے ساتھ کھیلتا بھی رہا۔ روٹی کھاتے ہوئے رشید کے چہرے کی طرف دیکھ کر پورو کو ایسا ہی لگا جیسے نوالہ رشید کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ رشید نے گھونٹ گھونٹ پانی کے ساتھ چند نوالے نگل لیے۔ رشید کا اتر اہوا سن پورو سے چھپا ہوا نہ تھا۔

قریب قریب بچھائی ہوئی چار پائیوں پر لیٹ کر پورو نے رشید کے من کی بات جانی چاہی۔ ”آج ہمارے گاؤں سے ایک آدمی آیا تھا، ہمارے اپنے کھتیوں سے۔“ رشید نے لحو بھر چپ رہنے کے بعد کہا۔

”چھو آلی سے.....؟“

”ہاں.....“

”پھر.....؟“

”اس نے بتایا ہے کہ ہماری کئی ہوئی فصلیں ایک جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ منوں دانے ڈھیروں کی صورت پڑے ہوئے تھے.....“

”پھر.....؟“

”کسی نے رات کو آگ لگا دی ہے.....“

”کیا.....؟“

”ساری فصل سے ایک دانہ بھی نہیں بچا۔“

”کسی نے جان بوجھ کر لگائی ہے.....؟“

”شک تو یہی ہے.....“

”ایسا کون تھا.....؟“

”کہہ رہا تھا آگ کے شعلوں سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔“

”پھر اب، ہمارا حصہ جو تھا سو تھا وہ بے چارے کیا کریں گے۔“

ان بے چاروں سے پورو کی مراد رشید کے بڑے، بھائی، چچاؤں اور تایاؤں سے تھی جن کا مشترکہ فصل میں حصہ تھا۔

رشید اچپ کر گیا۔ پورو بھی جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ بچے سو رہے تھے لیکن رشید سے اور پورو کی آنکھیں فیند سے خالی تھیں۔

”لیکن دوسرے کا گھر پھونک کر کسی نے کیا لبتا تھا؟“ پورو نے کتنی مرتبہ رہ رہ کر کہا۔ رشید بالکل چپ رہا۔ پورو دیکھتی رہی، رشید ابھی دائیں اور ابھی بائیں کروٹ لیتا۔ کئی بار آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا لیکن فیند اس سے کوسوں دور تھی۔ رشید نے کئی بار اٹھ اٹھ کر پانی پیا۔

”بچے کو دوسری چار پائی پر ڈال دے آج مجھے اس کے ساتھ فیند نہیں آئے گی۔“ رشید نے ایک بار کہا۔

جاوید ہمیشہ باپ کے ساتھ سوتا تھا۔ چھوٹے کو پورو اپنے ساتھ سلا لیتی تھی۔ اس سے پہلے رشید نے اس طرح کبھی نہیں کہا۔ آج پورو حیران تھی لیکن پورو نے چپ چاپ جاوید کو اٹھا کر علیحدہ چار پائی پر سلا دیا۔

پھر کافی وقت نذر گیا۔ رشید نے کی پسلیاں کروٹیں بدل بدل کر چور ہو گئیں لیکن فیند رشید سے نزدیک نہ پہنچی۔

”اڑتی اڑتی خبر سنی ہے۔ یہ خبر نہیں معلوم تھی ہے کہ جھوٹی۔“ لینے لینے رشید نے کہا۔  
”کیا.....؟“ پورو نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

رشید ابھر چپ کر گیا وہ اس نتیجہ پر پہنچنا چاہ رہا تھا کہ پورو کو یہ بات بتانی چاہیے کہ نہیں۔ رشید کی چپ طویل ہوئی۔ پورو اپنی چار پائی سے اٹھ کر رشید سے کی چار پائی پر آ بیٹھی۔

”سنا ہے آج گاؤں میں ایک اجنبی لڑکا آیا تھا وہ زیادہ کسی سے ملا جلا نہیں۔ گاؤں کے ایک دو لوگوں کو شک ہے کہ وہ..... تیرا بھائی تھا۔“

”میرا بھائی.....“ پورو نے اچانک کہا۔  
”کچھ کہا نہیں جاسکتا مجھے تو گاؤں گئے ہوئے دیر ہو گئی ہے یہ باتیں اس آدمی کی زبانی ہیں۔“

رشید اکہہ کر پھر چپ ہو گیا۔

پورو کا سر چکرانے لگا۔

”میرا بھائی؟ میرا بھائی اب جوان ہو گیا ہو گا، دس گیارہ سال ہو گئے ہیں مجھے اس کی شکل دیکھنے ہوئے، پتہ نہیں اس کی شکل اب کیسی ہے اچانک دیکھ لوں تو پہچان بھی نہ پاؤں، اس کی مسیں بھیگ چکی ہوں گی، نو سال کا تو جاوید بھی ہونے کو ہے۔“ پورو کے من میں کئی خیال گھومنے لگے۔

رشید نے اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ پورو کے پرانے گھر کے بارے میں اس نے گاؤں کے کسی آدمی سے پوچھا تھا کہ یہ گھر کس کا تھا لیکن اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لوگوں کو صرف شک تھا کانوں سے کسی نے کچھ نہیں سنا تھا۔

”سچ میں وہ گاؤں آیا ہو گا؟“ اسے میں یاد آئی ہوں گی۔ اس کی بہن، اس کی اپنی بہن، اس کے اپنے ماں باپ کی جی ہوئی.....“

پورو کے من میں کئی خیال آنے لگے۔ پورو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پورو کو بل بھر کے لئے لگی ہوئی آگ کا دکھ بھول گیا، جلی ہوئی گندم کی راکھ سے اپنے بہن بھائیوں کی گرمی کا احساس ہو رہا تھا، پیار کی ایک روشن چنگاری اس کے من میں چمک اٹھی۔

”شاید اسی نے آگ لگائی ہو، کیا پتہ اس نے اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لئے یہ بدلہ لیا ہو۔ اس کی جوان ہڈیوں میں خون نے جوش مارا ہو گا۔ اسے بہن کے دکھ نے ستایا ہو گا۔ میں ایک بار اگر اس کا چہرہ دیکھ لوں، نہ جانے میرے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔“ پورو کو کئی طرح کے خیالات اور امیدوں نے گھیر لیا۔

پھر پورو کو کئی طرح کے تفکرات میں گھر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے پورو کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں جن کا منوں اناج بھل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس وقت پورو کی ہمدردی اس کے ساتھ ہو گئی تھی جس نے شاید اس اناج کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ کہیں آگ لگانے والا وہی نہ ہو..... ہو سکتا ہے کسی اور نے لگائی ہو اور شک کی بناء وہ پکڑا جائے..... پورو کی سوچیں فکر مندنی میں بدل گئیں۔ کچھ بھی ہو وہ بھائی کا سر سلامت چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی شاید اس کے بھائی کے من میں کوئی دکھ اور پیار کی آگ جلتی تھی، اسی آگ میں سے ایک چنگاری کھیتوں میں پھینک دی۔ وہ سوچتی اس کے بھائی کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ رشید اچھوٹا آنی میں نہیں رہتا۔

پھر نڈھال ہو کر چار پائی پر ایٹ گئی۔ کنویں کی ٹنڈوں کی طرح اس کے من میں قسم قسم کے خیالات آتے رہے، پورو کی جب آنکھ کھلی، اس کے سامنے آگ ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ گھاس کے تنکوں سے لے کر

کھیتوں کی اونچائی تک سب کچھ جل رہا تھا۔ پھر اس نے سنے میں دیکھا کہ ایک خوبصورت جوان لڑکا آگ کے شعلوں کے پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ تاپ رہا تھا.....

ذرا سے اس کی آنکھ کھل گئی، اس کے جسم کا ایک ایک دھڑک رہا تھا، اس کی چپٹیں نکل رہی تھیں۔ جب ملٹری والوں نے آگ بجھائی اور کمرہ سے لوگ نکالے، ہاتھ اور دھکیلتے ہوئے لوگوں کو گاڑیوں میں بیٹھا لیا۔ انہوں نے تین آدھے گھنٹے ہوئے آدمیوں کو نکال دیا جن کے جسم سے چربی پگھل رہی تھی۔ جن کا ماس جلنے کی وجہ سے ہڈیوں سے علیحدہ لٹک رہا تھا۔ جن کی کہنوں اور گھٹنوں سے ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ لوگوں کے گاڑیوں میں بیٹھے ہی وہ تینوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی لاشیں وہیں زمین پر پھینک کر گاڑیاں چل پڑیں۔ ان کے گھر والے چیختے رہ گئے لیکن ملٹری والوں کے پاس ان کے کرایا کرم کا وقت نہیں تھا۔

پورو کا گاؤں خالی ہو گیا تھا۔ دوسری قوم کا کوئی آدمی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ صرف تین جلی ہوئی لاشیں حویلی کے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے منجھروں پر سچے کھچے گوشت کو گاؤں کے کوؤں اور کتوں نے اڑا لیا تھا۔ اب بھی منجھر کے منجھر آدھی جلی ہوئی حویلی کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔

پورو کی آنکھوں میں جیسے کسی نے شیشے کی کرچیاں ڈال دی ہوں۔ ایک دن پورو نے دیکھا دس بارہ منچلے لڑکے ایک ننگی جوان لڑکی کو آگے دھکیلتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھول ڈھمکے بجاتے ہوئے اس کے گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ نہیں معلوم کس گاؤں سے آئے تھے اور کس گاؤں جا رہے تھے۔

پورو کو ایسے ہی لگتا جیسے اس دنیا میں جینا ہی حرام ہے، اس دنیا میں بیٹی کا پیدا ہونا ہی حرام ہے۔ اس شام پورو کو گھنے کے کھیت میں چھپی ہوئی ایک جوان لڑکی ملی، جسے رات کے گھنے اندھیرے میں وہ گھر لے آئی۔ اس لڑکی نے پورو کو بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک سکھپ تھا جہاں گاؤں کے ہندو اکٹھے ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ ملٹری والے انہیں یہاں سے نکال کر دوسری طرف ہندوستان لے جائیں۔ اس طرف کی فوج سکھپ کی حفاظت کرتی تھی، لیکن ہر روز رات کو کچھ مسلمان آکر چوری چھپے سکھپ کی جوان لڑکیوں کو جن کر لے جاتے تھے اور دوسری صبح واپس چھوڑ جاتے تھے۔

اس لڑکی نے پورو کو بتایا کہ ”پوری دس راتیں ہو گئی تھیں، اسے ہر روز رات کو طرح طرح کے لوگوں کے گھر جانا پڑتا تھا۔ آج سے پچھلی رات کسی نہ کسی طرح وہ لے جانے والے کو دھوکہ دے کر دوڑ آئی تھی۔ دوڑتی دوڑتی اس گاؤں میں آ پہنچی تھی۔ جب سویر کی پو پھوٹی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں

جائے۔ "وہ سارا دن چپ چاپ گھنے کے کھیت میں بھوکی پڑی رہی۔ پوروسن کر حواس باختہ ہو گئی۔ اسے سننا مشکل ہو گیا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پورو نے لڑکی کو پھسلے کمرے میں چھپا لیا۔ اس کمرے میں ان کی گندم پڑی ہوئی تھی۔ بھینس کا چار پڑا ہوا تھا۔ دوسرے دن دو آدمی پھرتے پھرتے ہوئے آئے، سارے گاؤں سے پوچھ چھچی کر کسی نے لڑکی کو دیکھا ہے؟ وہ گاؤں کے دالانوں میں تاک جھانک کر کے چلے گئے لیکن لڑکی کے بارے میں کسی نے کچھ نہ بتایا۔

پورو کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب بھی اس دھرتی سے گندم کے پہلے بیسے سنبری خوشے پیدا ہوں گے، جس دھرتی کے ہونٹوں پر انسانوں کا خون جم گیا تھا۔ کیا اس دھرتی کے نکئی کے پھنوں سے پہلے جیسی خوشبو آئے گی جس کے کھیتوں میں مردے گل سڑ رہے تھے۔ کیا یہ عورتیں دوبارہ ان مردوں کے لیے بنے جنس گی جنہوں نے ان عورتوں کی اپنی بیویوں، بہنوں کی عزت اس طرح نیلام کی تھی۔

پورو کے گاؤں کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک قافلہ آیا۔ لوگ جوق در جوق پیدل چل رہے تھے۔ لوگوں نے ایک ایک گڈے کو بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ تھوڑے سے سپاہی لوگوں کے آگے آگے تھے، کچھ لوگوں کے پیچھے پیچھے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ راستوں کی گرداؤں اور کڑی قسٹ کی طرح ان کے سروں میں پڑی ہوئی تھی۔ قافلے کو رات پورو کے گاؤں میں پہنچنے کے بعد پڑی۔ پورو کے ہوش ٹھکانے نہیں آ رہے تھے۔ پورو کو رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ مڑک رتو وال کی طرف سے آتی ہے، قافلے میں اس کا رام چند ضرور ہوگا۔ ایک آخری ملاقات..... بس ایک بار..... آخری بار..... اس کے بعد کبھی اسے اس کے گاؤں کی خبر نہیں ملے گی.....

قافلے والے بچے کھچے گھنوں اور روپوں کے بدلے راستے میں آنے والے دیہاتوں سے اناج خرید لیتے تھے۔ دیہاتوں سے کچھ مرد اور عورتیں جا کر ان سے سودا طے کر لیتے۔ اسی بہانے پورو نے قافلے پر نظر دوڑائی.....

پورو نے قافلے میں بیٹھے ہوئے رام چند کو دیکھا۔ رام چند نے رتو وال کے کھیتوں میں کھڑی آندوؤں میں ترچہ سے والی پورو کو پہچان لیا۔

رتو وال کے کھیتوں میں پورو کا منہ سخت صدمے کی وجہ سے بند تھا اور آج پورو کا منہ پاس کھڑے پہریداروں نے بند کیا ہوا تھا، پورو کچھ نہ کہہ سکی۔

”آپ کو تاج دانے کی ضرورت ہوگی۔“ پھر پورو نے رام چند کی طرف منہ کر کے کہا۔

”ہاں“ رام چند کی نگاہ پورو کے چہرے سے پرے نہ ہٹتی تھی، شاید وہ ابھی پہچان رہا تھا۔

”ٹھیک.....! قیمت تیار رکھنا میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔“ پاس کھڑے سپاہی کی طرف دیکھ کر

پورو نے رام چند کی طرف دیکھا اور واپس آگئی۔

پورو نے رشید سے کو کہا کہ گھر میں چھپی ہوئی لڑکی کو قافلے میں شامل کرنا ہے، پھر پورو نے آنے اور

منی کے برتن میں پڑے ہوئے دیسی گھی کی پوٹلی ہانڈھی اور لڑکی کو ساتھ لے کر رات کے اندھیرے میں سوئے

ہوئے قافلے میں چلی گئی۔

سارا دن پیدل چلنے کے بعد لوگ تھکن سے چور تھے۔ بلاشبہ ہر وقت خطرہ ان کے سروں پر

چمکاؤں کی طرح منڈلا رہا تھا، پھر بھی لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے..... ”میں رات کو پہنچ جاؤں

گی۔“ رام چند کے کانوں میں پورو کی آواز شام سے گونج رہی تھی۔ رام چند رات کے اندھیرے میں کسی کے

قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہرے دار گھوم پھر کر پہرا دے رہے تھے جب پورو بچوں کے بل چلتی ہوئی قافلے میں گھس گئی۔

رام چند کے سامنے سر پر رکھی ہوئی پوٹلی نیچے رکھی اور لڑکی کو بٹھا دیا۔

”تم پورو ہی ہوتا؟“ رام چند نے آج بھی رتو وال کے کھیتوں والا سوال کیا۔

”اب بھی کچھ پوچھنا باقی ہے؟“ آج پورو نے ایک پیار بھرے غصے میں کہا۔

یہ پورو کی پوری زندگی میں اس سے پہلا اور آخری شکوہ تھا۔ رام چند نے سر جھکا لیا۔

”میرے والدین کی کوئی خبر.....؟“ پورو نے ایک آہ بھر کر پوچھا۔

”وہ جب سے شادی کر کے گئے ہیں واپس نہیں لوئے لیکن..... رام چند کہتے کہتے رک گیا۔

”شادی..... کس کی شادی.....؟“ پورو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”تمہارے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک رات چپ چاپ تمہاری چھوٹی بہن کے ساتھ

میرے پھیرے کرائے اور تمہارے بھائی کے ساتھ میری بہن کے، اس کے بعد سے وہ گاؤں واپس نہیں

لوئے۔ آج کل بھی وہ سیام میں رہتے ہیں لیکن.....“ رام چند پھر کہتے کہتے رک گیا۔

”میری بہن..... پھر تو وہ بھی قافلے میں ہی ہوگی۔“ پورو کے لیے رام چند سے اپنی بہن کی

شادی کی خبر بالکل غلط تھی۔

”نہیں جچھلے دنوں تمہارا بھائی آیا تھا، وہ اپنی بیوی کو میکے چھوڑ گیا اور بہن کو گھر لے گیا تھا، وہ یہاں آیا تو وہ بھی.....“ رام چند کی آنکھوں سے ٹھم ٹھم کر کے آنسو بہنے لگے۔

”وہ بھی..... کیا ہوا ہے اسے.....؟“ پورو کی سمجھ میں نہ آیا۔

”معلوم نہیں کس وقت میری بہن اٹھائی گئی، گھر سے نکلنے وقت ہمارے ساتھ تھی۔ میں بوزمی ماں کو پشت پر اٹھا کر قافلے میں شامل ہوا تو وہ میرے پیچھے آ رہی تھی لیکن قافلے میں نہیں ہے.....“ رام چند نے تیز چلتے ہوئے سانسوں کو روک روک کر بتایا۔ رام چند کی کھٹی کھٹی چیخیں نکل رہی تھیں لیکن اس نے اپنی پکڑی کا پلو منہ میں دبایا۔

”میری ماں خود کو پیٹ پیٹ کر تلی ہو گئی ہے۔“ رام چند نے بتایا۔

پورو کا جسم درد سے چورا ہو گیا۔

”کھوج لگانا، ہو سکتا ہے کہیں سے کوئی پتہ لگ جائے، کیا معلوم مر گئی ہے یا زندہ ہے۔“ رام چند نے آخری کوشش کی، اپنے اندر سے اٹھتے درد کی وجہ سے پورو سے بولا نہ گیا۔

”شاید اس کا نام لا جو ہے۔“ پورو کو پرانی یاد آئی، اپنی مٹکی کے وقت اس نے اپنے بھائی کی منگیترا کا نام سنا تھا۔

”ہاں..... اس کی بازو پر بھی اس کا نام کھدا ہوا ہے۔“

رام چند بتا رہا تھا۔ سپاہی ویسے ہی پہرا دے رہے تھے۔ سوئے ہوئے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے رام چند اور پورو آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

”اس لڑکی کو حوالے کرنا تھا اسے اپنے قافلے میں لے جاؤ۔ ہندوستان جا کر کھوجنا، اگر اس بیچاری کے والدین مل گئے تو.....“ پورو نے لڑکی کا ہاتھ رام چند کے ہاتھ میں دے دیا۔

”میرا بھائی ادھر آیا تھا، اگر میں ایک بار اس کو دیکھ سکتی۔“

پورو نے بڑی امید سے کہا۔

”جچھلے دنوں جب تمہارے چھوٹے والے کھیتوں میں آگ لگی تھی، یاد ہے؟“ رام چند کہہ رہا تھا۔

”آگ.....؟“ ہاں آگ لگی تھی۔ کیا یہ بات سچ تھی کہ میرے بھائی نے وہ آگ لگائی

تھی.....؟“

پورو کو وہ دن یاد آ گیا جب رشید نے ایک افواہ سنا کی تھی۔

”ہاں اس نے لگائی تھی۔ تمہارے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں رہتی ہو، اس نے غصے میں

آ کر رشید کے کھیتوں کو پھونک ڈالا.....“

پورو کو رشک سا آیا، اس کا بھائی جوان ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں بہن کا بدلہ جاگ رہا تھا، اس کے دل میں بہن کی یاد بسی تھی۔ ساتھ ہی پورو کو تازہ واردات یاد آئی، اس کے بھائی کی بیوی گم ہو گئی تھی، کسی نے زبردستی اٹھالی تھی۔ معلوم نہیں کس حال میں تھی وہ..... اس کے رام چند کی بہن.....

”مجھے سکر آلی ایک خط لکھنا، اپنا پتہ بھی لکھنا۔ اگر لا جو کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو میں لکھ بیٹھوں

گی.....“ پورو نے کہا۔

رات کا اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ سپاہی قافلے والوں کو جگانے لگے۔ قافلے نے راہ لیتی تھی۔ پورو اٹھ

کر کھڑی ہوئی۔

پورو نے دونوں ہاتھ رام چند کے آگے جوڑ دیے۔ پورو سے کچھ بولا نہ گیا۔ کھڑی پورو نے قافلے

سے باہر پاؤں نکالا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اس کے آگے لاشی تان لی۔

”تم کون ہو، کدھر جا رہی ہو.....؟“

”میں اناج بیچنے آئی تھی.....“

”کتنا اناج بیچا ہے؟ پیسے دکھاؤ.....“ سپاہی نے حیرت آواز میں پوچھا۔

پورو نے ہاتھ چادر میں کرتے ہوئے اپنی چاندی کی انگوٹھی اتار لی اور سپاہی کو دکھا کر تیز قدموں

سے گاؤں کی طرف چل دی۔

معلوم نہیں یہ بات سپاہی نے سوچی یا نہیں کہ ہندو لوگ کم ہی چاندی کے گبنے پہنتے ہیں، اس نے

اناج کے بدلے چاندی کی انگوٹھی کس سے لی؟



## پورو کی بھابی

رات کو چار پائی پر لیٹے پورو چھت کے کالے مہتروں کو دیکھتی رہتی۔ اس کا من ان لوگوں کے بند کمروں میں گھومتا رہا جن کے اندر لوگوں نے لوگوں کی بیٹیاں، لوگوں کی بیویاں زبردستی رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک لاجو ہوگی۔ لاجو رام چند کی بہن اور اس کی بھابی، لاجو کا اجنبی چہرہ پورو کی آنکھوں کے آگے آ جاتا۔ ٹوٹے ہوئے پتے جیسا لاجو کا چہرہ، جھڑے ہوئے کھیت جیسا لاجو کا چہرہ۔ پورو سوچتی لاجو شادی شدہ تھی ہو سکتا ہے اس کا کوئی بچہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر کیا کیا گزری ہوگی۔ پتہ نہیں وہ بد قسمت کہاں ہوگی۔ وہ اس کو کیسے ڈھونڈے؟ کیسے پہچانے؟ پورو سوچتی اس دن گئے کے کھیت والی لڑکی لاجو ہی نکل آتی، وہ اس کو قافلے کے ساتھ ملا آتی۔ وہ اس کو رام چند کے حوالے کر آتی۔ پورو نے ساری کی ساری بات رشید سے کو بتائی اور رشید سے کے پاؤں پڑی۔

”جس طرح بھی ہو مجھ پر کرم کر میں نے ساری عمر تم سے کچھ نہیں مانگا جس طرح بھی ممکن ہے

لاجو کا پتہ لگا دے۔“

پورو کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری تھے۔ رشید سے نے اس سے اقرار کیا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ رشید سے کو یہ یقین تھا کہ ہونہ ہولا جو رتوال میں ہی ہے۔ گھر سے وہ بھائی کے ساتھ نکلی، لیکن قافلے میں نہیں پہنچی۔ اکٹھے ہو رہے لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی اور وہ کسی کے ہتھے لگ گئی تھی۔ رشید سے نے دو چکر رتوال کے لگائے لیکن وہ لوگوں کے صحن کیسے چھانٹا۔ وہ گاؤں کی کئی دکانوں سے سودا سلف خریدتا، لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ اتنا ضرور سنا کہ گاؤں کے کچھ لوگوں نے جاتے ہوئے قافلے سے دو چار لڑکیاں اڑالی تھیں۔ رشید سے کو پکا یقین تھا کہ لاجو انہی میں سے کسی کے گھر میں کسی کے پاس تھی۔ اس گاؤں کے لوگ رشید سے کو نہیں جانتے تھے۔ رشید سے کا کوئی دوست، رشتہ دار اس گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ چار دن کس کے ہاں رہتا۔ کس سے وہ گاؤں والوں کے بارے میں معلوم کرتا۔ رشید سے کے ساتھ پورو نے ایک تدبیر سوچی۔ باؤلی والے سائیں کو وہ جانتے تھے۔ دونوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور سائیں کی ایک چھیری میں جا گئے۔ ویسے بھی پریشانی سے پورو کی دن رات جاگ جاگ کر آنکھیں زبردستی بند ہو رہی تھیں۔ روز صبح پورو نماز پڑھ کر باؤلی کے پانی سے آنکھیں دھوتی۔ سائیں کو شیرینی چڑھاتی اور دن کو نئے کھیسوں کی گانٹھ باندھ کر

گاؤں میں بیچنے چلی جاتی۔ گاؤں کے مرد حضرات کھیتوں میں ہوتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں گھروں میں اکیلی اپنے کام کاج میں مصروف ہوتیں۔ پورو تمام گھروں میں جا جا پوچھتی۔ وہ کھیسوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت بتاتی، اس کا بھاؤ کم ہی کسی سے بنتا۔ ویسے بھی گاؤں میں لوگوں کے پاس اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دریاں کھیس ہی کافی ہوتے ہیں۔ پھر انہیں لوٹ مار سے بھی کافی کچھ مل گیا تھا۔ کسی کو خریدنے کی چاہ نہیں تھی۔ لیکن پورو ڈھنائی سے ان کے صحن میں جا بیٹھتی۔ اندر باہر جھانکتی ہوئی عورتوں کو باتوں میں لگا لیتی۔ گاؤں کی لوٹ مار کی باتیں چھیڑ لیتی۔ کیا کیا کس کے حصے میں آیا تھا ہنس ہنس کے ان سے پوچھتی، پھر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں کی بات چھیڑ لیتی۔ پورو کو رام چندر کے مکان کی پہچان نہیں تھی۔ رشیدے اور پورو کو یقین تھا کہ ہونہ ہولا جو کو جو لے گیا ہے، ہو سکتا ہے اس نے لا جو کے گھر کو بھی سنبھال لیا ہو۔ پورو نے اس گھر میں ایک آدھ بار چکر بھی لگایا، لیکن ایک بوڑھی عورت باہر والی ڈیوڑھی سے ہی اس کو واپس بھیج دیتی تھی کہ انہوں نے کچھ نہیں لینا۔ ایک دن پورو جیسے زبردستی کسی کے گھر داخل ہوتے ہیں، صحن تک چلی گئی۔ "اماں! کچھ نہ لینا لیکن دیکھ تو لو، میں تم سے دیکھنے کی قیمت تو نہیں مانگتی۔" پورو نے کھیسوں کی گانٹھ زمین پر رکھ کر کھیس پھیلا دیے۔ صحن میں اس بڑھیا کے بغیر کوئی بھی نہیں تھا۔ "اللہ بھلا کرے مجھے پانی کا گھونٹ تو پلا، صبح سے پیاسی ہوں۔" پورو نے بڑھیا کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"پانی چھوڑ کر تولی کا کنورا پی لے لیکن اگر تو نے کھیس چادریں بیچی ہیں تو کسی شہر میں جا۔ وہاں لوگ نہ ہی کاٹتے ہیں اور نہ ہی بنتے ہیں۔ دیہاتوں میں کس کے پاس کھیسوں کی کمی ہے۔"

بڑھیا نے پورو کو صلاح دی اور اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی "نیک بخت! لسی کا ایک کنورا  
تولاؤ۔"

پورو کا دل دھڑکنے لگا، اندر سے آنے والی نیار کا منہ سچ مچ ٹوٹنے ہوئے پتے جیسا تھا۔ کھینچے ہوئے پردوں جیسا تھا۔ پورو کا ماتھا ٹھنکا، ہونہ ہو یہ تو لا جو ہے۔ جب تک پورو کو کہیں پر لا جو کا شک نہیں ہوا تھا، تب تک پورو کو ایک لگن تھی۔ کہیں لا جو نظر آئے۔ اب پورو کو لا جو کا شک پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کو سمجھ نہ آئی کہ وہ اپنے شک کی پرکھ کیسے کرے۔ "لڑکی ٹھیک تو ہے؟" پورو نے بڑی ہمدردی سے کہا اور لڑکی کے ہاتھوں سے لسی کا کنورا پکڑا۔

"ٹھیک ہی ہے، بس ایسے ہی ذرا؟" بڑھیا نے بات آئی گئی کر دی۔

”نمک کی ڈلی ہے تھوڑا سا ملا لوں۔“ پورو نے لسی کا ایک گھونٹ بھر کے کنورا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ لڑکی نے چپ چاپ نمک کی ڈلی لا کر پورو کے آگے کر دی۔ پورو نے اس کے ہاتھوں سے ڈلی پکڑتے ہوئے اس کی ایک انگلی کو دبایا۔ لڑکی نے ذرا گھبرا کر پورو کی طرف دیکھا۔ لیکن نہ تو اس کے ہونٹوں پر کوئی ہلکی آئی نہ ہی اس کے منہ سے کوئی حرف نکلا۔ لڑکی گنے کے چھلکے کی طرح تھی۔ پورو کو اور بھی یقین ہو گیا یہ لڑکی لا جو ہینک نہ ہو لیکن تھی کوئی زبردستی بسائی گئی لڑکی۔ پورو کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہی گھر رام چند کا گھر تھا۔ پورو کو پکا یقین ہو گیا تھا یہ لڑکی لا جو ہی تھی۔ لسی ایک ہی سانس میں چڑھا کر کنورا زمین پر رکھتے ہوئے لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔ ”آؤ“ میں تمہاری نبض دیکھوں، رنگ تو تمہارا ہلدی کی طرح ہو گیا ہے“ کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے پورو نے اس کی ہائیں بازو سے قمیض پرے سر کا دی۔ لڑکی کی بازو پر ہندی میں نام کھدا ہوا تھا ”لا جو“ لڑکی پھر بھی کچھ نہ بولی۔ پوہ ماگھ کے کیزے کی طرح خاموشی اس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔

”کوئی تعویذ دے دے لڑکی گھر میں رچ بس جائے لڑکے سے بھی کچھ نہیں بولتی۔“ بڑھیا نے

اترے ہوئے منہ سے کہا۔

پورو سے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، پھر بھی پورو نے تیزی سے جواب دیا ”میرے پاس ایسا تعویذ ہے یہ دنوں میں ہی مکی کے دانے کی طرح کھل اٹھے گی۔“

”جو تم کہو گی میں دوں گی، مجھے وہ تعویذ لا دو۔“ بڑھیا نے پورو کا آنچل پکڑ لیا۔

”لو! اللہ نے خیریت رکھی تو میں کل ہی لے آؤں گی“ کہتے کہتے پورو نے کھیسوں کی گانٹھ باندھ لی۔ لڑکی ایک گونگے بہرے بت کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کھیسوں کی گانٹھ تلے آج پورو کی کمر ٹوٹ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی باؤلی والی چھیری تک پہنچی۔ ”اب آگے ٹو جا اور تیرا کام“ پورو نے رشیدے کو پوری بات سنانے کے بعد کہا۔

”کوئی ایسی تدبیر تو سوچئے“ رشید اسوچنے لگا۔

”جس طرح مجھے گھوڑی پر بٹھالیا تھا اب بھی ہمت کرو۔“ پورو نے رشیدے کو ایک چوٹ لگائی اور ہنس پڑی۔ پھر پورو اور رشید اکتی ہی تدبیریں سوچتے رہے لیکن کوئی چچی نہیں تھی۔ رشید اکتا ”یہاں سے تو بھاگا لے جانا مشکل نہیں، میں اسے آگے کیسے پہنچاؤں گا؟“ پورو کو اس سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا تھا، لیکن آج اسے ایک اور سوچ آئی۔

”میرے ماں باپ نے پھر مجھے قبول نہیں کیا، اپنی بیٹی کو اب اپنی بہو کو قبول کر لیں گے۔“

”اگر انہوں نے واپس لینے سے ہی انکار کر دیا تو؟“ رشید نے پورو کو بتایا کہ ان کی سرکاری طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ زبردستی اٹھائی گئی لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس کر دیں کیونکہ ان کے بدلے میں دوسری طرف سے ڈھونڈی گئی لڑکیاں ملتی تھیں۔ ”ساری لڑکیوں کے والدین ان کو واپس لے لیں گے؟“ پورو کے من کو دھچکا لگا۔ اس کے لئے دنیا کے سارے دھرم اس کے راستے میں کانٹے بن کر بچھ گئے تھے۔ اس کے ماں باپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے سرال والے اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ آج سب مذاہب پر سے بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ آج.....

پورو نے اپنے خیالوں کا سلسلہ منقطع کیا اور صرف لاجو کے ہارے میں سوچنے لگی۔ تارے گن گن کر پورو نے رات کاٹی۔ وہ اگلے دن وقت کا کھوج لگاتی رہی کہ کس وقت لاجو کے گھر والی بڑھیا اپنے بیٹے کو کھیتوں میں روٹی دینے گئی ہوگی؟ اس نے دو نئے کھیس سر کے اوپر رکھے اور دو پٹے کے پلو سے کاغذ میں لپیٹی ہوئی چٹکی راکھ باندھ لی۔

لاجو کے گھر کا بند دروازہ ہاتھوں سے کھولتے وقت پورو نے سارے پیر فقیر یاد کیے۔ پورو کو عمر سے بھولے ہوئے دیوی دیوتاؤں کے نام یاد آئے۔ اس سے پہلے کسی بھی دن رب اور خدا کا نام لیتے ہوئے پورو کہہ دیتی تھی رب اس کا سوتا باپ ہے، خدا کی وہ سوتیلی بیٹی ہے۔ کسی بھی رب کو اس کا درد نہیں لیکن آج پورو کو یقین آ گیا۔ اس نے جھجھکتے ہوئے کسی رب کو یاد کیا کہ کسی طرح اس کا میل اکیلی لاجو کے ساتھ ہو جائے.....

دوپہر کے کھانے کا وقت پورو کو سو بھا۔ بڑھیا اپنے بیٹے کو روٹی دینے گئی ہوئی تھی اور لاجو بالکل اکیلی ایک خالی چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

”اماں کہاں ہے.....؟“ پورو نے مٹن میں پاؤں رکھتے ہی پوچھ لیا۔

”کھیتوں کی طرف گئی ہے.....“ لاجو نے کل کی کھیس بیچنے والی کو دیکھ کر کہا۔

کھیسوں والی کے ساتھ جاگی ہوئی لاجو کی دلچسپی لاجو کے چہرے پر عیاں تھی۔ لاجو اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔ پورو کو ایک بار اپنی ماں کا چہرہ، اپنی بہن کا چہرہ، اپنا چہرہ بھی لاجو کے چہرے میں نظر آیا۔ پورو لاجو کے گلے سے چٹ گئی۔

پورو کو خوب رونا آیا، اسے محسوس ہوا اس کے رونے سے دیواریں پھٹ جائیں گی، اس کا رونا کھینٹوں کو چیر دے گا، اس کا رونا دیہاتوں سے گزر جائے گا، اس کا رونا شہر بھلانگ جائے گا اس کا رونا..... پورو نے رونے کی آواز گلے سے نہ نکلنے دی۔

”تم لا جو ہو میری بھابھی.....“ پورو نے ساری گھمبیر تا کشمی کرتے ہوئے کہا۔

”تم پورو ہو.....؟“ لا جو نے اس کے سینے سے الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا لیکن لا جو نے پہلے کبھی بھی پورو کو نہیں دیکھا تھا جو پہچان جاتی پھر بھی لا جو کو پورو کا چہرہ بالکل پورو کے بھائی جیسا لگا، اپنے خاوند جیسا..... لا جو کی صدمے سے آنکھیں بھر آئیں جیسے وہ اپنے خاوند کے سامنے آنکھیں نہ اٹھا سکتی ہو۔ لا جو پورو کی ٹانگوں پر گر پڑی۔ لا جو کے من پر جو بیت رہی تھی شاید پورو اپنی رگوں میں بھی محسوس کر رہی تھی پورو کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ تھا۔ پورو نے بھینچ بھینچ کر لا جو کو کلیجے سے لگایا۔

”کوئی آجائے گا لا جو! میری بات سن۔“ پورو کو وقت کی نزاکت کا خیال آیا، لا جو کی ہنگامی بندھ گئی، لا جو کو سانس لینا دوجھر ہو رہا تھا۔

”وہ کب واپس آتی ہے؟“ پورو نے پھر پوچھا۔

”میں نہیں جانتی مجھے اپنے ساتھ لے چل.....“ لا جو کھڑی نہیں ہو رہی تھی پورو کی ٹانگوں کو جھونتی ہی نہیں تھی۔

”لینے ہی تو آئی ہوں، اور کیا کرنے آئی ہوں میری بات تو سن۔“ پورو نے کندھوں سے پکڑ کر لا جو کا چہرہ اوپر کیا۔

”بائے مجھے لے چل۔“

”لیکن تم سنبھل کر بیٹھو کوئی آجائے گا۔“

”مجھے یہاں سے بھگالے جائیں ساری عمر تمہاری نوکرائی بن کر رہوں گی۔“

”پاگل نہ بن اس طرح بھگا کر میں کہاں لے جاؤں گی، میری بات سن۔“

لا جو کے چہرے پر آنسو خشک ہونے کا کام نہ لیتے۔ پورو کو ڈر تھا کہ بات بھی مکمل نہیں ہو پائے گی اور بڑھیا آجائے گی، پورو نے دوپٹے کے پلو سے لا جو کا منہ پونچھا اور واسطے دے دے کر اسے چپ کرایا۔

”کبھی تو باہر آتی جاتی ہو.....؟“

”نہیں.....“

”لیکن صبح کھیتوں میں تو جاتی ہوگی..... آج ویسے بھی اماوس ہے، آج رات اگر تم باہر والے

کنویں کے پاس آ سکو تو وہاں رشید اکھوڑی لے کر کھڑا ہوگا۔“

”ابو جیسے جھک گئی رات کو اکیلے کنویں کے پاس پہنچنا ہی اسے محال لگتا تھا پھر وہ رشید سے کو جانتی بھی

نہیں تھی اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کسی کی جان سلامت نہیں تھی۔“ میں گھر سے نکلوں گی کیسے؟“

”بڑھیا کوئی افیم وغیرہ تو نہیں کھاتی.....؟“

”میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”ایک بار اگر وہاں پر پہنچ جاؤ تو.....“

”لیکن وہاں..... میں اس کو نہیں جانتی اگر تم وہاں ہو تو.....“

وہ تو رات بھر میں فاصلہ طے کر لے گا، میں ہوئی تو دونوں راستے میں ہی رہ جائیں گے۔

”میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔“

”تم مجھ پر اعتبار کرو، تمہاری تسلی کے لئے میرے ہاتھ کی یہ انگلی اس کے ہاتھ میں ہوگی۔“

”لینا۔“

”اگر آج رات موقع نہ ملا تو.....؟“

”پھر اس سے اگلی رات، وہ پوری تین راتیں تمہارا انتظار کرے گا۔“

”گلی میں سے شور کی آواز آرہی ہے شاید کوئی آگیا ہے۔“

پورو چار پائی سے نیچے بیٹھ گئی، چار پائی کی ادوائن کی طرف کھس رکھ کر پورو نے دوپٹے کے پلو سے

بندھی ہوئی راکھ کی پٹی یاد دیکھی کہ اگر بڑھیا آگئی تو اسے وہ تعویذ اور راکھ دے سکے، لیکن بڑھیا ابھی نہیں آئی تھی۔

”اگر تم اس تعویذ کے بہانے مجھے روز باؤلی پر لے جایا کرو اور پھر کسی دن.....؟“ لا جو نے

اپنی آواز پہلے سے بھی آہستہ کر لی۔

”اس طرح مجھ پر پورا شک ہو جائے گا۔ میں چاہتی ہوں وہ تمہیں گاؤں سے لے کر نکل جائے اور

میں بعد میں بھی دو تین دن گاؤں میں آتی جاتی رہوں، کوئی بھی مجھ پر انگلی نہ رکھ سکے۔“

”مجھے ڈر ہے اگر راستے میں کسی نے پکڑ لیا.....؟“

”پھر جو قسمت میں لکھا ہے پہلے کون سی قسمت ہمارے ساتھ ہے۔“

”لیکن میں ساری عمر کے لئے تم پر بوجہ بن جاؤں گی۔“

”یہ باتیں پھر کریں گے اس وقت نہیں، میرا خیال ہے میں چلی ہی جاؤں تو اچھا ہے بڑھیا آج

مجھے نہ ہی دیکھے تو.....“

”ہائے مجھے بھی لے چل.....“ لا جو اجنبیوں کی طرح جانے کے لئے تیار پور کو چمٹ گئی۔ پورو

نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے لا جو کو گلے لگا کر بھینچا پھر ”آج رات..... آدھی رات..... کل پرمت چھوڑنا۔“ یہ کہتے ہوئے پور وکھیں سنبھال کر گھر سے باہر نکل گئی۔

بان کی چار پائی پر لا جو نے دونوں پاؤں پیار لیے۔ آج لا جو کے انگ انگ میں ایک شوخی تھی۔ پھر

جیسے لا جو کو ساری دیواروں سے ایک آواز آئی ”آج رات..... آدھی رات.....“ لا جو نے

دالان کی ایک ایک اینٹ پر نگاہ ڈالی ”یہی میرا گھر تھا، یہاں ہی میں پیدا ہوئی اور چلی بڑھی، یہیں میں جوان

ہوئی، اسی گھر سے میری ڈولی نکلی، میں یہاں ہی واپس سکے آئی۔ سب اس گھر سے چلے گئے لیکن میرا مردہ اسی

گھر میں ذلیل ہوتا رہا۔ میں اپنے ہی گھر میں پردہ سن ہو گئی۔ اسی گھر نے مجھے پیدا کیا، اسی نے مجھے کھا

لیا۔“ لا جو گھر کی دہلیز کو دیکھنے لگی۔ اس دہلیز کو بھی شرم نہیں آئی۔ اس نے مجھے خوار ہوتے دیکھا ان دیواروں کو

لاج نہ آئی جنہوں نے میری عزت تار تار ہوتے دیکھی لیکن آج..... آج رات..... سب دیواریں

نوٹ جائیں گی۔ سب دہلیزیں ڈھے جائیں گی۔ میں.....“

بڑھیا باہر والا بند دروازہ کھول کر صحن میں آچنکی تھی۔

”صحیح وقت پر آگئی ہو۔“ لا جو نے من ہی من میں کہا۔

”آج اس کھیسوں والی نے آنا تھا۔ ابھی نہیں آئی؟“ بڑھیا نے آتے ہی پہلی بات، یہی پوچھی پھر

باتھ میں پکڑا ساگ، کھانے کا چھوٹا موٹا سامان زمین پر رکھ کر لا جو کی چار پائی پر بیٹھ گئی۔

کھیسوں والی کا نام سن کر لا جو کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ ”نہیں.....“

لا جو نے انکار میں سر ہلا کر کہا پھر لا جو سوچنے لگ گئی۔

”پورو کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ رہی ہوں؟ وہ مجھے کیسے ڈھونڈنے آئی؟ وہ کس گاؤں میں

رہتی ہے؟ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا؟ پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ آج رات..... آدھی



رات..... ” پھر لاجو کے من سے یہ آواز اٹھی اور کانوں سے ٹکرانے لگی۔

”میں نے کہا مٹھی بھر موٹھ ڈال کر چاولوں کی دیکھی پکنے کے لیے رکھ دو میں تو تھک گئی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے بڑھیا چار پانی پر آرام سے لیٹ گئی۔

جیسے آخری کام کو کوئی جلدی ختم کرتا ہے، لاجو نے اٹھ کر موٹھ صاف کیے، چاول صاف کیے اور چولہے میں لکڑی کے دو چار ٹکڑے ڈال کر چھوٹی دیکھی اوپر رکھ دی۔ زیادہ تر بڑھیا ہی آٹا گوندھتی تھی لیکن آج لاجو نے خود سے آٹا چھانا اور گوندھا۔

آج کا دن کسی ٹوٹے ہوئے جوتے کی طرح لمبا ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی، جب بڑھیا کا بیٹا گھر آیا تو لاجو زیادہ نہ چڑی۔ اس سے پہلے جب بھی اسے دیکھتی تھی تو جیسے اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتی تھیں۔

دیکھی میں پھرتے ہوئے لاجو کے ہاتھ سے تین بار چبچ گرا، دو بار ہاتھ سے بیلن چھوٹا، ایک دو بار تو گھی کا کٹورا بھی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

”دھیان سے کام کر“ ایک دو بار بڑھیا نے کرخت لہجے سے کہا۔

”آنکھیں ہیں کہ بن.....“ بڑھیا کے بیٹے نے بھی اسے ٹوکا۔

لیکن لاجو آج بڑھیا کو بھی خاطر میں نہیں لارہی تھی۔ اس کے بیٹے کی تو جیسے آج وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج گھر کے برتن بڑھیا اور اس کے بیٹے کا منہ چزار ہے ہوں۔ لاجو میں آج بہت زیادہ ہمت آگئی تھی۔ نہ تو وہ خوفزدہ تھی اور نہ ہی اسے کوئی سوچ آ رہی تھی۔ بس ایک طے شدہ وقت قریب آ رہا تھا۔ ابھی رات ہو جانی تھی ابھی سب نے سو جانا تھا اور لاجو کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے صابن لگی کلائی سے چوڑی کی طرح نکل جانا تھا۔ آج سے پہلے لاجو جلتی کڑھتی اٹھ کر، دارو کی بوتل لا کر بڑھیا کے بیٹے کے آگے رکھ دیتی۔ آج لاجو خود ہی کمرے سے بوتل نکال لائی۔ یہ بوتل بڑھیا کے بیٹے نے الاچیاں ڈلو کر دو آٹھ ہوائی تھی اور پرانی اور تیز ہونے کی وجہ سے الگ رکھی ہوئی تھی۔

بڑھیا کا بیٹا سوچ رہا تھا ”آج موٹھ کی کچھڑی بھی ملائی جیسی بنائی تھی، آج لاجو خود ہی دارو کی بوتل نکال لائی تھی اور لاجو آج بہت خوش تھی، آج.....“

بڑھیا اونگھ رہی تھی۔



”صحن میں ٹھنڈ ہو رہی ہے میں نے تمہاری چار پائی کرے بچھا دی ہے جا اور جا کر لیٹ جا۔“  
 لاجو نے گھر کی مالکن کی طرح بڑھیا سے کہا۔ ایک بار تو بڑھیا نے تیوری چڑھا کر لاجو کی طرف  
 دیکھا۔

”آج تو جیسے دن ہی پھر گئے ہیں۔ آج تو میں نے اسے تعویذ ڈلوانا تھا، پہلے ہی اثر ہو گیا ہے۔“  
 بڑھیا نے دل ہی دل میں سوچا اور کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

رات کا اندھیرا لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ بڑھیا کا بیٹا دارو کے نشے میں چور لاجو کے بازو اپنی  
 طرف کھینچ رہا تھا۔ رات کا پہلا چہر کب کا گزر چکا تھا۔ گھر کی دیواروں نے جہاں لڑکیوں کے اتنے ہیر پھیر  
 دیکھے تھے، آدھی رات کے وقت یہ بھی دیکھا کہ لاجو دبے پاؤں ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر گھر کی دہلیز سے باہر  
 نکل گئی۔

قدم گن کر چلتے ہوئے لاجو کو ایک دھچکا سا محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔  
 کسی نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا ہے، کسی نے اس کا گلا پکڑ لیا ہے۔ سردیوں کی ابتدائی ٹھنڈ میں  
 بھی لاجو کی کپٹی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔

بلاشبہ رات اندھیری تھی لیکن چمکتے ہوئے تاروں کی مدد سے روشنی بھی لاجو کو بڑی لگ رہی تھی۔ لاجو  
 اپنے گھر کی پکی دیوار کے پاس سے گزر کر اگلے گھروں کے راستے پر جاتے ہوئے ٹھٹھک گئی۔ اس نے گردن  
 موڑ کر اپنے گھر کی اونچی دیوار کو دیکھا۔ ساری گلی میں خاموشی گہرے کی طرح جمی ہوئی تھی۔ پھر بھی لاجو نے گلی  
 کا سیدھا راستہ چھوڑ کر گھروں کے پچھواڑے کا لمبا راستہ اختیار کیا۔ گھروں کی قطار جب ختم ہو گئی، باہر کے  
 کنویں تک پہنچنے کے لئے درمیان میں ایک کھلا میدان آتا تھا۔ یہاں لاجو کے نئے پیروں سے ایک جھرجھری  
 اٹھی اور اس کے ماتھے کی رگوں میں پھیل گئی۔ لاجو نے پیچھے مڑ کر قبروں کی طرح سوئے ہوئے گھروں کو دیکھا،  
 ابھی تک کوئی آفت نہیں آئی تھی ابھی تک کوئی قبروں سے اٹھ کر نہیں آیا تھا۔ لاجو کو سانس کی آواز بھی سنار کی  
 دھونکی کی طرح لگ رہی تھی، لیکن لاجو کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لاجو نے ایک بار چمکتے ہوئے تاروں کی  
 چمکی ہوئی روشنی کی طرف دیکھا اور میدان کی طرف چل پڑی۔

لاجو کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ میدان میں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی اسے دور سے دیکھ سکتا  
 تھا۔ لاجو کو پہنے ہوئے کپڑوں کی سفیدی بھی ڈراتی تھی۔ لیکن وہ میدان سے گزر گئی تھی، اس نے پیچھے مڑ کر

دیکھا پیچھے میدان خالی تھا۔ کنویں کو ایک نظر دیکھ کر لا جو کو ایک بار ہول اٹھا۔ کنویں پر تو کوئی بھی نہیں تھا، رشید ابھی نہ آیا، وہ تو کہیں کی نہیں رہی۔ لا جو کو واپس جانے کا خیال: تھے پر چوٹ جیسا لگتا۔ کنویں کے گرد اس نے چکر لگایا۔ اس نے جیسے دل میں ٹھان لی کہ اگر دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تو آج وہ اسی کنویں میں ڈوب مرے گی۔

چادر اوڑھے قریبی جھاڑیوں سے ایک آدمی نکل آیا۔

”بہن تم لا جو ہو.....؟“ آدمی نے لا جو کے قریب آ کر لپٹی ہوئی چادر سے چہرہ ہار نکالا۔

”یہ بی نشانہ دکھا دو بھائی.....!“ لا جو نے رشید سے کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ رشید سے کے چہرے پر بہت زیادہ ترس مہر کی طرح ثبت تھا۔ رشید سے نے ہاتھ کی انگلی لا جو کے سامنے کر دی۔

”تمہیں پہنچا کر کل یا پرسوں پورہ کو لے جاؤں گا، بچے اس کے ساتھ ہیں۔“

رشید انکویں کے چبوترے سے اتر کر جھاڑیوں سے پار بندھی ہوئی گھوڑی کھول لایا۔

”یا اللہ!“ رشید سے نے ایک بار کہا اور لا جو کو بازو کے سہارے گھوڑی پر بٹھالیا۔ گھوڑی کو ایڑ لگاتے

ہی رشید سے کے من میں خیال آ گیا، جب اس نے پورہ کو چھوڑ آئی کے کچے راستے سے کھینچ کر گھوڑی پر دھریا تھا۔ رشید آج حیران تھا کہ ایک بار پھر اسے گھوڑی دوڑانی پڑی تھی۔ گاؤں کی ایک اور نیار پھر ایک بار اٹھانی پڑی۔ جوانی کی وہ ملاقت آج رشید سے کے بازوؤں میں نہیں تھی۔

رشید اسوج رہا تھا، پورہ کو اٹھا کر وہ جیسے جیسے گھوڑی کو دوڑاتا جاتا تھا منوں بھاری ایک پتھر اس کی

روح پر پڑتا جاتا تھا۔ برس بار اس کی روح پر ایک بوجھ لدا رہا۔ آج جیسے جیسے اس کی گھوڑی رتو وال کی

حدیں پیچھے چھوڑے جا رہی تھی، رشید سے کو محسوس ہوتا اس کی روح پر سے منوں بھاری پتھر پر سے سرکتا جا رہا

تھا۔ رشید جیسے ہلکا پھلکا ہو کر گھوڑی دوڑا رہا تھا۔

## حمیداں

پو پھو مٹے ہی لا جو کے گم ہونے کی خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ منکوں میں ابھی بدعائیاں پڑی ہوئی

تھیں جب ہر گھر میں لا جو کی باتیں ہونے لگیں۔ قریبی دیہاتوں میں کہیں بھی کسی ہندو کا نشان نہیں تھا اور کسی

مسلمان نے یہ کام کس لیے کرنا تھا، لوگ بے حد پریشان تھے۔

روشنی لمحہ بہ لمحہ تیز ہو کر دھوپ میں بدل گئی تھی۔ اپلوں سے بھرے چولہوں پر رکھی دیکچوں میں لوگوں کی دالیں پک چکی تھیں۔ عورتیں ابھی تندور دہکا رہی تھیں، جن سے جلتی ہوئی کپاس کی خشک ٹہنیوں کی خوشبو اور اٹھتی ہوئی مہک نے سارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، تب پورو نے گاؤں کی دہلیز پر قدم رکھا۔

آج لاجو کے گھر کا دروازہ کسی جانور کے کھلے منہ کی طرح وا تھا۔ پورو نے جب اس گھر کے دروازے پر قدم رکھا۔ صحن میں رات کے بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں پر کھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ پورو کو دکھائی دیا کہ کسی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

”اری کہیں وہ کلمو ہی دیکھی ہے؟“ بڑھیا کے ماتھے پر اتنی سلوٹیں تھیں جیسے کسی نے مٹی کی ثابت گار اس کے ماتھے پر توڑ دی ہو۔

”کون اماں؟“ پورو نے سر پر رکھے کھیس صحن میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اری وہی بد قسمت، اللہ اس کو اٹھا لے؟“ بڑھیا نے پھر ساری نفرت ماتھے کی سلوٹوں میں بھر کر کہا۔

”ہائے ہائے کون؟ بہو کدھر ہے.....؟“

”اری وہی جل مرنی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

”ہائے ہائے کس کے ساتھ؟ میں تو اس کے لیے تعویذ اور راکھ لے کر آئی تھی.....“

”چولہے میں ڈالو تعویذ اور راکھ، اس کو تو معلوم نہیں جن لے گئے ہیں یا بھوت۔“

”چھوڑ دام! گاؤں سے کس نے اٹھا لے جانی تھی۔ باہر کھیتوں میں گئی ہوگی ابھی آجائے گی۔“

”کال کرتی ہو! کھیتوں میں گئی ہے، اوپر سے شکر دو پہر ہو گئی ہے۔“

”لیکن اماں! وہ کوئی روٹی کا ٹکڑا تو نہیں تھی کہ جسے کوئے لے اڑے ہوں۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں، ہو سکتا ہے کسی کنویں میں ڈوب مری ہو۔ شاید کسی تالاب میں گر گئی ہو۔ مجھے تو پہلے دن سے ہی اس پر بھروسہ نہیں تھا لیکن یہ بد بخت لڑکا ہی اس پر مارتا تھا اور کہتا تھا اس نے کہاں جانا ہے، اس کے تو آگے نہ کوئی پیچھے۔“

”کیوں اماں اس کے ماں باپ کس گاؤں کے ہیں؟“

”اری! اجڑ گئے ماں باپ۔ میں تو پہلے دن سے کہتی تھی اس طرح پرانی اینٹوں سے گھر نہیں بستے۔ لیکن اس کا تو دل آگیا تھا، بڑھیا کی کون سنتا ہے۔ لو اب تم سے کیا چھپانا، سارا گاؤں جانتا تھا کہ یہ ہندوؤں کی بیٹی تھی۔ جب ہندو گاؤں سے جانے لگے تو میرا بیٹا اس کو کہیں سے لے آیا۔ اللہ جانتا ہے میں تو پہلے دن سے ہی کہتی تھی، بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ اللہ دتے! تو ایسے ہی گناہوں کا بوجھ اٹھالایا ہے۔ آخر کس روز یہ بوجھ سر سے اتاریں گے؟“

”اچھا یہ بات تھی! اسی لیے اماں وہ پیچھے ہوئے لگتی تھی، لیکن بھاگ کر کہاں جائے گی؟ اس کا کوئی دور نہ نزدیک۔ آسمان سے گری اور سمجور میں اٹکی۔ میرے خیال میں تو وہ کسی کنویں میں گر گئی ہوگی، چاہے تو جان بوجھ کر مری ہو، یا ہو سکتا ہے اس کی موت آئی تھی۔“

”ہائے ری کلنک سے تو پیچھا چھوٹا مگر لڑکا میری جان کو آگیا ہے، کہتا ہے تو اندھی تھی، تمہیں پتہ ہی نہیں چلا وہ کوئی چڑیا کا بوٹ تو نہیں تھی جو کسی نے جیب میں ڈال لیا۔“

”پر اماں وہ پہلے بھی کبھی اکیلی باہر جاتی تھی؟“

”اری کہاں، مرے ہوؤں کے پاس جانا تھا۔ شروع شروع میں تو جب میں لڑکے کو دن کا کھانا دینے جاتی تھی تو باہر دروازے پر تالا لگا جاتی تھی۔ پھر لڑکا بھی کہے اور میں بھی سوچوں۔ بے چاری نے کہاں جاتا ہے۔ اگر آنٹنوں پر سر پر کھڑے رہو تو بندے کا دل گھر میں نہیں لگتا بس دوپہر کو تھوڑی دیر ہی اکیلی رہتی تھی۔ کل کھانا دے کر آئی تھی تو اچھی بھلی یہاں بیٹھی ہوئی تھی، رات کو موٹھ ڈال کر کچھڑی پکائی تھی۔

باتھو کا ساگ دینے میں پکایا تھا، روٹی پکائی تھی، ہم ماں بیٹے کو کھلائی تھی۔ خود کھائی، پھر رات کو میری چار پائی کمرے میں بچھائی تھی۔ کہتی تھی اماں مکن میں ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ لڑکے نے ذرا دارو کا گھونٹ پیا تھا۔ پھر میں سو مر گئی، پتہ نہیں کب یہ انہونی بیت گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے آوازیں دیں لیکن کوئی ہوتا تو سنتا۔“

”میں نے کہا کنویں دیکھے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ جانے کے قابل تو تھی نہیں۔“

”جانا بھی کس کے ساتھ تھا؟“ بڑھیا نے اپنے اترے ہوئے ماتھے کو ٹھنوں پر رکھ لیا۔

”حیرانی کی بات ہے، گوشت کی کوئی بونی تو نہیں تھی جو کتے بلی نے منہ میں ڈال لی ہو۔ گاؤں

تو سارا آپ لوگوں نے چھان مارا ہوگا؟“

”ہاں جی، صبح سے یہاں گاؤں کا ایک ایک آدمی آیا ہے، لوگوں نے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا

ہے۔ اب میرا اللہ دتے اور گاؤں کے کچھ لوگ کنویں دیکھنے گئے ہیں۔ شاید مری ہوئی کی لاش ہی مل جائے اور  
لو کے کو بھی افسوس نہ رہے کہ کدھر چلی گئی؟ لڑکا سلامت رہے، عورتیں اور بہت ہیں۔“

ابھی تک پورا افسوس..... شوق کے سارے رنگ اپنے چہرے پر اتارتی، چڑھاتی رہی تھی۔ اب  
دو تین آدمی باہر سے آگئے تھے۔

”تم تو سارے کنویں چھان آئے ہیں۔ اس کی تو کہیں سے ہڈی پہلی بھی نہیں ملی۔“ یہ کہہ کر تینوں  
آدمی سخن میں پیچھی چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔

”جائے جنم میں، تم نے کس لیے اپنی جان کو روگ لگا لیا ہے۔ کوئی بھوت پریت لے گئے ہوں  
گے۔“ بڑھیا نے اللہ دتے کی طرف منہ کر کے افسردگی سے کہا۔

پورو کو پتا چل گیا کہ یہی اللہ دتا ہے۔ پورو کو لا جو کا اترا ہوا چہرہ یاد آیا جو کسی چڑیا کے ہنجر کی طرح تھا  
جس کی جان بھو کی چیل کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

”میرے خیال میں دو رات کو اٹھ کر باہر گئی ہوگی اور کوئی جانور کھا گیا ہوگا۔“ ایک آدمی نے اللہ  
دتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ادھر ہی کوئی گیدڑ گھوم پھر رہا ہوگا اور بھلا گاؤں کے پاس کس جانور نے کھانے کو دوڑنا تھا؟“  
دوسرے نے پاس سے کہا۔

”ہماری طرف سے چور لے جائیں، تم تو کوئی نوالہ طلق سے اتارو۔“ بڑھیا نے اپنے بیٹے کو دلا سہ  
: یا اور اٹھ کر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

”اچھا اماں! اللہ تمہارا کلیجہ ٹھنڈا کرے، میں اب چلتی ہوں۔“ پورو نے بندھی بندھائی کھیسوں کی  
گانتھ سر پر رکھ لی۔

”میں نے کہا تم کون ہو؟“ اللہ دتے نے پورو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ابھی تک اللہ دتے نے پورو کو  
گاؤں کی عورت سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا لیکن کھیسوں کی گانتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو اللہ دتا کھردرے لہجے  
میں بولا۔ ”یہ کون ہے؟“

کھیس، غیر واضحی ہے اور کون ہے؟“ قریب سے ہی بڑھیا نے جواب دیا۔  
”میں نے اس سے پہلے تو تمہیں کبھی گاؤں میں نہیں دیکھا۔“ اللہ دتے نے شک کی بنا پر کہا۔

”کتنے دنوں سے بیچ رہی ہے۔“ بڑھیا نے ڈالتے ہوئے کہا۔

”میری گود میں دو لڑکے ہیں، سب دیہاتوں میں گھوم پھر کر چار پیسے کما لیتی ہوں۔“ پورو کا جی چاہے وہ پرنگا کر یہاں سے اڑ جائے، وہ کس لیے پیچھے گاؤں میں رہ گئی ہے۔ رات کو ساتھ ہی چلی جاتی تو کس نے پتہ کرنا تھا۔

”لیکن تم ہندو ہو یا مسلمان؟“ اللہ دتے کا شک ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی مذاق کرنے لگے ”کیا خیال ہے گھر بٹھانی ہے۔“ اللہ دتے کو ساتھی نے گد گدا کر کہا۔

”ہائے رے بھائیو! میں ہندو کہاں سے ہوں“ اور پورو نے اپنا دور پڑا جوتا پاؤں میں اٹکایا اور گانٹھ سنبھال کر باہر جانے لگی۔

”ہندو کا نام اس کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا۔“ اللہ دتے نے پھر ایک بھاری آواز میں کہا۔  
 ”بھائی تمہارا تو شک ہی نہیں جاتا۔ یہ دیکھو میرا نام حمیداں ہے۔“ پورو نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اپنے بامیں بازو پر لکھا ہوا نام دکھایا۔

”جاری جا، اس کا تو سر گھوم گیا ہے۔“ بڑھیا نے دور سے کہا۔

”مجھے اگر کوئی خبر ملی تو میں خود آ کر بتاؤں گی اماں!“ یہ کہتے ہوئے پورو تیز قدموں سے گلی کی طرف چل دی۔ باؤلی والے چھپر میں پورو نے اپنے دونوں چھوٹے بچے چھوڑے ہوئے تھے، جاوید اب سیانا ہو گیا تھا، چھوٹے کا دل بہلائے رکھتا تھا۔ پورو نے وہ رات گھڑیاں گن گن کر گزاری۔ دوسرے دن اس کے رشیدے نے لاجو کو سکر آ لی اپنے گھر چھوڑ کر پورو کے پاس واپس آتا تھا۔ وہ رات رتو وال میں پورو کی آخری رات تھی۔ وہ تارے کتنی ہوتی دونوں بچوں کو لیکر چار پائی پر لیٹ گئی۔ رتو وال سے آج پورو کی ساری یادیں اور فریادیں مٹ چکی تھیں۔ پورو کو پھلی بار رتو وال آنا یاد آیا۔ کھیتوں کھلیاں دیکھے تھے۔ اس بار پورو نے رام چند سے کھیتوں میں ملنا یاد آیا۔ پھلی بار پورو نے رام چند کے کھیت کھلیاں دیکھے تھے۔ اس بار پورو نے رام چند کا وہ گھر بھی دیکھا جس کو دیکھنے کی حسرت پورو کو برس برس رہی۔ پورو سوچنے لگی کہ اسی گھر میں اس نے بہو بن کر آتا تھا، اس گھر میں اس کی بہن بیاہ کر آئی، اسی گھر میں اس کا بھائی بارات لے کر آیا لیکن پورو نے اس گھر کو کب دیکھا، جب اس گھر میں گھر والوں کی پرچھائیں بھی باقی نہ رہی۔ اس گھر کے جیزوں میں اس نے

صرف ۱۱ جو کا چبایا ہوا شجر دیکھا۔ شکر ہے لا جو بھی اس وقت تک قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ پورو پھر سوچنے لگی آج تو وہ خود ہی اس گھر کے بیجر میں پھنسی ہوئی تھی۔

صرف "حمیداں" نام نے اسے بچا لیا۔ معلوم نہیں کس وقت پورو کی آنکھ لگی اور رات کی تاریکی دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں بدل گئی۔

## من کی باتیں

آنے جانے کا سالم یکہ طے کر کے رشید ارتو وال آیا اور پورو کو لے کر سکر آلی واپس چلا گیا۔ لا جو کی آنکھیں تو جیسے لوہے کے بند دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ پورو کے پیچھے کی پہلی آہٹ سنتے ہی لا جو نے بند دروازے کی چوٹی کھول دی۔ رشیدے نے باہر بھی ایک تالا لگایا ہوا تھا تاکہ گاؤں والوں کو شک نہ ہو۔ برآمدے کا دروازہ اندر سے بند کر کے پورو، لا جو اور رشید اندرونی کمرے میں یکبارگی ایسے بیٹھ گئے جیسے شیر سے ڈرے ہوئے ہرنوں کی ڈار کو جنگل میں کوئی نئی پناہ مل گئی ہو۔ لا جو اور پورو دونوں کو اس طرح محسوس ہوا جیسے وہ اکٹھی کھیتی ہوں، اکٹھی پلی بڑھی ہوں، دونوں ایک دوسرے کی ہم عمر ہوں، لیکن وقت کی گردش نے انہیں برس با برس جدا کر دیا ہو اور آج پھر کسی طوفان کے بعد، کسی بلا کی تیز ہوا کے بعد دونوں آپس میں مل بیٹھی ہوں۔ برسوں کی جدائی اور زندگی کی کہانیاں دونوں کے ہونٹوں پر جم چکی تھیں۔ دونوں کو کہنے اور سننے کی جلدی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ رشیدے کو اس بات کا خیال آیا کہ دونوں اکیلی بیٹھ کر دل کی کہہ سن لیں۔ اصل میں رشید شروع سے ہی برا نہیں تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ پورو کے ساتھ کوئی لین دین کا کھانا تھا اور نہ وہ اتنا برا نہیں تھا کہ راہ چلتے کسی کی نیک سیرت بہن، بیٹی کو زبردستی گھر ڈال لیتا۔ پورو کو اپنی بیوی بنانے کے بعد رشیدے نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی بہن یا بیٹی کو نہ دیکھا۔ دونوں بچوں کو سلا کر وہ پچھلے کمرے میں چار پائی بچھا کر لیٹ گئیں۔ رشید اس روز ساتھ والے کمرے میں سویا۔

"رتو وال کا قافلہ اسی گاؤں سے گزرا تھا۔" پورو نے ہی پہلے بات شروع کی۔

"تم نے دیکھا تھا؟" لا جو اور پورو آج تک مل کر نہیں بیٹھی تھیں۔ لا جو کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ پورو

نے اسے کیسے ڈھونڈا؟ کیوں ڈھونڈا؟



”میں تیرے بھائی سے ملی تھی، تبھی تو مجھے تیرے بارے میں معلوم ہوا۔“

”ہیں.....؟“

”ہاں.....“ اور پورو کو اس دن کے قافلے والے رام چند کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

”تم نے اسے کیسے پہچانا.....؟ تم نے تو کبھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔“

لا جو کے من ہی من میں ساری سوچیں گھوم گئیں۔ کیسے پورو اس کے بھائی کی منگیت تھی، کیسے اس کے بھائی کا بیاہ ہونے والا تھا، کس طرح پورو گم ہو گئی، پھر کس طرح پورو کی چھوٹی بہن کی اس سے شادی ہوئی۔

”میں نے اسے پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔“ پورو نے رتو وال کے کھیتوں والی ساری ہات لا جو کو

بتائی۔ پورو نے یہ بھی بتایا کہ ”اس وقت تک اسے معلوم نہیں تھا کہ رام چند اس کا بہنوئی بن چکا ہے۔“

”مجھے کبھی کسی کی خبر نہیں ملی، سوائے اس دن کے جس دن قافلہ یہاں سے گزرا۔ مرے ہوؤں کو

بھی لوگ یاد رکھتے ہیں، ان کے نام کے کھانے کھلاتے ہیں۔ کبھی کبھار میرا بھی تو گھر میں کوئی نام لینا ہو گا؟“ پورو کا جی بھرا آیا۔

لا جو نے اس کو بتایا کہ اس کا باپ دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کئی بار پورو کا نام لے لے

کر بین کرتی تھی۔

”میری ماں کی قسمت، بیٹی بھی اس کی جیتے جی مر گئی اور اب بہو بھی.....“ پورو نے کہا تو پورو اور

لا جو دونوں رو پڑیں۔ دونوں چار پائی کی بالیس کے ساتھ لگی رہیں جیسے ہجر خانے کی گائیں۔ ”جب تم وہاں جاؤ

گی، میری ماں سے ملو گی تو ایک بار اسے کہنا مجھ زندہ کا چہرہ دیکھے۔“ پورو نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

”میں..... میں..... وہاں کہاں جانا ہے.....؟“

”تم اپنے گھر جاؤ گی، اپنے خاوند کے پاس، اپنے بھائی کے پاس۔“

”میں تو جیتے جی مر گئی ہوں مجھے کون قبول کرے گا؟“

”نہیں لا جو! میں جیتے جی یہ نا انصافی نہیں ہونے دوں گی، تم اپنے گھر جاؤ گی۔ تمہارا اس میں کیا

قصور ہے؟“



”لیکن تمہارا کیا قصور تھا، تمہیں آج تک گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔“

”میری اور بات تھی لا جو.....!“

”تمہاری بات اور کیوں تھی؟ تم کوئی اپنی مرضی سے آئی تھیں؟ تم نے بھی تو مجبوراً.....“

”ہاں لا جو! اس وقت میں اکیلی تھی، میرے والدین میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ لوگوں کے طعنے سنتے

گمراہوں نے اپنا کلیجہ کاٹ ڈالا۔ اب کسی ایک کے نہیں سب کے کلیجے کو ہاتھ پڑا ہے۔“

”نہیں پورو! میری قسمت اچھی ہوتی تو یہ ظلم ہی نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مجھے کوئی نہیں لینے آئے

گا۔“

”میں کہہ رہی ہوں نا! تیرے بھائی کا خط ضرور آئے گا۔ ہم تیرے بارے میں خبر دیں گے تو وہ

ضرور تجھے لینے آئیں گے۔ میرا بھائی کیسا دکھتا ہے؟“ پورو چاہت سے پوچھنے لگی۔

لا جو کو اپنا شوہر یاد آیا ”وہ کیسے اس سے نظریں ملائے گی؟ وہ کیسے گھر والوں کا سامنا کرے گی؟“

لا جو سوچنے لگی مگر اس کو جیسے یقین تھا کہ اسے کوئی بھی لینے نہیں آئے گا۔ ”ویسے کسی سہانی آس کے سہارے

جتنے دن چاہے گزار لو۔“

”نہیں لا جو! کوئی نہ کوئی ضرور تجھے لینے آئے گا۔ آج کوئی کسی کو طعنہ نہیں دے سکتا، سب لوگ اپنی

بہنوں، بیٹیوں کو لے جا رہے ہیں۔ رشید ایتار ہا تھا کہ دوسری طرف سے بھی لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کے اپنی عورتیں

واپس لا رہے ہیں۔ کئی عورتوں کے تو بچے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔“ پھر دونوں گم سم عورتوں کی اس بے بسی کو

سوچنے لگیں۔

لا جو سوچنے لگی کہ آج تک اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس میں کیا نقص تھا۔

آج یہی نقص اسے بچا گیا، ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حال ہوتا؟ ”پہلے وہ ایک کورو تے تھے اب دو کورو لیں

گے۔ میں نے کہیں نہیں جانا پورو! میں کس منہ سے جاؤں گی۔ میں تیرے بچوں کی نوکری کر کے روٹی کھا لوں

گی۔“

”اس طرح کیوں کہتی ہو لا جو! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے لیکن لا جو وہ تمہیں

ضرور لے جائیں گے۔ میں دنیا جہان کے واسطے دے کر ان کو دے کر منالوں گی۔“ لا جو نے پورو کو بازوؤں

میں بھینچ لیا۔

”تم اپنی کہو، کیسی ہو پورو؟“

”رشدے کی پیٹھ سنتی ہے۔ پہلا گناہ جو اس نے کیا سو کیا مگر اس کے بعد اس نے مجھے کبھی برا بھلا

نہیں کہا۔ وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں کیسے تمہیں ڈھونڈ نکالتی؟“

”مجھے واپس لانے کے لیے اس نے اپنی جان جو کھوں میں ڈالی ہے۔ اگر کہیں اس شیطان کو پتہ

لگ جاتا تو اس نے میری ہڈیاں جلا کر پانی پینا تھا....“

”اس نے جلانی کب تھی بگلی! وہ لوگ تو دفنا دیتے ہیں۔“

”کیا معلوم، لیکن پورو کہیں وہ اس گاؤں کا سراغ تو نہیں لگا لے گا؟ میرا تو جی ڈرتا ہے کہیں تمہارا

بستا گھر برباد نہ کر دوں۔“

”ابھی تک تو ان کو تیرے سایے کا بھی پتہ نہیں لگا تھا۔“

اور پورو نے وہ ساری بات سنائی کہ کس طرح وہ لاجو کے گم ہو جانے کے بعد بڑھیا اور اس کے

بیٹے سی ملی تھی۔

”پہلے اسی اندرونی کمرے میں کئی دن ایک ہندو لڑکی چھپائے رکھی تھی، کسی کو اس کے بارے میں

کچھ معلوم نہ تھا پھر میں اس دن اسے قافلے میں چھوڑ آئی تھی۔ تجھے بھی اس گاؤں میں چوری رکھنا ہے تاکہ

گاؤں میں کسی کو شبہ نہ ہو۔ نے پائے۔ جس دن خط آ گیا تجھے چپکے سے جا کر لاہور چھوڑ آنا ہے کسی کو کان دکان خبر

بھی نہیں ہوگی۔“

”اگر ان کا خط نہ آیا....“

”میرا دل گواہی دیتا ہے لاجو! تیرا بھائی ضرور خط لکھے گا۔“

## بچکولے

دنوں پر دن گزرتے گئے۔ ہر صبح منہ اٹھاتی رہی، ہر شام سر جھکاتی رہی نہ لاجو کے بارے میں کوئی

خبر باہر نکلی نہ ہی لاجو کے گھر والوں کی کوئی خبر پہنچی۔ ویسے پورو اور لاجو کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہو گیا

تھا۔ رات کو جب نیند سے ان کی آنکھیں بھر جاتی دونوں کی آنکھوں میں خواب ہی خواب بکھر جاتے۔ صبح اٹھ کر

وہ ایک دوسرے سے خوب باتیں کرتیں۔ خوابوں کی اچھی بری تعبیریں سوچتیں۔ کبھی ان کے من میں کوئی ترنگ ہاتی نہ رہتی کبھی ان کا من مہم جاتا۔ کئی بار لاجو جو لہے سے کوئلہ لے کر لیکریں کھینچے بیٹھ جاتی، کبھی اسے لیکریں راہ بھاتیں۔ کئی بار لاجو کے رخساروں پر آنسوؤں کی جھری لگ جاتی۔ بہت دفع لاجو، پورو کے بچوں سے کھیل کر جی بہلا لیتی، ویسے لاجو کا من اکثر نراس ہی سوچتا۔ اسے امید نہیں تھی کہ کبھی کوئی اس کی خبر بھی لے گا لیکن پورو کا من اندر ہی اندر گواہی دیتا تھا کہ کسی دن اچانک ہی کوئی آ جائے گا۔ کسی دن اچانک کوئی خط آ جائے گا۔ لاجو کے دن پھر اچھے ہوں گے۔ پورو اپنی طرف سے لاجو کی اچھی طرح تواضع کرتی تھی۔ سوچتی تھی وہ شاید چند دنوں کے لئے اس کے پاس امانت ہے پھر شاید اسے کبھی بدل سکے گی، کبھی نہ دیکھ پائے گی۔ ہاتی سب کے چہرے بھی اسے اس وقت صرف لاجو کے چہرے میں سے دکھائی دیتے تھے۔ کب کسی نے اس کے گھر رہنے آنا تھا، کب کسی نے اس سے ملنے آنا تھا۔ اس کے اپنے رشتہ داروں میں سے لاجو نے بھی اس کے گھر نہیں آنا تھا۔ رات کے اندھروں نے لاجو کا بھید بہت وفاداری سے سنبھالا لیکن گاؤں کے ڈاکے نے تین پیسوں کا ایک بھی کارڈ لا کر ان کے صحن میں نہ پھینکا۔ خیالات جیسے لاجو اور پورو کے چہرے پر جم گئے تھے۔ صرف لاجو کو ایک ڈھارس تھی کہ کبھی پورو اور رشید سے اس کا جی میلانہ ہونے دیا۔ لیکن سارا دن گھر میں بند چھپی ہوئی لاجو سوچتی تھی کہ پہاڑی عمر اس کے سر پر لٹک رہی تھی کب اس کے دن پورے ہوئے؟

پورو کا کسی کے گھر زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ لاجو اندرونی کمرے میں ہی بیٹھتی تھی یا پھر دوپہر کے وقت باہر کے دروازے کی چٹنی لگا کر چھ خا کا تتی رہتی۔ دھاگے ختم ہو جاتے، دن ختم ہو جاتے، لیکن سوچیں نہ ختم ہوتیں۔

سخت سردی گزر گئی پھاگن کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ پانیوں کی ٹھنڈک کم ہو گئی تھی۔ ایک دن دھلتی دوپہر میں رشید جب گھر کی دہلیز سے گزرا، لاجو اور پورو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

سب سے پہلے چہرے کے ساتھ دونوں اس کے دائیں ہاتھیں بیٹھ گئیں۔ کتنی ہی دیر رشید اچکھ کہہ نہ پایا۔ لاجو کے کلیجے کو جیسے مٹھی میں بھر کر چھوڑ رہا تھا۔ اس کو ایک ہی ڈر تھا کہ رتوال کی بو دھیا اور اس کے بیٹے نے لاجو کا کھونچ لگا لیا ہے۔ وہ اس کو زبردستی کھینچ جان کر لے جائیں گے، معلوم نہیں پورو اور رشید سے کے ساتھ کیا کریں گے۔ رشید اچا رہا پانی کے کنارے بیٹھ گیا۔ قمیض کی بازو کے ساتھ دونوں آنکھیں پونچھ کر لاجو کو چھکارا۔

اس کے ہاتھوں میں وہی جذبہ تھا جو ایک بزرگ باپ کا بیٹی سسرال وداع کرتے ہوئے ہوتا ہے۔

رشید سے کامن بڑا دکھی ہو رہا تھا پھر رشید نے اپنے من کو تھام کر کہا ”آج رام چند آیا تھا۔“  
 ”یہاں؟“ لا جو اور پورو کے منہ سے یکبارگی آواز نکلی۔

”ہاں، کچھ ہندوستانی، کچھ پاکستانی سپاہی اس کے ساتھ تھے، اسی طرح لوگ گاؤں گاؤں، شہر شہر جا کر گشددہ لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں، مجھے اکیلے میں بھی رام چند ملا تھا۔“ رشید اتنا رہا تھا۔  
 ”سچ مجھے لینے آئے ہیں؟“ لا جو نے یکبارگی کہا اور پھر کہہ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ اس کو لگا اس کا سوال بے موقع تھا۔

”جھٹلی نہ ہو تو اور کیا کرنے آئے ہیں.....؟“ رشید نے کہا۔  
 پورو نے ابھی تک چپ نہیں توڑی تھی۔ وہ من ہی من میں نہال ہوئی جا رہی تھی کہ اس کا یقین سچا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رام چند آئے گا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ بیل ضرور منڈھے چڑھے گی، لا جو تو ایسے ہی اپنا دل چھوڑ دیتی تھی۔ جن دنوں رشید ابھی مایوس ہو جاتا تھا پورو کا دل گواہی دیتا تھا، رام چند ضرور آئے گا، سو آج وہ دن آ گیا ہے۔

”کیا ہے.....“ لا جو نے پوچھا۔

رشید سمجھ گیا کہ لا جو کے اس طرح پوچھنے کا کیا مطلب ہے۔

”ہاں ابھی تو اکیلا آیا ہے لیکن تم فکر نہ کرو لا جو! تمہارے گھر والے تمہیں صدقے واری ہوتے ہوئے لے جائیں گے۔“ لا جو کو کچھ تسلی ہو گئی۔

”تمہارا نام سن کر تمہاری خبر سن کر رام چند کا رونا تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آتا تھا۔“ رشید نے کی آنکھیں پھر بھرتائیں۔ لا جو اور پورو نے رونا شروع کر دیا۔

”میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجا دیا ہے۔ آج یہاں اس طرح تمہیں حوالے کرنے سے سارے گاؤں کو خبر ہو جاتی، ہو سکتا ہے رتو وال تک بھی بات پہنچ جاتی۔ میں نے انہیں کہا ہے آپ لا جو رو اپس چلے جائیں میں لڑکی کو لے کر لا جو پہنچ جاؤں گا اور وہیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔“  
 ”یہ بہت اچھا کیا ہے۔“ پورو نے جواب دیا۔

”ہم وہاں آج سے پانچویں دن پہنچے گے۔ اس وقت تک وہ پورو کے بھائی کو بھی امرتسر سے بلا لیں گے۔ میں نے سوچا تھا ایک بار پورو بھی اپنے بھائی کو مل لے گی۔“ رشید لا جو کو چکارتے ہوئے بتا رہا

تھا۔

پورو کے رکے ہوئے آنسو بہنے لگے۔ لاجو نے پورو کی جھولی میں سر رکھ کر پورو کو بھیج لیا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ دونوں کے دکھ مشترک ہو گئے تھے۔ دونوں کے آنسو ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

لاہور پہنچنے کا راستہ مشکل سے ڈیڑھ دن کا تھا۔ ابھی یہاں سے روانہ ہونے میں پورے تین دن تھے۔ اگلے دن پورو نے بسن پسوایا، بھینسوں کے دودھ کا جمع کیا ہوا مکھن نکالا، کشمش اور میوے ڈال کر پورو سارا دن پٹیاں (لڈو) بناتی رہی، جیسے بچی کو سسرال بھیجنا ہو۔ پورو نے ایک چاندی کی کڑھائی والا جوڑا نکالا، جو کو کلیجے سے لگاتی رہی۔ لاجو کو بھیج بھیج کر روتی رہی۔

پھر تین دن بعد دونوں بچوں کو ساتھ لے کر پورو، لاجو اور رشید امنہ اندھیرے گاؤں سے نکلے اور گاڑی پکڑی۔

پچھلے چار دنوں سے پورو کو سارا سارا دن اور ساری ساری رات کئی خیال آتے رہے۔ من ہی من میں کچھ طے کرتی رہتی۔ میں لاجو سے کہوں گی میری ماں سے جا کر یہ کہنا، میری ماں کو جا کر یہ بتانا۔ کسی طرح مجھ جیتی جاگتی کا منہ دیکھے..... سوچتے سوچتے پورو کا دل بھر آیا۔ سوچتے سوچتے پورو کو کہنے کے لیے بہت کچھ یاد آیا۔ سوچتے سوچتے پورو کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

لاجو کو اپنے بھائی اور اپنے خاوند کا چہرہ دیکھنا بڑا عجیب لگتا تھا جیسے کوئی مرنے کے بعد دوسری دنیا میں کھوئے ہوئے چہروں کو دیکھنے کی آس رکھتا ہو۔ بلاشبہ لاجو کو اپنے گھر والوں سے پچھڑے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو گئے تھے، لیکن لاجو کو ایسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک بار مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں جی اٹھی ہے۔ سفر کے دوران تمام وقت دونوں کے من جھگو لے کھاتے رہے۔

## ایک پل

پولیس کے پہرے میں جب وہ طے، لاجو کی پلکیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ پورو نے اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا، ملاپ کی اس گھڑی کے دوسری جانب ہمیشہ کے لئے جدائی نظر آرہی تھی۔ کسی کے بھی آنسو تھمنے میں

نہیں آرہے تھے۔

مردوں کے دل بھی ڈول گئے۔ اس انہونی کے بعد کسی کے پاس پوچھنے یا بتانے کے لیے کچھ نہ تھا۔  
رورو کران کے ہاتھ بھیگ گئے۔ زار و قطار رونے سے ان کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔  
”واسطے ہے کبھی بھول کر بھی لا جو کی بے عزتی نہ کرنا۔“ پہلے پہل پورو بولی۔  
”پورو ہمیں شرمندہ نہ کر۔“ آخر کار لا جو کے بھائی نے کہا۔

لا جو کا خاندان کچھ نہ بول سکا اور نہ ہی شاید کچھ سن سکا۔ آج اس نے صرف اپنی بیوی ہی نہیں دیکھی،  
آج اس نے ہوش سے پہلے کی کھوئی ہوئی بہن دیکھی تھی۔

برس ہا برس اس کے اندر ایک آگ سلگتی رہی تھی۔ اسی کی ایک چنگاری اس نے رشیدے کے کھیت  
کو دکھائی تھی، اس کا سارا کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ برس ہا برس وہ اس شہزادی کی کہانی کو سوچتا رہا تھا، جس کو  
ایک دیو چرا کو لے گیا تھا پھر پورب دیس کا ایک شہزادہ اپنے جادوئی تیروں کے ذریعے اس کو چھڑا لے گیا تھا۔  
چھوٹی عمر میں وہ کئی سادھوؤں، سنتوں سے جادو کے تیراگتار ہا۔ جوان ہو کر وہ پورو کے بارے میں سوچ سوچ  
کر دانت چیتا رہتا۔ آج برسوں کی کھوئی ہوئی پورو اس کی آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بھول  
گیا تھا کہ رشیدے نے اس کی بیوی کو بچایا ہے۔ اس گھڑی اسے صرف یہی یاد تھا کہ رشید اس کی بہن کو اٹھا  
لے گیا تھا۔

پولیس والوں کی لاری تیار ہوئی تھی، ہندوستانی پولیس کے سپاہیوں نے اعلان کیا:

”آؤ! دوسری طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں، لاری تیار ہے۔“

رام چند نے رشیدے کے گلے لگ کر بار بار اسے کہا:

”تیری مہربانی بھائی! تیرا احسان نہیں بھولیں گے۔“

رشیدے کے چہرے پر احسان کرنے کی خوشی بھی تھی، لیکن رشیدے کی نظریں لا جو کو بچا کر بھی  
شرمندہ تھیں۔ رشیدے کو پورو کا اٹھا لے جانا یاد آ رہا تھا، پھر اسے محسوس ہوا اس پر چڑھا ہوا قرضہ کچھ نہ کچھ اتر  
رہا تھا۔

ایک بار آواز پھر آئی ”دوسری طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں۔“

پورو نے چاندی کی کڑہائی والا جوڑا اور میسن کی ٹاپوں (لڈوؤں کی پولٹی لا جو کے ہاتھ میں دی، لا جو

کو بچھین کر چنگے لگایا اور پھر آخری لمبے کے لیے اپنے بھائی کے سینے سے لگ گئی۔

”پورو“ پورو کا بھائی صرف اتنا ہی کہہ سکا اور اس نے پورو کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

”میری بات سن، اس وقت.....“ پورو کے بھائی نے پھر جی کڑا کر کے کہا۔ پورو کو اپنے بھائی کی بات سمجھ میں آگئی، پورو کو ایک بار خیال آیا۔

”اگر میں اس وقت کہہ دوں میں ایک ہندو عورت ہوں تو وہ ضرور ان کے ساتھ لاری میں بٹھا کر لے جائیں گے، میں بھی..... لا جو کی طرح..... ملک کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح.....“

پورو کے رکے ہوئے آنسو پھر نکل آئے اس نے دھیرے سے اپنے بھائی سے اپنا بازو چھڑا لیا اور دور کھڑے رشید کے پاس جا کر اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگالیا۔

”لا جو اپنے گھر واپس جائے گی تو سمجھنا وہ پورو کی صورت میں آگئی ہے۔ میری جگہ اب یہی ہے۔“ پورو نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھائی کو آہستہ سے کہا۔

رام چند نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ دونوں ہاتھ پورو کے آگے جوڑ دیے۔ کوئی اندرونی دکھ رام چند کے ہونٹوں پر جم گیا، رام چند بول بھی نہ سکا۔

”لڑکی چاہے ہندو ہو یا مسلمان، جو بھی لڑکی اپنے ٹھکانے پہنچ رہی ہے سمجھو اس میں پورو کی روح ٹھکانے پہنچ رہی ہے۔“ پورو نے من ہی من میں کہا اور دونوں آنکھیں زمین پر جھکا کر رام چند کو آخری پر نام دیا۔

لاری چل پڑی تھی، خالی سڑک پر گرد پھیل گئی۔

\*\*\*



## جہنم کی آگ

ہنگری کا ادیب آرثر کوئسلر پیدائشی یہودی تھا۔ اس وقت کہ جب 1933 میں ہٹلر کے دور میں جرمنی کے شہروں میں کئی لاکھ کتابیں جلائی گئی تھیں، کوئسلر کی کتابیں بھی جلائی گئیں اور پھر جب 1952 میں سالن کے دور میں سوویت یونین کے مقبوضہ جرمن شہروں میں نوے لاکھ کتابیں جلائی گئیں، تب بھی کوئسلر کی کتابیں اس آگ کے حوالے ہوئی تھیں اور اس دوسری آگ کی راکھ میں کوئسلر کو اپنی کتاب کا ایک ادھ جلا ورق ملا تھا جس پر اس کا نام پڑھا جاسکتا تھا۔ اس ادھ جلے ورق کو کوئسلر نے فریم کروا کے اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کر دیا تھا وہ کہتا تھا کہ زندگی میں دو دفعہ کسی کی کتابیں جلائے جانے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہے؟

دسمبر 1987 میں جب اچانک دلی سے پاکستانی ادیب فخر زمان کا فون آیا کہ برسوں کے انتظار کے بعد انہیں اب پہلی دفعہ ہندوستان آنے کا موقع ملا ہے اور وہ تین دن میرے گھر قیام کریں گے تو آرثر کوئسلر کی زندگی کا وہ واقعہ میری نظروں کے سامنے آ گیا جب فخر زمان کے دیس میں ان کی ساری تصانیف ضبط کی گئی تھیں اور انہیں انڈیا کا ویزا بھی نہیں دیا جا رہا تھا۔ فخر زمان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی وگرنہ وہی رفاقت تو برسوں پر محیط تھی۔ تین دن میں ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ ان کی تمام کتابوں کا ایک مجموعہ چھپ رہا ہے۔ میں نے آرثر کوئسلر والے واقعہ کی روشنی میں پوچھا کہ آپ کی تمام تصانیف ضبط کی گئی ہیں، اگر ان سب کا ایک مجموعہ چھپ گیا تو کیا وہ ضبط نہیں ہو جائے گا؟

فخر نے کہا شاید ہو جائے گا۔ دوسری بار شاید نہ ہو کیوں کہ سرکاری کاغذوں میں ان کتابوں کا جو نام درج ہے ان سے مختلف نام سے یہ کتابیں چھپیں گی۔

وہ ہنس دینے اندر تو وہی نام ہوں گے۔ قانون کے اس دلچسپ پہلو پر وہ ہنستے رہے پھر فخر نے کہا کہ 'میری کتاب' 'بندی دان' کی ڈرامائی تشکیل کی گئی ہے یہ کتاب ضبط شدہ ہے۔ ادھر چھپ نہیں سکتی لہذا اس کی



ڈرامائی تشکیل پر اعتراض ہونا چاہیے یا نہیں۔۔۔ جب اوپر والے یہ فیصلہ نہ کر سکے تو اس پر پابندی لگا دی کہ یہ کھیل عوامی پلیٹ فارم پر نہیں دکھایا جاسکتا اسے اپنے گھر میں بیٹھ کے کھیل لو۔۔۔ سو ہم نے اس ڈرامے کو اپنے ایک دوست کی وسیع و کاشادہ کوٹھی میں تشکیل دیا۔ جتنے لوگ بھی اس جگہ آ سکتے تھے۔ بے نظیر بھٹو بھی آئی تھیں کوٹھی کے چاروں طرف سرکاری پہرا لگا ہوا تھا۔ ادھر ایک دوست نے ڈرامے کی ویڈیو ریکارڈنگ کر لی۔ یہ ریکارڈنگ گھریلو ویڈیو کمرے سے کی گئی تھی لہذا تکنیکی اعتبار سے اچھی نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک دستاویز بن گئی ہے۔

فخر کا ناول ”بندی دان“ میں نے پڑھا ہے لہذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل رُودے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا ایک ایک کردار آتا گیا اور درد کی چھجن بن کے آنکھوں سے بہتا گیا۔ اس وقت فخر نے بتایا کہ میں وہ فلم تمہیں دکھانے کے لیے لایا ہوں۔ ”میری پہلی حیرانی ایک سوال کی صورت میں تھی کہ انہوں نے لانے کی اجازت کیسے دی؟ پھر یاد آیا کہ فخر سیدھا اپنے ملک سے نہیں آیا۔ بیس سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ وہ فلم دیکھتے ہوئے مجھے آرتھر کونسلر کی دیوار پر لگا ہوا اس کا ادھ جلا ورق یاد آتا رہا۔ میں نے دیکھا فخر مسکرا رہے ہیں جیسے کونسلر کی طرح کہہ رہے ہوں، ”دیکھو یہ ہے لوگوں کا وہ دکھ جو ضبط شدہ قرار دیا گیا ہے مگر وقت کے درد کو کاغذ پر اتارنے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہوتا ہے نا کہ اسے ضبط شدہ قرار دینے کا فخر؟۔۔۔“

اگلے دن 26 دسمبر کی شام کو دلی کی ”قلم زاد“ تنظیم کی طرف سے فخر زمان کو استقبال دیا گیا۔ اردو کے ادیب قمر رئیس نے صدارت کی۔ میں اس دعوت کی مہمان خصوصی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے فخر کے کردار کھوم رہے تھے۔ اس لیے جب بطور مہمان خصوصی مجھے چند حرف کہنے کے لیے بلایا گیا تو میں نے کہا ”فخر زمان اپنے ناول ”بندی دان“ میں زید کا کردار پیش کرتے ہیں تو زید کہتا ہے کل جو انسانی قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں۔ آنے والے کل میں جو قتل ہو گا وہ بھی میں ہوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے میرے دل کا یہ عالم ہے کہ وہ ”زید“ فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔ یہ بات کرتے ہوئے مجھے فراق گورنپوری بہت یاد آئے جو اکثر ایک بات سنایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے حوالے سے دھرایا کہ ”ادبی تاریخ میں جنت اور جہنم کا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا والوں نے دیکھا کہ یہ شاعر ادیب ہیں۔ یہ پتہ نہیں عوام کا دکھا اپنے دلوں میں کیوں بسا لیتے ہیں کہ پھر ساری زندگی تڑپتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں عوام

کے دکھ سے کوئی سروکار نہیں ہوگا انہوں نے زندگی کو دو نام دیے ایک جنت جو ان کی اپنی زندگی کے لیے تھا۔ ایک دوزخ جو شاعروں اور ادیبوں کے لیے تھا۔ پھر ایک دفعہ جنت میں ایسی ٹھنڈی ہوا چلی کہ لوگ سردی سے کاٹنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ جہنم میں بہت آگ جلتی ہے، اس لیے تھوڑی آگ جہنم سے مانگ لی جائے۔ لیکن جب انہوں نے اہل جہنم سے آگ کی فرمائش کی تو جہنم سے جواب آیا کہ ادھر فالٹو آگ نہیں ہوتی۔ ادھر جو لوگ آتے ہیں وہ اپنی آگ ساتھ لے کر آتے ہیں۔ تو ایسی ہی آگ شاعروں اور ادیبوں کے سینوں میں جلتی ہے۔ یہ آگ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ اس آگ کو حاصل کرنے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے۔

اس حوالے سے بات بڑھاتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کی منہی قوتوں کے اندھیرے میں شعور کی آگ فخر زمان کی صورت میں جلتی ہے، ہم سب بھی اسے اپنے اپنے سینوں میں لے کر ان کی آگ کا استقبال کرنے آئے ہیں۔ وہ تین دن فخر زمان سے میری طویل ملاقات کے دن تھے جس سے نکلنے والی چنگاریاں منہی قوتوں کی اندھیری دنیا کو چیرتی چلی گئیں۔

☆☆☆☆

## کچھ ہور ویروے

(یاداں)

کئی گلاں رگاں وچ پنیاں ہوئیاں سن۔ لکھنوں رہ جانڈیاں ہن۔ "رہیدی ٹکٹ" وچ بہت کچھ درج کیتا سی، پر کچھ گلاں سن، جو ہتھیوں لانیجے ہو گئیاں۔ شاید ایس لئی کہ اوہ وجود وچ اینیاں وس گئیاں سن، کہ چیتا وی اوہناں نوں دکھرے طور تے پہچان نہیں سکيا۔

اک گھٹنا (واقعہ) ایہ سی، کہ جدوں پنجاں کھو ورھیاں دی ساں، میرے پتا نے میرے کولوں باؤنی صاحب گردوارے وچ ارداس کردائی سی۔ بھری سنگت وچ۔ گھر وچ اوہ ارداس دا حرف حرف کئی دن چیتے کرداؤندے رہے سن، تے تاکید کیتی سی 'بس ہتھ جوڑ کے حضوری وچ کھلو جاتا ہے۔ اکھاں میٹ لیدیاں ہن۔ ہر پاسے لوگ ہون گے پر توں کسے دل دیکھنا نہیں۔ اوہناں نوں سوچنا وی نہیں کہ لوک تینوں کوں دیکھ رہے ہن۔ سارا دھیان ارداس وچ رکھنا ہے۔ آپنے مونہہ دھیان ہو کے کھلوتا ہے۔ ایس طرحاں تینوں کوئی حرف نہیں بھلے گا۔'

جاپدا ہے، ایہ چھوٹی جہی گل میریاں رگاں وچ اتر گئی۔ ساری زندگی دھیان آپنے لفظاں نال جڑیا رہیا۔ جس ویلے، جو لکھ رہی ہوندی ہاں، پوری دی پوری اوہدے وچ سمائی ہوئی ہوندی ہاں۔ کدے خیال نہیں آیا کہ لوک ایسوں پڑھ کے کیہ آکھن گے۔ نندا اُستتہ کیہ ہونڈیاں ہن، اوس عمر وچ میں نہیں سی جاندی۔ پر میرے پتا جاندے سن۔ پتا نہیں اوہ اوہناں دی ذور اندیشی سی یاں قدرت دا کوئی کرم، جہنے میرے وجود وچ اوہ

کئی پادتی کہ فیر نندا اُستت دیاں وڈیاں وارداتاں وچوں گزرن ویلے دی، من تھاویں رہیا۔ بچے کدے گھڑی ڈولیا وی، تاں اگلے پل تھاویں ہو گیا۔

اک گھٹنا ہو رہی سی، جو اج وی میرے لئی رہس وچ لپٹی ہوئی ہے۔ عمر شاید سٹاں کو ورھیاں دی ہووے گی کہ لاہور دے چونا منڈی والے مکان وچ جو سبھ توں وڈا کمرہ سی، میرے پتا کئی پُراچین کھرڑیاں نوں دچھا کے، اوتھے بہندے سن۔ تے اوہناں دے کئی حصے کسے کاتب نوں بلا کے، بڑی خش خطی نال کاپی کرواندے سن۔ اک دن میں اوتھے ننگے سر چلی گئی، تاں پتا نے چھوڑ ماری۔ اوہناں دا حکم سی، کہ اوس کمرے وچ سبھ نے سر ڈھک کے آوتا ہے۔ اوہناں دی نظر وچ اوہ کتاباں دا ادب رکھن والی گل سی۔ اوس ویلے میں ایہ چھوڑ چپ کر کے جر لئی۔ پر لگدا ہے، جو جریا سی، اوہ میرے من کولوں جریاں نہیں سی گیا۔ کجھ ای گھنٹیاں پچھوں تیز بخار ہو گیا۔ ماں ٹھنڈے پانی دیاں پٹیاں سر تے رکھدی پٹی سی۔ جس ویلے میں تڑپ کے ماں دے مونہہ ول دیکھیا سی، تے آکھیا سی۔ اج جھڑیاں کتاباں لئی مینوں چھوڑ ماری اے، ایہو جہیاں میں آپے لکھ سکدی ہاں۔۔۔۔۔

ایہ قیامتی حرف میری زبان تے جس طرحاں آئے سن، میں اج تک نہیں جاندی۔ فیر کجھ ورھیاں پچھوں اک گھٹنا داہری، جینے میرے پتا دی زندگی وچ اک موڑ لے آندا۔ اوہ سکھ اتہاس دیاں وارداتاں لکھدے تے مناندے ہوندے سن۔ تے اوہ اتہاس نوں پراسارن لئی، اک وار وٹوں ودھ پیسے خرچ کے، کجھ سلائیڈز بنوائے۔ اک پروجیکٹر لیا، تے اک وڈی ساری سکرین جھوں دیوار تے لا کے، اوہ سلائیڈ دیکھے تے دکھائے جاسکدے سن۔ اوہناں ساریاں چتراں دی جو دیاکھیا کرنی ہوندی سی، پتا جی بول کے کردے سن۔

گھٹنا ایہ ہوئی کہ اک وار اوہناں نے اک گردوارے دی دیوار اُتے سکرین لا کے، بھری سنگت نوں اوہ سلائیڈ دکھائے۔ لوک گرو پریم وچ بچے ہوئے، دیکھ رہے سن کہ بھیڑ وچوں دو ٹہنگ سکھ اُٹھ کھلوتے کہ گردوارے وچ ایہ سینما نہیں چلے گا۔۔۔۔۔

اوس ویلے میں وی اوتھے ساں، پتا جی نال لے گئے سن۔ چھوٹی جہی نوں۔ دیکھیا۔  
 پتا جی چپ دے چپ ہو گئے سن۔ اک آدمی پتا جی نال گیا سی۔ اوس سامان والے  
 کالے ٹرنک نوں چکن رکھن لئی۔ سو پتا جی نے اوہنوں سارا سامان ٹرنک وچ پا کے، بند  
 کرن لئی آکھیا تے جھستی نال میرا ہتھ پھڑکے، مینوں سنبالدے، اوہ بھیڑ وچوں نکل  
 کے باہر آ گئے۔۔۔۔۔

ایہ گھٹنا سی کہ اوس توں بعد پتا جی نے اک خاموشی اختیار کر لئی۔ سکھ اتہاس  
 بارے جو لیکچر دیندے سن، پھڑکتے۔ اوہناں دا آکھیا اکو فقرا سی۔ 'کے مورکھ نال  
 بحث نہیں ہو سکدی'۔

اوہ کالا ٹرنک فیرکردی نہیں کھولھیا گیا۔ جدوں پتا جی لاہور پھڑکے بہار چلے گئے،  
 شاید 1945 وچ، کہ اوتھے کجھ زمین خرید کے، اوہ آپنی اک کنیا پالین گئے، تاں اوہ  
 کالا ٹرنک اوسے طرحاں بند دا بند، کچھ لاہور والے مکان وچ پیا رہیا۔ فیر 1947 وچ  
 لاہور پھڑکے ویلے، ایس طرحاں میرا سبھ کجھ اوس مکان وچ رہ گیا، اوسے طرحاں اوہ  
 کالا ٹرنک دی۔ ایسے گھٹنا نے، ظاہرا طور تے میرے پتا دا من اُپرام کر دتا سی، اوہناں  
 دی زندگی دا راہ بدل دتا سی۔ پر کدے سوچدی ہاں، تاں لگدا ہے، کہ ایس گھٹنا نے  
 مینوں کھیاں وختاں توں بچا لیا۔

میں کدے وی وقتی طور تے جذباتی ہو کے، کسے سنستھا (تنظیم) نال نہیں جڑو سکی۔  
 کئی وار ویلے آئے، کانگریس نال جرن دی پیشکش ہوئی، فیر کیونسٹ پارٹی نال، تے فیر  
 جدوں راج سبھا دی ممبر ساں، اک دن جنرل اردوڈا نے پچھیا۔ کیہ میں کانگریس دی  
 ممبر ہاں؟ میں کہیا نہیں، تاں اوہناں نے سکھ منچ نال جرن دی پیشکش کیتی۔ ایہ دی  
 آکھیا کہ مینوں آپنے اظہار لئی بہت دڈا منچ ملے گا۔ میں ہس پئی، آکھیا۔ نہیں جنرل  
 صاحب، مینوں کوئی منچ نہیں چاہیدا۔ میں کسے سنستھا نال نہیں جڑو سکی۔

(پہلی انٹرویو: جمیل احمد پال)

امرتا پر يتم

گورنکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم

## ہم سب غدار ہیں

میں نہیں جانتی۔ دنیا میں پہلی سیاسی جماعت کون سی تھی اور وقت کا وہ کون سا دباؤ تھا جس کے باعث اسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونا پڑا تھا۔۔۔ اسی طرح میں یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون سی ایسی شے تھی جس کی لوگوں کو ضرورت تھی اور کس پہلے منافع خور نے اسے گوداموں میں چھپا دیا تھا۔ لیکن ایک بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اتنی تیکنیکی ترقی کے ہوتے ہوئے بھی یہ ایسا دور ہے جب انسانی رشتے زمین دوز ہو گئے ہیں۔

ایک مرد اور عورت کے انتہائی نجی رشتے سے لے کر انسان اور اقتدار کے رشتے تک میں ایک ایسا تعلق ہوتا ہے جو ایک بہت ملائم اور خوبصورت چیز ہو سکتا تھا اور وہی تعلق آج انگ انگ کو زخمی کرتا کسی سے چھپانا نہیں جا رہا۔۔۔۔

اگرچہ شادیاں آج بھی جشن کے انداز میں کی جاتی ہیں، انتخابات آج بھی دلولہ انگیز نعروں کے ساتھ لڑے جاتے ہیں اور وفاداری کی قسمیں آج بھی اسی سجادنی رسوں کے ساتھ کھائی جاتی ہیں لیکن گھروں کی بیچ بھی اسی طرح چپ اور اداس ہے جیسے حکومتی کرسیاں۔ سچوں اور کرسیوں نے جیسے اپنی اپنی قسمت کے آگے ہار مان کر سر جھکا دیا ہے۔

پتہ نہیں کس نے کس پر وار کیا ہے۔ کوئی چیز ہر جگہ مری ہوئی ہے اور ہوا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں میں ایک عجیب سی باس بھر گئی ہے اور کوئی چیز بہت زور سے فیس رہی ہے۔۔۔ یہ نصب العین کی ہنسی ہے۔ لیکن کیسی! لگتا ہے اس کی جون بدل گئی ہے اور اس گناہ گار ”نصب العین“ کی ہنسی بہت بھیا تک ہو گئی ہے۔ کوئی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اپنی کمائی لٹاتا ہے۔ علم کی خاطر نہیں بلکہ اس وسیلے کی خاطر جہاں لگائے ہوئے

سرمائے کو ضرر ہیں دے کر لوٹا جاسکے۔ کوئی دوستیاں گھنٹتا ہے کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے لیے نہیں یا تبادلہ خیالات کی خاطر نہیں بلکہ دوسروں کے وسائل پر پاؤں رکھ کر آگے قدم بڑھانے کے لیے۔ شادی کی بیج بھی تن اور من کی سانجھ کے لیے نہیں ہوتی۔۔۔ خواہ یہ عمل کسی بھی ”نصب العین“ کے لیے ہو اور یا پھر صرف اس لیے کہ عورت کا قانونی۔ بیسوا بننا معاشرے کی ساخت میں شامل ہے۔

زندگی کے بہت سے میدان ہیں جہاں روزمرہ کا انسانی واسطہ زندگی کی ضرورتوں کا حصہ ہے۔ لیکن ہر واسطہ شک سے گھرا ہوا ہے اور ہر چیز بکاؤ ہے۔۔۔ انصاف سے لے کر انسان تک!

تالیوں کی گونج ابھی کانوں میں تازہ ہوتی ہے کہ ”نصب العین“ کا روپ بدل جاتا ہے۔ کل کی ہار آج کی جیت بنتی ہے تو ”بغاوت“ جیسا لفظ اسی لمحے ”بدلہ“ قرار پاتا ہے۔

ایک رومانین نظم میرے سامنے ہے جس میں مستقبل کے ہارے میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب ہر چیز کاغذ کی بن جائے گی۔ انسانی چیخیں کاغذ کے سانپوں کی طرح رینگیں گی اور دھرتی کھاب کھا کر ان لوگوں سے ہاتھ پونچھے گی جو پیپر نیپکن بن چکے ہوں گے۔ وہ دن آ گیا ہے۔۔۔

اس وقت میں انتھونی کوئین کی خود نوشت سوانح حیات پڑھ رہی ہوں اور اس ساری صورت حال میں اس کی چیخ سن رہی ہوں۔۔۔ ”ہم سب غدار ہیں کیونکہ ہم پیار کرنا بھول گئے ہیں۔“

اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ یہ انسانی قدروں کی حتمی موت نہیں لیکن صورت حال کی گراؤت یہ ہے کہ قدریں خوف زدہ ہو کر کہیں چھپ گئی ہیں اور اس موت جیسی کسی نہ کسی انتھونی کوئین کی چیخ سنائی دے رہی ہے۔۔۔



امرتا پر یتیم

گورکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم

## مصور امروز کا فن اور شخصیت

(امروز سے امرتا پر یتیم کا انٹرویو)

امرتا:- امروز اہلوان کدالوں والے گھرانے میں جنم لے کر آپ نے کھیتوں کے اوزار تھامنے کی بجائے ہاتھوں میں رنگ اور برش کیسے لے لیے؟

امروز:- یہ بھی مل ہی چلا رہا ہوں۔۔۔ خیالوں کی زمین پر۔ بچپن میں گھر میں ہر وقت ڈرائنگ کرتا رہتا تھا حالانکہ سکول میں ڈرائنگ نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں جن چیزوں کی ڈرائنگ کی وہ سب کھیتوں اور ہل کدالوں سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔

امرتا:- آپ عورت کی ڈرائنگ کے ماہر ہیں کیا عورت کا بنیادی تصور کھیتوں میں روٹی لے کر جانے والی عورت کا تھا؟

امروز:- نہیں جب ہلوان کدالوں کی ڈرائنگ کرتا تھا تب عورت کی ڈرائنگ نہیں کرتا تھا۔ ہل کدال بھی میرا پسنا نہیں تھا۔۔۔ وہ صرف 'آ بجیکٹ' تھے۔

امرتا:- سارے فنکار حقیقت کی وضاحت الگ الگ ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ حقیقت کو نئے زاویے سے دیکھنے کا نام بھی حقیقت ہوتا ہے حقیقت میں سے پھر حقیقت کی تعمیر بھی حقیقت ہوتی ہے۔ کچھ کے لیے 'ایسٹرکشن' بھی ان کی حقیقت ہوتی ہے۔ اور کچھ کے لیے کسی سپنوں کا رنگوں اور لکیروں میں ظاہر ہونا بھی حقیقت ہوتی ہے۔ امروز آپ حقیقت کی کیا شرح کرتے ہیں؟

امروز:- میرے مطابق ہر حقیقت ایک نئی حقیقت کو جنم دیتی ہے۔ وہ شاید عام آنکھ کی پکڑ میں نہیں آتی



مگر اسے فنکار کی نظر ضرور پہچان لیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی 'فلاسفہ' کو آج میں سے کل بھی نظر آ جاتا ہے۔ یہاں میں پابلو پیکاسو کے 'ہلز ہیڈ' کی مثال دے سکتا ہوں۔۔۔ ایک 'ٹرائی سائیکل' کا ہینڈل ہے اور ایک اس کی گدی۔ اس نے گدی کو ہینڈل کے درمیان میں لٹکا کر بیل کے سر کی شکل بنا دی۔ 'ٹرائی سائیکل' کی حقیقت میں سے اس نے بیل کے سر کی حقیقت نکال لی۔ یہ تصور کا سفر ہے۔

امرتا:- تو باہری چیزوں سے جب اندر کی نظر ملتی ہے تب کئی نئی شکلیں جنم لیتی ہیں نئی حقیقتیں۔ مگر یہ بتائیں کہ آپ اپنے فن کے ناظرین کو کیا احساس دینا چاہتے ہیں۔ خوبصورت کھڑے ہوئے لمحوں کے چین کا یا حرکت کی بے چینی کا؟

امرتا:- حرکت کی اور سوچ کی بے چینی کا۔

امرتا:- کیوں کورنگوں اور ہاتھوں کے سامنے رکھنے سے پہلے آپ۔۔۔ پنسل 'سکچ' بناتے ہیں یا صرف 'ڈرائنگ'؟

امروز:- دونوں۔

امرتا:- امریکن مصور آئیوان البرائیٹ اپنی ایک پینٹنگ پر بیس سال کام کرتے رہے تھے اور ان کے لفظوں میں وہ ساری دنیا کی سیاحت تھی۔ کیا آپ کو بھی کسی ایک پینٹنگ نے ایسے کئی برس باندھے رکھا ہے؟

امروز:- عورت کی ڈرائنگ کرتے ہوئے مجھے تیس برس ہو گئے ہیں۔ مہارت کے ساتھ میں بڑی جلدی عورت کے نقش و نگار تو خوبصورت بنالیتا تھا۔ مگر اس کا غور و فکر اس کے ماتھے میں بھرنے میں بہت برس لگ گئے۔ سینکڑوں تصویریں بنا کر بھی میں عورت کی تصویر کو ایک تصویر کہہ سکتا ہوں جس پر میں نے تیس برس لگا دیئے ہیں۔ وہ تصویر اب اس برس بنی ہے۔۔۔

امرتا:- کون سی؟

امروز:- میرے کمرے میں ایک پینٹنگ ہے وہی۔

امرتا:- جس میں عورت ایک ساز کی شکل میں ہے اور اس کا بدن ایسے ہے جیسے ساز کے تار سر کیئے ہوئے ہوں۔۔۔

امروز:- ہاں وہ پینٹنگ صرف ایک ہی لائن کی پینٹنگ ہے۔ عورت خیال کی شکل میں بھی ساز کی شکل میں بھی۔

امرتا:- تو پچھلے تیس سالوں سے عورت آپ کے فن کی تقسیم ہے۔ آپ نے کبھی ان تیس سالوں میں اس تقسیم کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہا؟

امروز:- میں اس تقسیم کی گرفت میں نہیں ہوں اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں چل رہے ہیں۔ ہمسفروں کی طرح۔

امرتا:- کئی آرٹسٹوں کے خیال میں کسی کا 'پورٹریٹ' بنانا شادی کرنے جیسا ہوتا ہے۔ ماڈل سے عجیب سا اپناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور 'پورٹریٹ' کبھی اچھی بنتی ہے کبھی خراب بھی جیسے شادی کا میاں بھی ہو سکتی ہے ناکام بھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:- میں نے زندگی میں صرف ایک ہی 'پورٹریٹ' بنائی ہے ایک سی شخص کی اور میرے تجربے میں یہ شادی نہیں عشق ہے۔ اب میں اس کو بغیر دیکھے بھی اس کا 'پورٹریٹ' بنا سکتا ہوں۔

امرتا:- مگر عشق بھی تو دیوی بیاہ ہوتا ہے کیوں؟ نہیں؟  
امروز:- اگر بیاہ کے ساتھ دیوی لفظ آ سکتا ہے تو بڑی خوشی سے عشق کو بیاہ کہہ لو۔ پھر یہ بیاہ بھی رہے قسمت!

امرتا:- کئی مصوروں کے لیے کوئی خاص رنگ بڑا لاڈلا ہوتا ہے کوئی ایسا ہی رنگ آپ کو بھی خاص طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ جیسے کالڈر کہتا ہے کہ لال رنگ اسے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کا دل کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو لال رنگ میں رنگ دے۔۔۔

امروز:- دھوپ کا رنگ مجھ پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ میرا جی کرتا ہے۔ ہر چیز دھوپ رنگی کر دوں۔۔۔  
امرتا:- آپ نے آج تک اپنی تصویروں کی نمائش بھی نہیں کی کیوں؟

امروز:- دو چیزوں کے لیے نمائش کی جاتی ہے۔۔ ایک دوسروں کی رائے لینے کے لیے اور دوسری تصویروں کو بیچنے کے لیے۔ کسی کی رائے کی مجھے ضرورت نہیں مجھے اپنی رائے پر یقین ہے۔ اور تصویریں میں بیچنے کے لیے بنانا نہیں۔ پھر میں نمائش کیوں کروں؟ ویسے مجھے نمائش لفظ پر بھی اعتراض ہے۔  
امرتا:- کیوں؟

امروز:- کیونکہ اس لفظ کی روح میں ہماری اپنی روح کی تہذیب نہیں ہے۔ کوئی انسان خوبصورتی کا مجسمہ ہو خدا کی نعمت ہے مگر اسے 'شوکیس' میں کھڑا کر دیا جائے یہ میری آنکھوں کو قبول نہیں ہوتا۔

مگر اسے فنکار کی نظر ضرور پہچان لیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی 'فلاسفر' کو آج میں سے کل بھی نظر آ جاتا ہے۔ یہاں میں پابلو پکاسو کے 'بلز ہیڈ' کی مثال دے سکتا ہوں۔ ایک 'ٹرائی سائیکل' کا ہینڈل ہے اور ایک اس کی گدی۔ اس نے گدی کو ہینڈل کے درمیان میں لٹکا کر ٹیل کے سر کی شکل بنا دی۔ 'ٹرائی سائیکل' کی حقیقت میں سے اس نے ٹیل کے سر کی حقیقت نکال لی۔ یہ تصور کا سفر ہے۔

امرتا:- تو 'بابری چیزوں' سے جب اندر کی نظر ملتی ہے تب کئی نئی شکلیں جنم لیتی ہیں، نئی حقیقتیں۔ مگر یہ بتائیں کہ آپ اپنے فن کے ناظرین کو کیا احساس دینا چاہتے ہیں۔ خوبصورت کھڑے ہوئے لمحوں کے چمن کا یا حرکت کی بے چینی کا؟

امرتا:- حرکت کی اور سوچ کی بے چینی کا۔

امرتا:- کیسوں کو رنگوں اور ہاتھوں کے سامنے رکھنے سے پہلے آپ۔۔۔ پنسل 'سکچ' بناتے ہیں یا صرف ذہنی 'سکچ'؟

امروز:- دونوں۔

امرتا:- امریکن مصور آئیوان البرائیٹ اپنی ایک پینٹنگ پر بیس سال کام کرتے رہے تھے اور ان کے لفظوں میں وہ ساری دنیا کی سیاحت تھی۔ کیا آپ کو بھی کسی ایک پینٹنگ نے ایسے کئی برس باندھے رکھا ہے؟

امروز:- عورت کی ڈرائنگ کرتے ہوئے مجھے تیس برس ہو گئے ہیں۔ مہارت کے ساتھ میں بڑی جلدی عورت کے نقش و نگار تو خوبصورت بنا لیتا تھا۔ مگر اس کا غور و فکر اس کے ماتھے میں بھرنے میں بہت برس لگ گئے۔ سینکڑوں تصویریں بنا کر بھی میں عورت کی تصویر کو ایک تصویر کہہ سکتا ہوں جس پر میں نے تیس برس لگا دیئے ہیں۔ وہ تصویر اب اس برس بنی ہے۔۔۔

امرتا:- کون سی؟

امروز:- میرے کمرے میں ایک پینٹنگ ہے وہی۔

امرتا:- جس میں عورت ایک ساز کی شکل میں ہے اور اس کا بدن ایسے ہے جیسے ساز کے تار سر کیئے ہوئے ہوں۔۔۔

امروز:- ہاں وہ پینٹنگ صرف ایک ہی لائن کی پینٹنگ ہے۔ عورت خیال کی شکل میں بھی ساز کی شکل میں بھی۔

امرتا:- تو پچھلے تیس سالوں سے عورت آپ کے فن کی 'تھیم' ہے۔ آپ نے کبھی ان تیس سالوں میں اس 'تھیم' کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہا؟

امروز:- میں اس 'تھیم' کی گرفت میں نہیں ہوں اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں چل رہے ہیں۔ مسفروں کی طرح۔

امرتا:- کئی آرٹسٹوں کے خیال میں کسی کا 'پورٹریٹ' بنانا شادی کرنے جیسا ہوتا ہے۔ ماڈل سے عجیب سا اپناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور 'پورٹریٹ' کبھی اچھی بنتی ہے کبھی خراب بھی جیسے شادی کا میاں بھی ہو سکتی ہے ناکام بھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:- میں نے زندگی میں صرف ایک ہی 'پورٹریٹ' بنائی ہے ایک ہی شخص کی اور میرے تجربے میں یہ شادی نہیں 'عشق' ہے۔ اب میں اس کو بغیر دیکھے بھی اس کا 'پورٹریٹ' بنا سکتا ہوں۔

امرتا:- مگر عشق بھی تو دیوی بیاہ ہوتا ہے کیوں؟ نہیں؟  
امروز:- اگر بیاہ کے ساتھ دیوی لفظ آ سکتا ہے تو بڑی خوشی سے عشق کو بیاہ کہہ لو۔ پھر یہ بیاہ بھی زہے قسمت!

امرتا:- کئی مصوروں کے لیے کوئی خاص رنگ بڑا لاڈلا ہوتا ہے کوئی ایسا ہی رنگ آپ کو بھی خاص طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ جیسے کالڈر کہتا ہے کہ لال رنگ اسے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کا دل کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو لال رنگ میں رنگ دے۔۔۔

امروز:- دھوپ کا رنگ مجھ پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ میرا جی کرتا ہے۔ ہر چیز دھوپ رنگی کر دوں۔۔۔  
امرتا:- آپ نے آج تک اپنی تصویروں کی نمائش بھی نہیں کی کیوں؟  
امروز:- دو چیزوں کے لیے نمائش کی جاتی ہے۔۔۔ ایک 'دوسروں کی رائے' لینے کے لیے اور دوسری 'تصویروں کو بیچنے کے لیے'۔ کسی کی رائے کی مجھے ضرورت نہیں مجھے اپنی رائے پر یقین ہے۔ اور تصویروں میں بیچنے کے لیے جاتا نہیں۔ پھر میں نمائش کیوں کروں؟ ویسے مجھے نمائش لفظ پر بھی اعتراض ہے۔  
امرتا:- کیوں؟

امروز:- کیونکہ اس لفظ کی روح میں ہماری اپنی روح کی تہذیب نہیں ہے۔ کوئی انسان خوبصورتی کا مجسمہ ہو خدا کی نعمت ہے مگر اسے 'شوکیس' میں کھڑا کر دیا جائے یہ میری آنکھوں کو قبول نہیں ہوتا۔

امرتا:- پھر فن ناظرین تک کیسے پہنچے؟

امروز:- یہ خوبصورتی کا عمل نہیں ہے کہ وہ ناظرین کو ڈھونڈتی پھرے یہ ناظرین کا عمل ہے کہ وہ خوبصورتی کو ڈھونڈیں۔

امرتا:- جیسے شگیت کا اپنے سازوں کو پوچھا کہ حد تک عزت دیتے ہیں ساز کھولنے سے پہلے اسے سلام تک کرتے ہیں یا مصنف لکھے ہوئے کاغذوں پر پاؤں نہیں آنے دیتے اسی طرح آپ کی مصوری کے کاروبار میں بھی آپ کے رنگوں اور برشوں کے لیے خاص عزت کی کوئی رسم ہے؟

امروز:- ماحول کا ادب اور کام کرنے کی جگہ کی پاکیزگی میرے لیے ضروری ہے اور آرٹسٹوں کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ ہاں! کاریگروں میں یہ ادب نسل در نسل پلتا آ رہا دکھائی دیتا ہے۔ 1950 کی ایک بات بتاتا ہوں۔۔۔

میں ایک آرٹسٹ کے یہاں کام کرتا تھا، بمبئی میں کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہاں عورتیں لے آتا ہے۔ ایک دن میں نے اسے ایک عورت کو لاتے دیکھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ شام کو جاتے وقت میں نے اسے کہا کہ وہ کام کے وقت عورتیں نہ لائے۔ کام کے گھنٹے کام کو وقف ہونے چاہیں ایک دل سے۔ مگر دل سے۔ مگر میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی نہ میرا ادب اور نہ کام کی جگہ کے متعلق میرا نظریہ۔ وہ عورتیں پھر بھی آتی رہیں۔ آخر ہار کر میں نے اس آرٹسٹ کو ایک دن سوچنے کی مہلت دی کہ اگر وہ کام کے وقت میں آئیں تو میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا۔ مگر اس دن بھی وہ عورتوں کو وہاں لے آیا تھا اور میں پھر اگلے دن سے کام پر نہیں آیا۔

امرتا:- ذہنی تصور کو باہر اتارنے کے لیے آپ رنگ، کیٹوس، لکڑی، کئی طرح کی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں کبھی اس سے الٹ تجربہ بھی ہوا ہے کہ کسی طرح کے میٹرل نے آپ سے اپنی ضرورت کے مطابق کسی شکل و ساخت کی مانگ کی ہو؟

امروز:- بالکل ہوا ہے۔ میں جب بھی 'ٹائٹم چیم' کو دیکھتا تھا ہمیشہ اس میں کچھ۔۔۔ خالی پن دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن نہ جانے کس طرح میں نے 'ٹائٹم چیم' کو دیکھا اور اس نے مجھے اور میں نے اس میں دو وقت اکٹھے کر دیئے۔ ایک جس کا اشارہ دینے کے لیے دوسوئیاں تھیں اور دوسرا ایک نظم جس کے لفظ اس کے خیال کی رفتار بتاتے تھے۔۔۔ اور اس طرح میں نے اس کا خالی پن نظم کے خیال سے بھر دیا۔

امرتا:- یہ تجر بہ صرف ایک دفعہ ہوا؟

امروز:- اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ہوا تھا۔ میں ایک نئی 'کیٹس' گھرا رہا تھا راستے میں اس سے کوئی چیز گرا گئی اور وہ ایک جگہ سے تھوڑی سی پھٹ گئی۔ میں نے کئی دن تک وہ 'کیٹس' ایک طرف ڈال رکھی۔ پھر محسوس ہونے لگا کہ اس 'کیٹس' کی پھٹی ہوئی جگہ میری طرف دیکھتی ہے۔۔۔ مجھ سے کوئی نیا وجود مانگتی ہے۔ میں نے اس پھٹی ہوئی جگہ پر پتہ جھڑکا ایک زرد پتہ بنادیا جو ہوا میں اکیلا اڑتا ہوا سا بچ سے پھٹ گیا ہو۔۔۔ باقی ساری 'کیٹس' پر خالی پن اور ویرانی پیٹ کر دی۔۔۔

امرتا:- پنجاب نے مصوری کا 'میوزیم' بنایا ہے پنجاب کے فنکاروں کے شاہکار حفاظت سے رکھنے کے لیے۔ اس میں آپ کی کوئی چیز بھی نہیں ہے کیوں؟

امروز:- انجمن کوئی بھی ہو اس کا عمل فن کو پیار کرنا نہیں ہوتا 'پئیرتائز' کرنا ہوتا ہے۔ وہ فنکاروں کو اپنا فخر نہیں سمجھتیں انہیں فخر عطا کرنا چاہتی ہیں۔۔۔ بخشش کی طرح۔ اس لیے وہ کبھی فنکار کے پاس چل کر نہیں آتیں ہمیشہ چاہتی ہیں کہ فنکار ان کے پاس چل کر آئے۔ افسر شاہی خوشامد پسند ہوتی ہیں آرٹ پسند نہیں۔ امرتا:- مگر بہت سے فنکار انجمنوں سے لیے ہوئے تحفے اور ایوارڈ بڑے فخر سے دکھاتے ہیں۔

امروز:- ہاں فخر والا حصہ تو دکھاتے ہیں مگر بے عزتی والا نہیں۔ تحفے دکھاتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ یہ کیسے لیے؟ ویسے بھی افسر شاہی سے بے عزتی کروا کر لی ہوئی عزت عزت کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ خاص کر اپنی نظر میں؟

امرتا:- فن کے تنقید نگاروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:- بہت سے تو گلوں میں لگے ہوئے بڑے بیڑ ہوتے ہیں۔۔۔ ڈیڑھ فٹ قد اور چیزوں کے دشمن۔

امرتا:- 'آرٹ کریک' تو بڑے ہائی براؤ ہوتے ہیں۔۔۔

امروز:- ہاں اکثر ہوتے ہیں مگر ماتھے کے بغیر ہائی براؤ۔۔۔

امرتا:- آرٹسٹوں کی زندگی میں وقتی لگاؤ بہت آتے ہیں۔۔۔ افسر زیہ کیوں ہوتا ہے؟ آپ کی نظر میں محبت کے لفظ کا کیا تجزیہ ہے؟

امروز:- محبت کا مطلب جب تک صرف 'جیتنا' ہوگا تب تک یہی ہوتا رہے گا۔ وقتی لگاؤ۔۔۔ بار بار

جیتنے کا عمل ہوتا ہے کیونکہ ایک بار جیتنے کے بعد جیتنے کے معنی ختم ہو جاتے ہیں، جیتی ہوئی چیز ملکیت ہو جاتی ہے کسی کو نے میں بیکار پڑی ہوئی۔ میرے خیال میں محبت کسی کو جیتنا نہیں کسی کو پانا ہے۔ جیسے کوئی اپنے آپ کو پاتا ہے اپنی نت نئی خواہشات کو جان کر اسی طرح دوسرے کو پانا ہوتا ہے اس کے اندر کی پابلیمنیز کو کھوج کر پہچان کر آرٹس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ خود محبوب ہونا چاہتا ہے مگر عورت کو یا بیوی بنا لیتا ہے یا رکھیل اسے محبوبہ نہیں بناتا۔ یہ نظر کا مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں محبوب صرف نظر نہیں ہوتا نقطہ نظر ہوتا ہے۔۔۔ محبت ایک دوسرے کی زمین میں اگنا ہوتا ہے اگنا اور کھلنا۔۔۔

امرتا:- امروز شخصیت کے ارتقاء کو آپ نے دھرتی کے پیداواری عمل سے جوڑا ہے۔۔۔ یہ شاید کسان کی نظر یہ ہے۔ اس نظریے کو دیکھ کر سوچتی ہوں۔۔۔ اگر سارے فنکار کسان خاندان سے آتے تو شاید فن کے ساتھ فن کی شخصیت بھی۔۔۔ کھل جاتی۔۔۔ مگر یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے کہ دوسرے کی زمین میں اگر خود کے اگنے کی توقع نہ رہے تب؟

امروز:- میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہر زمین میں ہر جگہ اگ سکتا ہے اور پھل سکتا ہے۔ ہر جگہ کے لیے مناسب زمین ہوتی ہے کوئی سی زمین نہیں۔ محبت اسی مناسب زمین کی تلاش اور پہچان کا نام ہے۔۔۔

امرتا:- میرا مطلب تھا کہ جسے آپ نے جگہ کے لیے زرخیز زمین سمجھا ہوا اگر وہ زرخیز نہ نکلے تب؟

امروز:- تب وہ زمین بدل لے۔ جسے خود کے ارتقاء کا عشق ہے اسے زرخیز دھرتی کھوجنی پڑے گی۔ گھاس پھوس تو کہیں بھی اگ آتا ہے۔ ایک سوال تو یہ ہے۔۔۔ زرخیز دھرتی کھوجنے کا۔ یہی اصل میں محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ اور دوسرا سوال ہے۔۔۔ جگہ کو ثابت رکھنے کا۔ شاید اس بات پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا کہ کچھ بھی اگنے کے لیے سالم جگہ جتنا ہوتا ہے۔ جگہ کے ٹکڑے کر دو تو کوئی ٹکڑا نہیں اگتا۔ فنکار جب چھوٹے چھوٹے ٹکڑے زمین میں بت جاتا ہے اس کا خود کبھی نہیں اگ پاتا۔

امرتا:- مینٹل اسٹریکشن کے بارے میں دنیا میں کئی کانفرنسز ہو چکی ہیں مگر اسے لے کر شاید کبھی بھی اتنے سادے لفظوں میں ڈیفائن نہیں کیا گیا۔۔۔ مگر ایک سوال اور طبیعت میں کبھی کوئی بے بسی جیسی چیز محسوس کی ہے آپ نے؟

امروز:- کام میری بے بسی ہے۔

امرتا:- کام وجود کی بے بسی ہوتا ہے۔ وہ ہر چے فنکار کی بے بسی ہے مگر میرا مطلب تھا کہ عام چیزوں



میں سے کوئی چیز بے بسی کا درجہ لے سکتی ہے؟

امروز:- انگور۔۔۔ مجھے موسم کے بڑھیا انگور کہیں دکھائی دے جائیں۔۔۔

امرتا:- پھر میرا خیال ہے آدم کے نام کے ساتھ سیب کھانے کا جو واقعہ دہرایا جاتا ہے سیب کی جگہ انگوروں کو بھی دی جاسکتی ہے۔

امروز:- میرے متعلق ضروری جاسکتی ہے۔

امرتا:- فن جدید کے بارے میں اور کچھ کہنا چاہیں گے؟

امروز:- یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ فن میں آنے سے پہلے زندگی میں آنی چاہیے زندگی کے غور و فکر میں۔

تب ہی وہ فن میں فطری ہو سکتی ہے۔ آج کے فن میں جو جدت دکھائی دیتی ہے وہ قدرتی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ بالکل ایسے ہے۔ جیسے 'کینوس' کی جگہ بان کی چار پائی کو دیوار پر لٹکا کر اس کا بان درمیان میں۔ سے توڑ دیا گیا ہو اور نیچے اس 'پینٹنگ' کا نام لکھ دیا گیا ہو یا ڈی اینڈ سول'۔

☆☆☆☆



امرتا پر تہم  
بندی سے تہم شہنم شکیل

## سیاہ حاشیہ

میرے ایسا مجموعہ جس سے بیمار تھا اور اسے اس حالت میں چھوڑ کر ملازمت پر جانا بہت حوصلے کی بات تھی۔ کام پر جانے کی مجبوری یہ تھی کہ میں آل انڈیا ریڈیو پر روزانہ "اجرت" کی بنیاد پر ملازم تھی۔ اگر ایک دن نہ جاتی تو اس دن کا معاوضہ کاٹ لیا جاتا تھا۔ جس روز کی میں بات کر رہی ہوں اس روز مجھے بچے کے لیے کچھ دوائیں خریدنی تھیں اور دوائیں مہنگی بھی بہت تھیں۔ ادھر بچہ مضر تھا کہ گھر پر ہوں۔ اسے ذرا تسلی دینے کے لیے میں دینے سے پھر واپس آگئی تو ڈاکے نے مجھے دو (2) خط لاکر دیے۔ بچے نے جب مجھے دوبارہ بیٹھ کر خط پڑھنے میں مصروف دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔

ایک خط تو میرے کسی خیر خواہ کا تھا جس نے لکھا تھا کہ امرتا مجھے بہت افسوس سے کہتا پڑتا ہے کہ تمہاری کتاب یونیورسٹی کے اصاب میں شامل نہیں کی گئی۔ تم جانتی ہو کہ یہاں میرٹ کی بنیاد پر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے۔ غارش چلتی ہے۔ میں تو تمہاری اصول پرستی کو ابھی تک نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسے مسئلوں میں خود ارباب اختیار سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ خط پڑھ کر جو شدید مایوسی مجھے ہوئی اسے برداشت کرنا ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ یہ حال میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لفافہ اپنے بچے کو دیا اور اسے مصروف رکھنے کے لیے کہا کہ وہ ان پر سے ٹکٹ اتارے۔

۱۰۔ الخط - حادث حسن منٹو کی طرف سے تھا۔ جنہوں نے لکھا تھا امرتا میں زندگی میں دو مرتبہ رویا ہوں۔ ایک، اند جب میرے بیٹے کا انتقال ہوا اور دوسری دفعہ۔۔۔ تمہاری نظم پڑھ کر کہ وہ نظم کہ جس میں تم نے کہا ہے کہ "بچے چاند کو چند اماںوں کہتے ہیں اس لیے کہ وہ چمکتا ہے۔ مگر اب چاند کی روشنی ایسی جلیبیوں پر ماند پڑتی جا رہی ہے کہ جہاں لوگ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔" منٹو کے خط کو پڑھ کر میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا

بچہ کا محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میری کتاب کی ہزاروں کاپیاں بک چکی ہیں جیسے مجھے ملازمت پر مستقل  
 کر دیا گیا ہے۔ جیسے میرے بچے کا بخار یکدم اتر گیا ہے۔ یہ 1955 کی بات ہے۔ دوسرے دن میں نے منٹو  
 کو خط لکھا۔ مگر اس کا جواب موصول ہونے سے پہلے میں نے سن لیا کہ منٹو کا انتقال ہو گیا ہے۔ کرشن چندر نے  
 بہت دل گرفتہ ہو کر مجھے لکھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے منٹو کے سینکڑوں ڈرامے اپنے ہاں سے نشر کیے تھے مگر ان  
 لوگوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس کی موت پر کوئی تعزیتی پروگرام نشر کرے۔ اردو بازار کہ جہاں منٹو کی کتابیں  
 ہزاروں کی تعداد میں بک چکی ہیں اور بیک رہی ہیں اسی طرح کھلا ہوا ہے۔ کرشن چندر کی آنکھیں یقیناً اس  
 وقت خون کے آنسو رو رہی ہوں گی جب اس نے مجھے لکھا کہ 'منٹو کوئی وزیر تو تھا نہیں کہ اس کی موت پر ایک دنیا  
 کے لیے قومی پرچم سرنگوں کیا جاتا۔ نہ ہی وہ کسی مافیا تنظیم کا رکن تھا کہ اس کے لیے بازار بند ہو جاتے وہ تو محض  
 غریب اور مظلوم طبقے کی نمائندگی کرنے والا ایک ادیب تھا' اس کی تحریریں طوائفوں، مانگے والوں، ڈاکیوں اور  
 موچیوں کی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ بھلا ایسے آدمی کے لیے کون روتا ہے۔ میں نے سوچا کہ واقعی ذرا  
 سیاست دانوں کو دیکھیں کہ جو قومی مفاد کی آڑ میں لوگوں کی جیبیں بھی کاٹ لیتے ہیں اور پھر بھی قابل احترام  
 رہتے ہیں۔ شاید قابل احترام کہلانے کی کسوٹی یہی ہو اور ادھر منٹو کا وہ 'گرہ کٹ' بھی ہے کہ جو اپنی ذلت و  
 سہائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھ کاٹ لیتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک گھٹیا گرہ کٹ ہی کہلاتا  
 ہے۔ شاید اس طرح سے وہ اس دنیا میں اپنی ساکھ برباد نہیں ہونے دیتا۔ منٹو نے عورت کے ان ہاتھوں کا  
 مشاہدہ کیا تھا کہ جو ساری رات پھولوں سے کانٹے چختے رہے اور پھر جن ہاتھوں نے پھولوں کو اپنے بستر پر بچھا  
 دیا تھا۔ مگر کانٹوں کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ منٹو کی کہانیوں سے پھولوں کی مہک نہیں آتی  
 بلکہ اچلتے ہوئے لہو کی خوشبو آتی ہے۔ منٹو نے ایسے انسانوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا کہ جن کی رُوح عرصہ ہوا مر چکی  
 تھی جو چلتی پھرتی لاش تھے اور وہ جس جگہ بھی جاتے ان کے آس پاس موت کو سونگھا جاسکتا تھا۔ جب منٹو نے  
 مشاہدات کو اپنے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' میں جگہ دی تو اس پر فحاشی کا الزام لگ گیا۔ منٹو نے ایسے بد قسمت  
 لوگوں کے بارے میں کہانیاں لکھیں کہ جن کی زندگی ایک مرگ مسلسل تھی۔ منٹو نے اس چاقو کی کہانی لکھی تھی  
 جو ایک ہلکی سی کرچ کی آواز سے کسی کی گردن میں پیوست ہو جاتا تھا۔ یہ ایسا چاقو تھا جو ایک لمحہ کسی کے ہاتھ میں  
 ہوتا اور دوسرے لمحہ کسی کی کمر میں۔ اس نے اس قہقہے کی کہانی بھی لکھی کہ جس نے ملک کے بزارے میں  
 انتہائی بے رحمی سے کام لیا تھا۔ یہ سارا کچھ لکھنے کی وجہ سے اس پر اتنی غلاطت اچھالی گئی کہ خدا کی پناہ۔ کرشن

چندر نے بڑے کرب کے عالم میں لکھا کہ آج ااکھوں کے اس شہر میں کسی ایک کے پاس بھی اتنا وقت نہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر منٹو کے بارے میں سوچے۔ میں اس درزی۔۔۔ عبدالغنی کی تلاش میں نکلا تھا جس نے منٹو سے سوٹ کی سلائی لینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ منٹو نے ”ہتک“ جیسا افسانہ تخلیق کیا تھا۔ وہ درزی تو نہیں ملا مگر ایک ٹانگے والے نے مجھے ٹانگے میں بٹھانے سے انکار کرتے ہوئے کہا ”آج ٹانگہ نہیں چلے گا۔ منٹو صاحب مر گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ واقعی آج ٹانگے والوں سے ٹانگہ چلانا مشکل ہوگا۔ مگر ایسے لوگ کہ جو ایک عورت کو رو دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہت خوش ہوں گے۔ کیونکہ ایسے ظالموں کے منہ پر طمانچہ مارنے والا اب کوئی نہیں رہا۔ اب کوئی ”کھول دو“ اور ”نوبے یک سنگھ“ جیسی کہانیاں لکھنے والا بھی نہیں رہا۔ منٹو نے انگل سام کو بھی بہت سے خط لکھے ہیں۔ جب وہ انگل سام کی خارجہ پالیسی پر قلم اٹھا تا تو وہ زہر میں بجھا ہوا ہوتا تھا۔ انگل سام بھی سوچتا ہوگا کہ آخر ایسے نتیجے پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔ خیر منٹو چلا گیا۔ انگل سام بھی خوش ہوگا کہ اب ایسے خطوط اسے کوئی نہیں لکھے گا۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔ نئی تبدیلیوں اور انتشار کے اس دور میں مجھے ایک اور کہانی یاد آ رہی ہے کہ جس میں ایک جوان لڑکی اپنی دادی سے ان پھولوں سے متعلق معلومات چاہتی ہے کہ جن کا رنگ ایسا پاگوتا ہے کہ اگر دھاگے کو اس میں رنگ لیا جائے تو یہ کبھی نہیں اترتا۔ دادی نے اسے وہ پھول منگوادیئے۔ لڑکی نے ان پھولوں کے رنگ میں اپنے دھاگوں کو رنگ کر اس میں لینن کی تصویر بنائی۔ یہ تصویر مکمل ہونے کے قریب تھی کہ اسے پتہ چلا کہ لینن کا انتقال ہو گیا ہے۔ لڑکی نے ایک عام کالے رنگ کا دھاگہ لے کر تصویر کے ارد گرد سیاہ حاشیہ بنا دیا۔ دن ”نرستے رہے۔۔۔۔۔“ ہوائیں چلیں طوفان آئے اور سیاہ حاشیہ کا رنگ اڑ گیا۔ مگر لینن کی تصویر اسی طرح سے چمکتی دکھائی رہی۔ اس کے پائیدار رنگ قائم و دائم رہے۔ دراصل وہ سیاہ حاشیہ افسوس کی علامت تھا۔ چنانچہ منٹو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی طرح منٹو کی شہرت پر بھی جو سیاہ دھبہ لگایا گیا ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔ البتہ اس کی کہانیاں ادب کے افق پر تاباں زندہ و تابندہ رہیں گی۔ کچھ عرصہ ہوا جب منٹو کی کہانیوں کا پنجابی میں ترجمہ ہوا۔ تو مجھے ان پر ایک تعارفی دیباچہ لکھنے کو کہا گیا اور جب بھاری دل کے ساتھ میں نے دیباچہ لکھا تو میرے ذہن میں یہ روٹی کہانی پھر سے تازہ ہو گئی۔

☆☆

امرتا پریم

اردو میں اردو زبان میں ترجمہ: ازہر منیر

## گرہن کتھا

جس روز میرا جنم ہوا اُس روز گرہن لگا ہوا تھا۔

معلوم نہیں دن تھا یا رات۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ اگر دن تھا تو وہ گھڑی سورج گرہن کی ہوگی اور رات تھی تو چاند گرہن کی۔

ہماری دیو ماا بیان کرتی ہے کہ جس ہاتھی کے ماتھے سے موتی ملتا ہے اُس کا جنم اُس گھڑی ہوتا ہے جب سورج یا چاند کو گرہن لگا ہو۔

گھر قبیلہ سماج مذہب اور سیاست بھی ہمارے چاند سورج ہی ہوتے ہیں تو اس سے جب گرہن لگے کوئی شاعر عاشق یا درویش جنم لیتا ہے تو سچ یہ ہے کہ درد کا موتی اُس کے ماتھے میں پڑ جاتا ہے۔ سوچ اور آگہی کا سفر بہت طویل ہوتا ہے۔

گھر قبیلے کو جب نوئے رشتوں کا گرہن لگتا ہے تو جس آگہی کا جنم ہوتا ہے اُس کے درد کی انتہا اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

سماج کو جب طرح طرح کی نا انصافیوں کا گرہن لگتا ہے تو سوچ کے احساس کی شدت اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

مذہب کے چاند کی جب فرقہ پرستی کا گرہن لگتا ہے تو آسمان کی روح کیسے تڑپتی ہے؟ اس سوچ کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔

اور سیاست کے سورج کو جب طاقت کی ہوس کا گرہن لگتا ہے تو بھرتی کی روح کیوں ہلکتی ہے؟ یہ سوچ اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

دنیا کی ادبی تاریخ کو درد کے موتی ملتے ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کسی کرم والے کی سوچ کو کتنے گرہن دیکھنے اور جھیلنے پڑتے ہیں۔

چاند اور سورج کا کچھ حصہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کا حادثہ نفسیاتی حوالے سے اُس وقت بھی پیش آتا ہے جب رشتوں کے ٹوٹنے سے اعتماد کی زمین پیروں کے نیچے سے اٹل جاتی ہے۔

آسمان کے چاند کو اُس سے بھی گرہن لگتا ہے جب فرقہ پرستی کے ہاتھ رُوحوں کے جلتے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں اور آسمان کے سورج کو اُس وقت بھی گرہن لگتا ہے جب طاقت کی ہوس کالی گھٹا کی مانند اٹھتی ہے اور لوگوں سے اُن کے گھروں اور صحنوں کی روشنی میں چھن جاتی ہے۔ جنہیں قلبی طاقت کا شعور ملا اور انہوں نے موتی کے رنگ کو اسلیٹ کو تاثیر کو پہچانا وہ کہتے ہیں "جو موتی چاند کے رنگ کا ہو اُس کا دیوتا اندر ہوتا ہے۔ موتی کا رنگ زرد ہو تو وزن ہوتا ہے۔ کچے ہوئے انار کے دانے کی طرح سرخ ہو تو دایو ہوتا ہے۔ دیے کی لو جیسا چمک دار ہو تو آگنی ہوتا ہے اور اگر اس کا رنگ گاڑھا سیاہی مائل ہو تو پھر موت کا دیوتا ایم ہوتا ہے۔"

درد کے کتنے ہی رنگ ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے والا خدا جانے کتنے رنگ اور کتنے دیوتا جھیلتا ہے۔ کہہ سکتی ہوں کہ میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے وہ یہ لمبی گرہن کٹھا ہے۔

نامعلوم کا بلاوا

تشکیک کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر

اندر کی گائے کا زودھ دودھا

کس نے بھر لیے برتن اپنے؟

کون سنے گا ہوا کی آہیں؟

چل رہی زندگی! چل ہمیں تقدیر کا بلاوا آیا ہے

کوئی بات کی جاسکتی ہے تو اُس سے جب تقدیر کا بلاوا آتا ہے۔ محبت تو خدا کی مانند نامعلوم کا نام ہے۔ اس کی بات جس قدر اشاروں میں اُترتی ہے وہ سلطان باہو کی ہو ہے۔ سلطان باہو کو شش کرتا ہے چمپا کی اُس یونی کی بات کہنے کی جومن کی منی میں اُگتی ہے۔ اسی قدر کہتا ہے کہ "نئی اثبات داپانی ملیا" یعنی ہاں کا پانی بھی ملتا ہے اور نہ کا بھی۔ مگر یہ اشارہ نامعلوم کی طرف نہیں تقدیر کے بلاوے کی طرف ہے جسے سن کر کوئی نامعلوم کی راہ پہ چل پڑتا ہے۔

یہ ایک بیج کے پھوٹنے کا سفر ہے جہاں ہاں کا پانی ملا تو قدم تیز تیز اٹھنے لگے نہ کا ملا تو قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ مگر جب بیج پھوٹ نکلا ایک خوشبو اپنے اندر کھلنے لگی تب وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کہہ پاتا۔ جب خوشبو سے دیوانہ ہو جاتا ہے تو اُس کے ہونٹوں سے فقط ”ہو“ نکلتا ہے جو ہر کان میں ایک ترنگ کی طرح دوڑ جاتا ہے۔ ایک اُسنگ بھر دیتا ہے۔

اس سفر کے مفہوم کو کسی حد تک میرا کی آواز میں بھی پہچانا جاسکتا ہے جب وہ کہتی ہے ”لاکھ چوراسی رو چوڑو پیارو! میں کئی بار“ اور ساتھ ہی کہتی ہے ”جہنم جہنم کیا پتی کیا“ اور تپتی دیہی کے سنگ“ اور جسے پانا تھا وہ نہیں ملا تو کہتی ہے ”میں کنواری یوں رہی۔۔۔۔۔“

وہ جو جہنم جم کا چوڑا بہن کر ہر دن میں سے گزرتے کچھ ”کنوارا“ رہ جاتا ہے وہ فراق ہے سفر کا درد ہے۔ میرا کے پاؤں جب نامعلوم میں اتر گئے تو بات رقص کے گھنگھر وڈوں میں اتر گئی۔ مگر رقص کے گھنگھر وڈوں سے کچھ پوچھایا جانا نہیں جاسکتا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ معلوم کی سرحد کہاں واقع ہے؟ اور جو کچھ اس سے آگے ہے وہ کیا ہے؟ بس اتنا جان پائی ہوں کہ جو اس سرحد سے آگے ہے وہاں سے کوئی اشارے ملتے ہیں جو میری گرفت میں نہیں آتے۔ بہت چھوٹی تھیں بچی سی جب شام کے وقت سورج میری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو رہا ہوتا تو میں رونے لگ پڑتی۔ ماں کا پلو کھینچتی تھیلکتی اور پوچھتی سورج کہاں چلا گیا۔ ماں ہنس پڑتی۔ کہتی ”تم کھانا کھا کے سو جاؤ۔ جاگو گی تو سورج آ جائے گا۔“

تو میں کہتی ”لیکن وہ کیا کیوں ہے؟“

لگتا تھا سامنے ایک اندھیرا سا بچہ گیا ہے۔ معلوم نہیں کتنا جس میں میں گم ہو جاؤں گی۔

رات یوں لگتی جیسے اندھیرے کا ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے۔ میں اس کنارے پر ہوں اور سورج دریا کے کہیں اُس پار چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں؟ اور میں یہیں کھڑی رہ جاؤں گی۔ کبھی پار نہیں جا پاؤں گی۔ اور یاد آتا ہے۔ جب بچپن رخصت ہو رہا تھا تو یوں لگا میرا ”میں“ میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ اس نادانی کی عمر میں کسی نامعلوم کا یہ تقاضا کیوں تھا؟ میں کبھی نہ جان پائی۔

اُن دنوں ایک نظم لکھی تھی کنارے سے مخاطب ہو کر

کنارے رے کنارے! ذرا اپنی بانہوں کا گھیرا کھول دو

ہم نے لہروں لہروں جانا ہے  
 ہواؤں کے پیروں میں چکر بنے کیسے کوئی ٹھکانہ تلاش کریں؟  
 راہیں کشادہ رشتے تنگ جی اداس اداس  
 کھوئے ہوئے مکھڑے مل نہ پائیں ریت سے کی چھانوں  
 یوں لگتا تھا کنارے پہ بیٹھی وقت کی ریت چھان رہی ہوں مگر جو کھو گیا ہے وہ مل نہیں پا رہا۔ وہ کیا تھا جو ہم  
 ہو گیا تھا میں اس کا کوئی نام نہ رکھ پائی۔

بڑی ہوئی، سن کی مٹی میں پریت کی پہلی پتی اُگی تو جانا میں اوہے کے ایک ٹکڑے کی مانند مٹنا طیس کی  
 طرف کھینچی چلی جا رہی ہوں۔ یہ اندر سے ٹوٹنے کا سہ تھا۔ ایک ٹکڑا "میں" مٹنا طیس کی طرف چلتا رہا اور ایک  
 ٹکڑا "میں" درودِ یوار کے سائے میں بیٹھا رہا۔ فقط میری نظمیں تھیں جو کاغذ پر اترتی رہیں اور کاغذ ہوا میں  
 بکھرتے رہے۔

نامعلوم کا سفر میلوں تک اُس ویرانی کا سفر ہوتا ہے جس میں جدائی کے جنگلی پھول تو کھلتے ہیں مگر ان  
 کے سوا اور کچھ نہیں اُگ پاتا۔

یہ طلب کیا ہے؟ یہ پیاس کیا ہے؟ اس کا اندازہ فارسی کے ایک شعر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریگستان میں  
 جو لوگ چمکتی ریت کو دیکھ کر بھی پانی کا دھوکہ نہیں کھاتے وہ دانش مند تو ضرور ہوں گے مگر ان کی پیاس میں یقیناً  
 کچھ کمی ہوتی۔

اُس وقت کچھ اور نہیں مگر اتنا ضرور جان پائی کہ میری پیاس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ برسوں کے صحرا میں  
 جب محبت کسی کے چہرے کے نقوش میں کھٹکنے لگ گئی تو یوں لگا جیسے نامعلوم کا بلاوا آیا ہے اور جب بلاوا آ گیا تو  
 یوں لگا اب نامعلوم کی طرف جانا ہی ہوگا۔

رات کی ڈالہن نے دعوت کی  
 تاروں نے چاول چھڑکے کسی نے دیکیں چڑھا دیں  
 کون ہے جو چاند کی صراحی لے آیا؟  
 روشنی گھونٹ شراب کا اور ابھر گہری آنکھیں

زندگی میں اس طرح کے بلاوے کا مل جانا ایک بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ پھر معلوم کی سرحد کب اور کیسے



تھکت گئی؟ میں نہیں جانتی۔ کچھ بھی گرفت میں نہیں آتا۔ فقط اس قدر جانا کہ پیروں میں تھلاہٹ تھی تا معلوم کی راہ پر چل نکلنے کی۔

جانے وہ کیسی رات ہوتی ہے جو کسی سینے کا ماتھا چوم لیتی ہے اور پھر خیالوں کے پیروں میں ایک جھانجھی بجنے لگ پڑتی ہے۔ اور یہی میرا کے گھٹکھرو ہیں جن سے کچھ پوچھا جانا نہیں جاسکتا۔

سر پہ جب برسوں کے بادل ٹکراتے ہیں 'بوند بوند' فونٹے ہیں اور کبھی ان کی چھاتی سے بجلی بھی کڑک جاتی ہے اس وقت من کی مٹی میں پڑے ہوئے جنم جنم کے بیج معلوم نہیں کہاں تک بہم جاتے سوکتے اور بھیگتے ہیں اور جو بیج پھوٹ نکلتے ہیں 'پیز بن جاتے ہیں اور چلتی ہوائیں ان کے شگوفے پتے اور پھل پھول جھاڑ دیتی ہیں۔ میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے ان سبھی حرفوں کو میں ان پیڑوں سے جھڑے شگوفے اور پتے مانتی ہوں۔ یہی احساس ایک نظم میں اُترا تھا

نہیں خاموشی کے اس پیڑ سے میں نے کوئی حرف نہیں توڑا

یہ تو جو پیڑ سے جھڑ گئے تھے

میں نے وہی حرف پھنپے ہیں

گورکھ دانی کی تہوں میں اُترتے رجش اُس عہد کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں جب بھگوان نے انسانی نسل بنائی تو خود بھی انہی کے بیج رہنے لگا۔ لوگوں کو کوئی معمولی سی ضرورت بھی پیش آ جاتی تو وہ جھٹ سے جا کر اُس کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ وقت بے وقت۔ اور مطالبے بھی ایسے جو ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ کوئی کہتا

”بھگوان! میں نے آج کپڑے رٹنے ہیں انہیں سکھانا ہے۔ اس لیے ذرا خیال رکھنا آج بارش نہ ہونے پائے۔“

کوئی اور کہتا

”پر میثور! آج بارش برسا دو۔ میں نے کھیتوں میں بیج بوئے ہیں کہیں خشک نہ ہو جائیں۔ انہیں

پانی ملنا ضروری ہے۔“

تو ان جیسے مطالبے سن سن کر بھگوان کا سر چکرا گیا۔ اُس نے تھک ہار کے ایک روز دیوتاؤں کو بلا بھیجا۔ ان سے

پوچھا

”بتاؤ میں کہاں چلا جاؤں؟ جی چاہتا ہے ہمالیہ کی چوٹی پہ چلا جاؤں جہاں کوئی نہ پہنچ پائے۔ میں تو



خست پچھتار ہا ہوں یہ انسان کی نسل بنا کر۔“

دیوتاؤں نے آنکھیں بند کیں مستقبل پر نظر ڈالی اور کہا

”ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے لیے بھی کوئی چنچنے والا ہے۔ کوئی ایک بار پہنچ گیا تو مشینوں اور مکوں کی مدد سے

کتنے ہی لوگ پہنچ جائیں گے۔ وہاں بھی سرائیں بن جائیں گی۔ ہوٹل کھل جائیں گے۔“

بھگوان نے کہا

”پھر کیا چاند پہ چلا جاؤں؟“ دیوتا پھر دھیان میں گمن ہوئے۔ بولے

”تکنیک کی مدد سے انسان وہاں بھی پہنچنے والے ہیں۔“

بھگوان بہت اداس تھے۔ تب ایک بزرگ دیوتا نے ان کے قریب ہو کر کہا

”ایک جگہ ہے جہاں انسان کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ اور وہ جگہ ہے اُس کا باطن۔ آپ وہاں جا کر

بیٹھ جائیں۔ انسان نے ہمیشہ باہر کی طرف بھٹکنا ہے۔ اپنے اندر کبھی نہیں اُترنا۔“

سو اُس روز سے بھگوان۔ خدا۔ رب ہر انسان کے اندر بستا ہے۔ جہاں انسان اُسے دیکھ ہی نہیں پاتا۔

کبھی کوئی بدھ کوئی کرشن کوئی تائک کوئی گورکھ اُسے اپنے اندر تلاش کر لیتے ہیں۔ پر وہ وصل کی ساعت ہوتی ہے اور ان کے ساتھ کی تو خود خدا کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔

مختصر اید بات حقیقتاً سچ ہے۔ ساری انسانی نسل ہمیشہ باہر کی طرف بھٹکتی رہی ہے۔ بات بات پہ جھگڑتی

دنیا کو خود ہی ہستی اور خود ہی اُجاڑتی ہے۔

1992 کی بات ہے۔ 12 مارچ کی صبح ہونے والی تھی جب مجھ نیند کی تہہ میں اُتری کو کسی نے پیغام دیا

کہ سائیں بابا نے بلایا ہے۔ میں حیرت سے پاگل ہو جاتی ہوں۔ پوچھتی ہوں

”ہر ٹی والے سائیں بابا؟ انہوں نے خود مجھے یاد کیا ہے؟“

میں جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں سامنے نیم تاریکی میں سائیں بابا بیٹھے ہیں۔ مجھے آتا دیکھ کر مجھ پر ایک نگاہ

ڈالتے ہیں پھر دریا یافت کرتے ہیں

”ایک بات بتاؤ۔ تم اتنی اداسی کیوں ہو؟“

میں وہیں کھڑے کھڑے جواب دیتی ہوں

”آپ بتائیں میں کیا کروں سائیں بابا؟ میرے چاروں طرف جھوٹ ہی جھوٹ پھیلا ہے۔ کوئی سچ نہیں

بولتا۔ میں کیا کروں؟“

وہ چپ چاپ زمین کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔

بس اسی قدر خواب تھا۔ لیکن جانا کہ کوئی درد معلوم نہیں میری رگوں میں کہاں تک اُترا ہوا ہے کہ سائیں  
بابا سے ملاقات کی گھڑی آئی تو غنیمت کی اس ساعت میں بھی یہی درد میرے ہونٹوں پہ بٹکنے لگا۔ مجھے لگا یہ بھی  
میری گرہن کتھا کا کرم ہے۔ میری تقدیر ہے۔

☆☆☆☆

## امروز

ساحر ایک خیال تھا، ہوا میں چمکتا ہوا شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا جادو، لیکن امروز کے ساتھ گزاری زندگی درمیان کے کچھ سالوں کے علاوہ ایک بے خودی کے عالم میں پہنچ گئی ہے۔ اس عالم کو شاید ابھی ابھی یاد آئی ایک بات سے تھا ما جاسکتا ہے۔ ایک دن گھر میں آئے کسی مہمان نے میرا اور امروز کا ہاتھ دیکھا اور کہنے لگا ”تمہارے ہاتھ میں دولت کی بہت گہری اور طویل لکیر ہے، تمہیں زندگی میں کبھی دولت کی کمی نہیں آسکتی“ لیکن امروز کو کہنے لگا کہ تم سے کبھی دولت اکٹھی نہیں ہوگی، تمہارے ہاتھ کی لکیر جلد سے شکست ہے۔ امروز نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر کہا ”اچھا تو ہم دونوں ایک دیکھا کے ساتھ گزارہ کر لیں گے۔“

1964ء میں جب امروز نے حوض خاص رہنے کے لیے ٹیل نگر والا مکان چھوڑ دیا تو اس دن اپنے نوکر کی آخری تنخواہ دے کر اس کے پاس ایک سو اور کچھ روپے بچ گئے تھے۔ لیکن اس وقت اس نے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نوکری کر لی تھی۔ اس لیے اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ دو تین ماہ بعد اس نے لاؤڈ کننگ کی طرح کہا ”میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس دس ہزار روپے ہوں تاکہ جب جی چاہے نوکری چھوڑ سکوں اور کوئی من چاہا تجربہ کر سکوں۔“ مہنگائی بڑھ رہی تھی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی کہی بات پوری ہو جائے۔ جلد ہی ایک سبب بھی پیدا ہو گیا کہ امروز کو تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے ماہوار کام الگ سے ملنے لگا۔ سو خرچ میں سے جتنی کفایت شعاری کر سکتی تھی کی اور امروز کے دس ہزار جمع کرنے کی ٹھان لی۔

سال سو سال کے عرصے میں واقعی دس ہزار جمع ہو گئے تو امروز نے ایک دن اچانک نوکری چھوڑ دی، الگ کام پانچ سو روپے کا سہارا بھی اگلے مہینے سے اچانک بند ہو گیا۔ مجھے تین ماہ کے لیے یورپ جانا تھا، چل گئی۔ میری غیر موجودگی میں امروز نے بوتیک کا تجربہ کرنے کا سوچ لیا اور اس کے لیے اپنے بھائی کو دکن کی

طرف بھیج دیا تاکہ وہاں سے بوتیک کا کوئی اچھا سا کار میکر تلاش کر کے لائے۔ میں یورپ سے واپس آئی تو اس نے گرین پارک میں تین سو روپے ماہوار کرائے کا ایک مکان لیا ہوا تھا جس میں دو کار میکر رہ رہے تھے اور رنگوں کے کڑا ہے اہل کرنے خریدے ہوئے کپڑے کے تھانوں پر بوتیک کا تجربہ کر رہے تھے۔ رنگ پورے نہیں آ رہے تھے اور ڈبوڈبو کر کپڑوں کے ڈھیر لگا کر پھینکا جا رہا تھا۔

ان دنوں امروز کا مزاج دہلی کے اس موسم جیسا تھا جب ابھی دوپہر کے وقت جسم گرمی سے جھلس رہا ہو اور ابھی سہ پہر کو سردی سے ٹھٹھہ رہا ہو۔ کچھ کہنا چاہا لیکن سارے لفظ اکارت تھے۔

اوپر سے ڈھائی سو روپے ماہانہ پر ایک درزی آگیا جو کچھ بہتر بنے ہوئے کپڑوں کو کتر کتر کر قیصوں کی شکل میں سی رہا تھا لیکن قیصوں کی کمر کا سائز اردو شاعری کی حسینہ کی کمر جیسا تھا۔

ان پانچ سو قیصوں کا حشر یہ ہوا کہ انھیں برس ہا برس تک سنبھالنے کے لیے ایک الماری بنوائی پڑی۔ ایک بڑا ٹرک خریدنا پڑا اور پھر انھیں دیکھتے ہی جلدی سے الماری کا دروازہ اور ٹرک کا ڈھکن بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ایک دن کی بات آج بھی یاد آجائے تو ہنسی پھوٹ بہتی ہے۔ ایک دن ایک امریکی عورت کو ایک قیص بہت پسند آئی، وہ اسے بتا رہا تھا کہ اردو شاعری کی حسینہ کی کمر کے لیے سلی قیص اسے پوری نہیں آئے گی لیکن اس نے ایک پردے کے پیچھے ہو کر کسی طرح وہ قیص پہنسا لیکن اتارنے لگی تو اتر نہیں رہی تھی۔ اس نے اتنا کر پردے کے پیچھے سے آواز دی "پلیز گیٹ می آؤٹ آف دس شرٹ"۔ دس ہزار ختم ہو گئے تو امروز نے اپنا اکلوتا پلاٹ بیچ دیا جو ساڑھے چھ ہزار کا ہکا اور ایک سال کے اس تجربے میں کتابوں کے اکا دکا ناکلوں کا کام کر کے اس نے جو بھی کمایا تھا، اس سمیت اس کے خرچ کی رقم بیس ہزار ہو گئی۔ پھر اس کا دل بوتیک سے اچاٹ ہو گیا۔ اس تجربے میں سے سلک کی ایک قیص اور سلک کی ایک ساڑھی جو امروز نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی، میرے پاس ہے۔ جب بھی قیص یا ساڑھی پہننے لگتی ہوں، بیس ہزار کا خیال آ جاتا ہے اور کبھی اداس ہونے لگوں تو امروز ہنس دیتا ہے۔ "اتنی قیمتی ساڑھی تو کسی ملکہ نے بھی نہیں پہنی ہوگی، تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ آج تم نے دس ہزار کی ساڑھی پہنی ہوئی ہے"۔ سو یہ میری ساڑھی بھی دس ہزار روپے کی ہے اور قیص بھی دس ہزار کی۔

میں سچ بیچ امیر ہوں۔ یہ امروز کے اس حوصلے کی امیری ہے جو بیس ہزار گنوا کے بھی اس طرح ہنس سکتا تھا اور یہ دس ہزار بھی وہ جو اس نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ بعد میں۔ امروز کو سمجھنا مشکل نہیں، اس میں

مسئلہ چلی آ رہی ایک رہا ہے (ہاتھ میں نہیں، پیشانی کی سوچ میں)۔ اس کے من میں چیزوں کی وہ شکلیں ابھرتی ہیں جنہیں کاغذ پر یا لکڑی پر پراتا نہ صرف اسی کے بس کی بات ہے۔ بڑے کمالات دکھانا اس کے بس میں نہیں۔ اس نے ٹیکسٹائل کے عجیب و غریب ڈیزائن بنائے۔ میں دیکھتی تو اسے کہتی کہ اگر یہ سچ سچ کاغذوں سے اتر کر دو گز کپڑوں پر آجائیں تو سارے ہندوستان کی لڑکیاں پریاں ہو جائیں۔ یہ ڈیزائن کاغذوں پر بنانے اس کے بس میں تھے، اس نے بنائے، انھیں کپڑوں پر اتارنے کے لیے کسی مہل کی ضرورت تھی۔ ہمارے ملک کی غریبی یہ نہیں کہ اس کے پاس مہلیں نہیں، غریبی یہ ہے کہ مہلوں والے اہل نظر نہیں ہیں۔ یہ ڈیزائن وہ مرتبہ دو مہلوں والوں کو دکھائے تھے لیکن تجربہ یہ ہوا تھا کہ وہ لوگ آئیون ریڈ کے اس فقرے جیسے تھے جو ایسے لوگوں کے لیے ان کی تقدیر کی طرح لکھا ہوا تھا "پرفیکٹ ایڈمیس"۔

اصل میں اسی بے بسی کی وجہ سے امروز نے بوتیک کا ذریعہ سوچا تھا کہ کچھ ڈیزائن مہلوں کی محتاجی سے سرخرو ہو کر کپڑوں کا جسم چھو سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کام جب تک کاریگروں کے ہاتھوں میں تھا، قابل ذکر نہیں تھا لیکن جب آخر کار امروز نے اس کا سارا عمل اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تو کچھ چیزیں ایسی تیار ہوئی تھیں کہ ان سے آنکھ نہیں ہٹائی جاتی تھی۔ لیکن ایسی چیزوں کے لیے کچھ جاپانیوں اور کچھ امریکیوں کے سوا کوئی خریدار نہیں تھا اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی تھی کہ جب یہ ہنر عروج تک پہنچ چکا تھا تو دو گز کپڑا خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں بچتے تھے۔

یہ معمولی ذریعہ بھی پہنچنے سے باہر ہو گیا تو اس تجربے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ تجربے عمل میں آئے جن کے لیے ایک مرتبہ میں پچاس سو روپے سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امروز نے گھڑیوں کے ڈائل ڈیزائن کرنے شروع کر دیے۔ جب پچاس روپے اکٹھے ہوتے، وہ ایک گھڑی خرید لیتا، اس کا ڈائل ڈیزائن کرتا، آج بھی ہماری ایک الماری ان گھڑیوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں چابی دینا ممکن نہیں لیکن کبھی کبھی ہم وہ الماری کھولتے ہیں تو ساری گھڑیوں کو چابی دے کر ان کی ٹک ٹک پٹھوون کی سمفنی کی طرح سنتے ہیں۔

گھڑیوں میں ہمیشہ ایک وقت ہوتا ہے لیکن امروز نے گھڑیوں میں دو وقت حاصل کرنا چاہے۔ ایک تو عام وقت جو سونیاں بتاتی ہیں دوسرا وہ جو دنیا کے کچھ شاعر لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے امروز نے نمبروں، الے ڈائل نکال کر گھڑیوں میں وہ ڈائل ڈال دیے جن پر اس نے دنیا کے ان شاعروں کی سطریں لکھی تھیں جن میں کئی پل کشید ہوئے تھے۔ سب گھڑیوں میں کسی کے ڈائل پر فیض کا شعر ہے، کسی پر قاسمی کا، کسی

پردارث شاہ کا، کسی پرشوکار کا۔

اسی طرح امروز کے ڈیزائن کردہ کئی کیلنڈر ہیں۔ کسی کی شکل چوکور میز جیسی ہے جن پر تاریخیں اور دن شطرنج کے مہروں کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ کسی کی شکل درخت جیسی ہے جسے تاریخوں اور دنوں کے ہرے پتوں سے سجایا گیا ہے۔ کسی کی شکل ایک ساز جیسی ہے جس کی تاروں کو کسے والی چابیاں سال کے دن اور مہینے ہیں۔ یہ سب کچھ اگر اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں دکھایا جاسکتا تو ہندوستان کا نام امیر ہو سکتا تھا لیکن کسی سرکاری مشینری کو چابی دے پانا نہ میرے بس میں ہے نہ امروز کے۔ جب کوئی کسی کا حال اپناتا ہے، اصل اپنا ہٹ میں اس کا اور دوسرے کا ماضی بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایک کا الگ اور دوسرے کا الگ نہیں رہ جاتا اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوتا لیکن وہ بھی اپنے ہونے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اپنے بدن کے کسی پرانے زخم کی طرح۔

امروز کو علم ہے کہ موہن سنگھ کے لیے میری قدروں میں میری محبت شامل نہیں تھی۔ ایک دفعہ جب وہ موہن سنگھ کی کتاب "جنڈرے" کا کور ڈیزائن بنا رہا تھا تو کتاب کی شکل کے مطابق اس نے دو قفل بنائے تھے۔ میرے دو بچے جو موہن سنگھ کی سوچ میں دو پھولوں کے قفل تھے، لیکن امروز نے ٹائل پر تین قفل بنائے، کہنے لگا کہ تیسرا سب سے بڑا قفل تو بچوں کی ماں تھی جو موہن سنگھ کو نظری نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ادھوری نظم کو پورا کرنے کے لیے دو کی جگہ تین قفل بنائے ہیں۔ اس وقت امروز نے میری سوچ اپنی پیشانی میں مائی ہوئی تھی۔ امروز کو علم ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ یہ علم ہونا اپنے آپ میں بڑی بات نہیں لیکن اس سے پرے جو کچھ بہت بڑا ہے، وہ امروز کا میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا ہے۔ امروز جب ساحر کی کتاب "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" کا ٹائل بنا رہا تھا تو ہاتھ میں کاغذ لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر کے کمرے میں میں اور دیوندر بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوندر واحد دوست ہے جس کے ساتھ میں ساحر کی بات کر لیتی تھی، اسی لیے دیوندر نے ماضی میں اتر کر ایک بار ٹائل کی طرف دیکھا۔ ایک بار میری طرف لیکن میرے اور دیوندر سے بڑھ کر امروز نے میرے ماضی میں اتر کر کہا "سالا خواب بننے کی بات کرتا ہے، خواب بننے کی نہیں"۔ میں ہنس پڑی "سالا جولا ہا ساری عمر خواب بٹتا ہی رہا، کبھی کسی کا خواب نہ بنا"۔ میں اور دیوندر کافی دیر بیٹھے رہے اس درد سمیت جو ایسے وقت ایسی ہنسی میں شامل ہوتا ہے۔ کبھی حیران ہو جاتی ہوں، امروز نے مجھے کس طرح اپنایا ہے، اس درد سمیت جو اس کی اپنی خوشی کا مخالف ہے۔ ایک دفعہ ہنس کر کہا۔ "ایہو، اگر مجھے ساحر مل جاتا تو آپ نہ

ہلتے۔۔۔ تو وہ مجھ سے بھی زیادہ مجھے اپنا کر کہنے لگا۔۔۔ میں نے تو ضرور ملنا تھا، چاہے تمہیں ساحر کے گھر نماز پڑھتی ہوئی کو جا کر ڈھونڈ لیتا۔۔۔

سوچتی ہوں، کیا کوئی خدا ایسے انسان سے الگ ہوتا ہے۔

امروز جو یہ ہے، اگر نہ ہوتا تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر یہ شعر بھی نہ لکھ سکتی۔

باپ اور بھائی، دوست اور خاوند

کسی لفظ کا نہیں کوئی رشتہ

میں نے جب یوں دیکھا تجھ کو

سارے لفظ ہوئے ہیں گہرے

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم بنام مظہر الاسلام

--- اے خدا!

مظہر کا یہ لفظ سن لے!

اور

انسان کی تقدیر میں لکھ دے

امرتا

☆☆☆☆

دوست!

اب کے بہار کا نیا پہلو دیکھا

بدن سے چھو کر بھی اور تصور سے چھو کر بھی

نہیں جانتی تھی کہ سرخ پھول اس طرح بھی کھلتے ہیں

اس تحفے کا بہت بہت شکریہ!

امرتا

آپ کو ایک خط ملا ہوگا وارث شاہ تقریب کے لیے ہندوستان آنے کا،

جواب کا انتظار ہے۔۔۔۔۔

کاتب امروڑ

☆☆☆☆



اک مدت ہوئی۔ تہا ذی خیر آئیاں  
 اوہ ظالم موسم ہے۔ کتوں دی غل دی مہک  
 ورگی آواز سنائی نہیں دیتی  
 اخباراں دی کچھ کٹینک بھیج رہی ہاں  
 نسی اپنیاں نویاں کہانیاں تے کہانی کیویں بنی ورے مضمون  
 ضرور بھیجو۔۔۔ تاک مٹی لئی تے  
 میر۔۔۔ تے امر دانی خط بھیجو

امرتا

کاتب امر دز کا سلام اور آپ جیسے سب سنجیدہ لوگوں کو بھی۔

☆☆☆☆

## امرتا پر یتیم بنام احمد سلیم

(میرے نام امرتا پر یتیم کے یہ خطوط گورکھی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ سترہ برسوں (1968-85) پر محیط خطوں کا یہ انتخاب امرتا پر یتیم کی فنی اور شخصی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 1985 کے بعد کے خطوط کی قائل میرے آرکائیوز سے غائب ہے اس لیے اس دور کے خطوط کا انتخاب نہیں کیا جاسکا۔ اردو ترجمہ دانستہ طور پر پنجابی محاورے کے قریب تر رکھا گیا ہے تاکہ امرتا پر یتیم کا بیان اور انداز بیان مسخ نہ ہونے پائے۔ ایک دو مقامات پر لفظ پڑھے نہیں جاسکے اس لیے وہاں (۔۔۔) کے نشان دیے گئے ہیں۔

ان خطوں میں 'ناگ منی' کے پرچوں اور امرتا کی مجھے بھیجی ہوئی کتابوں کا بار بار تذکرہ ملتا ہے جو مجھے اکثر نہیں مل پاتی تھیں۔ دراصل یہ 1971 کے بعد کے چند برس تھے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ معطل تھا اور یہ خط و کتابت اکثر بذریعہ لندن یا آنے جانے والوں کی معرفت ہوتی تھی۔ ان خطوں میں دوسرا تذکرہ جواں مرگ سارا انگفتہ کا ہے جو امرتا پر یتیم کو اتنی عزیز تھی کہ انہوں نے اس کی جواں مرگی کا نوحہ کتابی صورت میں ایک تھی سارا کے نام سے شائع کیا۔)

پیارے احمد سلیم جی

آپ کے خطوں کا بہت شکریہ۔ سارے خط میں نے بڑی قدر سے پڑھے ہیں۔ پڑھے نہیں پڑھوائے ہیں مجھے اردو نہیں آتی۔

آپ 'ناگ منی' پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ آپ پنجابی (گورکھی) پڑھ سکتے ہیں اس لیے خط اردو میں لکھوانے کی بجائے خود لکھ رہی ہوں۔

دیت نام کے بارے میں میری نئی نظم 'ناگ منی' کے تازہ شمارے کے ٹائٹل پر چھپی ہے۔ پرچہ بھیج رہی ہوں۔ پچھلے سال ایک بہت اچھی نظم لندن میں شائع ہوئی تھی 'انگریزی زبان میں'۔ کسی پچھلے شمارے میں نے اس کا پنجابی ترجمہ شائع کیا تھا۔ وہ شمارہ بھی بھیج رہی ہوں۔ یہ اینڈرین ٹیبل کی نظم ہے صفحہ 18 پر۔ اگر آپ گورکھی رسم الخط میں پنجابی پڑھ سکتے ہیں تو آئندہ سے 'ناگ منی' بھیج دیا کروں گی۔ آپ وہاں سے مجھے احمد ندیم قاسمی کا پرچہ 'فنون' بھجوادیں۔

آپ کی اور آپ کے دوست کی نظم ملی۔ آپ سے اور بھی اونچے معیار کی نظموں کا تقاضہ کرتی ہوں۔

پیارے امرتا پرتم

28-08-68

☆☆☆☆

کوئی محبوب نظر ہی  
محبوب چہرہ دیکھ سکتی ہے  
اور کوئی محبوب قلم ہی  
محبوب چہرہ تخلیق کر سکتا ہے  
احمد سلیم کے محبوب قلم کے لیے  
پیار بھی اور اس کا شکریہ بھی

امرتا پرتم

(حوالہ: امرتا پرتم کے نام احمد سلیم کی نظم) 7-7-69

احمد سلیم! اونیک آدمی!

تیرا پنا نھیک ہی تھا۔ تیرا خط پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم سچ سچ تاریک غاروں سے گزر رہے ہیں نہ جانے انسانی محبت کی کب پروا ہوگی۔

'ناگ منی' کے پر پے چند کتابیں اور یہ خط بھیجنے کا موقع ملا ہے۔ تیری نیک روح کو سلام! سجاد حیدر میرے بہت پرانے اور بہت پیارے دوست ہیں۔ اب تو لگتا ہے انہیں دیکھے صدیاں بیت گئیں۔ خدا کرے جیتے جی ایک بار ملاقات ہو جائے۔

میں 23 اگست کو یوگوسلاویہ جا رہی ہوں۔ وہاں تین ہفتے رکوں گی۔ پھر چیکوسلواکیہ اس کے بعد فرانس اور اکتوبر کے وسط میں لندن پہنچوں گی۔ وہاں تیرے خط کا انتظار کروں گی۔ اپنی نئی نظمیں 'ناگ منی' کے لیے ضہا کر بھیجتا۔

تیری امرتا پریم

16-8-72

☆☆☆☆

6-11-74

پیارے احمد سلیم!

شکر ہے کہ اب تمہیں خط لکھنے کی راہ نکل آئی ہے۔ 'ناگ منی' کے پر پے اور دونی کتابیں لاہور کے پتے پر اسی وقت بھیج دی تمہیں جب تمہارا پہلا خط ملا تھا۔ دوسرے خط میں آنے والے رقبے ہنگریش پوسٹ کر دیئے ہیں۔

ایک دن ٹی وی سے تیری نظمیں پڑھیں۔ احمد سلیم کی بھی اور فخر زمان کی بھی۔ پتہ نہیں تم نے سنیں یا نہیں! 'ناگ منی' میں جیل ہاشمی کا ناول 'آتشِ رفتہ' ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس اس کا پتہ نہیں اس کا پتہ بھیج دو اور اس کی تصویر بھی تاکہ ناگ منی میں اس کا سچا جاسکے۔  
فہمیدہ بہت یاد آتی ہے۔

تیری کتابوں کے بارے میں مدت ہوئی لندن سے خط لکھا تھا 'امید ہے مل گیا ہوگا۔  
رشم کا پتہ دی ہے۔

آئندہ ناگ منی لاہور کے پتے پر بھیجوں یا اسلام آباد کے پتے پر بتا دینا؟۔

تیری امرتا پر تم

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم!

لکھا ہے۔۔۔۔۔ اب میرا خط ابھی تم تک پہنچ سکے گا اور تمہارے خط مجھ تک آسکیں گے۔ اب فاصلے  
مہربان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس بار ناگ منی بھی بھیج رہی ہوں۔ شاید مل جائے۔ اطلاع دینا تاکہ آئندہ باقاعدگی سے بھیج دیا  
کروں۔

پتہ چلا کہ تمہاری خوبصورت سی بیوی ہے۔ میں 'ناگ منی' کے کالم 'ذکر خیر' کے لیے اس کا انٹرویو چاہتی  
ہوں۔ فخر زمان سے کہنا تیری بیوی کا انٹرویو کر کے بھیج دے اور تم فخر زمان کی بیوی کا۔ 'ناگ منی' میں یہ کالم  
دیکھا تو ہوگا۔

ایک اور کالم شروع کر رہی ہوں 'میں اور میں' سیلف انٹرویو۔۔۔ یعنی اپنے آپ سے ملاقات۔ اپنا  
سوال اپنا جواب۔ وہ بھی ضرور لکھ کر بھیجو۔ تم بھی اور فخر زمان بھی۔

بہت پیار سے

امرتا پر تم

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم!

خط ملا تیری محبت سچی اس کا حق اور دعویٰ بھی سچا لیکن شکوہ سچا نہیں۔ میں نے جسے بھی 'ناگ منی' کے پرچے اور کتابیں لے جانے کے لیے کہا ہر ایک نے زیادہ وزن سے ڈرتے ہوئے انکار کر دیا۔ فہمیدہ کے پاس بھی وزن زیادہ تھا کتابیں نہیں لے جاسکی۔

پچھلے سال۔۔۔ پریم سنگھ کے ہاتھ میں نے پورے سال کی فائل بھیجی تھی۔ وہ لاہور شہباز ملک کو دے آئے تھے کہ تمہیں کراچی پوسٹ کر دیں۔ پتہ نہیں وہ سارے پرچے تمہیں کیوں نہیں ملے۔ میری کہانیاں یا کچھ بھی چھاپنے کا تمہیں پورا حق ہے۔

لاہور میں نواز چودھری نے مکتبہء شعر و ادب کی طرف سے 'رسیدی ٹکٹ' شائع کی ہے۔ اس میں 'میرا سولہواں برس' والا باب لے کر چھاپ لو۔

جنوری اور فروری کے نئے شمارے بذریعہ ڈاک بھیج رہی ہوں۔

بہت سے لوگ ادھر آتے ہیں لیکن تمہیں بھی جیسے بھی ہو سکے آنا چاہیے۔ کیوں نہیں آتے؟ غرس کے دنوں میں ہی آ جاؤ۔

امروزی طرف سے بہت پیار

تیری امرا

5-1-80

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم

زندگی نامہ ناسل کے تحت اردو اور فارسی کی جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ مجھے درکار ہیں۔  
1- زندگی نامہ، اقبال لاہوری 2- زندگی نامہ، تقی زادہ 3- زندگی نامہ، علی 4- زندگی نامہ، بیرونی  
5- زندگی نامہ، شیخ طوسی اور زندگی نامہ، پیشہ دراز سیریز کی کئی کتابیں بھی ہیں۔  
اس کے علاوہ نظمیں، غزلوں، مضامین (اردو کے) جن کا عنوان زندگی نامہ ہو (بھی درکار ہیں)  
یہاں بندی کی ایک ادیبہ نے مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میرے ناول کا نام ہے 'ہر دت کا زندگی نامہ'  
جبکہ بندی کتاب کا عنوان تھا 'زندگی نامہ'۔ اس کا دعویٰ ہے کہ لفظ 'زندگی نامہ' اردو یا فارسی میں استعمال نہیں  
ہوتا۔ یہ لفظ صرف اسی نے استعمال کیا ہے جو سراسر غلط بات ہے۔  
اسی حوالے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ کتابیں چاہئیں۔

پیارے

امرتا

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم

ڈائری بھیج رہی ہوں۔ سارا کی کتاب ابھی کراچی نہیں پہنچی۔ تیرا مضمون 'ناگ' منی میں چھپا تھا دیکھ  
لیا ہوگا۔

پاکستان میں 'زندگی نامہ' کے عنوان سے جو بھی کتاب چھپی ہو وہ مجھے ضرور بھیجنا۔  
یہ زندگی نامہ خواہ کسی بھی ادیب کا ہو یا یہ کوئی مضمون ہو افسانہ یا کوئی نظم غزل جو بھی ملیں۔ لفظ 'زندگی  
نامہ' استعمال ہوا ہو۔

’ناگ منی‘ باقاعدگی سے مل رہا ہوگا

پیارے

امرتا

پس نوشت

سندھی ادب میں بھی اگر کسی تحریر میں ’زندگی نامہ‘ کا استعمال ہوا ہو تو ان کے حوالے بھیج دینا۔

امرتا

4-2-85

☆☆☆☆

بیار احمد سلیم!

مدت ہوئی تیرا خط نہیں آیا۔ میں نے ’زندگی نامہ‘ کے حوالے سے ایک خط لکھا تھا۔ پتہ نہیں تجھے ملا ہے یا نہیں۔

1- سارا کے بارے میں کتاب لکھ رہی ہوں۔ اس کے لیے اس کے سارے خط، نظمیں، ڈائریاں جو بھی ہوں مجھے مل سکیں تو کتاب کا کیوس وسیع ہو جائے گا۔ اسی طرح تم نے جو کچھ بھی سارا کے بارے میں لکھا ہو یا ثروت سلطانہ اور دوسرے دوستوں نے لکھا ہو وہ بھی مجھے بھجوا دو۔

2- پنجابی اکادمی دہلی۔۔۔۔۔ اگلے سال جنوری میں پنجابی مشاعرہ منعقد کر دانا چاہتی ہے ہند۔ پاک مشاعرہ۔ اس کے لیے تم نے تو آنا ہی ہے۔ باقاعدہ دعوت نامہ اکادمی کی طرف سے پہنچ جائے گا۔ مجھے دوسرے پنجابی شاعروں کے نام بھی لکھ بھیجو بہت اچھے نام ان کے پتے بھی تصویریں بھی تاکہ میں دعوت نامے بھجوا سکوں۔

3- نئی نظمیں ضرور لکھی ہوں گی، ’ناگ منی‘ کے لیے بھجوا دو۔

4- ثروت (سلطانہ) سے کہو سارا کے بارے میں اپنا مضمون لکھ بھیجے۔



5۔ مظہر الاسلام کے بارے میں، میں نے ایک مضمون لکھا ہے جو یہاں ہندی کے سب سے بڑے ہفت روزہ میں چھپا ہے، تصحیح رہی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں اردو میں چھپوا دو۔  
خط کے جواب کی منتظر ہوں۔

امرتا

17-8-85

☆☆☆☆



نی جندے میریٹے

## نی جندے میرے!

آئی یہ اپنے جندے!

اپنے وہی اور چنے تیرے۔

امیال وہی لکھدے۔۔

پولیاں وہی لکھدیں اور وہی

نعمتیاں پورے اتر رہی

نہاں اس وہی میدان میں وہی

وہی لکھیں تار سناں۔۔

پاؤں میں اور کھسک سکیں

تو اس، ابول سیاہ

وہاں، وہی پہنچا ہوا

امیال تو یہی پامند۔۔

تو ہندوئی نہ چھوٹی

نہ تیری نہ میری وہی

پر مشقماں وہی وہی

پوندی جاندی اندر۔۔

تیل، اس جندے نہ وہی

نہ وہی جاندی وہی

وہی، وہی وہی

نہی پوندے نہ وہی۔۔

تیریاں پوراں توں راہ لکھ

میریاں پوراں توں راہ لکھ

آہستہ توں ایس کنڈیالی

دھرتی وہی وہی۔۔



## امرت کور سے امرتا پریتم تک

اُن دنوں امرتا پریتم "امرت کور" ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں پھاگن کے سالانہ میلہ میں پریتم نگر گیا۔ لنگر کے باہر نوج سنگھ ملا تو اُس نے یہ خبر سنائی اس بار کوئی دربار چھار ہے گا، امرت کور بھی آئی ہے۔

"راج کماری امرت کور" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھائی گیت لکھنے والی امرت کور بہت خوب صورت لڑکی ہے اور بہت خوب صورت شاعری کرتی ہے۔"

"خوب صورت لڑکیاں کم ہی خوب صورت شاعری کر پاتی ہیں۔۔۔۔۔" میں نے اظہار تعجب کیا۔

نوج بولا، "مگر امرت تو کمال ہی ہے! ابھی ادھر آئی تو تم سے ملا دوں گا پریت لڑی میں اکثر اُس کی نظمیں چھتی ہیں۔۔۔۔۔ جذبات سے لبریز محبت سے سرشار عظیم نظمیں۔ خود بھی وہ بہت خوب صورت ہے۔"

امرتا ملی۔ اُس نے آنکھوں میں کاہل لگا رکھا تھا جس کے دنبائے کانوں تک پہنچے تھے، میانہ قد، اُس کے چہرے پر ایسی مجسم عورت کا وقار تھا، جسے لوگوں رُوپ وئی کہہ کہہ کر مڑ وقار بنا دیا ہے۔

میں نے کہا۔ "بھئی نوج مجھے تو یہ لڑکی خوب صورت نہیں معلوم ہوتی۔"

"کیوں؟"

"بہت معمولی سی ہے۔"

"شام کو کوئی دربار تھا، بہت سے کوئیوں نے اپنی اپنی کوتائیں پڑھیں۔ امرتا نے بنگال کے قحط پر ایک نظم پڑھی۔"

"کتنا کچھ فالتو"

اُس نے بڑی ادا سے نظم جو روایتی بندھنوں سے آزاد تھی سنائی۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں نوج میرے

پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا  
 ”بڑی بوس ہے یہ نظم! مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگی۔“

نوح بولا: ”بکال کے عظیم قسط پر ہے۔“

میں نے کہا: ”عظیم قسط ہی لکھنے سے کوئی نظم عظیم نہیں بن جاتی۔ مجھے تو یہ بہت گھٹیا سی لگی۔ اس نے مجھ  
 پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا۔“

پریت نگر میں جسے بھی دیکھو امرتا کی تعریف کر رہا تھا۔ جیسے کوئی چائے کی پیالی میں ناز کی پوری بھیلی گھول  
 ڈالے۔ ایسی ہی یہ تعریف تھی مجھے اس سے کچھ جڑی ہو گئی۔  
 یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں بہت عرصہ تک امرتا سے نہ ملا۔

پھر میں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر نوکر ہو گیا۔ وہاں کرتار سنگھ دگل نے بتایا۔

”پہلے کبھی کبھی امرتا پر ڈرامہ دینے آتی تھی، لیکن اب اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے؟“

”کیوں؟“

”پتا نہیں۔“

ایک دن ادیبوں کی میٹنگ تھی، ہم نے امرتا کو دعوت نامہ بھیجا۔ وہ نہیں آئی پھر ایک میٹنگ میرے گھر پر  
 ہوئی۔ اس نے کہلا دیا۔

”کوشش کروں گی۔“

شام کو نینس کھیل کر لوٹی ہوئی سائیکل پر وہ میرے گھر یہ کہنے آ گئی کہ کل وہ میٹنگ میں نہ آ سکے گی، اسے  
 ضروری کام ہے۔ میں نے بیٹھنے کو کہا۔ اجنبیوں کی طرح بیٹھ گئی۔

نوکر چائے لے آیا۔۔۔۔۔ ”چائے پیو گی؟“

”چائے تو میں کم ہی پیتی ہوں۔“

”آج ایک پیالی پیجیے۔“

میں نے کیتلی سے ایک چائے کی بھری۔

”اچھا بتائیے! آپ میٹنگ میں کیوں نہیں آ رہی ہیں؟“

”میں میٹنگ میں جانا پسند نہیں کرتی۔“

”سنا ہے پہلے آپ ریڈیو پر پروگرام دیتی تھیں۔۔۔“

”ہاں!“

”میں نے ستارہ بجانے کے کچھ پروگرام دیے ہیں۔ اب مجھے ریڈیو اچھا نہیں لگتا۔“

”ریڈیو۔۔۔۔۔ یا ریڈیو کے لوگ؟“

دونوں۔۔۔ ایک عورت کے لیے گھر اور سماج کی ایسی بندشیں ہوتی ہیں کہ وہ اس طرح کے بے تحاشہ کھلے ماحول کو پسند نہیں کر سکتی۔ لوگ پان کھا رہے ہیں۔۔۔ سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے ہیں۔ چائے کے پیالے اڑا رہے ہیں۔۔۔ ہا ہا ہو کا ہلچا ہوا ہے۔

”مجھے اس طرح مردوں میں بیٹھ کر کام کرنا اگلتا ہے۔ اس لیے میں نے ریڈیو اسٹیشن جانا چھوڑ دیا۔“

بات ختم ہو گئی۔

”کیا لکھ رہی ہیں آج کل؟ کوئی نظم سنائے۔“

”کسی دن ہمارے گھر آئیے تو سناؤں گی۔ میں نظم سنانے دوسروں کے گھر نہیں جاتی۔“

”اچھا کسی دن آؤں گا۔“

کچھ مہینوں کے بعد میں امرتا کے گھر گیا۔ اُس نے کھمبھی بازار سے مکان بدل کر انارکلی میں ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ فلیٹ میں چار پانچ کمرے تھے۔ جالی دار پردے تصویریں، صوفے۔

ہم نے چائے پی۔ نظم کوئی نہیں پڑھی۔

میں نے اپنی جدوجہد کی بات چھیڑی۔ امرتا نے اپنی جدوجہد کی بات چلائی۔

”آپ کیا جدوجہد کر رہی ہیں؟“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

اُن دونوں میرے لیے جدوجہد کا مطلب ”معاشی جدوجہد“ تھا۔ میں نے تین سال لاہور میں بیکار گھوم کر جگہ جگہ ٹیوشن کر کے آخر کار ریڈیو اسٹیشن پر سو روپے کی نوکری ڈھونڈ لی تھی۔ امرتا کون سی جدوجہد کر رہی تھی؟“

امرتا کی شادی انارکلی کے بہت امیر تاجر کے ساتھ ہوئی تھی۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ شام کو وہ ایک

شام الارفین میں بیٹھ کر لائیس باغ کی سیر کو جاتی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر بولی ”معاشری جدوجہد“

”آر آپ کو مشکلات کا سامنا ہے تو ایک معمولی انسان کو کتنی ہوں گی۔“

میں نے پریشان ہو کر کہا۔

”معاشری سماجی جسمانی۔۔۔ ہر طرح کی پریشانیاں مجھے ہیں۔ پریشانیوں کے جھنڈ ہیں۔ میرے

پاروں طرف جتنے ملنے والے آتے ہیں دو چار کو چھوڑ کر سب ہی پریشانیوں کے پناہ ہوتے ہیں؟“

اس کا چہرہ زرد اور متحائل تھا جیسے کوئی عرصہ سے بیمار ہو۔

”آپ بیمار رہتی ہیں؟“

”ہاں! اب بھی بیمار ہوں ہر چیز کھلی سی لگتی ہے۔ اکثر تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ شعر و شاعری بھی

فضول سامان بہاؤا ہے، کیا رکھا ہے اس میں؟ میں اپنی پچھلی نظموں پر نظر ڈالتی ہوں۔۔۔ چھ کتابیں! ہوں

مجھے اس پر کوئی غاس فخر نہیں۔ یہ نہیں کیسے لکھ ڈالیں اتنی نظمیں! اب ایک بھی نہیں ہوتی جیسے میں رک کر سوچنے

لگی ہوں یہ سب کیا ہے انسان کو کبھی کبھی سوچنے کے لیے رک جانا چاہیے۔ آج کل میں رک لگی ہوں، اسی

طرح میری شاعری بھی رک لگی ہے اس لیے کچھ تسکلی باری لگتی ہوں۔۔۔۔۔“

حافظ کہیے۔۔۔ ”میں کیسی باتیں لے بیٹھی ہوں!“

میں نے دیکھا امرتا میں تھکاوٹ تھی۔ اس کے چہرے پر زردی بکھری ہوئی تھی۔ چہرے کی لکیریں کبھی

ہوتی تھیں۔ جیسے کسی نے چاروں طرف سے اس کا چہرہ کس دیا ہو۔ چہرے پر سے فالٹو گوشت چھٹ گیا تھا۔ فکر

میں سے فالٹو سماجی فرائفس کی چھال اتر رہی تھی۔ کتنا کچھ فالٹو چھٹ گیا تھا۔ میں اس دل دیکھ سکتا تھا۔ جو سونے

کی ذلی کی طرح سنا کی بھٹی میں آگ کے نیچے دھک رہا تھا۔

باتیں زندگی کے بارے میں سماج کے بارے میں فنکار کی قسمت کے بارے میں ہوتی رہیں۔ بیچ بیچ میں

کوئی اور بات بھی ہونے لگتی۔ چائے کی پیالی بناتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”آپ کو پیاز کے پکوڑے اچھے لگتے ہیں کہ مرچ کے؟“

”مرچوں کے“

”مرد تو مرچوں سے کتراتے ہیں آپ مرچیں کیسے کھا لیتے ہیں؟“

”بچپن میں میں نے ماں کی کڑوی باتیں کھائی ہیں۔ یہ مرچیں ان سے زیادہ کڑوی نہیں۔ بھلا آپ کو مرچیں کیوں خوش ذائقہ لگتی ہیں؟“

”اس لیے کہ میں نے اتنی میٹھی چیزیں کھائی ہیں کہ اب کڑوی چیزیں اچھی نہیں لگتی! اسی طرح تعریف کی بات ہے، مجھے بہت تعریف اچھی نہیں لگتی! ایک دوسرے کی تعریف سے انسان کی بات کا معیار ایک خاص سمت میں اونچا نہیں اٹھتا۔ محبت اور نفرت۔۔۔ خیالات کے دو عکس دو گہرائیاں۔۔۔۔۔ زندگی کی تصویر دکھاتے ہیں۔“

”آپ کا عقیدہ پیار پر ہے یا نفرت میں؟“

”نفرت بھی اتنی قابل نفرت چیز نہیں۔ پیار کا الٹا پہلو ہی تو ہے۔ دوپٹے کے سامنے پیار اور الٹی طرف جہاں آپ کو ناکے نظر آئیں، نفرت ہے۔ کئی لڑکیاں دوپٹے کو سیدھے طرف سے اڑھتی ہیں اور کئی الٹی طرف سے۔“ آپ شاعری کا دوپٹے کس طرف اڑھتی ہیں؟“

”آج کل میں اڑھتی کو الٹی طرف سے کاڑھ رہی ہوں نفرت کی سوئی سے۔“

اس کا منہ اور بھی کھینچ گیا اور اس کی ناک سوئی کی طرح تیکھی تیکھی لگنے لگی۔

ہم دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے پھر چائے منگوائی۔ میں کبھی چائے کو نہ نہیں کہتا۔ میری وجہ سے اس کو بھی کئی پیالیاں پینا پڑیں۔

میں نے کہا۔ ”آج ایک روڈ پر دو چھرے بازیاں ہوئیں۔ دو آدمی مرے۔ کئی دوست لاہور چھوڑنے کی سوچ میں ہیں۔ مار کاٹ میں آپ کہاں جائیں گی؟“

”کہیں بھی نہیں۔“

”رہیں گی کہاں؟“

”لاہور میں ہی۔ یہ فساد تو کچھ لوگوں کا پاگل پن ہے۔ نفرت کا پھوڑا پھٹ گیا ہے۔ گنداخوں بہہ رہا ہے اس کے بعد آرام ہو جائے گا۔ میں نہیں چھوڑوں گی۔ لاہور کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں کی گلیوں کے موزا انارکلی راوی لارنس باغ ہر چیز سے مجھے پیار ہے۔ لاہور چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گی۔“

شام گہرا گئی۔ انارکلی میں بجلی کی جتیاں جل اٹھیں۔ میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”اچھا کبھی ملے تو نظم سنا دوں گی۔ اس وقت میرے پاس کوئی اچھی نظم نہیں“ اس نے الوداع کہی۔





ہوتا تو وہ اسے دیکھتی ہے اس کے ساتھ کھیلتی ہے جیسے جگنو آدھی رات میں روشنی سے کھلتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی روشنی میں مست اور کوئی آجائے تو ایک دم اسے منہ میں رکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔

امرتا نے محبت کی نظمیں لکھیں۔۔۔۔۔ گور کی اس لڑکی کی طرح جسے ایک پوشیدہ محبت کرنے والے سے محبت تھی اور جو دونوں کی طرف سے خط لکھتی تھی۔ اپنے آپ ہی پوسٹ کر کے آپ ہی پڑھ لیتی اور خوش ہو جاتی تھی۔ امرتا کا یہ پیار مجھے اس طرح لگا، لیکن نہیں امرتا کے پیار میں گور کی کے پیار کی بھوکی اس لڑکی کی طرح ایک زمانہ کی آواز تھی ساتھ ہی اتھاہ۔۔۔۔۔ سمندر کی جیسی خواہش اور جذبہ۔ اس محبت کے جذبے کا سہل ایک انسان تھا کوئی تصوراتی دیوتا نہیں ایک مرد۔

ایک دن اس نے اپنی نئی نظم سنائی!

"امبر۔۔۔۔۔"

ناریل کا بیڑا ہے

اور نیا چاند

سفید کھوپڑے کی پھانک

ناریل کو کس نے توڑا؟

آج جس نے اس کا پانی چکھا۔

نظم سن کر میں نے پوچھا۔

"تمہیں ناریل کا خیال کہاں سے آیا؟"

"ناریل کا خیال۔۔۔۔۔" وہ سوچنے لگی۔

"بھلا تم کیا سوچ رہی تھیں جب یہ گیت لکھا؟"

"میں اس وقت بمبئی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بمبئی یاد آرہی تھی۔ مجھے بمبئی اچھی لگتی ہے۔"

"کیوں؟"

"وہاں میرے احباب ہیں۔ شاید میں نے بمبئی میں سمندر کے پتلے کناروں پر اُسے ناریل کے بیڑ

دیکھے تھے اور اُن میں سے جھانکتی چاند کی پھانک۔ اس طرح کے نقش میرے دل پر منقش ہو گئے تھے، اُن کا

خیال آ رہا تھا۔"

میں نے کہا کہ!

”نھیک! لیکن مجھے اس گیت میں ایک مرد اور عورت کے بھرپور پیار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔“ امبر  
 ”مرد کی علامت ہے اور زمین عورت کی۔ تم نے امبر کو پکارا ہے اور ناریل کا پتہ لکھا ہے۔ ناریل کا پتہ مرد کی  
 علامت ہے تم نے چاند اور سفید گری کا ذکر کیا ہے، جو عورت کا زوہپ ہے ہر تہوار پر مبارک کام شروع کرنے  
 سے پہلے مرد کے پہلی بار ملنے اور ان کی انوٹ محبت کی علامت ہے تمہارا گیت عورت اور مرد کے گہرے  
 جسمانی اور روحانی لطف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔“

وہ سوچنے لگی۔۔۔

اُس نے یہ سب کچھ نہیں سوچا تھا۔ اُس نے صرف تاثرات محسوس کیے تھے اس کے حساس میں، دل میں چاہے صرف بھئی کا ساحل کا چیز اور چاند تھا، لیکن اُس کے تحت اشتور میں ایک بھرپور عورت اور مرد کے جذبات تے بھر اُکس تھا۔

اُس نے دوسری نظم پڑھی۔ یہ کسی کے خط کے جواب میں لکھی تھی۔

اُس کے زیادہ تر گیت دل کے راز ہیں۔ کبھی اداس، کبھی غمگین، کبھی محبت سے لبریز پکار اور کبھی جذبات کی کرنیں، کبھی وہ شکایت کرتی، کبھی خواب دیکھتی ہے۔ یہ سارے گیت آپ جیتی ہیں۔ اسی لیے اس میں درد بھی ہے اور اثر بھی۔

میں نے کچھ دیر ڈک کر پوچھا  
 "امرتا، تمہیں پیار نے بہت دکھ دیا ہے۔"

44 47

١١٠

”ہاں۔۔۔۔۔ ذکھ اور سکھ بھی۔ پیار کی دین ذکھ ہے لیکن اس کی جڑوں میں سکھ ہے اسی طرح سکھ کی کوکھ سے بھی ذکھ جنم لیتا ہے، اگلتا ہے جیسے چیز کی دوسرے ہوں۔۔۔۔۔ ایک ذکھ اور ایک سکھ۔۔۔۔۔ میں نے چیز پر اُڑھ لی ہے اور اس کے دونوں کنارے اپنے دانتوں میں دبا لیے ہیں۔“

انہی دنوں میں نے اس کی ایک اور نظم اس کی ڈائری سے پڑھی ایک سوال میرے دماغ میں چکر کاٹ رہا تھا۔ یہ نیت اس نے کسی دوست کے ساتھ اغڈیا گیٹ پر سیر کرتے ہوئے لکھا اور ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

اس کے پہلے گیتوں میں، کھلے پھولوں، بادلوں کے آنچلوں اور قوس و قزح کا ذکر تھا۔ جذبات کا طوفان تھا خاموشی نہیں، اس وقت وہ بے چین تھی اور کسی انجانے پیار کی، ناشناس منہاس کا ذکر کر رہی تھی۔  
 دھیرے دھیرے اسے ڈھونگ، جھوٹی اوٹ اور سماج کے ٹھیکے داروں سے چڑھنے لگی۔ سماج کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا بنایا ہوا قانون، جس کو وہ خود نہیں مانتے لیکن اندھا دھند دوسروں پر لا دینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکا، طبع کی سی جھوٹی پرت اتر گئی، آسمان اونچا اونچا نکلنے لگا۔ زمین چوڑی چوڑی اور پیڑوں، پتیوں اور سورج اور تاروں کی نئی شکل دیکھنے لگی۔  
 اس کے بعد بھٹی چلی گئی اور کئی مہینے تک میری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ جب دوبارہ دلی آئی، تو وہ بہت کھوئی ہوئی اور اس تھی جیسے کوئی چیز کہیں بھول آئی ہو۔  
 کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی، ہمیں نے کیا۔

”مطلع کس قدر صاف ہے!“

”ہوگا“ اُس نے جواب دیا۔

”ڈھوپ کتنی کن کنی ہے!“

”ہوگی“

”گھاس کتنی ہری ہے“

”ہوگی“

آج کل امرتا کی کوٹھی ہری ہے۔ نچلی منزل میں وہ خود رہ رہی ہے اوپر کی چھت تیار ہو رہی ہے۔ اسے جب بھی ٹیلیفون کرو، وہ سمیٹ کا رخ سنگ مرمر کی قسمیں، ساکواں اور شیشم کی خصوصیات اور انیٹوں کی گرائی کی بات کرتی ہے۔

”جب میں پہنچا“ اوپر کی چھت کی رگڑوائی ہو رہی تھی۔ مزدور مشین سے اوپر کے فرش کو رگڑ رہے تھے۔ سارا گھر اُس آواز سے گونج رہا تھا۔

میں نے کہا

”تیرے گھر میں بڑا شور ہے!“

امرتا بولی بس ایک ہفتہ اور ہے یہ شور۔۔۔۔۔ اس کے بعد بالکل خاموشی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ سکون! مجھے اس گھر کی بہت خواہش تھی۔“

”یہ شور نہیں۔“ کیونکہ اسی میں مجھے خاموشی کی آس ہے لیکن کافی ہاؤس کے شور سے مجھے نفرت ہے جہاں لوگ بول رہے ہوں۔ زور زور سے باتیں کر رہے ہوں۔۔۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے کتے بھونک رہے ہوں۔“

”اتنی بڑی کوشش میں ٹوا کیلی ریتی ہے؟۔۔۔۔۔ اس کی رکھوالی کے لیے کوئی کتا کیوں نہیں رکھ لیتی؟“  
”کون سا کتا اچھا رہے گا؟“

”بل ڈاگ بل میری“ آل سیشن یا کوئی دیسی کتا دیسی کتے دیسی عورتوں کی طرح خونخوار اور وفادار ہوتے ہیں۔“

”مجھے کوئی کتا ضرور رکھنا چاہیے۔ میری کوشش اکیلی ہے۔۔۔۔۔ بالکل ایک طرف آگے نیم کاٹھنا بیڑ ہے اور خالی کنواں مجھے کتا ضرور رکھنا چاہیے۔ اکیلی ہوتی ہوں۔۔۔۔۔“

بہت ڈر لگتا ہے۔ باہر کتا بندھا ہوگا تو ہر ایک پھیری والا، چندہ مانگنے والا، درشن کرنے والا نہیں آسکے گا ان درشن بازوں سے بڑی نفرت ہے۔“

”تیرا مطلب ہے پڑھنے والوں سے۔“

وہ ہنسنے لگی۔۔۔۔۔

”نہیں پڑھنے والے تو خط ہی بھیجتے ہیں، لیکن ہر نیا شاعر اور افسانہ نگار۔ اپنی کہانی یا نظم سنانے آتا ہے۔ عام طور سے پہلے یہی کہتا ہے کہ درشن کرنے آیا ہے۔ کچھ افسانہ نگار بڑی انکساری کے ساتھ آتے ہیں مجھے انکساری سے بھی ڈر لگتا ہے اکثر یہ انکساری والے۔“

”انکساری“ تیزی، منہاس، امرتا۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔ تیرے گھر میں بڑا شور ہے۔“ اس نے کہا

”کچھ لوگ بہت ادب سے ملتے ہیں، لیکن دو دن بعد ہی اپنا عشق پھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں جیسے کوئی الا پتھی کی طرح پیش کرے۔ مجھے اس عشق سے نفرت ہے جو الا پتھی کی طرح پیش کیا جائے۔“

”کیا تو نے کسی سے نفرت کی ہے؟“

”پوچھ پیار کس سے کیا؟“

چلو یہی سہی!“

”میں نے جسے پیار کیا، اُس کے بارے میں لکھا ہے؟“

”تُو نے کتنے مردوں سے پیار کیا ہے؟“

وہ خاموش ہو گئی اور باہر دیکھنے لگ، جہاں نیم کی ٹہنیاں کانپ رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی نہیں دوڑی بلکہ ورد کی لکیریں پھیل گئیں۔

اُس نے کہا ”دو مردوں کو پہلے سے تو نفرت کا سوال ہی نہیں۔۔۔۔۔“

”اُس کا جب بھی خیال آتا ہے۔ ہمیشہ خوب صورتی کا خیال آیا۔۔۔۔۔ کوئل سندرتا کا اُس کی آواز بہت سہانی تھی ایک بار اُس کی آواز میں نے ٹیلیفون پر سنی اور نظم لکھی۔ اُس آواز کو میں نے ہمیشہ سندر کشش کی شکل میں دیکھا۔ وہ کبھی غصہ سے نہیں بھڑکا۔ جب کبھی اُسے غصہ آیا وہ چپ ہو گیا۔ اُس کا پیار بے لوث تھا۔ خدا کی طرح۔“

”یکواس“

میں نے اُس کے تصور پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا

”وہ بولی ہاں یکواس ایشو اور پیار دونوں یکواس ہیں“

”اس آدمی کا نام کیا تھا؟“

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیا پتہ وہ ناراض ہو جائے۔“

تو دیہاتی عورت کی طرح ہے جو اپنے خصم کا نام نہیں لیتی۔ اگر اس کے خصم کا نام گلاب سنگھ ہو تو وہ پھولوں کی بات کرے گی گلاب نہیں کہے گی۔

وہ کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

”ہاں مجھے دیہاتی عورت ہی کے کچھ رسم و رواج اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ مہندی،

سرما سی، کڑوا چوتھ۔۔۔۔۔“

”کیا تو کڑوا چوتھ کا برت رکھتی ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ "جب میرا شوہر کے خصم ہونے پر عقیدہ تھا۔ اُس وقت میں برت نہیں رکھتی تھی۔ اب جب خصم کے شوہر ہونے پر یقین نہیں رہا تو کڑوا چوتھ کا برت رکھتی ہوں۔"

میں نے بات کا رخ بدل کر کہا "تو اپنے پریموں کا ذکر کر رہی تھی۔ پہلا پریمی مجھے دہم سا لگتا ہے۔۔۔ مایوس اور دوسرا؟"

"دوسرا پہلے سے بالکل الٹا ہے، بہت ہی سادہ۔۔۔۔۔ میں نے اُس کا پیار بھی دیکھا ہے۔۔۔ میں نے اس کی خوب صورتی بھی اور کڑنگی بھی۔"

"تو بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہی ہے؟"

امر تا میز پر دو گھڑیاں پاس پاس رکھے ہوئے تھی اور وہ انھیں بار بار چھینر رہی تھی۔

اُس نے کہا

"دونوں گھڑیوں کا وقت ملتا ہی نہیں۔۔۔۔۔"

"دو گھڑیاں کبھی نہیں دیکھیں۔"

میں نے پوچھا

"کہاں سے خریدی ہیں؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی

"یہ دونوں گھڑیاں میرے دو پریمیوں نے دیں۔۔۔۔۔ دونوں کو نہ جانے کیا سوچھی۔۔۔۔۔ یہ گھڑیاں سو کنوں کی طرح ہیں۔۔۔۔۔ ان میں کوئی بات ضرور ہے۔ کب مجھ سے میرا دوسرا پریمی روٹھ جاتا ہے تو دوسری گھڑی بند ہو جاتی اور پہلی گھڑی چلنے لگتی ہے اور جب وہ مان جاتا ہے تو پہلی گھڑی رُک جاتی ہے اور دوسری گھڑی ٹک ٹک کرنے لگتی ہے ایک ہارمین نے دونوں گھڑیاں لگائیں۔۔۔ گھڑیوں کا جوڑا۔۔۔ وقت کا جوڑا۔۔۔ پتھلتے ہوئے وقت کے گول دائرے"

وہ چمچہ دیر سوچتی رہی۔ اُس کے چہرے کے چھچھے سلگتی ہوئی کسی فکر نے اُس کی خوشی جذب کر لی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔

میں اُسے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ اُس امرتا کو جو لاہور کے فسادات کے بعد اجڑ کر دلی شہر میں آئی

اور دھیرے دھیرے اُس نے اپنے فن کو نکھارا اور سماج میں اپنے لیے بہت اونچا مقام بنایا۔ اُس کا لڑکا کالج پڑھتا ہے۔ اُس کی جوان بیٹی اپنی خوب صورت ماں کے انداز اور بالوں کے اسٹائل کی نقل کرتی ہے۔ اُس کی کتابیں ترجمہ ہو کر ہندی، اُردو، گجراتی اور بہت سی غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اُس کی دو منزلہ پکی کوٹھی تیار ہو رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔

”تو کیا سوچ رہی ہے؟“

وہ بولی

”میں محفوظ تنہا کر رہی ہوں، کتابیں، بچے، گھر، کوٹھی۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے لیکن میں خود کو ایک عورت کے لیے اس سے بڑا خواہ اس سے بڑی مایوسی، اس سے بڑی شکست کیا ہوگی کہ اس کا پریم کامیاب رہا؟ اسے اپنے پریم کے لمحہ لمحہ بدلے روپ کا پتہ نہ چلے۔ اس پریم کا مستقبل کیا ہے۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ میں نے کل کے بارے میں سوچنا بند کر دیا ہے، بس آج؟ میں صرف اس لمحہ کی مسرت میں زندہ ہوں۔۔۔ ایک ناکامیاب زندگی میں نے بمشکل اختیار کر لی ہے۔ میں اس کی طرح ہوں۔ جو روزانہ کماتی ہے اور کھاپکا کر سو جاتی۔ کل اُسے کام ملے گا یا نہیں وہ نہیں جانتی۔ میرا پریم۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہے۔“

اچانک خاموشی چھا گئی۔ گہری گھنی خاموشی چھت کے اوپر گرجتی ہوئی مشین بند ہو گئی تھی۔ ایک بج چکا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے لگے تھے۔ امرتا اس کی طرح بیٹھی تھی، جس نے صبح سے ریت کے کئی چھوٹے چھوٹے گردے بنائے اور اب بار بار ڈھارہی تھی!!

☆☆☆☆





آسانی سے میری سمجھ میں آ رہی ہے۔

اور یہ بھی۔۔۔۔۔ کہ 8 مارچ 'چیت' کا مہینہ بنتا ہے جب اس جنم میں 'میں' نے کتنی ہی وہ نظمیں لکھیں، جن

کا نام چیت ہے۔۔۔۔۔

یہ ساحر سے ملاقات تھی کہ جب نظم لکھی تھی۔۔۔۔۔

دونوں لوگ میرے رُشنائے

دوا کھاں نوں لہجھا آ کے ٹور گوا چا ہویا۔۔۔۔۔

نہیں جانتی تھی کہ اس وقت یہ کیوں لکھا کہ ایک گم شدہ نور آج میری آنکھوں کو ملا ہے۔ میں یہ نہیں

جانتی تھی کہ یہ گم ہو جانے کا احساس میرے اندر 1868 سے پڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔

ایک اور نظم لکھی جس کی دو سطریں ہیں۔۔۔۔۔

دونوں مین دیرا گے میرے بھر بھر کے آج ز نے

ست سمندر پیراں اگے کعبہ پر لے بنے۔۔۔۔۔

اس وقت میں اس 'پر لے بنے' لفظ کو گزشتہ جنم کے ساتھ نہیں جوڑ سکی تھی۔ اور نہ ہی ست سمندر کی

دوری کو پچھلے جنم کی دوری کے ساتھ۔

ایک جنم میں یہ بھی لکھا تھا۔۔۔۔۔

پیار تیرے دیاں کپیاں گنڈاں توں نہ سکیوں کھول

پیار مرے دیاں کپیاں گنڈاں میں نہ سکیاں کھول۔۔۔۔۔

میں اس وقت یہ نہیں جانتی تھی کہ میں نظم میں جن گانٹھوں کا ذکر کر رہی ہوں وہ پچھلے جنم نے باندھی تھیں

اور جن کو یہ جنم بھی نہیں کھول سکا تھا۔

اس نظم میں دو سطریں تھیں۔۔۔۔۔

کھول کھول کے لوک ہاریا کھول کھول پر لوک

کیہڑے رب دا زور وسدا دو تنداں دے کول

آج یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ میرے شعوری دل سے چوری میرے لاشعور دل نے ان گانٹھوں کو زبردستی

کھولنے والے "لوک" کا ذکر بھی کر دیا تھا اور "پر لوک" کا بھی مگر مجھے معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ "لوک" کا معنی

مجھے مروانے والوں سے تھا اور ”پزلوک“ کا معنی اس وقت کی موت سے اگلے وقت کا تھا۔۔۔۔۔  
اسی طرح ایک اور نظم تھی۔۔۔۔۔

ایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی وردی رہی  
ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں پوریاں کردی رہی  
بہت اچیاں ہن دیواراں روشنی دسدی نہیں۔  
رات سپنے کھیڈ دی ہے ہور کجھ دسدی نہیں

اودھایا! میں ”بہت اچیاں دیواراں“ کا ذکر کے بھی نہیں جانتا کہ میں دو لفظوں کے درمیان پڑی ہوئی  
دیواروں کی بات کر رہی ہوں جن کے بارے میں کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔

اس جنم میں تو کوئی وعدہ نہیں تھا پھر یہ کون سے وعدوں کا ذکر میں نے نظم میں کیا تھا؟  
جب نظم لکھی اس وقت نہیں جانتی تھی لیکن اب جانتی ہوں۔۔۔۔۔ یہ پوری نظم میں نے سپنے میں لکھی تھی۔  
اس سپنے کا پہلا حصہ تھا کہ مجھے تیز بخار ہے اور ساحر نے آرام سے میرے چتے ماتھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں اس  
کے ہاتھ کے لمس سے بخار کی بے ہوشی میں بندی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتی ہوں اور کہتی ہوں ”میں  
نے سوچا تھا تم کبھی نہیں آؤ گے“۔۔۔۔۔ اور اس نے جواب دیا ”مجھے تو علم تھا کہ میں آؤں گا“  
اور پھر سپنے میں مجھے جاگ آ جاتی ہے۔ وہ جاگ بھی سپنے کا حصہ تھی۔ اس وقت میں نے پوری ایک نظم  
لکھی تھی۔۔۔۔۔

ایہہ رات ساری تیرے خیالاں چہ گزار کے  
میں بنے بنے جاگی آں ستے بہشیاں اسار کے  
ایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی وردی رہی۔۔۔۔۔  
ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں پوریاں کردی رہی۔۔۔۔۔  
چنچھی دی ڈار بن کے خیال کئی آوندے رہے  
ہونڈھ میرے ساہ تیرے دی مہک ٹوں پیندے رہے۔۔۔۔۔  
بہت اچیاں ہن دیواراں روشنی دسدی نہیں۔۔۔۔۔  
رات سپنے کھیڈ دی ہے ہور کجھ دسدی نہیں۔۔۔۔۔

ہر میرا نغمہ جیویں میں خط کوئی لکھدی رہی

جیراں ہاں اک سطر دی تیرے تک مہجدی نہیں۔۔۔

اور جب اس سنے سے جاگ آئی تھی میں نے یہ نظم صرف کاغذ پر نقل کی تھی آج سوچتی ہوں کہ یہ بھی خدا کا کرم ہوا ہے کہ میں نے اس قول و اقرار کے مہینے کا دیدار پایا ہے جس کے بارے میں خود ہی لکھا تھا اور جانا نہیں تھا۔۔۔۔۔

آوند اے نگہ جاندا تیرے قولوں دا مہینہ

میلاں دے میل لے ریتاں دے نال اے

جیویں ڈاچیاں نوں بدھی ٹلی دا کھڑاک آوند

تیرے قولوں دا مہینہ۔۔۔۔۔

اور ڈاچیاں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز اب میں نے کانوں سے سن لی ہے۔۔۔۔۔

نہیں جانتی تھی کہ میں نے ساحر کی محبت میں یہ کیوں لکھا تھا؟

بھرتی دا ہوکا نکلیا آسمان نے سسکی بھری۔۔۔

پھلاں دا سی اک قافلہ تے تھلاں چوں گزریا۔۔۔

اور نہیں جانتی کہ میں اپنے ہی گزشتہ جنم کی داستان لکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اور اپنے ہی قتل کی رات کا ذکر کر رہی تھی۔۔۔۔۔ ”یہ کس طرح کی رات تھی آج دوز کر گزری جب چاند کا ایک پھول تھا پاؤں کے نیچے آ گیا۔۔۔۔۔“

کوئی نیبی قوت تھی جو میری ساری زندگی مجھے میرے گزشتہ جنم بارے اشارہ دیتی رہی۔ اور محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ میں اس کے اشارے کی زبان نہیں پڑھ سکتی۔۔۔۔۔ تو اس نے اس منظر کی صورت میں مجھے کچھ دکھا دیا جو میں سمجھ سکتی تھی۔۔۔۔۔

آج یہ سب کچھ سوچتی ہوں تو اس کے کئی اشارے سامنے آتے ہیں جو اس نے مجھے دکھائے تھے۔ ان میں سے ایک اشارہ اس پینے کی صورت میں تھا جس میں میں نے ہی خود کو ایک قنقس کی شکل میں دیکھا تھا۔ دیکھا تھا کہ ایک جنگل پھولوں کا بھرا ہوا ہے جس میں ایک پھولوں سے لدے درخت پر بیٹھ کر ایک قنقس گارہا ہے۔ اور پھر جوں جوں اس کا گیت اونچے ٹرڈوں میں ہو جاتا ہے اس میں اتنی مٹھاس اور اتنی تلخی پیدا

ہو جاتی ہے کہ اس کے پروں میں سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ وہی آگ کے شعلے پھراتے اونچے ہو جاتے ہیں کہ وہ قفس اپنی ہی آگ میں راکھ ہو جاتا ہے۔۔۔

آگ کی تپش سے ہی میری فیند کھل گئی تھی۔ اس وقت میرا تھا 'میرے ہاتھ' اور میرا انگ انگ جل رہا تھا۔ اس پتے ہاتھ میں میں نے قلم لے کر۔۔۔ ایک نظم لکھی تھی۔۔۔

لکھ جا میری تقدیر ٹوں میرے لئی  
میں جی رہی تیرے بناں تیرے لئی۔۔۔  
حرف میرے تڑپ اٹھدے ہن ایویں  
سلکدے ہن رات بھر تارے جیویں  
عمر میری بے وفا اٹکدی پئی۔۔۔۔۔  
روح میری بے چین ہے تیرے لئی۔۔۔۔  
سپایاں نوں چیر کے آجا ذرا۔۔۔۔  
رات باقی بہت ہے نہ جا ذرا۔۔۔۔  
قفس دھپک راگ نوں آج گلے گلے۔۔۔  
عشق دی ایس لاٹ تے جل جائے گا۔۔۔۔  
راکھ ہی ایس آگ دا انجام ہے۔۔۔۔  
قفس دی ایس راکھ نوں پر نام ہے۔۔۔۔

اس سنے اور اس نظم کے بعد میں کئی مہینے پاؤں میں جوتی نہیں پہن سکی تھی۔ پاؤں جلتے تھے۔ کئی بار میں کچی مٹی پر پانی چھڑک کر اپنے دونوں پاؤں اس مٹی پر رکھ چھوڑتی تھی۔۔۔۔

آج محسوس ہوتا ہے۔۔۔ میں جس قوت کا اشارہ نہیں سمجھتی تھی 'میرے' لاشعوری دل نے مجھ سے ایک اس طرح کی نظم کھوائی تھی جس میں اس کے اشارے کو سمجھ کر مجھ سے میرے گزشتہ جنم کی جتا کی راکھ کو پر نام کروایا تھا۔۔۔۔

جب ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی اس وقت ایک سنے نے مجھے بڑا سیدھا اشارہ دیا تھا 'لیکن' میں ہی اس کا اشارہ سمجھ نہیں تھی۔

سنا آیتھا کہ سامنے ساحر کی پشت نظر آ رہی ہے۔ اس کے پتلے جسم پر کھلی اور سفید قمیض ہے۔ میرے پاس میرے والد لکڑے ہیں اور وہ ساحر کی پشت کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ”پہچان سکتی ہو؟“ اور پھر خود ہی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ”یہ تمہاری تقدیر ہے۔“

بعد میں میں نے یہ سنا اپنی کتاب ”کالا غلاب“ میں لکھا تھا۔ لیکن نہ اس کو دیکھ کر اور نہ اس کو لکھ کر جانا کہ میرے والد تقدیر لفظ کو میرے گزشتہ جنم کے ساتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے۔

### پتھر کی مورت

2 نومبر 1984 کی رات تھی جب سامنے پورا آسمان ایک سمندر کی طرح پھیل گیا جس میں سے روشنی کی لہریں اٹھتی رہیں اچانک میں نے روشنی کی ایک لہر کو کہا۔۔۔۔۔ میں اپنا پھٹلا جنم دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ آنکھوں کے سامنے اچانک سرسوتی کی مورتی آگئی اور میں اس کی دونوں آنکھوں کی درمیانی جگہ کی طرف نہ معلوم کتنی دیر دیکھتی رہی۔۔۔۔۔

سرسوتی کے دونوں پہلوؤں کی درمیانی جگہ کی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے محسوس ہوا کہ میرے اپنے ماتھے پر دونوں پہلوؤں کی درمیانی جگہ پر کچھ مل رہا ہے۔۔۔۔۔

میں نے اپنے ماتھے پر ہونے والی سرسراہٹ کو کہا۔۔۔۔۔ میں اپنا پھٹلا جنم دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اچانک آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے روشنی کے سمندر میں سے کچھ لہریں اٹھیں اور ان لہروں میں سے کچھ شکلیں ملنے لگ گئیں۔ لیکن اتنی تیزی سے کہ کچھ بھی پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔

پھر اچانک ایک سفید پتھر کا کھمبا دکھائی دینے لگا جو کتنی دیر تک آنکھوں کے آگے نظر آتا رہا۔ اور پھر دیکھا کہ اس کھمبے پر پتھر کی ایک چٹان لگی ہوئی ہے اور اس پر میری تصویر کندہ ہے۔۔۔۔۔ میں غور سے اس چٹان کو دیکھ رہی تھی جب کانوں میں ایک آواز آئی۔۔۔۔۔ ”تم نے جس سے محبت کی تھی اس نے تمہاری محبت کو اس وقت جانا جب تم نہ رہی۔ تمہاری نظمیں ہواؤں میں پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ پھر اس نے تمہاری یاد میں یہ پتھر لگوایا تھا۔۔۔۔۔ یہ کھمبا اس کے محل میں تھا۔۔۔۔۔

”راجے کے حرم کی ایک عورت تمہارے نام سے بھی دکھی تھی تمہاری صورت سے بھی۔ اس نے اس کھمبے سے پتھر کی مورت کو تڑوانے کی بہت کوشش کی مگر تڑوا نہ سکی۔ یہ کھمبا اسی طرح قائم ہے اب بھی۔۔۔۔۔“

میں تڑپ کر پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ محل کہاں ہے؟ لیکن یہ سوال میرے حلق میں کھڑا رہا۔۔۔ اور سامنے سے سب کچھ غائب ہو گیا۔۔۔

جاگ کر ایک یقین جیسا احساس ہوا کہ وہ پتھر کی مورت جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھی آج میں اس کو امروز کے نام سے جانتی ہوں۔

میرے کمرے میں سے 'میری آواز امروز کے کمرے میں پہنچ جاتی ہے۔ میں نے جی جلائی اور آوازیں دے کر امروز کو بلایا اور کہا:۔۔۔ دیکھو! میں نے تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی ہے جو تم نے کبھی نہیں بنائی۔۔۔۔'

## امروز

اس زندگی میں میری امروز سے پہلی ملاقات 1956 میں ہوئی تھی۔ اور کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد ایک عجیب تڑپ اور ایک عجیب سکون میرے ماتھے پر اتر آیا تھا۔۔۔۔

اس سے بیس سال پہلے مجھے ایک پینا آیا تھا کہ کوئی دو منزلہ مکان ہے جس کی ایک کھڑکی میں سے مکان کے پچھلے حصے والا جنگل بھی نظر آتا ہے اور وہاں بہتی ایک ندی بھی۔

اور اس کھڑکی کے قریب ایک کیٹوس ہے جس پر کوئی تصویر بنا رہا ہے۔۔۔۔

یہ پینا مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے لگا تا بیس سال آتا رہا۔ لیکن جب امروز سے ملاقات ہوئی تو پھر یہ پینا نہیں آیا۔

ایک احساس ہوتا تھا کہ بیس سال کی آوارگی نے۔۔۔ اپنی شدت سے۔۔۔ حقیقت کی صورت اختیار کی ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں کر سکی تھی کہ احساس کی یہ شدت صرف بیس سالوں کی نہیں، کئی جنموں سے ہے جس کے سال شمار نہیں کیے جاسکتے۔۔۔۔

امروز کی ملاقات نے میرے شعوری دل کے بند دروازے پر معلوم نہیں کیسی دستک دی تھی کہ میں نے نظم لکھی۔۔۔۔

درد بھیر حیاتنے ارکھ صدق دی لاج

ریت تھلاں وج آرہی قدام دی آواز۔۔۔

مگر یہ نہ جانا کہ یہ ریت تھل صرف اس زندگی کے دوران برسوں کے نہیں یہ ریت تھل بہت لمبے ہیں۔  
 پچھلے جنموں کے بھی دوران برسوں تک پھیلے ہوئے۔۔۔

اور جب لکھا۔۔۔

در نہ بھیڑ حیاتے! دیکھ ذرا اک وار  
 متھے کرناں بندھ کے سورج آیا غیر۔۔۔

اس وقت اس "فیر" لفظ کا راز نہیں جانا تھا۔ صرف نظمیں تھیں جو کاغذوں پر حروف کی بوندوں کی طرح  
 برسنے لگی تھیں۔ یہ لکھ کر بھی کہ "اٹھ اپنے گھرے چوں پانی دا کول دے ا دھولواں گی بیٹھ کے راہواں دے  
 حادثے"۔۔۔۔۔ یہ نہیں جانا کہ میں نے جن حادثوں کو دھولینے کی بات کی ہے وہ حادثے کئی جنموں  
 کے ہیں۔

اس وقت ایک نظم لکھی تھی۔۔۔۔

نظر تیری نے جتھ پھڑایا

اکو ملاقات وچ گلاں عمر دی پوڑی چڑھ آئیاں۔۔۔۔

اور اس وقت میں نے "عمر" لفظ کے معنی نہیں جانے تھے۔ اور نہ یہ بات کہ اس کی میٹھیاں پچھلے جنموں  
 تک بھی اترتی ہیں۔۔۔

### نظموں کا میلہ

پہلی ستمبر۔۔۔ جس رات سے پیدا ہوئی تھی اس رات معلوم نہیں کون سا پہر تھا جس وقت دیکھا کوئی  
 بہت بڑی جگہ ہے جہاں پنجابی کے شاعر جمع ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ میں شاعروں کے اس میلے میں شامل  
 ہو جاؤں میں انکار کرتی ہوں۔۔۔

میں انکار کرتی ہوں کہ میں کبھی سٹیج پر نظم پڑھنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ لوگ اتنا تقاضا کرتے ہیں کہ میں ایک  
 بار ان میں شامل ضرور ہو جاؤں چاہے آخری بار۔۔۔۔

اور میں ان میں شامل ہو کر جب سٹیج کو سنبھالتی ہوں تو کہتی ہوں۔۔۔۔۔ آج ہم نے نظموں کا میلہ کرنا  
 ہے لیکن اس سے پہلے ہم سب پہلے بلے شاہ کا دھیان کریں اور اس کی ایک سطر کی طرح اپنے دل و دماغ کی



حالت بنالیں۔۔۔۔

کہتی ہوں۔۔۔۔ الف اللہ دل کرتا میرا مینوں ب دی خبر نہ کائی۔۔۔۔

اور کہتی ہوں۔۔۔۔ آؤ! اپنی اپنی لطم کہنے سے پہلے ہم الف اللہ کی حالت میں پہنچ جائیں!  
یہ کہہ رہی ہوتی ہوں۔۔۔۔ جس وقت جاگ آ گئی۔

## لا شعوری دل کے اشارے

1986 میں جب میں "انسائیکلو پیڈیا آف ان ایکسپلینڈ" پڑھ رہی تھی تو کئی حوالے سامنے آئے کہ دنیا میں کئی لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں جن کو کوئی غیبی قوت ملتی ہے اور ان سے کئی کتابیں لکھوا جاتی ہے۔ لیکن اپنے متعلق مجھے کبھی اس طرح کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں نے آج تک جو لکھا ہے اپنے ہاتھ اور اپنے ارد گرد گزرے واقعات کی بنیاد پر ہمیشہ شعوری دل کے ساتھ لکھا ہے۔

کئی نظمیں بنو رہی ہیں۔۔۔۔ جو مکمل یا نامکمل سینے میں لکھیں اور پھر جاگ کر کاغذ پر اتار لیں لیکن ان کے متعلق بھی کبھی اس طرح کی غلط فہمی نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے کسی دیوی قوت نے لکھوائی تھیں۔۔۔۔

لیکن 1986 میں۔۔۔۔۔ 8 فروری کی صبح ایک خیال آیا کہ میں نے جتنی بھی کہانیاں شعوری دل کے ساتھ لکھی تھیں اور جن کی ڈور آنکھوں دیکھے واقعات کے ساتھ جڑی ہوئی تھی کیا ان میں کوئی عنصر اس طرح کے بھی ملے ہوئے تھے جو میرے لا شعوری دل نے مجھ سے لکھوائے تھے؟

جی۔ سی۔ جنگ کے الفاظ میں "بہت چھوٹی عمر سے مجھے معلوم تھا کہ قسمت نے یہ میری زندگی جو میرے نام کی ہے یہ کسی مقصد کا قرض اتارنے کے لیے ہے" اور جنگ اپنی اس حالت کو ایک فقرے میں "بلڈی سڑگل" بھی کہتا ہے اور "سپریم ایکسٹنسی" بھی۔۔۔۔

جنگ کو میں بیسویں صدی کا وہ عالم مانتی ہوں جنہوں نے علم انفس کے مطالعہ کو فطری مطالعہ سے نکال کر روحانی مطالعہ تک پہنچا دیا۔ درویشانہ شعور تک۔۔۔۔ مجھے ایسا کوئی دعویٰ نہیں لیکن میں نے یہ جنگ کے باطنی دل کی حالت بسر کی ہے۔ وہ جس کو ایک سانس میں "بلڈی سڑگل" بھی کہا جاسکتا ہے اور "سپریم ایکسٹنسی" بھی۔

آج اسی باطنی دل کی گہرائی پانے کے لیے میں اپنے نادلوں کے کرداروں کو دکھائی دینے والے کچھ وہ

سننے اور وہ واقعات اپنے سامنے رکھ رہی ہوں جو دراصل وہ ناول لکھتے ہوئے میں نے شعوری دل کے ساتھ رقم کیے تھے۔ مگر نہیں جاتی کہ ان میں میرے لاشعور کا کون سا اور کتنا عنصر ملا ہوا تھا کچھ کچھ برسوں یا کچھ کچھ مہینوں کے فاصلے کے بعد وہ میرے ساتھ گزر گئے۔۔۔۔۔

میرا ناول "ڈاکٹر دیو" پہلی بار 1949 میں شائع ہوا تھا۔ وہ کسی ممتاز اور کسی ڈاکٹر دیو کی محبت کی داستان تھی جو دل کے راستے چلتی دونوں کے جسم میں سے گزر گئی تھی لیکن اس کو دھرتی پر پاؤں رکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

ماں باپ کی فاصلے کی دیوار جب دونوں کے راستے میں حائل کر دی جاتی ہے تو ممتا کی کوکھ میں سے پیدا ہوا بیٹا بھی کسی اور دیوار کے پیچھے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس بیٹے سے اور دل کے مرد سے نکھر کر ممتا کے لیے سماج کے دائرے میں جو گھر تعمیر کیا جاتا ہے وہاں جب وہ ایک بچے کو پیدا کرتی ہے تو اس کے نقوش میں سے زبردستی بننے کے نقوش کو علیحدہ نہیں کر سکتی تو ایک دن تڑپ کر اپنے تن من کا سارا درد گھر کے کھن میں رکھ دیتی ہے اور اس گھر کو الوداع کہہ کر کسی سکول میں چھوٹی سی نوکری کرنے لگ جاتی ہے۔

وہ ممتا جب دنیاوی رشتوں کے تار کھول دیتی ہے تو سکول کے رہائشی کمرے میں رہتے ہوئے ایک پینا سا آتا ہے "کمرے کی ہلکے نیل کے ساتھ لپی دیواریں اس طرح نرم ہوتی گئیں کہ پرسکون نیلے پانی کی طرح نظر آنے لگیں۔۔۔ ممتا کی چار پائی ایک کشتی کی طرح اس پانی میں ہلنے لگی۔۔۔ وہ کشتی بڑے سکون پانیوں میں پانی کے بہاؤ کی طرف بہنے لگی تو ممتا کی نظر ان کناروں کی طرف گئی جہاں کئی سائے نظر آ رہے تھے۔

ان سایوں میں سے ہی ایک چہرہ دیو کا نظر آیا ہمیشہ کی طرح سچا دکھائی دیتا جس کی طرف دیکھتے ممتا کی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹ ہلنے لگے۔۔۔ الوداع دیو! الوداع! دل کرتا ہے کشتی کھڑی ہو جائے میں کنارے لگ جاؤں لیکن اب امت نہیں۔۔۔ یہ پانی کی دھار اب مجھے کنارے سے بہت دور لے آئی ہے۔۔۔

کشتی اسی طرح آگے بڑھتی گئی۔ دیو کا سایہ پیچھے رہتا گیا اور کنارے کی اگلی طرف اس کو جگدیش کا چہرہ دکھائی دیا جس کے گھر میں اس کے ماں باپ نے اس کا ڈولا اتارا تھا۔ اور ممتا کو محسوس ہوا۔۔۔ اس چہرے پر ایک اداسی تھی شکوہ تھا اور ایک ہمدردی تھی۔ ممتا نے آنکھیں جھکا لیں اور کہا۔۔۔ مجھے معاف کر دینا آپ موتیوں کے بیوپاری تھے لیکن میں جب آئی تو میرے پاس صرف خالی ڈولا تھا۔۔۔ آپ کے آگے میری

غربی شرمائی۔۔۔۔۔ میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکی۔۔۔۔۔

کشتی اسی طرح پانی کے حوالے ہوتی رہی اور ممتا کو ایک ویران کنارے پر ایک بچے کی صورت دکھائی دیتی ہے جو ممتا کی طرف دیکھتا رہتا ہے لیکن پہچان نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اور ممتا نے کانپ کر اپنا سر جھکا لیا۔۔۔۔۔ پھر تھوڑی سی دوری پر۔۔۔۔۔ اسی کنارے پر ایک بچی کی صورت نظر آتی ہے جو کنارے کی ریت مٹی میں لڑھکتی لڑھکتی اس کی طرف دیکھتی ہے اور ممتا کو محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ بچی ابھی پانی میں گر پڑے گی۔۔۔۔۔ وہ گھبرا کر بازو پھیلاتی ہے کہ بچی کو تھام لے لیکن اس کے بازو پھیلے رہ جاتے ہیں کنارہ دور پیچھے رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔

کشتی اسی طرح پانی کے حوالے ہے اور ممتا کو اب کنارے پر کھڑے کئی بت نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ ماں باپ کا بڑے بھائی کا بڑی بہن کا اور سب گھٹنوں کے بل جھک کر کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہم کو معاف کر دو بیٹی! ہم کو معاف کر دے بہن۔۔۔۔۔ ہم گناہ گار ہیں۔۔۔۔۔

اور ممتا کو ان چاروں کے سروں پر ٹپکتے ہوئے کئی اور سائے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ان بزرگوں کے جو اس سے پہچانے نہیں جاتے۔ لیکن وہ سب کی طرف دیکھتی ہے تو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔۔۔۔۔ رب آپ کو معاف کرے!

پھر یہی کشتی تھی جو آہستہ آہستہ اس چار پائی کی شکل اختیار کرنے لگی جس کے اوپر اس رات ممتا سوئی ہوئی تھی اور نیلے پانی جیسے جیسے کمرے کی نیلی دیواریں بننے لگے۔

اس ناول کا نصف شعوری حال میں ممتا کو آ یا پننا میں نے 1948 میں دیکھا تھا۔ اور چاہے لکھنے کے دوران میں ممتا کی نصف شعوری کیفیت میں سے خود بھی گزری تھی لیکن میرا ایک مصنف کا ایک حصہ اس سب کچھ سے بے تعلق تھا جو صرف تماشائی تھا اور صرف مصنف۔

لیکن میں قدر کے اس راز کو نہیں جانتی کہ ٹھیک یہی پننا پورے بارہ برس بعد 1960 میں میرے ساتھ کس طرح بیت گیا۔

میں نے جب سماج کے سب رشتوں کی گانٹھیں کھول کر اپنی زندگی امردز کے ساتھ بسر کرنے کا قدم اٹھایا تھا تو میرے دونوں بچے ان کا باپ اور تمام رشتے دار کناروں پر کھڑے ٹھیک اسی طرح نظر آئے تھے جن سے میں الوداع بھی مانگ رہی تھی اور معافی بھی۔۔۔۔۔

1948 میں جو حالات ممتا کی زندگی کے تھے ان کے کوئی آثار میری زندگی میں نہیں دکھائی دیتے تھے۔

لیکن بارہ برس بعد وہ سارے آثار اچانک میری زندگی کے آسمان پر کالے بادلوں کی طرح چھا گئے اور ان بادلوں میں سے برسی موسلا دھار بارش سے میرے گھر کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح گھل گئیں جس طرح ممتا کے کمرے کی گھلی تھیں۔ اور میری چار پائی بھی ممتا کی چار پائی کی طرح ایک کشتی بن کر پانیوں کے حوالے ہو گئی تھی۔

”بند دروازہ“ نام کا میرا ایک ناول 1961 میں چھپا تھا۔ اس کی اور سمیش کی محبت، تنکا تنکا جوڑ کر اپنے لیے ایک گھونسلہ بنالیتی ہے کہ اچانک سماج کی طرف سے اس طرح کی ہوا چلتی ہے کہ وہ گھونسلہ ڈولنے لگتا ہے۔ سمیش کے دل کو دو طرفہ خیالات گھیرنے لگتے ہیں۔ اس کے باپ کی طرف سے اس کو اس طرح کی پیشکش ملتی ہے کہ اس کی پناہ اگر وہ قبول کر لے تو دنیاوی کامیابی کا ایک بڑا راستہ اس کے لیے کھل سکتا ہے۔ اس وقت کمی کی محبت اس کو کسی راستے کا حوصلہ نہیں دے رہی تھی کی رکاوت معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اس کو سرخرو کرنے کے لیے اس گھونسلے کو خود ہی چھوڑ دیتی ہے جو کبھی دونوں نے تنکا تنکا جوڑ کر بنایا تھا۔

اور کمی جب اس گھونسلے میں سے قدم باہر رکھتی ہے تو سمیش کے لیے ایک خط لکھ کر اس خالی گھونسلے میں رکھ آتی ہے ”سمیش! تمہارا گھر تمہیں مبارک! دھرم کے سماج کے شہرت کے عزت آبرو کے کتنے خوبصورت پھول ہیں تمہارے پھولدان میں اور گل کی طرح سجا تمہارا گھر۔۔۔ لیکن میری محبت راستوں کی گرد کی طرح تمہارے پاؤں پر پڑ گئی۔ آج تم اپنے خوبصورت گھر میں جاتے وقت ایک پائیدان سے اپنے پاؤں پونچھ لینا!“

یہ ناول میں نے 1960 کے اگست ماہ میں لکھ کر جب امرتسر کو سنایا تھا تو اس نے ناول کے مسودے کو چوم کر کہا تھا ”ہماری دونوں کی زندگی کے حالات کمی اور سمیش کے حالات ہیں، لیکن ہماری زندگی کا اختتام یہ نہیں ہوگا جو کمی اور سمیش کی زندگی کا ہوا۔۔۔“

لیکن خدا کا کرم اور خدم کا قہر کون جان سکتا ہے! ٹھیک تین ماہ کے بعد میں ٹھیک اسی مقام پر کھڑی تھی جہاں تین ماہ پہلے کی کھڑی تھی۔۔۔

اور ایک بھیا تک حقیقت سامنے تھی کہ جو خط کمی نے سمیش کے نام لکھا تھا وہ دراصل میں نے لکھا تھا، امرتسر کے نام، لیکن تین ماہ پہلے۔۔۔

خط وہی رہا تھا، لیکن اس پر دستخط بدل گئے تھے۔۔۔

## دو چار پائیاں

کل رات کا پینا کچھ دھندلا سایا د میں ہے کہ امروز کے ہاتھوں میں ہون کی چیزیں پکڑی ہوئی ہیں۔۔۔ ایک سرخ کپڑا اور چھوٹی موٹی کئی چیزیں۔ اور امروز نے کہا۔۔۔ باہر بیٹھک میں ایک نیا میز لگا کر یہ سب رکھ دیں! روزانہ ایک جگہ پر سب کچھ مل جائے گا۔ اور جواب میں میں نے کہا۔۔۔ نہیں، بیٹھک میں نہیں۔ وہاں کئی لوگ ملنے کے لیے آتے ہیں۔۔۔ ان کی نگاہ میں نہیں رکھنا۔۔۔ پھر معلوم نہیں وہ سب کچھ کہاں رکھا۔۔۔ کچھ یا نہیں۔۔۔

لیکن آج رات میں دیر تک ٹرگرین کی کتاب پڑھتی رہی تھی کہ ستاروں کا اور انسان کی تقدیر کا کیا رشتہ ہے۔۔۔ کہ صبح ہونے والی تھی جب میرے سامنے ایک سنت دکھائی دیئے۔ میں نے ایک ایک کاغذ ان کے سامنے کیا اور کہا۔۔۔ دیکھیں! یہ شنی اور شکر دونوں مل کر سورج کی پناہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کیا کریں گے؟ ساتھ ہی دیکھا کہ میری طرف دو چار پائیاں بھی ہوئی ہیں۔ جن پر شنی اور شکر بیٹھے ہوئے ہیں، سفید چادریں لپیٹ کر۔ اس سنت نے سرسری سی نگاہ سے دیکھا اور کہا۔۔۔ "ہاں، زندگی ان ہی کے اثر میں گزرے گی، لیکن میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ تم لوگ دل کو کتنا گہرا کر کے جیتے ہو یا کتنا گہرا کر جیتے ہو۔۔۔"

محسوس ہوا۔۔۔ میں نے یہ باتیں سنت کے ساتھ پہنوں میں کی ہیں۔ اور میری اوجھستی سی حالت میں یہ احساس تھا۔۔۔ کہ یہ پینا تھا تب بھی وہ پینا جاری رہا، اور میں نے سنت کو کہا۔۔۔ میں نے اسی طرح زندگی بسر کی ہے، اسی لیے میں نے نظم لکھی تھی کہ لوگ تو خدا سے مراد مانگنے کے لیے درخت کو چیتھڑا ہاندھتے آئے ہیں اور پھر مراد پوری ہونے پر وہ چیتھڑا کھولتے آئے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ خدا نے ایک درخت کو چیتھڑا باندھا، اور مراد مانگی کہ میں کوئی ایسا انسان دیکھوں۔۔۔ جو تمام دکھوں کو ہنس کر برداشت کر جائے! اور پھر میں نے خدا کو کہا۔۔۔ دیکھ! تم نے مجھ میں وہ انسان دیکھ لیا ہے، تیری مراد پوری ہو گئی ہے، اب آ کر اس درخت سے اپنا چیتھڑا کھول لو جو ایک مراد مانگتے وقت تم نے باندھا تھا۔۔۔

یہ سب کہہ رہی تھی کہ امروز۔۔۔ صبح کی چائے لے کر آ گئے۔

## اختتامیہ۔۔۔۔۔سرخ دھاگے کا رشتہ

28 ستمبر 1988 والے دن ساہتہ اکیڈمی دہلی کی طرف سے "میٹ وا آقھر" سلسلے میں 'میں نے اپنی نظموں اور کہانیوں کے بارے میں کچھ کہنا تھا' کہا کہ جس طرح وقت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے کرائسٹ سے پہلے اور کرائسٹ کے بعد میں ہر سوچ اور ہر تخلیق کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوں۔۔۔۔۔ ایک باطنی احساس سے پہلے اور ایک باطنی احساس کے بعد۔۔۔۔۔

اس دن کی تقریر میں 'باطنی احساس کی بات کرتے میں نے اپنے سپنوں کے ذریعے باطنی احساس کی تھوڑی سی بات کی تھی' برائے نام اشارتا، لیکن وہ وقت اس کی تفصیل میں جانے کا نہیں تھا۔۔۔۔۔ یہ کتاب وہی تفصیل ہے۔ تاریخ وار جو سرخ دھاگے کے رشتے کی گہرائی میں اترتی ہے۔۔۔

اس گہرائی میں سے نکلتے اس کی کتنی ڈائمنڈز ہیں، میں حیران ہی میں نے 'جتنی دیکھی ہیں وہ کاغذ پر اتار دی ہیں۔ لیکن وہ میرے کتنے جنموں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتی ہیں یہ میری گرفت میں نہیں آتا۔۔۔۔۔ ایک کسی اور تقریر میں کہی ایک اور بات میں یہاں بھی دہرانا چاہتی ہوں کہ فارسی کے ایک عالم ہمارے ایک شاعر نندال گویا نے 'کبھی بھٹکی ہوئی آواز میں کہا تھا۔۔۔

ہم پو موج از بہن دریا راتمود

موج کشتو کرد دریا راتمود۔۔۔۔۔

یعنی

میں بھرے بہتے دریا میں سے ایک لہر کی طرح اٹھا ہوں

ایک لہر بن کر اپنے دریا کو سجدہ کرنے کے لیے۔۔۔۔۔

نندال جی بہت بڑے عالم تھے مجھے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں، لیکن اسی دریا کی ایک بوند ہونے کے ناطے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شعوری اور لاشعوری دل کے ذریعے میں نے اپنے اس دھاگے کا رشتہ جتنا سادہ رکھا ہے اور اس کی بات جتنی سی لکھی ہے وہ اپنے دریا کو سجدہ کرنے کے لیے ہے۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

## حدیث درد

پیدائش: ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء

وفات: ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء

رہائش: گوجرانوالہ، لاہور اور دہلی

ترجمہ: دنیا کی چونتیس زبانوں میں ہوئے۔

ساتھ اکادمی ایوارڈ: ۱۹۵۶ء میں ملا

۱۹۶۶ء تا ۲۰۰۲ء تک رسالہ "ناگ منی" نکالتی رہیں۔

۱۹۶۹ء: پدم شری ایوارڈ ملا۔

۱۹۷۳ء: دلی یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔

۱۹۷۹ء: نوابت ساروا ایوارڈ ملا۔

۱۹۸۳ء: (انڈیا کاسب سے بڑا غیر سرکاری ایوارڈ) بھارتی گمیاں پیٹھ ایوارڈ ملا۔

۱۹۸۳ء: جودھ پور یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔

۱۹۸۳ء: دشنو بھارتی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کا اعزازی ڈگری ملی

۱۹۸۶ء: رات سبھا میں بطور ممبر سینٹ کے نامزدگی

۱۹۸۷ء: فرانس سرکاری جانب سے اعزازی ڈگری

۱۹۸۹ء: ایس این ڈی ٹی بھٹی یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

۱۹۹۰ء: پنجابی اکادمی دہلی کی جانب سے وارث شاہ ایوارڈ۔

## دوسرے ممالک کی یا ترا:

سویت روس، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، چیکوسلاواکیہ، ہنگری، فرانس، انگلینڈ، اٹلی جرمنی، مارشس اور ناروے۔

## تصانیف:

ناول: ڈاکٹر دیو، پنجر، آہلنا، اشوکا، اک سوال، بلاوا، بند دروازہ، رنگ دایا، اک سی انتیا، چک نمبر ۳۶، دھرتی، ساگر تے سپیاں، بولی دیاں گلیاں، اکتاتے اپریل، جلاوطن، یا تری، جیب کترے، اک دا بونا، پکی مویلی، آگ دی لکیر، کچی سڑک، کوئی نہیں جاندا، اوہناں دی کہانی، ایہہ سچ ہے، اک خالی جگہ، تیرھواں سورج، انجیادین، کورے کاغذ، ہر دت دا زندگی نامہ، نہ رادھانہ رکھی،

## شعری مجموعے:

ٹھنڈیاں کرناں، امرت لہراں، جیوند اچیون، تریل دھوتے پھل، او گیتاں والیا، بدلاں دے پلے وچ، بھدی لالی، مٹی جیہی سوغات لوک بیڑ، پتھر گیسے، لمبیاں داناں، میں تواریخ ہاں ہندی، سرنگی دیلا، سنہڑے، اشوکا چیتے، کستوری، ناگ منی، کاغذ تے کیونس۔

## شعری مجموعوں کے انتخاب:

چھ اُتار، کاغذ تے کیونس توں پہلاں، میں جمع توں، چیتر نامہ، ۱۴۱ کوٹاواں،

## کہانی پراگے:

چھتی ورھے بعد، کنجیاں، آخری خط، گوجردیاں پریاں، چانن دا ہوکا، جنگلی بوٹی، اجبئی،

## منتخب کہانی پراگے:

بیرے دی کئی، لٹیاں دی چھو کری، پنج ورھے لی سڑک، اک شہر دی موت، تیسری عورت، مٹی دی ذات،

## رپورتاژ:

بھارت دے اسرینے، موسم بیاں دے بھیت، باریاں جھروکے، کرچی لکیراں، کالا گلاب، آگ



دیاں لیکاں، اکیہ چٹیاں دا گلاب، سفر نامہ، عورت اک درشتی کون، اک اداس کتاب، اپنے اپنے چار ورھے، شوق صراحی، کبھڑی زندگی کبھڑا ساہت، کچھ اکھر، اک جتھ مہندی، اک جتھ جھالا، محبت اک درشتی کون، میرے کال ملتا سمکائی، سورج دشتی، چند روشی، عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے۔

آپ جیتی:

رسیدی ٹکٹ، لال دھاگے دارشت، چونوین پترے، رچونویں اخبار دا اک پراگا، زندگی تے نظریہ۔

دستاویز، امرتا کی ڈائری ایڈیٹر: امروز)

اس کے علاوہ امرتا پر تیم نے دوسری زبانوں میں سے بہت سی کتابوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ جو

کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ یہ سب کچھ ملا کے امرتا کی کتابوں کی تعداد سو اسو کے قریب ہے۔

امرتا پر تیم کی کچھ کتب کا ترجمہ ان زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ہندی، اُردو، انگریزی، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، اڑیا، اسامی، بنگلہ، سندھی، روسی، بلغاریہ، پولیش،

البانی، سرب، ہینش، اور فرینچ، کچھ نظموں اور کہانیوں کے تراجم ان زبانوں میں ہو چکے ہیں:

ٹائل، تیلگو، کوکٹی، ازبک، چیک، مقدونیئن، ہنگرین، رومانیئن، یوکرینیئن، عربی، ڈینش، چینی، جاپانی،

ویت نامی، جرمن اور ناروےجین۔

☆☆☆☆



اک ملاقات

## اک ملاقات

کئی دہائیاں دے پچھوں اچانک اک ملاقات  
تے دوہاں دی چند اک نظم وائٹک لکھی۔۔۔۔۔

ساہویر گچی رات کی  
پراوی نظم اک کٹھ وچ لکھی رہی  
تے ادھی نظم اک کٹھ وچ لکھی رہی۔۔۔۔۔

پتھر سویر سار۔۔۔۔۔

اسیں کاغذ دے پائے ہوئے نکلیاں دی طرح ملے  
تسا اپنے ہتھ وچ اوہدا تھ پھریا  
اوس اپنی بانہ وچ میری بانہ لیتی

تے پھیر اسیں دووین اک سسر دی طرح تے  
تے کاغذ نوں اک ٹخنہ دے میرے رکھ کے  
اوس ساری نظم تے اک لپک پھیر دتی۔۔۔۔۔

## کتابِ عشق کا اگلا ورق

بعض فن کار شہرت کی ان منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ جیتے جی زندگی کے حجم سے بھی بڑے نظر آنے لگتے ہیں کسی روایت کی طرح۔ کسی لیجنڈ کی طرح، امرتا پرتم اپنے پڑھنے والوں اور پسند کرنے والوں کو ایسی ہی شخصیت معلوم ہوتی ہیں، زندگی سے زیادہ زندگی سے لبریز۔

۷۴ء کے فسادات میں پنجاب کی دھرتی جب لبو نہا گئی تو امرتا پرتم کی گھائل آواز درد میں گھر کر ابھری "آج آکھاں وارث شاہانوں۔۔۔" اس انکم پر اعتراضات بھی بہت ہوئے اور اسے سینہ بہ سینہ دہرایا بھی گیا لیکن اس سے ایک بات بالکل واضح ہو گئی۔ امرتا پرتم نے وارث شاہ کو صدیوں بعد اس طرح پکارا تھا جیسے کوئی اپنے سگی، ساتھی، مونس و غم خوار کو پکارتا ہے۔ اس لہجہ میں پکارنا امرتاجی کا ہی حق ہے کہ آج وہ پنجابی ادب کا سب سے بڑا نام ہیں۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں ہندی اور اردو میں بھی اتنی ہی معروف ہیں کہ ان کے پڑھنے والوں کا دائرہ کسی ایک زبان کے دائرے سے وسیع تر ہے۔ ان کی کتابیں، بغیر اجازت اور ناقص ترجمے کے ساتھ اردو میں چھپتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان میں ترجمے کی غیریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ اپنی ہی بات محسوس ہوتی ہے۔ یہ تخلیق کا اعجاز ہے کہ زمان و زبان کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے، اور ایک اردو ہی پر کیا موقوف ہے، امرتا پرتم جدید ہندوستان کے معروف ترین قلم کاروں میں سے ہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جنہیں ہندوستان کا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز، ساتھ اکیڈمی ادبی انعام دیا گیا۔ ہندوستان کے صدر مملکت انھیں پدم شری کا خطاب بھی دے چکے ہیں۔ ۲۸۹۱ء میں انھیں بھارتیہ جن پتھ انعام دیا گیا اور ۶۸۹۱ء میں انھیں پارلیمنٹ کے ایوان بالا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں دنیا

کی ۴۳ زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

درجینا وولف نے کہا تھا کہ بھلا کون اس دل شاعری گرمی اور تشدد کی پیمائش کر سکتا ہے کہ جسے گرفتار کر کے ایک عورت کے جسم میں مقید کر دیا گیا۔ امرتا پریم کی شاعری اس گرمی اور تشدد کا زندہ افسانہ ہے۔ ان کے نقادوں نے ان کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کی ہیں کہ وہ ابدی عورت کے دکھ کی تفسیر ہیں، کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک معمر ہیں، نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک یہ سب شخصیت سازی کا پیدا کردہ اشتہاری ڈھکوسلا ہے۔ یہ سارے اعتراض اور مدح سرائی امرتا پریم کی زندگی کے رنگ ہیں۔ اس زندگی کی کہانی انھوں نے بڑی جرأت اور نزاکت احساس کے ساتھ اپنی خودنوشت ”رسیدی ٹکٹ“ میں سنائی ہے۔ اس کتاب نے ادبی دنیا میں خاصا تہلکہ مچایا کہ اس میں امرتا جی نے بہت کھل کر دوسروں سے اپنی رفاقت کو بیان کیا ہے، ایک ساحر لدھیانوی اور دوسرے امروز جنھوں نے امرتا جی کی ”ناگ مٹی“ کو رنگوں اور لکیروں سے سجا دیا ہے۔

امروز اور امرتا جی کا گھر صحیح معنوں میں نگار خانہ معلوم ہوتا ہے۔ دیواریں ہیں کہ ادراق مصور کہ منہ سے بول پڑنے کو تیار۔ کونا کونا رنگوں سے مزین۔ ایک دیوار پر امرتا شیرگل کی تصویر ٹنگی ہوئی ہے۔ کونے میں لیمپ جل رہا ہے جس پر کئی زبانوں میں شاعری درج ہے۔ دن ہو کہ رات یہ لیمپ ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ یہ شاعری کی روشنی ہے جس کا اُجالا ہر وقت موجود رہتا ہے۔ امروز نے مجھے بتایا کہ اس لیمپ کے قریب دروازہ ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور اس کمرے کی دیواروں پر دنیا کے بہترین مصنف امروز کی لکیروں کے روپ میں جی اٹھے ہیں۔ وارث شاہ، خلیل جبران، آئین ریڈ، شیوکار بٹالوی، ان تصویروں میں تازہ ترین تصویر اردو کی جواں مرگ شاعرہ سارا شگفتہ کی ہے جو امرتا جی کی تازہ ترین کتاب کا موضوع بھی ہے۔ امرتا جی نے مجھے بتایا کہ یہ کتاب بہت پسند کی جا رہی ہے اور اس کی بدولت سارا شگفتہ کا نام دور دور تک سنا جانے لگا ہے۔

امرتا جی مدھم اور کول سروں میں بولتی ہیں، جیسے شعر کہہ رہی ہوں۔ ان کی گفتگو جو یہاں من و عن درج کی جا رہی ہے اردو کے مخصوص لہجے سے پوری طرح ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے۔ شاعری کے اس ہمہ وقت روشن لیمپ کے اُجالے میں ان کا عمر رسیدہ چہرہ دیکھنے لگتا ہے۔ اس چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ یہ وہ اُجالا ہے جو زندگی کو گہرائی میں اور پوری شدت کے ساتھ جینے سے آتا ہے۔ وارث شاہ کو پکار کر کتاب عشق کا

اگلا ورق کھولنے کی جو فرمائش انھوں نے کی تھی تو اس اگلے ورق کی تحریر ان کی اپنی شاعری کے علاوہ بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔

سوال۔ امرتاجی میں آپ سے اردو کے حوالے سے بات کرتا ہوں یعنی جس زبان میں میں نے آپ کو پڑھا ہے حالانکہ یہ آپ کے اظہار کی زبان نہیں ہے لیکن آپ اس سے بہت دور بھی نہیں ہیں۔ کیا آپ کو اردو زبان اور ادب سے کسی رشتے یا تعلق کا احساس ہوتا ہے؟ خاص طور پر یوں بھی کہ اس زمانے میں اردو ادب نے جو راستے اختیار کیے ہیں اور ان راستوں پر جو موڑ آئے ہیں جیسے ترقی پسند تحریک، افسانے میں منٹو، کرشن اور بیدی کا دور تو ان سب چیزوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے۔ دیکھنے کا عمل آپ کو کیسا لگا؟ اردو کے اس ادبی دھارے سے ہم سفری اور رفاقت کا احساس ہوا؟

امرتا پریم۔ ایک بار اردو کا نفرنس ہوئی تھی بمبئی میں۔ وہاں مجھے بھی بولنے کے لیے کہا گیا تھا تو وہاں میں نے ایک ہنٹری کی نظم پڑھی تھی ایک ہنگیرین شاعر ہوئے ہیں وہاں بھلا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے تجربوں پر وہ نظم لکھی تھی "سپاہی کی واپسی" جنگ کے دن ہیں اور ایک سپاہی ایسے محاذ پر ہے جہاں وہ اکیلا ہے اور ویرانی ہے۔ دور تک جنگل ہی جنگل ہے، کوئی انسان نہیں، کوئی گاؤں نہیں تو وہاں اسے پتا چلتا ہے جنگ کے ختم ہونے کا۔ وہاں سے اس نے واپس آنا ہے اکیلے، راستہ بہت مشکل ہے، تو اس وقت وہ دنیا کی جتنی خوب صورت چیزیں ہیں، جتنی حسین چیزیں ہیں، جتنے شاہ کار ہیں، وہ اپنے ذہن میں تصور کرتا ہے اور ایک ایک کے نام پر دس دس قدم چلتا ہے یعنی اپنے گھر کے آگن میں سیب کے بیڑ کے نام پر جس پر پھول ابھی آئے نہیں، ان بچوں کے نام پر جو اس کی بیوی کی کوکھ میں سو رہے ہیں، ان کتابوں کے نام پر جو ابھی اس نے پڑھی نہیں۔ ان کھلونوں کے نام پر جو ابھی اس کے بچوں نے کھیلے نہیں اور اس طرح مائیکل انجلو کے نام پر، اس کے شاہ کاروں کے نام پر، ویس کی حسین گلیوں کے نام پر چلتے چلتے وہ اتنی چیزیں گنتا ہے۔ دنیا کے اتنے شاہ کار ہیں وہ نظم دہراتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ان میں، میں ایک لائن کا اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں دس قدم اردو زبان کے نام پر چلنا چاہتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اردو زبان میں ایک ایسی نفاست ہے، بات کو کہنے کا انداز ہے اور جسے کہتے ہیں richness of the soul وہ بھی ہے اور اندازہ بیاں بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہیں کیوں کہ چیزیں تو دو ہی ہوتی ہیں your mind اور the way to say things یعنی کرافٹ تو وہ دونوں چیزیں اردو زبان میں موجود ہیں اور اس کی ایک خاص لذت ہے۔ باقی یہ

ضرور ہے کہ اردو زبان بادشاہوں کے پاس ملی، اس لیے اس میں کچھ تکلف بھی ہے اور ایک تہذیب جو باہر سے لی جاتی ہے وہ بھی ہے لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اردو زبان کے پاس جو لہجہ ہے بات کہنے کا وہ بہت خوب صورت ہے۔

سوال: آپ کے جن ہم عصر اردو ادیبوں کے ابھی نام لیے تھے، کرشن، منٹو، بیدی، ان کا ادب اب آپ کو کیسا لگتا ہے، پہلے فکشن کی بات کریں۔ ان لوگوں کا فکشن اب آپ پر مبنی ہیں تو آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟ امرتا پریم: فکشن کے لوگ اپنے اپنے وقت پر بہت اچھے تھے جس وقت کرشن چندر تھے، بیدی تھے وہ اپنے وقت کی آواز تھے لیکن آج بات اور ہے۔ وقت کے ساتھ ضرورت بدلتی ہے، انداز بدلتے ہیں بات کہنے کے، لیکن آج میں نے دیکھا ہے کہ مظہر الاسلام کے افسانوں اور منشیاد کے افسانوں میں جو بات آئی ہے وہ اس سے پہلے اردو زبان میں نہیں تھی۔

سوال: وہ کیا بات ہے؟

امرتا پریم: وہ بات یہ ہے کہ اردو زبان کی جو روایت چلی آ رہی ہے اس سے ہٹ کر ایک شدت ہے اور ساتھ ہی بات کہنے کا انداز بدلا ہے، سمبلز بدلے ہیں اور symbolically گہرائی میں جاسکے کا وقت لیا ہے۔ مظہر الاسلام کے افسانوں پر میں نے ایک نمبر شائع کیا تھا اپنے میگزین کا۔ اس میں ان کی پانچ چھ کہانیاں اکٹھی تھیں۔ اسی طرح منشیاد پر کیا تھا بلکہ مظہر الاسلام نے ایک نظم لکھی، نئے سال کی ”دعا“ پہلی دعا اور انتم دعا دونوں اس میں تھیں۔ اس میں کچھ شعر انھوں نے..... اس کا ایک ٹکرا ہے کہ ہماری نظموں اور کہانیوں میں اے خدا سچائی اور محبت اُتار۔ تو اس نظم کو بھی میں نے بہت جگہ quote کیا ہے اپنی تقریروں میں کیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میلان کنڈیرا اور گارسیا اور امرتا پریم کی تحریروں میں اثر برقرار رکھ اور انھیں سچائیاں لکھنے کا حوصلہ دے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک پیپر پڑھا تھا اپنی نظموں پر یہاں انڈیا انٹرنیشنل فیسٹیول میں یہی نومبر کے آخر میں تو اپنا پیپر پڑھنے کے بعد میں نے مظہر الاسلام کی نظم کا وہ حصہ پڑھا اور کہا کہ خدا ان کی دعا قبول کرے اور مجھے نئی سچائیاں لکھنے کا حوصلہ دے۔

سوال: امرتا جی آپ کی لکھی ہوئی سچائیوں سے ہم اپنی اپنی زندگیوں کے جج کو تلاش کرتے ہیں، آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ آپ کے لکھے ہوئے جج کو ہمارے یہاں بھی بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آپ کی کتابیں پاکستان میں بھی بہت مقبول ہیں اتنی کہ ان کے جعلی ایڈیشن چھاپے جاتے ہیں بغیر اجازت اور خراب ترجمے

کے ساتھ۔

امر تا پریم: دیکھیے دو باتیں ہیں، لوگ اپنا پیار کرتے ہیں تو اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ وہ میرے نام سے کچھ بھی چھپے پڑھنا چاہتے ہیں لیکن تکلیف ایک بات کی ہوتی ہے کہ جو چھاپتے ہیں کیا وہ یہ سلیقہ بھی نہیں رکھ پاتے کہ ایک formal سی اجازت مجھ سے لے لیں اور جب کتاب چھپے تو اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دیں اور سب سے بڑی بات اس کا ترجمہ خراب نہ کریں۔ اگر ترجمہ خراب ہو تو ادیب کا پورا امیج خراب ہوتا ہے۔ تو مجھے یہ تکلیف ہوتی ہے کہ جو پانٹھکوں کے پاس امیج پہنچے گا وہ صحیح نہیں ہوگا۔ میں انھیں خود ترجمہ کروادوں، اجازت بھی دے دوں، پیسے کی بات نہیں ہے، جس پیار سے وہ چھاپتے ہیں لیکن اگر وہ اتنا رکھ پائیں کم از کم میری تسلی ہو، مجھے تکلیف تو نہ دینا چاہیں غلط ترجمے سے۔ جس ادیب کو چھاپتے ہیں اس کی طرف ان کا کیا حق بنتا ہے، اس کو تو ذرا سامنے رکھیں۔

سوال: امر تا جی آپ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور ناول بھی لکھے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ کی شاعری میں جو گہری ہے وہ ناولوں میں کچھ کم ہے، وہ آگ کچھ دہی دہی سی ہے یا یہ کہ ناولوں میں جذباتیت زیادہ ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کا جو اصلی کام ہے وہ آپ کی شاعری ہے اور ناولوں کی حیثیت ثانوی یا ضمنی ہے۔

امر تا پریم: میں ایسا نہیں سوچتی، میں سوچتی ہوں کہ کئی بار بڑی کیمنٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بات نظم میں نہیں کہہ پاتے کئی بار ایسا نظم لکھنے لگی اور وہ افسانہ لکھا گیا یا افسانہ لکھنے لگی تو نظم لکھ گئی تو پھر میں سوچتی ہوں کہ ایک وقت آتا ہے یہ جو میڈیا ہے forms of media of expression اور expression ان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ بات وہی ہوتی ہے، چاہے افسانے کی صورت میں کہی جائے یا نظم کی صورت میں کہی جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نظم میں شدت اس لیے زیادہ لگتی ہے کہ وہ بڑے کیمنٹس پر نہیں ہوتی۔ اس میں اتنا گڑھا پن ہوتا ہے، ایک نکتے پر سب کچھ سمٹ آتا ہے۔ اور افسانے میں اس کے perspectives بڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اب تو نظمیں چھپنے لگی ہیں کئی زبانوں میں حالاں کہ نظم ترجمہ نہیں ہو پاتی اچھی طرح لیکن جس نے مجھے جانا، افسانوں سے جانا، نثر سے جانا، نظم سے نہیں۔

سوال: آپ نے ذکر کیا تھا اس دعا کا کہ امر تا پریم نئی سچائیاں لکھنے کا حوصلہ رکھیں۔ آپ کی جس کتاب کے سچ نے لوگوں کو سب سے زیادہ حیران کیا وہ آپ کی آپ جی "رسیدی ٹکٹ" ہے۔ اپنے بارے میں اتنا



گہرا اور کڑوا جھ لکھتے ہوئے کیسا لگا؟ کیا یہ عمل تکلیف دہ ہوتا ہے؟

امرتا پریم: نہیں تکلیف نہیں ہوتی۔ میرے لیے وہ اتنا ہی اہل تھا۔ میں جو جیتی ہوں کہہ پاتی ہوں، جو کہتی ہوں وہ جیتی ہوں۔ اس میں فرق نہیں۔ اگر جینے کا آپ معیار اور رکھیں، کہنے کا اور رکھیں تو پھر تکلیف ہوتی ہے۔ میرے لیے ایک ہی بات ہے۔

سوال: آپ جیتی لکھنے سے بہت سے ادیب اس لیے گہرا تے ہیں کہ اپنے سچ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑتا ہے اور صرف دیکھنا ہی نہیں سب کو دکھانا بھی تو اپنی تمام نقابوں، گرہوں کو کھول کر برہنہ ہونا، اپنا آپ سب کے سامنے expose کرنا، اپنی آتما کی گہری اور نازک لرزشوں کو ساری دنیا کے سامنے بیان کرنا۔

امرتا پریم: جی ہاں، بالکل، یہ خیال آیا اور اسی میں، میں نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ میرا بچہ بہت چھوٹا تھا تو جس گھر میں ہم رہتے تھے وہاں تک بجلی نہیں پہنچتی تھی اس لیے ریڈیو نہیں تھا۔ جو مسائے تھے ان کے پاس بیٹری کا ریڈیو تھا تو جب میں شام کو جاتی تھی آل انڈیا ریڈیو میں اپنا پروگرام کرنے کے لیے، اناؤنس کرتی تھی پروگرام اور پیش کرتی تھی پروگرام تو اس وقت میرا چھوٹا سا بچہ مسایوں کے گھر میں جا کر سنتا تھا کہ میری ماما کی آواز ہے تو ایک دن اس کے بچے سے اس کی لڑائی ہو گئی اب وہ جان نہیں سکتا۔ میں جب واپس آئی تو مجھ سے کہنے لگا کہ مئی وعدہ کرو، میری ایک بات مانو گی، میں نے کہا بیٹے بتاؤ، میں مانوں گی۔ کہنے لگا، نہیں پہلے وعدہ کرو۔ وعدہ کیا تو اس نے کہا آپ سب کے ریڈیو پر بول لیجیے، بھولو کے ریڈیو پر مت بولے (ہنسی) لیکن مشکل یہ ہے کہ جب ادیب لکھتا ہے تو..... مجھے تو ساری زندگی کتنے ہی بھولو ہیں جن کے ریڈیو پر بولنا پڑا۔ یہی اس کا دوسرا پہلو ہے۔ تکلیف ہوتی ہے جب اسے سمجھ نہیں پاتے، اس کی پاکیزگی تک پہنچ نہیں پاتے، تو بہت سی ہلکی باتیں کرتے ہیں تو من کو تکلیف ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ صرف ان سے communication ہو جو اس بات کو سمجھ پائیں جن میں ایک wave length ہو لیکن جب کتاب ہوتی ہے تو wave length کی بات نہیں رہتی۔ وہ سب کے ہاتھ میں آتی ہے۔ اب ریڈیو پر تو کسی کا سوچ آف یا سوچ آن نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: اس کتاب کے جس حصے پر لوگ سب سے زیادہ چونکے وہ حصہ ہے جہاں آپ نے ساحر کا ذکر کیا ہے۔ اب ذاتی زندگی کی بات تو خیر الگ ہے لیکن جہاں تک ساحر کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے تو ساحر کی

شہرت میں بڑا زوال آیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ ان کے کلام پر جھومتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں خاصی کمی آگئی ہے۔ اس میں اب وہ بات نظر نہیں آتی جو اس وقت لوگوں کو نظر آتی تھی جو بات آپ کی شاعری میں اب بھی زندہ و تابندہ ہے تو ساحر کی اس شاعرانہ حیثیت کے زوال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کو یہ شاعری اب کیسی محسوس ہوتی ہے؟

امرتا پریتم: اس کے بارے میں میں کیا کہہ سکتی ہوں، جتنی ان کے پاس تھی، جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، انھوں نے کہہ دیا۔ جتنا بل تھا ان میں وہ دکھا دیا۔ مجھے یاد آتا ہے، ایک بار کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھی میری شاعری صرف teen agers کے لیے ہے، چلو کوئی بات نہیں teen agers پھر پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ تو ہوتے رہیں گے اور جب بھی ہوتے رہیں گے شاعری ان کی پسند کریں گے۔ وہ اصل میں فلموں میں جانے سے ان کا جو emotional side تھا وہ تو بہت آ پایا اور آج کی جسے جدید شاعری کہتے ہیں اس پر کچھ اور کہہ سکتے تھے۔ ان کے پاس طاقت تھی کہنے کے لیے لیکن شاید زندگی نے وقت نہیں دیا شاید ان کی توجہ شاعری کی طرف نہیں گئی جتنی فلم کی طرف ہوئی۔

سوال: امرتاجی اگر آپ بہت ذاتی سوال نہ سمجھیں تو یہ بتائیے کہ اب آپ چھپے مڑ کر دیکھتی ہیں تو آپ کو ساحر کیسے لگتے ہیں؟

امرتا پریتم: ساحر مجھے ایک بہت اچھے انسان لگتے ہیں، emotional، جذباتی اور خاموش۔ ایک ان میں خاص طرح کا سلیقہ تھا خاموشی کا، جو خاموشی کی آواز تھی وہ آج کے لوگوں میں نہیں ملتی یہ ان کی بڑی بات تھی۔ لیکن یہ ضرور لگتا ہے کہ اگر مجھے زندگی پھر سے جینے کو ملے پھر سے کوئی سامنے چناؤ ہو تو زندگی امروز کے ساتھ گزاروں گی بہت کچھ میں نے امروز سے پایا ہے۔

سوال: امرتاجی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ عمر کے مختلف مرحلوں میں آدمی کی جذباتی سطحیں بدلتی رہتی ہیں اور

ان کے حوالے سے اس کے responses.....

امرتا پریتم: جی ہاں بالکل بدلتی رہتی ہیں اور اس میں جس طرح گہرائی آتی ہے اس طرح سے اس کی تلاش بدلتی ہے۔

سوال: آپ کی تلاش کس طرح سے بدلتی ہے؟ جس وقت آپ نے لکھنا شروع کیا تھا ۲۰۰۳ء کی دہائی میں، اس سے لے کر جو ایک لمبا سفر آپ نے طے کیا، اس میں آپ کی تلاش کی دشائیں کیا رہی ہیں؟

امرتا پرتم: اصل میں یوں سمجھیے کہ ساحر کو اتنی شدت سے سوچ پانا میرے اپنے خیالوں کا جادو تھا اور ایسے جادو انسان نئی بار بنتا ہے، پھر اس میں خود ہی لپٹ جاتا ہے کچھ اس طرح تھا کیوں کہ سب کچھ میں تھا، تصور میں تھا، تخیل میں تھا۔ زندگی کی حقیقت میں تو نہیں تھا۔ زندگی کی حقیقت میں بھی وہ قائم رہ پائے یہ تو میں دیکھ نہیں پائی وہاں لیکن امروز کے ساتھ دیکھا کہ شدت زندگی کی حقیقت کس طرح بنتی ہے۔

سوال: بعض زندگیوں میں شدت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ شدت سارا ثقافت کی زندگی میں بھی تھی، آپ نے اس شاعرہ کا ذکر کیا اور اس حوالے سے بھی اسے شہرت ملی اردو کے بہت سے نقاد اسے اچھی شاعرہ نہیں سمجھتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ آپ نے اس کا اتنا ذکر کیوں کیا، اس کی شاعری کو quote کیوں کیا؟

امرتا پرتم: میں تو اب بھی quote کرتی ہوں۔

سوال: آپ کو سارا ثقافت کی شاعری مختلف کس وجہ سے محسوس ہوتی ہے؟

امرتا پرتم: میرا خیال ہے کہ سارا ثقافت جو کہہ پائی ہے اپنی شاعری میں وہ بڑے بڑے شاعر نہیں کہہ پائے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے دلی میں کچرل فینسیول ہوا تھا۔ ایک مہینے چلتا رہا۔ وہاں ایک دن مشاعرہ تھا۔ آپ تو جانتے ہیں آپ کے حالات کیسے ہیں، ہمارے حالات کیسے ہیں، مذہب کے نام پر کتنا جو ظلم ہو رہا ہے تو وہاں میں نے سارا کی ایک لائن سے اپنی نظم شروع کی تھی اس کا نام لے کر، اس کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اگر میں مسجد میں دعا مانگتی ہوں تو مندر روٹھ جاتے ہیں، تو میں سوچتی ہوں کہ اس وقت جو ہاں تھا وہ اس قدر کھل گیا تھا۔ ایک تو ہم اس دور سے گزر رہے ہیں اور کوئی شاعر اس طرح کہہ پایا ہے جیسے سارا نے کہا ہے کہ کیا عورت کا بدن سے زیادہ وطن نہیں ہے اس کے پیچھے ہماری کتنی صدیاں کھڑی ہیں اس ایک لائن کے پیچھے یا جس طرح وہ کہتی ہے خدایا میں بہت کڑی ہوں لیکن تیری شراب ہوں، کون کہہ پایا ہے یہ؟

سوال: شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے سارا ثقافت کی زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھا کیوں کہ وہ آپ کو ایک طرح سے اپنی نرومانی تھی تو زندگی کرنے کا جو اس کا انداز تھا وہ آپ کو کیسا لگتا تھا؟

امرتا پرتم: مجھے لگا کہ وقت اسے سنبھال نہیں پایا۔ پہلے بھی لگا اور واقعہ ایسا ہوا کہ وقت اسے نہ سمجھ پایا نہ سنبھال پایا۔ میں نے تو ابھی پوری کتاب لکھی ہے سارا کی زندگی پر اور شاعری پر اس کا نام ہے "ایک تھی سارا" اس کے بہت سے جیسے اخباروں میں بھی آئے، ہندی میں بھی آئے، انگریزی میں بھی آئے، تو چاہتی ہوں کہ وہ کتاب آپ کے سامنے بھی آئے اور دوسرے لوگوں کے سامنے۔ دوسرے ملکوں میں انگریزی کے

میڈیم سے بھی آئے۔ اس کا ایک حصہ جہاں سے میں نے کتاب شروع کی ہے، آپ کہیں تو کتاب میں سے پڑھ کر آپ کے سامنے رکھ دوں؟

سوال: جی ہاں ضرور۔

امر تا پرہیزم: (پڑھتے ہوئے) میں نے آسمان سے ایک تار ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ بہت تیزی سے آسمان کے ذہن میں ایک جلتی ہوئی لکیر کھینچتا ہوا۔ لوگ کہتے ہیں تو جی ہی کہتے ہوں گے کہ انھوں نے کئی بار ٹوٹے ہوئے تاروں کی گرم راکھ زمین پر گرتے ہوئے دیکھی ہے۔ میں نے بھی اس تارے کی گرم راکھ اپنے دل کے آگن میں برستے ہوئے دیکھی ہے۔ جس طرح اور تاروں کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح جو تار میں نے ٹوٹتے ہوئے دیکھا اس کا بھی ایک نام تھا: سارا شکفتہ۔ اس تارے کے ٹوٹنے سے آسمان کے ذہن میں جو ایک لمبی اور جلتی ہوئی لکیر کھینچ گئی تھی وہ لکیر سارا شکفتہ کی نظم تھی۔ نظم زمین پر گری تو خدا جانے اس کے کتنے ٹکڑے ہوا میں کھو گئے لیکن جو راکھ میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھی اس میں کتنے ہی جلتے ہوئے اکثر تھے جو میں نے اٹھا اٹھا کر کاغذوں پر رکھ لئے۔ نہیں جانتی کہ خدا نے ان کاغذوں کو ایسا شراب کیوں دیا ہے کہ آپ ان پر کتنے ہی جلتے ہوئے اکثر رکھ دیں وہ کاغذ نہیں جلتے، جن لوگوں کے پاس احساس ہے جلتے ہوئے اکثر کو پڑھتے ہوئے ان کے احساس سلگنے لگتے ہیں پر کوئی کاغذ نہیں جلتا۔ شاید یہ شراب نہیں ہے۔ ہے بھی تو اسے شراب نہیں کہنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو خدا جانے کتنی ہی دنیا کی کتابیں اپنے اکثروں کی آگ سے جل گئی ہوتیں۔

سوال: تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ سارا کے اکثروں میں بھی ایسی آگ تھی اور اسی آگ نے اسے جلا ڈالا۔ امر تا پرہیزم: اسے تو اکثروں کی آگ نے نہیں جلا یا۔ اسے تو وقت نے جو اسے پہچان نہیں پایا، اس نے جلا یا۔ اب اسی کے جو الگ الگ chapters ہیں، ان کے نام ہیں: مینا بازار، جھانچھر کی موت، چنگاریوں کا مقدر، انسانی کتاب کی آرزو، گجرے کے تین پھول، ایک اور اینٹ، خدا کی گلی، ننگا سورج، ایک چیخ کا اتہاس، ضمیر کا زہر، چوڑیوں کا قہقہہ، زخموں کی گواہی، حوا کا خط آدم کے نام، جلتی بجھتی عورت، ان میں یہ ساری باتیں تفصیل سے آئی ہیں۔

سوال: ابھی آپ نے بتایا کہ آپ نے سارا کی کوئی لائن ایک جلمے میں پڑھی جہاں کچھ سیاست اور مذہب کا بھی ذکر تھا تو یہ جو آپ کے دلس میں آج کل violence ہو رہی ہے، اس کے بارے میں آپ کیا محسوس

کرتی ہیں؟ کیا آج پنجاب کے لیے ایک بار پھر وارث شاہ کو پکارنے کی ضرورت ہے جیسے آپ نے ۴۷ء میں پکارا تھا؟

امرتا پریتم: اصل میں آج کا وارث شاہ تو انسان کی وہ evolution ہے، جو نہیں ہو پائی۔ ابھی دسمبر میں...

سوال: میں سمجھانیں، اس بات کی وضاحت کریں گی آپ؟

امرتا پریتم: یہی کہ انسان کی evolution نہیں ہو پائی۔ انسان چھوٹا ہے اور جو منفی طاقتیں ہیں وہ بڑی ہیں۔ ابھی یونیسکو کی کانفرنس تھی دسمبر میں پیرس میں، وہاں میں نے ایک سپر پڑھنا تھا دنیا میں امن کے لیے، تو یہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ تو وہاں بھی ایک نکتہ اٹھایا جس پر وہ سپر base کیا، وہ تھا کہ ہم جب تک سائنس اور spirituality کو اکٹھا نہیں کر پاتے تب تک یہ ہنگامے چلتے رہیں گے، جنگ کا خطرہ بھی رہے گا کیوں کہ جنگ کا خطرہ جن باتوں سے شروع ہوتا ہے وہ ہماری روزمرہ زندگی میں ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت ہے، حسد ہے، انتقام ہے۔ آج یہاں دلی میں ایک کانفرنس شروع ہوئی ہے اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کی اور سے تو وہاں مجھے ایک بات بہت خوب صورت لگی، راجیو گاندھی نے کہی کہ میں گاؤں میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں اور کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ یہ جو تہذیب ہے کیا ان لوگوں کے پاس ہم سے زیادہ ہے جنہوں نے بالکل کچھ علم حاصل نہیں کیا اور آج تہذیب کے نام پر ہمارے پاس جو کچھ ہے اس میں کتنی منفی طاقتیں شامل ہوئی ہیں؟ ہاں ایک بات جس کا میں ذکر کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ مذہب کے نام پر ہم پوری دنیا کے انسان سے محبت نہیں کرتے اس کے ایک ٹکڑے کو محبت کرتے ہیں۔ ایک فرقے کو محبت کرتے ہیں ایک حصے کو محبت کرتے ہیں باقی حصہ جو چھوٹ جاتا ہے اس سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد امن کیسے ہوگا۔ جب تک ہم پورے انسان کو الگ الگ نقطہ نظر رکھتے ہوئے بھی، الگ الگ رسم و رواج رکھتے ہوئے بھی، الگ الگ جو باہر کی formalities ہیں وہ رکھتے ہوئے بھی اعتبار نہیں کریں گے کام کیسے چلے گا، تو ہم جو بٹ گئے ہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس کا مطلب ہے کہ جو انسانیت ہے اس کے ایک ٹکڑے کو انسان سمجھ رہے ہیں، الگ الگ ٹکڑوں میں اگر انسانیت کو بانٹ دیں گے تو اس کی بات کیسے کریں گے؟

سوال: اس ٹکڑوں میں بنی ہوئی انسانیت کو جسے راج نعتی نے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جوڑنے کا کام تو کوئی ہی کر سکتی ہے، کوئی اور ساتھ۔

امرتا پر تیم: ضرور کر سکتے ہیں لیکن وہ سادہ سا بھی کتنے ہیں آج کے وقت میں؟ وہ دنیا کو اتنا دینا نہیں چاہتے جتنا دنیا سے لینا چاہتے ہیں۔ شہرت کے نام پر، پیسے کے نام پر، یہ بہت بڑے ہتھیار ہیں، شہرت بھی بڑا ہتھیار ہے، طاقت بھی، دولت بھی، پیسہ بھی لیکن اگر انسان کے ہاتھ چھوٹے ہوں تو وہ بڑے ہتھیاروں کو کیسے استعمال کرے گا۔ ہاتھ تو کٹ جائیں گے۔ تو ہاتھوں کو بڑا کرنے کے لیے میرا جو سوال تھا، جو میں نے کانفرنس میں پوچھا تھا کہ سائنس بہت بڑی طاقت ہے لیکن سائنس کو استعمال کرنے والے جو ہاتھ ہیں ان میں جب تک spirituality نہیں ہوگی وہ discriminate نہیں کر پائیں گے تو سائنس کا غلط استعمال ہوگا۔

سوال: امرتائی، پاکستان میں جو آپ کے چاہنے والے اور پڑھنے والے ہیں ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گی۔

امرتا پر تیم: یہی جو میں یہاں کئی بار کہتی ہوں کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک جو اکثروں کو پیار کرتے ہیں اور ایک جو اکثروں کا بیوہ پار کرتے ہیں۔ تو ہم اکثروں کو پیار کرنے والوں کی زندگی بڑھاتے چلے جائیں اور مذہب کے نقطہ نظر کو اتنا وسیع کریں کہ وہ روحانیت کی منزل کو چھو جائے۔ روحانیت ایک ہی ہوتی ہے، مذہب کوئی بھی ہو اور یہ روحانیت محبت کرنا سکھاتی ہے نفرت نہیں۔

☆☆☆☆



## حدیثِ دل

امرتا اس منی سے بنی ہوئی ہے جس سے روحانی باغیوں کا خیر اٹھتا ہے۔ ایک تنہا بچپن ایک کرب زدہ نوجوانی اور پھر شدید جذباتی جھکڑوں سے مرتعش دل کی سوانیت ایک شاعرہ اور ناول نگار کی حیثیت سے امرتا پر ہم ان تمام تجربات کو سن و سمن صفحہ قرطاس پر اتارنے میں اعتقاد رکھتی ہے جو اسے پیش آئے۔ وہ زندگی کے لیے شدید جذبات کے گہرے رنگوں میں سر سے پیر تک سرشار ہے۔ ایک عجب سا کرب ہر دم اس کے وجود کا احاطہ کرتے رہتا ہے۔ اور جب بھی کرب پھیلے ہوئے لاوے کی طرح اس کی تحریروں میں اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہے تو دل کا درد راؤ پر کو تھمتا ہے۔ مگر پھر دوبارہ سراٹھاتا ہے 'فرسودہ اور مذہبی بنیاد پرستی پر اس کے کھلے ہوئے بے لاگ تنقیدی نظریات کی وجہ سے اس پر غیر شائستہ ہونے کی مہر ثبت کی جاتی ہے۔ اس کی چھٹی ہوئی دیانت کی وجہ سے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بے نیاز امرتا کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب کی طرح ہے جس میں صداقتوں کی خوبصورتی ہے۔

اس کی خودنوشت سوانح "رسیدی ٹکٹ" اور "امرتا کی زندگی اور اس کا عہد" ایسی کتابیں ہیں کہ جن کے جھروکے سے آپ اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے کس آدمی سے پیار کیا کیسے کیسے خواب دیکھے کون کون سی خواہشوں کی آگ میں اندری اندر سلتی رہی۔ 75 (پچھتر) کتابوں کی مصنفہ امرتا کو جینا پتہ اور سہایتہ جیسی قابل احترام اکیڈمیوں کی طرف سے ایوارڈوں سے نوازا جا چکا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی ڈگریاں بھی دی ہیں۔ مگر ان تمام اعزازات کے باوجود ایک درد ہے کہ تھمتا ہی نہیں۔ تب وہ شام کے دھند لکے میں دوبارہ اپنا قلم اٹھاتی ہے اور اپنے اس انجانے خلا کو بھرنے کے لیے اُسی شدت سے پھر لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سکون باہر کی دنیا سے ملنے والے ان اعترافی اعزازات

میں نہیں۔ روحانی خلا کی اس گہری خندق کو بھرنے کے لیے تخلیقی اظہار کی ضرورت ہے۔ ستر اچوہدہری کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس نے کیے کی یہ اسی کی زبانی ہے:

### ایک فنکار ہونے کے ناتے ادیب کا منصب

ادیب وہ ہے کہ جو اپنی زندگی اور اپنی تحریر کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات کی تمام ممکنات کی کھوج لگاتا ہے اور پھر وہ اسے معاشرے کو دے دیتا ہے۔ وہ دینے والوں میں سے ہے۔ ہم سب لوگ جسمانی سطح پر زندہ ہیں۔ جب تک ہم جسمانی 'ذہنی اور روحانی طاقت کو سنبھال نہیں کرتے ہماری نجات ممکن نہیں۔ خاص طور پر ایک ادیب کے لیے اپنے وجود کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور مطابقت کا امتزاج بہت ضروری ہے۔ اسے باطنی شکر کے ساتھ ہی پھلنے پھولنے اور پختہ ہونے کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنی زندگی میں اس امر کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔ مکمل ہم آہنگی اور مطابقت کی اس خوبصورتی کا ابلاغ ضروری ہے۔ تجربے اور اس کے اظہار کے مابین اتحاد و تفاوت نہ ہو۔ زندگی کلی طور پر برتنے کی چیز ہے جزوی طور پر نہیں۔

### فن اور اخلاقیات

مادیت پرستی کے اس دور میں فن کے نام پر عامیانا سوچ اور سکیئنڈلز کی دلالت کی جا رہی ہے۔ ایسے ہی جیسے مذہب کی آڑ میں لوگ قتل و غارت اور تشدد کی دلالت کرتے ہیں۔ یہ مایوس کن اور خطرناک رجحان ہے۔ جنس بذات خود ایک بہت خوبصورت چیز ہے۔ مگر کسی تحریر میں اس وقت عامیانا دور عریاں نظر آتی ہے جب خود لکھنے والے کے کچھ "در پردہ عزائم" ہوتے ہیں۔ کتاب اپنے مقصد کا اظہار ایسے کرتی ہے جیسے پھول اپنی مہک سے۔ روح کی مہک اپنا تعارف خود ہوتی ہے۔ کسی فن پارے کو تخلیق کرتے ہوئے اگر ادیب خود اپنی "اعلیٰ ذہنی کیفیت" میں لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کا قاری ایک "اعلیٰ ذہنی تجربے" سے گزرتا ہے تو پھر عریانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ادیب کا نصب العین یہ ہے کہ اس کی تحریریں اس کی ذات کا مظہر ہوں۔ مگر اس امر پر وہ کتنا قادر ہے اس کا فیصلہ اس کی تحریر ہی کر سکتی ہے۔

### مذہب



میں مذہب اور دھرم کو الگ الگ سمجھتی ہوں۔ دھرم نام ہے روحانیت کا اور مذہب روحانیت کو ایک آئینی ادارے میں ڈھالنے کا۔ خدا کسی خارجی طاقت کا نام نہیں وہ آپ کے وجود کا حصہ ہے۔ میں اس بات کی قائل ہوں کہ خدا باطن میں موجود ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ہر خوبصورت چیز میں خدا ہے۔

## آزادی

خود اور مرد کے لیے ہو یا عورت کے لیے کلی اور قطعی آزادی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔ جہاں ایک سطح پر عورت کا استحصال کیا جا رہا ہے وہاں ایک اور سطح پر مرد کا استحصال بھی ہو رہا ہے۔ آزادی کسی خارجی شے کا نام نہیں۔ یہ خود اپنے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت کے استخراج کا نام ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اسے خود اپنے آپ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

## ہم عصر ادیب خواتین

آج کی ادیب عورت کے پاس بہت آگہی ہے۔ شعور ہے جو اس کی تحریروں میں منعکس ہوتا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت یاد آ رہی ہے کہ جس کے بارے میں میں نے "ایک تھی سارہ" ناول لکھا تھا۔ سارہ شگفتہ (30) تیس سالہ پاکستانی شاعرہ تھی۔ جسے میں اس حوالے سے ایک مثال تصور کرتی ہوں۔ وہ اپنی نظمیں مجھے بھیجا کرتی تھی، کیونکہ خود اس کے ملک میں انہیں شائع نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں محض دو مرتبہ اسے ملی تھی۔ پھر 1984 میں اس نے خود کشی کر لی۔ وہ بے انتہا شعور کی مالک تھی اور یہ معاشرہ یقیناً ایسی عورت کا مستحق ہونے کے بل ہی نہ تھا۔ میں نے اس کی نظموں اور دو ملاقاتوں کی بنیاد پر یہ ناول لکھا۔

## اپنے شہر کی بات

دہلی تقسیم کے وقت سے میرا شہر ہے بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس شہر کی تاریخ بالکل میری ہی طرح ہے۔ مختلف حکمرانوں کی عنایت سے "یہ نگر سومرتبہ لانا گیا" مگر ہر مرتبہ از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر سے پھسلنے پھوٹنے کے لیے۔ بالکل اسی طرح میں بہت سی چیزوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنے آپ کو ایک کھنڈر کی طرح محسوس کرتی ہوں مگر پھر میری اندرونی طاقت میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیتی ہے۔

## راجہ سجا کی رکن ہونے کی حیثیت سے

میں راجہ سجا کی رکن ہونے اور اپنے ادیب ہونے کو کوئی الگ الگ بات نہیں سمجھتی اور میں ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں پاتی۔ جس طرح سے میں اپنا مافی الضمیر اپنی تحریروں کی دساعت سے بیان کرتی ہوں اسی طرح یہی کردار ایوان میں سوالات کر کے ادا کرتی ہوں۔ لیکن سیاست میں کچھ چیزیں مجھے افسردہ بھی کر دیتی ہیں۔ جیسے حزب اختلاف کا کردار۔ کئی مرتبہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حزب اختلاف کے ارکان کسی بل پر بحث کرتے ہوئے مخالفت برائے مخالفت کر رہے ہیں۔ گواہی اقتدار کی مخالفت ایک مستحسن عمل ہے مگر ان باتوں کی بھی مخالفت کرنا کہ جو قوم کے مفاد میں ہوں۔ کچھ قریب مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔

## غیر مطبوعہ تخلیقات

خواب میرے نزدیک بہت اہم ہیں۔ ایک کتاب جس کی بنیاد میرے خوابوں پر ہے بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔ اس کا نام ”لال دھاگے کا رشتہ“ ہے۔ میں نے یہ نام جاپانی فلسفے سے لیا ہے۔ ایک جاپانی راہب تھا۔ جس نے اپنے فلسفے میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ بچہ پیدائش کے عمل کے بعد ماں سے جسمانی طور پر جدا ہو جاتا ہے۔ مگر ذہنی طور پر وہ اس سے جڑا رہتا ہے۔ اس طرح سے ہم سب ذہنی طور پر لامکاں کی کائناتی طاقت سے ہمیشہ منسلک رہتے ہیں اور ہمارے خواب اس تعلق کے مظہر ہوتے ہیں۔ میں بہت دفعہ خوابوں میں اپنے پیچھے جہنم کی جھلکیاں دیکھتی ہوں اور اسی حالت میں نظمیں بھی کہتی ہوں اور پھر جیسے ہی جاگتی ہوں انہیں فوراً کاغذ پر لکھ لیتی ہوں ”لال دھاگے کا رشتہ“ میں میں نے لامکاں سے تعلق اور اپنے خوابوں سے اس کے رشتے کی بات کی ہے۔

## قاری اور ادیب کا رشتہ

ادیب کے محسوسات کا مکمل ابلاغ ایک خوش آئند چیز ہے۔ ادیب اپنے پڑھنے والوں کو اپنی زرخیزی طبع میں شریک کرتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ قاری کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھتا وہ صرف اسے شریک کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے ہمدردیوں کی توقع بھی نہیں رکھتا اور نہ اپنی رائے ان پر ٹھونکتا ہے۔ اس کی تحریروں اس کے اندر رکھلے ہوئے گلزار کی طرح ہوتی ہیں۔ جس کے پھولوں کی مہک وہ ہر طرف پھیلاتا ہے۔ قاری اہم ہے مگر اس سے زیادہ اہم وہ باطنی تسکین ہے کہ جو مکمل ابلاغ سے ادیب کو حاصل ہوتی ہے۔ دولت شہرت طاقت اور

شناخت وہ ہتھیار ہیں جن سے لوگ اپنی تشبیہ تراشتے ہیں اس پر نقاشی کرتے ہیں لیکن اگر ان ہتھیاروں کو  
 سنبھالنے کی صلاحیت نہ ہو تو معاملہ اس کے برعکس ہو سکتا ہے اور خود اپنا ہی مُت پاش پاش ہو سکتا ہے۔ لوگ اپنی  
 ظاہری شبیہ پر بہت توجہ دیتے ہیں مگر میں اپنی باطنی شبیہ کو زیادہ اہم سمجھتی ہوں کئی مرتبہ میری یہ شبیہ مجھے  
 کچھ مایوس بھی کر دیتی ہے۔ مگر میں اسے بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتی ہوں اور اس کے لیے حوصلہ بھی مجھے  
 اپنے ہی باطن سے ملتا ہے۔

جب میں اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرا کوئی ایک بھی ایسا تجربہ نہیں ہے  
 جس پر اب مجھے پچھتاوا ہو۔ بقول فیض

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت  
 میری شخصیت جو اس وقت ہے اس کی تطہیر کے لیے ہر تجربہ اپنی اپنی جگہ انتہائی ضروری تھا۔

☆☆☆☆

The  
The  
With  
You

## ایک مکالمہ

The  
The  
For th  
You

گلزار: 'چاند پتھر' کا میری نئی کتاب، آپ کے لیے

امر: اچھی چھپی ہے، نظمیں بھی اچھی ہوں گی۔

گلزار: آپ جیسی تو نہیں ہیں۔ ہم تو سیکھتے ہیں آپ سے۔

What  
The h  
Drank  
You d

امر: میرے سے۔۔۔۔۔ ایک شیو جی کا بیاہ ہو رہا تھا تو پنڈت جی کہنے لگے کہ تمہارے باپ کا

نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا، 'وشنو' تو وہ بولے 'وشنو' کے باپ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا 'برہما' تو وہ بولے 'برہما'

نے باپ کا نام کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا 'میں'۔۔۔ تو کون کس سے سیکھتا ہے؟

گلزار: جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا کالج کے زمانے میں تو ہم آپ کی طرف دیکھا کرتے

تھے۔ اچھی تشبیہ، اچھے استعارے اور اچھی شاعری کے لیے تو پہلے اور دوسرے باپ کا نام تو یاد ہے، اس سے

آگے کا یاد نہیں ہے۔

☆☆☆☆

**Amrita Pritam**

Translated by: Hamza Hassan Sheikh

## **You Didn't Come**

The corses conjured  
The lips sweetened  
With breeze of forest  
You didn't come.

The redness of groves touched  
The flowers wore the silk  
For the fare of colours  
You didn't come.

What did the sky say?  
The heated clay too  
Drank the drop of blessing  
You didn't come.

How ■ this night?  
That in the palace of life  
The lamp of separation is,  
Still burning  
You didn't come.

**Amrita Pritam**

Translated by: Hamza Hassan Sheikh

## **Amrita Pritam**

There was a pain.  
Like ■ cigarette,  
I smoked silently.  
Some poems  
I knocked off,  
From cigarette  
Like the ashes.

claim the feelings of love. She will always glitter on the sky of love and her name will be adorned in the canopy of literature like a bride.

Somehow I always felt that Imroz would have become very sad after Amrita's death. He turned and said, "Why be sad? What I could not do, Nature did."

Her story cannot be completed with out the name of Sahir Ludhianvi. She was involved with him when she asked her husband for divorce. But Sahir then had ■ new woman in his life. Amrita grew closer to Imroz, whom she had known for many years and they were together for the rest of her life. Sahir remained a bachelor all his life; he had two failed love affairs with Amrita and ■ singer/actress Sudha Malhotra. These relationships could not be changed into marriage because these women's fathers refused to let them married to a Muslim. His relationship with Amrita Pritam was so passionate, that at one time while attending ■ press conference, Amrita wrote his name hundreds of times on a sheet of paper.

At the age of 16, the year she married Pritam Singh, an editor to whom she was engaged in early childhood, and changed her name to Amrita Pritam. After her divorce in 1960, her work became more clearly feminist. She worked until 1961 for All India Radio. A number of her works have been translated into English, French, Danish, Japanese and other languages from Punjabi and Urdu, including her autobiographical works Black Rose and Revenue Stamp (Raseedi Ticket in Punjabi). She died in her sleep on 31st October 2005 at the age of 86 years in New Dehli after a long illness. She survived by her partner Imroz, daughter- Kandlla; son-Navraj; daughter-in-law-Alka and her grandchildren-Tauras, Noor, Aman and Shilpi.

Though she is no more ■ this world but shadow of her love will always remain in this world. Her words will always



Love is a word which carries the depths of oceans. Ironically in societies that worship norms, love when it actually happens violating social system is still ■ four letter word.

Amrita is considered as a rebel poetess who remained faithful with her inner love for her whole life. She has created an excitement in the society when she decided to spend her life with her lover Imroz who was a painter and much younger than her. They lived together for 50 years, without marrying, under the same roof but in the separate rooms. They believed that in ■ true relationship, no law is needed. Law is made for irresponsible people.

Amrita says, "We never said, I love you" to each other because love is never claiming with tongue but it is taking care of small things for each other. When we decided to live with each other in the early 1950s, we didn't let anyone interfere with our decision. I told her, "You are my society. I am your society and why do you call it living? Aren't others living in relations?" As far ■ Sahir is concerned, he never asked her to come to him. If he had, she would have gone. And I would have respected her decision," says Imroz, forever smiling.

Imroz was ■ shadow, ■ dedicated friend, a lover and a humble in most ways. Egoless, self-assuming, a heart full of worship.....a love that is any woman's dream.

"What do you like most of Amrita?" Someone asked.

"Her presence." He replied.

When Amrita's body was being consumed by fire, one is introduced to ■ stoic Imroz deeply in love still but detached.

"At the end of the deserted cremation ground, a few people were standing, silently staring at the burning pyre. Away from everybody, alone, standing in ■ corner, was Imroz.

that as she is sharing the sorrows of her character as well as soothing their hearts ■ a grief-sharer.

She has penned many poems on Indo-Pak partition. The afraid and terrified faces became the titles of her poems all those characters who were shedding blood and on the other side others were seeking their way among the beasts for their safety. Her poems echo like the cries of poor. Though she composes the pain of her own but that becomes the representative of whole humanity. Her most famous poem "Aj Aakhan Waris Shah Nun" draws the feelings of many daughters of Punjab, Few lines are as;

Today, I call Waris Shah  
Speak from the grave  
Today, turn over the page  
Of love's book again.

Once, a daughter of Punjab groaned  
And you composed a lament  
Now millions of daughters  
Of this land sob.

Rise, O' narrator of miseries  
Look at your Punjab  
There are corpses all around  
And Chenab is filled with blood.

Whether she composes the poem or pens the story, in both the love and pain remain as a natural feelings perhaps that appears as the representative of her own inner feelings.

## Amrita Pritam: A Woman or Aphrodite

The deep emotions, the shadows of pain, the pang of separation and the songs of lovers, all these can be felt by any loving soul in the writing of Amrita Pritam. Her poems represent the rippling wave of pain and the short stories overshadow the social problems.

Her characters are vivid and full of emotions like herself. She portrays the life of village and farmers, labourer and the people belonging to lower class are among her characters which are true in emotions, faithful in love and the transparent in their passion. She writes the woeful feelings of dispirited souls with the feather of wounded bird and ink of blood. She feels the emotions of sad hearts and composes those in melancholy lines. She has penned small social topics in between her poems and short stories. Her famous short story "Ik Seeti Mar Mitra" is full of colourful emotions which abide in the deep core of every human. Dev Uncle of "Pardesi" and Karmanwali of "Karmanwali" show the pure characters of the society which are true in their principals of life as well as ignorant of the modern tricks. She talks about humanity boundless and borderless. Her pen doesn't know any kind of differences but shares the pains of every distressed heart.

The rhythm in her stories doesn't allow the reader to leave it incomplete. There is a flow in her story depth in her words and the true emotions in her characters. Her writings show a journey of struggle, love and pains which remain with her from early childhood till her end. After reading her stories it seems

On my visit to Pakistan whenever I pass through Gujranwala, the figure of Amrita jee conjures up in my mind and reminds me the tragic exodus that took place in the wake of partitioning humans. Her main theme for the promotion of Indo-Pak peace, her message of progressivism, secularism and humanism is ■ beacon light for us to determine our directions towards the salvation of humanity. The present generation has to emulate principles set by her. This is the message on her fourth death anniversary.

Dr Fatima Hussein

## **Amrita Pritam: The Doyen of Punjabi Literature**

I have never met Amrita Pritam personally though I had always wanted to. I knew her through her poetry and novels mainly. As a writer, she was simply par excellence. The images, metaphors, similes and in fact the entire sensibility of her writings was rooted in the traditions and cultural ethos of the land of five rivers. Her famous poem 'Aj Akhan Waris Shah Noon' spoke pathetically of the human tragedy with all its carnage and vandalism that hardly any body can suppress his tears after going through it. Her later poetry is more inclined towards existentialism and that's why she came under the influence of Mahatma near the fag end of her life. Her autobiography Raseedi Ticket is one of the most frank accounts of one's life that any writer has penned. Her novel Pinjar also deals with the trauma of partition and its characters are so living that the entire holocaust unfolds with a note of deep pathos.

I saw a movie, sometimes back and found it very moving. In fact, after watching this movie, my desire to meet her, increased. Many times, I passed by her Hauz Khas residence but could not meet her.

Amrita Pritam was a symbol of secularism. She was great protagonist of women empowerment and struggled for it when she was the member of Rajya Sabha. She is perhaps, one of the few Indian writers who have got highest civil awards in India and honoured universally.

age was very troublesome. Her two-hour surgery took five hours. When she returned home, she hoped to walk again but her foot started aching again after a few days so she spent rest of her life on the bed as sitting or walking had become impossible for her because her body and bones were not strong enough for further surgery.

Although she did not need any award, we announced to confer on her Lifetime Achievement Award from the World Punjabi Congress in 2003 as a gesture. We got prepared a shield and Mehmood Butt, a great painter, drew her picture. At the awards ceremony, the Punjabi writers, poets and intellectuals paid rich tributes to Amrita Ji. A documentary on Amrita Ji, produced by Basu Bhattacharya, was also screened on the occasion. When I informed her on telephone about the award, Amrita Ji said it was a real pleasure for her because it was to be given to her in Pakistan but also she could not visit the place where she was born, grew up, got married and gave birth to her two children (her daughter Kundlan and son Noraj were born in Lahore) and where she spent 28 years of her life.

I will always be lamenting that Amrita Ji could not visit Pakistan, where I wanted to arrange a welcome for her in accordance with her status and prominence. She never promised to visit Lahore in spite of my repeated insistence and always used to say: "Well, I will see and will come if I felt to be in a good health." But she did not visit Lahore and I will never be able to forget it.



a Hindi book in which a whole chapter was written on me. She also wrote a few articles in English language on me. All this is an honour for me. Indeed, she was an extremely good person, a great human being, large hearted, promoter of peace, messenger of love and very enlightened woman having progressive views.

Throughout her life, Amrita Ji violated disciplines and revolted against traditions and this was the reason that she achieved great successes in her life. She got a good friend and life partner as Imroz. She first met him in 1955 and they befriended in 1960 before becoming life partners in 1964. They jointly launched Punjabi monthly 'Naag Mani' and established a publication house. This journal was launched in 1966 and closed in 2004. Amrita Ji used to select material for the journal while Imroz was responsible for proofreading and sketch drawing. This magazine of high quality has been very popular and created a group that has been producing a fine literature.

Amrita Ji encouraged good writers and used to praise their writings. She never wrote foreword or preface of every book for her publicity.

When I invited her to visit Pakistan, she said her health was no good enough and would definitely visit Pakistan whenever she got an opportunity. It has always been my passionate desire to see her in Pakistan. Whenever I telephoned her, she attended it and talked to me affectionately. Whether I have been in Pakistan or abroad, I used to make her ■ telephone call once a week to enquire about her well being.

When Amrita Pritam slipped in bathroom in February 2000 and got a bone fracture, she was 81 and bone fracture at this

Zaman in the darkness of today, ■ all have come with the same fire in our hearts to welcome him."

It was a great honour for me, who was already taking pride in sitting on the stage with a personality like Amrita Ji.

I also went around Delhi along with Imroz and Amrita Ji. We used to sit together in the evenings and our conversation covered some books, her recitation of any new poem on my insistence and expression of her experiences and observations about Sufis, rishis and dervishes. She showed two documentaries on herself that were made beautifully. I spent three days there just like my own home, just like one stays with his parents. Amrita Ji used to prepare lunch, Imroz placed food at table and prepared tea and sometimes I lent them a helping hand.

When I mentioned that she was not writing Punjabi poetry and had started writing in Hindi, she said she had not written a lot of poetry and did so when felt to do so otherwise she did not make any conscious effort to pen down a poem. She said there is a large readership of Hindi, therefore, it was necessary to write in Hindi.

Amrita Pritam received honorary D Lit degree from the Punjab University in 1987 and the French Government also awarded her an honorary degree the same year, while she received an honorary doctorate from the SNDT University of Bombay (now Mumbai) in 1989 and Punjabi Academy, Delhi conferred Waris Shah Award on her in 1990.

She gifted me her book about writers, including myself. She wrote about the writers and their works. She also gave me



allowed literary, cultural and political activities within walled premises, we screened this drama on the occasion of first World Punjab Conference in 1986 at ■ house in Lahore. She said she had read the novel, so she knew how difficult production of ■ drama was, as every character of the novel dropped from eyes ■ itching of ■ pain.

Next day, the Urdu writers hosted a reception for me from the platform of 'Qalam Zad' organisation. The reception was chaired by Urdu writer Qamar Raees and Amrita Ji was requested to be the chief guest. She agreed and while speaking about my poetry and novels, particularly 'Bandiwaan', said: "When Fakhar Zaman presents character of 'Z' in his novel 'Bandiwaan', 'Z' says he was murdered yesterday, being murdered today and will be murdered tomorrow. At the moment, I am thinking that Fakhar Zaman and I both are 'Z'.

"I remember Firaq Gorakhpuri used to narrate that the issue of paradise and hell cropped up in the history of literature when people noted the poets and writers filling their hearts with agonies of people and then groan for the whole life. The people who have nothing to do with masses gave two names to the life: paradise that was for them and the hell was for poets and writers. Once chilly winds started blowing in the paradise and they started shivering and thought about getting ■ little fire from the hell. When they requested the dwellers of the hell to lend them some fire, they replied that there was no extra fire because everyone who came to the hell brought it with him.

"The same fire is burning in the hearts of poets and writers and, none else can share it. To get it, being ■ poet or writer is a must. The fire of insight that is burning in the shape of Fakhar

When Bulgaria instituted an award in memory of its revolutionary poet Nikola Vaptsarov in 1997 and selected five writers from Russia, the United States, Italy, Poland and India for this award, Amrita Ji was selected from India. She received this award at a ceremony on October 16, 1980. In his speech on the occasion, the president of the award committee said: "We, Bulgarian writers and people are happy that a prominent Indian writer and poetess is our friend. We published her writings in Bulgaria and love it because her poetry accepts struggle for social values and human welfare."

Amrita Ji was given the symbol of liberty---an injured bird made of brass with wings spread skyward-and half of the award money (\$ 1,300) in cash. She was honoured for attending the International Sofia Meeting of Writers attended by writers from 22 countries.

Amrita Ji was nominated for membership of Rajiya Sabha in 1986. In 1987, I was in Holland when renowned Punjabi fiction writer Ajeet Kor invited me to attend a two-day Punjabi Kahani Conference about my presence in the city. She asked me to reach her residence.

I reached her Hauz Khas home and stayed there for three days --- the golden moments of my life. I discussed with her literature, politics and Sufism as well as Punjabi Literature, literary figures and also exchanged views on Pakistan-India relations.

She knew about ban on my Punjabi books during the rule of Gen Zia-ul-Haq. When I asked her to watch video of a drama on my Punjabi novel 'Bandiwaan', she asked astonishingly how you produced a drama on this novel despite ban on your books. I informed her that when Zia-ul-Haq

strictly. So whenever I went abroad, I use to write her letters and call her on telephone. On this, Amrita Ji always got pleased.

I came to know about Amrita Pritam after reading all her writings, particularly her biography 'Raseedi Ticket' (Receipt Stamp) that got published in 1976 and its second part titled 'Mein Jama Toon'. 'Raseedi Ticket' made ■ stir in the literary circles and several people objected that she might not have mentioned some points but I think there is nothing of this sort. In fact, she had no double standards and used to mention everything in a straight way. She did not conceal anything, on the pretext of any diplomacy, about her friends, her life and her views with regards to literature. I think every true author should do the same.

A poem written by Amrita Ji on the bloodshed on the occasion of division of India in 1947 'Aj Aakhan Warish Shah Noon Kton Qarban Vichon Bol' immortalised her in the Punjab poetry. She ■ the first woman recipient of of the Sahitya Akademi Award on collection of her Punjabi poetry 'Sanehre' and the title of Padma Shree in 1969. She received three D Lit degrees from Delhi, Jabalpur and Vishva Bharti Universities in 1973 and 1983 respectively.

Amrita Pritam visited Moscow on the occasion of World Peace Congress in 1973. Earlier she visited Tashkent, Tajikistan and Uzbekistan on the invitation of Moscow Writers Union in 1961 and Bulgaria in 1966. She was sent to Yugoslavia, Hungary and Romania by the Indian Government under a cultural exchange programme in 1967. She mentioned details of these visits in 'Raseedi Ticket' but the award she received from Bulgaria in 1980 was very important.

**Fakhar Zaman**

## **Amrita Pritam: A Great Wordsmith in Punjab's Literary History**

When I was in college, I got inspiration from Amrita Pritam's poetry work, 'Naveen Rut' (New Season), to write in the mother language. However, the poetry of Amrita Ji impressed me a lot and besides Urdu and English, I started writing in Punjabi language. My first book 'Kanso Vele Dee' hit the bookshelves in 1972 and I sent a copy to Amrita Ji.

When telecasts of Indian TV started to be watched in Pakistan and the channel started airing Indian films, there was so much eagerness that people installed huge antennas to watch telecasts clearly. I used to watch with lot of interest the Punjabi Literary Programme 'Darpan' that was presented by Amrita Ji. One day she commented on my book and said: "This is very good poetry. These poems speak of ■ new sensibility and have given a new trend and shape to the Punjabi poetry. It has modernism and symbolism."

In reply, she wrote: "I got your book, I read and liked it. I expressed my views explicitly on everything liked by me."

Later, second book of my poetry 'Vangaar' got published and then my novel 'Satt Gawache Log' reached India. Amrita Ji liked my novel so much that she often mentioned it on television. Then I sent my next novels including 'IK Mare Bande Dee Kahani', 'Bandiwaan' and 'Be Watna' to Amrita Pritam. At that time, the travel from India was banned, however, correspondence continued but that too was censored

them, looked after them, and brought out their books as the finest of fine sculptures, like immortal paintings. Including Amrita's books which were always designed by Imroz. Bhaba Pritam Singh, who passed away a few months back! He published almost all the books which later got Sahitya Akademi Awards. And he himself was honoured almost twenty times with National Awards for publishing.

A whole golden era of Punjabi literature, over which Amrita Pritam reigned supreme like a queen! Writing superb poetry which goes beyond times, writing the immortal poems including 'Ajj Aakhan Waaris Shah Noo' : the superb poem which contained the pain of Partition of the country, the 'Nine Dreams of Tripta' : Nanak's mother, 'A Travelogue of Thirst', and many others which created new imagery, distinctive style, new vocabulary, deep emotions and a unique lyrical quality.

From her prose, her novel 'Pinjar' (The Skeleton), and the short story 'Shah Di Kanjari (The Landlord's Prostitute) will live for ever.

Though we were only a couple of friends around her when she departed, all Punjabi lovers, all Punjabi writers and readers, all over the world, cried for her!



merry-making!

"Don't they know? Doesn't anybody realize that the queen of Punjabi literature is going on her last journey?"

In the shadows of descending deep grey dusk, in the desolate and forlorn crematorium of Green Park, her body was kept on the rough wood. Nobody knew what to do.

'Any special prayers?' the crematorium incharge asked.

All of ■ were silent.

The sort of affinity with the Ultimate that she had achieved, the sort of merging with the Infinite that only she was capable of attaining, resulting in absolute peace, and an end to all questions she had ever been asking all the realized souls including all the Sidh Yogis who flocked to her, including Osho Rajneesh, had been resolved. It didn't make any difference to her sort of last rituals were performed and what sort of prayers were said. Because all these prayers couldn't reach even the threshold of her exalted abode.

She had said all her prayers, and had gone beyond prayers, reaching ■ stage of communication and diving deep within one's soul where eternal light dwells! Ultimately resolving all questions, all queries! She had already 'arrived' where she had endeavoured to arrive.

When she went up flames, an important era of Punjabi literature came to an end. An era inhabited by the great Punjabi writers like Nanak Singh, Bhai Veer Singh, Sardar Gurbaksh Singh, Mohan Singh, Charan Singh Shaheed, Dhani Ram Chatrik, Feroz Deen Sharaf, Kulwant Singh Virk, Balwant Gargi, Shiv Batalvi, Harbhajan Singh, Devinder Satyarthi !

And the greatest of the great Punjabi publisher, who had published all of them, over half a century and more, nurtured

A total merger of two souls! An absolute emersion in each other!

Their love was like an eternal journey towards

'moksha' ! Towards some unknown destination of ultimate redemption, tasting its nectar in every moment of their lives

It was four in the afternoon. According to her wish, hardly anybody was informed. No last bath was given. Clothes were not changed. No wailing, no crying, no photographs. She had planned all of it long back and ordered that her body should be taken without unnecessary delay to the crematorium.

From her first floor room, Imroz picked her up, wrapped up in the bed sheet she died on, like his own child, because she 'was' his only child, ever since they had decided in the very beginning of their relationship not to produce any child of their own, because they had to bring up the two children from her first marriage, Sally, the son, the flower of her womb, and Kandla whom she had adopted when my father, who treated her in Lahore, had advised her not to produce ■ child until she was fully cured, which took almost three to four years, and she needed ■ child. So she brought this chubby little girl, large-eyed and helpless, from an orphanage. Sally was born after she was completely cured.

In her last journey, she was accompanied by just four-five friends, and Imroz, her son and daughter, two grandchildren.

It was Diwali eve. Dazzling lights, crackers, people buying sweets in their finest saris and suits and diamonds and jewellery, revelry and noise on the streets!

Our small caravan of just the dead-bodies van, and two cars following it, passed through all the noise and

For the last three years, it was Imroz who had been looking after her like ■ mother. He, and Alka, Amrita's daughter-in-law.

Inderjeet met her in late fifties. After reading her first novel 'Doctor Dev', he rang her up. "Hello?" - She asked.

"Doctor Dev", he said, and put the receiver back into its cradle keeping also the surge of his love and emotion for Amrita in ■ cradle of silence.

He is a painter. For earning a living during the first creative years, when paintings are a private passion, but necessities of life and of painting materials makes people work on other jobs for making a living, he was working for an Urdu magazine 'Shama', making sketches to go with the poems and stories, and designing its covers.

'Shama' decided to serialise 'Doctor Dev' in Urdu translation. Designing was allocated to Inderjeet (now Imroz). He met Amrita to have ■ look at the sketches that Inderjeet had prepared, and it was the beginning of ■ unique relationship, the sort of relationship that kings immortalise in Taj Mahals!

Amrita would look at Imroz, and from the flicker of her eyelashes he knew if she wanted tea, or ■ cigarette, or wanted him to make a phone call!

They communicated with each other through their silences, with the sheer magic of togetherness.

It was a couple I have not come across anywhere else, in the whole of my very small world! Two suns revolving around each other in their two orbits, in infinite space, searching for the ultimate in life together with ■ simple naivety and beautiful, unparalleled companionship.



Ajeet Cour

## An Era Vanishes

When the message came that Amrita had passed away, it struck me like a hammer against the ribs.

All of us, who had seen her suffering during the last three years, had been expecting this.

Even she was expecting the end almost with restless longing.

During the first phase of her slipping into a horribly unending suffering, she longed for death.

Later, when she drifted into the twilight zone of forgetfulness and oblivion, she waited with amazing patience and resignation.

.....

At her home in Hauz Khas, on her bed, she was lying like a cuddled-up embryo in a mother's womb.

Her body had shrunk! She looked almost like a cuddled-up child, in deep slumber, seeing dreams of fairylands and butterfly lands.

Her arms and legs were folded up, as if she was holding herself in an eternal embrace.

He was there, her love, her companion for the last forty years, looking peaceful and composed and resigned. Like a saint! Inderjeet, who had merged his self in Amrita, and acquired the name which contained syllables from both their names Imroz. He had spent almost half a century in a unique, meditative love with Amrita.

**Amrita Pritam**

Translated by Kartar Singh Duggal

## **Virgin**

When I moved into your bed  
I was not alone--- there were  
two of us  
A married woman and a virgin  
To sleep with you  
I had to offer the virgin in me  
I did so  
This slaughter is permissible  
in law  
Not the indignity of it  
And I bore the onslaught of  
the insult  
The next morning  
I looked at my blood stained  
hands  
I washed my hands  
But the moment I stood  
before the mirror  
I found her standing there  
The one whom I thought I  
had slaughtered last night  
Oh God!  
Was it too dark in your bed  
I had to kill one and I killed  
the other?

clean-shaven Sikh.) He not only loved her, painted her eyes on doors and walls, designed book jackets for her but in the past few years of her life, when she was unable to move, looked after her to the last. He gave me a line drawing of Waris Shah, which I keep in my studio as an emblem of eternal love

never looked back.

My first disappointment came when she won the Sahitya Akademi Award. She was a member of the selection panel. She cast the deciding vote in her own favour. I found it hard to digest but said nothing to her. When she was served with a warrant by an Amritsar Court for something she had written about Sikhism, I agreed to accompany her. Nothing came of it. When Krishna Sobti took her to court for stealing the title of her autobiography *Zindaginamah*, I appeared in the Delhi High Court as a defense witness. Other troubles came her way, I stood by her.

Amrita was not a highly educated woman, not exposed to good writing in languages other than Punjabi nor sophisticated enough to add new dimensions to her own. She was besotted by Bollywood and believed getting one of her novels or short stories accepted by a film-maker was the ultimate in success. All her stories and novels were sob stuff and uniformly second rate.

When I translated *Pinjar*, I gave half the share of royalties due to me to her on condition that she would tell me her life story and her love life. We had many sessions. She conceded she had been in love with Sahir Ludhianvi and no one else. He came over to Delhi to meet her. It came to nothing. I told her love life could be written behind a postage stamp. She used it as a title of her autobiography *Raseedee Ticket*. About Imroz, the one who devoted most of his life to her, she had not much to say. (He is not Muslim as the name might indicate, but a

Singh. The offer was readily accepted. On marriage, Amrita added her husband's name to her own and became Amrita Pritam. I met her couple of times in Lahore with other Punjabi writers all of whom were infatuated by her, chief among them Mohan Singh Mahir, then acknowledged as the best among younger poets. He claimed his affection was reciprocated. Amrita assured me it was not.

I got closer to Amrita Pritam after 1947 when we migrated from Lahore to Delhi. She got a job in the Punjabi service of All India Radio. It was about that time she decided to make a clean break from her past. She persuaded her husband to divorce her leaving their son in her custody. She did not formally renounce Sikhism but cut off her hair and took to smoking heavily. It was also around this time she composed her poem Aaj Aakhaan Waris Shah Noo addressed to the Sufi poet Waris Shah, author of the most famous tragic Punjabi saga of Heer & Ranjah.

Utth dard-mandaan dey dardiyaa tak apna Punjab  
Beyley laashaan vichhiyaan  
Teh laho da bharya Chenab

(Sharer of stricken hearts,  
Look at your Punjab,  
Corpses are strewn in the field  
Blood flows in the Chenab.)

With this memorable lament, Amrita Pritam shot into fame in the Punjabi speaking world, both Pakistani and Indian. She

## Amrita Pritam: Queen of Punjabi Literature

I had known Amrita Pritam for more than 60 years and, besides her live-in gentleman companion and her children, been closer to her than anyone else. I was the first to translate some of her works into English, including her best-known novel *Pinjar* (The Skeleton) and selections of her verse published in the brochure released by Prime Minister P.V. Narasimha Rao when she was given the Jnanpith Award. However, when T V and radio channels asked me to pay tribute to her when she died on October 31, I firmly said no. Then I heard and read what others had to say about her. Patwant Singh on N D.T V in his usual haw haw English, spoke about her steadfast adherence to political principles. As a matter of fact, Amrita never bothered about politics and hardly ever read newspapers. Obituaries in newspapers repeated the same things about her life and work loaded, as is their practice, with superlatives. No one dared to mention her human failings. Amrita's father was a pracharak - a preacher of the Sikh faith from Gujranwala, where she was born. After the death of his wife, father and daughter moved to Lahore. Amrita grew into a pretty girl with almond-shaped eyes, fine features and a fair complexion. She was also petite, barely five feet tall and precocious. She began composing poetry in her teens. Her earliest work was in praise of Sikh gurus and what they stood for. She was lauded for her work. Among her many admirers was Jagat Singh Kwatra, owner of the leading hostelry store in Anarkali Bazaar. He asked for her hand for his son Pritam



پیشنگ امروز



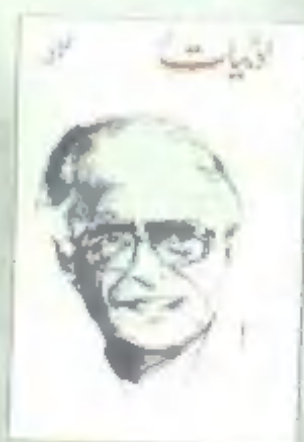
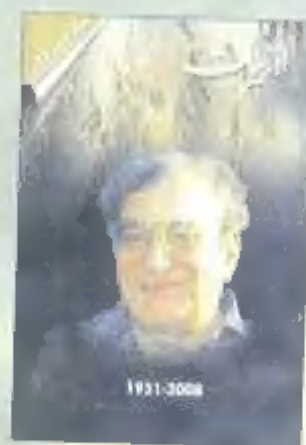






# سہ ماہی ادبیات

## چند خصوصی شمارے





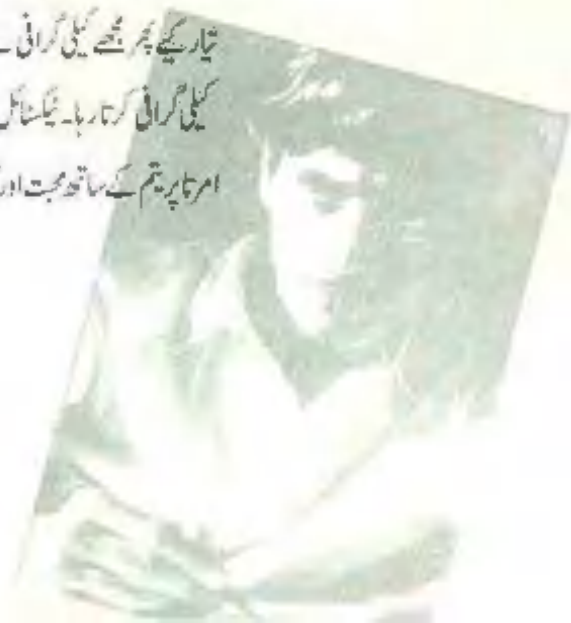
امروز

پیدائش: 26 جنوری 1926ء، لاکل پور، پاکستان

1943ء، میو سکول آف آرٹس میں داخلہ لیا جہاں تین سال پینٹنگ سیکھی  
1957ء، میں دہلی میں امرتا پرتم سے پہلی ملاقات ہوئی

”کھیتوں میں کھیلتا کھیلتا رنگوں سے کھیلنے کے لیے لاہور کے میو آرٹس سکول میں جا پہنچا۔ تین سال  
آرٹس سکول میں رنگوں سے خوب کھیلا۔ آرٹس سکول کے بعد میں زندگی کے سکول میں داخل ہو گیا۔

جو کچھ ہو چکا ہے اسے دہرانے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ہر وقت کچھ نیا کرنے کا شوق رہتا ہے  
اور میں اس کا انتظار بھی کرتا ہوں۔ میں نے ممبئی میں دو سال سینما کے بیسٹ بنائے، فلموں کے پوسٹر  
تیار کیے پھر مجھے کئی گرائی نے اپنی طرف کھینچا۔ اگلے چھ سال میں ”شمع“ رسالے میں اپنی طرح کی  
کئی گرائی کرتا رہا۔ نیلسن ڈی زائن بھی بنائے، گھڑیوں کے ڈائل بھی ڈیزائن کیے اور ایک عمر شاعرہ  
امرتا پرتم کے ساتھ محبت اور آزادی کا ”ست رنگ“ دیکھا اور جیا۔“



# آكادمى ادبىيات پاڪستان كى تازه مطبوعات





**Amrita Pritam No.**



آکھاں وارث شاہ نوں!

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبریں وچوں بول!  
تے اج کتابے عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول!  
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین  
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن:  
وے درد منداں دیا درویا! اٹھ تک اپنا پنجاب  
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب



**Pakistan Academy of Letters**

Pitras Bukhari Road, H-8/1, Islamabad, Pakistan

[www.academy.org.pk](http://www.academy.org.pk)